مخزنِ ادب

آنریبل خان بہادر سر شیخ عبدالقادر بار ایٹ لا اور دوسرے

مشاہیر ادب کے جواہر ریزے

فیروز سنز

پرنٹرز، پبلشرز، بک سیلرز اینڈ اسٹیشنرز

لاہور ——— کراچی ——— پشاور

۶۰ دی مال　　بندر روڈ　　۳۵ دی مال

قیمت ۸ روپے

فہرست مضامین

آنریبل خان بہادر شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹرایٹ لاء

"مخزنِ ادب" مخزن کے منتخب مضامین کا مجموعہ ہے۔ اور "مخزن" ادبِ اُردو کا وہ قیمتی رسالہ تھا۔ جس نے اپنے زمانۂ اشاعت میں ادبِ اُردو کی ایسی گرانبہا خدمات انجام دیں۔ کہ اُن کا تحریک و تفہیم امثال و نظیر اس ادبی ترقی یافتہ زمانے میں بھی کوئی کم ہی نظر آسکتا ہے۔ اس لحاظ سے مخزن کے ساتھ لفظ ادب ایزاد کر کے مجموعہ ہذا کا نام مخزنِ ادب قرار دیا گیا ہے۔ مگر مخزن اتنا مشہور کیوں تھا۔ اور ملکِ ادب میں اُس کی اتنی قدر کیوں تھی؟ صرف اس لیے کہ "مخزن" کی تمام ادبی گوہر فشانیاں آنریبل خان بہادر شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹرایٹ لا کے تبحرِ علمی اور دستِ عمل کی پرورش یافتہ تھیں۔ اس لیے ضروری ہے۔ کہ ادبیاتِ اُردو کے اس مایۂ نازِ محسن کے کسی قدر مجمل حالات بھی لکھے جائیں۔ جس کی تصویر زینت دہ "مخزنِ ادب" ہے۔"

شیخ صاحب ممدوح قانونگو شیخ ہیں۔ آپ کا آبائی وطن اور زاد بوم قصور اور سنِ ولادت ۱۸۷۴ء ہے۔ آپ کے والدِ ماجد گورنمنٹ سروس میں ایک ممتاز عہدے پر مامور تھے جن کی عمر کا بیشتر حصہ بسلسلۂ ملازمت لدھیانہ میں گزرا تھا۔ اور شیخ صاحب کی ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی تھی جس کے بعد آپ نے قصور کے سکول سے مڈل پاس کیا۔ اور ۱۸۹۰ء میں سنٹرل ماڈل سکول لاہور سے (جسے اُس زمانہ میں ایم۔ بی۔ ہائی سکول کہا جاتا تھا) انٹرنس کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کر کے یونیورسٹی سے وظیفہ حاصل کیا۔ اور فورمن کرسچین کالج لاہور میں تعلیم پا کر ۱۸۹۴ء میں بی۔ اے کی ڈگری بھی فرسٹ ڈویژن ہی میں پائی جس کے بعد کچھ عرصہ تک تو آپ پروفیسری پر مامور رہے۔ مگر ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ اس زمانے میں آپ نے ایک کتاب انگریزی زبان میں لکھی۔ جس کا نام "ادبیاتِ اُردو کا دورِ جدید" تھا۔ اس کتاب میں آپ نے اُن مشاہیرِ ہند کا تذکرہ کیا ہے جنھوں نے اُردو کی نظم و نثر کو نئی روش پر چلانے کے لیے

سعی بلیغ سے کام لیا تھا۔ بعد ازاں آپ کے ادبی ولولوں نے اپنے نشوونما کے لئے پروفیسری کو ایک محدود دائرہ خیال کرتے ہوئے اخبار آبزرور مرحوم کے دفتر میں اسسٹنٹ ایڈیٹری لینے پر مائل کیا۔ اور بہت ہی جلد آپ کی روشن دماغی اور زور قلم نے اس کی مکمل عنان ادارت آپ کے ہاتھ میں دلوا دی۔ چنانچہ ان فرائض ادارت کو شیخ صاحب نے اس خوبی اور خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ کہ ملک میں آبزرور کی دھاک بندھ گئی۔ اُسی زمانے میں آپ کی کوشش سے تعلیمیافتہ نوجوانوں میں شعروسخن اور علم ادب کا ذوق سلیم پیدا کرنے کے لیئے لاہور میں ایک مجلس مشاعرہ اور علم ادب کی قائم ہوئی ۔

اگرچہ ادبیات انگریزی میں بھی آپ کو کافی کمال حاصل ہے لیکن اس خیال سے کہ جس قوم کی زبان مکمل نہ ہو علمی دنیا میں نہ اس کی وقعت ہوسکتی ہے۔ اور نہ اس کے عام افراد ہی میں کوئی عالی دماغی ہونی ممکن ہے۔ ابتدا ہی سے آپ ادبیات اُردو میں ایک نئی روح پھونکنے کے متمنی تھے۔ اس لیے پانچ سال تک آبزرور کی کامیاب ایڈیٹری کے بعد آپ نے ۱۹۰۱ء میں ایک ماہوار رسالہ "مخزن" کے نام سے جاری کیا۔ جس نے آپ کی قلمی اعانت اور دماغی قابلیت سے ملکت اُردو میں وہ نایاب و خوش رنگ اور تابندہ جواہر ریزے اُگلے۔ کہ اس کی علمی شعاعوں اور وُہ جدید کی ادبی ضیا پاشیوں نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ملک کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دی۔ اور ادبیات کے ایسے ایسے حلاوت آفرین مضمون نگاروں اور سخنوروں کو ملک سے روشناس کرا دیا۔ کہ جن کے بامذاق مضامین کے ایک ایک فقرے پر اب بھی زبان ہونٹ چاٹتی ہے۔ ان جادو نگاروں کی سحر آفرینیوں سے مخزن کی شان ہر دلعزیزی کو وہ عروج اور معراج حاصل ہُوا۔ کہ مخزن کے خریدار اس کے انتظار میں ہمہ تن چشم و گوش ہو جاتے تھے۔ اور منتظر بھی کیوں نہ رہتے۔ کہ اس وسیع ملک کے طول و عرض میں جتنے معجز رقم گوشۂ عافیت میں چھپے بیٹھے تھے "مخزن" نے ان کی قابلیت میں چار چاند لگا کر انھیں آسمان شہرت کے درخشندہ ستارے بنا دیا۔ شیخ صاحب کے ذوق سلیم اور مخزن کی نشر و اشاعت نے ادبیات میں وہ جدّت پیدا کی۔ کہ جس نے گزشتہ زمانے

کے معیار نظم و نثر کو قصۂ پارینہ ثابت کر دیا۔ یہ ایسی عظیم الشان کامیابی تھی۔ کہ مولانا آزاد و حالی جیسے مسلم
الثبوت اُدبا بھی اگرچہ بہت کچھ کر گئے لیکن تعلیم یافتہ طبقہ کو مضمون نویسی سکھانے کے متعلق وہ بھی
اتنے کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ پھر تو یہ شوق اتنا بڑھا۔ کہ مخزن کی تقلید میں کانپور سے زمانہ اور الہ آباد
سے ادیب وغیرہ رسائل شائع ہونے لگے۔ جو بحیثیت مجموعی نہایت شاندار تھے۔ بالخصوص ادیب کتابت
اور طباعت کاغذ و تصاویر کی کثرت اور مضامین نظم و نثر کی متانت و ثقاہت کے لحاظ سے بہت ارفع
و اعلےٰ رسالہ تھا۔ لیکن اوّلیت کا وہ سہرا جو مخزن کے سر بندھ چکا تھا۔ کوئی دوسرا نہ چھین سکا۔ گو اس
کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت واقعی ہے۔ کہ مخزن الشیخ صاحب ہی کے زمانۂ ادارت میں مخزن تھا۔
ورنہ ہونے کو تو وہ بعد میں بھی شائع ہوتا رہا۔ لیکن اس مخزن کو شیخ صاحب کے زمانے کے مخزن
سے وہی نسبت تھی۔ جو ماہ نخشب کو مہتاب فلک سے ہو سکتی ہے۔

آپ کی ادبی توجہ حلقۂ ذکور تک ہی محدود نہیں رہی۔ بلکہ جن دنوں آپ مخزن کو لاہور سے
دہلی لے گئے تھے۔ اُنہی دنوں آپ نے طبقہ نسواں میں اُسدد علم ادب کا صحیح مذاق پیدا کرنے
کے لیے شیخ محمد اکرام صاحب بیرسٹرایٹ لاء کی نگرانی میں ایک رسالہ عصمت نام بھی جاری کیا۔
اور اس رسالے نے بھی حلقۂ اناث میں وہ ادبی خدمات انجام دیں کہ مخزن کی مانند کوئی نسوانی
پرچہ اس کا جواب اب تک پیش نہیں کر سکا۔

۱۹۰۴ء میں شیخ صاحب بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان تشریف لے گئے
اور ۱۹۰۷ء تک اُس میں مصروف رہے۔ مگر اس عرصہ میں بھی آبزرور اور مخزن کے لیے برابر
وہیں سے مضامین لکھتے رہے بلکہ مخزن کے علاوہ خاص انگلستان کے رسائل و اخبارات میں
بھی آپ کے اکثر مضامین شائع ہوتے رہے۔ اور مضامین نویسی کے سوا وقتاً فوقتاً اکثر مقامات
یورپ میں پُرزور دھواں دھار تقریریں بھی کرتے رہے۔ اس دوران میں آپ نے ممالک
یورپ کی سیر و سیاحت بھی فرمائی۔ اور مسٹر ڈبلیو ٹی سٹڈ اور پروفیسر ومبیری جیسی علّامہ اور باکمال
ہستیوں سے متعارف ہو کر گھنٹوں اُن سے ہندوستان کے مختلف پہلوؤں پر بحث و تمحیص

کرتے رہے ۔ بیرسٹری میں کامیابی حاصل کرکے جب واپسی پر آپ بغرضِ سیاحت ٹرکی تشریف لے گئے ۔ تو قسطنطنیہ میں بڑے بڑے پاشاؤں سے ملاقات کرنے کے علاوہ شہنشاہ ٹرکی خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالحمید خان ثانی مرحوم نے آپ کو شرفِ باریابی بخش کر تمغہ حمیدیہ عطا فرمایا ۔ اور واپس ہندوستان پہنچنے پر آپ نے "مقامِ خلافت" کے نام سے ایک قابلِ قدر کتاب لکھی جس میں روم و قسطنطنیہ کے حالات نہایت شرح و بسط سے درج ہوئے تھے ۔

انگلستان سے واپس آکر ابتدا میں آپ نے دہلی میں وکالت شروع کی ۔ کیونکہ مخزن بھی اُس زمانے میں بجائے لاہور کے دہلی سے شائع ہوتا تھا ۔ مگر دہلی میں دو ہی سال کام کرنے کے بعد آپ کو لاہور آنا پڑا ۔ جس کے ساتھ "مخزن" کا مقامِ اشاعت بھی پھر دہلی سے لاہور قرار پا گیا ۔ لیکن جب یہاں تھوڑا عرصہ کام کرنے کے بعد آپ کا شمار سربرآوردہ بیرسٹروں میں ہونے لگا ۔ اور آپ لائلپور میں گورنمنٹ ایڈوکیٹ مقرر ہو کر چلے گئے ۔ تو مخزن کے ساتھ وہ شغف و انہماک قائم نہ رہ سکا ۔ اس لیے آپ نے اپنی اس گراں مایہ یادگار کو شیدائے اردو شیخ غلام محمد صاحب مرحوم کے حوالے کر دیا ۔ لائلپور میں سرکاری خدمات انجام دینے کے ساتھ جب آپ نے وہاں کے مسلمانوں کی تعلیمی پستی کا مطالعہ کیا ۔ تو اپنی مساعیِ جمیلہ سے تین ہائی سکول ایک زمیندارہ ہائی سکول چک ۲۴۲ دسوہہ ۔ دوسرا اسلامیہ ہائی سکول چک ۲۳۳ ۔ اور تیسرا اسلامیہ ہائی سکول لائلپور قائم کرائے ۔ جو اُس وقت کے لحاظ سے بڑی کامیابی تھی ۔ اس عرصے میں آپ سرکار کی طرف سے خاص خاص خدمات پر بھی مامور ہوتے ۔ اور حکام و رعایا میں یکساں ہر دلعزیزی حاصل کرتے رہے ۔

سنہ ۱۹۲۱ء میں آپ نے سرکاری ملازمت ترک کرکے پھر لاہور میں بیرسٹری شروع کی ۔ اور گزشتہ پانچ سال کے عرصے میں آپ ایک سال جج ہائیکورٹ کی اسامی پر مامور رہے ۔ اور دسمبر ۱۹۲۳ء میں مغربی پنجاب کے مسلم قصباتی حلقہ کی طرف سے نمائندہ منتخب ہوئے ۔ اور داخلہ کونسل کے ساتھ ہی مقتدر ارکانِ کونسل میں شمار ہونے لگے ۔ چنانچہ ۱۹۲۴ء میں پہلے تو ممبران کونسل کے انتخاب سے کونسل کے وائس پریزیڈنٹ رہے ۔ اور پھر ۱۹۲۵ء میں جملہ ممبران کونسل کے انتخاب سے پریزیڈنٹ مقرر ہوئے

جس کے بعد ۱۲ اگست ۱۹۲۵ء سے اخیر نومبر تک آپ وزیرِ تعلیم پنجاب کی آسامی پر فائز المرام رہے۔ اور اس ضرورت سے آپ کو کونسل کی پریزیڈنٹی سے استعفیٰ دینا پڑا۔ آپ کے وزیرِ تعلیم مقرر ہونے پر ملک کے تمام ہندو مسلم اخبارات نے جس تپاک و محبت سے آپ کا خیر مقدم کیا۔ اور گورنمنٹ کے اس انتخاب کو جن مطمئن کلمات سے بہترین قرار دیا وہ غالباً آج تک کسی عہدہ دار کو حاصل نہیں ہو سکا۔ کہ ہندو سکھ عیسائی اور مسلمان سب یکساں مطمئن و خورسند ہوں۔ اس کے سوا مسلمانانِ لاہور۔ انجمن نوجوانانِ شیخ تانونگو یانِ لاہور۔ انجمن خدام الاسلام گجرات۔ انجمن شیخاں سرگودھا۔ اور انجمن اسلامیہ امین آباد وغیرہ وغیرہ تقریباً ہر انجمن نے جلسہ ہائے تہنیت منعقد کر کے آپ کو باضابطہ مبارکبادیں دیں۔ بلکہ انبالہ کے اللہ باسی دا اس صاحب نے کلارک آشرم شملہ میں آپ کو ایٹ ہوم بھی دیا۔ اور جس طرح پہلی دفعہ لیجسلیٹو کونسل کا صدر منتخب ہونے کے وقت ملک و قوم کے تمام نمائندوں نے بحیثیت مجموعی بلا تفریق مذہب و ملت بغیر کسی مقابلہ کے آپ کو منتخب کر لیا تھا۔ ویسے ہی تقرریٔ وزارت پر بھی ہندو مسلمان وغیرہ آپ کو صدقِ دل سے مبارکبادیں دینے گئے۔ جس سے آپ کے منصفانہ برتاؤ اور صلح کل پالیسی پر روشنی پڑتی ہے۔ وزارت کے بعد آپ گورنمنٹ کی طرف سے اُس سرکاری کمیشن کے ممبر بنائے گئے۔ جو جیلخانہ جات پنجاب کی تحقیقات و اصلاح کے لیئے مقرر ہوئی تھی۔ اور جس میں حجانِ ہائیکورٹ کے درجہ کے حکام کو ممبر نامزد کیا گیا تھا۔

اس کے بعد اگست ۱۹۲۶ء میں گورنمنٹ نے آپ کو جنیوا کانفرنس کے لیئے بطور لیڈرِ پریزیڈنٹ انتخاب فرمایا۔ اور آپ نے یورپ تشریف لے جا کر اس غرض نمائندگی کو اس خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ کہ ؏ فلک گفت احسن ملک گفت زہ ؎

آپ کی اس روانگی یورپ اور پھر کامیاب مراجعت کے موقع پر اہالیانِ لاہور نے جس اہلی خلوص اور دلی شوق سے گل افشانی و مبارکبادی کے ذریعہ اظہارِ مسرت کیا۔ اس کی نظیریں بہت کم ملیں گی۔ کہ کئی کئی بار آپ پھولوں کے ہاروں سے لدلد گئے۔ اور تمام گاڑی کیا سٹیشن کا سٹیشن گل و گلزار کا تختہ بن گیا ؎

یہ مشایعت اور استقبال اس امر کا کافی ثبوت اور بین دلیل ہے۔ کہ جس طرح گورنمنٹ کو آپ کی سلامت روی اور قابلیت پر اعتماد ہے۔ ویسے ہی تمام رعایائے ہند و پنجاب کو بھی آپ کی اصابت رائے اور ملکی بہی خواہی پر اعتبار ہے۔

پنجاب یونیورسٹی میں بھی بحیثیت فیلو و سنڈیکیٹ ہونے کے آپ نے علم و عمل اور ملک و قوم کی جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ وہ ہر طرح قابل ستائش اور لائق تعریف ہیں جس میں ہر ہر مسئلہ پر آپ نے نہایت تن دہی اور پوری دلچسپی کا اظہار کیا۔ اگر ایسے ہی کارکن فیلو اور سنڈک ہوں تو اُمید ہے کہ قوم کا تعلیمی بیڑا پار ہو جائے ؀

اس اجمال میں ناظرین غالباً اس درخشندہ گوہر پنجاب کے مجمل حالات سے واقف ہو گئے ہونگے لیکن اب ہم طلباء اور استاد صاحبان مدارس اور کالجیٹ حضرات سے پُوچھنا چاہتے ہیں۔ کہ آپ صاحبان بھی اس مثال سے کوئی فائدہ اُٹھائیں گے؟ وہی سکول اور وہی کالج ہیں۔ وہی اُستاد اور وہی پروفیسر ہیں۔ وہی کتابیں بلکہ پہلے سے زیادہ اہتمام و انصرام ہوتے ہیں لیکن یونیورسٹیاں ایسے جواہر گراں مایہ بہت کم نکالتی ہیں پھر کیا اس میں یونیورسٹیوں کا قصور ہے۔ یا کالج متہم ہیں؟ ہرگز نہیں ؎

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست　　در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

ہمارے اکثر طلباء صرف فیشن ایبل طلباء ہیں۔ ان کا مطمع نظر صرف ڈگری کے دو حروف ہوتے ہیں۔ وہ کتابوں کی سطروں کو پڑھتے ہیں۔ مگر بین السطور نہیں پڑھتے۔ وہ عبارتوں کو یاد کرتے ہیں۔ مگر اُن کا مدعا و مقصد نہیں سمجھتے۔ اور سمجھتے ہیں تو دوسروں کو سمجھانے سے قاصر ہیں۔ انہیں یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ تعلیم صرف مدرسہ یا کالج چلے جانا اور مقررہ اوقات کو پورا کرآنا ہی نہیں بلکہ کتاب علم سے خود منور ہو کر دوسروں کو منور کرنا تعلیم ہے۔ اسی طریق سے اُن کی ذہانت صیقل ہو سکتی۔ اور اسی روش سے اُن کی قابلیت مکمل ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ شیخ صاحب اپنے زمانہ طالب علمی میں بھی ایسے ہی مصروف تھے۔ جیسا کہ کسی باخبر علمی شخص کو ہونا چاہیئے۔ وہ لیکچر دیتے تھے۔ ڈبیٹیں کرتے تھے۔

مضمون لکھتے تھے۔ انجمنیں اور سوسائٹیاں بناتے تھے۔ اسی مشق کے باعث وہ انگریزی و اردو زبانوں میں قادر الکلام لیکچرار اور مضمون نگار تسلیم ہو گئے۔ اور بڑی بڑی ہستیاں آپ کو خوش آمدید کہنے کو تیار ہو گئیں۔ چنانچہ جسٹس میاں شاہ دین صاحب مرحوم کے دوش بدوش آپ نے زمانہ طالب علمی ہی میں ینگ مینز محمڈن ایسوسی ایشن میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔ اور ادبیات اردو کے مختلف شعبوں پر اردو اور انگریزی میں پُرزور تقریریں فرمائیں۔ آپ کی طلیق اللسانی سے انجمن حمایت اسلام اور مسلم لیگ ہی نے فائدہ نہیں اٹھایا۔ بلکہ لاہور کے علاوہ پنجاب کے بڑے بڑے شہروں کی تمام مقتدر انجمنیں بھی اپنے سالانہ اجلاس میں آپ کو بزور مدعو کرتی رہیں جہاں ہمیشہ آپ کے پرجوش و پرتپاک استقبال ہوئے۔ اور آپ کی تقریروں کو پورے شوق و محویت سے سنا جاتا رہا۔ خصوصاً تعلیمی معاملات میں تو آپ نے بیش قرار خدمات انجام دی ہیں۔ اور دے رہے ہیں۔ انجمن حمایت اسلام لاہور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور علی گڑھ کالج ہمیشہ آپ کے مورد توجہ رہے۔ ایک طرف اگر آپ انجمن حمایت اسلام کی کالج کمیٹی کے پریزیڈنٹ ہیں۔ تو دوسری طرف مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں لاہور اور رایبٹ آباد کے اجلاسوں میں بحیثیت صدر منتخب ہو کر اپنی ولولہ انگیز اور معنی خیز تقریروں سے خاص شہرت رکھتے ہیں

ابھی جب آپ بطور راونڈ ٹیبل گول میز سفر یورپ کو تشریف لے گئے تو لندن کے مسلمانوں کی درخواست پر آپ نے اس عالیشان مسجد کا افتتاح کیا جو اس ہجوم تثلیث میں آوازہ وحدانیت بلند کرنے کو قائم کی گئی ہے پہلے اس کام کے لیے انہوں نے موجودہ سلطان حجاز کے ولیعہد کو تجویز کیا تھا۔ لیکن وہ بیچارے ان باتوں کو کیا جانیں یہ کچھ شیخ صاحب جیسے ہمدرد اسلام کے ہاتھ سے ہی موزوں تھی اور الحمدللہ کہ پوری کامیابی سے یہ تقریب عمل میں آئی۔ اس سے آپ کی وہ اعلیٰ پوزیشن ظاہر ہے جو اسلام کے ہر فرقہ اور ہر طبقہ کے واسطے آپ کے دل میں موجود ہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ باوصف سر آغا خاں اور سر سید امیر علی جیسی عالی قدر ہستیوں کی موجودگی کے بھی یہ عزت آپ ہی کو دی گئی۔ اور آپ ہی نے ادا فرمائی۔

آپ کا علمی و ادبی شغف اس قدر وسعت پذیر ہے۔ کہ آپ کی بیگم صاحبہ بھی جو شیخ محمد عمر

صاحب بیرسٹرایٹ لاء کی صاحبزادی ہیں۔ تعلیم وتربیتِ نسواں کی بہت بڑی حامی اور مُمِد ومعاون ہیں۔ نسوانی پرچوں میں اُن کے مضامین اکثر شائع ہوتے ہیں۔ چنانچہ کتاب ہٰذا میں بھی اُن کا ایک مضمون "پیرس کا ایک کروڑپتی" درج ہے۔ گزشتہ سال اُنھوں نے آل انڈیا پردہ لیڈیز کانفرنس کی کرسیٔ صدارت کو زینت دیتے ہوئے ایک عالمانہ خطبۂ صدارت پڑھا تھا جس کا جیب و دامن تعلیم نسوان کے بیش بہا جواہر ریزوں سے پُر تھا۔

از ... دہلی

بناوٹ اور سادگی

بناوٹ بھی اک فن ہے جو جانتا ہو
تری سادگی کچھ نہیں جانتے ہیں

مندرجۂ عنوان شعر کی خوبی یوں تو ظاہر ہے۔ مگر لطافتِ خاص اس میں یہ ہے۔ کہ اس کا اِطلاق محدود نہیں۔ سادگی سے مراد لیجیے سچ۔ اور بناوٹ کو قرار دیجیے دروغ۔ سچ سچ ہے۔ خواہ اُسے لاکھ پردوں میں چھپائیں۔ جس رنگ میں جلوہ گر ہو۔ پہچاننے والے پہچان جائیں گے۔ ایسے ظاہر بین زمانہ میں جیسا کہ ہمیں نصیب ہؤا ہے۔ یہ اصول خطرناک تو ضرور ہے۔ مگر پھر سچّا اصول ہے۔ گو ایک دفعہ تو سچّی بات کہتے ہی انگلیاں اُٹھ جاتی ہیں۔ اور آج کل دروغ کو فروغ ہے۔ مگر تا بہ کے۔ گلٹ کے گہنے چند دن تو چاندی سونے کے زیوروں کو مات دیتے ہیں۔ مگر جب عارضی چمک اڑی۔ اور نیچے پیتل اور تانبا نظر آیا پھر اُن سے ذلیل اور بدنما چیز قیاس میں نہیں آسکتی۔ اور اس بدنمائی کے آثار ابھی ظاہر ہونے کو ہوتے ہیں۔ کہ وہی حسین جنہوں نے بڑے چاؤ سے ایسے زیوروں کو باعثِ زینت ٹھیرایا تھا۔ اِنہیں نہ صرف نظروں سے گرا دیتے۔ بلکہ اُتار کے پھینک دیتے ہیں۔ اور آخر سونا سونا ہے۔ جتنا پرانا ہو جائے۔ جتنا اُسے گھِسو جتنا اُسے پتھر پر رگڑو۔ اپنے جوہرِ اصلی دکھاتا ہے۔ اور کبھی کسی نازک بدن کے کانوں سے اُترے بھی تو صرّاف کی صندوقچی میں قدر و منزلت سے بند کر کے رکھا جاتا ہے۔ گھر میں عزت پاتا ہے۔ تو بازار میں بھی اس کی توقیر ہے۔ اور بازار سے گراں ملتا ہے۔ تو گھروں میں بھی منزلت ہوتی ہے۔ جو نسبت کھوٹے کو کھرے سے ہے۔ وہی تناسب بناوٹ اور سادگی میں ہے۔

اس پر بھی ایک عالم بناوٹ پر مِٹا ہوُا نظر آتا ہے۔ کیونکہ بہت تھوڑی آنکھیں ہیں۔ جن کو وُہ بینائی عطا ہوئی ہے۔ جو بناوٹ کے پردوں کو ہٹا کر ہر چیز کے حُسن و قبح کو اُس کی عُریانی میں دیکھ سکے۔

جو لوگ سادگی کے نظاروں سے آشنا ہیں۔ وُہ بناوٹ کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ مگر بناوٹ کے شیدائی بھی کیا کریں۔ اس دُنیا میں رہ کر دنیا سے الگ رہنا یہ بھی تو ہر کسی کا کام نہیں۔ اور وہ اپنے اپنے طور پر ایک ادنیٰ نمونہ اس بڑی مثال کا دکھا رہے ہیں۔ جو دنیا نے اُن کے لئے قائم کی ہے۔ پُرانے شعراء اور مصنّفین کی تحقیق متفق اللفظ ہو کر گواہی دے رہی ہے۔ کہ دنیا جس کے حسنِ زاہد فریب کے لاکھوں بلکہ کروڑوں بندگانِ خدا مبتلا ہیں۔ اصل میں ایک زالِ پیر ہے جو صرف خط و خال کی آرائش سے لوگوں کے دلوں کو لُبھا کر دامِ تزویر میں لا رہی ہے۔ اور اگر اُس کے چہرہ سے وُہ پوڈر اور سُرخی جو اس کی زینت ہے دھو ڈالی جائے۔ اور اس کے مصنوعی کالے اور بنے بال اُکھاڑ پھینکے جائیں۔ اور اس کے بناوٹی سفید دانتوں کی لڑی جو کہ کسی متنفس کے روبرو نہیں اتارتی نکال باہر کی جائے۔ اور اس کی اصلی شکل کسی کو دکھا دی جائے۔ تو پھر اس کے شیدائی اس سے قطع تعلق کر لیں تو کیا کسی حسین کے حُسن پر اعتبار نہ کریں۔ اور سب سے کنارہ کش ہو کر اپنے گوشۂ عافیت میں بیٹھ جائیں۔ پس جب یہ دنیا بذاتِ خود ایک بڑا دامِ تزویر ہے۔ جو اس عالم پر پھیلا ہوا ہے۔ تو وہ لوگ جو اس بڑے دام کے نیچے چھوٹی چھوٹی جالیاں لگاتے ہیں۔ معذور ہیں۔ اور جو بیچارے نادانستہ جھوٹے پھندوں میں پھنسے ہیں۔ وہ معذور تر ہیں اس میں کوئی کلام نہیں۔ کہ بناوٹ کا پھندا بڑا زبردست پھندا ہے۔ جسے دیکھو اس کا شکار ہے۔ عُشاق ہیں۔ تو زلفوں کے پیچ و خم کے پھیر میں۔ شعرا ہیں تو کلام میں تلازم کی تلاش میں۔ واعظ ہیں تو ناز و کرشمہ بر سرِ منبر کے انداز سوچ رہے ہیں مضمون نگار ہیں۔ تو اُنہیں قافیہ بندی کی دُھن لگی ہوئی ہے۔ کوئی نہیں سوچتا۔ کہ جس کی زلفِ پُر پیچ کے دیوانے ہیں۔ وہ اس قابل بھی ہے کہ اُسے چاہیں۔ کوئی نہیں دیکھتا کہ جس کلام کو تلازم کے نمک مرچ سے لطیف بنا رہے ہیں۔ وُہ

بھی کسی ذاتی صفت سے متصف ہے یا نہیں۔ کوئی غور نہیں کرتا کہ وعظ میں نکات بھی دلپذیر ہیں یا محض انداز ہی کی فکر ہے۔ اور کوئی نہیں پروا کرتا کہ قافیہ بندی کی دھن میں کہیں اصلِ مضمون ہی خراب نہ ہو جائے۔

اردو علمِ ادب کو آج تک اس بناوٹ کے شوق نے نہایت نقصان پہنچایا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اردو زبان ابھی ایک نوعمر زبان ہے۔ مگر مقدار کے اعتبار سے اس کے ادب کا ذخیرہ کچھ تھوڑا نہیں۔ سینکڑوں دیوان اشعارِ آبدار سے پُر ہیں۔ مثنویاں ہیں۔ واسوختیں ہیں۔ مرثیے ہیں۔ نعتیں ہیں۔ ہجو ہے۔ قصائدِ مدح ہیں۔ نثریں قصے ہیں۔ افسانے ہیں۔ رقعات ہیں۔ اور حال میں کتب تاریخ و سیر و فلسفہ بھی موجود ہو گئی ہیں۔ اخبارات ہیں رسالے ہیں۔ اردو لکھنے اور بولنے والوں میں لکچرار ہیں۔ واعظ ہیں۔ لطیفہ گو ہیں۔ بذلہ سنج ہیں۔ رُلانے والے ہیں۔ ہنسانے والے ہیں۔ غرض جو آثار کسی لٹریچر کی ترقی کے ہوتے ہیں۔ سب کے سب موجود ہیں۔ مگر صرف ذخیرہ کی کمیت پر نظر ڈالنے اور کیفیت کا لحاظ کرنے سے صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ کہ ذخیرہ کس پایہ کا ہے۔ اور کیفیت کا جو حال ہے۔ وہ ناگفتہ بہ ہے۔ پہلے نظم ہی کو دیکھئے کہ از سرتاپا بناوٹ ہے۔ اکثر صنفوں کی نسبت تو خود مصنفین اظہار کرتے ہیں۔ کہ ان میں فلاں صنعت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ نہ صرف ہماری نظم کی ظاہری صورت میں بناوٹ سے کام لیا گیا ہے۔ بلکہ خیالات بھی اکثر تصنع سے پُر ہیں۔ جن پیچیدہ جذباتِ دلی کے ظاہر کرنے کے لئے یہ ملکہ بعض طبیعتوں میں قدرت نے ودیعت کیا تھا۔ ان کو ہمارے شعرا اکثر دل ہی میں چھپائے چلے گئے ہیں۔ وہ لیلیٰ کی صورت پر طعنے دینے اور مجنوں کے ساتھ وحشت میں مقابلہ کرنے۔ فرہاد کو کم ہمت ٹھہرانے اور شیریں کی بیوفائی کی تشہیر میں اپنی ہمتیں صرف کر گئے ہیں۔ اس سے بڑھ کر تصنع کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ کہ اکثر شعرا کو اس عظیم الشان اور وسیع ملکِ ہندوستان میں کوئی ر‌ےچسپ عاشق و معشوق اہلِ ملک میں سے ایسے تلاش کرنے کا خیال نہیں ہوا جن کی باہمی محبت کے قصوں سے وہ اپنی نظم میں کام لیں۔ وہ اس کثیر الوقوع معاملے میں بھی کتب فارسی کے دستِ نگر رہے۔ جو جو شوق اکثر شعرا نے نظم میں ظاہر کئے

ہیں۔ اُن میں بہت سے اُن کے اصلی شوق نہیں۔ صرف تقلیدی طور پر اُن کے مضامین باندھنے آتے ہیں۔ مثال کے طور پر دیکھئے۔ کہ مہندی کو اس زمانہ میں وہ مقبولیت نہیں رہی۔ جو آج سے چالیس پچاس سال پہلے تھی۔ اُس وقت حسن کی آرائش کے لوازم میں حنا نہایت ضروری تھی۔ اب یہ شادی بیاہ۔ دن دہار میں تو رسماً استعمال ہوتی ہے۔ مگر نئے فیشن میں پسندیدہ چیز نہیں رہی۔ نہ حسین اسے باعثِ زینت سمجھتے ہیں۔ اور نہ دیکھنے والے اس کے رنگ کو کچھ بہت خوش ہو کر دیکھتے ہیں۔ اس پر یہ حال ہے۔ کہ آج کل جو اشعار کے مجموعے چھپتے ہیں۔ جن میں نوجوان شعرا پُرانے رنگ میں طبع آزمائیاں کرتے ہیں۔ اُن کو اُٹھا کر دیکھئے شائد کوئی حنا کی تعریفوں سے خالی ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ ایسی مصنوعی شاعری سے کیا حاصل ہے۔ اگر یہی طبعیتیں جو تقلید کے بندوں میں جکڑی ہوئی ہیں۔ اپنے بل پر اُڑتیں۔ تو دنیا ان کی بلند پروازیاں دیکھ کر حیران ہوتی۔ مگر ابتدا ہی میں کچھ ایسی بنیاد پڑی۔ کہ بناوٹ کے سلسلہ سے رہائی نہیں ہوئی۔ نثر میں بھی آج سے بیس پچیس برس پہلے تک یہی رنگ ہے۔ عبارتیں مقفٰے۔ الفاظ زیادہ خیالات کم خطوط میں القاب لمبے اور مطالب مختصر ضرورت سے زیادہ مبالغہ۔ ضرورت سے زیادہ لجاجت۔ رقعات کے رنگ کو تو پہلے مرزا اسد اللہ خان غالب نے پلٹا۔ اور اردو نثر کی سادگی میں وہ پرکاری دکھائی۔ کہ آج تک کسی سے اس کا جواب نہیں ہو سکا۔ اگر خدا کو یہ منظور ہوتا۔ کہ مرزا غالب بجائے انیسویں صدی کے ابتدا کے اُس کے وسط میں پیدا ہوتے۔ اور اِس وقت تک زندہ رہتے۔ تو نئے زمانہ کی ہوا سے ان کی طبیعت وہ جلوہ دکھاتی۔ کہ اردو نظم مطالب اور معانی کی بلندی کے اعتبار سے ہر زبان کی عمدہ نظم سے مقابلہ کا دعویٰ کر سکتی۔ اور نثر میں وہ جادو ہوتا۔ جسے طبیعتیں آج کل ڈھونڈھتی ہیں۔ اور نہیں پاتیں۔ تاہم جس زمانہ میں مرزا غالب ہوئے۔ اُس کے اعتبار سے جو کچھ وہ نثر کی تجدید میں کر گئے۔ نہایت حیرت انگیز ہے۔ اس کے بعد سر سید احمد خان مرحوم نے اردو نثر میں انگلستان کے سلیس سے سلیس لکھنے والوں کا نقشہ جمایا۔ اور اس طرح سب سے پہلے یہ دکھا دیا۔ کہ کلام بغیر رنگینی کی کوشش کے مؤثر اور پُر زور ہو سکتا ہے۔ اور زبانِ اردو باوجود اپنی نوعمری کے ایسے ایسے دقیق مطالب کے ادا کرنے کی

متحمّل ہے جو کئی اَور زبانیں باوجود پیرانہ سالی کی مشق کے نہیں ادا کر سکیتیں۔ سر سیّد احمد مرحوم کا یہ شوق رفتہ رفتہ اُن کے احباب تک پہنچا۔ اَور اب بہت سے اصحاب سادہ مگر پُر مطلب مضامین لکھنے والے ملک میں پیدا ہوگئے ہیں نظم میں سادگی سب سے پہلے اختیار کرنے کے ثواب کے مستحق مولانا الطاف حسین صاحب حالؔی مرحوم ہیں اور اب شعر میں سادگی۔ اصلیت اور جوش دکھانے والے شعراء ہندوستان میں موجود ہوتے جاتے ہیں۔

بناوٹ کو اپنی قد امت پر ناز ہے۔ اَور ہو سکتا ہے۔ اِس کو اپنے ولدادوں کی تعداد کا گھمنڈ ہے۔ اَور بجا ہے۔ مگر سادگی کو اپنی سچّائی پر بھروسہ ہے اَور درست ہے۔ اَور سب سے بڑی تسلّی اُسے یہ ہے۔ کہ زمانہ کی رفتار اس کے موافق ہے۔

فنِ تقریر

خدا نے انسان کو گویائی عطا کرنے میں تو اپنے لطفِ عمیم کا ثبوت دیا ہی تھا۔ مگر بعض اپنے چیدہ بندوں کو قوّت بیانیہ دے کر موردِ الطافِ خاص بنایا ہے۔ اور قوت بیانیہ کے ذریعہ سے حکمتِ ایزدی نے دنیا میں وہ وہ کام نکالے ہیں جن کے کرنے سے اور قوتیں عاجز تھیں۔ مثلاً تیغ و آتش فاتحانِ دنیا کے ہاتھ میں بڑی طاقتیں رہی ہیں۔ اِن سے انہوں نے سرکشانِ جہاں کو نیچا دکھایا۔ زبانِ تیغ نے بڑے بڑے بدزبانوں کے مُنہ پر مُہرِ سکوت لگائی۔ اور زبانۂ آتش کے بلند ہوتے ہی سب مغروروں کو سرِ غرور جھکاتے ہی بنی۔ مگر یہ تمام فتوحات ہیچ ہیں۔ اُن فتوحات کے سامنے جو مختلف زمانوں میں تیغ زبان کو نصیب ہوئیں۔ زبانِ تیغ کا اثر دو پر چار پر دس پر ہؤا۔ تو تیغ زبان نے دو ہزار چار ہزار دس ہزار کو ایک وقت میں مطیع کیا۔ پہلا اثر اگر محدود عرصہ کے لئے ہؤا۔ تو دوسرا زمانۂ دراز پر حاوی رہا۔ جو فتوحات پیغمبروں کی مبارک زبانوں کی آبدار تلواروں نے دنیا کے مختلف حصّوں اور مختلف زمانوں میں حاصل کی تھیں۔ وہ آج تک قائم ہیں۔ بلکہ دن بدن بڑھتی رہتی ہیں۔ حالانکہ فاتحانِ دہر کے نام و نشان تک رفتہ رفتہ صفحۂ دہر سے محو ہوتے جاتے ہیں۔ اور زمانے کے بیرحم ہاتھوں نے بعض کی دُھندلی نشانیاں تک مٹادی ہیں۔ پیغمبروں اور مذہبی پیشواؤں کی یہ آبدار تلواریں تو نہایت اعلیٰ نمونہ زبان کے معجزات کا ہیں۔ کیونکہ اُن کی چمک خاص نورِ الٰہی سے تھی۔ مگر دنیاداروں میں بھی وہ لوگ جنہیں جوہرِ فصاحت دیا گیا ہے۔ اپنے اپنے عہد میں بہت کچھ کر گئے ہیں۔ اُن کے کام کے اثرات تاحال موجود ہیں۔ اور زمانہ ان کو یاد رکھے گا۔ اور اُن میں جس کسی کے اقوال قلم بند ہو گئے ہیں۔ اُس کے نام کے نہ مٹنے کی تو گویا ضمانت موجود ہے۔ جب تک دنیا میں علم ہے۔ اور علم کے شوقین

لوگوں میں پائے جاتے ہیں جب تک مطالعہ مفید سمجھا جاتا ہے۔ اور زباندانی مطالعہ کے لئے ضروری مدد تصور کی جاتی ہے۔ جب تک لوگوں میں زبان کی خوبیوں کا مذاق ہے۔ اور یہ مذاق قابلِ قدر شمار ہوتا ہے۔ اُس وقت تک لوگ ان شیریں سخنوں کا کلام پڑھنے سے سیر نہ ہوں گے۔ نسلیں گذرتی جائیں گی۔ مگر اس شوق میں کمی نہ آئے گی۔

یوں تو ہر زبان میں مادہ فصاحت ہے۔ اور ہر زبان کو فصاحت سے بولنے والے گذرے ہیں۔ مگر ایشیائی زبانوں میں یہ قوت بالطبع دوسری زبانوں سے بڑھ کر ہے۔ اور ایشیائی طبیعتوں میں اس قوت کے بڑھانے کی قابلیت قدرتی طور پر بہت ہے مگر تعجب کی بات ہے کہ فصاحت بہ حیثیت فن ایشیا میں ایک عرصہ سے متروک ہے۔ اور اہلِ فرنگ نے اس فن کو صدیوں کی مشق سے اوجِ کمال پر پہنچا دیا ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ عرب و عجم میں فصحا نہیں گذرے۔ یا اس وقت بالکل معدوم ہیں۔ یا ہندوستان میں پُرتاثیر واعظ و خطیب نہیں ہوئے۔ یا اب نہیں ہیں۔ مگر تعداد وُہ نہیں جو ممکن تھی۔ باجوان ممالک سے بہت کم رقبہ کے ممالک اہلِ فرنگ میں ہے۔ نیز یہ کہ فرنگستان میں تو فصحا کے طبقے میں اکثر ایسے اصحاب ہیں جن کی قابلیت عطایائے قدرت اور باقاعدہ مشقِ فن کی مناسب ترکیب کا نتیجہ ہے۔ اور یہاں جو کوئی خال خال خوش بیان آدمی پایا بھی جاتا ہے اس کی مثال سبزۂ خودرو کی مثال ہے۔ قدرت نے کہیں جوہرِ فصاحت طبیعت میں رکھ دیا۔ یا زبان میں تاثیر بخشدی۔ اور اتفاقیہ کسی تقریب سے تقریر کا موقعہ بھی پڑ گیا جس سے جوہردار کو خود اپنے جوہر کا علم ہو گیا۔ تو یہاں کیلئے فصاحت کے مردِ میدان بن گئے۔ اب دیکھتے ہیں۔ تو مشق کا موقعہ بہت کم کہیں برس چھ مہینے میں ایک دفعہ کوئی بڑا مجمع تقریر کے لئے مل جائے۔ تو وہی تختۂ مشق ہے۔ اور وہی تقریبِ اظہارِ فن۔ دس بیس جلسوں میں بولنے کا اتفاق ہو گیا۔ تو پختہ کار سمجھے جانے لگے۔ برعکس اس کے مغربی دنیا میں اوّل تو والدین یا اُستاد بچوں کی طبیعت کا موازنہ کر کے اگر ان کی مناسبت گویائی کی طرف دیکھیں۔ تو انہیں مدرسہ ہی میں مشق کے موقعے دینے لگتے ہیں۔ اور بعد تحصیلِ علم ایسے کاموں میں لگاتے ہیں۔

جہاں گویائی کی مشق ہوتی رہے۔ اس منزل پر پہنچکر اگر اُنہیں شوق ہوتا ہے۔ تو فنِ تقریر پر ضخیم کتابیں موجود ہیں۔ جن کا وہ مطالعہ کر سکتے ہیں۔ مدرسے اس فن کے لئے مخصوص ہیں۔ جہاں اس فن کے ابتدائی مرحلے آسانی سے طے ہو سکتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر ملک کے لٹریچر میں ایک بہت بڑا ذخیرہ فصحا کے لکچروں اَور خطبوں کا موجود ہے۔ جن پر عبور طالبِ فن کے لئے اکسیر ہے۔ ان مدارج کو طے کرنے کے بعد عدالتیں۔ کونسلیں اور پارلیمنٹیں ایک سے ایک اچھا ذریعہ قوّتِ تقریر کے مانجھنے کا ہیں۔ اور ایک ان پر کیا منحصر ہے۔ پبلک جلسے اس کثرت سے ہوتے ہیں۔ اور ان میں اہلِ علم اس ذوق شوق سے آتے ہیں۔ اور ذرا ذرا سی خُوبی کی اس زور سے داد دیتے ہیں۔ کہ الکن بھی کلیم بن جائے۔ تو تعجب نہیں ہونا چاہیئے۔ قدیم روما کے ایک مشہور فصیح کا قول ہے۔ کہ "فصاحت آزادی کا ایک بہترین ثمر ہے"۔ یہ وہ درخت ہے جو اسی سرزمین میں جڑ پکڑتا ہے جس پر آزادی کی حکومت ہو۔ اور جیسے آزادی ہی کی آب و ہوا راس ہے"۔ ایک حد تک تو مغربی دنیا اور مشرقی دنیا کی فنِ تقریر کے متعلق ترقی کے نمایاں فرق کی وجہ اس قول سے سمجھ میں آتی ہے۔ یعنی مغربی ممالک کی ترقی فنِ فصاحت میں اُن ممالک کی آزادی کے مطابق ہے۔ اَور یہاں کی ترقی یہاں کی آزادی کے تناسب سے ہے۔ اس انگریزی حکومت میں جو ہمیں آزادی کی نعمت نسبتاً زیادہ حاصل ہوئی ہے تو ہندوستان میں مجالس کے چرچے شروع ہوئے ہیں۔ لکچروں کی ضرورت پیدا ہوئی ہے۔ اَور فصیح اور جوش بیان خطیبوں کی مانگ ہے۔ اور جوں جوں ہمارے ملکی حقوق وسیع ہوتے جائیں گے۔ فنِ تقریر میں ترقی ہوتی جائے گی۔ مگر چونکہ وسعتِ حقوق اپنے قابو کی چیز نہیں۔ اس لئے کسی ایسے وسیلۂ ترقی کا ذکر کرنا چاہیئے۔ جو اہلِ ملک کے اختیار میں ہو۔ اور وہ قدر دانیٔ اہلِ فن ہے۔ یورپ میں قدردانی کی یہ نوبت ہے۔ کہ مشہور آدمیوں کے ایک ایک لکچر کے لئے پانچ پانچ ہزار روپیہ اور دس دس ہزار روپیہ دینے کو لوگ تیار ہیں۔ وہ لکچر کا ٹھیکہ لے لیتے ہیں۔ اور ٹکٹ لگا دیتے ہیں۔ پھر سامعین اس کثرت سے جاتے ہیں۔ کہ ٹھیکہ داروں کو بھی نفع ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاں ابھی قدردانی

نام کو بھی نہیں۔ مفت لیکچر سننے والے بھی پانچ دس ہزار آدمی ہر جگہ دستیاب نہیں ہوتے اہلِ ملک کو ناقدر دان ٹھہراتے ہوئے یہ بھی اعتراف کرنا ضروری ہے۔ کہ یہاں کے مقرر جو کچھ بھی ہیں۔ تقریر کی ذمہ داری کو اس حد تک محسوس نہیں کرتے۔ جو مقرّرانِ یورپ کا خاصہ ہے۔ وہاں مشہور لیکچرار بھی خاصی تیاری کے بغیر پبلک کے رُوبرو نہیں آتے۔ بعض تو مہینوں پہلے تقریر کو قلم بند کرتے ہیں۔ پھر اس کو پچاس بار یا سو بار پڑھ کر حفظ کرتے ہیں۔ اس کے بعد چند راز دار احباب کے رُوبرو پڑھ کر اُن سے کہتے ہیں۔ کہ اگر کوئی نقص طرزِ ادا یا حرکات میں ہو۔ تو اُنھیں بتا دیں۔ یا آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر حرکات اور طرزِ ادا کی مناسبت کو دیکھتے ہیں۔ اور پھر سامعین کے کانوں تک اپنا پیغام پہنچاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ تماشائیوں کو محوِ حیرت کر دیتے۔ دلوں کو موم بنا لیتے۔ اور سامعین سے جو کچھ مانگ بیٹھیں لے کر ہٹتے ہیں۔ کاش! ہمارے ملک میں بھی اس ضروری اور قابلِ قدر فن کو فن سمجھ کر اختیار کرنے والے لوگ پیدا ہو جائیں۔ اور قومی مفید کاموں کے واسطے ترغیب و تحریص کے لیے کار آمد ہوں۔ ایک برقی طاقت ان کے ذریعہ سے اہلِ ملک کے دلوں پر اپنا اثر ڈال دے اور جن جن باتوں کے لیے کام کرنے والوں کو مستعد کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی وسیلہ سے آمادہ کئے جائیں ❖

مُرقّعِ عبرت

خدا جانے لکھنؤ کے سیر کرنے والوں میں کتنے اصحاب ایسے ہیں۔ جنھوں نے شاہانِ اودھ کی قدِ آدم تصویروں کے اُس مجموعہ کو غور سے دیکھا ہے۔ جو حسین آباد امام باڑہ کے قریب ایک بارہ دری میں حفاظت سے رکھی ہوئی ہیں۔ اگر کوئی صاحب نظرِ غور سے اُن دس تصویروں کو جو اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ دیکھ چکے ہیں۔ تو وہ یقیناً ہم سے متفق ہوں گے۔ کہ یہ تصویروں کا مجموعہ نہیں۔ بلکہ ایک مُرقّعِ عبرت ہے۔ شاہانِ اودھ کی آزادانہ اور خودمختار حکومت کوئی سَو سَوا سَو برس کے قریب ہی اور دیکھنے والے کے لیئے ان دس تصویروں میں سو سال کی تاریخ موجود ہے۔ تصویروں کے نیچے سوائے فرمانروایانِ اودھ کے اسماء تاریخِ جلوس اور زمانۂ حکمرانی کے اور کچھ نہیں لکھا۔ مگر تصویریں زبانِ حال سے اپنے زمانہ کا قصّہ یکساں فصاحت سنا رہی ہیں۔ بشرطیکہ کوئی اُن کی بولی سمجھے۔ تصویروں کی بولی سمجھنے کا رواج اب بہت بڑھتا جاتا ہے۔ اور مغربی دنیا میں تو کوئی کتاب خواہ "تاریخ" کی ہو۔ خواہ قصّہ کہانی کی۔ خواہ سوانح عمری ہو۔ خواہ لغت۔ مکمل نہیں سمجھی جاتی۔ جب تک اُس کے متن کے ساتھ تصویروں کا حاشیہ نہ ہو۔ تصویر کی شرح بہت سے شرح سے اچھا کام دے جاتی ہے۔ وہاں تو یہ شوق اس قدر بڑھتا جاتا ہے۔ اور تصویر کو ذریعہ تعلیم سمجھنا تجربہ کار افسرانِ تعلیم نے یہاں تک تسلیم کر لیا ہے۔ کہ بعض لوگ کہتے ہیں "کوئی دن کو کتابیں محض تصویروں کا مجموعہ ہوا کریں گی۔ عبارت کی ضرورت ہی نہ رہے گی"۔ چنانچہ ایک مشہور فرانسیسی مصنّف نے جس کی نامی کتاب کو مولوی سید علی صاحب بلگرامی جیسے فاضل نے زبانِ اُردو میں ترجمہ کرکے ہندوستان کے اُردو خوان طبقہ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اپنی تصنیف "تمدّنِ عرب" کے دیباچہ میں تصویروں

سے سبق لینے کے مذاق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہی بات لکھی ہے ۔ کہ اصل میں وہ کئی سو تصویریں جو کتاب میں جمع ہیں ۔ تواریخ تمدّن عرب کے نقشے آنکھوں کے رُو برو پھرا دینے کے لیے کافی ہیں ۔ اور جو کچھ اُس میں عبارت بڑھائی گئی ۔ وہ فقط توضیح کا کام دیتی ہے مگر شاید وقت آجائے ۔ کہ صرف تصویروں سے ایسا مطلب نکلے ۔ اور توضیح کی ضرورت ہی نہ رہے اور تو اور مغرب کے معاملاتِ ملکی میں تصویریں اور خصوصاً وہ تصویریں جنھیں کارٹون کہتے ہیں ۔ بہت کام دیتی ہیں ۔ ہمارے ہاں ابھی تصویروں کا بہت رواج نہیں ۔ اور اسی لیے تصویروں کو سبق حاصل کرنے کی غرض سے بہت کم دیکھتے ہیں ۔ مگر شاہانِ اودھ کی یہ دس تصویریں ۔ کچھ ایسی ترتیب سے رکھی گئی ہیں ۔ کہ معمولی سے معمولی طاقتِ مشاہدہ رکھنے والا آدمی بھی یہ دیکھ کر پھڑک جاتا ہے ۔ کہ نواب سعادت جاہ مرحوم کی صورت شکل ۔ لباس اور عادت میں رجحان تک عادت قیافہ سے معلوم ہو سکتی ہے ، اور اُن کے دسویں جانشین واجد علی شاہ مرحوم کی شکل اور وضع میں کیسا زمین آسمان کا تفاوت ہے ۔ تصویر میں بھی نواب سعادت جاہ کے چہرہ سے شجاعت ۔ جفاکشی ۔ عزم بالجزم اور مردانگی کا پتہ چلتا ہے ۔ پیشانی پُر چین کیا کہتی ہے ۔ کمر میں خنجر کیا کہہ رہا ہے ۔ لمبی عبا سے کیا شوکت ٹپکتی ہے ۔ غرض ساری ہیئت اور وضع سپاہیانہ ہے ۔ اور اس رُعب اور جلال کی تصویر پر نظر ڈالنے کے بعد اگر اچانک دوسرے کونے پر اس صورت کو دیکھیں جس پر اس آغاز کا انجام ہوا ۔ اور وہ واجد علی شاہ مرحوم کی شبیہہ ملاحظہ کریں ۔ تو زُلفوں کے لامِ نستعلیق ۔ کمر تک لٹکے ہوئے بال ۔ باریک کپڑے کا انگرکھا جس سے بدن چھن چھن کر نظر آتا ہے ۔ سب مل ملا کر آدمی کو گھبراہٹ میں ڈالتے ہیں کہ ۱۷۹۸ء میں لکھنؤ کے تخت پر وہ جری تھا ۔ اور کچھ اوپر سو سال بعد ۱۸۵۶ء میں یہ لباسِ زنانہ کے مشتاق اور عاداتِ زنانہ کے پابند اُسی مسند پر جلوہ افروز ہیں ۔ ۱۸۵۶ء میں تو شاہانِ اودھ کے اس سب سے آخری بادشاہ کی حکومت ہی اودھ سے اُٹھ گئی ۔ اس کے بعد تو جس طرح اس نے دن گزارے ۔ خیر گزارے ہی سہی ۔ مگر اس تصویر کو دیکھ کر اور اُن کے حالات کا خیال کر کے جو وہ تصویر بیان کر رہی ہے ۔

کیا کسی کے دل میں تعجب ہو سکتا ہے۔ کہ شاہانِ اودھ کے تاج کے جواہر اُن سے چھن کر زینتِ تاجِ قیصری کیوں جا بنے۔ اور اودھ کا حاصل خیز علاقہ سلطنتِ انگریزی کے جاہ و مال کی افزائش کا باعث کیونکر ہوا؟

سچ یہ ہے۔ کہ جب سعادت جاہ کے جانشینوں میں سے کئی ایسے نکلے۔ جو اس وضع کے پابند نہ رہے جو اس کامیابی کا راز تھی۔ اور اس سے الگ ہو کر چلنے لگے۔ تو زمانہ نے اُن کی مساعدت نہ کی۔ اور خاندان زور پکڑتے ہی بیٹھ چلا۔ اور اُبھرتے ہی ڈوبنے کے آثار پیدا ہونے لگ گئے۔ پہلے تین چار پشت تک تو خوب نبھتی گئی۔ سعادت جاہ کے جانشین تھے۔ نواب صفدر علی خان صفدر جنگ جنہوں نے ۱۷۳۹ء سے ۱۷۵۴ء تک حکومت کی۔ اُن کے بعد نواب شجاع الدولہ ابو المنصور خان صفدر جنگ نے ۱۷۷۵ء تک فرمانروائی کی۔ ۱۷۷۵ء سے ۱۷۹۷ء تک نواب آصف الدولہ ہزبر جنگ نے دادِ حکمرانی دی۔ اس والیٔ ملک کے زمانہ میں اودھ پر ایک خاص رنگ تھا۔ آصف الدولہ کئی اعتبار سے خاندان بھر میں نامور بادشاہ گزرا ہے۔ اور لکھنؤ کا سب سے بڑا اور عالی شان امام باڑہ جس کی صناعی کے بعض حصے دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس کے عہدِ سلطنت کی یادگار ہے۔ اس کے قیافہ سے بھی وہ تمام اوصاف جو اس میں موجود تھے۔ مترشح ہو رہے ہیں۔ مگر جس جس کے قیافہ میں آرام طلبی اور عیش پسندی کا پتہ چلتا ہے۔ اس کا زمانۂ حکومت بھی اس کے حالات کے مطابق ہی کامیاب پایا جاتا ہے۔ نشست کا انداز ہی بدلتا جاتا ہے۔ جوتے تک کی وضع میں نمایاں تبدیلی ہوتی جاتی ہے۔ لباس ایسا آتا جاتا ہے جس سے سپہ گری کا کوئی واسطہ ہی نہیں۔ درمیان میں پھر ایک دو کام کے آدمی آتے ہیں۔ اور آخر واجد علی شاہ کے وقت میں خود آرائی حد کو پہنچ جاتی ہے ۱۷۹۸ء میں سعادت علی خاں صاحب تشریف لاتے ہیں۔ غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر بھی اپنا سکہ جما جاتے ہیں ۱۸۱۴ء سے ۱۸۲۷ء تک پہلے کی اور ۱۸۲۷ء سے ۱۸۳۷ء تک دوسرے کی حکومت ہوئی محمد علی شاہ صاحب ۱۸۳۷ء اور امجد علی شاہ ۱۸۴۷ء تک سلطنت کر کے چل دیئے۔ مگر یہ ناؤ جس کے ڈوبنے کے آثار ابتدا ہی میں پیدا ہو گئے تھے کئی دفعہ ڈوبتی ڈوبتی بچ کر واجد علی شاہ کے عہد میں آخر کو بیٹھ گئی۔ اور ایسی بیٹھی کہ پھر نہ اُبھری بس ؎ آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم - ہو گئے خاک انتہا ہے یہ؟

مجالسِ تفریح

اہلِ یورپ کی موجودہ تمدنی ترقی کے اجزا میں ایک جزو اُن کی تفریحی مجالس ہیں۔ جن کو انگریزی میں کلبز کہتے ہیں۔ آج ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ کہ اُن کا کیا اثر یورپ پر ہوا۔ اور ہندوستان میں ان مجالس کی ضرورت ہے یا نہیں؟

یورپ کی پوچھو۔ تو وہاں آج سے نہیں۔ صدیوں سے جب وہ موجودہ معراجِ ترقی پر بھی نہیں پہنچا تھا۔ بلکہ اکثر امور میں ایشیا کے قدیم تمدنوں کا دستِ نگر اور محتاج تھا۔ اتنا رواج تو ضرور چلا آتا ہے۔ کہ وہاں کے لوگ مل جُل بیٹھنے کی بے حد قدر کرتے ہیں۔ اور ایسے مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ جن میں بہت سے ہم قوم باہم ملت یا ہم خیال آدمیوں کے جمع ہونے کی صورت نکل آئے۔ وہ اس گُر کو شروع ہی میں جان گئے تھے۔ کہ ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں۔ اور ہر قسم کے کام بجائے شخصی کوششوں کے اگر قوم یا حصۂ قوم کی مجموعی ہمت سے ہوں تو زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔ یہی اصول اُن تمام امور میں جن پر آج یورپ کو ناز ہے نظر آتا ہے۔ ملک داری کے کاموں سے لے کر معمولی روزمرہ ضروریاتِ قومی تک سب میں اسی کا پرتو ہے۔ یہ جمہوری سلطنت کی خوبیوں کی طرف جو آج کل تمام دنیا کی تعلیم یافتہ طبائع جُھکی پڑتی ہیں۔ یہ یورپ اپنی منصوبہ یا لیمنٹوں اور کونسلوں پر جو فخر کرتا ہے۔ ہندوستان کی اقوام میں سے وہ حصہ جو سب سے زیادہ نئی روشنی سے مستفید ہوا ہے۔ ہندوستان کی ترقی کے واسطے ہندوستانی کونسل اور پارلیمنٹ کی خواہش کرتا ہے۔ یہ صرف اسی پُرانے اصول کی خوبیوں کا بے ساختہ اقرار ہے یعنی یہ کہ ایک بادشاہ خواہ وہ کیسا ہی بیدار مغز اور فہمیدہ ہو۔ مصالحِ مُلکی پر غور کرنے کے لیے ہرگز تنہا ایسا مُفید

نہیں ہو سکتا۔ جیسے ایک مجمع جس میں رعایا کے لائق ترین اشخاص شامل ہوں۔ اور سب کے سب
اپنی دماغی طاقت کو اس کے ساتھ مل کر خرچ کریں۔ اس اصول پر ابتدائے اسلام میں مسلمانوں
نے عمل کر کے دکھایا۔ اور اس سے نمایاں نتائج پیدا کیے۔ مگر افسوس کہ اب وہ ایسی حالت میں
ہیں۔ کہ انھیں وہی باتیں دُور سے دوسروں کے پاس نہایت عجیب اور نئی معلوم ہوتی ہیں۔
ملک داری کو چھوڑ کر تجارت کی طرف آئیے۔ جس میں یورپ کی تمام دولت و ثروت کا راز نہاں
ہے۔ یہی اصول مُدّت سے وہاں کی تجارت کا رہنما ہے۔ گو ایسے اشخاص وہاں موجود تھے جس میں ہر فرد
لاکھوں اور کروڑوں روپیہ کا بیوپار کر سکتا تھا۔ مگر انھوں نے یہی مناسب سمجھا۔ کہ بیوپار مل جُل کر کیا
جائے۔ چنانچہ بیوپار میں عام شراکت کا رواج ہو گیا۔ اہل یورپ کے وہ تجارتی جہاز جو آج نئی اور پُرانی
دنیا کو احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ جن کے بہانہ سے اہل یورپ دُنیا کے ہر حصے میں جا گھُستے ہیں۔ جن
کے ذریعہ سے وہ آخر کش جابجا حکومت حاصل کر رہے ہیں۔ جن کے ذریعہ سے دنیا کے مختلف حصّوں
کے مال و اسباب اور نعمتیں فرنگستان کے اُمرا کے جاہ و تمکنت۔ عیش و آرام اور زینت و آرائش کی
باعث ہو رہی ہیں۔ اُن میں سے اکثر اس قدر صرف سے تیار ہوئے ہیں۔ اور یہ تمام بیوپار اس قدر
روپیہ چاہتا ہے۔ کہ اگر تمام قوم کی مجموعی طاقت نہ ہوتی۔ تو ان باتوں کا عشر عشیر بھی حاصل نہ ہو
سکتا۔ خواہ خاص خاص آدمی آپ سے کبھی زیادہ دولتمند ہوتے ایک آدمی کروڑ دو کروڑ تک کا بیوپار کریگا۔
یورپ کی جائنٹ سٹاک[1] کمپنیاں کروڑہا اور ارب ہا روپیہ کی تجارت کرتی ہیں۔ کمپنیاں ملک گیری کرتی ہیں
کمپنیاں مُلک داری کرتی ہیں۔ اور جہاں جہاں انسان کی رسائی ہے وہاں پہنچ کر ایسی سرزمینوں اپنی سلطنتوں کا
جھنڈا اٹھاتی ہیں۔ جن میں آج تک کوئی علم بھی بلند نہیں ہُوا تھا۔ ہندستان کی ضروریات گو سب
سے زیادہ مقتضی اس امر کی ہیں۔ کہ یہاں جائنٹ سٹاک کمپنیاں بکثرت پیدا ہو جائیں۔ لیکن
ہندستانی ابھی اس امر کی طرف متوجہ ہی نہیں۔ غرض یہ کہ یورپ کی یونیورسٹیاں۔ وہاں کے
بعض فرقوں کے گرجے۔ وہاں کے مشن۔ وہاں کے ابتدائی مدارس اور ہر طرح کے قومی اور مُلکی کام

[1] مشترکہ سرمایہ والی ۱۲

کسی ایک شخص یا دو تین شخصوں کی سعی یا صرف پر منحصر نہیں ہیں۔ نہ سلطنت کے محتاج ہیں۔ بلکہ قومی انجمنوں اور مجالس کے ماتحت ہیں۔ اور اُنھی سے مدد پاتے ہیں۔ غنیمت ہے۔ کہ اس معاملہ میں ہندوستان میں بھی کچھ اسی طرح کے انتظام کی صورت ہونے کی ابتدا ہو گئی ہے۔ لیکن ہماری انجمنوں اور مجالس کے واسطے ابھی بہت سے مرحلے طے کرنے باقی ہیں۔ پیشتر اس کے کہ وہ اس قدر کام کر سکیں جتنا دیسی مجالس فرنگستان میں کر رہی ہیں۔ یہ تمام اقسام جو یورپ میں میل ملاپ کے رواج کی پیدا ہوئی ہیں یہ سب کسی خاص مقصود اور کام کی غرض سے ہیں۔ لیکن وہاں ایک اور رسم میل جول کی ہے۔ جو ہمارے ہاں تقریباً مفقود ہے۔ وہ محض اتحاد اور تفریح کی غرض سے جمع ہونا ہے۔ یہ بھی وہاں کوئی تازہ رسم نہیں۔ بلکہ مدتوں سے چلی آتی ہے۔ اور یہ تقاضائے فطرتِ انسانی بھی ہے۔ کہ کوئی ایسی رسم ہر ملک میں ہو۔ انسان بالطبع مدنی یعنی سوسائٹی پسند واقع ہوا ہے۔ جب تک یہ وحشی ہے۔ اُس وقت تک تو مثل حیوانوں کے دوسرے انسان سے بھاگتا ہے۔ لیکن وحشی انسانوں میں بھی اپنے ہم جنسوں سے ملنے کی رغبت بہ نسبت حیوانات کے بدرجہا زیادہ پائی جاتی ہے۔ مگر جہاں اُسے تمدن کی ذرا سی بھی چاٹ لگی۔ پھر تو یہ ہم صحبتوں کے بغیر جی ہی نہیں سکتا۔ تنہائی وبالِ جان ہو جاتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ تمام شائستہ دنیا میں قیدِ تنہائی سزاؤں میں سخت ترین شمار کی جاتی ہے۔

ہندوستان میں انسان تقاضائے فطرت مل بیٹھنے پر ایسے ہی مجبور ہیں۔ جیسا انگلستان یا فرانس جرمنی میں فرق صرف اتنا ہے۔ کہ یہاں کا مل بیٹھنا یہاں کی تمدنی حالت کے درجہ کے موافق ہے۔ اور وہاں کا جمع ہونا وہاں کی ترقی کے مطابق۔ آپ ہندوستان کے کسی گاؤں میں شام کے قریب جائیں۔ جب کسان دن بھر کی محنت سے تھکے ماندے آ کر کسی کوچہ کے موڑ پر یا کسی گاؤں کے پاس کے میدان میں حقہ کے گرد حلقہ باندھے ہوئے ہوں۔ اور حقہ ایک سے دوسرے کی طرف گردش کر رہا ہو یہ کیا ہے؟ ایک کلب لیکن ساتھ ہی نہایت کم خرچ اور ہندوستان کی حالت کا سچا نقشہ۔ اسی کے مقابل میں ذرا اپنی عنانِ خیال کو یورپ کی طرف دوڑائیے۔ اور

انگلستان کے کسی گاؤں کے اسی طبقے کے لوگوں کے کسی مجمع کی تلاش کیجئے۔ تو آپ دیکھیں گے کہ ایک مختصر سا مکان ہوگا۔ اُس میں گو کسی قدر بھدی مگر خاص آرام دینے والی کرسیاں ہوں گی۔ جو ایک میز کے گرد قرینے سے سجی ہوئی ہوں گی۔ میز پر کچھ چرٹ پڑے ہوں گے۔ اور ہر شخص اپنا اپنا چرٹ پی رہا ہوگا۔ خاموشی کا شید اچپ چاپ بیٹھا ہوگا۔ اور باتوں کا مشتاق اپنی بذلہ سنجی سے دوسرے کے دلوں کو لبھا رہا ہوگا۔ ایک خدمت گار ہوگا۔ جو ادب سے ایک طرف کھڑا ہوگا۔ اور جس چیز کی اہل بزم میں سے کسی کو ضرورت ہوگی۔ مہیا کرے گا۔ گو دن بھر حاضرین میں سے ہر شخص مزدور یا کاشتکار تھا۔ اور گو گھر میں جا کر اُن کو خدمتگار میسر نہ ہو۔ مگر کم از کم اس تھوڑے عرصہ کے لیے ہر شخص اُس پُر آسائش مکان کو اپنا مکان اور اُس خدمتگار کو اپنا خدمتگار سمجھنے سے ایک قسم کی راحت پائے گا۔ اور دن بھر کی تکان دور کر کے گھر کو لوٹ جائے گا۔ جاڑوں میں اگر آپ کسی ہندوستانی دیہاتی کلب کو ملاحظہ کرنا چاہیں۔ تو آپ اہل دِہ کا اچھا معقول مجمع کسی تکیہ میں یا شودوارہ میں یا پٹوار خانے میں غرض ایسی جگہ میں جس کو سب کی جگہ کہہ سکیں۔ اور کسی خاص شخص کا مکان نہ ہو۔ پائیں گے۔ وہ بطور حلقہ باندھے ہوں گے۔ اور درمیان میں آگ جل رہی ہوگی۔ جس کے لیے لکڑیاں وغیرہ بہم پہنچانے میں ہر کسی نے تھوڑی بہت مدد دی ہوگی۔ سب کے سب آگ تاپ رہے ہوں گے۔ کبھی ہاتھ لمبے کر کے آگ کے قریب لے جائیں گے۔ کبھی اُن کو مل کر پھر چادریں لپیٹ لیں گے۔ جو چادریں کہ پہلے دو شالہ یا اوورکوٹ کی قائم مقام ہوتی ہے۔ ذرا بھی آگ بجھنے لگے۔ تو ہر شخص اپنی اپنی طرف اور تھوڑا سا ایندھن ڈالتا جائے گا۔ ساتھ ساتھ باتیں ہوتی جائیں گی۔ اگر آپ اپنے ذہن کو لمحہ بھر کے لیے ہی مُلکِ انگلستان کے موسم سرما میں کسی چھوٹے قصبہ کی طرف منتقل کریں۔ تو آپ دیکھیں گے۔ کہ کمرہ میں دو تین انگیٹھیاں دہک رہی ہیں۔ جو شخص زیادہ آگ کے قریب بیٹھنا پسند کرتا ہے۔ وہ اپنی کرسی انگیٹھی کے پاس کھینچ لیتا ہے۔ دوسرا کمرہ کی بڑھی ہوئی حرارت ہی پر اکتفا کرتا ہے۔ کوئی اخبار پڑھ رہا ہے۔ کوئی چاء یا قہوہ پی کر اپنے تئیں گرم کر رہا ہے۔ اور جو شراب پینے والے ہیں۔ وہ ساغر سے اپنے تئیں گرما رہے ہیں۔ گو ہم انگلستان کے اس مجمع کے ان لوگوں

کو جو شراب پینے والے ہیں۔ اپنے اِن غریب دیہاتی بھائیوں سے خوش قسمت نہیں کہہ سکتے۔ مگر باقی سب باتوں میں وہ بلاشبہ قابلِ رشک حالت میں ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

لیکن اس سارے معاملہ میں جو قابل غور امر ہے۔ وہ یہ ہے کہ یورپ کے دیہات کے کچھ نمونے تو ہندوستان کے دیہات میں موجود ہیں۔ گو بہت کم درجہ کے ہیں لیکن یہاں کے شہروں میں ان مجالس کا جو وہاں کے شہروں کی رونق ہیں۔ نشان بھی نہیں۔ وہاں کے شہروں کی مجالس اس عروج پر ہیں۔ کہ عقل دنگ ہوتی ہے اور بارہا مفید نتائج کا باعث ہوتی ہیں۔ سامان اور زینت اور آرائش کی تو کچھ نہ پوچھئے۔ وہ تو یورپ کے تموّل پہ شاہد ہیں۔ اور ہندوستان میں ابھی نہ ان کی تقلید ممکن ہے۔ نہ ان کی تقلید مفید۔ مگر ان کے کاموں کو تو دیکھئے۔ ہزاروں ایسے لوگ جو غم غلط کرنے یا دل لگی کی تلاش میں گمراہ ہو جاتے۔ اور ایسی عادات عامیانہ صحبتوں میں بیٹھکر سیکھ لیتے۔ جو اُن کی زندگی کی تلخی کا باعث ہوتیں۔ اور اُس کو خراب کر دیتیں۔ عمدہ قسم کی سوشل مجالس کے ذریعہ سے اُن تمام خطرات سے بچ جاتے ہیں۔ اور سوسائٹی اور قوم کے لئے مفید اور کار آمد ثابت ہوتے ہیں۔ دل بہلانے کے سامان تو وہاں مختلف ہیں سکے علاوہ انواع و اقسام کے کھیلوں کے جو محض تفریح کا کام دیتے ہیں۔ ان میں سے اکثر جلسوں میں ایسے مشاغل بھی ہیں۔ جو بیک کرشمہ دو کار کا حکم رکھیں۔ یعنے دل بھی بہل جاتا ہے۔ اور علمی یا عملی فوائد بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً عمر خیام کلب کو لیجئے۔ جو لوگ اخبارات دیکھتے رہتے ہیں۔ انہوں نے تو بالخصوص اس کی لمبی لمبی رپورٹیں بھی دیکھی ہوں گی۔ اس کا آغاز چند ایسے علم دوست انگریزوں سے ہُوا۔ جو فارسی زباندانی کے شوقین تھے۔ اور فارسی شعرا میں "عمر خیام" کی مشہور رباعیات کو پسند کرتے تھے۔ معمولی انگریزی کتابیں پڑھنے اور روزمرہ کے کام کے بعد انہیں عمر خیام کی رباعیات میں ایک جدت ملتی تھی۔ جو فرحت بخش تھی۔ اور جو اُن کے تھکے ہوئے دماغوں کو بہت کچھ آرام دیتی تھی۔ لیکن فرق یہ ہو گیا۔ کہ آگے تو ان میں سے ہر شخص اپنے اپنے گھر میں بیٹھ کے دل خوش کر لیتا تھا۔ اور ڈرتا تھا۔ کہ بعض اُس کے ہم قوم اُسے کسی قدر مجنون سمجھیں گے۔ کہ ایک ایرانی شاعر کو خوبیوں کا پتلا سمجھتا ہے۔ اور اب اس طرح ایک مجلس کے ذریعہ سے انہوں نے یہاں تک کامیابی حاصل کر لی۔ کہ اور سینکڑوں بلکہ ہزاروں

کو اپنا ہم خیال بنا لیا۔ جو اُن سے بھی بڑھ کر عمر خیام کے کلام کے دلدادہ ہو گئے۔ اور بانیانِ کلب بفخر سے یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ ایسے وہی نہیں۔ جو عمر خیام کی قدر کریں۔ بلکہ عمر خیام فی الواقع قدر کے قابل ہے ؎

نہ من بر آں گُل عارض غزل سرائم و بس
کہ عندلیب تو از ہر طرف ہزار انند

اس کا اثر علمی ترقی اور شوق زباندانی پر جو کچھ پڑنا چاہئے۔ محتاج بیان نہیں۔ لیکن ویسے بھی انہوں نے اپنے ملک کے لئے کیسا اچھا نام پیدا کر لیا۔ کہ دنیا بھر میں یہ چرچا ہے۔ کہ انگریزوں میں ایسے ایسے علم دوست موجود ہیں۔ جو اپنی زبان کی عمدہ تصانیف کے بھی مستقل قیام کے ممد و معاون ہیں۔ اگر اہل ہندوستان اور خصوصاً انگریزی خواں صاحبان میں فدا بھی دوسری قوموں کے ساتھ قدم بقدم ترقی کرنے کا خیال ہوتا۔ تو آج اس ملک میں کم از کم پانچ سات جگہ انگریزی خوانوں کی ایسی مجالس ہوتیں۔ جو انگلستان کے بہترین شعرا کے مطالعہ کو اپنا خاص کام ٹھہراتیں۔ اور جیسا انگریزوں نے عمر خیام کے ترجموں سے اپنے اہلِ مُلک کو مستفید کیا۔ وہ شکسپیئر اور ملٹن کی نازک خیالیاں اپنے ویسی بھائیوں تک پہنچاتیں۔ مگر یہ تو دور کی باتیں ہیں۔ یہاں کی ہمت کا تو یہ حال ہے۔ کہ ہمارے ہاں کے وہ علوم اور مصنفین جن کی خوبیاں مُسلّم ہیں۔ مٹتے چلے جاتے ہیں۔ دوسری اقوام خود بخود اپنی کوششوں سے ان خوبیوں کو دریافت کرتی۔ اور ان کا اعتراف کرتی ہیں۔ مگر یہاں کسی کو ہمت نہیں۔ کہ شکسپیئر کلب نہ سہی۔ ایک سعدی کلب تو بنا دے۔ ایک وقت تھا۔ کہ سعدی شیرازی علیہ الرحمۃ کی بے نظیر تصانیف رُوم سے لیکر ہندوستان تک ایشیائی ممالک میں جہاں مسلمانوں کو کچھ بھی دخل رہا ہو۔ بکثرت متداول تھیں۔ بچے اُن سے اخلاق اور نصائح کے سبق شروع کرتے تھے۔ اور بوڑھے اُن ہی سے تمام اُمور دنیاوی اور معاملات ملکی کے لئے ہدایات حاصل کرتے تھے۔ اور فی الواقع گلستان اور بوستان ایسی کتابیں ہیں۔ کہ دانا سے دانا آدمی بھی اُن سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ اور عالم سے عالم شخص خواہ وہ نہایت خوش تحریر و خوش تقریر صاحب

تصنیف ہو۔ مرتے دم تک اُن سے کچھ سیکھ سکتا ہے۔ انگلستان میں شکسپیئر کی یہ قدر ہے۔ کہ گو بچپن میں بھی وہ درسی کتابوں میں ہوتا ہے۔ مگر مرتے وقت وہاں کے ملک الشعراء ٹینی سن کی بغل بھی اس شکسپیئر ہی کی کتاب پڑی تھی۔ ہمارے خیال میں نہ صرف ایران بلکہ ایشیا سعدی پر ویسا ہی نازاں ہو سکتا ہے۔ جیسے انگلینڈ بایورپ شکسپیئر پر۔ وہاں باوجود موجودہ قدر دانی کے جابجا شکسپیئر کے نام پر سوسائٹیاں قائم ہیں۔ اور اصل میں یہی سوسائٹیاں ہیں۔ جن کے ذریعہ سے شکسپیئر کا کلام کچھ مدت تک زیب طاقِ نسیاں رہنے کے بعد اس شہرت کو پہنچا ہے۔ مگر یہاں یہ نوبت ہے۔ کہ آج اگر رہے سہے انتخاب سعدی سرکاری مدارس کی کتابوں میں سے اُڑا دیے جائیں۔ تو آنے والی نسلوں کو شاید رفتہ رفتہ بھول ہی جائے۔ کہ سعدی کون تھا۔ اب بھی قواعد تعلیم میں ایسے اختیارات طالب علموں کو دیے جا رہے ہیں۔ جن کے وسیلے سے وہ بغیر سعدی کا ایک حرف بھی پڑھنے کے بی اے اور ایم۔ اے بن سکتے ہیں۔ اور بعض کو ضروریاتِ زمانہ مجبور کرتی ہیں۔ کہ وہ اُن طریقوں کو اختیار کریں۔ تو اہل ہند کے پاس جن کے واسطے سعدی کی تصانیف ایک قابلِ قدر وراثت ہیں۔ کون سا ذریعہ باقی رہ سکتا ہے۔ جس سے وہ اس کو ضائع نہ ہونے دیں۔ سوائے اس کے کہ اُن کا کوئی نہ کوئی مجمع ایسا ہو۔ جس میں فارغ التحصیل نوجوان بھی جن کو دیگر ضروریات کے باعث اس وقت تک ایسی تصانیف سے کامل بہرہ نہیں ملا۔ ایسا موقع پائیں۔ کہ وہ اس کمی کو پورا کر سکیں۔ اچھا اس کو چھوڑیئے۔ اور انگلستان کی ایک اور مجلس کی طرف توجہ فرمائیے۔ گو یہ مجلس اب موجود نہیں۔ مگر اس کی حکائتیں زبان زد خلائق ہیں۔ اٹھارہیں صدی میں وہاں ایک کلب تھا۔ جس کی روح رواں ڈاکٹر جانسن تھے۔ کوئی اس کے حالات پڑھے۔ تو بلا شبہ اُس صدی کے تمام انگریز مصنفوں کی بیش بہا تصانیف اُس کے سامنے آئینہ ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر جانسن جو انگریزی کی پہلی مشہور لغت کی کتاب کے جامع اور علمی تنقید کی رسم کے بڑے موجدوں میں گذرے ہیں۔ اپنے دن بھر کے کام کے بعد کلب میں جا کر بیٹھنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ایک کلب اُن کے مذاق کی اُن کو مل گئی تھی۔ اس میں کچھ اور بھی تصنیف و تالیف کے شائق آمد و رفت رکھتے تھے۔ گولڈ اسمتھ صاحب نادر الکلام مضمون

نویس برک کا ساجادو بیان فصیح۔ رینالڈ کا سا مصوّر۔ اس مجلس کے ممبروں میں تھے۔ ان سب کے بہترین نتائج طبع انہی ونوں کا ثمرہ ہیں۔ جب یہ لوگ مل بیٹھتے تھے۔ صفائی سے ایک دوسرے پر نکتہ چینیاں ہوتی تھیں۔ دلچسپ بحثیں ہوتی تھیں۔ ایک کی مثال دوسرے کو اکساتی تھی۔ اور نہایت عمدہ اثر اس کا ملک کے علمی ذخیرہ پر پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کی اس وقت کی گفتگو میں جمع کی گئی ہیں۔ جو نہایت ہی دلکش اور پڑھنے کے قابل ہیں۔ اس طرح اس کلب نے ملک کی علمی حالت پر بیّن اور مفید اثر ڈالا تھا۔

عمر خیام کلب جس کی بنا علمی مذاق پر ہے۔ اور جو ایک مذاق کے اہلِ علم کے جمع ہونے کی جگہ ہے۔ اس پر کیا حصر ہے۔ فرنگستان میں ہر طبقہ اور ہر مذاق کے آدمیوں کے مل بیٹھنے کے سامان ہیں۔ اور یہاں کوئی ایسی مجلس بھی نہیں۔ جو مدارس اور کالجوں کی تعلیم کے بعد علمِ مجلس اور روزمرہ کے برتاؤ کی تہذیب کی تعلیم گاہ کا کام نوجوانوں کو دے سکے۔ یورپ میں جہاں عزّت اور روزگار حاصل کرنا ہندوستان سے بدرجہا مشکل ہے (گو یہاں بھی اب بہت مشکل ہوتا جاتا ہے) نوجوانوں کی کامیابی اخلاق و عادات اور برتاؤ پر بالکل منحصر ہے۔ وہاں سوائے نہایت اعلیٰ طبقہ کے آدمیوں کے دُوسرے ہر شخص کو اپنے بل پر بڑھنا پڑتا ہے۔ کسی کے متوسّلین میں کوئی شخص اس سبب سے عزّت نہیں پاتا کہ وہ کس کا بیٹا ہے۔ بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے۔ کہ وہ خود کیا ہے۔ پس قواعدِ مجلس سیکھنے اور مجالس میں عزّت اور اعتبار حاصل کرنے کے لیئے وہاں کے نوجوان مجالس ہی میں سیکھے جاتے ہیں۔ فرض کیجئے۔ ایک شخص نے اپنی ضروری تعلیم سے فارغ ہو کر ایک دوکان کھولی ہے۔ اب اپنے لیئے ایک معزز فردِ قوم کی حیثیت قائم کرنے کے واسطے اُسے خاص کوشش کی ضرورت ہے۔ اُس کو خود ملاقاتیں کرنی پڑتی ہیں۔ خود دوستوں کو اپنی خوبیوں کا معترف بنانا پڑتا ہے۔ اور خود ہی ہر قسم کی عزّت حاصل کرنی پڑتی ہے۔ پہلی آشنائی جو وہ کسی کار آمد شخص سے پیدا کرتا ہے کسی نہ کسی کلب کے ذریعہ ہوتی ہے۔ کچھ دنوں میں اگر وہ مناسب طریق سے چلتا ہے۔ تو وہاں کے تمام ممبروں کو اپنا بنا لیتا ہے۔ وہی اس کے نئے علمِ مجلس کے معلّم ہوتے ہیں۔ اُنہی کے تجربہ سے وہ تجربہ

اور انہی کے مشاہدے سے مشاہدہ جمع کرتا ہے۔ اور وہی تعلیم اُس کے واسطے اعلیٰ طبقات کی مجالس کے لیئے پروانۂ راہداری ہو جاتی ہے۔ یہاں یہ تو عام طور پر مانا جاتا ہے۔ کہ مدارس کی تعلیم مکمل نہیں خصوصاً علم مجلس میں بالکل ناقص ہے۔ اور کوئی ایسا تعلیم یافتہ نہیں۔ جس کو اپنے خاندانی تعلقات میں اس قسم کی معلومات کی ضرورت نہ پڑے۔ سوسائٹی میں داخل ہونے ہی سخت گھبراتا ہے۔ غلطیاں کرتا ہے۔ اُس کی ہنسی اُڑتی ہے۔ اور اس کی تعلیم کو بھی بٹہ لگتا ہے۔ اگر ہمارے ہاں ایسی مجالس ہوں۔ جن میں نوجوانوں کو تعلیم رواجی سے فارغ ہونے کے بعد اچھی صحبت میں بیٹھنے۔ اداب صحبت کو سمجھنے۔ اور ملحوظ رکھنے اور کچھ نہ کچھ معلومات دنیا بڑھانے کا موقعہ مِل جائے۔ تو بے انتہا فائدہ ہو سکتا ہے۔ ممالک فرنگ میں ہر کام کے لیئے ایک جداگانہ کلب موجود ہے۔ اکثر مجلسیں ہیں۔ جن کا کام ورزش جسمانی اور کھیل کود کی عادات کو ملک میں جاری رکھنا ہے۔ تاکہ لوگوں کی صحت میں خلل نہ پڑے۔ اور قوم ایسی مُردہ نہ ہو جائے۔ کہ پڑھ پڑھ کر جوش تو بہت ہو جائے۔ اور ہاتھ پاؤں ہیں کہ جواب دے رہے ہیں۔ اور جوش کو عملی طور پر ظہور میں لانے کی اُن میں صلاحیت ہی باقی نہیں رہی۔ مثلاً یونیورسٹیوں میں لڑکے کشتی چلانا سیکھتے ہیں۔ جو ایک نہایت مفرح اور مردانہ ورزش ہے۔ تو وہاں ایسی کلبز بھی موجود ہو گئی ہیں۔ جن میں وہی طالب علم دنیاوی کاروبار ملازمت یا تجارت وغیرہ میں پڑنے کے بعد بھی اپنی مشق کو جاری رکھتے ہیں۔ گیند بلّے کے کلبز کا تو کچھ حساب ہی نہیں جن میں بوڑھے بوڑھے آدمی اپنے پُرانے شوق کو پورا کرتے ہیں۔ بلکہ دن بدن کمال پیدا کرتے جاتے ہیں۔ غرض ٹینس کھیلنے کے لیئے کلب ہیں۔ بائیسکلوں کی گھوڑدوڑ کے کلب ہیں۔ فن تصویر کے کلب ہیں۔ کونسا شوق ہے جو وہاں پورا نہیں کیا جاتا؟ اور کونسا کام ہے۔ جس میں فائدہ کا پہلو ساتھ ہی مرعی نہیں ہوتا؟ اگر وہ لوگ ظاہراً لہو ولعب میں بھی پڑے ہوئے دکھائی دیں گے۔ تو اُن میں بھی کوئی نہ کوئی ترکیب مالی علمی یا اخلاقی فائدہ کی رکھی ہوئی ہو گی۔ سہ

پائے ساقی پر گرایا جب گرایا ہے مجھے
چال سے خالی کہاں یہ لغزش مستانہ ہے

ہمارے ہاں پہلے تو سرے سے یہ غلطی کی گئی۔ کہ جن لوگوں نے پڑھنا شروع کیا۔ وہ محض پڑھنے میں ایسے مستغرق ہو لے۔ کہ دُنیا وَمافِیھَا کو بھول گئے۔ کھانے تک کی ہوش نہ رہی۔ نیند کم لینا تو طالب علمی کا پہلا فرض سمجھا جاتا ہے۔ کثرت سے بے خوابی کی ورزش۔ کھیلنے۔ کودنے، دَدڑنے کا نام ہی نہ لیا۔ نہ مُنہ پر رونق۔ نہ ہاتھ میں سکت۔ رہ گئے تو قلم فرسائی کے قابل۔ اور وہ بھی ادھورے کہ انگریزی بلبلیں قفس نکالیں صحت کی نعمت ہاتھ سے دے بیٹھے پڑھنے کے بعد دفتر یا کچہری ہیں گئے۔ دن رات کام۔ نتیجہ یہ کہ جوانی میں ہی آنکھوں کی بینائی ناقص۔ بھوک بند۔ معدہ ضعیف۔ دماغ کمزور۔ اول تو بڑھاپے تک پہنچتے نہیں۔ اور اگر پہنچیں تو زندگی دوبھر ہو جائے۔ اجی ایسے پڑھنے سے تو نہ پڑھنا ہی اچھا تھا۔ آخر یہ مصیبت کی حالت دیکھ کر حُکّام کو بھی رحم آیا۔ اور انہوں نے تاکیدی حکم جاری کرنے شروع کئے۔ کہ مدارس میں طلبا کی ورزش اور کھیل کود پر ویسا ہی زور دیا جائے۔ جیسا کہ اُن کی تعلیم پر۔ کچھ دنوں تو یہ حکم بالائے طاق رہا۔ آخر تعمیل شروع ہوئی۔ اور اس وقت گو عام عملدرآمد کے سبب اتنا ہو گیا ہے۔ کہ طالب علموں میں سے اکثر باقاعدہ ورزش کرتے ہیں۔ مگر طالب علموں کی زندگی کا پتہ لگایا جائے۔ تو نوّے فیصدی اُسی کانِ نمک میں چلے جاتے ہیں۔ جس میں اُن سے پہلے کی جماعتیں جا چکی ہیں۔ اور اگر کچھ باقی رہ جاتا ہے۔ تو ایک قصّہ کہ کسی زمانہ میں ہم ایسے اچھے ورزشی کرتب سیکھ گئے تھے۔ یا گیند کھیلنے میں ایسے اُستاد تھے۔ یا ٹینس میں ہماری شہرت تھی۔ کوئی پوچھے۔ کہ کیوں صاحب! وہ سب شوق کیا ہوئے؟ تو آہِ سرد بھر کر جواب دیتے ہیں۔ جناب اکارِ سرکاری سے سر کھجانے کی فرصت نہیں۔ وہ صحبتیں کہاں کہ خواہ مخواہ کو بھی جی للچا آئے۔ اور اگر شوق بھی کرنا چاہیں تو کیونکر؟ ہمعصروں میں یہ مذاق نہیں۔ اور چھوٹوں میں جا کر مل نہیں سکتے۔

فرصتِ کار و بار شوق کسے؟ ذوقِ نظارۂ جمال کہاں؟
دل تو مل وہ دماغ ہی نہ رہا شور سودائے خط و خال کہاں؟

اُس کے مقابلہ میں بابو یا منشی صاحب کے محکمہ کے بڑے صاحب کو دیکھیے۔ جو عمر میں اُن

سے بھی بڑے ہیں۔ مگر طبیعت میں نوجوانی کی اُمنگ۔ کام کرنے کا شوق اور کام کرنے کی طاقت باقی۔ دفتر سے جاتے ہی منہ ہاتھ دھو کپڑے بدل اپنے کلب کی راہ لیتے ہیں پہنچتے ہی اپنے رواج کے مطابق تفریح کے سامان سے محظوظ ہوتے ہیں کسی کتاب یا اخبار یا مخزن کو اگر دم بھر کے لئے اُٹھا لیتے ہیں۔ اور کسی نہ کسی معاملہ کی نسبت کچھ بحث کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ اپنے احباب سے ایسی باتیں کرتے ہیں۔ جو روزمرہ کے فرائض اور دفتر کی چکی پیسنے سے تعلق نہیں رکھتیں۔ اور تازہ دماغ ہو کر رات کو آرام کی نیند لیتے ہیں۔ ادھر اگر ہمارے بھائی کہیں کسی دوست کے مکان پر تین چار جمع بھی ہو جائیں۔ تو اُن کی باتیں کیا ہیں۔ وہی دفتر کے قصے۔ وہی کچہری کے رونے۔ وکیل ہوں تو مقدمات کا ذکر۔ حکیم ہوں تو بیماروں اور معالجوں کے جھگڑے غرض شب و روز ایک ہی دُھن میں کٹتا ہے۔ اور پھر دیکھو۔ تو ڈھاک کے وہی تین پات۔ اپنے اپنے کام میں کوئی ایسی بڑی قابلِ رشک ترقی بھی نہیں کر لیتے۔ کہ کچھ تو اطمینان ہو۔ انگریزوں کا تو یہ خیال ہے۔ کہ جہاں جائیں۔ خواہ جنگل ہی کیوں نہ ہو۔ دو چار ہم خیال ڈھونڈ ہی نکالتے ہیں۔ اور اپنے مل بیٹھنے اور تفریح کا بندوبست کر لیتے ہیں۔ اس وقت رتبہ اور عہدہ کا بھی چنداں لحاظ نہیں کرتے۔ یہ مجالس گویا اُن کے لئے ایک ضرورتِ زندگی بن گئی ہیں۔ ہم شوق سے اُس وقت کا انتظار کریں گے۔ جب ہمارے ملک میں بھی کارآمد و مفید تفریحی مجالس کے گھر گھر چرچے ہوں *

فنِ تنقید

ہندوستان میں علوم وفنون کی ترقی کی راہ میں ایک رُکاوٹ یہ رہی ہے۔ کہ یہاں فنِ تنقید کا رواج نہیں تھا۔ اور باوجود ترقی کے مختلف خیالات پیدا ہوجانے کے آج تک یہ فن اس ملک میں رائج نہیں ہے۔ آجکل بعض تحریرات میں کہیں کہیں ناقدانہ جھلک نظر آتی ہے۔ مگر ایسی تحریریں ابھی تعداد میں اس قدر کم اور وہ جھلک ابھی ایسی خفیف ہے کہ یہ کہنا مشکل ہے۔ کہ اس فن کا رواج ہندوستان میں ہوگیا ہے۔ مغربی دنیا کے باشندوں میں جہاں آجکل اور خوبیاں نظر آئی ہیں۔ وہاں یہ بھی ہے۔ کہ لوگ ہنروروں کے عیب وہنر کو دیکھتے ہیں۔ نظم ونثر کی تصنیفات قبولِ عام کا خلعت پہننے سے پیشتر جوہریانِ سخن کی نقاد نظروں کے کامل العیار ترازو میں جانچی اور تولی جاتی ہیں۔ اور اُن سے سندِ درستی حاصل کرنے کے بعد سخن فہم قدردانوں کی نظروں میں سماتی ہیں۔ انگریزی میں ایک لفظ ہے "کرٹک" جس سے مراد وہ شخص ہے۔ جو کسی فن کی نسبت رائے لگائے اور کھوٹا کھرا انصاف سے پرکھ دے۔ اسی لفظ سے مشتق ہے۔ ایک لفظ کرٹسزم جس کے معنے ہیں "جانچنا پرکھنا"۔ تعجب ہے کہ اس فن کا وجود تو ایک طرف ہمارے ہاں ابھی ان دونوں لفظوں کے صحیح ترجمہ کا فیصلہ نہیں ہوا۔ ان الفاظ کے ترجمے عموماً غلط کئے جاتے ہیں۔ جو ان کے اصل مفہوم سے بہت دُور ہیں۔ مدرسوں میں تو بعض نیم مُلا "کرٹسزم" کے معنی "نکتہ چینی" پڑھاتے ہیں۔ یا بہت بڑھے تو "رائے زنی" کہہ دیا۔ اس میں شک نہیں کہ کرٹسزم میں بعض اوقات نکتہ چینی ہوتی ہے۔ مگر بعض اوقات تعریف بھی ہوتی ہے۔ اس لئے نکتہ چینی کچھ ٹھیک ترجمہ نہیں۔ یہ ابتدائی تعلیم میں غلط معنے ذہن نشین ہوجانے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ کہ بعض اچھے خاصے انگریزی خواں تحصیل سے فارغ

ہونے پر بھی اس غلطی میں مبتلا رہتے ہیں۔ اور کرِٹِک کو محض نکتہ چین اور اس کے فن کو نکتہ چینی جانتے
ہیں۔ رائے زنی والا گروہ بمقابلہ ان کے راستی پہ ہے۔ مگر اوّل تو یہ لفظ پورا مفہوم ظاہر کرنے سے قاصر
ہے۔ دوسرا کچھ کانوں کو بھلا نہیں معلوم ہوتا۔ مثلاً کسی شخص کی نسبت یہ کہنا کہ اپنے زمانے میں انگلستان
کے نامور رائے زنوں میں گزرا ہے۔ خواہ مخواہ مذاقِ سلیم کو کھٹکتا ہے۔ اور جو لوگ بالکل اصلی
انگریزی لفظ سے ناآشنا ہیں۔ وہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کہ حضرت موصوف کس معاملہ پر رائے زنی کیا
کرتے تھے۔ معاملاتِ مُلکی سے انھیں خاص دلچسپی تھی۔ یا تمدنی امور میں زیادہ دخیل تھے۔ علوم کی طرف رجوع
تھا۔ یا فنون کی طرف۔ حالانکہ انگریزی لفظ کے معنے زیادہ تر علم اور فن کے ساتھ مخصوص ہیں۔ کرٹک یا تو
علم ادب کی تصانیف کے لیے ہوتے ہیں۔ یا فن نقاشی اور مصوری و معماری وغیرہ کے لئے اگر اور کسی
چیز کی نسبت رائے دینے والے لوگوں کا ذکر کرنا ہو۔ تو اس کا نام لینا پڑتا ہے۔ اور کہنا پڑتا ہے۔
کہ فلاں چیز کے کرِٹک۔ ان دو ترجموں کے علاوہ حال میں کہیں کہیں لفظ تنقید اس معنے میں استعمال
ہوتا نظر آیا ہے۔ مگر اہلِ زبان کی غفلت اور سہل نگاری سے رواج نہیں پاسکا۔ کیونکہ بعض ایسے
لکھنے والوں نے جو استادوں میں گنے جاتے ہیں۔ اس کوشش سے کہ اپنی زبان کے کسی لفظ کو
ان معنوں میں رواج دیں۔ اجتناب کیا۔ اور عافیت اس میں سمجھی کہ اصل انگریزی اصطلاح اُردو
کتابوں میں لکھ دیں۔ مگر بدقسمتی سے وہ اصطلاح ایسی ہے۔ کہ اُس کا تلفّظ آسان نہیں۔ بعض فارسی
خواں اصحاب کی زبان سے جو اس اصطلاح کو سُنا ہے۔ تو سخت ہنسی آئی ہے۔ فرمانے لگے یہ ہمارے مُلک
میں ابھی کرِٹک نہیں نکلے۔ جب پوچھا صاحب وہ کیا؟ تو بولے "یہی جو کتابوں پر کیری ٹی سزم"
لکھتے ہیں۔ ہم دعوےٰ سے یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ یہ اصطلاح اُن الفاظ میں سے نہیں ہے۔ کہ اردو میں
عام طور پر مقبول ہو سکے۔ اور جزوِ زبان بن سکے۔ یہ ایسی اصطلاح ہے۔ کہ اس کا تلفّظ اگر انگریزی
خوانوں کی زبان سے صحیح طور پر بھی ادا ہوگا۔ تو بھی اُردو آشنا کانوں کو کھٹکے گا۔ اس لیے ضروری
ہُوا۔ کہ اُس کے لیے ایک لفظ ایسا تلاش کیا جائے۔ جو زبان اُردو میں پہلے سے مروّج ہو۔ اور جو
اس اصطلاح کے مفہوم کو ادا کر سکے۔

ہماری نظر میں اس مطلب کے لیے "تنقید" سے بہتر کوئی لفظ نہیں ملا اور ہم تو آج سے ہی "کریٹی سزم" کو سلام کہتے ہیں۔ اور تنقید سے کام لیں گے۔ کریٹک کو ہم "نقاد" یا "ناقدِ سخن" کہیں گے۔ کیونکہ ہمیں ابھی علمِ ادب ہی کے نقادوں سے کام ہے۔ اور ان دو لفظوں کے رواج کو فنِ تنقید کی ترقی کا پہلا زینہ سمجھیں گے۔ اور فنِ تنقید کی ترقی۔ اگر یہ فن ایماندار اور انصاف پسند لوگوں کے ہاتھ میں رہا۔ ہمارے علم کو اس سوا یہ ترقی پر پہنچا دے گی۔ جس کے اکثر ہوا خواہانِ ملک دل سے آرزومند ہیں۔ اس وقت مصر میں عربی زبان کا علم ادب غیر معمولی ترقی کر رہا ہے۔ یورپ کے علمی اور ادبی خزانے مالِ غنیمت کی طرح ملک کے ذخیروں کو مالامال کرنے کے لیے لوٹے جا رہے ہیں۔ جو کام پہلے سلطنتیں کرتی تھیں۔ وہ عوام کر رہے ہیں۔ اور ہر قسم کی انگریزی اور فرانسیسی کتابیں عربی زبان میں ترجمہ ہوتی جاتی ہیں۔ وہاں ضرورت نے بہت سے غیر زبانوں کے لفظوں کو اختیار کرنے اور بعض کے لیے اپنی زبان کی اصطلاحیں ڈھونڈھ نکالنے پر مجبور کیا ہے۔ مگر اس بات کی داد دینی پڑتی ہے۔ کہ جن لفظوں کو اختیار کیا ہے۔ ان کو بالعموم خوبصورتی سے اپنا بنا لیا ہے۔ اور جن کے ترجمے ڈھونڈھے ہیں۔ ایسے موزوں کہ لفظی رعایت بھی ملحوظ ہے۔ اور مطلب بھی ادا ہو گیا ہے۔ انہی ترجموں میں یہ لفظ "تنقید" ہے۔ وہاں اکثر اخبارات یا رسالوں میں جہاں تازہ تصانیف کی پرکھ ہوتی ہے۔ وہاں صفحہ یا کالم کے اوپر "باب التنقید" لکھا ہوتا ہے خود "کالم" کے لفظ کی بجائے وہ عماد لکھتے ہیں۔ جو انگریزی لفظ کا صحیح ترجمہ ہے۔ اور اگر ہمارے اخبارات میں کالم کا لفظ حد سے زیادہ مروج نہ ہو چکا ہوتا۔ اور یوں بھی ایک سادہ اور سہل لفظ نہ ہوتا تو ہم زور سے رائے دیتے کہ "عماد" کو یہ نئے معنے عطا کیے جائیں۔

فنِ تنقید کے رواج کے لیے دو تدبیریں ہمارے ذہن میں ہیں۔ ایک تو یورپ کی بعض مشہور تصانیف میں سے وقتاً فوقتاً اس فن کی نسبت اقتباسات درج کرنا۔ دوسرے فن کے اصول کے موافق آجکل کی بعض مشہور تصنیفات کو تنقید کے ترازو میں تولنا اور نتیجہ بلا کم و کاست ظاہر کرنا۔ یہ دونو کام بجائے خود مشکل کام ہیں۔ پہلی تدبیر میں تو ترجمہ کا کام نہایت دشوار ہے۔ اس فن کی مختلف

اصطلاحیں تعداد میں اس قدر ترقی کر گئی ہیں۔ اور مدح و ذم کے ایسے ایسے باریک پہلو نکالے گئے ہیں کہ ان عبارات کو جو وہاں صدیوں سے منجھی ہیں۔ اُردو میں ادا کرنا کارے دارد۔ دوسری تدبیر میں علاوہ اس کے کہ صحیح تنقید کوئی آسان بات نہیں۔ دقت یہ ہے کہ مصنفین اور مطالع ابھی سچی تعریف اور سچی مذمت سننے کے عادی نہیں۔ یہاں مدت سے تقریظوں کا رواج رہا ہے کوئی پرانا دیوان یا کتاب اٹھا کر دیکھیے قلمی نسخہ ہو یا چھپا ہوا۔ آخر میں صفحوں کے صفحے تقریظوں سے پُر ہیں۔ ہمیں یاد نہیں۔ کہ آج تک کوئی ایسی تقریظ کسی کتاب کے ساتھ لگی ہوتی ہو جس میں جہاں دس خوبیاں جتائی ہیں۔ ایک آدھ نقص بھی جتا دیا گیا ہو۔ مصنف کو دیکھیے۔ تو سر تقریظ لکھنے والے کے قلم جواہر رقم۔ طبع رسا۔ اور کلک گہر سلک کے گیت گا رہے ہیں۔ اور تقریظوں کو دیکھیے۔ تو سب کی سب کتاب کو لاجواب۔ رشکِ آفتاب و مہتاب۔ سزاہوں میں انتخاب بتا رہی ہیں۔ کوئی یہ نہیں دیکھتا۔ کہ کتاب کتنے تعریفی الفاظ کی مستحق ہے۔ بلکہ ہر شخص یہ دیکھتا ہے کہ اس کی یہ تقریظ دوسرے سے زور دار ہو۔ تقریظ لکھنا ہر شخص کے لیے اپنی طبع آزمائی کا موقعہ ہوتا ہے۔ نہ کہ مصنف کو ایسی داد دینے کا جس کا وہ مستحق ہے بعض ایسی مثالیں بھی دیکھنے اور سننے میں آئی ہیں۔ کہ تقریظ میں تو تعریف کے پل باندھ دیے۔ اور ویسے اگر کسی نے پوچھا۔ کہ کتاب کیسی لکھی گئی ہے تو کہہ دیا کہ کتاب تو بتسیا نہ مشق ہے۔ ہم نے تو ایک دوست کی خاطر سے تقریظ لکھ دی ہے۔ تقریظوں کے علاوہ بعض پُرانی کتابوں پر نکتہ چینی بھی کی گئی ہے۔ مگر اس کا مذاق یہ نہیں کہ ع

عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو !

بلکہ یہ کہ اُس کو سراپا عیب اور ہمہ تن نقص قرار دیتے تھے۔ ایک ایک لفظ پر اعتراض حرکات اور سکنات پر گرفت۔ بندش پر نکتہ چینی۔ مضمون پر حرف گیری۔ ایسے ہی لوگوں کی شان میں میر انیس مرحوم لکھ گئے ہیں ؎

مقابلہ پہ چڑھائے ہیں آستینوں کو	مزا یہ طرفہ ہے مضمون تو دستیاب نہیں
ہنر عجیب ملا ہے۔ یہ نکتہ چینوں کو	غلط یہ لفظ۔ وہ بندش بُری یہ مضمون سُست

غرض افراط و تفریط کی عملداری رہی ہے۔ اور مذاق مباحثہ روی سے آشنا ہی نہیں نتیجہ یہ ہے کہ کتاب کی تعریف کرو تو بیانشان دوستی سمجھا جاتا ہے۔ اور نہ کرنا یا کوئی اعتراض کرنا علامتِ دشمنی ہے۔ آپ فرد کسی کی کتاب میں کوئی نقص بیان کیجیے مصنف کے بیسیوں طرفدار آپ کی پگڑی اُتارنے کو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ آپ میں کتاب کے سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں۔ اس حالت میں آزادی سے تصانیف پیدا کیے دینے کا بیڑا اٹھانا ایک جہان سے دشمنی پیدا کرنا ہے۔ اور دشمنی بھی وہ جسے خداواسطے کی دشمنی کہتے ہیں۔ یعنی نہ کوئی ذاتی غرض نہ عناد۔ صرف ملک کے علم ادب اور مذاق کی اصلاح اور منفعت عام کی غرض سے تو تنقید لکھی جائے اور جن کے کلام پر تنقید ہو وہ ایسے بگڑیں کہ دل میں غصہ بھر لیں اور بدلا لینے کی فکر میں رہیں۔ اس میں شک نہیں کہ رفتہ رفتہ تنقید کی برداشت لوگوں میں پیدا ہوتی جائے گی۔ مگر ابتدا میں بہت سی مشکلات کا سامنا ہے ؂

جوہرِ فصاحت

فصاحت قدرت کا عطیہ ہے۔ یا سیکھنے سے آتی ہے۔ اہل الرّائے لوگوں میں اس باب میں بہت کچھ اختلاف ہے۔ کوئی تو کہتا ہے کہ تقریر کی عمدگی ایک جوہر خداداد ہے۔ جو مشق سے جلا پا سکتا ہے۔ مگر پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور کوئی کہتا ہے۔ کہ مشق پر فصاحتِ تقریر کا مدار ہے۔ ایک پچھلے مضمون نویس نے یہاں تک لکھ دیا ہے۔ کہ اس خیال نے کہ فصاحت وہبی ہے۔ اکتسابی نہیں۔ بہت گویا آدمیوں کو فصیح بننے سے روکا۔ کیونکہ وہ تھوڑے سے عطیہ پر اس قدر پھولے۔ کہ کوشش ترک کر دی۔ اور جو کچھ بننا تھا وہ نہ بن سکے۔ اور کئی کم زبان اشخاص کو بے زبان بنا دیا۔ اور وہ سمجھ بیٹھے۔ کہ جب فی الحال اُن کی تقریر موثر نہیں۔ تو اُن کو مشق سے کیا فائدہ ہو گا۔ کیونکہ یہ فن اکتسابی نہیں۔ خواہ ان خیالات میں سے کسی کے ہم طرفدار ہوں۔ غالباً اس رائے سے کسی کو اختلاف نہ ہو گا۔ کہ مشقِ تقریر بہر حال مفید ہے۔ جن میں قوّتِ گویائی اور زورِ طبع قدرت نے رکھا ہے۔ اُن کی قدرتی خوبیاں مشق سے دوبالا ہو جائیں گی۔ اور جنہیں قدرت نے اس نعمت سے تھوڑا سا حصہ دیا ہے۔ وہ بھی اپنی موجودہ حالت سے بہت کچھ ترقی کر جائیں گے۔ اور فنِ تقریر کو بہ حیثیت فن سیکھنے سے اس قابل ہو جائیں گے۔ کہ بھرے مجمع میں دلیری سے گفتگو کر سکیں۔ اور سننے والوں پر تھوڑا بہت اثر ڈال سکیں۔ اس فن کی نسبت یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے۔ کہ اگر کوئی دل سے اس کا شوق کرے۔ اور طبیعت بھی معمولی درجہ کی رسا پائی ہو۔ اور ایسا ہی بدقسمت اور کُند ذہن نہ ہو۔ تو یہ اُسے کچھ نہ کچھ بنا دے گا۔ اور اس کے کلام کو خوبیوں سے آراستہ کر دے گا۔ اس کا خاصہ ہے۔ کہ میدانِ سخن میں بزدلوں کو دلیر کرتا ہے۔ اور دلیروں کو شیر کرتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں

فنِ تقریر شائستہ ممالک کے لیئے ضروریاتِ زندگی میں داخل ہوگیا ہے۔ اور جس ملک میں رعایا کو تھوڑی سی بھی آزادی حاصل ہے۔ وہاں ہر معزز باشندے کو کئی موقعے مجلسوں کے سامنے تقریر کرنے کے پیش آتے رہتے ہیں۔ واعظوں اور خطیبوں اور لکچراروں کی جماعت کو تو جانے دیجیے۔ وہ تو اس فن کے لیئے بنائے گئے ہیں۔ یہ اُن کی زندگی ہے۔ اور وہ اس کے زندہ رکھنے والے ؎

مزا نہیں ہے خموشی کا خوش بیان کے لیئے
زبان سخن کے لیے ہے سخن زباں کے لیئے

صرف اُن لوگوں کی حالت پر غور کیجیئے۔ جو تقریر پیشہ نہیں۔ راجہ ہیں۔ نواب ہیں۔ رئیس ہیں ساہوکار ہیں۔ طبیب ہیں۔ اہلکار ہیں۔ مجسٹریٹ ہیں۔ جج ہیں۔ ہر کسی کو کبھی نہ کبھی ایسے موقعے پیش آتے ہیں۔ کہ ابنائے جنس کے ایک مجمع سے خطاب کرے۔ راجاؤں اور نوابوں کو کسی ہمسر کے ہاں مہمان ہونے کے وقت کسی حاکم یا معزز مہمان کی میزبانی کے وقت تقریریں کرنی پڑتی ہیں۔ رؤسا اور امراء کو بڑی بڑی مجالس کی صدارت کے وقت ساہوکاروں طبیبوں سوداگروں اور اس قسم کے حضرات کو جو پولٹیکل معاملات سے خصوصیت نہیں رکھتے۔ اور اپنی آزادانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ شہرداری کے تعلقات میں یہ ضرورت پیش آتی ہے۔ کسی برادری یا قوم کے مجمع میں کسی اصلاح کے جلسے میں۔ اور اگر ان سب سے کنارہ کش ہیں۔ تو میونسپل کمیٹی کی ممبری ہی سہی۔ وہ جب ہی کام کے ہوتے ہیں۔ کہ اپنے خیالات واضح اور مدلل طور پر سامعین کے سامنے پیش کر سکیں۔ اور کبھی کبھی اپنی رائے کو اپنے ہمراہیوں کی رائے پر تقریر یا دلیل کے زور سے غالب بنا سکیں اہلکار کو اگر اور کاموں سے وہ سروکار نہ بھی رکھیں۔ تو اپنے افسروں کے استقبال یا رخصت کے اوقات ہی پہ تقریر سے کام پڑ جاتا ہے۔ مجسٹریٹ اور جج علیٰ ہذا القیاس اور نہیں تو وفادارانہ جلسوں ہی میں خیر خواہی سرکار انگریزی کی برکات کا اظہار پُر زور لفظوں میں کرنا چاہتے ہیں۔ غرضیکہ ہر ذی وجاہت شخص کو کم و بیش فنِ تقریر کی ضرورت ہے۔ اور جوں جوں ملک میں شائستگی بڑھتی جائے گی۔ اور آزادی ترقی کرتی جائے گی۔ یہ ضرورت زیادہ ہوتی رہے گی۔ اس لیے ہم زمانہ کمال کے چند مشہور فصحائے

انگلستان کی آرائے کا خلاصہ لکھتے ہیں۔ اور بتلاتے ہیں کہ وہ کس کس طرح تقریروں کی تیاری کرتے ہیں۔
مسٹر چیمبرلین کی مثال لیجئے۔ جب وہ بحیثیت وزیر صیغۂ نوآبادی ہائے انگلستان ہونے کے بہت مشہور ہوگئے اور خصوصاً جنگِ افریقہ جنوبی کے متعلق ان کے مخالف کہتے تھے کہ ان کی سیاسی غلطیاں اس منحوس جنگ کا باعث ہیں۔ جس نے لاکھوں بندگانِ خدا کی جانیں جوکھوں میں ڈالیں۔ اور ہزاروں کے خون بہا دیے۔ سینکڑوں گھر برباد اور بیسیوں شہر نذر تیغ و آتش کر دیئے۔ ان اعتراضات کا جواب مسٹر چیمبرلین اپنی زبردست تقریروں میں دیتے تھے۔ اور اُن کا باوجود ان سب واقعات کے ایسا اثر تھا کہ انگلستان میں ایک گروہ کثیر اُن کا طرفدار تھا۔ اور امید رکھتا تھا۔ کہ اُن کی لیاقت اُن کو کسی دن سلطنت انگلستان کے اعلیٰ ترین عہدہ پر ممتاز کر دے گی۔ مسٹر چیمبرلین نے مقام برمنگھم کی ایک مجلسِ مناظرہ (ڈی بے ٹنگ سوسائٹی) میں اُس کے پنجاہ سالہ جلسے پر ایک تقریر کرتے ہوئے خود اُس مجلس کے ذریعہ فنِ تقریر کی ابتدا کرنے کا ذکر کیا تھا۔ انھوں نے فرمایا۔ کہ وہ ۱۸۵۴ء میں پہلے اس مجلس کے رکن مقرر ہوکر ۱۸۶۳ء تک رہے۔ وہ اس عرصہ میں برابر اس کے مناظروں میں شریک ہو کر ایک طرف یا دوسری طرف تقریریں کرتے رہے۔ اس تجربہ سے جو رائے اُن کی قرار پائی ہے۔ وہ یہ ہے :-

"بغیر سخت محنت کے کوئی عمدہ دلیل مناسب الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتی۔ ایک فرانسیسی مصنف کا قول ہے۔ اور میرے خیال میں بہت درست قول ہے۔ کہ فصاحت اصلی اس کا نام ہے۔ کہ آدمی سب باتیں جو مناسب ہوں۔ کہہ دے۔ اور ان کے سوا اور کچھ نہ کہے۔ یہ آخری شرط سب سے مشکل ہے۔ اور تقریر تیار کرتے ہوئے زبان کے مانجھنے سے زیادہ وقت اس بات میں صرف ہو جاتا ہے۔ کہ غیر ضروری باتیں کم کر دی جائیں۔ اور بے محل فقرے نکال دیے جائیں میں جانتا ہوں۔ ہر اچھے مقرر کا تجربہ اس امر کا شاہد ہوگا۔ کہ بڑے بڑے فصحا بھی اور زیادہ فصیح ہوتے۔ اگر وہ اختصار سے کام لیتے۔ مگر بہت سے مطلب کو تھوڑے الفاظ میں ظاہر کرنا خالی از

تکلیف نہیں۔ اور بغیر محنت اور زر ڈُد کے ہو نہیں سکتا۔ جان برائٹ جو اپنے عہد میں منتخب نصیحت روزگار سے تھا۔ اپنی تقریروں پر بے حد محنت کرتا تھا۔ ہفتہ ہفتہ بھر بلکہ اس سے بھی زیادہ وہ ایک مضمون پر اپنے خیالات کو پختہ کرتا اور سُلجھاتا رہتا تھا۔ اُس کا قول تھا۔ کہ میں سب سے پہلے تو خود اچھی طرح اپنے دل نشیں کر لیتا ہوں۔ کہ کونسا مدعا ہے۔ جو میں سامعین کے دل پر نقش کرنا چاہتا ہوں۔ پھر اس کو سادہ سے سادہ عبارت میں بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اور اس امر کا خاص لحاظ رکھتا ہوں۔ کہ ہر ایک زائد لفظ۔ ہر بے ضرورت دلیل تقریر سے خارج رہے۔ اور ہر مناسب تشبیہ و توجیہ جو خیال میں آ جائے۔ اور جو نفسِ مضمون کی موید ہو۔ وہ داخل ہوتی جائے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب میں تقریر ختم کر کے بیٹھتا ہوں۔ تو مجھے یقین ہوتا ہے۔ کہ سامعین میرا مطلب پوری طرح سمجھ گئے ہوں گے۔ اور میری تقریر کا مقصدِ اصلی بخوبی اُن کے ذہن نشین ہو گیا ہو گا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہر شخص جان برائٹ نہیں ہو سکتا۔ اور اس شہبازِ فصاحت کی بلند پروازیوں کی تقلید ہر مُرغِ بے بال و پر سے ممکن نہیں۔ لیکن ہم میں سے ہر ایک اس قابل ہے۔ کہ تقریر پر محنت کرنے اور وقت صرف کرنے میں اُس کی تقلید کرے۔ اور کم از کم یہ کر سکے۔ کہ سُننے والوں کو کسی امرِ حق کا وہ پہلو وضاحت سے جتا دے۔ جو خود اس کے نزدیک مُسلّم ہو۔

برمنگھم کی مجلس مناظرہ کے ایک دو اراکین نے جنھیں مسٹر چیمبرلین کی فصاحت کی ابتدائی حالت دیکھنے کا موقعہ ہوا تھا۔ بیان کیا تھا۔ کہ معلوم ہوتا ہے کہ صاحب موصوف پہلے اپنی تقریریں لکھ کر حفظ کر لیا کرتے تھے۔ اور اسی لیے طرزِ ادا میں بے ساختہ پن نہ ہوتا تھا۔ گو وضاحت میں کوئی کسر نہ ہوتی تھی۔ اسی مجلس کے سیکرٹری صاحب نے لکھا تھا۔ کہ مسٹر چیمبرلین صاحب کی تقریریں دلچسپ با معنی اور پُر مطلب بھی ہوتی تھیں۔ اور اُن سے ذہانت۔ ہوشیاری اور نکتہ رسی بھی ٹپکتی تھی۔ مگر ابتدا میں بالخصوص یہ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ نہایت محنت اور کوشش سے پہلے ہی سے تیار کی ہوئی ہیں۔ اور صرف پڑھی جا رہی ہیں۔ اس سبب سے ایک دفعہ کسی کا جامِ صحت تجویز کرتے ہوئے مسٹر چیمبرلین کا اپنا تجربہ اُن کے اس خیال کا شاہد تھا۔ کہ فصاحت صرف قدرتی جوہر ہی نہیں۔ بلکہ مستقل مزاجی

اور محنت سے حاصل ہو سکتی ہے۔

سر چارلس ڈلک پارلیمنٹ کے مقرّروں کے اعلیٰ طبقہ میں تھے۔ اور فصحا میں شمار ہوتے تھے۔ اب اُن کی مثال لیجیئے۔ سر چارلس ڈلک سے کسی نے پوچھا۔ کہ آپ نے فنِ تقریر کیسے سیکھا۔ انھوں نے جواب دیا۔ کہ میں نے سب سے پہلے کیمرج یونین میں اس فن کی مشق کی۔ میں یونین کے جلسوں میں اکثر بولتا تھا۔ اور رفتہ رفتہ پریذیڈنٹ منتخب کیا گیا۔ وہاں۔ اُن دنوں آکسفورڈ کے دستور کے خلاف تقریر میں معاملہ فہمی کا رنگ غالب تھا۔ اور محض خوش بیانی اور شیریں زبانی کی قدر کم تھی۔ اور میں جانتا ہوں۔ کہ میری تربیت میں اس مذاق کا خاص اثر ہوا۔ کوئی نیا آدمی جو خوش بیانی کی کوشش کرتا اس پر وہاں کے طلبا ہنستے تھے اور جس تقریر میں واقعات اور نکات بیان ہوں اُس کو غور سے سنتے تھے۔ اس کا ضروری نتیجہ یہ تھا کہ میں اکثر مضمونِ تقریر کی تیاری تقریر سے زیادہ کیا کرتا تھا یعنی واقعات اور دلائل تلاش کرنے میں سعی بلیغ کرتا تھا اور زبان کی چنداں پروا نہیں کرتا تھا۔ مستفسر نے دریافت کیا۔ کہ آپ کا پھر ہمیشہ یہی طریق رہا۔ یا بعد میں بدل گیا؟

سر چارلس نے کہا۔ "ہاں میں سیر و سیاحت کے بعد پارلیمنٹ میں داخل ہو گیا۔ وہاں میں پہلے پہلے بولنے سے ہچکچایا۔ گو یونین میں بے دھڑک بولتا رہا۔ پارلیمنٹ میں جب موقعہ ہوتا میں گھبراہٹ کے بغیر بولنے کے لئے نہ اُٹھ سکتا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ میں طبیعت پر قابو پا گیا۔ اور اپنا کیمرج والا طریق استعمال کرنے لگا۔ جس سے ایک حوصلہ پیدا ہوا۔ میں بڑی احتیاط سے مضمون کو تیار کرتا۔ اور خاصے مکمل نوٹ پہلے سے لکھ لیتا۔ مگر وہ نوٹ نفسِ مضمون کے متعلق ہوتے تھے۔ طرزِ ادا سے انہیں کوئی واسطہ نہ ہوتا تھا۔" سر چارلس تیاری اور مشق کے اصول کے پورے پابند تھے۔ اور کم از کم اُن کی حالت میں یہ درست بھی ثابت ہوا ہے۔ مسٹر لوسی صاحب نے پارلیمنٹ کے کچھ حالات مرتب کئے تھے۔ جن میں یہ بھی لکھا ہے۔ کہ ۱۸۶۹ء میں ڈلک صاحب کی تقریر ایسی بھدّی ہوتی تھی۔ کہ متوسط درجہ کے ممبروں سے بھی گری ہوئی شمار ہوتی۔ مگر ۱۸۷۷ء میں وہ نہایت پُر تاثیر مقرّروں کے زمرہ میں گنے جانے لگے۔

زندہ دِلوں کا وطن

خدا جانے کس مقبول گھڑی میں سرسیّد احمد خاں مرحوم کی زبان سے "زندہ دلانِ پنجاب" کا فقرہ نکلا تھا۔ کہ تیر کی طرح نشانہ پہ بیٹھا۔ اور جزوِ زبانِ اُردو بن گیا۔ اب جس اخبار کو کھولو۔ جس قومی مجلس کی روئداد کو پڑھو۔ جس تحریک کے اشتہار پر نظر ڈالو۔ یہ الفاظ جلی حروف میں لکھے ہوئے نظر آتے ہیں جو کوئی باشندگانِ پنجاب کو کسی قسم کا شوق دلانا چاہتا ہے۔ وہ اُن الفاظ کے ذریعہ اُن کو یاد دلاتا ہے کہ یہ تمغہ جو قوم کی جانب سے اُنھیں مل چکا ہے۔ اس کی لاج رکھیں۔ اور بعض دوسرے صوبجات کی طرح بے اعتنائی سے کام نہ لیں۔ اس میں شک نہیں۔ کہ یہ افسوں کئی دفعہ چل جاتا ہے۔ مگر ہمارا خیال ہے۔ کہ اگر زندہ دلی سے مراد قومی اور مُلکی بہتری کے لیے سرتوڑ کوشش کرنا ہے۔ تو پنجاب کچھ ایسا بہت مستحقِ نیک نامی نہیں۔ یہ اور بات ہے۔ کہ مُلک کے اور حصّوں میں اندھیرا ہی اندھیرا ہو۔ اور یہاں ایک دھیما سا چراغ ٹمٹماتا نظر آئے۔ مگر ترقی جس چیز کا نام ہے۔ اس سے ابھی پنجاب بھی بہت دُور ہے۔ پنجاب میں ابھی بہت تھوڑے لوگ ہیں۔ جو فی الحقیقت خطاب "زندہ دلانِ پنجاب" کے مُستحق ہیں۔ اور بہت سے ایسے ہیں۔ کہ جو زندہ دلوں کو مردہ دل بنانا۔ چلتی ہوئی گاڑی میں روڑا اٹکانا بنتے ہوئے کام بگاڑنا۔ اور ترقی کے راستہ میں سدِ راہ بننا اپنا شعار کیے ہوئے ہیں۔ جو لوگ اس اصلیت سے واقف ہیں۔ اُنھیں بڑی ندامت ہوتی ہے۔ جب وہ ہر طرف سے اپنے ہم وطنوں کی تعریفیں سنتے ہیں۔ اور بے ساختہ اُن کے مُنہ سے دُعا نکلتی ہے۔ کہ جو کچھ وہ بظاہر سمجھے جاتے ہیں۔ وہ فی الحقیقت بن جائیں۔ تاکہ اس ندامت سے رہائی ہو۔ جو اب اُنھیں اپنی تعریف سُنتے وقت لاحق ہوتی ہے ؂

طاؤس را بہ نقش و نگارے کہ ہست۔ خلق
تحسیں کنند و او خجل کہ پائے زشتِ خویش

ہاں یہ ضرور ہے۔ کہ اگر زندہ دلی کے زیادہ وسیع معنے لئے جائیں۔ تو اہل پنجاب اس خطاب کے بہت مستحق ہیں۔ اور اس کی وجہ زیادہ اُن کے وطن کی قدرتی خوبیاں ہیں۔ پنجاب اور اہل پنجاب کی حالت اور عادات کا صحیح اندازہ آج تک دیگر حصص ہند میں نہیں کیا گیا۔ ایک عرصہ تک تو یہ صوبہ کنج گمنامی میں پڑا رہا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کے باشندے کس مپرسی کی حالت میں رہے۔ اسلامی سلاطین کے زمانے میں یہ سلطنتِ ہندوستان کا ایک دُور افتادہ حصہ تھا جس کی منزلت سرائے سرِ شاہراہ سے زیادہ نہ تھی۔ سرحد پنجاب ہندوستان کے حملہ آوروں کا دروازہ تھا۔ اور پنجاب بمنزلہ ایک سڑک کے تھا۔ جو بڑے بڑے دارالخلافوں تک پہنچتی تھی۔ وسط ایشیا سے آریا ورت کے بانی آئے تو اُن کو گنگ و جمن کی کشش نے راوی اور بیاس کے کناروں کو آباد نہ کرنے دیا۔ آریہ ورت پر محمود حملہ کرنے نکلا۔ تو اُسے کو بھی ہندوستان کی دولت کے مرکزوں نے اپنی طرف کھینچا۔ اور اُس کا شوق بت شکنی کو اُسے سومنات تک پھر الایا۔ مگر پنجاب پر اُس نے کوئی خاص التفات نہ کی۔ تیمور لنگ نے بھی اپنی جرار فوجوں کو لئے پنجاب میں سے گزر جانے پر ہی اکتفا کیا۔ اور شاہانِ مغلیہ کی شان و شوکت نے بھی دہلی اور آگرہ کو ہی انتخاب کیا۔ پنجاب کا پرانا دارالخلافہ لاہور۔ صرف ایک صوبہ کے گورنر کی ہی قیامگاہ رہا۔ اور پنجاب کے وسیع میدانوں سیراب کھیتوں اور دلچسپ سبزہ زاروں کا ذکر کہیں جہانگیر نے کشمیر جنت نظیر کو جاتے جاتے اپنی تزک میں لکھ دیا۔ کہ پنجاب کے فلاں مقام سے گزر ہوا۔ تو اُس کے منظر کو دلآویز پایا۔ کہیں کسی نے کابل کو جاتے ہوئے یا آتے ہوئے کسی مقام کو قابل تذکرہ خیال کر لیا۔ تو پنجاب کا نام آگیا۔ مگر اس سے زیادہ خصوصیت اسے بہت کم حاصل ہوئی۔ اس گمنامی کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ مدتوں دہلی اور لکھنؤ کے لوگ جن کی آنکھیں شاہی آب و تاب کے تماشے دیکھ چکی تھیں۔ پنجاب کو کچھ نظر حقارت سے ہی دیکھتے رہے۔ اور چونکہ یہاں کے باشندوں میں وہ نفاست اور سلامت نظر نہ آئی۔ جو شاہی دربار کے قرب نے اہل دہلی اور لکھنؤ اور اُن

شہروں کے مضافات کو سکھائی تھی۔ اس لیئے انھیں شائستگی کے حلقہ سے باہر سمجھتے رہے۔ اہل پنجاب جو اُن اثرات سے خالی تھے۔ جو اُن کے ہمسایوں پر پڑ چکے تھے۔ ہندوستانی حضرات کی غیر معمولی نازک مزاجی کو دیکھ کر اُن سے الگ رہے۔ اور انجام کار دونوں ایک دوسرے سے رُک رُک کے ملنے کے عادی ہو گئے۔ اور ہندوستانیوں اور پنجابیوں میں ایک علیحدگی سی ہو گئی سر سید مرحوم نے جو بڑے اہم کام اپنی زندگی میں سرانجام کئے۔ اُن میں یہ بھی کچھ کم قابلِ تعریف نہیں کہ اُنھوں نے ہندوستانیوں اور پنجابیوں میں ایک رابطۂ خاص پیدا کر دیا۔ اور ہندوستانی حضرات کو بجائے پنجابیوں سے نفور ہونے کے اُن کا مداح بنا دیا۔ اس میں شک نہیں۔ کہ اب تک ہندوستانیوں میں بعض ایسے لوگ ملیں گے۔ جن میں پہلی کشیدگی باقی ہے۔ اور پنجاب میں کچھ ایسے آدمی نظر آئینگے جو ہندوستانیوں سے بدستور کھنچتے ہیں۔ مگر ایسی صورتوں میں یگانگت اور اتحاد کی بنیاد مستحکم ہو رہی ہے۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ قوم کے دونوں حصّے ایک دوسرے کو بخوبی پہچانتے جاتے ہیں۔ شناسائی دوستی اور محبّت کی ابتدا ہے۔

جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے مُلک کا یہ چھوٹا سا حِصّہ پانچ دریاؤں سے سیراب ہوتا ہے۔ اور انگریزوں کے وقت میں یہ پانچ دریا حکمتِ جدید کے زور سے اتنی انہار میں تقسیم کر دیئے گئے ہیں۔ کہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ صفحۂ ملک پر پانی کی ایک چادر بچھ گئی ہے۔ یہاں کی زمینیں شروع سے حاصل خیز رہی ہیں۔ اور یہاں کے کسان محنت و مشقّت میں ضرب المثل ہیں۔ اُس پر پانی کی مناسب تقسیم نے وہ لُطف پیدا کیا ہے۔ کہ فصل کے دنوں میں اطراف ملک میں ایک گلزار کھل جاتا ہے فلک کا اہل ہند پر خاص عتاب نہ ہو۔ اور بارانِ رحمت کا نزول بھی انسانی حکمتوں کا معاون ہو جائے تو غلّہ کامیاب فصلوں میں اِس کثرت سے پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر دوسرے صوبجات میں نہ جائے اور ممالک غیر کی خرید نہ ہو۔ تو وہ ارزانی ہو کہ بایدو شاید۔ اس عام سیرابی کے علاوہ بعض قطعات خصوصیت سے سیر حاصل ہیں۔ ستلج اور بیاس کے درمیان ایک دوآبہ ہے۔ جو خوبی آب و ہوا اور کثرتِ باغات و اشجار کے اعتبار سے ممتاز ہے۔ ایک طرف راولپنڈی اور دوسری طرف گوردا سپور

کے قریب بعض مقامات دامن ہائے کوہ میں واقع ہیں۔ جن کے قدرتی چشمے اور خوشگوار پانی اور اُن کے زور پر بڑھنے والے میووں کے باغ "جنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ" کا سماں آنکھوں میں کھینچ دیتے ہیں۔ بعض اضلاع ہیں۔ کہ نسبتاً غیر آباد اور سرسبزی و طراوت سے خالی ہیں مگر اُن میں اور کچھ نہیں تو ہوا نہایت صحت بخش ہے۔ کشمیر کا قرب اور اس کے ساتھ پنجاب کا قدیم اور موجودہ تعلق اس صوبہ کے لئے باعثِ رونق ہیں۔ بعض اضلاعِ پنجاب کی حد ریاست کشمیر کی حد سے ملتی ہے۔ یہ اضلاع زبانِ حال سے ع

جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد

بیکار رہے ہیں شملہ کا پہاڑ اور اُس کے ساتھ کی پہاڑی ریاستیں۔ کانگڑہ کا ضلع مع اپنے قدرتی منظروں کے تماشائے قدرت کے دلدادوں کے لئے کشش خاص رکھتے ہیں۔ اور ان سب قدرتی سامانوں کا مجموعی اثر باشندگانِ پنجاب پر پڑتا ہے۔ کسی مُلک یا حصۂ مُلک کی جغرافیائی حالت ہمیشہ ایک خاص اثر اہلِ مُلک پر رکھتی ہے۔ اہلِ عرب کی ترقی کا راز اُن کے صحرائی مُلک میں مستور تھا۔ اگر انھیں گھر میں کھانے کو مل جاتا۔ تو مشکل تھا۔ کہ وہ دنیا کے مشارق اور مغارب کو چھان مارتے۔ اہلِ انگلستان بہ حیثیتِ قوم اچھے جہاز راں ہیں۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ قدرت نے اُن کو دُنیا سے اس قدر الگ تھلگ ڈال دیا تھا۔ کہ بغیر جہاز رانی کے وہ شائستگی کی نعمت سے بہرہ ور ہی نہ ہو سکتے تھے۔ اہلِ انگلستان کامیاب تاجر اور باہمت سیّاح ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ اگر صرف اپنے مُلک کے سہارے بیٹھے رہتے تو سوائے آلو کے کچھ کھانے کو ہی نہ ملتا۔ لوہے کا کام انگلستان میں سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ انگلستان کی سرزمین لوہے کی کان ہے۔ اسی طرح جاپان جو ایشیا میں جغرافیائی حالت میں انگلستان کا جواب ہے۔ اسی طرح برِّ اعظم سے الگ پڑا ہوا ہے۔ اسی طرح چاروں طرف پانی سے گھرا ہوا ہے۔ اسی طرح دندانہ دار ساحل بحر رکھتا ہے۔ اسی طرح اکثر پیداوار کے لئے دوسرے ملکوں کا حاجتمند ہے اور اُسی طرح ایک باہمت قوم کا وطن ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس اہلِ پنجاب بھی جیسی حالت میں ہیں۔ یا جس

حالت تک پہنچیں گے۔ اپنے وطن کی خصوصیتوں کے اعتبار سے ہی بنے ہوئے ہیں۔ اور اسی اعتبار سے بڑھیں گے۔ اُن کی زراعت پیشہ زندگی۔ اُن کے وطن کے کوہ و دریا۔ اُس کے جنگل میدان سب اس بات کے متقاضی ہیں۔ کہ یہ جفاکش اور سادہ اطوار ہوں۔ تکالیف کے عادی اور سفر کو آسان سمجھنے والے ہوں۔ ممکن ہے کہ پنجابی کی جفاکشی اور سادہ وضعی دوسرے صوبجات میں کنجوسی پر محمول کی گئی ہو۔ مگر جاننے والے جان سکتے ہیں۔ کہ یہی ایسی خوبیاں ہیں۔ جن سے اُمید ہو سکتی ہے کہ پنجابی بڑھنے والا آدمی ہے۔ پنجاب میں لکھ پتی اشخاص اکثر اوقات لمبے لمبے قدم مار کر چلتے۔ مستعدی سے کام کرتے۔ اور حسب ضرورت میلوں پیادہ چلنے کو آسان سی بات سمجھتے دکھائی دیں گے۔ ممالکِ مغربی و شمالی میں معمولی سفید پوش بھی تھوڑی دُور تک بغیر سواری کے چلنا عار سمجھے گا۔ پنجابی کے دستر خوان پر سیدھی سادھی روٹی اور سیدھا سادہ سالن ہو گا اور بس۔ ہندوستان میں دستر خوان دستر خوان نہ سمجھا جائے گا۔ جب تک اُس پر کم از کم چار یا پانچ رکابیاں نہ ہوں۔ یہاں تکلّف سے خالی ہونا ہُنر اور وہاں پُرتکلف ہونا داخل خوبی شمار ہو گا۔ ہمارا خیال ہے۔ کہ پنجابی کے لئے ضرورت ہے کہ کبھی کبھی اپنے ہندوستانی بھائی سے تکلّف کی کتاب کے بہت نہیں۔ تو ایک دو ورق ہی پڑھ لیا کرے۔ اور ہندوستانی کو چاہئے۔ کہ بے تکلفی کا سبق پنجابی سے سیکھ لے۔ شائستہ زندگی کے لوازم پنجابی کو ذرا پُرتکلّف ہونے کا تقاضا کرتے ہیں۔ مگر اس طرح کہ اپنی اصلی سادگی ہاتھ سے نہ کھو بیٹھے۔ ہندوستانی اگر زندہ دلوں کے وطن کی سیر کرے۔ اور پنجابیوں سے بے تکلف ربط اور میل جول بڑھائے۔ تو بہت سی وہ مردانہ اور مفید عادتیں سیکھ سکتا ہے۔ جو اُسے ترقی کرنے میں پوری مدد دیں۔

پنجاب کی اگر کوئی سیر کرے۔ تو جا بجا صحت بخش زندہ دلی کے ثبوت پائے گا۔ جس کو اگر عمدہ موقعوں پر استعمال کیا جائے۔ تو قومی امور میں سچی زندہ دلی پیدا ہو جائے۔ اس صُوبہ کی آبادی گلہائے رنگا رنگ کا ایک عجیب گلدستہ ہے۔ ہر شہر میں ایک معقول تعداد مُلک کے دیرینہ باشندوں کی ہے۔ جو آریہ نسل سے ہیں۔ پنجاب کے آریہ اصل والے باشندے رنگ و روغن میں

اپنے اُن بھائیوں سے اچھے ہیں۔ جو گنگا کنارے جا بسے ہیں۔ اور جن کے سنگ کو پورب کے آفتاب کی زیادہ سخت حدّت نے قدرے سیاہ کر دیا ہے۔ ان کے علاوہ ہر شہر میں ایک خاص حصّہ مسلمانوں کی مختلف اقوام کا ہے جن میں سیّد عربی الاصل۔ مُغل۔ تاتاری اور پٹھان افغانستان سے آئے ہوئے ہیں۔ اکثر بڑے شہروں میں ایک کثیر تعداد کشمیری الاصل باشندوں کی ملتی ہے جن میں سے بعض اب تک اپنی مادری زبان اور وطنِ مالوف کی عادات کو نباہے جاتے ہیں۔ اور بعض ٹھیٹھ پنجابیوں میں مل جُل گئے ہیں۔ اس ملاپ نے پنجاب کے بعض مقامات کو کانِ حسن و ملاحت بنا دیا ہے۔ اور وہ وہ صورتیں پیدا کی ہیں۔ جن کا نظیر ہندوستان کے اور بہت کم حصّوں میں پایا جاتا ہے۔ اثر قبول کرنے کی طاقت کچھ قدرت نے اس علاقہ میں ایسی ودیعت کی ہے۔ کہ شائستہ پنجابیوں میں اُن سب اقوام کی اچھّی اچھّی چیزیں جن سے اُنھیں سابقہ پڑا ہے۔ مروّج ہو گئی ہیں۔ پنجاب میں کئی گھر ملینگے جہاں خ ان دمرد ایرانیوں اور افغانیوں سے فارسی میں گفتگو کرتے۔ اور اُن کے ساتھ قہوہ پیتے ہیں۔ کشمیریوں کے ساتھ قیماقی چائے اُڑاتے ہیں۔ ہندوستانیوں کے ساتھ پان کھاتے ہیں اور اُردو میں باتیں کرتے ہیں۔ اور خالص پنجابی مجلس ہو تو پنجابی بولی جاتی ہے۔ اور حُقّہ تو بھری سبھا میں یوں پھرتا ہے۔ جیسے گوپیوں میں کاہن۔ ہر زبان کے تلفّظ کو پنجابیوں میں سے تیز ذہن لوگ آسانی سے اڑا لیتے ہیں۔ اور اُردو زبان کو یُوں بولتے ہیں۔ جیسے اُن کی اپنی ہو۔ با اینہمہ بلا ضرورت کم بولنے ہیں۔ اور خموشی پسند واقع ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ ہندوستانی بھائی اُنھیں عموماً گُمی کہتے ہیں۔ کوئی پنجابی آپ کو سفر میں ملے۔ تو بہت کم ایسا ہوگا۔ کہ خود بخود آپ سے مستفسرِ حالات ہو یا گفتگو شروع کرنا چاہے لیکن با گر اتفاق سے گفتگو شروع ہو جائے تو پردہ تکلف جلد درمیان سے اُٹھ جاتا ہے۔ دوست بننے میں پنجابی بہت مستعد اور زود باز نہیں مگر دوست بن جائے تو پکا دوست ہوتا ہے۔ پنجابی گھر کا ایسا ہی عاشق ہے جیسا ہند کا کوئی اور باشندہ۔ لیکن جب گھر سے نکل کھڑا ہو تو افریقہ اور آسٹریلیا اور امریکہ سب ایک ہے۔ دُنیا کے دُور سے دُور حصّوں میں پنجابی کا سُراغ ملتا ہے۔ اور جُوں جُوں علم کی روشنی پھیلتی جائے گی۔ زندہ دلوں کا وطن اپنے ہونہار بیٹوں کو ہر ملک و دیار اور ہر آب و ہوا میں جاگزیں ہوتا۔ اور پھلتا پھولتا دیکھے گا۔

عورتوں میں ہمدردی

عورتوں کو خدا نے بالطبع نرم دل پیدا کیا ہے۔ اور نرم دلی کا یہ تقاضا ہے۔ کہ جہاں کسی کو پریشان حال دیکھا۔ رقت پیدا ہو گئی۔ اور خواہ مخواہ دل یہی چاہنے لگا کہ ہو سکے تو اس سے کچھ ہمدردی کی جائے۔ ہمارے مُلک میں گو تعلیم نسواں کی کمی کے سبب عورتوں میں باہمی ہمدردی کی نظیریں ایک وسیع پیمانے پر عموماً نایاب ہیں۔ مگر اپنے اپنے حلقہ میں عورت ہمدردی کا ایک ذخیرہ رکھتی ہے۔ کسی ہمسایہ کی عورت کو کوئی صدمہ پہنچ جائے۔ یہ فوراً اُس کی دلجوئی پر آمادہ ہوتی ہیں۔ مردوں سے کہ کر مدد دلواتی ہیں۔ اور زبانی بھی ہر وقت اپنی غمزدہ بہن کی دلدہی کرتی ہیں۔ ایک دوسری کے سامنے اس سادگی اور صفائی سے اپنے دُکھڑے کہہ سکتی ہے۔ کہ مردوں میں اس کی مثالیں کم ملتی ہیں جس تحمل بردباری اور سچی ہمدردی کے ساتھ ایک عورت پہروں دوسری عورت کے دُکھ سُکھ کی کہانی سنتی ہے۔ اُسے دیکھ کر طبع انسانی کے متعلق اچھی رائے پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ میلان جس کے سیدھے سادھے اور بلا تصنع ظہور ہندوستان کی مستورات میں کم و بیش نظر آتے ہیں۔ مغربی دُنیا کی تعلیم یافتہ عورتوں میں بہت نفیس رنگ میں اور وسیع پیمانے پر پایا جاتا ہے۔ اور اس وقت اہلِ فرنگ کے لئے مایۂ ناز ہے۔ بعض اعلیٰ درجہ کی پڑھی لکھی اور خاندانی خاتونیں ایسی ہیں۔ جو ہمدردیِ نسواں اور اپنی جماعت کی خدمت کو اپنی زندگی کا سب سے اہم فرض اور بہت بڑا مقصد جانتی ہیں۔ مگر اُن خاتونوں کو چھوڑ کر بھی جنھوں نے اس قسم کی ہمدردی میں شہرتِ خاص حاصل کی ہے ہزاروں نیک نیت اور خدا پرست خاتونیں ایسی ہیں۔ جو اپنے مقدور کے موافق کوشش کرتی ہیں۔ کہ اُن کی ذات سے اُن کی بہنوں کو نفع ہو۔ اور چپکے چپکے غیر معلوم طور پر بغیر اس کے کہ طالبِ شہرت ہوں۔ اس کام کو ایک فرضِ مذہبی جان کر کئے جاتی ہیں۔ کوئی اپنے گھر کے کام کاج سے

فارغ ہوکر اپنی ہمسائی کے ہاں چلی جاتی ہے۔ اور اگر اُس کو انجیل پڑھنے کا شوق یا ملکہ نہیں ہے۔ تو اس کو انجیل سناتی ہے۔ یا اس کی لڑکیوں کو انجیل پڑھاتی ہے۔ یا سینا پرونا سکھاتی ہے۔ کوئی ایسے غربا کے گھر میں چلی جاتی ہے۔ جنھیں پیٹ بھر کھانے کو نہیں میسر ہوتا۔ اور انھیں کچھ کھانے کو دیتی ہے۔ اور عورتوں کو محنت مزدوری کے ایسے طریقے بتاتی ہے۔ جس سے وہ گھر کے مالک کی کمائی میں اضافہ کر سکیں۔ کوئی اُن مصیبت زدہ مکانات میں جاتی ہے۔ جہاں صاحب خانہ اپنی کمائی شراب کی نذر کر چکا ہے۔ اور زن و فرزند فاقہ مستی میں پڑے ہوئے صورت کی وجہ سے ایسی حالت کو پہنچ گئے ہیں۔ کہ خدا کی ہستی سے بھی انکاری ہیں۔ اُن کی مصیبت کو گھٹانا۔ اُن کو صبر سکھلانا۔ اُن کے گھر کی صفائی کی کوشش کرنا۔ اور ایسے ایسے اور دشوار کام یہ نیک بخت اپنے ذمہ لیتی ہے۔ اور سرانجام کرتی ہے۔ غرض اپنی اپنی سمجھ کے موافق ہر ایک چھوٹا کچھ مفید کام کر رہی ہے۔ اور ایسے طریق سے کہ دنیا کی آفرین سے کچھ غرض نہیں۔ بلکہ اپنے اعتقاد کے موافق اپنے خدا سے اجر کی خواستگار ہے۔ اس طبقہ میں بعض ایسی خاتونیں بھی ہیں۔ جو اپنے ہاں بیٹھی بیٹھی دوسرے ممالک کی عورتوں پر اپنے خیالات کے مطابق نیک اثر ڈالنا چاہتی ہیں۔ اور جن کی یہ خواہش ہے۔ کہ اُن کی بہنیں جو دنیا کے دوسرے حصوں میں آباد ہیں۔ ان نعمتوں کا جو انھیں حاصل ہیں حصہ پا لیں۔ اس خیال کی ایک خاتون کا خط جو ایک ہندوستانی خاتون کے نام انگریزی میں لکھا ہوا ہے۔ ہمیں اتفاق سے ہاتھ لگا ہے۔ اور ہم اُس کا ترجمہ اپنے ملک کی مستورات کے فائدے کے لیئے کیئے دیتے ہیں۔ تاکہ اُن کی آنکھیں کھلیں۔ اور انھیں معلوم ہو۔ کہ مغربی دنیا میں اُن کی بہنیں کیا کچھ کر رہی ہیں۔ اور اُن میں سے بعض کتنی روشن خیال ہیں۔ یہ میم صاحبہ جن کے خط کا ترجمہ ہم درج کیا چاہتے ہیں۔ امریکہ کے اُس حصہ کی ہیں۔ جو کینیڈا کہلاتا ہے۔ اور اُسی سلطنت کے زیر سایہ ہے۔ جس کا ہندوستان میں راج ہے۔ کینیڈا ہر چند کہ ترقی میں امریکہ کے آزاد اور جمہوری سلطنت والے حصے سے کم ہے۔ جسے ریاستہائے متحدہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تاہم نہایت مہذب و ترقی یافتہ ہے جس کا کافی ثبوت اس خط میں ملے گا۔ کیونکہ اس سے معلوم ہوگا۔ کہ وہاں

معمولی متوسط الحال خاتونوں کی تربیت کیسی ہے۔ اور خیالات کس قسم کے ہیں:۔

وہ خط یہ ہے:۔

کوچہ اردن نمبر ۱۱۲

وسٹ ماؤنٹ

کینیڈا۔ ۱۵ اگست ۱۹۱۰ء

میری مکرمہ!

تسلیم! آپ کا خط مورخہ ۱۵ جولائی۔ مجھے آج ہی ملا۔ اور مجھے بہت ہی خوشی ہوئی۔ کیسی خوشی کی بات ہے۔ کہ آپ کو میرے پچھلے خط سے اور اُس مرقع سے جو میں نے اُس کے ساتھ بھیجا تھا مسرّت ہوئی۔ اس وقت شمالی امریکہ کا یہ حال ہے۔ کہ ملک بھر میں خیالات کا رجُوع مذہب کی طرف ہوتا جاتا ہے۔ اور ہم اس میلان کو سوُرج کی روشنی کہتے ہیں۔ اسی لیئے یہ خیال عام ہوتا جاتا ہے کہ جس کسی کو کچھ خوشی حاصل ہو۔ وہ کسی دوسرے بھائی یا بہن کو اُس کا حصّہ دے۔ یہاں ایک انجمن اسی غرض سے قائم ہوئی ہے۔ گو میں ابھی اُس میں شریک نہیں ہُوں۔ تاہم جو کام مجھے دل سے پسند ہے۔ وہ یہ ہے کہ اخبارات اور رسالے جو مجھے ہاتھ لگیں میں دوسری بہنوں کو دکھاتی رہُوں۔ اور جو دوسری بہنوں کی نظر سے گذرے وہ مجھے دکھادیا کریں۔ میری ہمسائی کو جو اخبارات آتے ہیں۔ وہ پڑھ کر مجھے دے دیتی ہے۔ میں اُسے دے دیتی ہُوں۔ پھر جو فارغ ہو جائیں۔ اُن کو میں بذریعہ ڈاک کسی رشتہ دار یا سہیلی کے پاس بھیج دیتی ہوں۔ اور وہ پڑھ کر کسی اور تک پہنچا دیتی ہے۔ جب میں چھوٹی سی تھی۔ اور بورڈنگ سکول میں پڑھتی تھی تو میرے خاندان کی ایک بزرگ عورت نے میرے پاس ایک روزانہ اخبار بھجوانے کا انتظام کر دیا تھا۔ مجھے یہ تحفہ دل سے پسند ہُوا تھا۔ اور میں اس احسان کو عمر بھر نہ بھُولوں گی۔ بارہ سال ہوئے۔ وہ مرحومہ انتقال کر گئی۔ اور خدا جانے اُسے اب معلوم ہے یا نہیں کہ اُس کی یاد یہاں کیسی تازہ ہے۔ جب میری شادی ہو گئی۔ تو میرے خاوند کے ایک دوست نے جسے میں نے کبھی نہیں

لکھا تھا۔ اور جواب وفات پا گیا ہے۔ سالہا سال تک مجھے ایک بیش قیمت ماہوار رسالہ بھیج کر ممنون کیا۔ اور سچ یہ ہے۔ کہ اس رسالہ کے پڑھنے نے مجھ پر اور میرے بال بچوں کے دلوں پر بہت اچھا اثر کیا آپ کا خاوند چونکہ باخبر اور پڑھا لکھا آدمی ہے۔ وہ آپ کو بتا سکیگا کہ اس زمانہ میں اخبارات کے ہاتھ میں کتنی بڑی طاقت ہے۔ جسے چاہے وہ بھلائی کے لیئے کام میں لائیں۔ چاہے بُرائی کے لیئے میں آج پھر آپ کو دو اخبار بھیجتی ہوں۔ ایک تو ہی. قع تصویرات ہے۔ اور دُوسرا خاص عورات کے لئے ہے۔ جو مقام ٹارنٹو سے شائع ہوتا ہے۔ ٹارنٹو مثل اٹاوہ کے قدیم باشندگان امریکہ کی زبان سے لیا گیا ہے۔ یہ نام نہایت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک کے مشہور شاعر "لانگ فیلو کی نظم میں یہ نام اکثر آتے ہیں۔ کیا آپ نے "لانگ فیلو" کا کچھ کلام پڑھا ہے؟ کیا پاکیزہ کلام ہے۔ اگر آپ نے نہ پڑھا ہو۔ تو میں آپ کو اُس کی کلیات کی ایک جلد بھیج دُوں۔ کیونکہ اہلِ امریکہ کو اس شاعر کے وجود پر ناز ہے۔ اور ہم سب جانتے ہیں کہ اُس کی شہرت دُور دُور پھیلی ہے۔ اس مُلک میں ہمارا علم ادب ابھی ابتدائی حالت میں ہے۔ مگر یہ بھی معلوم رہے۔ کہ اس مُلک کی ابھی عمر ہی کتنی ہے؟ ہمیں یہاں آباد ہوئے صرف چند سَو سال ہوئے ہیں۔ حالانکہ ہندوستان ہزارہا سال سے آباد ہے۔ علاوہ بریں تمہارے آباؤ اجداد مُدتوں سے تعلیم یافتہ تھے۔ اور ہمارے بڑے اُس زمانہ میں وحشی تھے۔ البتہ اتنی بات ہے۔ کہ اب تہذیب یہاں روز افزوں ترقی کر رہی ہے۔ وسٹ ماؤنٹ۔ کیوبک میں۔ جو یہاں کا سب سے پُرانا صوبہ ہے۔ نمونہ کے طور پر پیش کئے جانے کے قابل قصبہ گنا جاتا ہے۔ اگرچہ مانٹریل کے ایک طرح ماتحت ہے۔ اور اُس کا جزو سمجھا جاتا ہے۔ تاہم یہاں ہمارا اپنا انتظام ہے۔ ہم مقامی عہدہ دار منتخب کرتے ہیں۔ یہ تعلیم یافتہ اصحاب ہیں۔ جن کا مقصدِ اعلیٰ یہ ہے۔ کہ مقام وسٹ ماؤنٹ پُرامن اور خوشحال مقام ہو۔ یہ قصبہ ایک خوبصورت پہاڑی پر واقع ہے۔ مکانات جن کی شکل و صورت سے مکینوں کی خوشحالی برس رہی ہے۔ اس پر واقع ہیں۔ پُرانے اور بڑے بڑے درخت اُن پر سایہ کئے ہوئے ہیں۔ اور اُن کے گرد رفاہِ عام کے لیئے زمینیں ہیں۔ جن کو نہایت کوشش

سے خوشنما حالت میں رکھا جاتا ہے۔ یہاں بجلی کے ذریعے چلنے والی گاڑیوں کا انتظام بہت عمدہ ہے۔ ہر پانچ منٹ کے بعد ایک نفیس گاڑی آپ کو مل سکتی ہے۔ اور پانچ سنٹ (اڑھائی آنہ) دے کر آپ سارے مانٹریل کی جس کا رقبہ دس میل ہے۔ سیر کر سکتے ہیں۔ مقام (مسٹ ماؤنٹ میں جس کی آبادی نو ہزار ہے۔ کوئی ایسی دکان نہیں۔ جہاں شراب مل سکے۔ اور اس سبب سے یہاں مخمور آدمی بہت کم نظر آتے ہیں۔ چھ سال کے عرصہ میں مجھے صرف دو آدمیوں کو نشہ کی حالت میں دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اور وہ بھی شراب مانٹریل سے جا کر لائے تھے۔ یہاں اتوار کو ہر دکان بند ہوتی ہے۔ اور لوگ پوری طرح اتوار مناتے ہیں۔ ہر شخص اچھے اچھے کپڑے پہن کر گرجے کو جاتا ہے۔ یا گلگشتِ چمن کرتا ہے۔ یا پہاڑ کے قدرتی نظاروں کا لطف اٹھانے کو گھر سے نکل پڑتا ہے۔ ہر طرف سے آرام اور استراحت کے آثار نظر آتے ہیں۔ ہمارے ہاں سات گرجے۔ تین بڑے بڑے مدرسے اور ایک کتب خانۂ عام ہے۔ جہاں سے اس قصبہ کا ہر باشندہ زن و مرد دو کتابیں ایک وقت میں مستعار لے سکتا ہے۔ بغیر اس کے کہ ممبری کا کوئی چندہ ادا کرے۔ ایک ریڈنگ رُوم (کمرہ) جس میں اخبارات وغیرہ رفاہ عام کے لئے رکھے ہوتے ہیں ہے جس میں بجلی کی روشنی ہے۔ اور جسے جاڑوں میں گرم ہوا بہم پہنچا کر خوب گرم رکھا جاتا ہے۔ اس میں ایک تعلیمیافتہ خاتون ہر وقت موجود رہتی ہے۔ جس کا فرض ہے۔ کہ بلا لحاظ مذہب و ملت و قوم ہر باشندۂ وسٹ ماؤنٹ کی وہاں خاطر تواضع کرے۔ اور اُن کو کتب خانہ کے اراکین سمجھے۔ اس قصبہ میں ایک عمدہ اور بڑا ہال بھی ہے۔ جو بڑے بڑے جلسوں کے لئے مخصوص ہے۔ اور اس کے ساتھ ورزش کا کمرہ اور غسل خانے اور حمام ہیں۔ جاڑے کے موسم کے لئے ایک حوض مکان کے اندر تیار کیا گیا ہے۔ اور گرما کے واسطے ایک بہت بڑا تالاب کھلی ہوا میں ہے۔ جس کے محافظ معقول اور معتبر آدمی ہیں۔ جو لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے علیحدہ علیحدہ اوقات نہانے اور تیرنا سیکھنے کے مقرر کرتے ہیں۔ بچوں کو تیرنا بتاکید سکھایا جاتا ہے۔ کتب خانہ اور ہال کے قریب ایک کھلی زمین نوجوانوں کی انواع و اقسام کی کھیل کود اور تفریح کے واسطے مہیا رہتی ہے۔ ایک چھوٹی سی جھیل بھی موجود

ہے۔ جس میں بچے اپنی چھوٹی چھوٹی کھلونوں کی سی کشتیاں چلاتے ہیں۔ رات کو اُس پُرفضا مقام میں بجلی کی روشنی ہوتی ہے۔ اور ہمیں ہمارے خاوند وہاں سیر کے لیے لے جاتے ہیں۔ اور ہم ایک طرف بیٹھ کر بچوں کی کھیل کود کا تماشا دیکھتی رہتی ہیں۔ میرے خاوند کو یہ فضا خاص کر بہت پسند ہے۔ اور وہ مجھے اکثر وہاں لے جاتا ہے۔ صحت کی حفاظت کے لیئے ایک انتظام ہمارے ہاں کا بہت اچھا ہے۔ ہمیں تاکیدی حکم ہے۔ کہ اپنے اپنے صحن اور گلی کوچے صاف اور ستھرے رکھیں۔ ایک ملازم پولیس اس کام کی نگرانی کے لیئے گشت کرتا رہتا ہے۔ اور ہفتہ میں دو دفعہ کوڑا کرکٹ ایک بڑی بھٹی میں ڈال کر جلایا جاتا ہے؛

میں یہاں تک لکھ چکی تھی۔ کہ مجھے چٹھیوں کے ایک صندوق میں ڈاک کے ہرکارہ کے چٹھیاں ڈالنے کی آواز آئی۔ جس سے مجھے آپ کی چٹھی کا ایک فقرہ یاد آیا۔ آپ نے پوچھا تھا۔ کہ کہیں میرا خاوند تو آپ کی تحریر کو نہ دیکھ لے گا۔ اس لیئے ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ میں آپ کو جتا دوں۔ کہ میرا خاوند میرے خطوط سے کچھ سروکار نہیں رکھتا۔ اُس کو مجھ پر ایسا اعتبار ہے کہ وہ اپنے کاغذات اور خطوط بھی مجھے رکھنے کو دے دیتا ہے۔ وہ بہت دانشمند اور دیانتدار آدمی ہے۔ اور متانت اُس کی طبیعت میں بہت ہے۔ میری طبیعت ویسی متین نہیں۔ اور میں زندہ دل اور خندہ پیشانی واقع ہوئی ہوں۔ اور یہی بات اُسے پسند ہے۔ جب وہ دن بھر کا کام کر کے تھکا ماندہ گھر میں آتا ہے۔ تو وہ چاہتا ہے۔ کہ کوئی باتوں سے اُس کا دل بہلائے۔ اور یہ کام میں کرتی ہوں۔ میں فرصت کے اوقات میں اخبارات پڑھ کر دنیا کے حالات معلوم کرتی رہتی ہوں۔ تاکہ اپنے شوہر سے اور اپنے لڑکوں سے اُن حالات کے متعلق آسانی سے گفتگو کر سکوں۔ میرے دو جوان لڑکے ہیں۔ جو اس وقت مجھ سے دو ہزار کوس پر برٹش کولمبیا میں ہیں۔ میں اُن کو مفصل خط لکھ کر اپنے دل کو خوش کرتی ہوں۔ اور وہ مجھے اپنی حالت کی نسبت مفصل اطلاع دیتے رہتے ہیں۔ مجھے اپنے لڑکوں پر فخر و ناز ہے۔ اور میں یقین کرتی ہوں۔ کہ اگر آپ صاحب اولاد ہیں۔ تو مجھے معذور سمجھیں گی۔ میرے بچے نہ شراب پیتے ہیں۔ نہ تمباکو۔ اور میرے شوہر نے ان کی

تربیت ایسی کی ہے۔ اور اُن کے خوب ذہن نشین کر دیا ہے کہ انسانی زندگی نہایت پاکیزہ ہونی چاہیئے۔ میرا بڑا لڑکا صیغۂ معدنیات کا انجینئر بننے کی تیاری کر رہا ہے۔ اور تین سال تک انجینری کے مدرسہ میں تعلیم پا چکا ہے۔ ابھی تین سال اُس کی پڑھائی کے باقی ہیں۔ کیونکہ اُس نے دوہرا نصاب اختیار کیا ہے۔ دُوسرا لڑکا ڈاکٹر بننا چاہتا ہے۔ دونوں برٹش کولمبیا کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ کیونکہ آب و ہوا خوشگوار ہے۔ اور ہر قسم کی آسائش وہاں موجُود ہے۔ وہاں بھی اتوار کو بالکل کام نہیں ہوتا۔ اور ریڈنگ روم بھی موجُود ہے۔ مگر افسوس ہے۔ کہ شراب کا بہت رواج ہے۔ اور اکثر لوگ سخت شرابی ہیں۔ سبب یہ ہے۔ کہ اُن کی آمدنی بےحساب ہے۔ اور اسی طرح بےحساب خرچ کرتے ہیں۔ اور روپیہ پانی کی طرح بہا دیتے ہیں۔

اب مَیں آپ کو اپنی لڑکیوں کا حال سُناتی ہُوں۔ میری تین لڑکیاں ہیں۔ اور تینوں لڑکوں سے چھوٹی ہیں۔ جب یہ پیدا ہوئیں۔ تو مجھے بہت خوشی ہوئی تھی۔ کیونکہ ہمارے مُلک میں لڑکیاں ماؤں کے لیئے بہت آرام دِہ ہوتی ہیں۔ اور میرا شوہر بھی لڑکیوں کو بہت پیار کرتا ہے۔ سب سے بڑی کا نام آینی ہے۔ اس کی عمر اٹھارہ سال ہے۔ اور اب تک مدرسہ میں پڑھتی ہے۔ دوسری مَیری ہے۔ جس کی عمر سولہ سال ہے۔ اور تیسری کا نام مارگریٹ جو آٹھ سال کی ہے۔ اب کے برس دونوں بڑی لڑکیاں ایک بورڈنگ والے مدرسے میں داخل ہوں گی۔ جسے پچاس برس ہوئے۔ ایک فرانسیسی خاتون نے ایک چھوٹے سے میں شروع کیا تھا۔ لیکن جو اب ترقی کرتے کرتے کینیڈا کے بہترین مدرسوں میں گنا جاتا ہے۔ میرے دونوں لڑکے بھی کچھ عرصہ اس مدرسہ میں پڑھ چکے ہیں۔ اس مدرسہ میں بچّوں کو کوئی نہ کوئی دستکاری سیکھنا لابدی ہے۔ خواہ کوئی کیسا ہی امیر کیوں نہ ہو۔ کچھ نہ کچھ کام ضرور سیکھنا پڑتا ہے۔

آپ نے مجھ سے کینیڈا کے قدرتی منظروں کی چند تصویریں مانگی ہیں۔ مَیں اگلی ڈاک میں ضرور بھیجوں گی۔ مجھے خوشی ہے کہ کینیڈا بھی اب بڑے ممالک میں شمار ہونے لگا ہے۔ خصوصاً جب یہ معلوم ہُوا۔ کہ اس میں بیش قیمت کانیں ہیں۔ اس کی وقعت بہت بڑھ گئی ہے۔ ریاستہائے

متحدہ امریکہ والے جو اپنے آپ کو "امریکن" کے نام سے موسوم کرتے ہیں چاہتے ہیں۔ کہ ہمیں اپنے ساتھ ملالیں۔ مگر ہم اپنے پرانے وطن انگلستان کے ساتھ ہی رہنا چاہتے ہیں۔ اور اپنے قدیمی جھنڈے کے زیر سایہ رہنا پسند کرتے ہیں۔ ہم اپنے فوائد کو خوب سمجھتے ہیں۔ اور انگلستان جیسے باضابطہ ملک کے محدود اختیارات والے بادشاہ کی رعایا ہونے کو پریسیڈنٹ کی رعایا ہونے پر ترجیح دیتے ہیں۔ کیونکہ جمہوری ریاستوں میں پریسیڈنٹ اپنی میعادِ مقررہ کے لیئے ایک قسم کا زارِ رُوس ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ریاستہائے متحدہ کے بعض پریسیڈنٹ نہایت اچھے اچھے ہوئے ہیں۔ جن کا چلن بہت اعلیٰ درجہ کا تھا۔ مگر ہمارا یہ خیال ہے۔ کہ ہم کینیڈا میں زیرِ سایہٗ برطانیہ ہی اچھے ہیں۔ اور اس لیئے ہم اپنے بال بچوں کو بھی سکھاتے ہیں۔ کہ برطانیہ کے وفادار رہیں۔ ہم جانتے ہیں۔ کہ برطانیہ میں عیوب اور نقائص ہیں۔ اور کبھی کبھی اس سے سخت غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔ مگر ہمارا عقیدہ ہے۔ کہ برطانیہ کے سر پر خدا کا ہاتھ ہے۔ اور آخر کار خدا اُس کو عیوب سے بری کر کے اس کے ذریعہ تمام دُنیا میں اپنی حکومت پھیلائے گا۔

میں حیران ہوں۔ کہ میرا قلم مجھے کہاں سے کہاں لیئے جاتا ہے۔ اور میں نے اس خط کو کس قدر لمبا کر دیا ہے۔ تاہم میں اُمید کرتی ہوں۔ کہ میں باعثِ ماندگی نہیں ہوئی۔ میں چاہتی ہوں۔ کہ آپ بھی مجھے لمبی چٹھی لکھیں۔ اپنی بابت آپ جو کچھ مجھے بتائیں۔ میرے لیئے نہایت دلچسپی کا باعث ہوگا۔ اور اس طرح ہماری دوستی مضبوط ہو جائے گی۔ اور جانبین کی خوشی کا ذریعہ اور فائدہ کا مُوجب ہوگی۔

آپ کو یہاں کی "مجلسِ خواتین" کا بھی حال معلوم ہے؟ میرا خیال ہے۔ کہ ابھی ہندوستان میں کوئی ایسی مجلس قایم نہیں ہوئی۔ یہاں کی مجلس لیڈی ابرڈین نے قایم کی ہے۔ ہر مذہب و ملت کی عورتیں اس میں شامل ہیں۔ اور کینیڈا بھر میں اس کی شاخیں ہیں۔ ان میں عورتیں جمع ہوتی ہیں مجالس منعقد کرتی ہیں۔ مضامین پڑھتی ہیں۔ تمدنی معاملات پر بحث کرتی ہیں۔ اور ان تمام امور پر جو دُنیا میں عورتوں اور بچوں کی حالت کو بہتر بنا سکیں۔ بحث ہوتی ہے۔ اس مجلس کا یہاں بڑا اثر

ہے۔کیونکہ بہت سے اعلےٰ طبقہ کی خاتونیں اس میں شامل ہیں۔ اور وہ اپنے شوہروں کو جو بڑے مدبران مُلک میں سے ہیں اس کی حالت پر توجہ دلاتی رہتی ہیں۔ مَیں ان جلسوں میں جا نا پسند کرتی ہُوں۔ اگرچہ مَیں باقاعدہ ممبر نہیں۔ لیڈی ابرڈین کے ذریعہ مُلک کو بُہت فائدہ پہنچا ہے۔ اُس نے بیمار دار عورتوں کی ایک جماعت مہیّا کی تھی۔ جس سے غُربا کو بُہت نفع ہو رہا ہے۔ اُس نے یہ بھی بندوبست کیا تھا۔ کہ اُن لوگوں کو جو خُود عُمدہ کتابیں خرید نہیں سکتے۔ یا اُن تک دسترس نہیں رکھتے۔ عُمدہ کتابیں پہنچ جایا کریں۔ یہ فی الواقع بُہت مُفید کام ہے۔ اور مجھے اس پر فخر ہے جو عورت کوئی بڑا کام کرے۔ مَیں اُسے اپنی ساری جماعت کے لیئے باعثِ فخر خیال کرتی ہوں۔ اور گو مَیں اس کے پایہ کو نہ پہنچ سکوں۔ مَیں دل سے اُس کی تعریف کرتی ہُوں۔ سچ یہ ہے کہ مَیں طبقہ نسواں میں پیدا ہونا باعثِ افتخار سمجھتی ہُوں۔ اور ہمیشہ خُدا کا شکر کرتی ہُوں۔ کہ اُس نے مجھے عورت بنایا۔ خدُا نے تمام دُنیا کو پیدا کرنے کے بعد آدم کو بنایا۔ اور پھر سب کے بعد آدم سے عورت کو پیدا کیا۔ مَیں جانتی ہُوں۔ کہ اس میں خدُا نے ہمارے لیئے اعزازِ خاص پنہاں رکھا ہے۔ مَیں اکثر مذاق کے طور پر اپنے شوہر سے کہتی ہُوں۔ کہ خُدا نے عورت کو آدمی کے پہلو سے پیدا کیا۔ تاکہ وہ اُس کا ساتھ دے۔ سر سے پیدا نہ کیا۔ کہ وہ اس پر حکومت کرتی۔ پاؤں سے پیدا نہ کیا۔ کہ وہ اُس کا حاکم ہوتا۔ بلکہ اس کا رفیق اور ہمسر بنایا۔ اس پر میرا خاوند مُسکرا کر جواب دیتا ہے "اگر تم عورتوں کا بس چلے تو تم سب حکومت پسند ہو" اس طرح چھُپکے چھُپکے چٹکیاں لینے میں بُہت طاق ہے۔ اور گو بظاہر خاموش ہے لیکن اُس نے طبیعت میں بُہت کچھ ظرافت پائی ہے۔ مَیں نے آپ کا خط اُسے پڑھ کر سُنایا تھا۔ اور وہ اُس سے ایسا ہی خوش ہُوا۔ جیسے مَیں۔ شاید ہماری عادات آپ کو ایسی عجیب معلوم ہوں۔ جیسی آپ کی ہمیں۔ مگر ہمیں ایک دُوسرے کی رسُوم و رواج کا ضرور لحاظ کرنا چاہیئے۔ مَیں کوشش کروُں گی۔ کہ آپ کو خطُوط اُن ہدایات کے موافق لکھوں۔ جو آپ مجھے لکھیں۔ اور اگر مجھ سے نادانستہ کوئی اور غلطی ہو۔ تو مجھے ضرور بتا دینا۔ اور اگر چاہیں۔ کہ مَیں ہی آپ کے خطُوط پڑھا کرُوں۔ اور اپنے خاوند کو نہ سُناؤں۔ تو مَیں

اِس پر بھی کاربند ہونے کو حاضر ہوں۔ ہماری تربیت کا یہ جزوِ اعظم ہے۔ کہ دُوسروں کے عقائدِ معاند خیالات کا اظہار نہ کیا جائے۔ مَیں نہایت خُوش ہُوں گی۔ اگر آپ مجھے خدماتِ لائقہ سے مطلع فرمادیں۔ یا مَیں کسی طرح آپ کی خوشی کے ازدیاد کا ذریعہ بن سکوں۔

مَیں ہُوں آپ کی صادقہ
م۔ ا۔ ک !

ہیر رانجھا

اُس سے بڑھ کر تصنع کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ کہ اکثر شعرا کو اس عظیم الشان اور وسیع مُلکِ ہندوستان میں کوئی دو سچے عاشق و معشوق اہل مُلک میں سے ایسے تلاش کرنے کا خیال نہیں ہُوا۔ جن کی باہمی محبت کے قصّوں سے وہ اپنی نظم میں کام لیں۔ چنانچہ ہم اپنے مُلک کے دو جابر زبانِ عشق کا ذکر کیا چاہتے ہیں۔ اور ایک ایسے شاعر کا نام لیا چاہتے ہیں۔ جس نے ان کے حسن و عشق کی داستان کو دوام کا خلعت بخش دیا ہے۔ افسوس ہے۔ تو اتنا کہ اس شاعر نے زبان ایسی اختیار کی جو بدقسمتی سے ملکی زبان نہیں ہے۔ ورنہ سرزمین پنجاب کا یہ دلفریب قصّہ شہرت کے پر لگا کر ہندوستان کے گوشہ گوشہ تک پہنچ گیا ہوتا۔ اور لوگ لیلےٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کے قصّوں سے زیادہ دل لگا کر اسے پڑھ رہے ہوتے۔ پنجاب میں تو اب بھی کوئی آدمی ایسا بے خبر نہ ہوگا۔ جو علاقہ جھنگ سیال کی مشہور جمیلہ ہیر اور تخت ہزارہ کے چودھری میاں رانجھا کے نام سے ناواقف ہو۔ مگر چونکہ اُن کی محبت کے افسانے صوبۂ پنجاب کی ٹھیٹھ بولی ہی میں منظوم ہوئے ہیں۔ اس لیے وہ انہی حدُود کے اندر محدُود رہ گئے۔ اور اُس حصّۂ مُلک میں جسے ہندوستان کہتے ہیں۔ اور جہاں زبانِ اُردو بولی جاتی ہے۔ اُن کا چرچا نہیں ہُوا۔ ہمارے ناظرین میں ایک کثیر تعداد ایک طرف تو ممالکِ مغربی و شمالی اور صوبہ بہار کے رہنے والوں کی ہے۔ اور دوسری طرف حیدر آباد دکن کے باشندگان کی۔ اور ان میں سے اکثر کے لیے یہ مشہور نام بالکل نئے ہوں گے۔ اسی خیال سے مناسب معلوم ہُوا۔ کہ ایک مختصر سا خاکہ اس قصّہ کا لکھ دیا جائے۔ تاکہ اُن اصحاب کو جنہوں نے پنجابی کتبِ قصص کو زیادہ مطالعہ کیا ہے۔ زیادہ مفصّل

حالات لکھنے کی ترغیب ہو۔ اور رفتہ رفتہ ہمارے اُن دوستوں کے پاس جو زبان پنجابی سے نا آشنا ہیں۔ اتنا کافی ذخیرہ معلومات کا پیدا ہو جاتے۔ کہ وہ محبت کی مثالوں میں ہیر اور رانجھے کو بھی پیش کرنے لگیں۔ اور انہیں یہ نام غیر مانوس نہ معلوم ہوں۔ اور وہ یہ نہ کہیں کہ یہ نام اُن کی زبان پر چڑھ نہیں سکتے۔

یوں تو پنجابی شاعری کا جزوِ اعظم ہیر اور رانجھے کے معاملہ کی طرف اشارات سے پُر ہے۔ مگر دو مشہور پنجابی شاعروں نے اپنی خداداد ذہانت اور لیاقت کو صرف اسی قصے کے نظم کرنے پر صرف کیا ہے۔ اور اُن کی مدت العمر کی کمائی اصل میں اُن کی وہی کتابیں ہیں۔ جو ہیر وارث شاہ اور ہیر فضل شاہ کے نام سے موسوم ہیں۔ یہ دونوں سخنور اپنی اپنی جگہ صاحب کمال گزرے ہیں۔ مگر آج ہمیں صرف اُن میں پہلے کے ساتھ سروکار ہے۔ وارث شاہ یا جیسا کہ عوام میں پکارا جاتا ہے وارے شاہ ایک فقیر منش اہل دل گزرا ہے۔ جس کا کلام جوہر قبول ساتھ لے کر آیا تھا۔ اور جیسے ہر دلعزیزی حاصل کرنے میں اتنی کامیابی ہوئی ہے۔ کہ اُس کی نظیر آسانی سے نہیں مل سکتی۔ وارے شاہ کا کلام پنجاب کی دیہاتی زندگی کا ایک جزوِ ضروری ہے۔ کسی گاؤں میں آپ جائیں آپ وارے شاہ پڑھنے والے اور سننے والے پائیں گے۔ کہیں دھوپ کے وقت آدھے دن کی سر توڑ محنت کے بعد کسی درختوں کے جھنڈ کے تلے کسی کنوئیں کے قریب چند دیہاتی جمع ہیں۔ اپنی اپنی روٹی کھا چکے ہیں۔ ذرا حقہ پیا اور سستانا چاہتے ہیں۔ کہ اُن میں سے ایک ہیر وارث شاہ کے ابیات گانے لگا۔ دم بھر میں سب کے سب حلقہ باندھ لیتے ہیں۔ اور لیٹنا اور سونا چھوڑ کر ہر ایک ہمہ تن گوش بن جاتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ اطمینان کا جلسہ اُس وقت ہوتا ہے۔ جب رات کو کام کاج سے نبٹ کر گاؤں والے شاملات دہ کے میدان میں یا کسی فقیر کے تکیے یا ٹھاکر دوارہ میں جمع ہوتے ہیں۔ اور ایک خوش الحان آدمی سے درخواست کی جاتی ہے۔ کہ وہ ہیر پڑھ کر سنائے۔ بہت سے پڑھنے والے ایسے ہوتے ہیں۔ جن کو کتاب کا بہت سا حصہ برزبان ہے اُن کا پڑھنا زیادہ پُر تاثیر ہوتا ہے۔ بعض کتاب کھول کر پڑھتے ہیں۔ اور سننے والے اس

خوشی اور اس توجہ سے سُنتے ہیں۔ کہ حیرت کی تصویریں نظر آتے ہیں۔ اس کے پڑھنے کے مختلف لہجے اختیار کئے گئے ہیں۔ اور ہر شخص اپنی خاص لَے میں پڑھتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ اگر کوئی زبان نہ بھی سمجھتا ہو۔ جب بھی ایک قسم تاثیر آواز کی اپنے قلب پر پاتا ہے۔ سالہاسال سے یہ قصہ اس طرح دہرایا جا رہا ہے۔ بوڑھے۔ جوان سب اسے سُنتے ہیں۔ اور قصہ میں بازبان میں باطرزِ بیان میں کچھ ایسی دلچسپی ہے کہ اُکتاتے نہیں۔ اس خاصیت میں "وارث شاہ" دُنیا کے مشہور شعرا سے مشابہت رکھتا ہے۔ اور اگر پنجاب میں سعدی یا شیکسپیئر سے کسی کو تشبیہ دینی ہو۔ تو وارث شاہ سے زیادہ مستحق اس تشبیہ کا کوئی نہیں مل سکتا۔ گو بہت سے اسباب سے "وارث شاہ" اس رتبۂ عالی کو جو بزرگانِ موصوف کو حاصل ہے۔ کبھی نہ پہنچ سکے۔ تصانیف کی رنگارنگی کے اعتبار سے ہوتے ہوئے بھی ان کی رنگارنگی کے اعتبار سے تو سعدی اور شیکسپیئر جیسے ناموران جہاں ایسے بلند پایہ ہیں کہ اور مصنفین کو ان سے نسبت دینا گستاخی ہے۔ مگر اپنی حدِ اثر میں وارث شاہ کئی باتوں میں ان سے مشابہ ہے۔ "وارث شاہ" اپنی محدود اور نا حال اُن گھڑ زبان کا ویسا ہی اُستاد ہے۔ جیسا کہ سعدی فارسی جیسی شیریں۔ اور شیکسپیئر انگریزی جیسی وسیع زبان کا الفاظ اور لغات کی کثرت "وارث شاہ" میں اپنی زبان کی بساط کے موافق دلیسی آیا ہے۔ جیسی ان مسلّم الثبوت اُستادوں میں محاورات اور ضرب الامثال وارث شاہ نے بھی اس کثرت سے اپنی کتاب میں جمع کی ہیں۔ کہ اُن کے مجموعے سے پنجابی زبان کی ایک خاصی "کتاب الامثال" تیار ہو سکتی ہے۔ مختلف طبقوں اور مختلف قماش کے لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے جس خوبی کے ساتھ وارث شاہ نے اُسی قماش کے لوگوں کی زبان اُڑائی۔ وہ اُسی کا حصہ ہے۔ اور اس کی نظیر شیکسپیئر میں ملتی ہے۔ مُلّا کی طرف سے جو گفتگو ہے اُس میں مسجد کی مُفت روٹیاں صاف جلوہ گر ہیں۔ رانجھے کی گفتگو میں سادگی۔ ناتجربہ کاری اور چوہدری زادہ ہونے کا گھمنڈ۔ عشق کی چوٹ اور گدا رسب مل کر پرتو فگن ہیں۔ ہیر کی باتیں دِل فریبی کے ساتھ الڑھ پن کا انداز لیئے ہوئے ہیں۔ ہیر کی نند کی باتیں شوخی اور شرارت کا پہلو برابر نباہتی چلی جاتی ہیں۔ کہیں وید اپنی دوائیوں کے خواص بتا رہا ہے۔ اور کہیں جوگی مختلف پنتھوں

کی تفصیل بیان کر رہا ہے۔ ایک طرف کوئی اہل اللہ رموزِ معرفت سناتا جاتا ہے۔ تو دوسری طرف کوئی خود غرض فقیر دلق طمع کی آڑ میں دنیا طلبوں کو شکار کرتا ہے۔ ملاح ملاحوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ اور بازاری مردوں اور عورتوں کے الفاظ اور خیالات کی سچی تصویریں موجود ہیں۔ یہ مرقع بے عیب ہوتا۔ اگر اس میں بعض جگہ فحش عبارتیں نہ آ جاتیں۔ مگر ہر زمانہ کا اپنا مذاق ہوتا ہے۔ جیسے سعدی کی کتابوں میں بعض فقرات ایسے ہیں جن کو لوگ آج کل نہیں سُن سکتے۔ یا جیسے شیکسپیر کے کلام کے خلاصے مدارس میں پڑھائے جانے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ اسی طرح موجودہ نفیس مذاق کے اطمینان کے واسطے وارث شاہ کی ہیر کا بھی ایک ایسا ایڈیشن تیار ہونا چاہئے۔ جس میں سے معیوب فقرات نکال دیے جائیں۔ اور جو چھپائی کے نقصوں اور لکھائی کے سقموں سے مبرا ہو۔ بلکہ اگر کسی سے ہو سکے۔ تو اس کے بعض الفاظ کا فرہنگ اور اس کے بعض اشعار پر حاشیے لکھے۔ تو پڑھے لکھے آدمیوں میں اس بیش بہا کتاب کے مقبول ہونے کی بہت زیادہ توقع ہو سکتی ہے۔ اور یہ کتاب اپنی خوبیوں کے اعتبار سے استحقاق رکھتی ہے کہ اس کے واسطے ایسی محنت برداشت کی جائے۔

اصل قصّے کی طرف آئیں۔ تو روایت یہ ہے کہ رانجھا ایک پنجابی نوجوان ہے۔ جو اپنے گاؤں کے چودھری کا بیٹا مردانہ حسن میں اپنے اقران و امثال میں ممتاز اور نشہ جوانی میں سرمست ہے۔ ایک دن اپنی بھاوجوں سے اس کی بحث ہو پڑتی ہے۔ وہ کہتی ہیں۔ کہ "تو کسی سے شادی کر" اور وہ کہتا ہے۔ کہ "میں گاؤں میں اپنے مذاق کے موافق حسین عورت نہیں پاتا۔ اس پر بگڑ کر وہ بولتی ہیں۔ کہ "دیکھیں تو کہاں سے کوہ قاف کی پری لے آتا ہے۔" وہ غصّہ کھا کر گھر سے نکل پڑتا ہے۔ اور ہیر کی شہرتِ حسن اُسے جھنگ سیال کی طرف کھینچ لاتی ہے۔ ریلوں، اور سڑکوں سے پہلے کے زمانہ میں پنجاب میں ایک ضلع سے دوسرے ضلع کا سفر بھی بے شمار مصائب سے پُر تھا۔ ابتدا ہی میں بیسیوں مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ بہت دقتوں کے بعد منزل مقصود پر پہنچ کر ہیر کے والد کے گھر شبانی کی خدمت لیتا ہے۔ صرف اس اُمید پہ

کہ اس تعلق کی بدولت ہیر سے دو چار ہونے کے موقعے ملتے رہیں گے۔ انھی ایام میں ہیر کے دل میں بھی اُس کا گھر ہو جاتا ہے۔ اور ایسی محبت کا بیج بویا جاتا ہے۔ جو آخر بڑھتا اور پھیلتا پھلتا ہے۔ اور زمانہ کی ناساعد ہوائیں اُس کو اکھیڑ نہیں سکتیں۔ جب ہیر کے والدین کو اس حالت سے آگاہی ہوتی ہے۔ تو وہ رانجھے کو معمولی حیثیت کا آدمی سمجھ کر اور اپنے درجہ سے کمتر جان کر اس خیال کو کہ ہیر اور رانجھے کی شادی ہو جائے پسند نہیں کرتے۔ اور عشق کی راہزنی کر کے ہیر کی شادی کسی اور سے کر دیتے ہیں۔ اور ہیر کو جلد سُسرال بھیج دیتے ہیں۔ اب رانجھے کو کیا پڑی تھی۔ کہ گلہ بانی کرتا۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ فقیر ہو جاتا ہے۔ اور فقیری رنگ میں اس مقام پر پہنچتا ہے۔ جہاں ہیر کے سُسرال تھے۔ وہاں دیہات کی سادہ اور بے پردہ زندگی کچھ عرصہ کے بعد اس بات کا امکان پیدا کرتی ہے۔ کہ رانجھا ہیر کے درشن کر لے۔ ہیر جوگی کی کرامتوں کا ذکر سُن کر معتقدانہ بھیس میں جوگی کی خدمت میں حاضر ہوتی ہے۔ مگر جوگی کی باتوں سے چوٹ کھائے دل کا درد بے اختیار ٹیک پڑتا ہے۔ اور حالِ دل چھپا نہیں رہتا۔ اور آخر یہ تدبیر بھی ناکام رہتی ہے۔ اور بہت سی تدبیریں کی جاتی ہیں۔ مگر کوئی کارگر نہیں ہوتی۔ اسی کشمکش میں دونوں کی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ ہیر کے والدین اُسے زہر دے کر مار ڈالتے ہیں۔ اور گویا رانجھا بے زہر ہی مرتا ہے۔ آخر دونوں داغِ حسرت لے کر قبر میں جا سوتے ہیں۔ صرف اُن کی مستقل اور بے لاگ محبت کا اتنا اثر ہوتا ہے۔ کہ اُن کا نام لوگوں کی زبانوں پر رہ جاتا ہے۔ اس قصہ میں ایک خصوصیت یہ ہے۔ کہ اس میں جذبۂ محبت کے جو جو ایثار اور قربانیاں بیان ہوئی ہیں۔ اُن میں خلافِ قیاس باتیں یا غیر ممکن کرشمے نہیں ہیں۔ بلکہ ایسے واقعات ہیں۔ جو ایسی حالت میں انسان سے سرزد ہونے ممکن اور قرینِ قیاس ہیں۔ گویا یہ قصہ نیچرل رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ اور یہ ایک باعثِ امتیاز ایسا ہے۔ کہ جس پر اس کے مصنف کو بجا ناز ہو سکتا ہے۔ کاش اُردو زبان کا کوئی نامور مصنف اس قصہ کو وارث شاہ کے خیالات کے ساتھ اُردو میں منتقل کر لے۔ مگر اس کے واسطے پنجابی اچھی طرح سمجھنا مقدم ہے۔ اور یہ وہ شوق ہے۔ جو زبانِ اُردو کے

مضمون نگاروں اور شعراء نے خواہ وہ پنجاب میں ہوں یا صوبجاتِ متحدہ اور اودھ میں۔ آج تک کیا
ہی نہیں۔ اغلب ہے۔ کہ کوئی زمانہ آئے گا۔ کہ وارث شاہ کا کلام تعلیمیافتہ لوگوں میں وقعت
کی نگاہ سے دیکھا جانے لگے گا۔ اور اُسے نہ صرف تفریحاً پڑھا جائے گا۔ بلکہ اُس کی تصنیف سے
نکاتِ علمی ڈھونڈیں گے۔ اور دانش و ظرافت کے بے شمار جواہرات جو اس کے اوراق میں دبے
ہوئے ہیں۔ سمیٹیں گے۔ اور اس طرح اُس زمانہ کی ابتدا ہوگی۔ جس میں پنجابی زبان علمی زبانوں کے
زُمرہ میں داخل ہوگی۔ اور وارث شاہ کی تصنیف کے ماہِ تاباں کے گرد اور بیسیوں خاص خاص اختر
چمکیں گے۔ اعلےٰ خیالات کے لکھنے والے اور قدرتی جذبات کی تصویریں کھینچنے والے مصنفوں
کی پنجابی میں کمی نہیں۔ مگر ان میں کئی ایسے ہیں۔ جن کا کلام بعض آوارہ گرد فقیروں کی زبان پر ہے
کہیں قلمبند نہیں ہوا۔ بعض ایسے ہیں۔ جن کی شاعری عوام کے مقبول گیتوں میں چھپی ہوئی ہے
نہ کوئی ان گیتوں کو جمع کرتا ہے۔ اور نہ سوائے عیش و طرب کے موقعوں کے اُن کو سنتا ہے
حالانکہ اہل پنجاب کی زندہ دلی کا راز اُن کی مردانگی کا جلوہ اُن کے اُن قومی گیتوں میں نظر آتا
ہے ؛

کیا رسم ستی بند ہو گئی ہے؟

در محبت چوں زنِ ہندی کسے مردانہ نیست
سوختن بر شمعِ مُردہ کار ہر پروانہ نیست

ہندوستان کی درسی کتابوں میں اکثر زعد کے ساتھ اس زمانہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جب سلطنت برطانیہ نے سرزمین ہند سے رسم ستی کی بیخ کنی کر دی۔ مُردہ خاوند کی لاش کے ساتھ بیوی کا جل مرنا قانوناً جُرم قرار دے دیا ہے۔ اور اس فعل کی امداد و اعانت کو بھی جرم ٹھیرایا۔ لیکن معلوم نہیں کتنے لوگوں نے اس بات پر غور کیا ہے۔ کہ رسم ستی فی الحقیقت بند بھی ہو گئی یا نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جہاں تک ظاہری جل مرنے کا تعلق تھا۔ وہ تو رُک گیا ہے۔ مگر ایک اور جل مرنا ہے جو ابھی جاری ہے۔ اور جس کے انسداد کی کوئی صورت جلدی نبتی نظر نہیں آتی۔ اور ہندوستان کی عورتوں کو اس جلا کر راکھ کر دینے والی آگ سے بچانے والا کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ ستی بذاتہٖ خود ایسی بُری رسم نہ تھی۔ کہ اُسے جُرم کہا جا سکے۔ اس کو معیُوب اس بات نے بنا دیا۔ کہ عورتیں جلنے پر مجبُور کی جانے لگیں۔ ورنہ باختیار خود جوشِ محبت کے اثر سے آگ میں کُود پڑنا مجنونانہ حرکت ہو تو ہو۔ محض وحشیانہ حرکت نہ تھی۔ بلکہ انسانی طبیعت کے ایک زبردست جذبہ کا پُر زور ظہور تھا ہندوستان کی بے شمار ستی ہونے والی بیواؤں میں کئی ایک ایسی نیک نہاد اور پاک طینت عورتیں ہوں گی۔ کہ اُن کی مردانگی کی یاد میں بُت بھی بنائے جائیں۔ شعر مندرجہ عنوان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک ایرانی شاعر کے دل پر ہندوستان کی اس رسم کا کیا اثر ہوا۔ اور اُس نے جل مرنے کو ایک ایسا فعل قرار دے کر جو رضا و رغبت سے قرار دیا گیا ہو ستی کی کیسے خوبصورت

الفاظ میں تعریف کی ہے۔ اور ہندوستان کی عورتوں کی بہادری کی کیا بے ساختہ داد دی ہے۔ افسوس وہ چتا میں کود کر جلنا تو ختم کر ہو گیا۔ مگر تمام عمر آتش غم پر کباب ہونا گیا۔ اس آگ میں اگر ہتی ذہمدی مجبور اً کود تی تھیں۔ تو یہاں تو نے نیندی مجبورا گڑھ گڑھ کر مرتی ہیں۔ اس میں جو بیس نیند کی کچھ جوش سے اپنے آپ کو قربان کرتی تھیں۔ کم از کم ان کو داد ملتی تھی۔ ان کی قسمت پر ہمارے ایرانی شاعر جیسے آنسو بہانے والے تو پیدا ہو جاتے تھے۔ مگر یہاں نہ کوئی خوشی سے بقیہ زندگی تلخ کر لینے والوں کی داد دیتا ہے۔ نہ مجبور جل بجھنے والیوں کے درد کو محسوس کرتا ہے۔ ہندوستان کے ہر گھر میں۔ اور ہر گھر میں نہیں۔ تو ہر گلی میں۔ ہر گلی میں نہیں۔ تو ہر محلہ میں ایسا بھاڑ موجود ہے جس میں کوئی باعصمت خاتون بے گناہ جل رہی ہے۔ مگر غضب یہ ہے کہ دھواں تک نہیں اُٹھتا۔ اور اگر اُٹھتا ہے۔ تو کوئی دیکھتا نہیں۔ اور اگر کوئی دیکھتا ہے۔ تو آگ بجھانا نہیں وہ جلنا ایک آدھ گھنٹے کے لئے تھا۔ یہ جلنا ایک آدھ عمر کے لئے ہوتا ہے۔ اُس جلنے پر لوگ کف افسوس ملتے تھے۔ اس جلنے کی کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ اُس جلنے کے بعد راکھ قدر و منزلت سے اُٹھا کر دریائے رواں کے صاف شفاف اور ٹھنڈے پانی میں بہا دیتے تھے۔ اس راکھ کے ذرّوں کو پانی برسوں اپنی ٹھنڈک پہنچاتا تھا۔ یہاں راکھ ہونے کی نوبت آنے سے پہلے کچھ ایسے سامان ہوتے ہیں۔ جو آگ پر تیل کا کام دیں۔ اور تیل بھی وہ تیل جو بجھتے بجھتے آتش کو تیز کر جائے۔ مگر پھر اکھنے نہ دے۔ بہ سبب انتہا زیبر ذکر اس ستی اور آج کل کی ستی میں بڑا فرق یہ ہے۔ کہ وہ قربانی خاوند کے مرنے کے بعد کرنی پڑتی تھی۔ اور اس قربانی میں کئی ایسی نیک بخت عورتیں بھی ہیں۔ جو خاوندوں کے جیتے جی چتا پر ہیں۔ شاعر نے فی الواقع بڑا عجیب نکتہ پیدا کیا ہے۔ اور نہایت نفیس پیرایہ میں زنانِ ہند کو قربانیٔ نفس کے بارہ میں دوسری عورتوں پر ترجیح دی ہے۔ مانا کہ عشق میں بڑی قوت ہے۔ اور عورت خاوند کی محبت میں یوں جان دے دے جیسے پروانہ شمع پر نثار ہو کر مرجاتا ہے۔ اور ایسی مثالیں ہر ملک میں نظر آتیں۔ مگر ایسا پروانہ اور کہاں ملتا ہے۔ جو بجھی شمع کے گرد پھرے۔ اور بجھی شمع پر فدا ہو جائے۔ یہاں بجھی شمع پر فدا

ہونے والیاں آج بھی موجود ہیں۔ ایک تو وہ جو خاوند کے مرنے سے حسبِ رواجِ ملک زندہ در گور ہیں۔ اُن کی حالت پر نظر ڈالئے۔ جو خاوندوں کے جیتے جاگتے مُصیبت میں ہیں۔ کئی گھر ایسے ملیں گے۔ جہاں خاوند کے دل میں محبّت کی آگ یا تو جہاں تک بیوی کا تعلق ہے۔ کبھی بھڑکی نہیں۔ یا تھی تو بجھ چکی ہے۔ مگر بیوی کے دل کو ٹٹولو۔ تو اسی بجھے شعلے کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ جو اُلفت پہلے تھی۔ وہ اب بھی ہے۔ جو خدمت کا شوق اوّل میں تھا۔ وہ آخر تک پایا جاتا ہے۔ جو ایثار آغاز میں تھا۔ وہی انجام تک ہے۔ جو وفا بچپن میں سیکھی تھی۔ وہ ہاتھ سے نہیں گئی۔ اندر ہی اندر تن من جلا دیا۔ مگر ظلم پر اُف تک نہیں کی۔ یہ وہ دستی ہے۔ جس میں زنِ ہندی آج تک ستی سے بڑھ کر مردانگی دکھا رہی ہے۔ گو آج اُس کی بہادری کی قدر مفقود ہے اگر یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس صفتِ خاص میں دُنیا بھر کی عورتوں میں ہندی عورت اپنا جواب نہیں رکھتی ؛

اسرارِ وجود

نشوی واقفِ یک نقطہ ز اسرارِ وجود
گر تو سرگشتہ شوی دائرۂ دوراں را (حافظ)

حافظ کا کلام جس پایہ کو پہنچ چکا ہے۔ محتاجِ بیان نہیں۔ اور اس قبولیت کی بڑی وجہ یہی ہے۔ کہ اس دریائے عرفان کے شناور کی زبان سے بے ساختہ رموزِ معرفت کے ایسے ایسے نکتے نکل گئے ہیں۔ جو اور شعرا میں کم پائے جاتے ہیں۔ بلکہ اس خاص صیغہ میں بیشتر شعرائے فارس وہندوستان حافظ کے خوانِ علم کے زلہ ربا ہیں انھیں نکات میں وہ نکتہ ہے۔ جو شعر مندرجہ بالا میں نہایت پرزور الفاظ میں ادا کیا گیا ہے گو اس کے سچے ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ مگر اس کے متعلق یہ بات قابلِ ذکر ہے۔ کہ اس شعر کا اور اس قسم کے اور اقوال کا اثر مختلف آدمیوں پر مختلف پڑتا ہے جہاں یہ منتہیوں کے لیے چراغِ ہدایت ہیں۔ وہیں یہ مبتدیوں کے لیے باعثِ گمراہی بھی ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ حافظ اور اس رنگ کے اور مصنفین اور شعرا کی تصانیف کی بابت ہمیشہ سے دو رائیں چلی آتی ہیں۔ ایک فریق ان کو نہایت اعلےٰ سمجھتا ہے۔ اور ان کی تعریف کرتے نہیں تھکتا اور دوسرا فریق اُن کی مذمت کرتا۔ اور اُن کے مطالعہ سے لوگوں کو روکتا ہے۔ اور اپنی اپنی جگہ دونو حق بجانب ہیں۔ اُن لوگوں کے لیے جو اِن حقایق کو دیکھ سکتے ہیں۔ جو ایسی کتابوں میں بھرے پڑے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے بہتر شغل نہیں ہو سکتا۔ اور اُن کے لیے جو اُس فہم سے بہرہ ور نہیں ہوئے۔ جو ان کے مطالب کے ادراک میں مدد دے۔ ان کا مطالعہ نہایت مضر

ہے۔ اب اسی مسئلۂ اسرارِ وجود کو دیکھئے۔ اس سے زیادہ سچی بات کیا کہی جاسکتی ہے۔ کہ اسرارِ وجود اس قدر پیچیدہ ہیں اُن کی تحقیقات کی راہیں ایسی باریک اور دشوار گزار ہیں۔ اور اُن کا علم کا احاطہ ایسا وسیع اور اُن کی اصلیت کا سمندر ایسا ناپید اکنار ہے۔ کہ آپ عمر بھر ٹکریں مارتے رہیں۔ اُن کی تہ کو پہنچنا محال ہے۔ لیکن اسی بات کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر کوئی یہ سُن کر تلاش اور جستجو کو ہی چھوڑ بیٹھے اور ہمت ہار دے۔ تو اُس سے زیادہ غلطی اور خسارہ میں پڑنے والا اور کون ہو سکتا ہے۔ دُنیا میں جتنے فلسفی گزرے ہیں۔ جن کا نام اُن کے علم و فضل اور خرد مندی کے سبب سے آجتک ادب سے لیا جاتا ہے۔ سب مدت العمر اسرارِ وجود کی تلاش میں مصروف رہے۔ اور شاہدِ مقصود ہاتھ لگا یا نہ لگا۔ مگر اُن کی یہی تلاش اُن کے بقائے نام کا سبب بن گئی۔ جتنے نامور اہلِ دین و بانیانِ مذاہب گزرے ہیں۔ اُن کی زندگی کا سب سے اعلیٰ مقصد اسرارِ وجود پر روشنی ڈالنا تھا۔ اور جہاں تک اُن کے وسائل نے اجازت دی۔ انہوں نے خود تلاش سے کام لیا۔ اور جو کچھ اُنھیں اس تلاش میں ملا۔ اُسے اُنھوں نے کھلے دل سے اپنے ابنائے جنس کے سامنے رکھ دیا۔ آگے یہ دوسروں کے نصیبوں پر رہا۔ کہ وہ کس حد تک اس تحقیقات سے مستفید ہوئے۔ ہر ایک نے اپنی محدود انسانی عقل اور اپنی مسدود حدِ نگاہ کے مطابق کچھ نہ کچھ اخذ کر لیا۔ اگر یہ سب لوگ اس نصیحت کے انہی معنوں پر عمل کرتے۔ جو حافظ کے مندرجۂ عنوان شعر سے حاصل ہوتے ہیں۔ تو یقیناً یہ مسئلہ سخت تاریکی میں رہتا۔ اور اسرارِ وجود سے تھوڑی بہت آگاہی رکھنے والے بھی دُنیا سے مفقود ہوتے۔ جو لوگ اُس رمز سے آگاہ ہیں جو حافظ شیرازی نے اس شعر میں بیان کی ہے۔ وہ یہ تسلیم کریں گے کہ یہ انتہائے مقصد رسی کا اظہار ہے۔ علم ابتدائی حالت میں انسان کو اپنی معلومات کی وسعت پر نازاں کرتا ہے۔ اس درجہ میں آدمی دوسرے ابنائے جنس کو نظرِ حقارت سے دیکھتا ہے۔ یا اُن کی کم علمی پر رحم کرتا ہے۔ اپنی بڑائی پر فخر کرتا ہے اور سمجھتا ہے۔ کہ ہمچو من دیگرے نیست۔ اس کے بعد ایک درجہ آتا ہے۔ کہ صاحبِ علم وسعتِ علم کو دیکھ کر خاموش ہو جاتا ہے۔ اور اُس کی خاموشی اُسے تصویرِ حیرت بنا دیتی ہے ؎

جو طبل تہی ہیں وہ ہنکار تے ہیں   جنھیں کچھ خبر ہے وہ کہتے ہیں کب کچھ

اس مرحلہ سے گذر کر ایک منزل آتی ہے۔ جہاں خاموشی پھر تبدیل بہ گویائی ہوتی ہے۔ مگر اس گویائی میں نخوت و غرور و تکبر کا کہیں پتہ نہیں ہوتا۔ ہر بن مو سے صدائے "من نیم" "من نیستم" نکلتی ہے اور علانیہ وہ پکار اٹھتا ہے۔

"ایں قدر دانستم کہ ہیچ نہ دانستم"

یہ تھا قول ایک مشہور ترین حکیم کا۔ اپنے بستر مرگ پر۔ موجودہ زمانہ کا ایک بڑا بلند پایہ جرمنی مصنف جس کے تبحر علمی کا سارا فرنگستان معترف ہے۔ مرتے وقت آب حیات علم کے لیے العطش العطش پکارتا ہوا گیا۔ اور اس کے آخری الفاظ یہ تھے۔ اور روشنی! اور روشنی! اسی بے چینی کا اظہار ہمارا نفا لے کیا ہے۔ جب اس نے یہ کہا ہے۔ کہ اسرار وجود کی تحقیق کے میدان میں خواہ آپ کتنے گھوڑے دوڑائیں۔ اس کے کوہ و دشت میں کتنا ہی سر ٹکرائیں۔ اور آخر کسی حد تک ایسی معلومات کو لے جائیں۔ مگر یہ سمندر اتنا وسیع ہے۔ کہ اس کے ایک قطرہ سے بھی آپ آشنا نہ ہوں گے۔ یہ دائرہ اتنا بڑا ہے۔ کہ اس کے ایک نقطہ پر بھی آپ حاوی نہ ہوں گے۔ اس کا مطلب جو کچھ ہم سمجھتے ہیں۔ انتہائے علم انسانی کے محدود ہونے کا اعتراف ہے۔ ورنہ اس سے یہ غرض ہرگز نہیں۔ کہ ہر نوجوان زندگی کا آغاز کرنے والا۔ ہر طالب علم طلب علم میں عازم سفر ہونے والا۔ ہر متلاشی اور ہر متجسس تلاش و جستجو سے دست بردار ہو جائے۔ کیونکہ ایک صاحب عرفان نے کہہ دیا ہے۔ کہ اس جستجو سے حاصل کچھ نہیں۔ طالب کو چاہیئے۔ کہ سرگرم جستجو رہے۔ بلکہ جستجو کا ہی کوچہ وہ کوچہ ہے۔ جس کی خاک چھاننی انسان کے لیے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ اور جس کی خاک چھانتے چھانتے انسان حقائق و معارف کے اتنے ریزہ ہائے زر و جواہر جمع کر سکتا ہے۔ کہ سمیٹے نہ سمیٹے جائیں۔ اور اس کا دامن گوہر مقصود سے مالا مال ہو کر ایسی دولت بے انتہا نظر آئے۔ کہ وہ مجبور ہو کر اٹھے ؎

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار   گلچین بہار تو زداماں گلہ دارد

ہے۔ اب اسی مسئلۂ اسرارِ وجود کو دیکھئے۔ اس سے زیادہ سچی بات کیا کہی جاسکتی ہے۔ کہ اسرارِ وجود اس قدر پیچیدہ ہیں اُن کی تحقیقات کی راہیں ایسی باریک اور دشوار گذار ہیں۔ اور اُن کا علم کا احاطہ ایسا وسیع اور اُن کی اصلیت کا سمندر ایسا ناپیدا کنار ہے۔ کہ آپ عمر بھر ٹکریں مارتے رہیں۔ اُن کی تہ کو پہنچنا محال ہے۔ لیکن اسی بات کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر کوئی یہ سُن کر تلاش اور کوشش کو ہی چھوڑ بیٹھے اور ہمت ہار دے۔ تو اُس سے زیادہ غلطی اور خسارہ میں پڑنے والا اور کون ہو سکتا ہے۔ دُنیا میں جتنے فلسفی گزرے ہیں۔ جن کا نام اُن کے علم و فضل اور خرد مندی کے سبب سے آجتک ادب سے لیا جاتا ہے۔ سب مدّت العمر اسرارِ وجود کی تلاش میں مصروف رہے۔ اور شاید مقصود ہاتھ لگا یا نہ لگا۔ مگر اُن کی یہی تلاش اُن کے بقائے نام کا سبب بن گئی۔ جتنے نامور اہلِ دین و بانیانِ مذاہب گزرے ہیں۔ اُن کی زندگی کا سب سے اعلٰے مقصد اسرارِ وجود پر روشنی ڈالنا تھا۔ اور جہاں تک اُن کے وسائل نے اجازت دی۔ انھوں نے خود تلاش سے کام لیا۔ اور جو کچھ انھیں اس تلاش میں ملا۔ اُسے انھوں نے کھلے دل سے اپنے ابنائے جنس کے سامنے رکھ دیا۔ آگے یہ دوسروں کے نصیبوں پر رہا۔ کہ وہ کس حد تک اس تحقیقات سے مستفید ہوئے۔ ہر ایک نے اپنی محدود انسانی عقل اور اپنی مسدود حدِ نگاہ کے مطابق کچھ نہ کچھ اخذ کر لیا۔ اگر یہ سب لوگ اس نصیحت کے انہی معنوں پر عمل کرتے۔ جو حافظ کے مندرجۂ عنوان شعر سے حاصل ہوتے ہیں۔ تو یقیناً یہ مسئلہ سخت تاریکی میں رہتا۔ اور اسرارِ وجود سے تھوڑی بہت آگاہی رکھنے والے بھی دُنیا سے مفقود ہوتے۔ جو لوگ اُس رمز سے آگاہ ہیں جو حافظِ شیرازی نے اس شعر میں بیان کی ہے وہ یہ تسلیم کریں گے کہ یہ انتہائے مقصد یہی کا اظہار ہے علم ابتدائی حالت میں انسان کو اپنی معلومات کی وسعت پر نازاں کرتا ہے۔ اس درجہ میں آدمی دوسرے ابنائے جنس کو نظرِ حقارت سے دیکھتا ہے۔ یا اُن کی کم علمی پر رحم کرتا ہے یا اپنی بڑائی پر فخر کرتا ہے اور سمجھتا ہے۔ کہ ہمچو من دیگرے نیست۔ اس کے بعد ایک درجہ آتا ہے۔ کہ صاحبِ علم وسعتِ علم کو دیکھ کر خاموش ہو جاتا ہے۔ اور اُس کی خاموشی اُسے تصویرِ حیرت بنا دیتی ہے ؎

جو طبل تہی ہیں وہ ہنکارتے ہیں　　　　جنھیں کچھ خبر ہے وہ کہتے ہیں کب کچھ

اس مرحلہ سے گذر کر ایک منزل آتی ہے۔ جہاں خاموشی پھر مُبدّل بہ گویائی ہوتی ہے۔ مگر اس گویائی میں نخوت و غرور و تکبر کا کہیں پتہ نہیں ہوتا۔ ہر بن مو سے صدائے "من ہیچ" "ہیچ نیستم" نکلتی ہے اور علامہ دہر بکار آشکارا تھا۔

"ایں قدر دانستم کہ ہیچ ندانستم"

یہ تھا قول ایک مشہور ترین حکیم کا۔ اپنے بستر مرگ پر موجودہ زمانہ کا ایک بڑا بلند پایہ جرمنی مصنف جس کے تبحر علمی کا سارا فرنگستان معترف ہے۔ مرتے وقت آب حیات علم کے لیے العطش العطش پکارتا ہوا گیا۔ اور اس کے آخری الفاظ یہ تھے۔ "اور روشنی! اور روشنی!" اسی بے چینی کا اظہار حافظ نے کیا ہے۔ جب اس نے یہ کہا ہے۔ کہ اسرار وجود کی تحقیق کے میدان میں خواہ آپ کتنے گھوڑے دوڑائیں۔ اس کے کوہ و دشت ہی کتنا ہی سر ٹکرائیں۔ اور آخر کسی حد تک ایسی معلومات کو لے جائیں۔ مگر یہ سمندر اتنا وسیع ہے۔ کہ اس کے ایک قطرہ سے بھی آپ آشنا نہ ہوں گے۔ یہ دائرہ اتنا بڑا ہے۔ کہ اس کے ایک نقطہ پر بھی آپ حاوی نہ ہوں گے۔ اس کا مطلب جو کچھ ہم سمجھتے ہیں۔ انتہائے علم انسانی کے محدود ہونے کا اعتراف ہے۔ ورنہ اس سے یہ غرض ہرگز نہیں۔ کہ ہر نوجوان زندگی کا آغاز کرنے والا۔ ہر طالب علم طلب علم میں عازم سفر ہونے والا۔ ہر متلاشی اور ہر متجسس تلاش و جستجو سے دست بردار ہو جائے۔ کیونکہ ایک صاحب عرفان نے کہہ دیا ہے۔ کہ اس جستجو سے حاصل کچھ نہیں۔ طالب کو چاہئے۔ کہ سرگرم جستجو رہے۔ بلکہ جستجو کا ہی کوچہ وہ کوچہ ہے۔ جس کی خاک چھاننی انسان کے لیے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ اور جس کی خاک چھانتے چھانتے انسان حقائق و معارف کے اتنے ریزہ ہائے زر و جواہر جمع کر سکتا ہے۔ کہ سمیٹے نہ سمیٹے جائیں۔ اور اس کا دامن گوہر مقصود سے مالا مال ہو کر ایسی دولت بے انتہا نظر آئے۔ کہ وہ مجبور ہو کر کہہ اٹھے ؎

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار　　　گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

تصویر کے دو رُخ

یُوں تو ہر تصویر کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ ایک روشن اور ایک دُھندلا ایک سفید اور ایک سیاہ۔ ایک طرف نقش و نگار اور ایک طرف ورقِ سادہ ایک رُخ صرف سادگی کی آرائش سے زیبا اور دُوسرا حُسن و خوبی سے معرا۔ مگر درد ناک اور تعجب خیز نظارہ اہلِ ہند کی سوسائٹی کی تصویر کے دو رُخ دکھاتے ہیں۔ افسوس اس تصویر کی نقل اُتارنے کے لیئے جیسے صاحبانِ فن کی ضرورت ہے۔ وہ مُیسّر نہیں۔ نقاشِ ازلی نے بھی اُسے کھینچ کر "دست از قلم کشید" پر عمل کر لیا ہے۔ اور جب کبھی کسی مصوّر نے اس کا نقشہ اُتارنے کی کوشش کی ہے۔ وہ نور اور پرتو دونوں کو یکساں تناسب کے ساتھ دکھانے میں کامیاب نہیں ہُوا کِسی کی تصویر میں نور اچھّا جلوہ گر ہے۔ تو پرتو ندارد۔ اگر کسی نقاش کی نظر پرتو پر جا پڑی ہے۔ تو نور نظر سے اوجھل ہو گیا ہے۔ ہاں چشمِ بینا کے مطالعہ کے لیئے نقاشِ ازل کے ہاتھ کی تحریر کے اوراق ہر وقت وا ہیں۔ آنکھ کھولیئے۔ کہ پردہ کھُل جائے۔ اور تماشا دیکھیے۔

چلیئے پہلے کسی دیسی عہدہ دارِ سرکاری کے مکان کی سیر کریں۔ ایک بڑی ڈیوڑھی سے گُزر کر ایک وسیع صحن میں جا پہنچتے ہیں۔ صحن کے عین وسط میں ایک حوض ہے۔ جو پانی سے لبالب ہے۔ حوض کے چاروں طرف خوشنما گملے رکھے ہیں۔ کُرسیاں بچھی ہوئی ہیں۔ اور ہمارے معزز عہدہ دارِ سرکاری جو ایک پُرانی وضع کے بزرگ ہیں۔ کچہری سے آکر چوغہ وغیرہ اُتار کر ذرا سستا رہے ہیں۔ اور ہمارے معزز دوست پیچوان کی چاندی کی مُہنال مُنہ میں لیئے دُھوئیں کے بادل نکال نکال کر اُن کی پیچ در پیچ رفتار کا ایک مست نگاہی کے ساتھ

لطف لے رہے ہیں۔ گویا آرام و آسائش کی مورت ہیں۔ اگر کوئی اجنبی اتنی ہی کیفیت کو دیکھے تو سمجھے کہ ہندوستان میں لوگ بڑے آرام سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن ذرا گستاخی سے نگاہِ تصور کو زنانہ کی طرف لے چلئے۔ اور نقشہ ملاحظہ کیجئے۔ کہ "گھر کے لوگ" کس حالت میں ہیں۔ بیوی صاحبہ ہیں۔ کہ جیسا رہ جیسی ایک چارپائی پر متمکن ہیں۔ چارپائی پر ایک طرف کو ایک پاندان رکھا ہے۔ جس کے باہر تک کتھے چونے کے دھبے ہیں۔ اس کے پاس ایک نیچے کا ٹوٹا سا کھٹولا پڑا ہوا ہے۔ پائینتی کی طرف کچھ ساگ پات دھرے ہیں۔ اور وہ ملا کو پکار رہی ہیں۔ "اری جلدی کھانے کی فکر کر۔ ابھی میاں آتے ہوں گے۔ ذرا دیر ہو گئی۔ تو میری جان کھا جائیں گے۔ تیرا کیا جائے گا۔" ادھر سے ملا بڑبڑاتی ہوئی آتی ہے:۔

"جب سے اس گھر میں آئے ہیں۔ نہ دن کو چین نہ رات کو آرام۔ سارا دن کام کاج میں کھپ جاتا ہے۔ اور پھر بیوی کو دیکھو۔ تو پیشانی سے بل ہی نہیں اترتا"۔ اور سامنے آ کر پکار کر کہتی ہے "میاں تو ابھی گئے ہیں کون سی فارغ بیٹھی تھی۔ کہ اس سے پہلے کچھ فکر کرتی"۔ اتنے میں ایک چھوٹی سی لڑکی باورچی خانہ کی طرف سے راکھ سے کھیلتی ہوئی آجاتی ہے۔ اور اسے دیکھ کر اس کی ماں طیش میں آجاتی ہے" ابھی نگوڑی کو نہلا دھلا کر بھیجا تھا ذرا ابھی چھم لتھڑی ہوئی آگئی اب کہاں تک کوئی ان کو صاف رکھے۔ اور وہ آئیں گے۔ تو مجھے ڈانٹیں گے ذرا آپ تو ایک دن بھی خبرگیری کرنی پڑے۔ تو حال معلوم ہو" اور لڑکی سے مخاطب ہو کر۔ "اری چڑیل آ تو سہی تجھے سمجھوں گی۔ اب باورچی خانہ میں جانا۔ اگر دسپنا تجھ پر توڑ نہ دیا تو کہنا" یہ گھڑکی سنتے ہی لڑکی بسورنے لگتی ہے۔ اور اس حالت میں ماں کے ماتھے پر بل پڑتے دیکھ کر پھوٹ پڑتی ہے۔ اور چلا چلا کر رونے لگتی ہے۔ رونے کی آواز مردانہ تک گئی۔ اور ہمارے عہدہ دار صاحب چیخے۔ "یہ کیا غل مچا رکھا ہے۔ جب آؤ۔ اس گھر میں کچھ نہ کچھ شور ہی پاؤ گے۔ جاؤ جمن (نوکر کا نام ہے) ذرا بیگم کے ننھی کو لے لینا"۔ جمن آواز دیتا ہے اندر سے آواز آتی ہے "ٹھہرو ذرا اس کا منہ دھولیں"۔ مگر لڑکی بھاگ کر اسی طرح لتھڑی

ہوئی جُتن کی گود میں آجاتی ہے۔ اور وہ نامعقول بے سوچے سمجھے اُسے میاں کے سامنے لے آتا ہے۔ لڑکی کی صورت دیکھتے ہی جھلاتے ہیں۔ اور غُصّہ کے جوش میں بھرے ہوئے اندر جاتے ہیں۔ تم سارے دن بیٹھی ہوئی کیا کرتی رہتی ہو۔ کہ ذرا لڑکی کا بھی دھیان نہیں رکھ سکتیں۔ لڑکے تو اب تمہارے محتاج نہیں۔ اُن کے لئے تو میاں جی نوکر ہے۔ وہی بے چارہ اُنھیں کپڑے پہناوے۔ وہی سیر کو لے جائے۔ وہی سبق پڑھا چھوڑے۔ ایک لڑکی ہے محسن کی طرف بھرے گھر میں کوئی توجہ کرنے والا نہیں" یہ عتاب سُنتے ہی بھلا تاب کسے! بیوی بھی بگڑ کر جلے پھپھولے پھوڑنے لگتی ہے۔ اگلے پچھلے گلے شکوے دفتروں کے دفتر کھل جاتے ہیں۔ اور آخر ایسی تلخی تک نوبت پہنچتی ہے۔ کہ میاں کھانا کھائے بغیر شام کو پڑے رہتے ہیں۔ اور بیوی الگ مُنہ لپیٹ کر اپنے بڑوں کو کوستی ہے۔ کہ ایسے سخت گیر خاوند سے بیاہ دیا۔ کہ عُمر رونے میں کٹ گئی۔

اب یہاں زیادہ ٹھہرنے کی ضرورت نہیں۔ انہی کے ہمسایہ میں ایک اور معزز عہدہ دار رہتے ہیں۔ مگر وہ نئے رنگ کے آدمی ہیں۔ ذرا اُن کے ہاں ہوتے چلیں۔ ایک پُرتکلف نشست ہے۔ جس کے دروازوں پر چلمنیں پڑی ہیں۔ اندر پردے لٹک رہے ہیں۔ کمرہ کی آرائش میں انگریزیت کی صاف جھلک نظر آرہی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ مکان کے سجانے کا یہ نقشہ ضرور کہیں سے اُڑایا ہوا ہے۔ کچھ کرسیاں قرینے سے دھری ہیں۔ کونے میں ایک میز رکھی ہے۔ جس پر شیشہ، کنگھی۔ انگریزی خوشبودار تیل بال سنوارنے کا برش سب سامان درست ہے۔ وسط میں ایک میز ہے۔ جس پر چند نہایت عمدہ جلدوں کی کتابیں ہیں۔ اُن میں بعض تصویروں کے البم ہیں بعض عمارات اور مشہور مقامات کے نقشے ہیں۔ ایک آدھ دلچسپ ناول ہے۔ ایک کسی مشہور سیاح کا سفر نامہ ہے۔ غرض ہر چیز سے صاحب خانہ کی تربیت۔ سلیقہ شعاری اور صفائی مذاق کا پتہ چلتا ہے۔ اتنے میں دو صاحب نئی وضع کے لباس میں ملبوس گپ شپ کی باتیں کرتے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔ اُن میں سے تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ اصلاح مُلک

قوم کی فکر میں اکثر مبتلا رہتے ہیں۔ اور کبھی کبھی اپنی خوش تقریری سے بھی کام لیتے ہیں۔ اور اپنے خیالات کا اثر لوگوں کے دلوں پر ڈالنا چاہتے ہیں۔ ذرا ان کی گفتگو سُن لیجئے۔

صاحبِ خانہ :۔ اب آپ بہت دنوں میں تشریف لائے۔ آپ کے دیکھنے کو ہمیں ترس گئیں۔ جب آپ کو دیکھتا ہُوں۔ دِل خُوش ہو جاتا ہے۔ قومی کاموں میں آپ کی طرح دِل سوزی کرنے والے ہم لوگوں میں ابھی بہت کم ہیں۔

مُصلح :۔ جناب یہ سب آپ کی قدردانی ہے۔ ورنہ میں کیا اور میری خدمات کیا؟ واللہ! اگر آپ جیسے قدرداں نہ ہوں۔ تو اِس مُلک میں دم گھٹ جائے۔ مُلک کے واسطے آپ کوئی کام کیجئے۔ اہلِ مُلک آپ سے بدظن ہو جائیں گے۔ اور داد کی بجائے اعتراضوں کی بوچھاڑ کریں گے۔ اب اسی عورتوں کی اصلاح کے مسئلہ کو دیکھئے۔ جس سے مجھے دلچسپی ہے۔ کیسا ضروری معاملہ ہے۔ اور لوگ اس سے کس قدر غافل ہیں۔ اور تو اور۔ جو نیک صلاح دے۔ اُلٹے اُس کے سر ہو جاتے ہیں۔

صاحبِ خانہ :۔ واقعی جس اِستقلال سے آپ ان دِقتوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ آپ ہی کا کام ہے۔ فرمایئے۔ اب کچھ عرصہ سے آپ نے کوئی لیکچر نہیں دیا۔

مُصلح :۔ جناب مجمع ہی نہیں ہوتا۔ آپ کا شہر ایسے بے مذاق آدمیوں سے بھرا ہُوا ہے۔ ورنہ بندہ تو ہر وقت حاضر ہے۔ اب پرسوں کے لیئے ایک جلسہ قرار پایا ہے۔ اُسی کے اہتمام میں جاتا ہُوں۔ اور آپ سے مُرخص ہوتا ہُوں۔ آپ بھی قدم رنجہ فرمایئے گا۔

غرض صاحبِ خانہ سے وعدہ لے کر وہ تو رُخصت ہُوئے۔ اور صاحبِ خانہ تشریف لے گئے۔ گوش زد چانڑے دارد۔ ابھی ابھی عورتوں کی اِصلاح کا ذکر تھا۔ بیوی سے اسی کے متعلق گفتگو شروع ہوئی :۔

میاں :۔ مَیں نے کئی دفعہ تم سے کہا ہے۔ کہ ابھی موقع ہے۔ کچھ شُد بُد لکھنا پڑھنا

سیکھ لو۔ واقعی جب کبھی باہر لکھی پڑھی عورتوں کا ذکر ہوتا ہے۔ تو مجھے سخت ندامت ہوتی ہے اور میں تو اسی خیال سے تعلیمِ نسواں کی حمایت میں کچھ کہنے سے شرماتا ہوں۔ کہ میرے اپنے گھر میں پڑھی ہوئی بیوی نہیں۔

بیوی :۔ یہ کیا آپ کو دھن لگی ہوئی ہے۔ کیا سارے زمانہ کی عورتیں پڑھی ہوئی ہوتی ہیں۔ ہمارے تو کنبہ بھر میں کبھی لکھنے پڑھنے کا چرچا نہیں ہوا۔ کسی کو بہت خیال ہوا۔ تو کلامِ مجید ناظرے پڑھنا سیکھ لیا کہ چلو ثواب کا کام ہے۔ یہ ایک نئی علّت لگی۔ کہ پڑھے بغیر گزارہ ہی نہ ہو۔

میاں :۔ گزارے کی تو بات ہی الگ ہے۔ اب ہم زندگی بھگت ہی رہے ہیں نہ مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ بغیر خواندہ بیوی کے زندگی بے لطف ہے۔

بیوی ۔ (چانک بگڑ کر) :۔ تو کوئی خواندہ ڈھونڈھی ہوتی۔ میری تو ماں کی آنکھوں پر تمہارے ہاں کی رزق روٹی دیکھ کر پٹی ہی بندھ گئی۔ کہ اُس نے مجھے یہاں جھونک دیا۔ ہر وقت پڑھائی کا طعنہ۔ ہر وقت پڑھنے کا جھگڑا اور کوئی بات ہی نہیں بس یہی ایک چھیڑ ہاتھ لگ گئی۔ اب کوئی اور خواندہ کر لاؤ۔ ہم سے بھی جیسے ہوگا۔ زندگی کاٹ ڈالیں گے۔ (اور بلند آواز کر کے) آگ لگے۔ ایسی روٹی کو! چولھے میں جائے ایسا رزق! (رونے کی آواز آنے لگتی ہے)۔

میاں بے چارے سلیم الطبع آدمی۔ دم بخود۔ خواہ مخواہ امن خانگی میں خلل اندازی پر پچھتاتے۔ کچھ اپنی تعلیم کو کچھ اپنی قسمت کو کوستے باہر نکل آتے ہیں۔ اور دل ہی دل میں کڑھتے ہوئے خدا سے شکایت کرتے ہیں۔ کہ یا تو اس ضرورت کا احساس نہ دیا ہوتا۔ یا والدین کے دل میں بھی جن کے ہاتھ میں اولاد کی مناکحت کی باگ ہوتی ہے۔ اس ضرورت کا احساس ڈال دیا ہوتا ؎

خرم آنکس کہ از جہاں بے خبر است ہوش است کہ سرمایہ صد دردِ سر است

دربیضہ نمے کنند مرغاں فریاد ہرچند کہ بیضہ از قفس تنگ تراست

اب خدا قومی مصلح کا تعاقب کیجئے۔ دوست کی ملاقات سے فارغ ہو کر ایک چھاپہ خانہ میں پہنچے۔ وہاں اسی طرح ناقدردانی زمانہ کے دکھڑے روئے اور کہا کہ خیر۔

کس بشنود یا نشنود من گفتگوئے مے کنم

بلا سے لوگ نہ مانیں ہم تو اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں گے۔ ایک اشتہار لیکچر کا پرسوں کے لئے چھاپ دیجئے لیکچر کا موضوع یہ ہو۔ "عورتوں اور مردوں کے حقوق مساوی ہیں؟" موضوع کا اظہار کرنے پر دیر تک صاحب مطبع سے اس اصول پر بحث رہی۔ حضرت مصلح نے بڑے شدومد سے اس اصول کو ثابت کیا۔ اور کہا۔ مرد عورتوں پر اس ملک میں بڑا ظلم کرتے ہیں۔ اور ان کے حقوق غصب کئے بیٹھے ہیں۔ ان کو خدا کے روبرو جواب دینا ہوگا۔ اس گفتگو سے فارغ ہو کر گھر پہنچے۔ ایک پرانے سے گھر میں جس میں کواڑ کھٹولے تک درست نہیں۔ ایک دالان میں جہاں باوجود شام ہو جانے کے چراغ تک نہیں جلا تھا۔ ایک بے کس سی عورت لیٹی تھی۔ یہ ہمارے لیکچرار صاحب کی اہلیہ تھی۔ لیکچرار صاحب نے اُسے کس مپرسی کی حالت میں پڑا رہنے دیا۔ اس کو پوچھا تک نہیں۔ اور آپ الگ صحن میں ایک ٹوٹی سی چارپائی پر دراز ہو گئے۔ وہ نیک بخت اٹھی۔ اور پنکھا لے کر جھلنے لگی۔ وہ کھڑی پنکھا کرتی رہی۔ ہمارے انصاف پسند دوست کے منہ سے یہ نہیں نکلا کہ بیٹھ جاؤ۔ نہ کوئی شکریہ کا کلمہ نکلا۔ کچھ دیر کے بعد بغیر کسی خطاب کرنے کے پوچھا "کھانا تیار ہے؟" وہ دوڑی اور کھانا نکال لائی۔ پاس بیٹھ کر کھلانے لگی۔ جو کچھ پکا تھا۔ اُس نیک اور ایثار کرنے والی بی بی نے خاوند کے آگے لا کے رکھ دیا۔ اور جو کچھ اُس نے کھانے کے بعد چھوڑا۔ اُس سے اپنا پیٹ بھر لیا۔ معلوم نہیں ہمارے لیکچرار کے دل میں ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال آیا یا نہیں۔ کہ اُن کے گھر میں زن و مرد کے حقوق کی مساوات کہاں تک ملحوظ ہے۔ لیکن اگر آیا بھی ہوگا۔ تو انہوں نے یہ سمجھوتہ کر لیا ہوگا۔ کہ اگر عورت بھی پڑھی لکھی

ہو۔ تو اُس کے حقوق اُن کے ساتھ برابر ہوں۔

چلئے اِن کے حال سے درگزر کرکے اِن کے ایک پڑوسی بابو صاحب ہیں۔ اُن کی خانہ داری کا اندازہ کرتے چلیں۔ بابو صاحب کہیں باہر گئے ہیں۔ اُن کی غیر حاضری میں بام خانہ پر ایک عورت چھڑکاؤ کررہی ہے۔ ایک چارپائی پر بچھونا بچھا ہے۔ اُس کے پاس اُسی عورت نے حقّہ بھر کر رکھ دیا ہے۔ اُس عورت کی پوشاک یہ ہے۔ کہ ایک میلا سا کپڑا ہے۔ جسے یہ سر سے پاؤں تک ساڑھی کے طور پر اوڑھے ہوئے ہے۔ مگر وُہ ستر میں کچھ بہت مدد نہیں دیتا۔ شاید خیال گزرے۔ کہ یہ کوئی خادمہ ہے۔ مگر نہیں۔ یہ بابو صاحب کی بیوی ہے۔ جو آپ تو دُھلے ہوئے کپڑے بدلتے ہیں۔ اور ہم چشموں میں خوش خور اور خوش پوش مشہور ہیں۔ یہ بھی اچھے اچھے کپڑے رکھتی ہے۔ جن کی زرق برق سے آنکھیں چکاچوند ہوجائیں۔ مگر وہ تو تہوار یا میلے پر جانے یا شادی بیاہ میں شریک ہونے کے موقعوں پر نکالے جانے کے لئے صندوقوں میں احتیاط سے بند ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے پاس بھاری زیورات ہیں۔ جن پر اسے ناز ہے۔ مگر اُن کو بھی خاص موقعوں پر نکالتی ہے۔

اسی مکان کے سامنے جُلاہوں کا ایک گھر ہے۔ اس میں ایک بڈھا دیرینہ سال جُلاہا بیٹھا حقّہ پی رہا ہے۔ آؤ آج کے مشاہدات کے ختم کرنے سے پہلے اس کی باتیں سُن لیں۔ ویسے تو آپ جس دن آئیں گے۔ اور جتنی مرتبہ آئیں گے۔ ہندوستان کی زندگی کی تصویر کے دونوں رُخوں کا منظر آپ کو نئے سے نئے رنگ دکھائے گا۔ یہ بڑے میاں گزشتہ زمانہ کی خوبیوں کا بیان کر رہے ہیں:۔

آپ:۔ کہو بڑے میاں آج کل کے زمانے کے بڑے شاکی معلوم ہوتے ہیں۔

بڈھا:۔ کچھ پوچھئے نہیں۔ زمانہ کہے سے ایسا نکل گیا ہے۔ کہ کوئی حد نہیں۔ خدا جانے کیا اندھیر ہونے والا ہے۔ عورتوں کی کبھی ایسی آزادی نہ دیکھی نہ سُنی۔ یقین جانئے عمر سے ایمان کو اپنے بیٹے کا نام ہے۔ میں نے وُہ وُہ پیٹا ہے۔ مگر بیچاری نے کبھی یہ نہ کہا۔ کہ میں تمھارے

گھر نہیں رہتی۔ مگر اس عمر ے نالائق نے میرے گھر کا ستیاناس کر دیا ہے۔ اپنی عورت کو اس قدر سر چڑھا رکھا ہے۔ کہ خدا کی پناہ۔ ہمارا ابھی جوانی میں بیاہ ہوا تھا۔ ہم تو اپنے باپ کے سامنے عورت کی اتنی پاس داری نہیں کرتے تھے۔ خواہ وہ اُسے جھڑک دیں۔ خواہ زیادہ کام لیں خواہ تھوڑا کھانے کو دیں خواہ بہت۔ یہ نا ہنجار تو جس دن سے بیاہ گیا ہے۔ مجھے باپ ہی نہیں سمجھتا وردہ نامراد ناش وساس سے یُوں لڑتی ہے۔ جیسے سوت ہو۔ میں نے بارہا لڑکے کو سمجھایا تو آج آخر اس نے ذرا ہاتھ اُٹھایا تھا۔ مگر صاحب وہ بگڑی ہوئی عورت ابھی دو چار ہی پڑی تھیں۔ کہ محلہ سر پر اُٹھا لیا۔ اور اُس وقت سے رو رہی ہے۔ کہ میں تو طلاق ہی لوں گی عجب مُصیبت میں جان ہے۔ اُدھر یہ بے عقل پھر روم ہوا جاتا ہے۔ کہتا ہے عورت ہاتھ سے جاتی رہے گی۔ حالانکہ میں اُسے کہہ چکا ہوں۔ کہ عورت کو تو جوتی برابر سمجھنا چاہیئے۔ ایک اُتر گئی دوسری پہن لی۔

بڑے میاں کے خیالات کا نمونہ تو آپ نے سُن لیا۔ چلو اب چل کے سو رہو۔ خدا کرے خواب میں آپ کو تصویر کا سیاہ رُخ کسی قدر سفیدی سے بدلتا نظر آئے۔ تو صُبح کو ہم آپ کو اچھی سی تعبیر بتائیں ٭

بے سروسامانی

جدھر نظر اُٹھا کر دیکھو۔ ایک دُنیا سروسامان کی فکر میں سرگرداں نظر آتی ہے۔ کوئی کامیاب ہو۔ کوئی ناکام۔ مگر یہ دھن اور یہ سودا ہر سر میں موجود ہے۔ کہ مکان ہو آراستہ۔ اور لباس ہو پیراستہ۔ گاڑی گھوڑا سواری کے لیئے مِل جائے۔ دو چار نوکر چاکر خدمت میں حاضر رہیں اور کچھ نہیں۔ تو زر و جواہر بھی مضبوط آہنی صندُوق میں بند ہوں۔ بازار میں ہو کر نکلیں۔ تو دس بیس سلامی ہوں۔ اور گھر میں بیٹھیں تو کوئی آکر پُرسانِ حال ہو۔ کسی مجلس میں جائیں۔ تو لوگ تعظیم کو اُٹھیں۔ اور خلوت میں ہوں۔ تو احباب دیکھنے کے لیئے طلبگار ہوں۔ یہ باتیں لوازمِ شائستگی و تہذیب سمجھی جاتی ہیں۔ اور ہر شخص دل و جان سے ان ہی باتوں کا شیدائی ہے۔ کون سی مصیبت ہے۔ جسے انسان اس مقصدِ عالی کے حاصل کرنے کے لیئے نہیں اُٹھاتا۔ بچّہ مدرسہ اور مکتب میں جا کر جورِ اُستاد سہتا ہے۔ تو اُس کے نتھے سے دماغ میں یہی خیال ہوتا ہے۔ جو والدین کی باتوں سے اُس کے ذہن میں جاگزین ہو گیا ہے۔ ذرا اور بڑا ہوا۔ مدرسہ سے نکل کر بیت العلوم میں پہنچا۔ تو کیا پُوچھنا۔ ہوا کے گھوڑوں پر سوار ہے۔ اُمنگوں اور آرزوؤں کا لشکر دل میں ہے۔ اُمید کا لہلہاتا ہُوا باغ آنکھوں کے سامنے ہے۔ یاس کا کانٹا نظر سے اوجھل ہے۔ کوئی محتاط تجربہ کار چتا بھی دے کہ ذرا ہشیار رہنا۔ یاس اُمید کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ تو اُس کی یہ تنبیہہ بُری معلوم ہو۔ یاس کا خیال دل میں لانا تک روا نہیں۔ عہدِ شباب کی مستی اور اس پر نشۂ علوم۔ کتاب ہاتھ میں ہے کبھی کمرے میں ٹہل رہے ہیں۔ اور پڑھ رہے ہیں۔ کبھی باغوں کی روشیں ہیں۔ اور اُن پہ ٹہلتے ہوئے کتاب کا رٹنا۔ کبھی آدھی رات ہے

اور چراغ اور طالب علم۔ آخر فارغ التحصیل ہو کر نکلتا ہے۔ تو ی مضمحل۔ دماغ پریشان۔ اور وہی تماشِ سرو سامان پیشِ نظر۔ جس جستجو کے زمانے میں بے سروسامانی یونہی ذرا سی جھلک دکھاتی ہے۔ وجہ معاش پیدا کرنے میں دقتوں کا سامنا ہوتا ہے۔ روزی کے سب دروازے بند نظر آتے ہیں۔ کوئی کھلے بھی کھلے تو کلید زر سے کھلتا ہے۔ اور اسی کی کمی ہے۔ اپنی محنت پر پچھتاوا شروع ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں۔ پڑھ پڑھ کے دیوانہ ہو گیا ہے۔ اور یہ فرماتے ہیں۔ کہ جناب من اِسالہا سال

"دُود چراغ خوردہ سحر کردہ ام بزور"

پھر اگر دماغ میں خشکی کا اثر ہو۔ تو آپ تعجب کیوں کرتے ہیں۔

"معذورم ار نماند دماغ مر تری"

اتنے میں امید و بیم کے بھنور میں غوطے کھاتے کھاتے آخر اس کی امیدوں کی کشتی ساحل مراد پر جا لگتی ہے اور کامیابی کی ہوا سر میں سماتی ہے۔ وہ سازو سامان جس کی جستجو تھی۔ سارا نہیں تو آدھا میسر آنے لگتا ہے۔ پیٹ میں روٹیاں آتے ہی چودہ طبق منور نظر آتے ہیں۔ اور سر خوشی کی سوجھتی ہے۔ مٹے گلرنگ کے دور چلتے ہیں۔ اور عیش و نشاط کے صور ہوتے ہیں۔ اُس وقت کوئی بے سروسامان اپنا دُکھڑا روئے۔ یا کوئی اور اس کے لیئے مدد مانگے۔ تو ایسے کاموں کا ہوش کسے۔ اپنی کامیابی میں مسرت ہیں۔ ابھی یہ نشہ اترا نہیں ہوتا۔ کہ حرص اور اصبوری آکر اپنا سکہ جماتی ہیں۔ جو سامان عیش میسر ہے۔ وہ نظر میں ہیچ نظر آنے لگتا ہے اور اُس سے بڑھ کر۔ سازو سامان کی تلاش ہوتی ہے۔ اور کچھ اور ملنے پر دہانِ طمع سے "ھل من مزید" کی صدا نکلتی ہے۔ یہ وہ مرض ہے۔ جسے امراضِ اخلاقی کے اطبا نے لاعلاج قرار دیا ہے۔ اور اسی کی بدولت یہ نوبت پہنچی ہے۔ کہ آدمی کی آرزوں کا جہاز مایوسی کی چٹان سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ اور ہمیشہ کے لیئے کام سے جاتا رہتا ہے۔ اس مایوسی میں ایک حالت انسان پر آتی ہے۔ جس میں نہ صرف بے سروسامانی کی قدر آجاتی ہے۔ بلکہ

اُس کے حصول کی تمنا پیدا ہوتی ہے۔ یہ فقط انتہائے یاس کا ایک ظہور ہوتا ہے۔ ورنہ کسی کے دل کو ٹٹول کر دیکھا جائے۔ تو اس میں پھر کوئی نہ کوئی حسرت بھری ہوئی ہوتی ہے۔ اس کیفیتِ قلبی کا ایک عجیب اور پُر زور نقشہ مرزا اسد اللہ خاں غالب نے کھینچا ہے۔ گویا بے سروسامانی کی تصویر کھینچ دی ہے:۔

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار ؛

اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو ؛

مگر یہ بے سروسامانی اشعار میں ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ جب سب سامان موجود ہوں۔ اور کسی ایک آدھ اُمید میں ناکامی کا سامنا ہو جائے۔ تو ناز پروردہ انسان اپنی بے اطمینانی کا اظہار اس طرح اپنے آپ کو کوس کر کرتا ہے۔ لیکن اگر ایسا خوفناک سماں کبھی فی الحقیقت موجود ہو جائے۔ تو آدمی فوراً گھبرا جاتا ہے۔ بڑے بڑے فلسفی جو دُنیا کو قناعت کا وعظ سناتے تھے جو تنہائی کی خوبیاں گھنٹوں تک اس فصاحت سے بیان کرتے تھے۔ کہ سُننے والے اُن کی شیرینیٔ کلام پر عش عش کرتے تھے۔ جو ماں کو سمجھاتے تھے۔ کہ جُدائی سے نہ گھبرانا۔ جو باپ کو تسلی دیتے تھے کہ غم نہ کھانا۔ جو بیوی کو بہلاتے تھے۔ کہ خیریت ہے۔ چار دن مشکل کے ہیں۔ پھر اسی حلقۂ خانہ داری میں آئے جاتے ہیں۔ اُن لوگوں کو دیکھا گیا ہے۔ کہ جب کبھی عارضی طور پر بھی وہ امتحان میں ڈالے گئے ہیں۔ اور انہیں تنہائی کے صدمے فرقت کے رنج اور بے سروسامانی کے غم اُٹھانے پڑے ہیں۔ تو آخر اُن کی ثابت قدمی اُن کو جواب دے گئی ہے۔ اور وہ بے صبری سے چلا اُٹھے ہیں۔ "ہائے وہ پہلی حالت"۔ اس وقت شاید انہیں خیال آتا۔ کہ اصلی بے سروسامانی خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ مگر یہ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ کہ اُن میں کس کس نے عہد کر لیا ہو۔ کہ اگر بخیریت اپنی اصلی حالت کو پہنچ جاؤں۔ تو نہ صرف سجدۂ شکر ادا کروں گا۔ بلکہ خدا کی شکر گزاری

عملی ثبوت اُس کے ایسے بندوں کے ساتھ جو سروسامان نہیں رکھتے۔ بھلائی کرنے سے دوں گا۔
گرما میں اپنے خس خانۂ و برفاب سے آرام پاتے ہوئے غربا کو کم از کم ٹھنڈا پانی تو پلاؤں گا۔ سرما
میں اپنے حماموں اور انگیٹھیوں سے آسائش حاصل کرتے ہوئے یہ بھی ذہن میں رکھوں گا۔ کہ کتنے
ایسے بھائی ہیں جن کے پاس آگ تاپنے کو نہیں۔ کمبل اوڑھنے کو نہیں۔ گدڑی بچھانے کو نہیں وہ
یہاں تک کہ کہیں چیتھڑا بدن ڈھکنے کو نہیں۔ میں اپنی زندگی کا مقصد علی بناؤں گا۔ کہ جہاں اپنے
لیئے لباسِ حریر و سمور یا کم از کم بانات کے کوٹ سلاؤں گا۔ وہاں بے سروسامانوں کے لیئے کچھ
موٹے سوٹے چوغے چھینٹ کے یا کسی سستے گرم کپڑے کے بھی تیار کرادوں گا۔ اور انھیں
اُس بے سروسامانی سے بچاؤں گا۔ جس کے سامنے دستے پینے چلتے پھرتے تندرست توانا اور کامیاب
لوگوں کی نازک دماغی سے بھری ہوئی شکایتیں ہیچ ہیں۔ انھیں نہ صرف اپنے متعلق قناعت
سے کام لینا چاہیئے۔ بلکہ دوسروں کی بے سروسامانی سے اپنی ثروت کا مقابلہ کر کے جس حد
تک ممکن ہو۔ دوسروں کی بھلائی میں کوشش کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اس سے انھیں وہ سرور
سامان ملے گا۔ جسے نہ گھُن کا ڈر ہے۔ نہ زنگ کا۔ یہ جتنا پرانا ہوگا۔ چمکے گا۔ اور جتنا بانٹا
جائے گا۔ بڑھے گا۔

اطالین نمائش

جن ذرائع سے مغربی دُنیا میں علوم و فنون کی ترقی کی کل کو چلایا گیا ہے۔ اُن میں ایک مقبول اور دل پسند ذریعہ نمائشیں ہیں۔ نمائشیں کئی طرح کی ہوتی ہیں۔ سب سے اعلیٰ تو وہ ہیں۔ جو مختلف ملکوں کی متفقہ کوششوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اور تمام شائستہ دُنیا پر کم و بیش اثر ڈالتی ہیں۔ زمانہ حال میں اس قسم کی نمائشوں میں چکاگو کی مشہور نمائش۔ پیرس کی عالمگیر اگزبیشن۔ اور سب سے نئی سنٹ لوئس کی نمائش قابلِ ذکر ہیں۔ یہ نمائشیں تو تاریخی یادگاریں ہیں۔ اور جب اقوامِ مغرب کی ترقی کی تاریخ لکھی جائے گی۔ تو اس میں ان نمائشوں کے سال سنگِ نشان کا کام دیں گے۔ ان کے لیئے روپیہ اس قدر درکار ہے۔ کہ اکثر مغربی قومیں باوجود اپنے تموّل کے ان کے مصارف سے عاجز آجاتی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ سنٹ لوئس میں خاطر خواہ مالی کامیابی نہیں ہوئی۔ اس لیئے ان نمائشوں کا مفصّل تذکرہ ہم غریبوں کے لیئے جو ایک نادار ملک میں پیدا ہوئے ہیں مفید نہیں۔ ہم ابھی اُس مقام سے جس کا تقاضا ایسی نمائشوں کا اہتمام ہوتا ہے منزلوں دُور ہیں۔ ان کے سوا یورپ اور امریکہ میں کئی نمائشیں بعض فنون کے لیئے مخصوص ہوتی ہیں۔ مثلاً زراعت کی نمائش جُدا۔ جس میں مختلف قسم کے بیج۔ کھاد۔ آلات کشاورزی اور دیگر اسبابِ زراعت دکھلائے جاتے ہیں۔ دودھ اور مکھّن کی نمائش الگ جس میں مختلف کارخانوں کو باہمی مقابلہ کا علیحدہ موقعہ دیا جاتا ہے۔ پنساری اور عطّار اپنی نمائش علیحدہ رکھتے ہیں۔ فوجی نمائش جُداگانہ ہے۔ تصویروں کی نمائش ایک مستقل چیز ہے۔ جس میں

صاحبانِ فن اپنا کمال دکھاتے ہیں۔ غرض ہر پیشے اور ہر ہنر کے لوگ اپنی اپنی ترقی کی تدابیر کرتے رہتے ہیں۔ مگر ان دونوں قسموں کے علاوہ ایک اور قسم نمایش کی ہے۔ جس کا مقصد یہ ہوتا ہے۔ کہ ہر طبقے کے لوگوں کو چھوٹے سے پیمانے پر انبساطِ عامہ بڑھانے کا موقع مِل جائے۔ اور ساتھ ہی تفریح کا مقصد بھی حاصل ہو۔ یہ نمایشیں ہمارے ہاں کے میلوں کا جواب ہیں۔ اور انہیں مہذب میلوں کا لقب دیا جا سکتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے۔ کہ میلا ایک دو دن کی دل لگی۔ چند گھنٹوں کی گھبراہٹ۔ جانے کی دھوم دھام۔ واپس آنے کی مارامار۔ دھکے کھانے کے لطف۔ اور بدپرہیزی کرنے کی اجازت کا نام ہوتا ہے۔ اور اس کا مقصد صرف تفریح ہوتا ہے۔ جو بچپن اور آغازِ شباب تک تو اس سے حاصل ہوتی رہتی ہے۔ لیکن اس کے بعد دن بدن زائل ہونے لگتی ہے۔ اور آخر جاتی رہتی ہے۔ مگر یہ مہذب میلے ہفتوں بلکہ مہینوں رہتے ہیں۔ لوگ اطمینان سے اُن میں جاتے ہیں۔ بے فکری سے اُن میں چلتے پھرتے ہیں۔ ہر طرح کے تماشے اور دلچسپی کے سامان ایک احاطے کے اندر جمع ہیں۔ جن سے ہر شخص حسبِ مذاق و توفیق فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ اور اُن میں جانا اور اُنھیں دیکھنا۔ سیر کی سیر اور تعلیم کی تعلیم ہوتی ہے۔ لندن کے اس قسم کے میلوں میں سے ایک میلا چند ہفتے ہوئے ختم ہوا ہے۔ جب میں مئی کے مہینے یہاں آیا۔ تو شروع تھا۔ اور اکتوبر کے آخیر تک رہا۔ اس میلے کی ترکیب یہ ہے۔ کہ ایک وسیع احاطہ اس کے منتظموں نے گھیر رکھا ہے۔ جس کا نام ارلز کورٹ ہے۔ اس میں ہر سال نئی نمایش ہوتی ہے۔ جو کئی مہینوں تک رہتی ہے۔ چند سال ہوئے یہاں کی پیرس کی زندگی کا نقشہ دکھایا گیا تھا۔ اس کے بعد ایک برس۔ یہاں "نمایشِ آتش" تھی۔ جس میں مکانات کا جلنا۔ آگ بجھانے والی فوج کا مستعدی سے اُن کے بچانے کو دوڑنا۔ اور جان فشانی سے لوگوں کے جان و مال کو بچا لینا دکھایا گیا تھا۔ اس مرتبہ مُلکِ اطالیہ کی باری تھی۔ اور نمایش میں جانا یہ معنی رکھتا تھا۔ کہ آپ اچانک آنکھ بند کر کے اطالیہ کے مشہور مقامات میں سے کسی کی سیر کر رہے ہیں۔ داخل ہوتے ہی دربانِ اطالیہ کے لباس میں ملبوس نظر آتے تھے۔ دکانیں

وہیں کی سنگ تراشی۔ مصوری اور دیگر صنعتوں کے نمونوں سے پُر ہیں جہاں کہیں لوگوں کے واسطے کھانے پینے کا سامان مہیا کیا تھا۔ وہاں خادم اور خادمہ خاص وردیاں پہنتے تھے جن کی کاٹ تراش اطالیہ کی قسم کی نقل ہی تھی احاطہ کی دیواریں نگار رنگ کے پردوں کی بنی تھیں جن پر اطالیہ کے قدرتی مناظر کے نقشے آنکھ کو دھوکا دیتے تھے۔ کہ دیکھنے والا واقعی جنوبِ یورپ کے مناظر دیکھ رہی ہے احاطہ کئی حصوں میں منقسم تھا جن میں بعض حصے مسقف تھے اور بعض کھلے مسقف حصوں میں صناعی کی نمائش اور دوکانیں تھیں۔ اور کھلے حصوں میں سیر و تفریح کی باتیں۔ ایک صحن پھولوں کی کیاریوں سے رشکِ گلشن بنا ہوا تھا۔ اور اس کے وسط میں بینڈ کے لیے جگہ تھی۔ جہاں مقررہ اوقات پر ہر روز باجا بجتا تھا۔ اور موسیقی کے دلدادہ اس کے گرد کرسیوں پر بیٹھے باجا سُنتے رہتے تھے۔ مگر جو حصہ اس نمائش کا مجھے سب سے دلچسپ معلوم ہوتا تھا۔ وہ ایک اور صحن تھا۔ جو دو بلند عمارتوں کے درمیان واقع تھا۔ اور جس میں ایک خوبصورت حوض صاف پانی سے لبالب بھرا رہتا تھا۔ اس حوض کے دونوں طرف ایک نہر سی بنی ہوئی تھی۔ اور اس کے وسط میں ایک کل تھی۔ جسے اُڑنے کی کل کہتے تھے اس کے اندر کشتیاں تھیں۔ ان میں لوگ بیٹھ جاتے تھے۔ یہ کشتیاں نہایت مضبوط رسّوں سے آویزاں تھیں۔ اور ان تمام رسّوں کے سرے ایک بڑے ستون کے سرے سے لوہے کے حلقوں کے ذریعے سے بندھے تھے۔ یہ ستون دُخانی کل کے ذریعے سے گھومتا تھا۔ تو ساری کشتیوں کو حرکت ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ چکر کھاتے کھاتے ایسا درجہ آتا تھا۔ کہ کشتیاں ہوا میں اُڑتی معلوم ہوتی تھیں۔ اس کل کا اصول بالکل وہی تھا۔ جو ان چکروں کا ہوتا ہے۔ جو ہمارے ملک میں عام میلوں پر موجود ہوتے ہیں۔ اور جن کے ذریعے سے کاٹھ کے گھوڑے جن پر شوقین لوگ سوار ہوتے ہیں۔ گھومنے لگتے ہیں۔ مگر اسی خیال کی ترقی سے ایسی نفاست پیدا ہوئی تھی۔ کہ اس مشین کو دُور سے چلتے دیکھنا نہایت ہی مزا دیتا تھا۔ اور اس میں سوار ہونا اس سے زیادہ دلچسپ تھا۔ اور اسی لیے نہ صرف تماشائیوں کا ایک گروہ کثیر اس کے گرد جمع رہتا تھا۔ بلکہ سوار ہونے والوں کا بھی ہجوم ہوتا تھا۔ اور میرا خیال ہے۔ کہ سار

تماشوں میں یہی سب سے مقبول تھا۔ اور اس کے مالک کو سب سے زیادہ نفع ہوا۔ حوض کے وسط
میں اس کا نصب ہونا اس کے لطف کو دو بالا کرتا تھا۔ اور رات کے وقت جب حوض پر چاروں
طرف سبز و سرخ شیشوں میں چراغ جلتے تھے۔ اور سارے شہر میں روشنی ہوتی تھی۔ تو اس مشین کی سیر عجب
بہار دیتی تھی۔ اس پر بیٹھ کر گھومنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ رنگین روشنی کی مسلسل قطاریں چکر لگا رہی
ہیں۔ ایک عجیب بات اس کے متعلق یہ تھی۔ کہ اس میں عورتیں بکثرت سوار ہوتی تھیں۔ گو میں نے کئی
مردوں کو اس سواری سے گھبراتے دیکھا اور یہ کہتے سنا کہ خواہ کتنی ہی احتیاطیں کر لی گئی ہیں۔ پھر بھی
خطرناک ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ انگلستان میں عورتیں عموماً بزدلی کی کمزوری سے خالی
ہیں۔ اور بہت سے مردانہ کھیل شوق سے کھیلتی ہیں سمندر میں غوطے لگانا۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھنا ان
کے لئے ایسا ہی آسان اور اُن کو اتنا ہی مرغوب ہے جتنا مردوں کو۔ مگر طرفہ یہ ہے کہ ان کشتیوں میں سوار ہوتے
وقت یا اور کسی ہنسی خوشی کے موقعے پر اظہار نزاکت سے بھی دریغ نہیں کرتیں۔ اور کشتیوں کے چلتے ہی
دھم چیخیں مارتی ہیں کہ اگر چیخوں کے بعد فوراً قہقہے کی آواز سنائی نہ دے تو سننے والے سمجھیں کہ کوئی حادثہ ہو گیا۔

اس حوض کے پانی سے دو اور کام لئے گئے تھے۔ اس کے دونوں طرف نہریں سی نکلتی تھیں۔ اُن میں
سے ایک کے اختتام پر ایک ڈھلوان آہنی سڑک بنی تھی جس کے نیچے مضبوط لکڑی کی شہتیروں سے
ڈھلوان فرش بنایا گیا تھا۔ اس سڑک پر ایک پہیوں والی کشتی بجلی کے زور سے چلتی تھی۔ اور ڈھلوان
سے زور شور کے ساتھ اترتی ہوئی دھم سے پانی میں گر پڑتی تھی۔ اور گر کر جھاگ اچھالتی ہوئی
اچھلتی تھی۔ اور پھر نہر میں تیرتی ہوئی کنارے جا لگتی تھی۔ اس کھیل کو بھی قبولِ عام کا فخر
حاصل تھا۔ اور رونق کے دن تو ہزاروں آدمی دن بھر میں اس میں سوار ہوتے تھے۔ اور کشتی
اوپر سے ایسی ترکیب سے گرائی جاتی تھی۔ کہ کسی کو کبھی دھماکے سے نقصان نہیں ہوا حالانکہ
بظاہر اس کا ڈھلوان سے لڑھکتا ہوا آنا اور پانی میں گرنا سخت خوفناک معلوم ہوتا تھا۔ اسی نہر
کے دوسرے حصّے سے یہ کام لیا گیا تھا۔ کہ وہ ایک مصنوعی غار میں سے ہو کر گزرتا تھا۔ جو
اطالیہ کی قدرتی غاروں کی نقل تھی۔ اور جس کے اندر لوگ کشتیوں میں بیٹھ کر ہو آتے تھے۔ ان

غاروں کو گروٹو کہتے ہیں۔ اور ان کی ساخت اس قسم کی ہوتی ہے۔ کہ کہیں کہیں روشنی کی شعاع اندر آ گھستی ہے۔ اور طرح طرح کے رنگ نظر آتے ہیں۔ اور کہیں بالکل تاریکی ہوتی ہے۔ سیاح ان غاروں میں بڑی خوشی سے گھستے ہیں۔ اس شوق کو ایک چھوٹے پیمانے پر پورا کرنے کا سامان کر دیا گیا تھا۔ اسی سلسلے میں تھوڑی دور ایک اور جگہ تھی۔ جسے دیکھ کر یہ گمان ہوتا تھا۔ کہ ملک اطالیہ کا کوئی ٹکڑا کاٹ کر کسی جادو کے ذریعہ سے لندن میں لا کر سجا دیا ہے۔ یعنی وہاں کے مشہور تاریخی شہر وینس کی نقل بنائی گئی تھی۔ اس مصنوعی وینس کے دروازے کے اندر جانے ہی کیا نظر آتا تھا، جنوبی یورپ کا صاف نیلگوں آسمان۔ اس پر بے شمار تارے۔ گلی کوچوں کی بجائے پانی کی نہریں رواں تھیں۔ جن میں کشتیاں چل رہی تھیں۔ اور لوگ اُن میں بیٹھ کر دوستوں کو ملنے ایک گھر سے دوسرے گھر جاتے تھے۔ اور دکانوں سے سودا سلف خریدتے تھے۔ کشتی والے اپنی دھن میں کچھ الاپتے جاتے تھے۔ اور کشتی کھیتے جاتے تھے۔ مکانوں کا نقشہ ہُو بہُو وینس کا تھا۔ اور وسطِ شہر میں ایک چوک تھا۔ جہاں خاص اطالیہ کے گویوں کی ایک جماعت وہیں کی زبان میں پیارے پیارے گیت گا رہی تھی۔ یہ ایسے گیت تھے۔ جو ہمارے ایشیائی راگوں سے بہت ملتے۔ اور انگریزی طرزوں سے بالکل جدا تھے۔

اُڑنے کی مشین اور پانی میں گرنے والی کشتی کچھ اس نمائش کی خصوصیات میں نہ تھیں کرسٹل پیلیس میں بھی موجود ہیں۔ مگر یہاں زیادہ اچھی بنائی گئی تھیں۔ لیکن گروٹو کی سیر اور وینس کا نقشہ یہ اسی کا خاص حصّہ تھیں۔ اور کہیں اور نظر نہ آ سکتی تھیں۔ ان کے سوا ایک بڑی خصوصیت اس نمائش کی ایک بہت ہی بڑا پہیّہ ہے۔ جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ پیرس کے ایفل ٹاور کا جواب ہے۔ اس کی بلندی کا یہ حال ہے۔ کہ اگر اُن گاڑیوں میں جو اس میں لگی ہیں بیٹھ جاؤ اور یہ گھمایا جاوے۔ تو جس وقت آپ انتہائے بلندی پر پہنچ جاویں۔ تو لندن باوجود اپنی وسعت کے آپ کی آنکھ کی پتلی میں سما جائے۔ مگر افسوس ہے۔ کہ یہ سیر

بہت مقبول نہیں ہوئی۔ اور اس کثیر خرچ کے اعتبار سے جو اس کے بنانے میں ہوا ہوگا۔ مشکل معلوم ہوتا ہے۔ کہ بنانے والے کو بہت فائدہ ہوا ہو۔ تاہم یہ پہیہ بھی چلتا ہی رہتا تھا اور کچھ نہ کچھ لوگ اس پر بھی سوار ہو ہی لیتے تھے۔ ایک دفعہ عجیب تماشا ہوا۔ لوگ اس پر سوار تھے۔ اور با قاعدہ اوپر کی طرف حرکت کر چکے تھے۔ کہ پہیے کی کل بگڑ گئی۔ اور حرکت بند ہو گئی جو اوپر تھے وہ اوپر رہ گئے۔ اور چونکہ رات کو کل کی مرمت نہیں ہو سکی۔ اس لئے انھیں صبح تک آسمان اور زمین کے درمیان بے خواب و خور معلق رہنا پڑا۔ نقصان تو سخت نہ ہوا۔ کیونکہ خدا کے فضل سے جانیں بچ گئیں۔ اور کمپنی والوں نے سب صاحبان کو پانچ پانچ پونڈ بہ طور ہرجانے کے نذر کئے۔ بعض لوگ تو ان میں ایسے تھے۔ کہ ان کی تکلیف کا یہ کافی معاوضہ نہ تھا۔ لیکن بہت سے ایسے تھے۔ جن کے وسائل محدود تھے۔ اور انھیں ایک رات کی تکلیف کے عوض میں ستر اسی روپے مل جانا غنیمت معلوم ہوا۔ شہر بھر میں اس واقعہ کا کئی دن چرچا رہا۔ اور لطیفہ یہ ہوا۔ کہ اس واقعے کے بعد بجائے پہیے کی طرف رجوع کم ہونے کے چند دن تک ایک کثیر تعداد لوگوں کی اس میں سوار ہونے کو آتی رہی۔ اس خیال سے کہ اگر پھر کوئی ویسی ہی دقت پیش آئے۔ تو پانچ پانچ پونڈ ملیں۔ مگر نہ ایسی افتاد روز ہوتی ہے۔ اور نہ ایسی رقم بے محنت آئے دن ہاتھ لگتی ہے۔

اس قسم کی بہت سی کھیل تماشے کی چیزیں تھیں۔ جن کے ذریعے سے ہزاروں پونڈ روز نمائش گاہ میں آتے تھے۔ مگر کچھ کھیل تماشے کی چیزوں پر ہی تماشا ختم نہ تھا۔ اسی نمائش میں اطالیہ کی بندوقوں اور توپوں کے نمونے تھے۔ جن سے ملک کے اسلحہ اور اس کی جنگی حالت کا پتہ چلے۔ اسی میں وہاں کی تصاویر تھیں۔ جن سے فن نقاشی کی ترقی کا حال کھلے۔ اسی میں سنگ مرمر اور دوسرے پتھروں کے خوبصورت اور سڈول بت تھے۔ جو سنگ تراشی کے اعلیٰ نمونے کہلا سکتے تھے۔ اسی میں لکڑی کا اچھا اچھا کام تھا۔ اور اسی میں اطالیہ کی دوسری صنعتوں کے نمونے دکھلائے گئے تھے۔ کہیں سوئیاں تیار ہو رہی تھیں۔ کہیں شیشے اور

بلور کا کام دیکھنے والوں کے سامنے بنایا جاتا تھا۔ کہیں چکنی مٹی کے چھوٹے چھوٹے بُت ایک شخص اس خوبی سے منٹوں میں بنا کر رکھتا جاتا تھا۔ کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی تھی۔ غرض سارا میلہ ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق تھا۔ اور اس کی بہت سی باتیں ایسی تھیں۔ جو قابلِ تقلید معلوم ہوتی تھیں۔ بلکہ ہم لوگ اگر میلوں کے بغیر گذارہ نہ کر سکیں۔ اور اور فطرتِ انسانی کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ شاید نہ کر سکیں گے۔ تو اتنا تو ہو۔ کہ جو کچھ کیا جائے۔ سلیقے سے کیا جائے۔ اور اس میں کچھ فائدہ مدِّنظر رکھ لیا جائے۔

مدفنِ بزرگاں

(انگلستان کے مشاہیر کا مرقد ویسٹ منسٹر ایبے)

چپّے چپّے پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز
(حالیؔ)

دہلی مرحوم خدا اُسے دوبارہ زندہ کرے ایک زمانے میں مشاہیر عالم کا مرجع تھی۔ بڑے بڑے با کمال دُور دُور سے اُس کی طرف کھنچے ہوئے آئے اور آخر وہیں کے ہو رہے۔ وہیں مر کر وہیں دفن ہوئے خود وہاں کی مردم خیز زمین سے کئی نامور اُٹھے۔ اور بالآخر وہی سرزمین اُن کی آرامگاہ بنی اسی لیئے مولانا حالیؔ کو اس کے وسیع کھنڈروں کا ذکر کرتے ہوئے کہنا پڑا۔ کہ اس ویرانے میں اتنا خزانہ مدفون ہے۔ کہ کہیں نہ ہوگا۔ لندن کے مشہور قبرستان ویسٹ منسٹر ایبے کو دیکھ کر مجھے مولانا حالیؔ کا شعر یاد آیا۔ اور دہلی کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا۔ وہ بھی ایک خزانہ تھا۔ اور یہ بھی ایک خزانہ ہے۔ اور بعض اعتبارات سے اُس سے بھی بڑا خزانہ ہے۔ کیوں نہ ہو۔ دہلی ہندوستان کا بڑا شہر تھا۔ اور لندن اِس وقت دنیا کا بڑا شہر ہے۔ اُس خزانے کے قدردان دنیا سے اُٹھ گئے۔ اس خزانے کے محافظ اور قدرشناس موجود ہیں۔ ایک بات جو خاکِ دہلی کی خصوصیت ہے۔ وہ خاکِ ویسٹ منسٹر کو حاصل نہیں۔ ایک چیز جو ویسٹ منسٹر میں ہے۔ وہ دہلی کو میسّر نہیں۔ خاکِ دہلی ہے مہمان نواز۔ عرب ہو یا تُرک۔ ایرانی ہو یا ہندی۔ اسے سب عزیز ہیں۔ اور سب کو اپنے آغوشِ شفقت میں لیتی ہے۔ مگر ویسٹ منسٹر کی چار دیواری میں جگہ پانا مشکل ہے۔ اور دن بدن مشکل ہوتا جاتا ہے۔ ہاں ویسٹ منسٹر کو جو امتیاز حاصل ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ ایک محدود رقبے

میں سینکڑوں ناموروں کے جسدِ خاکی مدفون ہیں۔ بحالیکہ دہلی میں میلوں کا چکر لگانے پر بھی اتنا مجمع یک جا نہیں مل سکتا۔ وہاں گو ہر سنگ بزرگوں میں ملے ہوئے بسے ہیں۔ اور معمولی آنکھ کا یہ کام نہیں ہے۔ کہ بتا سکے۔ کہ گوہر کون سا ہے۔ اور سنگ کون سا۔ لندن کو عجیب و غریب اتفاقات سے یہ بات حاصل ہو گئی ہے۔ کہ ایک بڑے گرجے کی چار دیواریوں میں انگلستان کی تمام گزشتہ بڑائی کی یادگاریں جمع ہیں۔ اور ایک مقام کی زیارت زیادہ گردش کی ضرورت باقی نہیں چھوڑتی۔ بڑے بڑے تاجورانِ گردش کش اسی احاطے کے اندر لیٹے ہوتے ہیں۔ اور اُن کے جاں نثار اُن کی قبروں کے گرد ویسے ہی جمع ہیں۔ جیسے اُن کی زندگی میں اُن سے گرد حلقہ باندھے رہتے تھے۔ اسی احاطے میں بہادرانِ انگلستان میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت دینے کے بعد آرام سے سوتے ہیں۔ اُن کی قبروں کے کتبے موجودہ زمانے کے سپاہیوں کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔ اور اُن کو یہ سمجھا رہے ہیں۔ کہ اگر پائدار شہرت چاہتے ہو۔ تو ان جوانمردوں کے نقشِ قدم پر چلو۔ قوم کی خدمت میں جانیں لڑاؤ۔ تو اُن کے پہلو میں جگہ پاؤ۔ یہیں وہ مُدبّر آرام کر رہے ہیں۔ جن کے ناخنِ تدبیر نے بڑی بڑی پوشیدہ گتھیاں سلجھائیں۔ اور جن کی دانائی اور حسنِ انتظام نے انگلستان کو ایک چھوٹے سے جزیرے کی چھوٹی سی سلطنت سے ایک عظیم الشان شاہنشاہ کے رتبے تک پہنچا دیا۔ اور شاہِ انگلستان کو قیصر بنا دیا۔ اسی تعمیرِ کہن کے گوشوں میں وہ اہلِ قلم پڑے ہوتے ہیں۔ جن کے قلم کی جنبش ہزارہا دلوں کو ہلا دیتی تھی۔ اور جن کے تصانیفِ نظم و نثر کو اہلِ انگلستان آج تک اپنی بہترین وراثت سمجھتے ہیں۔

بزرگانِ انگلستان کا یہ مدفن پہلے کیتھولک راہبوں کے ایک فرقے کی قیام گاہ تھا جس کی بنا ہزار برس ہوئے ڈالی گئی تھی۔ خیال بے اختیار لندن کی اُس ابتدائی حالت کی طرف دوڑتا ہے۔ جب اُس کی اس بڑائی کے نشان بھی نہ تھے۔ ہاں لندن کا دیرینہ دوست دریائے ٹیمز جب بھی اس ایبے کی طرف بہتا تھا۔ اور اب بھی بہے۔ مگر جہاں اب پارلیمنٹ

کی سربفلک عمارت کھڑی ہے - وہاں ایک چھوٹا سا محل تھا - اور جہاں ویسٹ منسٹر کی خوب صورت سڑکیں اور عالی شان ہوٹل اور عمارتیں ہیں - وہاں دلدل تھی - اور جہاں ایبے ہے - یہ حصہ اُبھرا ہوا ایک ننھا سا جزیرہ تھا - جو پانی اور دلدل سے گھرا ہوا تھا - اس جزیرے پر اُن راہبوں نے بسیرا لیا - اور اُن کے لئے چھوٹی سی عمارت بنائی گئی اور اس میں کوئی دس بارہ راہب رہتے تھے - ۱۰۵۰ء میں شاہ اڈورڈ نے جو دین داری میں مشہور تھا - اور کانفسر کے لقب سے ممتاز ہوا - اس عمارت کو ڈھایا - اور شاندار ایوان کی آسائش کے لئے عمارت بنادی جس کے بعض حصے آج تک قائم ہیں علاوہ دین داری کے کانفسر کی اس خانقاہ سے خاص دلچسپی کا باعث یہ تھا - کہ اس کا محل اس کے قریب تھا اور وہ اس میں دفن ہونا چاہتا تھا . یہ بادشاہ اڈورڈ اول سے کچھ پہلے ہوا ہے - اور ۱۰۴۲ء سے ۱۰۶۶ء تک حکمران رہا - اُسے نارمن طرزِ[1] تعمیر پسند تھی - اور اسی لئے ایبے کی تعمیر نارمنڈی (علاقہ فرانس) کے نمونے پر ہوئی - انگلستان میں اس طرز کا یہ پہلا نمونہ تھا - اور اس کے بعد گرجے عموماً اسی نقشے پر بننے شروع ہوئے -

اصلاحِ مذہبِ عیسوی کے اس زبردست سیلاب میں جو ہنری ہشتم کے عہد میں آیا اور جس نے کیتھولک عقیدے کے سب نشان مٹا دیے عجب نہیں تھا - کہ یہ ایبے بھی بہہ جاتی - مگر اس کی قسمت میں یہ خزانہ لکھا تھا - اس سیل کی دستبرد سے بچ گئی - اور بجائے ایبٹ[2] کے اس کے لئے ڈین[3] مقرر کر دیا گیا - چونکہ یہ گرجا محلِ شاہی کے قریب واقع تھا - اس لئے عموماً بادشاہوں کی نظرِ عنایت اس پر رہی -

"ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت"

کا ظہور تو وقتاً فوقتاً ہوتا رہا - مگر سب اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے رہے - یہاں تک کہ

[1] لاہور کی نئی عمارتوں میں گورنمنٹ کالج کی عمارت کے بعض حصے اس طرزِ تعمیر کی نقل ہیں ؛

[2] راہبوں کا افسر ۱۲ [3] انگریزی اصلاح شدہ گرجے کا افسر ۱۲

سب بادشاہ اس میں دفن ہونے لگے۔ اور یہی جگہ تاج پوشی کے لئے مخصوص ہوگئی۔ تاج پوشی جو ایک خوشی کا موقع ہے۔ اس کا ایسا گہرا تعلق ایک مدفن سے ہونا بادی النظر میں نہایت تعجب خیز معلوم ہوتا ہے۔ اور خیال آتا ہے۔ کہ انگریز بھی باوجود آزاد خیالی کے دعوے کے اس قدر بندۂ رسم ورواج ہیں۔ کہ اس پرانی رسم کو جو موقعہ مناجوشی کے بالکل نامناسب نہیں ترک کرسکیں۔ اس میں شک نہیں۔ کہ انگریز بہ حیثیتِ قوم رسم پرستی میں کسی اور قوم سے کم نہیں اور اس رواج میں بھی رسم پرستی کو خاصہ دخل ہے۔ مگر ذرا غور کرنے سے اس رواج کی معقولیت صاف سمجھ میں آجاتی ہے۔ بادشاہ جب اس مقامِ عبرت میں سر پہ تاج رکھتا ہے۔ تو دنیاوی بڑائی کا انجام اس کی نظر میں پھر جاتا ہے۔ اور وہ اس بات کو محسوس کرتا ہے۔ کہ جو اختیار اور جو اقتدار اس تاج سے وابستہ ہے۔ وہ چندروزہ ہے۔ اور اس پر پھولنا مناسب نہیں۔ کوشش یہ چاہئے۔ کہ اس اختیار کو ایسی طرح برتا جائے۔ کہ پس مرگ لوگ خوشی سے اٹھے ان بزرگوں کے پہلو میں لاکر سلائیں اور نیکی سے یاد کریں۔ رسم تاج پوشی اڈورڈ کانفیسر کے مزار کے قریب جو گویا اس ایبے کا مرکز ہے۔ ادا کی جاتی ہے۔ یہ ایک بڑا سا چبوترہ سا ہے۔ جس پر لکڑی کے تختہ سے زینے چڑھتے ہیں۔ اس کے متعلق ایک انگریز مصنف یہ رائے ظاہر کرتا ہے:۔

"یاد رہے کہ یہاں آپ اسی مقام پر ہیں۔ جو ساری عمارت میں مقدس ترین ملنا جاتا ہے کسی قدر بلندی پر جناب کانفیسر آرام میں ہیں۔ شاہ ہنری سوم نے ۱۲۶۹ء میں بڑی شان وشوکت کے تابوت کو یہاں لاکر دفن کیا تھا۔ یہی وہ محرابیں ہیں۔ جہاں شاہ وگدا زانو ٹیک کے دعائے توبہ کرتے تھے۔ یا بیماری سے صحت پانے کے امیدوار تھے۔ آپ کے گرد و پیش شاہوں کے مقبرے ہیں۔ اور آپ کے پاؤں تلے شاہزادوں اور شہزادیوں کی مٹی ہے۔ کتاب کے اوراق جن میں اس مدفن کے حالات درج ہیں۔ پھر کسی وقت فرصت میں الٹ لیجئے گا۔ سردست اس کے عالی رتبہ تعمیر کنندہ ہنری سوم کی شاندار قبر کی طرف آنکھ اٹھائیے۔ جو جانبِ شمال واقع ہے۔ وہ خود تو یہاں ہیں۔ مگر دل ان کا اور جگہ اپنی ماں کے قریب ہے۔ جانبِ مغرب

ان سادہ بے زینت سلوں کے نیچے اُس کا نامور تخت جگر شاہ ایڈورڈ اوّل ایستادہ ہے جس کی حکومت دانائی کا نمونہ تھی۔ اور جس نے سکاٹ لینڈ والوں کی گردن پر جُوا ڈالا تھا۔ جانبِ شرق شاہ ایڈورڈ کی پیاری بیگم ملکہ الی نور کی قبر ہے جس کی خاطر جہاں کہیں اس کا جنازہ ٹھہرایا جاتا تھا کراس یعنی صلیبی نشان بنائے گئے تھے۔ اور جن میں سے ایک لندن کے مشہور چوک "چیرنگ کراس" کے نام کا باعث ہوئی۔ اب مغربی جانب کو چلیے تو ایڈورڈ دوم کی شاہی ڈھال اور تلوار رکھی ہے۔ اور کرسی تاج پوشی موجود ہے۔ یہ ایڈورڈ اوّل کے حکم سے بنی تھی۔ اور اس کے نیچے سنگِ تقدیر رکھا ہے۔ جو ایڈورڈ اوّل کو سکاٹ لینڈ میں ملا تھا۔ اُسی کرسی اور اُسی ناہموار پتھر پر سارے شاہانِ انگلستان اُس زمانے سے آج تک تخت نشین ہوئے ہیں۔ اس کی نسبت ایک عجیب روایت یہ ہے کہ یہی پتھر حضرت یعقوبؑ کا سنگِ بالیں تھا۔ اور پھر کنعان سے مصر میں پہنچا۔ مصر سے ہسپانیہ۔ ہسپانیہ سے آئرلینڈ اور آئرلینڈ سے سکاٹ لینڈ"۔

یوں تو اس مدفن کا ہر حصہ تاریخ انگلستان کا ایک باب ہے۔ اور اس لئے دل چسپی سے بھرا ہوا ہے۔ مگر دو حصے عام زائرین کے لئے سب سے زیادہ دلچسپ ہیں۔ ایک وہ جس میں مشہور مدبّرانِ مُلک کی قبور اور یادگاریں ہیں۔ اور دوسرا وہ جسے "گوشۂ شعراء" کہتے ہیں۔ زندگی میں تو یہ لوگ مقناطیسی کشش میں ممتاز تھے ہی۔ مگر خدا جانے کس بلا کا جادو ان کے خمیر میں تھا۔ کہ پسِ مرگ ان کی خاک بھی دامن گیر ہے۔ جی چاہتا ہے کہ گھنٹوں ایک ایک کے سرہانے چشمِ عبرت کھولے بیٹھے رہیں۔ کیا خوش قسمت تھے یہ لوگ اور کیا مبارک تھی ان کی زندگی۔ کہ جیتے تو دُنیا کو اپنے علم و عقل سے نفع پہنچایا۔ اور مرے تو ایسی نشانیاں اپنی محنت اور ہمّت کی چھوڑ گئے۔ کہ آئندہ نسلیں بھی اُن سے فائدہ اُٹھائیں۔ مدبّروں میں سے بعض کو شاندار یادگاریں اور شاندار کتبے نصیب ہوئے ہیں۔ جن کے ذریعے سے سپاس گزار قوم نے اپنے خادموں کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ مگر بعض نے یہاں بھی اپنی سادگی

کو نباہا ہے۔ اور مدت عمر سادگی کے ساتھ بسر کرنے کے بعد انہیں یہ گوارا نہیں ہوا۔ کہ مر کر شاندار نظر آئیں۔ گلیڈسٹون کا کتبہ اس خیال کا اعلےٰ نمونہ ہے۔ اُس سے سادہ کتبہ ایسے بلند پایہ وزیر دولت کے لئے ہو نہیں سکتا تھا۔ اس پر اس کے نام اور سن ولادت و انتقال کے سوا صرف یہ الفاظ ہیں:-

"چار دفعہ وزیر اعظم انگلستان"

اگر کوئی غور سے دیکھے۔ تو ان کتبوں کے الفاظ میں۔ ان پتھروں کی سلوں میں۔ ان کے رنگ میں۔ ان کی شکل میں۔ اُن بزرگوں کی تاریخ اور خصائل کا خلاصہ موجود ہے۔ شعراء اور مصنفین کے مدفن عام طور پر زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ بادشاہوں کی قبر پر تو کوئی پھول چڑھانے نہیں آتا۔ مگر چارلس ڈکنز ناولسٹ کی قبر پر اکثر پھول نظر آتے ہیں۔ اس کی ہر دلعزیزی روز افزوں ہے۔ اور مزا یہ ہے۔ کہ بعض لوگ ساتھ رقعے لکھ کر بھیجتے ہیں۔ جن میں اس کی نسبت اپنی عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی طرح دیگر مصنفیں کی قبروں پر اُن کے مداح کبھی کبھی پھول چڑھاتے ہیں۔ یہ لوگ اقلیم عقل و ذہانت کے بادشاہ گزرے ہیں۔ اور معلوم یہ ہوتا ہے۔ کہ قلوب انسانی پر جو دیرپا حکومت اور اثر ان کو حاصل ہے۔ وہ اُن بادشاہوں کو نہیں۔ جن کی قوت تیغ و سنان سے تھی۔ اور جن کی شان مال و دولت پر مبنی تھی۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا۔ کہ اس حصے میں سونے والے سب کشور سخن کے تاجور ہیں۔ کیونکہ جیسا ملکی سلطنت کے لئے جھوٹے دعویدار پیدا ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اس شاہی کے بھی مستحق اور غیر مستحق دونوں ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ غیر مستحق اپنی زندگی میں زیادہ قبولیت حاصل کر لیتے ہیں۔ اور اُن کے معاصرین۔ انہیں "گنج شہرت" میں جگہ دیتے ہیں۔ لیکن زمانہ ایسی غلطیوں کی اصلاح کر دیتا ہے۔ چنانچہ آج یہ میں بھی کئی ایسے لوگ پڑے ہیں۔ جن کے نام اب زمانہ مٹا چکا ہے۔ اور کئی ایسے ہیں جن کی شہرت میں امتداد زمانہ کچھ خلل نہیں ڈال سکتا۔ اسی لئے شیکسپیئر کا مشہور ہمعصر بن جانسن

جو اب حلقۂ مشاہیر میں شامل ہے۔ اور ویسٹ منسٹر ایبے میں جگہ پائے ہوئے ہے لکھنا ہے کہ میں جب گوشۂ شعرا میں گیا۔ تو میں نے وہاں کئی ایسے شاعر دیکھے جن کی شان میں کوئی یادگار وہاں برپا نہیں کی گئی تھی۔ اور کئی ایسی یادگاریں دیکھیں جن کے پاس شاعر نہ تھے۔ مگر غیر مشہور لوگوں کو چھوڑ کر بھی اتنی تعداد مشاہیر کی ہے۔ کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

ویسٹ منسٹر ایبے بے شک عجائبات انگلستان میں سے ہے لیکن دو باتیں اس میں ایسی ہیں۔ جو ایشیائی مذاق کو کھٹکتی ہیں۔ ان میں ایک تو لاعلاج ہے۔ اور اس کے باعث تو ہر مشرقی سیاح کو ضرور کم و بیش مایوسی ہوگی۔ لیکن دوسری علاج پذیر ہے۔ اور افسوس ہوگا۔ اگر اس کی کوئی اصلاح ممکن نہ ہو۔ پہلی چیز جو پہل ان آنکھوں کو جو مشرقی دُنیا کے عالی شان مقبروں کے نظارے کی عادی ہیں۔ جن کے بلند اور سفید گُنبدوں اور میناروں پر آفتاب اپنی پہلی کرن ڈالتا ہے۔ اور ابر رحمت اپنی پہلی بُوند برساتا ہے۔ مایوس کرتی ہے۔ وہ ایبے کی باہر سے سیاہ دیواریں اُس کے چھوٹے اور پست دروازے اور اس کے اندر کے حصوں میں سے بعض کی تاریکی ہے۔ مشرقی خیالات میں۔ قبرستان کے ساتھ سبزہ و گل لازم ہوئے ہیں۔ بادشاہوں اور امرا کی قبریں اگر چھت سے ڈھنپتی ہوتی ہیں۔ تو اُن کے گرد درخت اور بہتا ہُوا پانی اور سبزہ موجود ہوتا ہے۔ اور اگر متوسط درجہ کے لوگوں اور غربا کو یہ شان میسر نہ ہو۔ تو خودرو سبزہ برسات میں اُن کا قبر پوش ہوتا ہے۔ اور جنگل کے درخت اُن کی قبروں پر سایہ کیئے ہوئے ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے یہاں سب تربتیں اُس پرانے گرجے کی چار دیواری سے گھری ہوئی اور اُس کی دیرینہ چھت کے زیر سایہ ہیں۔ جو خیالی تصویر اس مقام کی کتابوں میں اس کا نام پڑھتے پڑھتے ہمارے ذہن میں جم گئی تھی حقیقت اس سے بالکل جُدا ہے۔ اور اس بڑے مدفن کا زائر ظاہری شان کی جس قدر کم توقع دل میں لے کر آئے۔ اُتنا ہی اس کے لیئے اچھا ہے۔ دوسری چیز جو ایشیائی طبیعت کو ناگوار ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ یہاں لوگ ان ناموروں کی قبروں پر بے دھڑک قدم رکھ دیتے ہیں۔ اور قبوُر کی

سلیں اس طرح فرشِ زمین سے ملی ہوئی ہیں۔ اور ایک دوسرے کے اس قدر قریب ہیں۔ کہ تاوقتیکہ خاص کوشش نہ کی جائے۔ اُن کو روندنے کے بغیر ایبے میں چلنا محال ہے۔ ٹنی سن اور براؤننگ۔ ڈکنز اور مکالے جیسے یکتا لٹائے گئے ہیں۔ اور ان کے زائرین ان کے اوپر چلتے ہیں۔ مانا کہ اب وہ پیوندِ خاک ہو گئے ہیں اور مغربی خیالاتِ تعظیمِ قبور کی اس ظاہری حرمت کے چنداں متقاضی نہیں۔ تاہم یہ کبھی فراموش نہیں ہو سکتا۔ کہ یہ خاک خاک تو ہے۔ مگر ایسے دل و دماغ کے بزرگوں کی۔ جن کی زندگی میں لوگ اُن کے لباس کو چھُو لینا فخر سمجھتے۔ اور گو وہ اس جہان سے چل بسے۔ تاہم اُن کی مٹی اب تک اتنی قدر کی تو مستحق ہے۔ کہ بے دریغ روندی نہ جائے۔ ملکہ الزبتھ ایبے کے جس گوشے میں سو رہی ہے اور جہاں اس کی قبر پر ایک بلند اور ممتاز چبوترہ ہے۔ اُسی گوشے میں دہلیز کے قریب فرش کے برابر ایڈی سن مدفون ہے۔ جو کوئی ملکہ کی قبر دیکھنے جاتا ہے۔ وہ ایڈی سن کی قبر کو روندتا ہوا جاتا ہے۔ یہ حالت دیکھ کر مجھے خیال آیا۔ کہ کاش ایڈی سن کسی اور گوشے میں دفن ہوتا۔ جہاں خواہ کم لوگ چلتے۔ مگر پامالی بھی کم نصیب ہوتی۔ اگر سنگِ مزار بول سکتا تو متوفی کی طرف سے یہ شعر پڑھتا ؎

شاہوں کے مقبروں سے الگ دفن کیجیو
ہم بیکسوں کو گورِ غریباں پسند ہے

یہ تو مشکل ہے۔ کہ اہلِ مغرب قبور کے متعلق ادب کا وہ لطیف اور نازک درجہ حاصل کر لیں جو اہلِ مشرق کا خاصہ ہے۔ مگر کم از کم یہ طریق جو اب مروّج ہے۔ ضرور قابلِ ترمیم ہے اور اس میں انھیں ایشیا سے سبق لینا چاہیئے۔ اس طرح ایشیا کو اپنے قابل لوگوں کی قدردانی میں اہلِ مغرب کی مثال سے بہت فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اور جس دن ایشیا کے بڑے شہر اپنی اپنی جگہ ویسٹ منسٹر ایبے کا جواب رکھیں گے۔ وہ دن ترقی کی مبارک فال لائے گا۔

ہربرٹ سپنسر

(۱۸۲۰ء سے ۱۹۰۳ء تک)

فلسفۂ جدید کی تاریخ گزشتہ صدی کے ناموروں میں ہربرٹ سپنسر سے بڑا آدمی شاید مشکل ہی سے پیش کر سکے ۔ اس عالی دماغ شخص کے حالاتِ زندگی کون نہیں سُننا چاہتا۔ اور اگر خود سپنسر کی زبانی سُنے جا سکیں۔ تو ازیں چہ بہتر۔ حال میں اس کی اپنی تصنیف کی ہوئی سوانح عُمری دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سپنسر ان لوگوں میں سے تھا جو اپنی رسائی ذہن اور قدرتی طباعی کے سوا تلمذ کے ممنوں یا کسی یونیورسٹی کی تعلیم کے مشکور نہیں ہوتے۔ اور محض اپنی محنت اور ہمت سے وہ نام پیدا کرتے ہیں۔ کہ دُنیا دنگ رہ جاتی ہے۔ اہلِ علم کے دلوں پر ابھی اس بلند پایہ فلسفی کے دُنیا سے اُٹھ جانے کا داغ تازہ ہے ۔ اور اس لیئے اُس کے حالات اور بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ سپنسر نے اس کتاب میں اپنے حالات کی تفصیل اور اپنے خیالات کی توضیح میں اُسی شوقِ تجربہ سے کام لیا ہے۔ جس سے علم کیمیا کا ماہر حقیقتِ اشیا دریافت کرتے وقت اور علمِ نباتات جاننے والا کسی پھول یا پتے کی تشریح کرتے ہوئے لیتا ہے۔ عبارت کے لحاظ سے یہ کتاب اس کے طرزِ تحریر کا عمدہ نمونہ نہیں کہی جا سکتی۔ کیونکہ اُس نے اسے عجیب دقتوں کے باوجود تکمیل تک پہنچایا۔ پہلے ۱۸۷۵ء میں اُس نے اپنی زندگی کے واقعات کا ایک ڈھانچ سا کئی نشستوں میں کسی سے لکھوایا۔ وہ بولتا جاتا تھا۔ اور کاتب لکھتا جاتا تھا۔ پھر اور کتابوں کی تصنیف میں مصروف ہو گیا۔ اور سوانح عمری کی ترتیب کا کام ویسے ہی پڑا رہا۔ کوئی دس سال بعد اس کی صحت پہلی دفعہ

بگڑی۔ اور دماغی محنت کے کثرت کے سبب ایسا معلوم ہُوا۔ کہ شاید قویٰ نے جواب دے دیا ہے۔ مگر ایسے آدمی سے نچلا کب بیٹھا جاتا تھا۔ سوانح عمری کے وہ اوراقِ پریشان یاد آئے۔ اور ۱۸۷۵ء میں اسے شغلِ بیکاری سمجھ کر پھر اُٹھا لیا۔ کیوں کہ کوئی ایسا کام جس کے لیئے زیادہ دماغ سوزی درکار ہو۔ اُن دنوں ممکن نہ تھا۔ دن میں کسی وقت جب طبیعت بے کاری سے بالکل گھبرا جاتی تو ۱۸۷۵ء کی یادداشتوں کو ذرا وضاحت سے لکھ لیتا۔ مگر واقعات بہ پابندیِ تاریخ و قوع درج نہ ہو سکے۔ سپنسر کو ہر وقت یہ خیال ستاتا رہتا تھا۔ کہ شاید مفصّل حالات کے قلمبند کرنے کے لئے اُس کی زندگی وفا نہ کرے۔ اس لئے اُس نے ارادہ کر لیا۔ کہ پہلے ضروری ضروری باتیں لکھ دی جائیں۔ مگر اسی اثنا میں صحت درست ہو چلی۔ اور اُس نے بعد ازاں کئی باتیں جو پہلے رہ گئی تھیں۔ جا بجا بڑھا دیں۔ ان اسباب سے ترتیب اور خوبیٔ عبارت میں تو خلل آ گیا۔ تاہم ہمیں اُس کا مشکور ہونا چاہیئے۔ کہ ہمارے لیئے اپنی مستند تصویر چھوڑ گیا۔ جسے اس کے بعد اشاعت نصیب ہوئی۔

عجیب بات ہے کہ ابتدائے عمر میں سپنسر بالکل معمولی قابلیت کا آدمی نظر آتا ہے۔ ریاضی میں تھوڑی سی واقفیت کے سوا جو مدرسے میں پیدا کی اور سائنس سے کچھ خفیف شناسائی کے علاوہ جو بطور خود قدرتی مذاق کی وجہ سے حاصل کی سپنسر اس چیز سے جسے عُرف میں تعلیم کہتے ہیں۔ بے بہرہ تھا۔ اٹھارویں برس میں وہ اپنی تعلیمی حالت کا نقشہ یُوں کھینچتا ہے:۔

ریاضی خاصی آ چلی تھی۔ اور اسی لیئے قوتِ استدلال مضبوط ہو گئی تھی۔ مگر زبانیں سیکھنے میں مجھے بہت کم کامیابی ہوئی۔ فرانسیسی کا تو سوائے گرامر کے ابتدائی حصّے اور ایک فقرول کی کتاب کے چند صفحوں کے میں کچھ نہ پڑھ سکا۔ یونانی میں بھی قدرے صرف نحو اور انجیل کے چند بابوں کا ترجمہ اور لاطینی کی کسی آسان سی کتاب کا ترجمہ میں کر سکتا تھا۔ مگر اس میں غلطیاں رہ جاتی تھیں۔ ہنٹن میں تعلیم کا احاطہ محدود تھا۔ تاریخ تو پڑھائی ہی نہیں جاتی تھی عام علم ادب کی طرف کوئی توجہ نہ تھی عملی علوم طبیعات داخل نصاب نہ تھے۔ اور نظم اور افسانے خارج از علوم سمجھے جاتے تھے۔

سپنسر کی باقاعدہ درسی تعلیم کا مندرجہ بالا تفصیل پر خاتمہ ہوگیا۔ اس کے بعد وہ فنِ انجینیری کی تحصیل میں لگا دیا گیا۔ اور اکیسویں برس تک اسی شغل میں مشغول رہا۔ کبھی لندن کے ریل کے کارخانوں میں اور کبھی برمنگھم میں وہ کام سیکھتا رہا۔ شوقِ علم اُسے اس عرصے میں بھی طبیعت کو گدگدائے بغیر نہ رہ سکا۔ اور اس لئے وہ اوقاتِ فرصت میں ریاضیات میں اپنا علم بڑھاتا رہا۔ اس زمانے میں سپنسر نے جو خطوط اپنے باپ کو لکھے ہیں۔ وہ مسائل اقلیدس سے پُر تھے۔ اور کبھی کبھی وہ اپنے فن کے متعلق یا علم طبعی کے متعلق بھی اُن میں بحث کرتا تھا۔ اس کا باپ فزکس (طبیعت) اور کیمسٹری (علم کیمیا) کا شائق تھا۔ اور کچھ لوگ اُس سے یہ علوم پڑھنے تھے۔ اس لئے سپنسر کو بھی بچپن ہی سے ان میں کچھ تھوڑا سا مذاق پیدا ہوگیا تھا۔ جن دنوں وہ کام سیکھ رہا تھا۔ ان دنوں میں چند لیکچر علم کیمیا پر ہوئے اور ان کے سننے سے اسی علم کی چند کتابیں پڑھنے کی طرف رغبت ہوئی۔ اور اسی زمانے میں ایک کتاب علم طبقات الارض کی خریدی اور پڑھی۔ مگر ان عملی چیزوں کی طرف میلان کے سوا اس زمانے میں گہرے فلسفیانہ مسائل پر غور و فکر کا کہیں پتہ بھی نہ تھا۔ اس وقت کوئی اس نوجوان انجینیر کو دیکھ کر گمان تک نہیں کر سکتا تھا۔ کہ علم مابعد الطبیعہ کے مطالعے کے لئے جس نازک خیالی کی ضرورت ہے۔ اور جس قدر جذبات سے بھری ہوئی طبیعت درکار ہے۔ اس کا کوئی حصّہ اس شخص میں موجود ہے۔ یہ باتیں عموماً مذہبی طبائع میں ہوتی ہیں اور مذہب سے سپنسر کو بالکل ناموافقت تھی۔ یہ ناموافقت ایک حد تک تو بعض موروثی خواص کا نتیجہ تھی۔ اور ایک حد تک اس کی خصوصیت تھی۔ اپنے بزرگوں کے خواص وہ یوں شمار کرتا ہے۔ آزادہ روی۔ خود رائی انکارِ تقلید اور سیاسی۔ تمدنی اور اخلاقی امور میں اپنی رائے کا صاف اور بے دھڑک اظہار۔ اس لئے کچھ تعجب نہیں۔ اگر ایسے بزرگوں کی اولاد مذہب سے اس درجہ بے پرواہ ہو۔ جیسا کہ سپنسر ذیل کی عبارت میں نظر آتا ہے:۔

مذہبِ عیسائیت باعتبار میرے جذبات اور میرے قوائے ذہنی کے میری فطرت سے

بیگانہ ہے۔ بہت لوگوں کو عبادتِ مذہبی سے ایک قسم کی فرحت ہوتی ہے۔ مگر مجھے کبھی نہیں ہوئی البتہ گرجے کی موسیقی سے جو اثر قلب پر ہوتا ہے۔ اُسے مستثنےٰ رکھتا ہوں۔ مگر ایک شخصی وجود کی مدح و ثنا۔ اور اس کے سامنے اپنی اطاعت اور عجز کا اظہار ایسی آوازیں ہیں۔ جن کی صدا میرے دل سے کبھی نہیں اٹھی"۔

تحصیلِ فن کے زمانے میں سپنسر کو نوکری بھی مل گئی تھی۔ مگر اکیسویں برس میں ہی اس نے اس نے اس ملازمت کو خیر باد کہا۔ تاکہ ایک کل بنانے میں جو برقی مقناطیسی دونوں قوتوں سے کام لے اور جس کی تجویز اس کے باپ کو سوجھی تھی۔ اپنا سارا وقت صرف کر سکے۔ لیکن ایک مہینے کی لگاتار محنت سے یہ معلوم ہوا۔ کہ وہ تجویز عملی صورت میں نہیں آسکتی۔ مایوس ہو کے رہ گیا۔ اس کے بعد سات سال تک بے ٹھکانہ سی زندگی کٹی۔ کئی دفعہ انجینئری کی عارضی ملازمت منظور کی۔ پر سات برس میں کل ڈیڑھ برس ملازمت کا موقع آیا۔ اور باقی وقت "نئی تجویزیں سوچنے اور ان کا امتحان کرنے میں ضائع ہوا۔ بغیر اس کے کہ ان سے کوئی عملی نتیجہ مترتب ہو"۔ ان تجاویز کا مقصد یہ تھا۔ کہ کوئی نئی دریافت یا ایجاد ایسی ہو۔ جس سے مالی نفع پہنچے۔ لیکن یہ محنت رائیگاں گئی۔ اور گو بعض چیزیں ابتدا میں اُمید دلانے والی نظر آئیں۔ مگر اُمید جلد مُبدّل بہ مایوسی ہوتی گئی۔

۱۸۴۲ء میں جب اُس کی عمر بائیس برس کی تھی۔ ہم اُسے میدانِ تصنیف میں قدم رکھتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اُس کی پہلی کتاب ایک پولٹیکل رسالہ تھا۔ جس میں "حکومت کے حدود مناسب مقرر" کئے گئے تھے۔ اس میں بعض رائیں ایسی تھیں۔ جنہیں بعد میں سپنسر کو بدلنا پڑا۔ مگر غور سے دیکھیں۔ تو اس کے پولٹیکل فلسفے کے سب اصول اس رسالہ میں آگئے تھے۔ اس کا بیان ہے۔ کہ اسی رسالے سے بعد کی مشہور کتابیں نکلیں۔ کتاب سوشل سٹیٹکس کا خیال اسی سے پیدا ہوا۔ اور جن تمدنی امور سے اس میں بحث تھی۔ اُن پر غور کرتے ہوئے پرنسپلز آف سائی کولوجی (یعنی علم النفس کے اصول) کی نوبت آئی۔

۱۸۴۶ء میں سپنسر نے چند کتابوں کا مسلسل مطالعہ شروع کیا۔ تاکہ فلسفہ پر کتاب لکھے ۱۸۴۷ء میں اس کے پاس مجوزہ کتاب "مارل فلاسفی" کے لئے کافی مواد جمع ہو گیا۔ اور یہ مواد اس کے دماغ میں کھولنے لگا۔" اور اسی سال کے ماہ ستمبر میں اُس نے دیباچے کے تیس صفحے لکھ کر اپنے باپ کے پاس بھیج دیئے۔ ۱۸۴۸ء میں گو ابھی مستقبل کے متعلق وہ معرض اُمید و بیم میں تھا۔ تاہم ڈربی کے گرد و نواح کے کھیتوں میں گھومتے ہوئے وہ اس کتاب کے اگلے باب سوچتا رہا۔ اور یہ اس کی عادت تھی۔ کہ سوچ کے لئے اُس کی طبیعت سیر ہی میں حاضر ہوتی تھی ۱۸۴۹ء میں آئندہ کی تجاویز ایسی غیر متیقن تھیں۔ کہ اس کا ارادہ ہو رہا تھا۔ کہ نیوزی لینڈ میں چلا جائے کبھی یہ ارادہ ہوتا تھا۔ کہ باپ کے ساتھ شریک ہو کر ایک نیا مدرسہ جاری کرے مگر اختتام سال سے پہلے اس کو اخبار "اکونومسٹ" کی نائب اڈیٹری مل گئی۔ اور اس تشویش کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد اُس کی زندگی ثابت قدمی کے ساتھ ایک منزل کی طرف ترقی کرتی گئی۔ سب سے پہلے کتاب "سوشل سٹیٹکس" تیار ہوئی۔ لندن میں جو پہلا سال گزرا۔ اُس کی راتیں اس تصنیف کے لیے وقف رہیں۔ طرزِ تحریر کی طرف اس زمانے میں بہت توجہ تھی۔ ۱۸۵۰ء کے آخر میں یہ کتاب شائع ہوئی۔

۱۸۵۰ء اور ۱۸۶۰ء کے درمیان جو دس سال کا عرصہ گزرا۔ اس کے متعلق سب سے زیادہ دلچسپ بات یہی ہے۔ کہ اس عرصے میں سپنسر کے دل میں ایک نظام فلسفی کے خیال کا ارتقا جاری رہا۔ انہی دنوں میں جارج الیٹ (مشہور افسانہ نگار) اس کی ملاقات ہوئی۔ اور جارج لوئس (مصنف تاریخ فلسفہ) ہکسلے اور ٹنڈل (مشہور سائنس دان) سے دوستی اور رسم پیدا ہوئی۔ جو مدت العمر قائم رہی۔ لوئیس کی دوستی کے لحاظ سے اُس نے لوئیس کی مشہور و معروف کتاب "تاریخ فلسفہ" پڑھی۔ اور اُس کا تعارف فلسفیانہ خیالات سے اسی کتاب کی بدولت ہوا۔ وہ خود معترف ہے۔ کہ اس وقت تک فلسفی مسائل کی طرف اس کی توجہ نہیں ہوئی تھی۔ اس سلسلے کا چھڑنا تھا۔ کہ پھر بقیہ عمر فلسفی تصانیف کی ہی نذر ہو گئی۔ ۱۸۶۲ء میں اس کی نامور کتاب "اے

سسٹم آف سنتھٹک فلسفی" شائع ہوئی۔ اور ۱۸۹۶ء میں اس کی طبع ثانی کی نوبت آئی۔ سپنسر کا فلسفہ بہ حیثیت جدت اور ندرت بیان میدان قبولیت میں تو گوئے سبقت لے گیا۔ مگر داننقادانِ فن کی نقادانہ رائے یہ ہے۔ کہ اُس میں ابتدائی تعلیم میں فلسفے کی ناواقفیت کے آثار موجود ہیں۔ اور نتائج کے استنباط میں لغزش کی جگہ نظر آتی ہے۔ تاہم اس کی کتابیں اپنے رنگ میں لاجواب ہیں۔ اور دیر تک وقعت کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی۔

اُنیسویں صدی کے عقائد میں قانونِ ارتقا (ایولیوشن) سب سے زیادہ مقبول نظر آتا ہے۔ اور گو یہ کہنا آسان نہیں۔ کہ بیسویں صدی کے اختتام پر دُنیا اس مسئلہ کو اُسی طرح تسلیم کرے گی۔ جس طرح اُنیسویں صدی کے اخیر میں کرتی تھی۔ تاہم اس کی موجودہ وقعت کا لحاظ اس کے سب سے بڑے حامی کی توقیر پر مجبور کرتا ہے۔ ڈارون اس نئے زمانے میں اس کا محرک اور سپنسر اس کا بڑا موئید تھا۔ اس بارے میں اس کے عقائد کا اندازہ مندرجہ ذیل عبارات سے جو اس کی پہلی تصنیف سے ماخوذ ہیں۔ ہو سکتا ہے۔

"ترقی کوئی اتفاقی امر نہیں۔ بلکہ لازمہ ہستی ہے۔ تہذیب بجائے مصنوعی چیز ہونے کے فطرت کا اُسی طرح ایک حصہ ہے۔ جیسے جنین کا ترقی کرتے کرتے بچے کی صورت اختیار کرنا اور کلی کا کھل کر پھول بننا۔ جو جو تبدیلیاں بنی نوع انسان میں واقع ہوئی ہیں۔ اور ہو رہی ہیں۔ وہ اُسی قانون کا نتیجہ ہیں۔ جو ساری ذی حیات مخلوقات پر حاوی ہے۔ اور بشرطیکہ نسلِ انسانی قائم اور ترکیب اشیا بحالت موجودہ رہے۔ ان تبدیلیوں کا لازمی نتیجہ تکمیل ہے۔ جیسا کہ یہ یقینی ہے۔ کہ درخت اکیلا نمو پاتا رہے۔ تو تناور ہو جاتا ہے۔ اور اگر جھنڈ میں سے ایک ہو تو پتلا سا رہتا ہے۔ یا جیسا کہ گھوڑا حسب ضرورت گاڑی میں جوتنے کے لائق یا گھوڑ دوڑ میں دوڑنے کے لائق بنتا ہے۔ اسی طرح یہ یقینی ہے۔ کہ انسان کے قوائے جسمانی و ذہنی اس کی تمدنی حالت کے عین متناسب رہنے کے لئے سانچے میں ڈھلتے ہیں۔ اور اسی طرح لازم ہے۔ کہ وہ چیزیں جنہیں ہم بُرائی اور بداخلاقی

سے تعبیر کرتے ہیں۔ رفتہ رفتہ غیر موجود ہو جائیں۔ اور انسان انسانِ کامل بن جائے۔ پھر اسی کتاب کے ایک اور حصے میں:—

ایک زبردست حرکت ہے۔ جو ہمیشہ تکمیل کی طرف جا رہی ہے۔ اس کی عمومیت اس درجہ کی ہے۔ کہ تمام خفیف بیقاعدگیاں اور کوتاہیاں اس کے آگے ہیچ ہیں۔ جیسے کہ زمین کی گولائی کے خم کے سامنے کوہ و وادی بے حقیقت ہے۔ بنظرِ غائر نقائص میں بھی خواہشِ تکمیل کی بے حد جہد کا ظہور پاتی ہے۔ غور کرنے والے شخص کو جو بات سب سے بڑھ کر حیرت میں ڈالتی ہے اصلی کفایتِ اشیا ہے اور وہ بظاہر پیچیدہ مگر در حقیقت سادہ اصول جس سے ہر نقص کی اصلاح خود بخود ہوتی رہتی ہے وہی اصول جس سے نجوم بعد حرکت اپنی اپنی جگہ قائم رہتے ہیں۔ جس سے زخمی ٹانگ خود بخود درست ہو جاتی ہے۔ جو نظامِ تمدن کے پلڑے برابر رکھتا ہے۔ جو نابینا آدمی کی شنوائی بڑھا دیتا ہے۔ جو قیمت کو پیداوار کی مقدار کے متناسب کرتا ہے۔ اور جو ایک پودے کو نئی آب و ہوا کا عادی بنا دیتا ہے۔ سوچنے والا آدمی روز بروز انتظامِ فطرت میں نیا حسن دیکھنے لگتا ہے چشمِ بصیرت کھلتے ہی اُسے اعلیٰ موزونیت دکھانے لگتی اور اس کے دل میں گہرا عقیدہ جمانے لگتی ہے۔ جب اس کے قلب پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو اُسے کسی سطحی خیال کے شخص کا اُٹھ کر یہ دعوےٰ کرنا کہ وہ کس طرح فطرت کی اصلاح کر سکتا ہے۔ اور اس بے عیب جامے میں تھگلی لگا سکتا ہے۔ کتنا بُرا معلوم ہوتا ہے۔ ان حضرات کی صورت تو ملاحظہ ہو۔ کہ ایسے بجا شرارت سے تو گھرے ہوئے ہیں۔ اور پھر انہیں یہ جرأت ہے۔ کہ اس امر کا اعلان کریں۔ کہ اُنہوں نے اور ان کے چند ہمعصروں نے باہمی مشورہ کر کے خدائی انتظام میں اصلاح کا کوئی طریقہ ایجاد کیا ہے۔ یہ دخل در معقولات دینے والے۔ یہ خود بخود دُنیا جہان کی خبر گیری کا بیڑا اُٹھانے والے قوانینِ قدرت پر اس قدر کم اور اپنی قابلیت پر اس قدر زیادہ بھروسا رکھتے ہیں کہ اگر ان کی چلنے پائے۔ تو آج ہی سورج اور زمین کو ایک مضبوط زنجیر سے جکڑ دیں کہ کہیں وہ قوت جو اس دونوں کو قائم رکھے ہوئے

ہے۔ اچانک عمل کرنے سے نہ رہ جائے۔ گویا ان کے نزدیک کوئی قاعدہ جو پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے ہیں۔ قوانین کے مشابہ نہ ہو قابلِ اعتبار نہیں ہے۔ یہ ہے خلاصہ اُن حیرت انگیز عقائد کا جو ان ترمیم کنندگانِ تحلیق کا شعار ہیں "

مندرجہ بالا عبارات ظاہر کرتی ہیں۔ کہ سپنسر گو بعض باتوں میں نیا ہے۔ مگر اُس پُرانے مسئلہ میں کہ دُنیا کی تجویز اس سے بہتر ہو ہی نہیں سکتی۔ متقدمین سے نہایت خوش عقیدہ لوگوں کا ہم خیال ہے۔ اس کی تصانیف کے بعض حصّے جہاں لامذہبی کا اظہار کرتے ہیں۔ وہیں ایسی عبارتیں خدا کی خدائی کا بے اختیارانہ اعتراف کر رہی ہیں۔ اور انہیں پڑھتے ہوئے حالی کا وہ شعر یاد آتا ہے ؎

مانا نہیں جس نے تجھ کو جانا ہے ضرور
بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہے کھٹکا تیرا

اس کی آخری کتاب یعنی سوانح عمری میں جو اس کے پس مرگ شائع ہوئی ہے۔ نہایت دلچسپ بات یہی ہے۔ کہ اس نے اپنے حالات اور خیالات بلاکم و کاست لکھ دیئے ہیں۔ اور اپنے نقائص کا بے حجاب اقرار کیا ہے۔ اس کے ساتھ اس کی خوبیوں کا گہرا نقش دل پر بیٹھتا جاتا ہے۔ اور خوبیاں عیوب کو بھلا دیتی ہیں۔ اس کی اعلیٰ درجہ کی دیانت داری بے حد محرک اخلاقی جرأت۔ مثالیہ کی بلندی سب بے حد مشکلات کے باوجود اپنے مثالیہ کو عملی صورت دینا۔ عادات کی سادگی۔ ابنائے جنس کی صحبت کی جستجو۔ بچوں کی محبت اور دیرپا دوستیاں قائم کرنے کی قابلیت ایسی خصلتیں ہیں جن کی تعریف کئے بغیر رہا نہیں جاسکتا۔ اور اس سوانح عمری کو پڑھنے والا کتاب کو پسند کرتے وقت مصنف کی بہ حیثیت انسانی سچی تعظیم اپنے دل میں پاتا ہے۔ اور اس بڑے فلسفی کے خیالات سے خواہ اُسے اتفاق ہو یا نہ ہو۔ اس کو بڑا آدمی تسلیم کرنے میں انکار کی گنجائش نہیں رہتی۔

کشتی اور طوفان

وہ دہشتناک نظارہ مشکل سے بھولے گا۔ جب میں نے ایک دن کشتی اور اس کی سواریوں کو ساحل کے قریب ہزارہا لوگوں کے پیشِ نظر طوفان کی لہروں کے زبردست تھپیڑوں سے عاجز آکر ڈوبتے دیکھا۔

فرانس کا شمالی ساحل تھا۔ اور اتوار کا دن۔ ہزاروں تماشائی زن و مرد، ساحل کے قریب اونچے بند پر بیٹھے۔ طوفان اور تلاطم دریا کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ سکون کے وقت تو سمندر کے منظر کو دل کشا ماننے میں شاید کسی کو بھی کلام نہ ہو۔ لیکن تلاطم کے وقت کا منظر بھی ایک پُرشوکت دلچسپی سے خالی نہیں۔ بشرطیکہ آپ سبکساران ساحل میں ہوں۔ مگر یہ دلچسپی اسی وقت تک ہے کہ سامنے سمندر ہی سمندر ہو۔ کسی انسان کی جان یا کسی کشتی کی قسمت طوفان کے پنجے میں نہ ہو۔ ورنہ فوراً سخت سے سخت دل موم ہونے لگتے ہیں۔ اور دلوں سے دعائیں بے اختیار نکلتی ہیں کہ الٰہی ان جانوں کی خیر ہو۔ جو اس پُرشور حالت میں توکل بخدا پانی میں ناؤ ڈالے ہوئے ہیں۔ جس دن کا میں ذکر کرتا ہوں۔ اس دن سمندر زوروں پر تھا۔ موجیں بلیوں اچھلتی تھیں۔ اور کبھی کبھی پانی ساحل کی ساری خشکی طے کر کے بند سے آکر ٹکراتا تھا۔ اور اس طرح اچھلتا تھا۔ کہ بند کے اوپر کی زمین تر ہو جاتی تھی۔ اور جو لوگ وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے کپڑے بھیگ جاتے تھے۔ لیکن تعطیل کا دن۔ فراغت کا زمانہ۔ سمندر کی بے اعتدالیاں ہنسی میں ٹال دی جاتی تھیں۔ کسی عورت کے دامن تک اگر سمندر اپنا دستِ گستاخ بڑھاتا تھا۔ تو کئی اور مشتاق ہاتھ ہٹانے کو دوڑتے تھے۔ اور چھتری کی ڈھال سامنے کر دیتے تھے۔ اور عورت ہنستی ہوئی شکریہ

ادا کرتی تھی۔ اگر کسی مرد کا دامن آبِ شور سے تر ہو جاتا تھا۔ تو عورتیں تالی بجاتی تھیں
اور وہ قہقہے پڑھتے تھے۔ کہ الاراں۔ لوگ بھیگتے تھے۔ اور پروا نہ کرتے تھے۔ کوئی اپنی جگہ
سے ٹلتا نہ تھا۔ ایک طرف باجا بج رہا تھا۔ اور سینکڑوں لوگ اُس کے گرد جمع تھے۔ اور
جو دُور تھے۔ وہ بھی اس کی سُریلی صداؤں کے مزے لے رہے تھے۔ کہ اچانک ایک
توپ کی آواز آئی۔ چار بجے کے قریب توپ کیوں چلی۔ سب حیران ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگے
جاننے والے جان گئے کہ کوئی جہاز یا کوئی کشتی خطرے میں ہے۔ اور یہ توپ بندرگاہ کے اُس
مینار سے چلی ہے۔ جہاں ایک تجربہ کار بحری افسر اس نگہداشت پر متعین رہتا ہے۔ کہ
نواحِ بندر میں اگر کوئی حادثہ ہو۔ تو فوراً اس کی اطلاع دے۔ نگاہیں سمندر کی طرف دوڑیں
اور ایک بادبان پر پڑیں۔ جو اپنے کام سے عاری ہو چکا تھا۔ اور اُس سے ایک ستون
پر اٹریں۔ جو سرنگوں ہونا چاہتا تھا۔ کشتی کا ایک سرا پانی میں تھا۔ اور دوسرا پانی کے
اُوپر تھا۔ اور اس طرف ستون سے مضطربانہ لپٹے ہوئے دو آدمی نظر آتے تھے۔
سینکڑوں زن و مرد بے قراری کے ساتھ بند سے نیچے اُتر کر پانی کے قریب جانے لگے۔ اور
بعض تیراک کپڑے اُتار کر۔ پانی میں کودے کہ کشتی تک پہنچ کر اُس کی مدد کریں۔ تھوڑی دیر
میں دو کشتیاں پانی میں ڈالی گئیں جن میں وردی پوش ملّاح جو ایک ایسی سوسائٹی کے ملازم تھے
جس کا کام ڈوبتوں کی جانیں بچانا ہے۔ اور جو عموماً سمندر کے کنارے پھرتے رہتے ہیں۔
کہ اگر کوئی ناواقف دُور تک نہاتا ہوا چلا جائے۔ اور غوطے کھانے لگے۔ یا اور کوئی
واقعہ ہو تو مدد کو پہنچیں۔ مگر موجوں کی یہ حالت تھی۔ کہ دونوں کشتیوں میں سے ایک بھی
وہاں تک نہ پہنچ سکی۔ جہاں کشتی ڈوب رہی تھی۔ یہ لوگ ہمت کر کے اُس طرف کو بڑھتے
تھے۔ مگر ایک ہی موج ایسی آتی تھی۔ کہ مار کر پیچھے ہٹا دیتی تھی۔ اُتنے قدم بڑھنے نہیں پاتے
تھے۔ جتنے پیچھے دھکیل دیئے جاتے تھے۔ گویا سمندر زبانِ موج سے اُن پر عتاب کرتا ہوا
کہتا تھا۔ "او انسانِ ضعیف کے بے ادب ہاتھو! ہٹو۔ اور اپنی بساط سے بڑھنے کی جرأت نہ

کرو۔ یہ کشتی اور اس کی سواریاں میرا شکار ہیں۔ اور کس کی مجال ہے؟ کہ میرا شکار مجھ سے چھینے۔ اور میں کیا ہوں۔ میں بھی نہنگِ اجل کا ایک مُنہ ہُوں۔ اس نہنگ کا نوالہ اب تمہارے ہاتھ کیوں کر آسکتا ہے؟ اسی طرح وہ دلاوراں بہر و پہراں جو اِکا دُکا کُود پڑے تھے بطمۂ مُوج سے عاجز آ کر کنارے پر کھڑے بےبسی سے یہ خوفناک تماشا دیکھ رہے تھے۔ کشتی بان کے کئی یار دوست جان پہچان والے وہیں کنارے پر موجُود تھے۔ اور ہاتھ مَل رہے تھے۔ مگر کیا ہوتا تھا۔ کشتی دو چار دفعہ ڈوبی اور اُبھری۔ آخر صرف بادبان کا ایک حصّہ پانی کے اُوپر تھا۔ اور باقی سب پانی کے نیچے۔ ذرا دیر میں وُہ بادبان بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اور کشتی نذرِ طُوفان ہو گئی۔

اس ہیبت ناک سین کے دیکھنے والوں کے چہرے اُس وقت دیکھنے کے قابل تھے۔ ایک مایُوسی تھی۔ جو سب کے چہروں پر چھائی ہوئی تھی۔ ایک رنج تھا۔ جو سب کے دِلوں پر مسلّط تھا۔ ایک پریشانی تھی۔ جو سب طرف آشکار تھی۔ ایسی ہی گھڑیوں میں بنی نوعِ انسان کی وہ باہمی لازوال یگانگت ثابت ہوتی ہے جس سے کیا اشخاص کیا اقوام کامیابی کے نشے اور دولت کمانے کی جد و جہد میں چشم پوشی کر لیتی ہیں۔ وہاں عیسائی بھی تھے۔ اور یہوُدی بھی۔ انگریز بھی۔ اور فرانسیسی بھی۔ پراٹسٹنٹ بھی تھے۔ اور کیتھالک بھی۔ چند سیاہ فام حبشی تھے۔ اور چند گندم گون مصری۔ مراقش اور الجزائر کے کئی تاجر اپنی سُرخ ٹوپیاں پہنے کھڑے تھے۔ اور میں ایک ہندی بھی اُسی گروہ کا جزوِ قلیل تھا۔ مگر ہر ایک نبض ایک رفتار پر تھی۔ گویا ایک نبض تھی۔ ایک دُوسرے سے پُوچھتا تھا۔ کہ مرنے والے کون تھے۔ کہاں سے آئے تھے۔ پہلے تو جتنے مُنہ تھے۔ اُتنی زبانیں۔ کوئی کچھ کہتا تھا۔ کوئی کچھ۔ آخر ایک شخص سے جس نے اس کشتی کو روانہ ہوتے دیکھا تھا۔ معلوم ہُوا۔ کہ کشتی میں چھ آدمی تھے۔ ایک کشتی بان اور دُو اُس کے بچے۔ ایک چودہ سال کا جو کشتی چلانے میں مدد دیتا تھا۔ اور دُوسرا آٹھ نو سال کا جس کو وہ اکیلا گھر میں نہیں چھوڑ سکتا

تھا۔ کیوں کہ اُس کی ماں مر چکی تھی۔ یہ شخص کشتی لئے کنارے پر بیٹھا تھا۔ کہ تین مسافر آئے دو مرد اور ایک عورت۔ اُنہوں نے کہا۔ ہم سمندر کی سیر کرنا چاہتے ہیں۔ ایک دو اور کشتی والوں نے انکار کیا۔ کہ آج طُوفان آرہا ہے۔ اس حالت میں کشتی دریا میں نہیں ڈالی جاسکتی۔ وہ مایوس ہوئے۔ اور کہنے لگے۔ کہ ہمیں پھر اور موقع نہیں ہے۔ کل واپس جانا ہے۔ یہ کشتی بان دلیر تھا۔ اس نے کہا۔ آؤ میں لے چلتا ہوں۔" وہ ہنستے ہوئے سوار ہو لئے اور کشتی چلی۔ آدمی تھا کاریگر۔ خاصی دیر تک باوجود طُوفان کے چلاتا رہا۔ مگر اُس کی دلیری اور ان کے اس شوق کی آڑ میں موت شکار کھیل رہی تھی۔ ایک تھپیڑا ایسے زور کا آیا۔ کہ کشتی اُس کے قابو میں نہ رہی۔ اور اُلٹ گئی۔ بس پھر کیا تھا۔ نہ کہیں ٹھکانا لگنا تھا۔ نہ لگا۔

اب اُن آفت رسیدوں کی کہانی سنیئے جو سیر کرنے نکلے تھے۔ وہ تھے ایک میاں۔ ایک بی بی اور ایک میاں کا بھائی۔ میاں۔ بی بی میں کچھ عرصہ سے عشقِ صادق تھا۔ اور آخر دونوں نکاح پر متفق ہو گئے تھے۔ اِتوار کا یہ حادثہ ہے۔ اور ہفتے کے دن اُن کا بیاہ ہوا تھا۔ دونوں کے ماں باپ زندہ تھے۔ اور بیاہ ہوتے ہی یہ اُن سے ہنسی خوشی رُخصت ہوئے تھے۔ کہ اتوار کا دن بولوں کاٹ کر پیر کو گھر آجائیں گے۔ ہفتے کو جب پادری ان کے ہاتھ ملا کر اُن کو دُعا دے رہا ہوگا۔ تو اُسے کیا معلوم ہوگا۔ کہ وہ نکاح آسمان کے لئے باندھ رہا ہے۔ اور زمین پر اُس نکاح کی مُدّت چوبیس گھنٹے سے زیادہ نہیں ہے۔ مگر وہ چوبیس گھنٹے ایسے تھے۔ کہ اُن پر چوبیس سال کی خوشی قربان کر دینی چاہئے۔ کیونکہ اُن کا جو انجام ہُوا۔ وہ ہرچند پُردرد اور غم ناک ہے۔ مگر ایسا انجام ہے۔ کہ کوئی طالب و مطلوب اُس سے بڑھ کر آرزو نہیں کرسکتے۔ دونوں ڈوبے تو اکٹھے ڈوبے۔ شب بھر موجوں کے سامنے اکٹھے سینہ سپر رہے۔ اور جب دُنیا بھر نے یہ سمجھ لیا۔ کہ قعر سمندر میں جہاں لاکھوں بندگانِ خُدا کی بے نشان قبریں بنتی ہیں۔ ان کا بھی مزار بن چُکا۔ تو اچانک سمندر کے جی میں یہ آئی کہ ان کا عشقِ صادق کم از کم پختہ اور مُشترکہ مزار کا مستحق ہے۔ چلو ان کی لاشیں اُگل دو۔ باقی سب کو تو ہضم کر گیا۔ مگر ان دونوں کو پیر کے روز ساحل

پر پھینک دیا۔ پیر کو دریا کا سکون دیکھ کر تعجب ہوتا تھا۔ کہ کل یہیں اس زور کا طوفان تھا۔ اور جہاں کشتی ڈوبی تھی۔ اُس جگہ کے قریب خشکی ہو گئی تھی۔ وہاں دو موم کی تصویریں پڑی تھیں۔ بیوی اپنے شوہر جاں نثار سے لپٹی ہوئی۔ بال چہرے پر پریشان۔ مگر صورت سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے سو رہی ہے۔ میاں کے چہرے پر یہ سکون نہ تھا۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا تھا۔ کہ جواں مرد نے موجوں سے لڑنے لڑتے جان دی ہے۔ اور جدو جہد کا نقش چہرے پر یادگار رہ گیا ہے ؎

شناوران محبت تو سب ہنر ور ہیں مگر
جو ڈوب جائے وہ پہنچے ہے آشنائی کا

دو سہ روز آشنائی بہ شناختن نیرزد

یہ مصرعہ جو اس مضمون کا عنوان ہے اُن اقوال کی مثال ہے۔ جن میں شعراء ایک خاص جوش اور وجد کی حالت میں بہت سے جذباتِ انسانی کو چند لفظوں میں ظاہر کر دیتے ہیں۔ یا بہت سے سالوں کے تجربے اور مشاہدے کو ایک مصرع یا ایک شعر کے تنگ حدود میں بند کر لیتے ہیں۔ شعر میں جو ایک غیر معمولی اثر اور قوت ہوتی ہے۔ وہ بعض اوقات آدمی کے دل پر بے طرح قابو پالیتی ہے۔ وہ الفاظ کی ایک مناسب اور موزوں ترتیب کا نتیجہ ہوتی ہے۔ لیکن اس ترتیب کا مادہ خدا نے ہر شخص کو عطا نہیں کیا۔ اور سوائے اُن لوگوں کے جن کے حصّے میں مذاقِ شاعری قدرت نے رکھا ہو۔ کسی کو یہ طاقت نہیں۔ کہ محض لفظوں کے ہیر پھیر سے دلوں پر حاوی ہو جائے۔ مذاقِ شاعری سے مُراد طبیعت کی وہ موزونیت نہیں۔ جو عروض کے چند ابتدائی قواعد کے مُطابق تک بندی کرنے تک محدود ہوتی ہے۔ اور جس کا شمالی ہندوستان میں قریباً ہر باشندے کو عُمر کے ایک نہ ایک حصّے میں دعویٰ ہوتا ہے۔ بلکہ قدرت کا بنایا ہُوا شاعر ہم اس کو مانتے ہیں جس کا دل شاعر ہو۔ دِل کا شاعر ہونا اُردو میں ذرا غیر مانوس محاورہ ہے۔ اور اکثر لوگوں کے کان جو انگریزی نہیں پڑھے۔ اس سے غالباً نا آشنا ہوں گے۔ اس لئے اس کی تشریح ضروری معلوم ہوتی ہے۔ دل کے شاعر ہونے کے بظاہر تو معنے معلوم ہوتے ہیں۔ کہ دل غزلیں اور مخمّس اور مسدّس کہتا ہو۔ اور تاریخیں نکالتا ہو۔ اور ایک مثنوی عشقیہ بھی لکھ چکا ہو۔ ایک آدھ مرثیہ یا سلام بھی اُس کی تصنیفات میں ہو۔ شعر کے جو مختلف صنائع ہیں۔

ان سے بھی واقف ہو۔ ایک سہرا بھی کسی کی سیار کباد کو نہ ہی۔ ذوق و غالب کے جواب میں ہی کہہ رکھے۔ اور کبھی کسی مشاعرے میں بھی پڑھا ہو۔ لیکن انگریزی میں شاعر دل اور بھی معنے رکھتا ہے۔

وہ دل جس میں درد ہو۔ رقت ہو۔ سوز ہو۔ گداز ہو۔ وہ دل جو قدرت اور اس کے گوناگوں نماشوں میں اپنے ساتھ کچھ یگانگت پائے۔ وہ دل جو قدرت سے قادر کا پتہ لگائے۔ وہ دل جو خالق کے سبب اس کی مخلوق کا بھلا چاہے۔ وہ دل جو زندگی کے مقصد کا متلاشی ہو۔ اور وہ دل جو ان تمام مدارج کو طے کرکے خود فراموشی اور محویت کے ایک ایسے درجے پر پہنچے۔ جس میں وہ عام انسانوں کے طبقے سے اوپر نظر آئے۔

یہ کہنے سے کہ انگریزی میں شاعر دل کے یہ معنی ہیں یہ مطلب ہرگز نہیں۔ کہ ہمارے شعرا میں ان اوصاف سے متصف شاعر نہیں گزرے۔ ہمارے شعرا میں سے بعض میں صانع قدرت نے یہ صفات کوٹ کوٹ کر بھری تھیں اور ان میں سے ہر ایک کا پرتو اُن کے کسی نہ کسی شعر میں۔ رباعی میں قطعے میں جلوہ افگن ہے۔ بلکہ یہ مدعا ہے۔ کہ ان اوصاف کو لوازم شاعری ٹھہرانا اور ان اشخاص کو جو ان سے بے بہرہ ہوں۔ غیر شاعر سمجھنا یہ اہل یورپ کی ہی کتابوں میں دیکھا گیا ہے۔ در وقت آ گیا ہے۔ کہ ہندستان میں بھی اس اصول کی پابندی شروع ہو۔ اور جو لوگ اس معیار میں پورے نہ اتریں اُن سے شاعری کا خطاب چھین لیا جائے۔ محض قافیہ اور ردیف کے سمجھنے اور پرانی لکیر پر چل کر دو چار غزلیں کہہ دینے کا نام ہی شاعری نہ رکھا جائے۔ اس سے ہمارے پرانے اعلے درجے کے شعرا کی ناموری میں جیسے کہ میر۔ مصحفی، ذوق۔ غالب۔ آتش۔ ناسخ۔ انیس۔ دبیر ہیں کچھ کمی نہ آئے گی۔ لیکن بہت کچھ رطب و یابس جو ہمارے لٹریچر میں بھرا ہوا ہے۔ چھنٹ جائے گا۔ اور شاعری کے پہچاننے کا صحیح مذاق مُلک میں پیدا ہو جائے گا۔ اور لوگ اس قابل ہو جائینگے

کہ ایک ایسے مصرعے کو جوان چند سطور کا زیب عنوان ہے۔ پڑھ کر محض اس کی لفظی خوبی اور بندش ہی کو نہ دیکھیں گے۔ بلکہ ان خیالات پر بھی غور فرمائیں گے۔ جن کے ہجوم کرنے سے شاعر کی زبان پر مصرعہ بے اختیار آ گیا ہوگا۔ اور جس کے بعد ایک مصرعہ اس کے پہلے لگا کر یوں شعر مکمل کر لیا ہوگا۔

مکن آشنائی اے دل بہ کسے کہ نزدِ دانا
دو سہ روز آشنائی بہ شناختن بنرزد

بادی النظر میں یہ شعر ایسا قابلِ قدر نہیں معلوم ہوتا۔ یہ خیال میں آتا ہے۔ کہ اگر کوئی اس پر عمل کرے۔ تو اس ڈر کے مارے۔ کہ آشنائی چند روزہ ہے۔ کسی سے آشنائی ہی نہ کرے۔ دنیا کے دن بے یار و مددگار بے دوست و آشنا کاٹ لے۔ اور چل بسے۔ اس صورت میں تمام دنیا کے داناؤں کی کثرتِ رائے اس کے برخلاف ہوگی کیوں کہ ان سب نے باوجود دُنیا کی بے ثباتی کے دُنیا میں دوستی کو بہت بڑھایا ہے۔ اور ہر شخص کے لئے دلی دوست پیدا کرنے اور اُن کی خدمت کرنے کی تاکید کی ہے۔ اور سچے دوست کو دُنیا میں سب سے بڑی نعمت قرار دیا ہے شعرا نے دوستوں کی دوستی کی تعریفیں کی ہیں۔ فسانوں میں یاروں کی غم گساری کی حکایتیں ہیں۔ اور تاریخوں میں باوفا اصحاب کی وفاداری کی روایتیں ہیں۔ مسلمانوں کے ہادیٔ برحق نے دوستوں کے حاصل کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ اور اُن کے بعد کے بزرگانِ دین کا بھی یہی مسلک رہا ہے پس "مکن آشنائی" پر کیوں کر عمل ہو سکتا ہے۔ لیکن تھوڑی دیر غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا۔ کہ یہ شعر نہ تو آشنائی کا مانع اور نہ متقدمین کے عمل کے متضاد ہے بلکہ عین اس کے موافق اور اطمینانِ قلبِ انسانی کا جو شعرا و فلسفے کا [illegible] مقصد ہے نسخہ لئے ہوئے ہے۔ جو دلوں کو پریشانی سے بچانے کے لئے اکسیر کا حکم [illegible] اس شعر کی سچائی کی تصدیق کسی ایسے حرماں نصیب شاعر سے کیجئے جس سے مدت

تلاش کے بعد اپنے دل کی پسند کے مطابق ایک شخص دیکھا ہو۔ کسی ذریعے سے اس کے ساتھ ملاقات پیدا کرنے کی کوشش کی ہو۔ اُس میں ناکامیاب ہُوا ہو۔ پھر اور کوئی ذریعہ ڈھونڈھا ہو۔ مگر وہاں بھی ناکامی نے اُس کا پیچھا نہ چھوڑا ہو۔ کوئی اور ترکیب سوچی ہو۔ مگر پھر بھی تیر نشانے پر نہ بیٹھا ہو۔ آخر ملاقات ہوئی ہو۔ اب ملاقات بڑھانے کی فکر ہو۔ مگر جس کا یہ مشتاق ہو۔ وہ اُس سے دُور دُور کی سلام علیک ہی پسند کرے۔ مشکلوں سے اس نے ربط بڑھایا ہو۔ پھر ربط بڑھنے کی حالت میں چند امتحانات اس پر آئے ہوں۔ اور اُن میں بھی پُورا اُترا ہو۔ اور عین اُس وقت جب وہ یہ سمجھے کہ جسے مَیں چاہتا تھا۔ وہ میرا ہو لیا تو کوئی ایسی غلط فہمی درمیان آ جائے۔ کہ شخص موصُوف پھر بدگمان ہو جائے۔ اور منائے نہ منے۔ اور بات ایسی بگڑے۔ کہ بنائے نہ بنے۔ کیا یہ اس حالت میں اس کے مُنہ سے بے ساختہ نہ نکل جائے گا؟ کہ ع

دو سہ روز آشنائی بشناختن نیرزد

کیا اس کو وہ دو چار دن جو باہم ارتباط میں گذرے۔ اس زمانۂ دراز کے سامنے جو اشتیاق میں گزرا تھا۔ بہت ہی کم نظر نہ آئیں گے؟ اور کیا وہ یہ نہ کہے گا۔ کہ "شناختن" کی تکلیف کی قیمت بھی ادا نہ ہوئی۔

اس سے بھی زیادہ تصدیق کی ضرورت ہو۔ تو کسی ایسے شخص کو ڈھونڈھو۔ جس نے ایسی تلاش سے جیسی اُوپر بیان کی گئی ہے۔ بیس بائیس سال میں دو چار دوست پیدا کئے ہوں۔ جس نے اس عرصے میں والدین اور اعزہ اور اقربا کی بے غرض محبت کی قدر کرنی سیکھی ہو۔ اور جس کے دل میں اس کے عوض دینے کے نیک ارادے ہوں۔ جس نے بہت انتظار کے بعد اپنے مطلب کی بیوی پائی ہو۔ اور نکاح کے بعد یہ محسوس کیا ہو۔ کہ دنیا میں پوری خوشی باعصمت اور تعلیم یافتہ بیوی کے مل جانے سے ہے۔ اور جس نے مناسب نکاح کا پہلا اور سب سے عمدہ میوہ ایک صحیح اور خوش رُو بچہ ابھی ابھی دیکھا ہو۔

اور جو بچپن سے لے کر اس وقت تک کے دراز عرصے میں دُنیا کی سب چیزوں سے محض آشنا ہُوا ہو۔ اور اس آشنائی کے لُطفوں کے کچھ عرصے تک حاصل کرنے کے خیال میں ہو۔ کہ اچانک اُسے پیامِ اجل آجائے۔ اور وہ تمام اُمیدوں اور آرزوؤں کو خیرباد کہتا ہُوا اور در و دیوار پر حسرت سے نظر کرتا ہُوا عالمِ بالا کو سُدھارنے لگے۔ اگر اس وقت کان لگا کر اُس کی کمزور آواز سُنو۔ یا اگر لب بند ہوں۔ تو اس کی صدائے دِل سُنو۔ تو یہ کہہ رہا ہوگا۔ کہ ع

دو سہ روز آشنائی بہ شناختن نیرزد

اچھا ان خیالی مثالوں کو چھوڑ کر سر سیّد احمد خان مرحوم کی واقعی مثال کو لیں۔ اس کے بچپن کو دیکھیں۔ اس کی جوانی پر نظر دوڑائیں۔ اس کے ادھیڑپن کے زمانے پر غور کریں۔ اور اس کے بڑھاپے کو خیال میں لائیں۔ شروع سے یہ دُھن اس کے سر میں سمائی ہوئی تھی۔ کہ قوم مسلمانان جو علومِ زمانہ حال سے نفور ہے۔ ان کی طرف راغب ہو۔ جہالت اور مذہب کی نسبت توہماتِ بے جا اور خیالاتِ باطل جو ان کے دلوں میں گھر کئے ہوئے ہیں۔ ان سے دُور ہوں۔ وہ اسلام کی حقیقت کو پہنچیں۔ اور اس کے اصُول پر کاربند ہوں۔ اور اُن بد عادات کو جو دوسری اقوام کی رسومات کے اثر سے اُن میں پیدا ہوئی ہیں چھوڑیں۔ اسلام کی وقعت غیر قوموں کے دلوں میں پیدا ہو۔ اور اس قوم کی شان بڑھے۔ اس دُھن کے پُورا کرنے کے لئے سید مرحوم مُدت العمر محنت کرتا رہا۔ گالیاں کھاتا رہا۔ بدنامی سر پر لیتا رہا۔ کفر کے فتوے سُنتا رہا۔ اور جب وہ زمانہ قریب آیا۔ کہ اپنی محنت کا ثمرہ اُٹھائے۔ لوگوں میں وہ شوق جو وہ پیدا کرنا چاہتا تھا پیدا ہونے لگا۔ اُس کی نیک نامی شروع ہوئی۔ اُس کی تکفیر کے فتوے بند ہوتے۔ اقوامِ غیر بھی مسلمانوں کو قوموں میں شمار کرنے لگیں۔ تو مشیتِ ایزدی میں یہی آیا۔ کہ اُس کا وقت ختم کر دیا گیا۔ کیا وہ دو سہ روزہ آشنائی جو سر سیّد مرحوم کو قومی ترقی کے آثار سے ہوئی۔

اُس محنت کا جو "شناختن" میں صرف ہوتی تھی۔ معاوضہ ہو سکتی ہے؟ گو اس کو اس تسلی نے کہ کام شروع ہو گیا ہے۔ خواہ تکمیل اس نے نہ دیکھی۔ شاید اس مصرعے کو شکایت پڑھنے سے روک لیا ہو۔

تحصیل علوم و فنون میں بھی یہی حال نظر آتا ہے۔ کہ تحصیل کا عرصہ اس عرصے سے جس میں اس تحصیل سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ عموماً کم ہوتا ہے۔ مثلاً کسی علم کی تکمیل کے لئے تو کم از کم ایک عمر چاہیئے۔ فرض کیجئے کہ کوئی شخص عمر بھر صرف کر کے بڑھاپے کے قریب اُس سے کماحقہٗ آشنائی حاصل کرتا ہے پس وہ دن جن میں وہ اُس سے فائدہ اٹھاتا ہے شناختن کے زمانے کو پورا مقابلہ نہیں کر سکتے فرض کرو۔ کہ ایک طبیب پچاس سال کے تجربے سے نبض کو پہچاننے میں سحر یا میسٹر کا رتبہ حاصل کرتا ہے۔ مگر جلد وہ تجربہ اُس کے ساتھ ہی قبر میں جاتا ہے۔ اور اس سے دُوسرے کی طرف منتقل نہیں ہو سکتا۔ ایک علم کیمیا دان عمر بھر کی محنت شاقہ کے بعد ایک ڈسکوری کرتا ہے۔ یا کوئی ماہرِ علم طبیعات کوئی نئی اور مفید ایجاد کرتا ہے۔ یا فلسفی کوئی تھیوری نکالتا ہے۔ کہ اُٹھتے ہی پیمانۂ عمر لبریز ہو جاتا ہے۔

ان مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ یہ تو عام دستور ہے۔ جو سب پر کم و بیش اثر کرتا ہے کہ آشنائی میں محنت کرنی پڑے۔ اور شناختن کے لُطف یا فائدہ اُٹھانے کے دن کم ہوں۔ اس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہیئے۔ کہ اس خیال سے وہ محنت ہی نہ کریں وہ تو مایوسی کی حالت میں انسان کے دل سے یہ نکل جاتا ہے۔ کہ کاش اس مصیبت میں نہ پڑتے۔ تاکہ یہ روزِ بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ اس اظہارِ ناراضگی سے طبیعت ایک گونہ تسلی پاتی ہے۔ مگر ایسے بے تابانہ الفاظ یا فقرات کبھی مانع سعی نہیں ہوتے۔ کیوں کہ دُنیا میں اصلی راحت تو سعی میں ہے۔ گو انسان ہر وقت اس بات کو نہیں سمجھتا۔ اور شاعر نے جب ایسے ہی مختلف خیالات کے ہجوم سے جن کے نمونے اُوپر لکھے گئے ہیں۔ یہ بے ساختہ

مصرع کہا۔ تو اس کا مقصد یہ تھا۔ کہ یہ خیال کہ حصولِ مدعا کے بعد اس کا لطف چند روزہ ہوتا ہے۔ اور دُنیاوی چیزیں بہرحال چند روزہ ہیں۔ ہر وقت پیش نظر رہے۔ اور اس خیال سے وہ ہر فرصت کو غنیمت سمجھے۔ اور آشنائی کے حصول میں اتنا وقت ضائع نہ کر دے جتنا بعد کے لاانتہا لطفوں کی اُمید ہونے کی صورت میں کوئی کر سکتا ہے۔

اور نیز یہ کہ جب اس کی کوششوں کا ماحصل اُس سے چھننے لگے۔ تو وہ صبر کو بالکل ہاتھ سے نہ دے بیٹھے۔ بلکہ اس خیال سے تسلی پائے۔ کہ آشنائی تو اپنے نیچر ہی میں دو دستہ روزہ تھی ؂

حُرّیت اور آزادی

مہاراجہ بڑودہ ایک دن لندن کے ایک مجمع میں مع مہارانی صاحبہ مدعو کیے گئے۔ میل جول کا جلسہ تھا۔ اور لوگ بے تکلفی سے اپنے اپنے حلقوں میں باتیں کر رہے تھے۔ مہاراج کے مزاج میں چونکہ بے ساختہ پن انتہا درجے کا ہے۔ اس لیے وہ بھی خُلق سے ہر ایک سے باتیں کرنے لگے۔ اور لیڈیاں رانی صاحبہ کی طرف جُھکیں۔ اور چونکہ رانی صاحبہ اخلاق میں اپنے نامور اور ممتاز شوہر سے کچھ کم نہیں۔ اور حسن سیرت و صُورت کے ساتھ جوہر شرافت رکھتی ہیں۔ اس لئے اُن کے گرد ایک معقول حلقہ سلامیوں کا ہو گیا۔ اس حلقے میں ایک ہندوستانی بزرگ تھے۔ عمر رسیدہ اور ریاستی لباس پہنے ہوئے۔ کسی بڑی ریاست کے اہل کار تھے۔ مہاراج اُن کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا۔ کہ آپ کب سے یہاں ہیں۔ اُنہوں نے کہا۔ کہ چند ہفتے سے۔ مہاراج نے کہا۔ آپ نے بڑی ہمّت کی۔ کہ اس عمر میں اتنے لمبے سفر کا عزم کیا۔ آپ جیسے تجربہ کار لوگوں کا اِس مُلک میں آنا۔ اور یہاں کے حالات کو دیکھنا مُفید ہے۔ اُنہوں نے جواب دیا۔ کہ اسی شوق نے اتنی دُور کھینچا۔ مہاراج نے سوال کیا۔ آپ کس صیغے سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ آیا آپ یہاں کی تعلیم گاہیں دیکھ رہے ہیں۔ یا تجارت گاہیں۔ یا صنعتی کارخانے۔ اُنہوں نے کہا۔ اب میری عمر ان چیزوں کے مفصّل طور پر دیکھنے کی نہیں ہے۔ مَیں سرسری طور پر بہت سی چیزیں دیکھ رہا ہُوں۔ اور جو چیزیں یہاں کی مجھے سب سے زیادہ پسند ہیں۔ وہ یہاں کی لبرٹی ہے۔ مہاراج یہ لفظ ایک بوڑھے ریاستی اہل کار کی زبان

سے سُن کر بہت خوش ہوئے۔ اور مسکرا کر انہیں اپنے ساتھ ایک کونے میں لے گئے۔ اور دیر تک اُن سے باتیں کرتے رہے۔

اِس ایک لفظ میں کیا جادو تھا۔ اِسے وُہی سمجھ سکتے ہیں جن کے دل میں اس کی قدر ہے۔ مگر ہم میں کتنے ہیں۔ جو اس کی پُوری قدر کرتے ہیں۔ یا کر سکتے ہیں۔ پوری قدر کے یہ معنی کہ اسے جان و مال سے عزیز سمجھیں۔ جیسے بزرگوں کے قصے سُنتے ہیں۔ کہ وہ جان و مال اولاد سب چیز پر آبرو کو مقدّم رکھتے تھے۔ اور چاہے کیسی تکالیف کا سامنا ہو۔ آبرو پر آنچ نہیں آنے دیتے تھے۔ اُسی طرح اس مجموعی آبرو، اس قومی عزّت، اس مُلکی نمود پر جو لبرٹی سے وابستہ ہے۔ مر مٹنے والے ہم میں کہاں ہیں؟ ہمارے ہاں اس انگریزی لفظ کا ترجمہ عموماً "آزادی" کیا جاتا ہے۔ مگر انگریزی میں ایک اور لفظ بھی ہے۔ جس کا ترجمہ اُردو میں "آزادی" ہی ہے۔ یعنی "فری ڈم" گو یہ دونو انگریزی لفظ اصل میں مترادف ہیں۔ مگر مزاج کے فرق نے ان کے معانی میں ایک باریک سا فرق پیدا کر دیا ہے۔ لبرٹی لاطینی زبان سے لیا گیا ہے۔ اور فری ڈم سیکسن اصل سے ہے۔ معنی دونوں کے وہی ہیں۔ اور اب بھی بعض اوقات ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہو جاتے ہیں۔ لیکن اصطلاح میں جو لطیف امتیاز ان کے معنوں میں ہوا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ "فری ڈم" مطلق آزادی کے لئے چاہیے۔ وہ خیالات کی ہو۔ عادات کی ہو۔ اطوار کی ہو۔ ذاتی ہو۔ یا ایک جماعت کی ہو۔ استعمال ہوتا ہے۔ اور لبرٹی ملکی آزادی کے معنوں میں زیادہ مستعمل ہے۔ ہمارے ہاں اکثر ان دونوں الفاظ کے لئے ایک ہی ترجمہ ہونے سے غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہم بھی لبرٹی کے خاص مفہوم کے لیئے ایک خاص لفظ قرار دیں۔ اور میرے خیال میں اس مفہوم کو عربی لفظ "حُرّیت" سے بڑھ کر کوئی لفظ ادا نہیں کرتا۔ اور چُوں کہ "حُرّیت" پہلے سے ہی ہمارے ہاں مُرَوّج بھی ہے۔ اِس لئے اِس کے زیادہ استعمال میں کوئی رُکاوٹ نہیں۔ مصر کے عربی

اخبارات میں یہ لفظ بہت مستعمل ہے۔ مگر وہاں عموماً حمیتِ قومی یا ملکی معنوں میں آتا ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھیں۔ تو مفہوم بہرحال وُہی رہتا ہے۔ کیونکہ حمیت قومی ملکی حریّت کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور اگر کسی اتفاق سے ہو بھی جائے۔ تو پنپنے نہیں پاتی۔ حمیّت قومی ایک پودا ہے۔ جو حُریّت کی سرزمین میں اُگتا ہے۔ حُریّت کے پانی سے سرسبز ہوتا ہے۔ اور حُریّت کی ہوا اُسے راس آتی ہے۔ اور جگہ جم بھی جائے۔ تو وُہ کیاری سُوکھ جاتی ہے۔ حمیّت کے گیت گانا۔ حمیّت حمیت پکارنا اور چیز ہے۔ اور حمیت کا عملی ثبوت دینا اور چیز۔ اور یہ عملی ثبوت ہی وہ شے ہے۔ جو اُس خطۂ دُنیا میں جو حُریّت کی نعمت سے محروم ہو۔ ناممکن ہے

ہندوستان میں گو آزادی کا شوق عام ہوتا جاتا ہے۔ اور ایک روز افزوں جماعت اس کی خواہاں ہے۔ تاہم یہ بھی ایک امرِ واقعہ ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ آزادی کے مخالف بھی ہم میں بکثرت موجود ہیں۔ جو اس کے نام سے بھڑک اُٹھتے ہیں۔ کچھ بہت عرصہ نہیں ہوا۔ کہ اخبارات اور رسائل میں بعض ثقہ اور ملامت رُو حضرات آزادی کے شوق کے خلاف مضمون لکھ رہے تھے۔ اور آزادی کے دلدادہ اپنے رنگ کے اخبارات میں انہیں صلواتیں سُنا رہے تھے۔ اور اب بھی یہ مباحثہ وقتاً فوقتاً تازہ ہوتا رہتا ہے۔ مگر اس کی وجہ یہی ہے۔ کہ دونو فریق اس لفظ کے مفہوم پر متفق ہو کر بحث شروع نہیں کرتے۔ اختلاف کرنے والوں کے ذہن میں آزادی "مادر پدر آزادی" کے قریب قریب معنی رکھتی ہے۔ اور چونکہ آزادی پسند طبائع بھی کبھی کبھی اپنی مشق گھر ہی سے شروع کرتی ہیں۔ اور باہر قیود کی زیادتی کی وجہ سے سکوت پر مجبور ہو کر سارا زور گھر کی چاردیواری کے اندر "آزادی" کی پکار پر ڈالتی ہیں۔ اس لئے پُرانے طریقوں اور رسُوم کے دلدادہ گھبرا کر زمانے کو کوسنے لگتے ہیں۔ اور اس صدی کو بُرا کہتے ہیں۔ جس نے یہ تاثیر نوجوانوں میں پیدا کر دی۔

اور نہایت درد کے ساتھ یہ اشعار پڑھتے ہیں ؎

ایں چہ شوریست کہ در دورِ قمر مے بینم | ہمہ آفاق پُر از فتنہ و شر مے بینم
دختراں را ہمہ جنگ است و جدل با مادر | پسراں را ہمہ بد خواہ پدر مے بینم

یہ زمانے کے گلے شکوے تو ہمیشہ سے چلے آتے ہیں۔ اور ہمیشہ رہیں گے۔ اِن کا جھگڑا چکانا تو ہمارا مقصود نہیں۔ ہمیں تو بحث اس سے ہے۔ کہ جو غلط فہمی لفظِ آزادی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کا خاتمہ ہوجائے۔ اور آزادی کی کم از کم ایک صفت ایسی ہو۔ جس کے متعلق متفقہ رائے یہ ہو۔ کہ حاصل کرنے کے لائق چیز ہے۔ اور پھر اس کے حصول کے لئے متفقہ کوشش ہو۔ اور یہ وہ حقیقت ہے جسے ہم نے ابھی حُریت کے نام سے پکارا ہے۔ کوئی معقول آدمی اس کی ضرورت سے انکار نہیں کرسکتا۔ اور قوموں کی تاریخ اس بات پر دلالت کرتی ہے۔ کہ قوموں اور ملکوں کے بننے اور بگڑنے کا دار و مدار اسی پہ ہے۔

یُوں تو یُورپ کے اکثر حصّے اس دولت سے مالا مال ہیں۔ مگر انگلستان اور فرانس کو اس پر خصوصیت سے ناز ہے۔ نئی دنیا میں ریاستہائے متحدہ کا یہ دعویٰ ہے۔ کہ اُن کی جمہوری حکومت سب سے نمایاں مثال لبرٹی کی ہے۔ اور ادھر ایشیا میں اب جاپان نے لبرٹی کا جھنڈا بلند کیا ہے۔ فرانس کی حُریت نے جس زمانے میں زور پکڑا۔ اُس نے تو ملک میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا تھا۔ اسی انقلاب میں وہاں قدیم شاہی کی بیخ و بنیاد اُکھڑ گئی۔ اور اس کی جگہ موجودہ ری پبلک یعنی جمہوری حکومت قائم ہوئی۔ جس کے نشان پر یہ الفاظ جلی حروف میں لکھے ہیں "لیبرٹی۔ اگالٹی۔ فراٹرنٹی" ان تینوں حروف کا ترجمہ ہے "حُریت۔ مساوات۔ برادری" یعنی ہر فرانسیسی آزاد ہے۔ سب اہالی برابر ہیں۔ اور سب اہالی بھائی ہیں۔ یہ نشان جس پر فرانس اس وقت نازاں ہے۔ دُنیا میں سب سے پہلے عرب میں اسلام کے آتے ہی بلند ہوا تھا۔ مگر افسوس۔ کہ بعد میں اس کا بہت تھوڑا حصّہ باقی رہا۔ اور اب صرف ایک تاریخی واقعہ کا حکم رکھتا ہے۔ انگلستان کا یہ قول ہے

کہ اس کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی غلامی کی بیڑیاں ٹوٹ جاتی ہیں یہ قول تو اس زمانے میں رائج ہوا تھا۔ جب انگلستان نے غلامی اپنی حکومت میں قانوناً ممنوع کر دی تھی اور اس لئے کسی دوسرے ملک سے اگر کسی کا غلام بھاگ کر انگلستان میں پناہ لیتا تھا تو وہ آزاد سمجھا جاتا تھا اور واپس نہیں دیا جاتا تھا۔ گو اب غلامی ان پرانے معنوں میں قریب قریب فسانہ رہ گئی ہے۔ سوائے اس کے کہ کانگو کی ریاست کے یورپین انتظام میں اہل ملک پر زمانۂ غلامی کے ظلم سے یورپ کی پیشانی پر ایک بدنما داغ ہے لیکن انگلستان کے متعلق یہ قول اب تک صحیح ہے۔ کیونکہ غلامی کی دوسری صورتیں جو دنیا کے بعض حصوں میں اب تک انسان کی جان کا وبال بنی ہوئی ہیں ان کے ستم پر۔ جو انگلستان میں آکر پناہ لیں۔ فوراً ان حالات سے آزاد ہو جاتے ہیں یہاں کوئی انہیں یاد نہیں دلاتا۔ کہ وہ مغلوب ہیں۔ ہر شخص اپنے گھر میں بادشاہ ہے اور کوچہ و بازار میں میلے تماشے میں گل گشتِ باغ میں۔ ریل کی سواری میں۔ کھانے پینے کے کمروں میں اس کے ساتھ وہی سلوک ہوتا ہے جو انگلستان کے کسی معزز باشندے کے ساتھ اس سلوک سے وہ زنجیریں جن سے وہ جکڑا ہوا تھا۔ خود بخود ٹوٹنے لگتی ہیں اور کچھ عرصہ اس آب و ہوا میں جینے کے بعد وہ اپنے دل و دماغ کو آزاد پاتا ہے اور حریت کے خواب دیکھنے لگتا ہے۔ مگر حریت مہنگے داموں بکتی ہے۔ اس عارضی طور پر اس کا مزا چکھنے کو جب ہزاروں روپے چاہئیں تو مستقل طور پر اس صحت بخش و مفرح آب و ہوا میں جینے کے لئے تو لہو پانی ایک کرنا ہوگا۔

حریت جب مزاج میں پیدا ہو جائے تو ایک عجیب رنگ لاتی ہے نہ صرف اپنی قیود بھاری ہونے لگتی ہیں۔ بلکہ دوسروں کے جکڑ بند توڑنے کو جی چاہتا ہے۔ انگلستان میں جو تحریکیں وقتاً فوقتاً کارخانوں میں مزدوروں کی نوکری کے گھنٹے کم کرانے کے لئے گھروں میں نوکروں کو اتوار کو آدھی تعطیل ضرور دینے کے لئے مدرسوں کے لڑکے لڑکیوں کو کھلی ہوائیں

رہنے کے مواقع پیدا کرنے کے واسطے ہوتی رہتی ہیں۔ وہ اس شوق کی مثالیں ہیں جو ہے تو خفیف سی بات۔ مگر نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ لیڈیاں اور صاحبان جو کتے پالنے کے شوقین ہیں۔ اگر اپنے بڑے بڑے اور تند کتوں کو جو عموماً بے زنجیر رکھے جاتے ہیں۔ ٹہلانے باہر نکلیں تو ان کی زنجیر کھول دیتے ہیں۔ ایک کوڑا ہوتا ہے جس سے ایک کنڈا سا لگا ہوتا ہے۔ وہ ہاتھ میں احتیاطاً رکھ لیتے ہیں۔ اگر کتا کچھ شرارت کرنے لگے۔ تو پٹے سے اٹکا کر کوڑے کو زنجیر بنالیں۔ مگر کتا بھی اپنی آزادی کی قدر کرتا ہے اور اس اعتبار پر ناز کرتا ہوا کہ اسے بازار میں مالک یا مالکہ کے ساتھ بے زنجیر چلنے کی اجازت دی گئی ہے۔ بہت احتیاط سے چلتا ہے کہ کہیں کوڑا زنجیر نہ بن جائے۔ اہل امریکہ میں یہ شوق اس حد کو پہنچا ہے کہ انہیں انگلستان بھی مفید معلوم ہوتا ہے۔ میں اڈنبرا میں تھا کہ ایک دن اتوار کو ایک بڑی چوراسیہ گاڑی جس میں ادھر کے قابل سیر مقامات میں بیس بیس پچیس پچیس مسافروں کو لاد کر سیر کرنے لے جاتے ہیں۔ مجھے اتفاق سے تین چار امریکن لیڈیاں مل گئیں جو محض سیاحت کے لئے برطانیہ کی سیر کر رہی تھیں جیسا کہ ہزاروں امریکن کرتے ہیں۔ اپنے بزرگوں کا وطن، اپنی تاریخ کا مرکز۔ انگریزی زبان کے بڑے بڑے مصنفوں کا گھر۔ انہیں برطانیہ سے خاص دلچسپی کیوں نہ ہو؟ برطانیہ کو دیکھنے یوں آتے ہیں۔ جیسے کوئی حج یا تیرتھ کے لئے آئے۔ ان لیڈیوں سے گفتگو ہوئی کہنے لگیں۔ ہمارے ہاں تاریخی دلچسپی کے ایسے سامان نہیں ہیں۔ جیسے اس ملک والے رکھتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ہمارا ملک دیکھنے کے قابل ہے اور ہم اس پر فخر کرتے ہیں۔ میں نے کہا۔ "آپ کا فخر بجا ہے۔ یہاں والے اگر تاریخ کی بوسیدہ ہڈیوں پر اترا سکتے ہیں تو آپ کا ملک ایک تاریخ جاری ہے جو اس وقت تکمیل رہی ہے یہاں والوں کا ناز ہے کہ ان کے بڑوں نے یہ کچھ کیا تھا۔ آپ اب وہ باتیں کر رہے ہیں جن کو آئندہ نسلیں تعجب سے دیکھیں گی اور جن سے آئندہ تاریخ بنے گی۔ امریکہ کے تھوڑے

سے زمانے میں جو کچھ کیا ہے وہ اسی کا حصہ تھا"۔ اپنے ملک کی تعریف کسے نہیں بھاتی میرے
اس خیال کے اظہار سے وہ بہت خوش ہوئیں اور باقی رستے میں جا بجا اپنے خیالات
سے مستفید کرتی گئیں۔ ایک خوبصورت پرانا مکان رستے میں پڑا۔ جو کسی امیر کی ملک تھا اور
اس کے گرد ایک آراستہ باغ تھا اور باغ کے گرد ایک چار دیواری تھی۔ جس کی دیواریں
خاصی بلند تھیں کہنے لگیں "مکان بہت عمدہ۔ باغ بہت اچھا۔ مگر دیواریں بہت خراب"
میں نے کہا "پرانے زمانے کی یادگاریں"۔ کہنے لگیں "ہمیں ان سے وحشت ہے۔ ہم
کھلی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اب تو مکان سے گرد جنگلے تک کی رسم مٹتی جاتی ہے"
آگے دور چل کر چند پھٹے کپڑوں والے لڑکے نظر آئے جو گاڑی کے ساتھ ساتھ پیسے
مانگنے کے لئے دوڑتے تھے۔ برطانیہ کا قانون کسی کو ایسا کرنے کی اجازت تو نہیں
دیتا۔ لیکن بیرون جات میں کہیں نہ کہیں افلاس لوگوں کو مجبور کر ہی دیتا ہے۔ اور
مثالیں چونکہ کہیں کہیں ملتی ہیں۔ اس لئے قانون بھی تعرض کم کرتا ہے ان لڑکوں کو دیکھ کر
ایک امریکن لیڈی بولی "یہاں قدم قدم پر اس بات کا ثبوت ملتا ہے۔ کہ یہاں
حکومت لوگوں کی اپنی نہیں نہ صرف ان غریب لڑکوں میں بلکہ عام طور پر غریب لوگوں
کے چلنے پھرنے، بات چیت ہر چیز میں نظر آتا ہے کہ یہ ملک شاہی طرز حکومت
کے ماتحت ہے"۔ میں یہ سن کر متعجب ہوا۔ اور میں نے ان سے کہا کہ آپ کی نگاہ میں
اس ملک کی لبرٹی نہیں جچتی اور اگر ہم ان کی حالت میں ہوں تو گویا پولٹیکل بہشت میں پہنچ
جائیں۔ اس نے کہا "اہو۔ تو کیا آپ ان سے بھی ابتر حالت میں ہیں۔ میرا خیال تھا۔ کہ
انگریزی حکومت سب جگہ یکساں ہے۔ کم از کم اکثر یہی سنتے ہیں کہ انگلستان نے ہندوستان
کو تمام وہ فوائد اور حقوق جو خود اسے حاصل ہیں دے رکھے ہیں"۔ میں نے کہا کہ جب
آپ سکاٹ لینڈ کے باشندوں کی صورت سے ان کی حالت کا اندازہ کر سکتی ہیں تو

ع میری صورت میری حالت کا پتہ دیتی ہے

اس کا بھی اندازہ کر لیجئے۔ مگر صحیح اندازہ جب ہو سکتا ہے۔ جب آپ مجھے ہندوستان میں دیکھیں۔

ان امریکہ والوں کے خیالات سے تو ہمارے ہاں کیا انگلستان میں بھی کئی لوگ گھبراتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اتنی آزادی ہمیں مطلق نہیں بھاتی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جتنی مطلوب اور ضروری ہے۔ اتنی بھی ملے تو کیونکر ملے؟ حریت کا خیال دلوں میں پیدا ہو تو کیونکر؟ ہندوستان میں کئی دل سوختہ اس وقت ایسے ہیں کہ وہ اپنے ملک سے قطعی مایوس ہیں۔ ان میں ایک میرے دوست ہیں جو ان دنوں واپس وطن گئے ہوئے ہیں۔ یہاں تھے تو ان سے بحث رہتی تھی اور وہاں ہیں تو خطوں میں وہی بحث چلتی رہتی ہے۔ اتفاق سے وہ زن و فرزند کے علائق سے اب تک خالی ہیں۔ اس لئے وہ اکثر خواب دیکھتے ہیں کہ ہندوستان سے ہجرت کر جائیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ کدھر جائے گا؟ یہ تو فرمایئے کہیں آپ کی قدر بھی ہے؟ ذرا جنوبی افریقہ میں آسٹریلیا میں تشریف لے جا کر تو دیکھئے۔ حریت کے تمغے کے بغیر کون پوچھتا ہے۔ آپ کے بھائیوں کی جو تواضع ہو رہی ہے۔ وہ سارے زمانے کو معلوم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایران یا روم کو جا بسائیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ آپ کی تحقیر وہاں بھی رفاقت کرے گی۔ جب تک اپنے ملک کی عزت نہ بنا لو گے باہر کہیں عزت نہ ہوگی۔ انہوں نے مجھے خط میں لکھا "ہندستان جہنم ہے"۔ میں نے جواب عرض کیا "اسے جنت بنایئے"۔ اور مجھ سے پوچھئے تو میں اسے باہمہ نقائص آب و ہوا اچھا سمجھتا ہوں۔ اب معلوم نہیں وہ اپنے ذاتی علائق کی محبت ہے یا قدرتی الفت وطن۔ بہر حال ہندستان جو کچھ ہے ہمارا ہے۔ اور ہم اس کے ہیں۔ جو عزت ہم اس سے جدا ہو کر حاصل کرنا چاہیں۔ جو آرام ہم اس سے بھاگ کر ڈھونڈیں۔ وہ اول تو ملے گا نہیں اور اگر ملا تو اس کا لطف نہیں آ سکے گا۔

عزت وہی ہے جو وطن کی عزت کے ساتھ ہو اور وطن کی عزت اہل وطن میں حریت کے پیدا ہونے پر منحصر ہے اور وہ جب ہی پیدا ہوگی کہ ہر ہمدرد وطن اسے اپنی عزت، اپنی آبرو۔ اپنے نفع سے بڑھ کر عزیز رکھے۔ اس صورت میں ہندستان "فری انگلینڈ" (آزاد انگلستان) کا ایک معزز حصہ اور سلطنت برطانیہ کا ایک رکن رکین ہوگا۔ ورنہ اس کے بغیر تو اس کے دامان دولت کے وابستگان میں باوجود بہترین ہونے کے کمترین ہے۔

وطن آخر وطن ہے

(ترجمہ فرانسیسی)

۱

لندن سے دور بر مقام فلیڈلفیا کی سمتھسن کمپنی کے مشہور تجارتی کارخانے کا معتبر ملازم اپنے ایک کمرے میں مضطربانہ پھر رہا ہے۔ ادھر سے ادھر جاتا ہے اور ادھر سے ادھر آتا ہے۔ کوئی پریشانی دامنگیر ہے کبھی اپنے آپ سے باتیں کرتا ہے اور کبھی تند و تیز حرکات سے اس بحث کا اظہار کرتا ہے جو اس کے دل میں اندر ہی اندر جاری ہے۔

اگر اس کے دوستوں میں سے کوئی اسے اس وقت دیکھے تو یقیناً حیران ہو کیونکہ فیلڈلفیا میں اس کے جاننے والے سب اُسے کامیاب آدمی سمجھتے ہیں۔ اور باعث رشک خیال کرتے ہیں۔ جب سے اس نے امریکہ میں قدم رکھا کامیابی نے اس کا ساتھ دیا۔ اسے ابھی دو برس سے زیادہ نہیں گذرے۔ مگر ہر ایک کے دل میں اس نے گھر کر لیا ہے اور گو ابھی اس کی عمر چھوٹی ہے۔ تاہم اس کارخانے میں ذمہ داری کا کام اس کے سپرد ہے۔ اس بنا پر لوگ اسے ذی فہم اور ہونہار نوجوان سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ ایک دن مالدار ہوگا۔

چند ہفتوں سے اُسے ایک اور خوش قسمتی حاصل ہے سمتھسن صاحب کی بیوی نے اسے اپنے شام کے بے تکلف جلسوں میں آنے کا کئی بار موقعہ دیا ہے اور وہاں مس آرابلا سمتھسن

اپنے پیارے پیارے ہاتھوں سے چائے کی پیالیاں اُسے دیتی ہے اور اپنے لطف آمیز تبسم اور مہربانی کی نگاہوں سے اس مزے کو اور دوبالا کرتی ہے۔ چنانچہ آج قرارداد کے مطابق ان دونوں ماں بیٹیوں کے ساتھ اُسے نمائش گاہ عام میں باجا سننے جانا ہے۔ جہاں ہر قوم کی موسیقی کا نمونہ دکھایا جانے کو ہے۔ اس عزت پر اس کے بہت سے ہمسروں کو رشک ہے۔ وہ اس میں معنی پیدا کرتے ہیں۔ اور گمان کرتے ہیں کہ محبت کرنے سے وہ شادی کی لاٹری میں بہت سا مال جیت۔ لے جائے گا

بایں ہمہ اگر وہ متفکر ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے آج ہی اپنے باپ کا ایک خط ملا ہے۔ جس کے مضمون نے یہ اضطراب اس کے دل میں پیدا کیا ہے۔ بوڑھا دور تیر ایک پنشن یافتہ فوجی کمان افسر ہے جو اپنے زاد بوم۔ فرانس کی خدمت کے بعد میں ایک گاؤں میں اپنے آخری دن کاٹ رہا ہے۔

انڈرے نے کچھ عرصہ ہوا اپنے باپ کو ایک تجویز لکھ کر بھیجی تھی۔ جس میں امریکہ میں مستقل سکونت اختیار کرکے قانوناً وہیں کا باشندہ قرار دیا جانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ یہ اس تجویز کے جواب میں ہے

بوڑھے سپہ سالار کے خط کا مضمون ذیل میں درج ہے :-

میرے پیارے انڈرے

جب مدرسے سے نکلتے ہی تم نے مجھے یہ کہا کہ تم سپہ گری کا پیشہ اختیار کرنا نہیں چاہتے تو میں نے تمہاری خواہش کو تسلیم کیا۔ سپاہی ہونے کے لئے اپنے فن کا شوق اور ایثار کی خصلت درکار ہے۔ تم اس صدی کے آخری حصے کی پیدائش ہو۔ تمہارے خیالات اور ہیں اور تم نے کوئی اور ذریعہ معاش تلاش کرنا چاہا۔ پس میں نے مناسب نہ سمجھا...... کہ اپنے خیالات کی موافقت پر تمہیں مجبور کر دوں

میں صفائی سے اس بات کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ جب سے تم فرانس سے

گئے ہو تم نے اپنے فیصلے کی عمدگی کا اپنی نمایاں کامیابی سے عملی ثبوت دیا ہے۔ اور جو خط مجھے فلیڈلفیا سے آیا ہے اس میں تمہاری تعریف ہی آئی ہے

مگر اب جو تم جلدی امیر ہونے کی خاطر امیر کی بیٹی بیاہنے کی غرض سے ایک دوسری قوم میں شامل ہو جانا چاہتے ہو اور اسے اپنا وطن کرنا چاہتے ہو۔ جیسا کوئی پرانے کپڑے کو اتار کر پھینک دیتا ہے۔ تو اے پیارے بیٹے! میں اپنے پدرانہ اختیارات ترازو کے دوسرے پلڑے میں ڈالنا چاہتا ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ تمہارے لئے پھر یورپ میں آنا باعث تکلیف ہوگا۔ اوّل تو تمہیں تین سال فوج میں صرف کرنے پڑیں گے جو ہر ایک کے لئے لابد ہے۔ اگر وہ فرانسیسی رہنا چاہے۔ مگر فرض کا خیال مقدم ہے۔ اور فرض ہی حکم دیتا ہے۔ کہ تم واپس آؤ۔

ہاں، پدر! وطن اس جگہ کو نہیں کہتے۔ جہاں معاش میسّر ہو۔ بلکہ یہ اس سرزمین کا نام ہے جہاں والدین رہتے ہوں۔ جہاں آبا و اجداد کی ہڈیاں مدفون ہوں یا جہاں تمہارا عہد رہا ہو۔ اسی کی خاطر تمہارا دادا دشمن کے ہاتھوں مارا گیا۔ اسی کے واسطے مجھے لوآز کی فوج میں زخمی ہونے کی عزت حاصل ہوئی۔ آؤ اور اس پیارے جھنڈے کے نیچے اپنی جگہ لو جس نے تمہارے بزرگوں کے خون کا رنگ دیکھا ہے۔

میں اپنے زمانے میں خاصی ترقی کر رہا ہوں۔ گو مجھے کوئی بڑی مہم سپرد نہیں ہوئی۔ لیکن میں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ اپنے ملک کو دیا ہے اور آڑے وقت میں اس کے کام آیا ہوں۔

جب تم گھر سے نکلے تھے اور میں نے تمہیں گلے لگا کر تمہاری پیشانی پر بوسہ دیا تھا اس وقت میں نے عہد کیا تھا کہ تم میرے بعد اپنے ملک کی خدمت کرو گے اور تمہاری نسل ہم سے بڑھ کر خوش قسمت ہوگی۔

اے فرزند! میں تم سے درخواست کرتا ہوں اور اگر ضرورت ہو تو تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم فرانسیسی رہو اور اپنا وطن نہ بدلو۔

"کمانڈر روڈوز ہو"

انڈرسے نے اس خط کو پھر ایک دفعہ پڑھا اور میز کے قریب آکر کانپتے ہوئے ہاتھ سے جواب لکھنا شروع کیا جس کا مضمون یہ تھا:۔

میرے والد بزرگوار

آپ نے لکھا ہے کہ وطن اس جگہ کو نہیں کہتے۔ جہاں معاش ہو میسر! مگر کیا اس جگہ کو بھی نہیں کہتے۔ جہاں اس کا محبوب ہو۔ میرا دل یہاں ہے اور میرا کاروبار یہاں۔ مجھے فرانس جسے میں نے مدرسے کی کھڑکیوں سے ہی دیکھا ہے۔ اب اچھی طرح یاد بھی نہیں اور نہ مجھے چنداں خیال ہے۔ آپ کے لیئے اس نے کیا کیا ہے؟ آپ نے اپنی ساری زندگی اس کی خدمت میں وقف کر دی اور اس کے بدلے اپنا خون بہایا۔ اس کے عوض آپ کے کندھے پر ایک رنگدار فیتہ بڑھانے اور بڑھاپے میں محض گذارے کے موافق مدد دینے کے سوا اس نے کیا کیا۔ ملک امریکہ مجھے دولتمند اور با اثر بنا دے گا۔

ابا جان! میں اس بارے میں آپ کی حکم عدولی پر مجبور ہوں۔ گو مجھے اس کا سخت افسوس ہے۔ مگر میں اپنی جوانی کے تین بیش قیمت برس گولہ باری سیکھنے میں ضائع نہیں کرنا چاہتا اور جتنی جلدی ممکن ہوگا۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی آزاد مملکت جمہوری کے اہالی میں شامل ہو جاؤں گا۔

نوجوان انڈرسے یہاں تک لکھنے پایا تھا کہ ٹائم پیس نے گھنٹی بجائی اور اُسے معلوم ہوا کہ سٹمسن صاحبہ اور مس سٹمسن سے ملنے کا وقت ہوگیا۔ اس نے قلم رکھ دیا اور خط ختم کیئے بغیر وہ ان کی ملاقات کے لیئے گھر سے نکلا۔

---

(۲)

فرانسیسی نوجوان کا مع دو خواتین کے نمائش گاہ میں داخل ہونا باوجود مجمع کی کثرت کے لوگوں کی نظر سے بچا نہیں۔ کئی نگاہیں اُن پر پڑیں وہ خود دراز قد، چھریرے بدن کا سیاہ مونچھیں بانکپن سے چڑھائے ہوئے فرانسیسی نسل کا ایک عمدہ نمونہ تھا اور اس کے ساتھ والی مس آرابلا کی خوبصورت نیلگوں آنکھیں۔ نازک کمر۔ سنہرے بال، ان حسینوں کی یاد دلاتے تھے۔ جن کے فسانے دنیا میں رہ گئے ہیں۔

جہاں باجا بجتا تھا۔ اس کے قریب کرسیاں بالکل بھری تھیں۔ لیکن چونکہ ان تینوں کے لئے پہلے سے مخصوص ہو گئی تھیں۔ اس لئے انہیں جگہ ڈھونڈھنے میں چنداں دقت نہ ہوئی۔ گو راستے میں کسی قدر گھمسان تھا۔ خاص کر ایک جگہ جہاں ایک گروہ سفید مگر ابھرے ہوئے گالوں والے آدمیوں کا بیٹھا تھا۔ جو آسانی سے پہچانے جا سکتے تھے کہ جرمن لوگ ہیں۔

آندرے اپنی خوش رو جلیس کو گوشۂ چشم سے دیکھتا جاتا تھا اور اس کے کان موسیقی سے بڑھ کر اس کی آواز کی طرف لگے ہوئے تھے۔ کہ اتنے میں ایک عام حرکت سامعین میں ہوئی۔ جس نے اس کے خیالات کو جو موجودہ تصاویر کے گلابی گالوں پر پرواز کر رہے تھے۔ زمین کی طرف دم بھر کے لئے واپس بلا لیا۔ یعنی پیرس کی مہوری سلطنت کے دستۂ فوج کا باجا شروع ہونے لگا۔

اچانک وہ کیا دیکھتا ہے کہ وہ وردی جس کو وہ بچپن میں خوب جانتا تھا۔ اس کے سامنے موجود ہے اور وہ تین رنگ کا جھنڈا جو تمام دنیا کے گرد فرانس کی شہرت، اور آزادی کا آوازہ بلند کرنے کے لئے پھر چکا ہے اس کے پیش نظر ہے۔ ان کے دیکھتے ہی وہ سب باتیں جنہیں وہ اپنے ذہن میں بھلا بیٹھا تھا۔ سرعت سے اس کے دماغ میں پھر گئیں۔

سب لوگ سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہو گئے۔ ایک سکوت کا عالم تھا۔ صرف ایک
آواز اس سکوت میں مخل تھی اور وہ ایک جرمن کی تھی جو اپنے رفیقوں کے ساتھ باتیں
کرتا ہوا طعن آمیزی سے ہنس رہا تھا۔ انڈرے نے سمجھا کہ وہ فرانسیسیوں کے قومی جھنڈے
کی ہنسی اڑا رہا ہے۔ اس نے بے اختیار بے سوچے سمجھے پکار کر کہا "شُش ہُش" اور یہ کہنے کے
بعد خود اپنے آپ پر متحیر ہوا۔

باجے کے افسر نے اپنی چھڑی اٹھائی۔ نقارے پر چوٹ پڑی، زنگولے بجنے لگے
اور مرسیلیز کا غیر فانی راگ کمرے میں گونج اٹھا۔ سارا زمانہ اس گیت کو پہچانتا ہے۔ فرانس
کے مشہور انقلاب میں بھی آوازۂ جنگ تھی۔ جس نے لوگوں کے دل ہلا دیئے تھے۔ اور جب
باجا ختم ہوا تو سننے والوں نے بے تحاشا داد دی اور تالیوں پر تالیاں بجیں مگر ایک طرف
سے حقارت آمیز سیٹی سنی گئی اور یہ اسی جرمن نے بجائی۔ جسے انڈرے خاموش رہنے کو
کہہ چکا تھا۔ اس پر فرانسیسی نوجوان بے قابو ہو گیا۔ اسے سب کچھ بھول گیا۔ نہ یہ خیال رہا
کہ اس کی آرزوئیں کیا کیا ہیں نہ یہ کہ وہ کس کے ساتھ ہے اور کہاں ہے۔ غرض سب خیالات
جو ابھی اس کے دماغ میں سمائے ہوئے تھے کافور ہو گئے۔ اسے یاد نہ رہا کہ باپ کے خط کا
جواب ابھی ابھی وہ کیا لکھ رہا تھا۔ محبت وطن کی کیا تحقیر کی تھی اور اہل امریکہ میں شامل ہونے
کا اس کا کتنا پکا ارادہ تھا۔ یہ سب اس وقت نگاہ سے غائب تھا۔ صرف ایک چیز
اسے نظر آتی تھی اور وہ یہ کہ اس جرمن نے فرانس کی بے عزتی کی ہے۔ اور جیسے کوئی اپنی
ماں کی بے عزتی کے انتقام کے لئے جھنجھلا کے اٹھتا ہے۔ اس طرح وہ تندی کے ساتھ
اس گستاخ جرمن کی طرف بڑھا اور جا کر اسے گلے سے پکڑ لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب ذرا
حواس قائم ہوئے تو اس نے اپنی جیب سے اپنے نام کا ایک کارڈ نکالا اور اسے اپنے
حریف کو دینا چاہا۔ مگر جرمن نے اسے لینے کے لئے ہاتھ نہ بڑھایا۔ گلا گھٹنے
سے وہ پتھر کی طرح ہو گیا تھا۔ اور اسے اب اس فرانسیسی سے

ڈوائل لڑنے کی جرأت نہ تھی۔ وہ بت بنا ہوا اس کے منہ کو تک رہا تھا۔ حقارت کے ساتھ حریف کی طرف کارڈ پھینک کر فرانسیسی ادھر کو مڑا۔ جہاں اس نے دونوں خواتین کو چھوڑا تھا۔ تاکہ ان سے معذرت چاہے کہ اُسے جوش نے اس فعل پر مجبور کیا۔ مگر ان کی جگہ خالی تھی۔ وہ اس بکھیڑے کی الجھن کے خوف سے اور اس کی حرکت سے ناراض ہو کر چل دی تھیں۔

(۲۳)

ان دو امریکن عورتوں نے جو سلوک اس سے کیا۔ اُسے دیکھ کر انڈرے کو مشہور امیرالبحر نیلسن کے متعلق ایک روایت یاد آئی۔ جب نیلسن نیلز گیا ہوا تھا۔ تو اس کے کسی بے تکلف دوست نے اسے لکھ بھیجا تھا۔ "مائی لارڈ انگلستان واپس آ جایئے۔ اپنے ملک کی عورتوں کے تبسم کی برابری کوئی چیز نہیں کر سکتی"۔ وہ اس بے پروائی سے بغیر کسی اظہار ہمدردی کے اٹھ گئیں اور جس چیز نے اسے اسی قدر رنج پہنچایا تھا۔ اس کا اُن پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ اس سے انڈرے کو معلوم ہوا کہ فرانس اور امریکہ صرف بہ لحاظ جغرافیہ ہی جدا نہیں۔ بلکہ دونوں کے خیالات اور عادات میں بے حد فرق ہے۔ جو کسی طرح مٹ نہیں سکتا۔

جیسے سورج کے اثر کے سامنے دھند اور غبار کے بادل دم بھر میں پھٹ کر بکھر جاتے ہیں اور مطلع صاف ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس کے خیالات کے بادل آناً فاناً بکھر گئے۔ اور فرانس کی تصویر اس کی آنکھوں میں پھر گئی۔ ہر عشق کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ اسے کبھی کبھی انسان مردہ سمجھ بیٹھتا ہے۔ مگر اس کی چنگاری راکھ کے نیچے چھپی پڑی ہوتی ہے اور اسے بھڑکانے کے لیئے ایک پھونک کافی ہوتی ہے۔

ؔلہ لغوی معنے دو آدمیوں کی لڑائی۔ فرانس اور دیگر ممالک یورپ کی قدیم رسم جس میں کئی جھگڑے باہمی اس طریق سے فیصلے ہوتے تھے اور قانون اس رسم کو جائز رکھتا تھا۔ موجودہ قانون بہت کچھ ترمیم میں سامی ہار

وہی نوجوان جو اپنے آپ کو صرف کامیابی کا شائق سمجھتا اور جس کی نظر میں تھوڑی دیر پہلے زر کے سوا کوئی معبود نہ تھا۔ اب اپنی اصلیت کو صفائی سے دیکھنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ جس جھنڈے سے اب وہ اپنا واسطہ نہیں سمجھتا تھا اس کی خاطر ابھی ڈھال لڑنے پر آمادہ تھا۔ اور اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے کو تیار تھا۔ مرحشلی نے راگ کی آواز نے اُسے زمانۂ انقلاب فرانساری کے سپاہیوں کا سا جوش دے دیا تھا اور خونِ حمیت اس کی رگوں میں حرکت کرنے لگا تھا۔ کیا تو وہ باپ کے غریبانہ گاؤں کو حقارت سے دیکھ رہا تھا اور اس کے جوش کے جواز کا قائل نہ تھا۔ اور کیا ابھی ایک برمن کی ادنیٰ سی حرکت سے کہ وہ سیٹی بجا کر فرانس کے باجوں کی تحقیر چاہتا تھا۔ اس پر حملہ کر بیٹھا۔ کیونکہ یہ تحقیر اسے اس مبارک سرزمین کی تحقیر محسوس ہوئی۔

نمائش گاہ سے نکل کر وہ اپنے گھر آیا۔ آتے ہی میز پر وہ خط دیکھا جسے وہ ناتمام چھوڑ گیا تھا۔ اس کو پھاڑ ڈالا اور کہنے لگا۔

پیارے باپ! فرانس کے شریف مگر منکسر خدمت گزار! تو حق پر ہے میں اگلے جہاز میں خط کے جواب میں خود تیری خدمت میں پہنچتا ہوں۔ اپنا بازو تیرے حوالے کرتا ہوں اور اپنے **وطن** کے خادموں کے درمیان جگہ دیئے جانے کی درخواست کرتا ہوں۔

گلبازی یا گلباری

یوں تو ہر ملک کے میلے تماشے اپنی اپنی جگہ دلچسپ ہوتے ہیں اور کون سا آباد ملک ہے جو اپنی دلچسپیوں سے خالی ہے۔ مگر مجھے بولون علاقہ فرانس میں ایک نہایت اجلا میلا نظر آیا۔ جس میں اہل شہر نے کمال نفاستِ مذاق سے کام لیا تھا اور جسے دیکھنا شمالی فرانس کی زندگی کے ایک نادر پہلو کو دیکھنا تھا۔ اس کے فرانسیسی نام کا لفظی ترجمہ "پھولوں کی لڑائی" ہے۔ گو چوں کہ اس میں ایک پرانے ایشیائی کھیل کا اصول موجود ہے۔ اس لئے ہم اسے "گل بازی" کہہ سکتے ہیں۔ لیکن جس کثرت سے اس میں دو گھنٹے تک پھول برسائے گئے۔ اگر اس کثرت کو ملحوظ رکھیں تو اُسے گل باری کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔

بولون شمالی فرانس کے مقامات میں سے ہے جہاں لوگ جولائی اور اگست کے مہینوں میں گرمی بسر کرنے جاتے ہیں۔ نہ صرف قرب جوار کے فرانسیسی آتے ہیں بلکہ پیرس تک کے لوگ سمندر کے ساحل کی کشش سے کھنچے آتے ہیں۔ گو ساحل کی زندگی کا شوق فرانس میں اس درجے پر نہیں ہے جس پر انگلستان میں ہے۔ بولون چوں کہ انگلستان کے ساحل جنوبی کے مقابل واقع ہے اس لئے انگریز بھی اس موسم میں کثیر تعداد میں بولون کی رونق کو بڑھاتے ہیں اور یہ بھی مزے کی بات ہے۔ فوکسٹن سے ساحل پر کھڑے ہو کر دیکھو تو بولون نظر آئے گا۔ جہاز پر سوار ہو جاؤ تو رودبار عبور کرکے گھنٹے سوا گھنٹے میں بولون آسکتے ہو۔ اُدھر ریلوے اور جہاز کمپنیاں خلقت کا

روج دیکھ کر کرایہ بھی کم کر دیتی ہیں اور اس تخفیف سے دل میں امنگ اٹھتی ہے کہ خاصی بہت اور تھوڑے سے خرچ سے ایک نئی سرزمین دیکھی جا سکتی ہے۔ کیوں نہ دیکھ لیں۔ بس ایک سیل کا امنڈ آتا ہے۔ جدھر جاؤ انگریزی اور فرانسیسی کی آواز ملی جلی کان میں پڑتی ہے۔ انگریز زباں دانی میں ممتاز نہیں۔ اس لئے باوجود صدیوں کی ہمسائیگی اور کثرت آمد و رفت کے اور باوجودیکہ اکثر مدارس انگلستان میں فرانسیسی ستعاً پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے بولنے سے عاری ہیں اور اگر بولنے بھی لگیں تو چند فقروں سے آگے نہیں بڑھ سکتے اور اس میں بھی تلفظ کی غلطی عام سی بات ہے۔ مگر غیر فرانسیسی دکاندار بھی اپنی زبان کے قتل عام کا بدلہ انگریزوں سے لئے بغیر نہیں رہتے۔ وہ بھی دکان پر لکھ رکھتے ہیں۔ یہاں انگریزی بولی جاتی ہے۔ تاکہ انگریزی بولنے والا گاہک آئے اور جب آتا ہے تو عموماً جیسی اس کی فرانسیسی ہوتی ہے ویسی ان کی انگریزی۔ عوض معاوضہ گلہ ندارد۔ کام تو چل جاتا ہے۔ مگر انسان خود فریقین میں نہ ہو تو دور سے اس تماشے کا دیکھنا لطف خاص رکھتا ہے۔ فرانسیسی آدمی جہاں الفاظ جواب دیتے ہیں۔ حرکات سے کام لیتا ہے اور اثنائے گفتگو میں اس کے شانے بے حد ہلتے ہیں اور انگریز جوں جوں سمجھنے یا سمجھانے میں قاصر رہتا ہے۔ گھبراتا ہے۔ مگر ہم گلباری سے دور رہے جاتے ہیں۔

گل باری میں سب شریک ہوتے ہیں۔ مسافر اور مقیم۔ انگلستان سے آئے مہمان اور فرانس کے اہل وطن بوڑھے اور جوان عورتیں اور بچے۔ بانکے چھیلے اور سیدھے سادھے۔ کون ہے جو احاطے کے اندر داخلے کے چند پیسے دے سکتا ہے اور نہیں جاتا عین کنار آب پر ایک تماشہ گاہ ہے۔ جس کے متعلق ایک باغیچہ ہے۔ وہی باغیچہ اس مرتبہ اس میلے کے لئے مقرر تھا۔ کئی دن پہلے سے تیاریاں تھیں۔ اس کی روشیں آراستہ کی گئی تھیں اور روشوں کے دونوں طرف نشست کا سامان تھا۔ ایک طرف اونچے

اونچے عارضی چبوترے جن پر ممتاز لوگ جو مدعو تھے۔ یا جنہوں نے زیادہ قیمتی ٹکٹ خریدے تھے بیٹھ سکیں۔ اور دوسری طرف صرف بنچ اور کہیں کہیں کرسیاں جن پر اُن سے کم قیمت ٹکٹ لے کر لوگ بیٹھ سکیں۔ صبح سے گُل فروشوں کی دکانیں غیر معمولی طور پر پھولوں سے پُر نظر آنے لگیں اور دوپہر کے بعد اس باغیچے کے قریب بھیڑ بھاڑ شروع ہوگئی اور اس کی سڑک پر دوکانوں کی قطاریں ہندوستان کے میلوں کی طرح لگ گئیں۔ چار بجے اصل تماشا شروع ہوا۔ تمام نشستیں تماشائیوں سے پُر تھیں اور ان کے سوا ایک بڑی تعداد ایسے تماشائیوں کی تھی جو صرف داخلہ کا ٹکٹ رکھتے تھے اور انہیں میلے کے ہر حصے میں چلنے پھرنے کی اجازت تھی۔ مگر ان کے لئے بیٹھنے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ سب تماشائی پھولوں سے جھولیاں بھرے ہوئے تھے۔ "گو جھولی" بجائے کرتے یا دوپٹے کی جھولی کے کاغذ کی جھولی تھی اور بعض زیادہ دولت مند لوگ نہایت خوش نما اور قیمتی گلدستے لئے کھڑے تھے کہ اتنے میں سواری گل کی آمد آمد ہوئی تحسین گل کا شور اٹھا اور سب متوجہ ہو گئے۔

سب سے آگے ایک گاڑی تھی ہمہ تن گل۔ گھوڑا تو سر سے پاؤں تک پھولوں سے سجا ہوا۔ پہیے پھولوں سے اٹے ہوئے۔ پشت ایک تختۂ گل اور وسط میں ایک خوبصورت ٹوکری پھولوں کی۔ غرض اندر پھول۔ باہر پھول۔ اس میں ایک معزز فرانسیسی لیڈی ایک پھول سے بچے کو ساتھ لئے بیٹھی تھی۔ چہرے پر باریک پھول دار نقاب ٹوپی پر پھول اور تکیے پر پھولوں کی چادر۔ اس پر پھول برسنے لگے۔ دونوں طرف سے بوچھاڑ ہوتی تھی اور وہ ایک ہاتھ سے گھوڑے کی باگ تھامے ہوئے ایک ہاتھ سے سب کا جواب دیتی جاتی تھی۔ اس گاڑی کے پیچھے ایک دو اسپہ گاڑی تھی۔ جس کی سجاوٹ اس سے کچھ کم نہ تھی۔ صرف رنگ آمیزی میں فرق تھا۔ ہر گاڑی کی سجاوٹ میں ہر کسی نے اپنے اپنے مرغوب رنگ لگائے تھے اور اپنی پسند کے گل کھلائے تھے۔ اس

میں چار لڑنے والیاں تھیں۔ اور گھوڑے کی آگ کو جیسے سنبھالے ہوئے تھا جیسے صف گل میں بیٹھنے کا انعام برابر مل رہا تھا۔ کئی مل لگی بازنشانہ اُڑاتے تھے۔ اور وہ جواب نہیں دے سکتا تھا۔ سر جھکانے گاڑی ہانکے جاتا تھا۔ اس گاڑی کا جیونزوں کے سامنے آتا تھا۔ کہ چونکھیا لڑائی ہونے لگی۔ لوگ ہزار ملے تھے۔ تو کیا ہوا۔ یہ چار چنچل نار تھیں۔ ان سے کون بازی جیت سکتا تھا۔ جس طرف سے پھول آتا تھا۔ اُسی طرف جواب جاتا تھا۔ کوئی گلدستہ پھینکتا تھا۔ تو ادھر سے بھی فی الفور اسی پر بوچھار ہوتی تھی۔ کسی کا وار خالی گیا۔ تو یار لوگ ہنس دیتے۔ کسی نے تاک کر پھول مارا۔ تو واہ واہ ہوگئی۔ ان کے پیچھے ایک اور سواری تھی۔ جس میں اس پرانی رسم پر بیسویں صدی کا پیوند لگا دیا گیا تھا۔ یعنی موٹر کار۔ اسی طرح پھولوں سے لدی ہوئی۔ اس میں مرد اور عورتیں دونوں سوار تھے۔ اور چلانے والے کے سوا سب ہاتھ چلا رہے تھے۔ ایک گاڑی آئی۔ جس میں بہت سے بچے تھے۔ ان کا آنا چھوٹے بڑے سب کے لئے اشارہ تھا۔ کہ برس پڑو۔ خصوصاً ہم عمروں سے ان کی خوب رہنی تھی۔ اس کے پیچھے ایک اور گاڑی آئی۔ جس میں ایک زندہ دل بوڑھا اپنی بڑھیا کو لئے جلوس گل میں شامل ہو رہا تھا۔ کوئی نہ کوئی خدا ترس ان کی طرف بھی پھول پھینک دیتا تھا۔ اور یہ بھی بہت کشادہ دلی سے پھول برسانے جاتے تھے۔ مگر عام دلچسپی اس گاڑی سے بہت کم تھی۔ اور چشم عبرت کو یہ سبق ملتا تھا۔ کہ ایسے کھیل ایک خاص وقت تک ہی موزوں ہیں۔ اور جیتے جی ہی وہ زمانہ آجاتا ہے۔ جب زندگی کی بہت سی خوشیوں کو خیرباد کہنا ہوتا ہے۔ اسی طرح اور سواریاں تھیں۔ جن میں ہر شخص نے اپنی توفیق کے مطابق سجاوٹ کی تھی۔ اور یہ قطار کی قطار باغ کے گول چکر میں چلتی تھی۔ اور وسط صحن میں باجا بجتا تھا چھ بجے تک یہ چکر جاری رہا۔ آخر کب تک چلتا۔ ہر انسانی خوشی محدود ہے۔ اور کیسی ہی پُر لطف کیوں نہ ہو۔ آدمی خود اس سے تھک جاتا ہے۔

اس دو گھنٹے کے عرصے میں کئی پھولوں کی جھولیاں بار بار خالی ہوئیں اور بار بار بھری گئیں۔ پھول والے ٹوکرے بھرے بیٹھے تھے۔ میلے کے ختم ہونے سے پہلے سب بیچ کر فارغ ہو گئے۔ گاڑیوں میں بھی کئی دفعہ پھولوں کے نئے ذخیرے کی مانگ ہوئی مگر کتنا ہی بڑا خزانہ ہو۔ جب دونوں ہاتھ سے لٹایا جائے۔ تو کہاں تک ساتھ دیگا آخر پھول ختم ہو چلے۔ گھڑیال نے بھی آواز دی۔ کہ جشن کے لئے وقت کے اٹل قانون نے جتنے منٹ اور جتنے ثانیئے فیاضی سے عطا کئے تھے۔ سب ہو لئے۔ ہاتھ جو برابر مصروفِ ورزش رہے تھے۔ پکار اٹھے۔ کہ اب استراحت درکار ہے۔ گھوڑے چکر لگاتے لگاتے تھک گئے۔ اور فطرتِ انسانی کا مجموعہ جو انبوہِ تماشائیاں میں نمودار تھا۔ اپنی تغیر پسندی کا ثبوت دینے لگا۔ تماشائی ایک ایک دو دو کر کے کھسکنے لگے۔ اور آخر پھولوں والی گاڑیاں جس ترتیب سے آئی تھیں۔ اسی ترتیب سے قطار باندھے ایک بیرونی چکر سے گھوم کر باہر سڑک پر جا نکلیں۔ مکانوں کے بالاخانوں پر اس واپسی کے دیکھنے کے لئے ہجوم ہو گیا۔ کہیں کہیں سے پھول بھی برسے مگر تھوڑی دور جا کر یہ قطار بھی منتشر ہو گئی۔ اور ہر ایک نے اپنا اپنا راستہ لیا۔

میں اس میلے کو دیکھ کر آیا۔ تو ایک ہجوم خیال ساتھ لایا۔ گل باری کی پہلی جھلک دیکھی تو خیال آیا۔ کہ کیا اچھا ہو۔ اگر کوئی ملک ایسا ہو۔ جہاں اسی طرح پھول برسا کریں۔ میلے کے ختم ہونے کی کیفیت دیکھی۔ تو اس خیال کی اصلاح کی کہ پھول برسنے کا لطف ہی جاتا رہے۔ اگر روز یہ سامان میسر ہو۔ میلے کی بے تکلفی نے اپنے ملک کی ہولی یاد دلائی۔ عجب نہیں۔ کہ ہندوستان کے اس تہوار کے بانیوں نے ابھی بے ضرر ملی لگی اور چہل پہل کے لئے ہولی کی رسم جاری کی ہو گی جس میں مصفا آبِ گل رنگ کو ایک دوسرے پر چھڑکنا ابتدائی دستور ہو گا۔ مگر حضرتِ انسان کہیں ایک بات پر قرار پکڑتے ہیں۔ ایک ستم ایجاد میں۔ وہ وہ ایجادیں اس رنگ میں کیں۔ کہ

مولی کو ہولا بنالیا۔ مزاج تغیر پسند تو فطرتاً واقع ہوا ہے۔ فرق صرف یہ ہوا کہ دنیا کے مغربی حصے میں گذشتہ چند صدیاں اس تغیر کی نذر ہوئیں۔ جسے ترقی کہتے ہیں اور ہم اس تغیر کی طرف مائل رہے جس کا نام تنزلی معکوس ہے۔ میں نے انگریزوں کو فرانسیسیوں کے گروہ میں دیکھا۔ تو خیال کیا کہ برابر کے جوڑ ہیں۔ جبھی تو ان دونوں میں باہم میل ملاپ ہو رہا ہے۔ صدیوں کی لڑائی اور مخالفت کے بعد ایک کے دل میں دوسرے کی وقعت پیدا ہو گئی ہے۔ اور دونوں نے محسوس کیا ہے کہ باہم لڑنے جھگڑنے سے بہتر ہے کہ دونوں ہمسایہ قومیں صلح سے رہیں۔ اور باہمی موافقت سے دونوں دنیا میں اپنا رعب بڑھائیں۔ اور ایک دوسرے پر گولہ باری کرنے کی بجائے ایسے جلسوں میں جمع ہو کر ایک دوسرے پر گل باری کیا کریں۔ اس جھیڑ بھاڑ میں اپنی طرف خیال گیا اس مجمع اغیار میں ایک میں اور ایک میرا رفیق دو ہندوستانی تھے۔ سوچا کہ ہم کیا ہیں۔ ہم کہاں ہیں بمصداق مثل گل بازی۔ نہ اِدھر کے نہ اُدھر کے

ہم پر کیا موقوف جاپان کو چھوڑ کر ساری ایشیائی قومیں اقوام یورپ کے ہاتھ میں گلبازی سی ہوئی ہیں۔ وہ جو سلوک چاہیں کریں۔ ہاں اگر انہی ٹکڑوں میں قوت اجتماع پیدا ہو جائے تو شاید اِدھر اُدھر پھینکے جانے سے محفوظ ہو جائیں۔ فرانس اور انگلستان کی مصالحت آج سے دس برس پہلے کون باور کر سکتا تھا۔ کہ ممکن ہو گی۔ اس کو دیکھ کر سعدی کا قول یاد آیا کہ "خلق و ختا صلح کردند"۔ اما زید و عمر را ہنوز خصومت باقی است"۔ فرانس اور انگلستان جیسے صدیوں کے دشمن مل جائیں اور ہم ہندوستانی ہندو مسلمانوں کے ملاپ کو ترسا کریں ؎

بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرح نو در اندازیم

＊

کان کنی کے شہید

جان کنی | ماہ مارچ ۱۹۰۶ء کی دسویں تاریخ کان کنی کی تاریخ میں۔ مدتوں یادگار قائم رہے گی۔ شمالی فرانس میں کوئلے کی کانیں ہیں۔ جن پر ہزارہا لوگوں کی معاش کا دارومدار ہے۔ ہفتے کے دن دسویں تاریخ کو مقام کوریر میں ان کانوں کے مزدور حسب معمول گھروں سے نکلے۔ ہنستے ہنستے بیوی بچوں سے جدا ہوئے۔ کہ شام کو پھر ملیں گے۔ مگر تقدیر یہ تھی کہ تم میں سے سینکڑوں کے لئے یہ ملاقات آخری ملاقات ہے۔ تمہارا کام ویسے بھی محنت کی سخت ترین صورت ہے۔ لیکن آج تمہاری کان کنی سچ مچ کی جان کنی ہوگی۔ کان کی تنگ و تاریک غار میں تمہاری قبر بنے گی۔ اور آگ اور دھواں اور نیم سوختہ کوئلے کی زہریلی ہوا اُس قبر کا عذاب ہوگا۔

آفت ناگہانی | ان مزدوروں کی تعداد اٹھارہ سو تھی۔ اور زن و مرد و بچے سب قسم کے مزدور تھے۔ انہیں کانوں میں اُترے دیر نہیں ہوئی تھی۔ کہ صبح کے ساڑھے چھ بجے کے قریب اچانک ایک پُرزور دھماکا ہوا۔ جیسے بارود سے بھری ہوئی کان زور سے پھٹ پڑے اس مہیب آواز سے جو لوگ باہر شہر میں تھے۔ اُن کے دل ہل گئے۔ اندر والوں کا حال ناگفتہ بہ ہے۔ معلوم نہیں دھماکا کیسے ہوا۔ اور کان کیسے پھٹی۔ کوئی کچھ وجہ بتاتا ہے۔ کوئی کچھ۔ یقینی ہے تو اس قدر کہ کان نمبر ۲، ۳، ۴ دفعتہً آگ کا بھبوکا بن گئیں۔ اور اس دوزخ کے شعلے اس قدر بلند ہوئے۔ کہ کچھ عرصہ تک بدقسمت مزدوروں تک کسی مدد کا پہنچنا ناممکن ہو گیا۔ جن آنکھوں نے انہیں اندر جاتے دیکھا تھا۔ اُن کی نگاہ میں دنیا اندھیر ہو گئی۔ ہر شعلے پر گمان ہوتا تھا۔ کہ کسی جوان ہمت مرد یا خوبصورت

عورت کی جان چاٹ کر نکل رہا ہے۔ اور اس طرح شمعِ محنت کے سینکڑوں پروانے اپنے معشوق پر جانیں فدا کر رہے ہیں ؎

پھر تہ دیکھا بجز یک شعلۂ پر پیچ و تاب
شمع تک تو ہم نے بھی دیکھا کہ پروانہ گیا

رونے والے کان کنی کے ان شہیدوں میں ایک ایک موجودہ زمانے کا فرہاد ہے فرق صرف اتنا ہے۔ کہ فرہاد کی کوہ کنی دنیا میں افسانہ بن گئی ہے۔ اور ایشیا کی نظم و نثر اس کے تذکرے سے پڑ ہے۔ اور ان غریبوں کے گنج شہیداں پر شاید سب کے نام بھی صحیح طور پر معلوم کر کے لکھنے مشکل ہوں۔ مگر اس بے کسی پر بھی ان کے حال پر رونے والوں کی کمی نہیں رہی۔ یُوں تو ایسی مُصیبت بھی۔ کہ دُور دُور سے لوگوں نے اظہارِ غم کیا۔ مگر ہجوم ماتم جو اس قبر آتشیں کے باہر اُس شنبہ کے دن ہوا۔ وہ بھی اپنی مثال آپ ہی تھا۔ جوں جوں اس واقعہ جان کاہ کی خبر شہر میں پھیلی۔ عورتیں اور بچے جوق در جوق گلیوں سے نکلنے شروع ہوئے۔ ہر ایک تصویر حیرانی تھا۔ اور نشانِ غم ہر چہرے پر مسلط تھے۔ تین بجے بعد دوپہر کے قریب ایک انبوہ پچیس ہزار آدمیوں کا مرنے والوں کا ماتم کرنے کے لئے جمع ہو گیا۔ کوئی اِکا دُکا خوش قسمت جو اس طوفانِ بلا سے سالم بچ نکلا۔ اور کوئی لاش جو کسی کی ہمت سے باہر آ گئی۔ سب اُس کی طرف دوڑتے تھے۔ اور اس گھڑی کی نفسا نفسی عرصۂ محشر کا نمونہ تھی۔

دو ثلث چل دیئے ۶ بجے کے قریب اتنا معلوم ہو گیا۔ کہ دو ثلث کے قریب یعنی گیارہ بارہ سو آدمیوں سے ہاتھ دھو بیٹھنا چاہئے۔ جو بچ رہے۔ اُن میں بھی کوئی دو سَو آدمیوں کی طرف سے اطمینان ہے۔ کیوں کہ ۱۲۵ اتفاق سے آگ لگنے سے پیشتر باہر آ چکے تھے۔ اور چالیس زینوں کے قریب تھے۔ اور جھٹ نکل آئے۔ باقی آدمیوں کے نکالنے کے لئے بڑے بڑے انجینئروں نے کمرِ ہمت باندھی۔ اور جوانوں کی ایک

جماعت لے کر کانوں کی طرف بڑھے۔ کان کے اندر ہوا پہنچانے کی کھڑکیاں کھول دی گئیں۔ اور کل کے زور سے ہوا پہنچانے کی پوری کوشش کی گئی۔ مگر اندر کی غلیظ ہوا اور دھواں کی کثافت ایسی نہ تھی۔ کہ اتنی ہوا سے مغلوب ہو جاتی۔ بچانے والی جماعت کو بار بار پسپا ہونا پڑتا تھا۔ کیونکہ ذرا سی دور جا کر دم گھٹنے لگتا تھا۔ آخر کچھ لاشیں اور کچھ نیم مردہ مزدور نکالے گئے۔ جو سسکتے نکلے۔ اُن کے جینے کی آس نہ تھی۔ کیونکہ جل کر کوئلہ ہو گئے تھے۔ اور کپڑا تو کسی کے جسم پر باقی نہ تھا۔

ماتمی شہر | شام تک سارا شہر ماتم میں تھا۔ کوئی گھر ایسا نہ تھا۔ جسے ذاتی صدمہ نہ پہنچا ہو کیوں کہ یہ بستی کان کنوں کی تھی۔ ہر دروازہ پر سیاہ ماتمی کپڑا لٹک رہا تھا۔ اہلِ شہر ماتم میں سیاہ پوش تھے۔ دوکانیں سیہ پوش تھیں۔ رہی سہی کمی آسمان نے پوری کر دی۔ کالی گھٹا آکر شریک ماتم ہوئی۔ اور ۱۱۔۱۲ مارچ تر شح ابر اور سردی کی بدولت اور مصیبت کے دن بن گئے۔ بچانے کی کوشش کرنے والے جان جوکھوں میں ڈال کر اس حالت میں بھی مصروفِ کار رہے۔ مگر کچھ بہت کامیابی نہ ہوئی۔ کوئی ایک سو سے زیادہ لاشیں ہاتھ نہ لگیں۔ برف کو بھی شاید انہیں دنوں کا انتظار تھا۔ اُس نے بھی زمین پر اپنی سفید چادر پھیلا دی۔ گویا قدرت نے ان بےکسوں کے لئے کفن بھیجا۔

گورِ غریباں | ۱۳ مارچ کو دفن کا سامان شروع ہوا۔ دو تین جگہ گڑھے کھودے گئے۔ جن میں بہت سی لاشیں یک جا دفن ہوئیں۔ کیوں کہ کئی لاشیں تو پہچانی ہی نہیں جا سکیں۔ اور جو پہچانی بھی گئیں۔ ان کو علیحدہ علیحدہ کفن دفن ایسی حالت میں کون کرتا۔ ایک صاحبِ دل جو ان دردناک موقعوں میں سے ایک پر موجود تھا۔ چشم دید حالات یوں بیان کرتا ہے۔ "میری کورٹ والے چھپر کے تلے بائیس لاشیں اپنے اپنے صندوقوں میں رکھی ہوئی تھیں۔ سرکارِ جمہوری کی طرف سے وزیر صیغۂ داخلہ

باچشم پُرنم کھڑا تھا۔ اور گرجے کی طرف سے ایک آرچ بشپ پریذیڈنٹ اور وزرائے دولت کی طرف سے پھول رکھنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ ماتمیوں کی تعداد کوئی پانچ ہزار ہوگی۔ خستہ حال عورتیں صندوقوں کے گرد بکھری بیٹھی تھیں۔ زار زار روتی اور عالم یاس میں ہاتھوں کو ملتی تھیں۔ اتنے میں کان کن جنازوں کی طرف بڑھے نہیں آہستگی سے اٹھایا۔ اور مدفن کی طرف لے چلے۔ جو کوئی دو سو گز کے فاصلے پر تھا۔ جب یہ دردانگیز قطار جنازوں کی طرف روانہ ہوئی۔ نوحہ ہو رہی تھی۔ ۲۲ جنازے ایک دوسرے کے پیچھے پیچھے آرہے تھے۔ چھ کان کن ہر جنازے کو اٹھائے ہوئے تھے۔ اور کان کنوں کے چھوٹے چھوٹے چراغ اُن کے سروں پر ٹوپیوں سے لٹکائے ہوئے دھرے تھے۔ پولیس اور فوج کا ایک معقول دستہ موجود کھڑا تھا۔ کیوں کہ ہر لحظہ یہ ڈر تھا کہ کہیں پریشان حال کان کن نقصِ امن پر آمادہ نہ ہوجائیں۔ پادری نے جنازہ کی دعا پڑھی۔ اس کے بعد سوشلسٹ جماعت کے ایک قائم مقام نے بھڑکانے والی تقریر کی۔ جس کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوا۔ "سرمایہ والوں کو سزا ملنی چاہیئے۔ وہ ہمارے قاتل ہیں"۔ جب صندوق گڑھے میں اُتارے گئے۔ اُس وقت عورتوں کی حالت نہیں دیکھی جا سکتی تھی"۔ یہی کیفیت دوسرے قبرستانوں میں گذری۔ جہاں باقی جنازے دفن ہوئے۔

ملک کی ہمدردی | مرنے والے مرگئے۔ اور رونے والوں کے لئے عمر بھر کا رونا چھوڑ گئے۔ مگر اس داستانِ غم کی خوفناک تاریکی میں اہلِ ملک کی سچی اور بے ساختہ ہمدردی اور مالی امداد ایک شعاعِ نور ہے۔ جس سے ملک کی بیدار زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ زندہ قوموں کے یہ اطوار ہوتے ہیں۔ کوریر کا سوگ خوش باش دارالخلافہ تک محسوس ہوا۔ شہر پیرس کا چہل پہل مبدل بغم ہوگیا جمہوری حکومت کے اراکین فوراً جمع ہوئے۔ اور انہوں نے ضابطہ وغیرہ کو بالائے طاق رکھ کر

بیس ہزار پونڈ یعنی تین لاکھ روپیہ فوری امداد کے لئے بلا تامل منظور کیا۔ جگہ جگہ کےطور پر جا بجا چندے کی فہرستیں کھل گئیں۔ بنک فرانس نے تیس ہزار روپیہ (۳۰۰۰۰) چندہ اپنا لکھ کر سپہ ہی فہرست کھولی۔ راتھچائیلڈ والوں نے ساٹھ ہزار روپیہ (۶۰۰۰۰) نقد فوراً روانہ کر دیا۔ کہ زیادہ حاجت مند قبائل کو اس وقت تھوڑا تھوڑا مہارا مل جاتے۔ سب بڑے بڑے اخباروں نے اپنے اپنے دفتروں میں چندہ جاری کر دیا۔ ۴ مارچ تک اس عام چندہ کی تعداد چار لاکھ (۴۰۰۰۰۰) روپیہ سے اوپر پہنچ چکی تھی۔ اور ابھی زور سے جاری تھا۔ جمہور کے پریذیڈنٹ کے نام ہر ملک سے ہمدردی کے تار پہنچے۔ اور نہ صرف زبانی ہمدردی کے بلکہ انگلستان وغیرہ ہمسایہ ملکوں میں بھی چندہ شروع ہو گیا۔ مگر سب سے بڑھ کر قابل ذکر ہمدردی فرانس کے ہمسایہ جرمنی کی طرف سے ہوئی۔ جہاں سے ایک جماعت انجینیروں اور کان کنوں کی امداد کے لئے پہنچی۔ جس نے اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر بہت سی لاشیں اور نکال دیں۔ مصیبت کا وقت بھی عجیب وقت ہوتا ہے۔ کہ اس وقت ہر شائستہ قوم اور ہر مہذب شخص کا فرض ہے۔ کہ دشمنی اور مخالفت کو نظر انداز کر کے انسانیت کا حق ادا کرے۔ اور جرمن جو فرانسیسیوں کے بڑے دشمن سمجھے جاتے ہیں۔ اور جو اس وقت بھی مراقش میں اُن سے جھگڑ رہے تھے۔ اس موقع پر پورے انسان ثابت ہوئے۔ اور آن کی اس عملی ہمدردی کی ہر طرف سے داد مل رہی ہے۔

<u>خوش حالوں کی غفلت</u> | خوش حال لوگ جو جاڑے میں اپنی انگیٹھی کے گرد بیٹھے کوئلے کی آگ تاپتے ہیں۔ اور کہتے ہیں یہ کیسی طرب انگیز آگ ہے۔ کیا جانیں کہ کوئلہ کس محنت سے زمین سے کھود کر نکالا گیا ہے اور کتنے غریب محنتی لوگوں نے اپنا لہو پانی کیا ہے۔ اس لئے کہ ان تن آسانوں کو آرام ملے۔ جو ریل کے درجہ اول کے گدیلوں پر آسائش سے لیٹے ہوئے سفر کرتے ہیں کہ ریل، جو انہیں ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑائے لئے جاتی ہے۔ کوئلے کے

ریل پر چل رہی ہے اور اگر انجن کے دوزخ کو کوئلے کا ایندھن نہ ملے تو وہیں کھڑی ہو جائے۔ انہیں کیا خبر کہ وہ مفلس جو محض نان شبینہ کے لئے جان پر کھیل کر ان کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ کس حال میں ہیں۔ کل کا بنا ہوا خوشنما کپڑا پہننے وقت کون سوچتا ہے کہ کوئلے کے بغیر دخانی کلیں کیسے چلتیں۔ اور ہم کوئلے کے میسر آنے کے لئے کس کے مرہون منت ہیں۔ اس لئے تو ابھی تک ... سے گھبرا کر بیچارے مظلوم کان کن سرمایہ داروں کے خلاف خیالات ظاہر کرنے لگے۔ اگر سرمایہ داروں کو ان غریبوں کی جاں فشانی کی قدر ہو۔ تو وہ ان کے ساتھ اب ... زیادہ مہربانی کا سلوک کریں مزدوری اب سے بہتر دیں۔ ان کی حفاظت کی کوشش زیادہ کریں۔ اور جو جو احتیاطیں ایسے حوادث کے روکنے کے لئے ممکن ہوں سب عمل میں لائیں چاہے ان کے عمل میں لانے کے لئے صرف کثیر درکار ہو۔ کیوں کہ لاکھوں روپے کا منافع جو سرمایہ دار لیتے ہیں اس میں بہت کچھ ان محنتی جان نثار مزدوروں کا حق ہے اور لازم ہے کہ حقدار کو حق پہنچاتے رہیں۔ ہندوستان میں بھی اب کان کنی شروع ہے فرانس کے کان کنوں کی اس مصیبت عظمیٰ سے سب جگہ کانوں کے مالک سبق لے رہے ہیں۔ ہندوستان کے مالکان معادن کو بھی غافل نہ رہنا چاہئے۔ چراغ جو کان کے اندر جائیں سب ڈھکے ہوئے ہونے چاہئیں۔ نکلنے کے رستے اور ہوا کے ذریعے اب سے زیادہ بنانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ انگریزی پارلیمنٹ کی نئی لیبر پارٹی یعنی مزدوری پیشہ جماعت کے قائم مقام فریق کے لیڈر مسٹر کیر ہارڈی نے اس موقع پر اپنے پیام ہمدردی میں خوب لکھا ہے ؛۔

"میں ذاتی طور پر واقف ہوں۔ کہ کان کے ایسے حادثے کیا مصائب ہوتی ہیں اس لئے میرا دل بے اختیار آپ کے غم میں شریک ہوتا ہے۔ ہم سب مزدوری پیشہ انگریز آپ سے دلی ہمدردی رکھتے ہیں۔ اور دعا کرتے ہیں کہ خدا وہ

دن جلد لائے ۔جب سائنس کی ترقی اور تعاون کی ہمدردانہ انسانیت دونو مل کر ایسے حوادث سے یہ رُک سکتے ہیں ۔جس کے بعد ایسے افسوسناک واقعات قصّے کے طور پر ایک وحشیانہ زمانہ کی یادگار سمجھے جانے لگیں گے ؟

قدرت سے لڑائی گو یہ واقعہ اس قسم کا ہے ۔کہ اُسے سُن کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں ۔پس جن کو اس سے صدمہ پہنچا ہے ۔اُن کا کیا حال ۔تاہم انسان کی مجبوریاں ایسی ہیں ۔کہ تلاشِ رزق اُس سے بُری طرح کنوئیں جھکواتی ہے ۔اس لئے اِدھر سے تو بے چارے کان کن جو اس وقت جوش میں کام چھوڑنے پر آمادہ ہیں ۔آخر کہنے سننے سے ۔یا زیادہ اُجرت کے لالچ سے پھر ان تاریک گڑھوں میں اُتریں گے ۔ اُدھر دولتمند سرمایہ دار قدرت کے ساتھ جنگ جاری رکھنے پر تُلے بیٹھے ہیں اور یہ ناکامی ان کو اسی بات پر آمادہ کرے گی ۔کہ جس طرح بھی ممکن ہو ۔قدرت کے خزانوں پر ہاتھ صاف کرتے رہیں حقیقت یہ ہے ۔کہ حرص انسان کی فطرت میں ہے ۔اور اس کا نچلا بیٹھنا ممکن نہیں ۔شروع سے اس کی رفتار شوقِ ارتقاء کی شہادت دے رہی ہے ۔۔ پہلے یہ قدرت کا دستِ نگر تھا ۔درختوں کے پھل اس کی خوراک تھی ۔درختوں کے پتے اس کا لباس ۔قدرتی غاریں اس کا مسکن تھیں ۔اور گوشۂ وحشت اس کا مدفن ۔قناعت کا خوگر تھا ۔جو مانگتا تھا ۔قدرت اُسے بخش کر دیتی تھی ۔گرمی سے گھبراتا تھا ۔تو ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اس کی تسلّی کے لئے بھیجے جاتے تھے ۔سردی سے ٹھٹھرنے لگتا تھا ۔تو دُھوپ اُسے گرمی پہنچاتی تھی ۔ذرا ہوش سنبھالا ۔تو ہاتھ پاؤں مارنے شروع کئے ۔زمین سے کہا ۔کہ "بے کار پڑی رہتی ہو ۔ہمارے کام آؤ ۔ہم بیج بوئیں ۔تم اس کی حفاظت کرو" قدرت نے دیکھا کہ لڑکا ہونہار ہے ۔اُس کا حوصلہ بڑھانے کے لئے مینہ کو حکم دیا ۔کہ اس کے کھیتوں کو پانی دے ۔سُورج کی خدمت مقرر کی ۔کہ انہیں پکائے ۔انسان نے سنی

وحشی وصل سمٹا تو اپنی کاری گری پر نازاں ہونے لگا - کچھ دن بعد اور پر پرُزے نکالے
اُسی بہتی ندی کی آزادی میں خلل ڈالا - اس کا راستہ کاٹ کر اُس کا رُخ بدل
دیا۔ لگی بے چاری کھیت کی آب یاری کرنے - لڑکا اور پھُولا - کہ اب تو قدرت
وقفِ خدمت ہو چلی - خیال آیا - کہ نہر کا پانی زور سے بہہ رہا ہے - اس زور
سے کچھ کام کیوں نہ لیا جائے - ایک پن چکّی لگا دی پانی لگا چکّی پیسنے بھلا اب اس نازپروردہ
لڑکے کا دماغ کیوں ٹھکانے رہتا - اپنے آپ کو قدرت کا حکمران سمجھنے لگا۔
درحقیقت نئی تجویز قدرت کی قوتّوں کو زیر کرنے کی نکالنے لگا - قدرت بھی بُردباری
سے سب گستاخیاں دیکھتی گئی - اور درگزر کرتی گئی - یہاں تک کہ حضرتِ
انسان نے قدرت کی سب سے پیاری پری برق کو شیشے میں اُتار لیا - پیام
بری کا کام تو اس سے لیتا ہی تھا - اب بے درد یہاں تک گھمنڈ میں آیا ہے کہ
اُس کے دستِ نازک سے گاڑیاں کھنچواتا ہے - اور قدرت کو کھلم کھلا پیامِ
جنگ دے دیا ہے مگر آفرین ہے قدرت کے علم و وقار پر - کہ اب بھی انسان کی
گستاخیاں دیکھتی اور چشم پوشی کرتی ہے - ہاں کبھی کبھی جب اس کا ہاتھ بہت بڑھ
بڑھ کر چلنے لگتا ہے - تو تادیب کے طور پر چشم نمائی کر دیتی ہے - اور کوئی آفت ایسی
بھیجتی ہے - جس کے آگے انسان کو عجز کا اعتراف کرنا پڑتا ہے - انسان قدرت
کے دفینے کھودتا اور ان سے مالا مال ہوتا ہے - اور قدرت چُپ رہتی ہے - مگر آخر
پردہ دری کی بھی ایک حد ہوتی ہے - اور اس حد سے گزرو - تو قدرت اپنی قوّت
دکھاتی ہے - اور سینکڑوں اور ہزاروں گھر اُجڑ جاتے ہیں - مگر ہے انسان
اپنی دُھن کا پکّا - ہمّت نہیں ہارتا - برابر یہی کہے جاتا ہے - کہ بڑھے چلو" چنانچہ
فرانس میں اس شکستِ فاش کے بعد جو وہاں کوئلے کی کانوں میں قدرت کے ہاتھوں
انسان کو ملی ہے - آخر یہی فیصلہ ہوا ہے - کہ جنگ ٹھنی رہے - مجروحین اور مقتولین

کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا جائے۔ بیواؤں اور یتیموں کو مدد دی جائے۔ اور سپاہی اس نہ زیبنی جنگ کے لئے تیار ہوں۔ اس فیصلے کو چاہے دلیرانہ کہو چاہے گستاخانہ۔ مگر بنی نوع انسان کی خدمت کے لئے خالی از فائدہ نہیں۔ اور اس لئے اس عزم اور ہمت کی داد دینی پڑتی ہے۔ بوجھ اپنی طاقت سے بڑھ کر اُٹھانا تو حضرت آدمؑ کا پرانا شیوہ ہے۔ مگر انصاف یہ ہے۔ کہ باوجود اپنی ضعیفی کے اہم ذمہ داریوں کو مردانہ وار نباہنا بھی تو حضرت ہی کا کام ہے ؎

شیوہ خاص ہے یہ عام نہیں
جو نکتے ہیں ان کا کام نہیں

گھر سے نکل کے دیکھو

"سفر وسیلۂ ظفر ہے" یہ مقولہ اگلے زمانے میں بھی سچ تھا۔ اور آج بھی سچ ہے۔
بلکہ پہلے کم تھا۔ اب زیادہ۔ پہلے افراد پر عائد ہوتا تھا۔ اب اقوام پر حاوی ہے۔ کسی
ترقی کرتی ہوئی قوم کا نام لو۔ جو اس کے فوائد سے بے خبر ہو۔ دُنیا کی موجودہ تجارت
کا فروغ اسی اصول پر مبنی ہے۔ جرمنی آجکل صنعت وحرفت کی ترقی میں اول درجے پر
شمار کیا جاتا ہے۔ کیا اس صنعت وحرفت کا مدار محض اہل جرمنی کی قدردانی ہے؟ اس
میں شک نہیں۔ کہ اہل ملک بھی اپنے مال سے بڑھ کر کسی کے مال کو نہیں سمجھتے۔ دوسرے
ملکوں کی بنی ہوئی چیزیں گر جرمنی میں راہ پانے کی کوشش کریں تو وہاں کی حکومت ان
اشیا پر بھاری محصول لگاتی ہے۔ تاکہ ملکی اشیا کا مقابلہ کر سکیں۔ مگر یہ وہاں کی صنعتی
ترقی کا ایک جزو ہے۔ اور شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ کہ جزوِ قلیل کا جزوِ اعظم بیرونی
تجارت پر منحصر ہے۔ دنیا کا کون سا گوشہ ہے۔ جہاں جرمن ساخت کا مال نہیں پہنچتا
چین میں اس کی کھپت ہے۔ روم میں اس کی قدر ہے۔ افریقہ کی منڈیاں وہ گھیرے ہوئے
ہے۔ اور ہندستان کے بازاروں میں وہ انگریزی ساخت کی چیزوں سے بڑھ کر بکتا ہے۔
یہاں تک کہ خود انگلستان باوصف بڑا تجارتی ملک ہونے کے جرمن ساخت کی اشیاء
کی دستبرد سے بچ نہیں سکتا۔ اور لندن کے بازاروں میں لاکھوں کا مال جرمنی سے آیا ہوا
بکتا ہے۔ امریکہ بھی اس ترقی میں کسی سے کم نہیں۔ اور انگلستان بھی اول درجے کے تجارتی
ممالک میں ہے۔ اس کے سوا یورپ کے قریب قریب سب ملک اس تجارتی لوٹ میں جو

دُنیا میں (بچ رہی) ہے - کم و بیش حصّہ دار ہیں - مشرقی اقوام میں سے جاپان نے حال ہی میں اس گُر کو سیکھا ہے - اور جاپانی چیزیں بھی جابجا پھیلتی جاتی ہیں - اب ہندستان کی باری ہے - (رُوئی) کے کام میں اب بھی ہمارا وطن کسی سے کم نہیں - اور ابھی کل کی بات ہے - کہ یورپ کی دکانوں میں ہندوستان کی دستکاری مہنگے داموں بکتی تھی - اب مشین کا زمانہ آگیا ہے - اور صنعتی اور تجارتی لڑائی میں اس قوم کا جو کل کا مقابلہ ہاتھ سے کرنا چاہے - وہی حال ہوگا جو میدان جنگ میں توپ کا مقابلہ تیر و تفنگ اور بندوق کا سامنا تیغ و سناں کے ساتھ کرنے سے ہوتا ہے - وقت آپہنچا ہے - کہ ہندجاگے - اور اس کے ساتھ اہل ہند کی قسمت - اور ہندوستان والے دنیا کی معزز صنعتی اور تجارتی اقوام کی مجلس میں برابر کی کرسی لیں - اس کا آغاز تو پہلے گھر کی خبر لینے سے ہی ہوگا - کہ اپنی ضرورت کی چیزیں اپنے کارخانوں سے حریدیں - مگر اس کا معراج یہ ہے کہ ہندستان کا مال زمانہ سابق کی طرح اطراف دنیا میں پھیلنے لگے - بے شک یہ منزل دُور ہے - اور دشواریاں بھی رکھتی ہے - لیکن اس کا پیش نظر رہنا بہرحال ضرور ہے - مسافر کی رفتار پر اس کے علم کا اثر ہوتا ہے - اور کوشش کا معیار جتنا بلند ر ہے مفید ہے -

سوال پیدا ہوتا ہے - کہ اس ترقی کی تدبیریں کیا ہیں ؟ تدبیریں تو مختلف ہیں اور سب اپنی اپنی جگہ ضروری - مگر ہندیوں کا بکثرت دُنیا کے دوسرے ملکوں میں پھیل جانا ان میں سے ایک تدبیر ہے - جس کی اہمیّت میرے دل پر روز بروز نقش ہوتی جاتی ہے صنعتی تعلیم کے لیے سفر درکار ہے - تجارتی تعلقات بڑھانے کے لئے سفر درکار ہے - محنت مزدوری کے ذریعے ڈھونڈھنے کے لیے سفر درکار ہے - مگر ان کے علاوہ بعض اور فوائد دوسرے ممالک میں چندے قیام پذیر رہنے سے وابستہ ہیں - جن کا احساس وطن میں کم ہوتا ہے - اور زیادہ تر وطن کے باہر ہی ہو سکتا ہے - دوسری قوموں

کے اوضاع و اطوار دیکھنے سے خیالات میں ایک وسعت پیدا ہوتی ہے۔ جو نہایت قابل قدر ہے۔ اور جب کسی ملک میں ایک کثیر تعداد ایسے لوگوں کی موجود ہو۔ جو مدتوں باہر رہے ہیں۔ اور جنہوں نے اپنے ہاں کی ہوا کے سوا اور مقامات کی بھی ہوا کھائی ہے۔ تو نامعلوم طور پر ایک قسم کا تغیر ملک کے خیالات اور حالات میں پیدا ہونے لگتا ہے۔ جیسے میدہ پر خمیر کا اثر ہوتا ہے اور بہت سی ترقیاں اور بہت سی اصلاحیں جو پہلے ناممکن نظر آتی تھیں۔ ممکن معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اور کئی تعصبات جو پہلے سدِ راہ ہوتے تھے۔ راستے سے ہٹ جاتے ہیں۔ ہاں اس نتیجے کے مترتب ہونے کے لئے یہ ضرور ہے۔ کہ جو لوگ سفر سے مستفید ہوں۔ وہ اس کے فوائد کے اخذ کرنے کی قابلیت رکھتے ہوں۔ اور ان میں سے بیشتر ایسا سفر کریں۔ جس کے اخراجات وہ سفر ہی سے نکالیں۔ نہ یہ کہ سب کے سب ملک کا روپیہ باہر صرف کر آئیں۔ اب تک جو کچھ لوگ سفر یورپ کو نکلے ہیں۔ وہ عموماً یا تو طالب علمی کے لئے نکلے ہیں۔ یا محض سیاحت کے لئے۔ اور ان لوگوں کی تعداد جو تجارت کی غرض سے یورپ آتے ہیں۔ ابھی بہت کم ہے۔ تاہم اس سلسلے کا آغاز ہی دل خوش کن ہے۔ اور ایسے اصحاب کی تعداد بڑھانے کی ضرورت ہے۔ لیکن میری مراد سفر سے سفر یورپ ہی نہیں۔ بلاشبہ اس وقت یورپ رونق کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اور صاحبانِ توفیق کے لئے اس کا دیکھنا خالی از لطف و فائدہ نہیں۔ مگر میرا مدعا سفر سے عام سفر ہے۔ چین کا ہو یا جاپان کا۔ روم کا ہو۔ یا ایران کا۔ تہذیب سے دور ہوے دار نوریب کا ہو یا تہذیب کے شکار افریقہ کا۔ سب سے سبق مل سکتا ہے۔ سب سے فائدہ ہو سکتا ہے۔ شرطیکہ کوئی محنت اور لیاقت کے جوہر لے کے نکلے۔ اور ہمت کی نافت نہ چھوڑے۔ کلکتہ اور بمبئی اور ہندوستان کے بعض اور بڑے شہروں میں ایک معقول تعداد چینیوں کی ملتی ہے۔ جو مختلف صنعتی اور تجارتی طریقوں

سے روپیہ کما رہے ہیں۔ اور نوٹ بنانے میں خصوصیت سے اُستاد ہیں۔ کیا ان کے مقابل میں چین کے کسی مقام میں ایسی یا اس کے قریب تعداد ہندی دستکاروں کی موجود ہے؟ نہیں۔ انگریز تاجروں کو لو۔ اور اُن کے کارخانوں کو دیکھو۔ جو روپیہ گورنمنٹ کے خزانے میں ہمارے ہاں سے جاتا ہے۔ اُس کی بابت تو فریادیں ہوتی ہیں۔ کہ ہم لوٹے جا رہے ہیں کیا یہ بھی گورنمنٹ کا قصور ہے۔ کہ سب بڑی بڑی تجارتی کوٹھیاں۔ بہت بڑے کارخانے قریباً سب بستیاں جو چائے نیل یا قہوہ کی پیداوار کے لئے قائم ہیں۔ انگریز تاجروں کے ہاتھ میں ہیں؟ کیا اگر خود اہل ملک مشترکہ سرمایہ کی بڑی کمپنیاں رکھتے ہوں۔ اور ان کاموں میں حصہ لیں۔ اور انگریز تاجروں کے نفع میں خود بھی شریک ہوں۔ تو کوئی بیجا دعویٰ ہے؟ چاہئے تو یہ کہ ہر انگریز کے جواب میں جو ہندوستان میں تجارت کر کے روپیہ کماتا ہے ایک ہندی تاجر انگلستان میں روپیہ کما رہا ہو۔ ہر فرانسیسی تاجر کے جواب میں ہندی کی کوٹھی فرانس میں ہو۔ ایران تجارتی اقوام کے لئے زرخیز منڈی ہے۔ دور دور سے قومیں آ کر وہاں سے روپیہ کما سکتی ہیں۔ تو ہندوستان والے جو پاس رہتے ہیں کیوں مستفید نہ ہوں خلیج فارس کے سواحل پر چند جگہ ہندوستانیوں کی ... کیوں اس سے زیادہ نہ ہوں۔ ملک کے اندر کے شہروں میں کیوں ہندی تاجر ... روم ہم سے بہت دور بھی نہیں۔ اور ہمارے ابنائے وطن میں خصوصاً مسلمان ... بھی اس سے گاڑھا ہے۔ روم میں ہر قوم کے تاجر ہیں۔ نہیں موجود تو ہندی ہی ... افریقہ کے بعض حصوں میں ہندوستانی جانے لگے تھے۔ اور کام بھی اُن کا ... مثلاً جنوبی افریقہ میں۔ اور وہاں آب و ہوا بھی اچھی تھی مگر وہاں فرنگی ... آدمیوں کی کامیابی بھی کانٹے کی طرح کھٹکی۔ اور اُنہوں نے ان کے ... دقتیں ڈال دیں۔ اور اُن کا جانا قریب قریب بند کر دیا۔ اچھا ... سہی۔ اور کئی دروازے ابھی کھلے ہیں۔ وہاں گھس جاؤ۔ اور جو دوران ...

ہو۔ کبھی تو کھلے گا ہی۔ امریکہ جنوبی کے بعض حصوں میں کچھ ہندی اچھی حالت میں ہیں۔
وہاں ان کے خلاف تعصب بھی کم ہے۔ وہاں کچھ ور بھی کسب سکتے ہیں۔ ریاستہائے متحدہ
امریکہ اس وقت جمیع اقوام عالم کو مقناطیس کی طرح کھینچ رہی ہے۔ جرمن سے روس
سے فرانس سے لوگ وہاں جاتے ہیں۔ اور وہیں کے باشندے قرار پاجاتے ہیں۔
معلوم نہیں اگر بہت سے ہندوستانی وہاں جا کر بسنا چاہیں۔ تو وہ کہاں تک یہ اختیار کریں۔
لیکن تا حال ان کا سلوک ہندوستانی سیاحوں، واعظوں اور طلبہ سے بہت عمدہ ہے۔
آزادی کی سرزمین ہے۔ زرخیزی میں دنیا کے کسی حصے سے کم نہیں۔ محنت مزدوری کے
لئے اچھی ہے۔ بشرطیکہ کوئی ہنر کسی کے پاس ہو۔ وہاں قسمت آزمائی کرنے والے نکلنے
چاہئیں۔ کینیڈا تو سلطنت برطانیہ کا ہی حصہ ہے۔ اور اس میں ہزارہا ایکڑ قابل
زراعت زمین نئے کاشت کار کے ہاتھ کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہاں کی گورنمنٹ آئے
دن انگلستان اور دیگر ممالک یورپ میں ایجنٹ بھیجتی ہے۔ کہ لوگوں کو ترغیب دے کر
لاؤ۔ زمین مفت ملے گی۔ وہ آ کر قابض ہو جائیں۔ اور آباد کریں۔ آئے دن سینکڑوں
جاتے ہیں۔ مگر اُدھر سے ھل من مزید کی آواز ابھی جاری ہے۔ کچھ کم ہمت پڑھے
لکھے ہندوستانی اگر جائیں۔ تو عجب نہیں۔ کہ انہیں وہی رعایات مل جائیں اور جو اور
آبادکاروں کو مل رہی ہیں۔ اور اگر تجربہ کامیاب ثابت ہو۔ تو پھر اور زیادہ لوگ جانے
لگیں۔ غرض اُمنگ اور جستجو شرط ہے۔ پھر اس میں کچھ کلام نہیں۔ کہ

"ملک خدا تنگ نیست۔ پائے گدا لنگ نیست"

اس تحریک پر اعتراض دو ہو سکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ خود ہمارا ملک بہت وسیع ہے۔
[illegible] سی زمین قابل زراعت موجود ہے۔ اور بہت سے پیشے قابل تحصیل سرمایہ
[illegible] اُس کی بھی ملک میں بیحد ضرورت ہے پھر باہر جانا کیا معنے؟
[illegible] کام کرنے والے کم ملتے ہیں۔ اور اگر اس طرح باہمت آدمیوں

کا ایک معتدبہ حصہ ملک سے باہر چلا جائے۔ تو ملک اور بھی غریب ہو جائے۔ اعتراض
دونوں بجا اور درست ہیں۔ اور ان کے جواب میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے۔ کہ ملک کے اندر جو ترقی
ممکن ہے۔ وہ تو آپ کیجیے اور ضرور کیجیے۔ لیکن اگر قوموں میں نام پیدا کرنا ہے۔ تو قوموں
سے بھی رشتہ پیدا کرنے کی بنیاد ابھی سے ڈال دو۔ ہندوستان میں تمہاری سب کوششیں
اُن حدود سے محدود ہوتی ہیں۔ جو محکومی کے لوازم ہیں۔ باہر نکل کر نئے ملک میں جو لوگ آزادی
کی آب و ہوا میں زندگی بسر کریں گے۔ اور اپنی قوتوں کا دوسری قوموں کی قوتوں سے موازنہ
کریں گے۔ انہیں معلوم ہو جائے گا۔ کہ کوئی وجہ نہیں کہ ہندی کسی سے کم رہیں۔ اُن کی رائے
دوسروں کی رائے پر اثر ڈالے گی۔ اُن کی مثال دوسروں کو ابھارے گی۔ اُن کی حیثیت
کا عکس دوسروں کی حیثیت پر پڑے گا۔ اگر وہ باہر اپنی قابلیت کا سکہ بٹھا لیں گے۔
اور اپنے چلن کی خوبی کا اعتراف کرا لیں گے۔ تو ملک میں جو اُن کے بھائی ہوں گے۔ انہیں
بھی اس نیک نامی کا حصہ ملے گا۔ اس لحاظ سے یہ تدبیر امتحان کے قابل ہے۔ اور یہ ایثار
گوارا کرنے کے لائق رہا۔ دوسرا اعتراض کہ ہم کو قومیوں سے ملک کو خالی نہ کرنا
چاہیئے۔ اس کا علاج یہ ہو سکتا ہے۔ کہ ہر شخص جو باہر جانے کا قصد ملک کی خاطر کرے۔ وہ
اس ارادے کے ساتھ ہی یہ عہد کر کے جائے کہ کامیابی کے بعد وہ ملک غیر کو وطن ہی
نہ بنا لے گا۔ اور اپنی عمر کا آخری حصہ اور اپنی محنت کی کمائی ملک کی بھلائی میں صرف کرے گا
اور جو کسی اتفاق سے اپنے نئے وطن کا پابند ہو جائے۔ وہ اپنے وطنِ مادری سے کبھی رشتہ
نہ توڑے۔ اور دور بیٹھ کر بھی ہند کے لئے باعثِ تقویت رہے۔ اور حتی المقدور ملک
کی بہتری کے لئے کوشش کرتا رہے۔ جو کام فرزندانِ انگلستان دنیا کے دور دراز
حصوں میں جا بسنے پر بھی انگلستان کے لئے کرتے رہتے ہیں۔ وہی کام ہر ہندی ہندوستان
کے لئے کرتا رہے۔ اس شرط کو خیالی اور موہوم نہ سمجھنا چاہیئے۔ جب قومیں بننے لگتی ہیں اور
اُن کے دن پھلے آتے ہیں۔ تو اُن کے عزم و ارادے میں استقلال پیدا ہو جاتا ہے۔ اور

سیکھیں۔ تو پھر اُس کو سکھا بھی سکیں۔ جس مُلک میں جائیں۔ اُس کی زبان پہلے حاصل کرنے
کی کوشش کریں۔ اور اس کے اوضاع و اطوار سے واقفیت بہم پہنچائیں۔ وہاں دن
بسر کریں۔ تو اس طرح معلوم ہو۔ نہ صرف اپنی بلکہ اپنے ابنائے وطن کی عزت کا ہر وقت
پاس ہے۔ اگر بڑھیں اور ان احتیاطوں کے ساتھ بڑھیں تو کوئی دن میں وہ کامیابیاں جو اب
اَوروں کے حصے میں ہیں۔ ہمارے احاطۂ دسترس میں ہوں۔ اور یہ جو ناکامیوں کی شکایت
اب ہے۔ اس کا خاتمہ ہو جائے۔ لندن میں ہزارہا یہودی روس سے آتے ہیں۔ اور
دنوں میں کاروباری بن جاتے ہیں۔ چند سال کے بعد انگریزوں کے سے حقوق حاصل
کرتے ہیں۔ اور اُن کی اولاد ہر اعتبار سے انگریز کا حکم رکھتی ہے۔ فرانسیسی۔ جرمنی۔
ارمنی۔ یونانی۔ اطالیہ کے باشندے ہسپانیہ کے باشندے۔ آسٹریلیا کے رہنے والے
روس کے ساکن۔ غرض ہر مُلک کے قائم مقام انگلستان کے بڑے شہروں میں روزی
کمارہے ہیں۔ اور محروم ہیں۔ تو ہم جن کا اتنا حق انگلستان پر ہے۔ اور جن سے
انگلستان کو بے شمار نفع پہنچتا رہتا ہے۔ یہی حال کم و بیش سلطنت برطانیہ کے دیگر حصص
اور امریکہ وغیرہ میں ہے۔ اور جوں جوں اس کیفیت کو ہم بچشم خود دیکھتے ہیں۔ دل کڑھتا
ہے۔ اور یہ آرزو پیدا ہوتی ہے۔ کہ ہمارے ہم وطن بھی نکل پڑیں۔ اور اس خوان یغما میں
شریک ہوں ؎

سخن درست بگویم نمے توانم دید
کہ مے خورند حریفاں و من نظارہ کنم

شیکسپئر کا وطن

سٹریٹ فورڈ کنارِ ایوان

انگلستان کی سرزمین کا چپہ چپہ ویسے تو تاریخی یادگاروں سے مالا مال ہے۔ مگر علم دوست سیاحوں کے لئے شاید کوئی قطعۂ زمین انگلستان بھر میں وہ دلچسپی نہیں رکھتا۔ جو اس پرانے قصبے میں موجود ہے۔ جسے شیکسپئر لازوال شیکسپئر کے مولد و مدفن ہونے کا فخر حاصل ہے۔ انگلستان کی چھوٹی چھوٹی ندیوں میں یہ ننھی سی مگر پیاری ندی ہمیشہ امتیاز پر ناز کرے گی۔ کہ ایک ایسے جادو نگار شاعر نے اس کے کنارے جنم لیا۔ جس کی خوبیٔ تحریر نے ایک عالم کو گرویدہ کر لیا۔ خود مشہور ہوا۔ تو اپنے قصبے کے حقوق کو نہ بھولا۔ اُسے مشہور کر دیا اور جس ندی کے پانی سے وہ شاداب ہے۔ اس کے احسان کا بھی حق ادا کر گیا۔ اب دُنیا اُسے ناظمِ ایوان کے نام سے یاد کرتی ہے۔

دریا اُسی دھیمی آواز سے بہہ رہا ہے۔ جس سے ۲۶ اپریل ۱۵۶۴ء کو بہہ رہا تھا۔ جب جان شیکسپئر کے ہاں ولیم شیکسپئر کے پیدا ہونے کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ اس کی چال میں آج بھی وہی معشوقانہ انداز نکلتا ہے۔ جو اُس دن تھا شہر کے رہنے والے آج بھی دریا پر جا کر اُسی شوق سے کشتیاں کھیتے ہیں۔ جیسے ولیم کے بچپن میں کھیلتے تھے۔ کئی پرانی وضع کے گھر اب تک کھڑے ناظر کو یقین دلا رہے ہیں

کہ اُس کے گرد و پیش کی دُنیا سولھویں صدی کی دُنیا ہے۔ مگر حقیقت اُسے یاد دلاتی ہے۔ کہ تین سے زیادہ صدیاں گزر چکی ہیں۔ زمانہ سینکڑوں کروٹیں بدل چکا ہے ولیم شیکسپیئر طفل سے جوان۔ جوان سے پیر ہو کر مر چکا ہے۔ مرنے سے پہلے اپنے ہمعصروں میں عزّت و امتیاز پیدا کر کے مرنے کے بعد کچھ دنوں کنج گمنامی میں رہ چکا ہے۔ مگر جن کیلئے روز ازل سے شہرت اور قبولیت و دیعت ہو چکی ہو۔ انہیں گمنامی میں کون ڈال سکتا ہے۔ آخر وہ شہرت بقا سے دوام اُسے نصیب ہوئی۔ جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

جب تک ملک اپنے سرمایۂ ناز سے ناآشنا رہا۔ اس وقت کو جانے دو۔ لیکن جب سے [illegible] بیدار ہوا۔ اور اس کی شہرت کے نصیب جاگے۔ اُس دن سے اس [illegible] کی بھی قسمت بیدار ہوئی۔ ویسے کوئی اس چھوٹے سے قصبے کو دیکھے کیوں [illegible] آئے دن وہاں ہجوم زائرین رہتا ہے۔ امریکہ سے ہزاروں لوگ ہر سال انگلستان آتے ہیں۔ اور انگریزوں سے زیادہ شوق سے [illegible] سٹریٹ فورڈ جاتے ہیں۔ وہاں خاص ان کے قیام کے لئے اب ایک بڑا امریکن [illegible] ہو چکا ہے۔ شیکسپیئر کی یادگار میں ایک خوشنما تھیئٹر، کتب خانہ اور تصویر خانہ تیار کرنے کے فنڈ میں انہوں نے دل کھول کر شرکت کی ہے۔ بازاروں میں [illegible] دکانیں صرف مقامی [illegible] اور نشانیاں بیچنے پر چل رہی ہیں۔ لکڑی پر اس کے گھر کی تصویریں۔ چینی پر اس کے گھر کی تصویریں پتھر پر اس کے گھر کی تصویریں۔ اس قسم کا مال یہاں بہت بکتا ہے۔ ہوٹلوں والے گھوڑوں والے گاڑیوں والے سب شیکسپیئر کے زائروں کی کثرت سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اس عجیب و غریب شخص کا نام مرنے کے بعد اپنے اہل وطن کو بے حساب نفع پہنچا رہا ہے۔ جب یہ چھوٹا سا لڑکا سٹریٹ فورڈ کی گلی کوچوں میں کھیلتا پھرتا ہوگا۔ کسے خبر ہوگی کہ اس قصبے کے لئے یہ لڑکا لازوال خزانہ ثابت ہوگا۔ جس کی بدولت ہزاروں کو معیشت کا

پشت تک یونہی کتابیں گے۔ اور دُور دُور سے لوگ آکر سٹریٹ فورڈ کی گلیوں میں قدم قدم پر اُس کا نقشِ پا ڈھونڈھتے پھریں گے۔ اور جہاں کوئی ایسی جگہ نظر آئے گی۔ جس کی نسبت قابلِ اعتبار روایت ہو۔ کہ شیکسپیر وہاں اُٹھتا بیٹھتا تھا۔ اُسے گھنٹوں کھڑا دیکھا کریں گے۔

سب یادگاروں سے زیادہ دلچسپ وہ پرانا گھر ہے۔ جس میں یہ خوش قسمت شاعر پیدا ہوا۔ غنیمت ہے۔ کہ یہ مکان دستبردِ زمانہ سے محفوظ رہ گیا۔ انگلستان بہ جوشانِ شوکت آج کل رکھ رہی ہے۔ اور جو محل ہر طرف سر بفلک دکھائی دیتے ہیں اُن کی خوگر ہوا آنکھ کو تیاہے۔ یہ مکان گنداسی حقیر معلوم ہو۔ مگر علاوہ شیکسپیر سے متعلق ہونے کے اس پہلو پر بڑی خوبی ہے۔ کہ اس کے تنگ و تاریک کمروں سے سولھویں صدی عیسوی کی زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ مکان کی تعمیر بیشتر لکڑی سے ہوئی ہے۔ یہ طرزِ تعمیر دیکھ کر کشمیر یاد آ گیا۔ لکڑی کا ایک لمبا شہتیر لے کر اس کے اوپر چند چھوٹی کڑیاں پاٹ کر زیریں اور بیچ کے حصے کو اینٹ اور چونے سے چُن ڈالا۔ پھر کچھ اوپر چل کر ایک اور شہتیر ہموار سی لگا یا۔ اور اس میں کڑیاں ٹھونک کر عمارت اٹھالی۔ اور اسی طرح دیواریں تیار کر لیں۔ اندر بالکل لکڑی کا کام ہے چھتیں بہت نیچی اور دروازے ایسے ہی چھوٹے جن میں جھک کر داخل ہونا پڑے۔ زینے لاہور کے بعض پرانے مکانوں کی چھوٹی اور تنگ سیڑھیاں یاد دلاتے تھے۔ جس کمرے میں شیکسپیر پیدا ہوا۔ اُس کی ایک کھڑکی بازار کی طرف کھلتی ہے۔ دوسرے کمرے میں روشنی کے لئے صرف چھت میں روشندان ہے۔

اُس گھر کی تاریخ یُوں بیان کی جاتی ہے۔

شیکسپیر کے بعد یہ مکان اُس کی وصیت سے اس کی بہن کو ملا۔ بہن مر گئی۔ تو شیکسپیر کی بڑی بھتیجی سوسن اس پر قابض ہوئی۔ اس لڑکی کی شادی ایک طبیب ڈاکٹر

ہال سے ہوئی تھی۔ ۱۶۴۹ء میں سوسن کا انتقال ہوگیا۔ تو اُس کی لڑکی لیڈی برنارڈ وارث بنی۔ مگر ۱۶۷۰ء میں اسے بھی پیام اجل آگیا۔ اس کے بعد شیکسپیئر کے بہنوئی کی اولاد میں سے ایک شخص ٹامس نامی قابض ہوا۔ کیوں کہ لیڈی برنارڈ بے اولاد تھی۔ ٹامس ۱۶۹۴ء میں چل بسا۔ اور بے اولاد مرا۔ اس لئے اس کا بھائی جارج جو درزی کا کام کرتا تھا۔ گھر کا مالک بنا۔ اور اس نے ۱۷۲۷ء میں یہ مکان اسّی پونڈ (بارہ سو روپیہ) کو گرو کر دیا۔ جارج مرا۔ تو مکان اپنی بیوی کے قبضے میں چھوڑ گیا۔ وہ ۱۷۵۴ء میں راہی ملکِ عدم ہوئی۔ تو مکان اپنے شوہر کے بھتیجے کو جو شوہر کا ہم نام تھا۔ سونپ گئی۔ اس شخص کا انتقال ہوا۔ تو ۱۷۷۸ء میں اس کا بیٹا جان وارث بنا۔ اور جان کے بیٹے ٹامس نے کچھ عرصہ بعد قصاب کی دکان مکان کے نصف حصے میں کھولی وہ مرگیا۔ تو اس کا بھائی دکان چلاتا رہا۔ اور جب اُس کے جینے کی نوبت ۱۸۰۰ء میں آئی۔ تو اُس کی بیوہ اور تین بچے نہایت ناداری کی حالت میں رہ گئے۔ اور یہ غریب بیوہ ۱۸۰۶ء میں مکان بیچ کر اور زرِ رہن ادا کر کے اس قصبے کو چھوڑ کر کہیں اور جا رہی۔ یہ لوگ جنہیں شیکسپیئر سے رشتہ داری کا تعلق تھا۔ قدرتی طور پر دل سے اس تعلق کی قدر کرتے تھے۔ اور اسی لئے جب کبھی کوئی شخص شیکسپیئر کی ولادت کی جگہ دیکھنے کو آجاتا تھا۔ اُسے دکھا دیتے تھے مگر جس شخص نے آخری وارث سے مکان خریدا۔ وہ اس فرض کے ادا کرنے سے گھبراتا تھا۔ لوگوں کو تکلیف ہونے لگی۔ اور اس اثنا میں شیکسپیئر کی قدردانی از سرِ نو عام ہو چلی تھی اور زائرین کی تعداد روز افزوں تھی۔ اس حالت کو دیکھ کر تحریک شروع ہوئی کہ اُسے رفاہِ عام کے لئے خرید لیا جائے۔ اور ۱۸۴۷ء میں تین ہزار پونڈ ۴۵ ہزار روپیہ کو خرید لیا گیا۔ ۱۸۵۷ء میں یہ کوشش کی گئی۔ کہ جہاں تک ممکن ہو۔ اس کی اصلی صورت بحال کی جائے۔ اور اس کوشش میں بہت کامیابی ہوئی۔ ۱۸۹۱ء میں یہ مکان قوم کی ملکیت ہوگیا۔

میں کوئی تماشا گاہ نہ تھی۔ اور نہ کوئی مستقل تماشے کی کمپنی۔ تماشا کرنے والے شہر بشہر
دورہ کرتے رہتے تھے۔ جیسا ان دنوں ہندوستان کے شہروں میں دستور ہے۔ دُنیا
کا بادشاہ ادب نگار ابھی بچہ ہی تھا۔ کہ ایک کمپنی تماشا کرنے والی آنکلی۔ انہوں نے ہال
میں تماشا کرنے کی اجازت لی۔ اور ایک عارضی چبوترہ بنا کر اُس پر کھیل دکھایا۔ شیکسپیئر
نے بھی دیکھا۔ خدا جانے اس ہونہار بچے کے دل میں اُس وقت کن خیالات کا ہجوم ہوگا۔
اور کیا عجب ہے کہ اُسی دن سے اس ننھے سے دل میں آرزو پیدا ہو گئی ہو۔ کہ جو
منصب اس کھیل کے اہتمام کرنے والوں کو ہوتا ہوگا۔ وہ بھی اُس میں شریک ہو۔

ہال کے اوپر کا مدرسہ اس لئے قابل زیارت ہے۔ کہ شیکسپیئر نے وہاں کچھ
دنوں خود استاد کا مزا چکھا ہے۔ وہاں ایک میز کی تختی اس مقام کا نشان بتاتی ہے۔
جہاں شیکسپیئر اپنی جماعت میں بیٹھا کرتا تھا۔ گرجا جو اس ہال سے متعلق ہے۔ نہ
صرف اس قدیم زمانے کی نشانی ہونے کے اعتبار سے دیکھنے کی چیز ہے۔ بلکہ کہتے
ہیں کہ مدرسے کے لڑکے اس میں عبادت کے لئے بھیجے جاتے تھے۔ اور یہ رسم اب
تک جاری ہے۔ اب بھی اس مدرسے میں لڑکے پڑھتے ہیں۔ اور وہ اس گرجے میں
عبادت کے لئے آتے ہیں۔ پس اس کے اندر داخل ہونے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ
یہیں شیکسپیئر نے اپنے بچپن میں کئی دفعہ اپنے معبود کی بارگاہ میں سر نیاز
جھکایا ہوگا۔

سٹریٹ فورڈ کا مختصر سے مختصر بیان مکمل نہیں ہو سکتا۔ جب تک اُس تیا اُس
غریبانہ جھونپڑے کا ذکر نہ ہو۔ جہاں شیکسپیئر نے پہلے اینی ہاتھاوے سے ملاقات
کی۔ اور جہاں اُن دونوں کی نسبت کی قرارداد ہوئی۔ خاوند کی بدولت اس غریب
اور گمنام عورت کا شکستہ سا گھر جو شہر کے کوئی میل بھر کے فاصلے پر ہے۔ ناموران
دُنیا کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اور حقیقت میں نہایت ہی دلچسپ چیز ہے۔ اس

کی سادگی - اور اس کا بے ساختہ پن ایسی صفات ہیں - جو اُسے بڑی بڑی عالی شان یادگاروں سے ایسا ہی ممتاز کرتی ہیں جیسے اُس کی مکبین - اپنی باوجود اپنی غربت کے شیکسپیئر کی نظروں میں بڑی ذی جاہ عورتوں سے کہیں بڑھ کر تھی -

گو سٹریٹ فورڈ کی اصلی دلچسپی اُن پرانی چیزوں کے ساتھ وابستہ ہے - تاہم ایک نئی یادگار جو تھوڑا عرصہ ہوا - شیکسپیئر کے نام پر قائم کی گئی ہے خصوصیت سے قابل ذکر ہے - یہ ایک خوب صورت تھیٹر ہے - جو دریا کے کنارے بنائی گئی ہے - جس میں ایک عالی شان تھیٹر ہے - جہاں شیکسپیئر کے کھیل دکھلائے جاتے ہیں - اور جہاں بعض اوقات انگلستان کے چیدہ ایکٹر جا کر وہاں کے کارکنوں کا ہاتھ بٹاتے ہیں - ایک گیلری ہے - جہاں شیکسپیئر کے متعلق عمدہ عمدہ تصاویر کی ایک ... ہے اور نیچے کے درجے میں ایک کتب خانہ ہے جس میں شیکسپیئر کے نسخے جو آج تک طبع ہوئے ہیں - بیشتر موجود ہیں - اور جو شرحیں اور حواشی شیکسپیئر کی تصانیف پر لکھے گئے ہیں) - وہ بھی جمع کئے گئے ہیں - یہ یادگار نہایت مناسب اور موزوں ہے اور ثابت کرتی ہے - کہ اس ملک کے لوگ اپنے محسنوں کے احسانات کی کس قدر جوش اور سرگرمی سے قدر کرتے ہیں ؎

خانہ بدوش جپسی

انگلستان اور یورپ کے دیگر ممالک میں کچھ خانہ بدوش قومیں اب تک پائی جاتی ہیں جنہیں جپسی کہتے ہیں۔ گو تمدن کی ترقی اور قانون کی سخت گیری سے روز بروز ان کی تعداد گھٹتی جاتی ہے۔ اور ان میں جو ذرا خوش حال ہیں۔ وہ اپنی آوارگی کی زندگی چھوڑ کر زیادہ پُرامن پیشوں میں گھستے جاتے۔ اور رفتہ رفتہ انگلستان کی زبردست آبادی کا جزو بنتے جاتے ہیں۔ تاہم اُن کے حالات نہ صرف تاریخی اور علمی اعتبار سے دلچسپی سے پُر ہیں۔ بلکہ اہلِ ہند کے لئے خصوصیت سے دلچسپ ہیں کیونکہ جدید تحقیقات کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ اقوام زمانۂ قدیم میں ہندوستان سے گئی تھیں۔ اور اس وقت تک خانہ بدوش لوگ ہندوستان کے اکثر حصوں میں پائے جاتے ہیں۔ وہ ان گورے رنگ والے کوٹ پتلون پہنے ہوئے خانہ بدوش جپسیوں کے چچیرے بھائی ہیں۔

جیسا کہ لفظ جپسی سے ظاہر ہے۔ ایک زمانہ تک اہلِ فرنگ کا خیال تھا۔ کہ یہ لوگ "ایجپٹ" یعنی مصر کے رہنے والے ہیں۔ اس خیال کی دو وجہیں تھیں۔ اوّل تو یہ کہ مدت تک مصر اہلِ یورپ کے لئے مشرق کا حکم رکھتا تھا۔ مصر سے پرے کی مشرقی اقوام سے ادھر کے لوگ عموماً واقف نہ تھے۔ اور بہت دور جاتے تھے۔ تو مصر تک جاتے تھے۔ اس لئے ان مشرقی خط و خال کے آدمیوں کو اُنہوں نے ایجپسی سے تعبیر کیا۔ اور یہ لفظ بعد "جپسی" بن گیا۔ دوم یہ کہ غالباً یہ لوگ ایشیا سے یورپ میں مصر کے راستے ہی داخل ہوئے۔ اور جیسا کہ اُس زمانے میں ضروری تھا۔ کہ ہند سے نکل کر

[illegible] یہاں پہنچنے میں پہلی بڑی منزل ایران میں ہوئی۔ وہاں سے کچھ فارسی الفاظ سیکھے
ایران سے رُوم میں آگئے۔ اور رُوم سے مصر میں۔ مصر سے یورپ کون بڑی بات تھی
جب گھر سے نکل پڑے۔ تو دُور و نزدیک کا کیا پوچھنا۔ خصوصاً اس حالت میں جب
خانہ بدوشی کی عادت ہو۔ بچپن سے سفر اور آوارگی گھٹی میں پڑے۔ دریاؤں میں چکر
ہو۔ یہ غریب بھی شاید مصر سے نکل کر یورپ بھر میں پھیل گئے۔ اٹلی۔ فرانس جرمنی
غرض کون سا ملک ہے۔ جہاں اُن کا نشان نہ ملتا ہو۔ ہسپانیہ میں تو کچھ دنوں ان
کا بہت چرچا رہا [illegible] داستان کوئی ان کے [illegible] شور و غل سے [illegible] یورپ
کے پرانے قصوں میں۔ کوئی قصہ مشکل سے جپسی کے بغیر مکمل ہوتا ہے۔ سکاٹ
کے کئی فسانوں میں جپسی فال نکالتے۔ نجوم کا سوال آتا ہے۔ تو ہاتھ دیکھ کر ماضی و مستقبل
کا حال کہتے نظر آتے ہیں۔ یہ پیشہ یورپ میں اب تک باقی ہے۔ گو پیشہ وروں کو
بہت احتیاط سے چلنا پڑتا ہے۔ ورنہ قانون کے پھندے میں پھنس جائیں۔ ان دنوں
جپسی لوگ انگلستان میں اس کثرت سے نظر نہیں آتے۔ جیسے آج سے نصف صدی پہلے
تک انہیں دیکھنا ممکن تھا۔ وہ بڑے بڑے شہروں میں عموماً الگ رہتے ہیں۔ پھر بھی
دیہات میں نکل جاؤ تو کسی جگہ ان کے ڈیرے خیمے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا اصول زندگی
اس بیسویں صدی میں بالکل وہی ہے۔ جو ہزار برس پہلے تھا۔ اور جو اُن کے بھائی بندوں
کا ہے۔ جو ہندوستان میں پائے جاتے ہیں۔ قافلہ قافلہ مل کر رہتے ہیں۔ سختی برداشت
کرنے میں زن و مرد یکساں ہیں۔ مرد عورتوں کی طرح چابک دست اور عورتیں مردوں
کی طرح دلیر ہیں۔ کھانا پینا غریبانہ اور سیدھا سادہ۔ زندگی بے تصنع اور بے
تکلف۔ ہندوستان میں گھاس پھوس کے جھونپڑے بناتے ہیں۔ یہاں کپڑے کے تنبو
لئے لئے پھرتے ہیں۔ وہاں نہایت بھدا سا چھکڑا یا گدھے اسباب لادنے کے لئے رکھتے ہیں۔ یہاں دو تین
بند گاڑیاں ہوتی ہیں۔ جو ایک کمرہ کی طرح بنی ہوتی ہیں۔ اس کے اندر عورتیں بچوں کو

لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔ اور اسباب سمیٹ لیتی ہیں۔ مرد گاڑی ہانکتے یا گاڑی کے ساتھ
ساتھ چلتے ہیں۔ کچھ مریل سے ٹٹو بار برداری کے لئے ہوتے ہیں۔ اور آئے دن یہ
کاروان ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کرتا رہتا ہے۔ جس گاؤں میں جاتے ہیں۔ وہاں
کسی نہ کسی قسم کا سفری تماشہ ساتھ لے جاتے ہیں۔ کچھ بانس کے بنے ٹکڑے گاڑ دیتے ہیں
ٹٹو اور گدھے کرایہ پر دے دیتے ہیں۔ اور ہوا سا چھپر ایک میلہ جما لیتے ہیں۔ ان
کی صورت دیکھو۔ تو ان میں اور ادنیٰ درجے کے انگریزوں میں بہت کم فرق ہے
زبان انگریزی گنواری لہجہ میں اچھی بولتے ہیں۔ اور سر والے سیاہ بالوں یا سیاہ آنکھ
کے جو کبھی کبھی مشرقی اصل کا پتہ دے جاتی ہے۔ رنگ ڈھنگ سب چیزیں فرنگی ہیں۔
اور اس نظر سے ہر ہندی کے لئے انہیں دیکھنا بہت کچھ نصیحت اور عبرت کا سامان
ہے۔ ہندوستان کی ان کی برادری سیاہ فام ہونے میں خصوصیت رکھتی ہے۔ اور
شرفائے ہند عموماً صاف رنگ کے ہیں۔ جو رنگ ان کا ہر وقت باہر دھوپ میں رہنے
کی وجہ سے ہے۔ اور اس عادت کا اثر ان کے چہروں پر یہاں بھی موجود ہے۔ مگر اتنا ہی
جتنا کسی اور انگریز پر ہو۔ جو عموماً دھوپ وغیرہ میں چلتا پھرتا ہو۔ لیکن آب و ہوا
کی خوبی دیکھئے۔ اس سرد ملک میں چند صدیوں کی بود و باش نے انہیں بھی وہ چیز
عطا کر دی ہے۔ جس کو اہل فرنگ اپنا سرمایۂ ناز سمجھتے ہیں یعنی سفید رنگ۔ اگر وہ
ذرا غور کریں۔ تو ان کو معلوم ہو جائے۔ کہ نازش علامت پر ہونی چاہئے۔ اور وہ
آج کل اہل فرنگ کا حق ہے۔ لیکن رنگ پر اترانا اور صرف اس کی وجہ سے اپنے
آپ کو گندم گوں یا سیاہ رنگ لوگوں سے اعلیٰ مخلوقات جاننا کتنی بڑی
غلطی ہے۔

جیسے انگلستان میں انگریزی بولتے ہیں۔ فرانس میں فرانسیسی ہسپانیہ میں
ہسپانیہ کی زبان۔ مگر اپنے حلقۂ خاص میں اپنی خاص بولی بولتے ہیں۔ اس بولی میں جہاں

ڈاکٹر صاحب موصوف نے مجھے یہ بھی بتایا۔ کہ وہ اکثر ان لوگوں سے جاکر باتیں کیا کرتے ہیں اور کوئی نہ کوئی نئی بات سُن آتے ہیں۔ چنانچہ انہیں معلوم ہوا۔ کہ یہ لوگ ڈور کو "دور" ہی کہتے ہیں۔ اور یہ لفظ فارسی سے لیا گیا ہوگا۔ "چھری" کو "چھُری" کہتے ہیں۔ "مجھے گوشت دے" کہنا ہو تو "دے مو سے ماس" بولتے ہیں۔ ان مثالوں کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ کہ وطن کی مہر کتنی زبردست ہے۔ جو دیسی بولی میں مٹائے نہ مٹی۔ جپسیوں سے پوچھو۔ تو انہیں کچھ معلوم نہیں کہ اُن کی ہستی کہاں کی ہے۔ اُن کے باپ دادا انہیں کچھ۔ بس اتنا جانتے ہیں۔ یہ ہندی کے الفاظ روز بولتے ہیں۔ مگر انہیں کیا معلوم کہ یہ ہند کی ہیں۔ وہ تو یہ جانتے ہیں کہ اُن کے بزرگوں نے دوراندیشی سے انہیں ایک خاص بولی سکھا دی۔ جسے سوائے اُن کے دوسرے لوگ نہیں سمجھتے۔ بلکہ وہ پردے کی باتیں یا اپنی چوری کی سازشیں اس بولی میں کر لیا کریں۔ اور پاس والوں کو خبر نہ ہو۔

لطیفہ یہ ہے کہ اس بولی کے کئی الفاظ بے معلوم طور پر خود انگریزی زبان میں بھی جپسیوں کے ذریعے داخل ہو گئے ہیں۔ مگر ان میں سے اکثر بازاری بول چال میں جسے سلینگ کہتے ہیں آئے ہیں۔ اور شرفا تعلیم یافتہ انہیں بہت کم بولتے ہیں۔ گو کبھی کبھی وہ بھی انہیں مزہ دار سمجھ کر استعمال کر لیتے ہیں۔ مثلاً "چیز" جپسیوں میں معنی "شے" کے آتا ہے۔ اور انگریزی میں اس کے معنے ہیں عمدہ یا اوّل درجے کی چیز۔ انگریزی کا لفظ Daddy ڈیڈی باپ کے لئے پیار کی اصطلاح ہے۔ اس کے متعلق ایک مصنف نے لکھا ہے۔ کہ اغلب ہے۔ کہ یہ لفظ جپسی لفظ "دادی" سے جو وہاں باپ کے لئے مستعمل ہے۔ لیا گیا ہو۔ انگریزی میں (Mound) مونڈ مانگنے کے لئے ہے۔ اس کی نسبت بھی قیاس ہے۔ کہ یہ جپسی لفظ (مونگ) سے جو مانگنے کے لئے ہے۔ ماخوذ ہے انگریزی میں (Tiny) چھوٹے کو کہتے ہیں۔ اور جپسی میں ٹوٹو

کچھ عرصہ ہوا۔ انگریزی میں بازاری الفاظ و محاورات کی ڈکشنری[1] شائع ہوئی تھی

جو اب کمیاب ہے۔ اس کا ایک نسخہ[1] مجھے ملا ہے۔ اور اس میں ایسے الفاظ کی جو جپسی لوگوں کا عطیہ ہیں۔ ایک معقول فہرست مندرج ہے۔ میں نے مندرجہ بالا چند الفاظ و نمونۃً اُسی سے لئے ہیں۔ اُس میں ان لوگوں کے متعلق بعض عجیب باتیں لکھی ہیں۔ مثلاً لکھا ہے کہ انھوں نے نشانات مقرر کئے ہوئے تھے۔ جنہیں صرف یہی سمجھتے تھے۔ اور جو بعد میں ان سے گداگروں نے بھی لے لئے۔ جس سے ہر جپسی یا ہر گدا اپنے رفیقوں کو اطلاع دے دیتا تھا۔ کہ کدھر جائے۔ اور کدھر نہ جائے۔ کدھر جانا مفید ہوگا۔ اور کدھر مضر۔ کس شخص سے کچھ ملے گا۔ اور کس سے نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اُن نشانات میں سے چند کا نقل کر دینا خالی از لطف نہ ہوگا:-

کسی کام کے نہیں۔ بہت غریب ہیں اور تنگ۔ ×

یہاں ٹھہرو۔ اگر اُن کے مطلب کا مال تمہارے پاس ہو تو خریدنے والی اسامی ہیں مگر ہیں ہشیار ～

اسی طرف چلے جاؤ۔ دوسرے راستے سے بہتر ہے اُدھر کچھ نہیں ≻——

خاصہ گھر ہے۔ کم از کم سوکھا ٹکڑا تو مل جائے گا مگر ذرا زیادہ باتیں نہ بنانا ◊

یہاں بہت سائلوں کے آنے سے کام بگڑ گیا ▽

کتے سے بچنا۔ کاٹتا ہے مکان بھی مایوس کرنے والا ہے □

اگر یہاں گئے تو ایک مہینے کا جیلخانہ یقینی سمجھو۔ ◎

ان نشانات کے لئے اصطلاحی نام ہیں۔ اور دیگر امور کے لئے بھی اصطلاحات ہیں اگر کوئی ہند کی ایسی اقوام کی اصطلاحات کا ماہر دونوں اصطلاحوں کا مقابلہ کرے۔ تو

[1] کتاب کا نام اور پورا پتہ:- The Slang Dictionary
Publishers Chatta & Wendas London.

عجب نہیں۔ کئی الفاظ مشترک مل جائیں۔کیونکہ متحد الاصل ہونے کے علاوہ فطرتِ انسانی ہر جگہ ایک سی ترکیبیں استعمال کرتی ہے۔ چنانچہ اُسی ڈکشنری میں جس کا حوالہ اُوپر دیا گیا ہے ایک نئی ترکیب راز کی باتیں کرنے کی لکھی ہے کہ حروف کی ترکیب بدل دیتے تھے۔ مثلاً ٹِن چاپ کو چپٹن ماپ کہتے تھے۔ اور یہ رواج ایسے لوگوں میں ہندوستان میں بھی بعینہٖ موجود ہے۔ ایک اور رواج ہے جو ہندوستان کے ایک رواج سے بہت مشابہ ہے یعنی کوئی زائد حرف ہر لفظ میں ڈال کر اُس کی صورت مسخ کر دی جاتی ہے۔ مثلاً "شیل دی گو" (یعنی کیا ہم جائیں گے) کو شگیل دگی گگو" کہنا اس کے مقابلہ کے لئے پنجاب کے بعض آوارہ لوگوں کی وہ ترکیب قابلِ ملاحظہ ہے جس میں وہ "میں نئیوں کہنا ہاں" کی جگہ مفیں تفینوں کفہنا ہفاں" بولتے ہیں۔ انگریزی میں بھی یہ ترکیب کچھ حرف گ سے مخصوص نہیں۔ بلکہ بعض نے گ کی جگہ ف یا ل سے اس بولی کو ترتیب دیا ہے۔ ڈی کوئنسی۔ جو انگریزی مصنفین میں ایک مشہور شخص گزرا ہے۔ ایک جگہ بیان کرتا ہے۔ کہ اس کے بچپن کے زمانے میں اس بولی کا خاصہ رواج تھا۔ اور ونچسٹر کالج کے طلبہ خاص طور پر اس کے مشاق تھے۔ چنانچہ اُس نے بھی اسے سیکھا۔ اور اس قدر مشق بہم پہنچائی۔ کہ پچاس سال بعد اُسے لارڈ ورسٹ پورٹ کے ساتھ اُس میں گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا۔ تو بھی نہایت آسانی اور روانی کے ساتھ بولتا چلا گیا۔ اس زبان کا اصطلاحی نام زِنّ ہے۔

میرا مُدعا ان چند واقعات کے اظہار سے نہ صرف کسی قدر نئی معلومات کا ناظرینِ کرام تک پہنچانا ہے۔ بلکہ یہ بھی کہ تحقیق پسند طبائع یہ تھوڑا سا اشارہ پا کر جیبی خانہ بدوشوں کی اصل کے متعلق زیادہ مسالہ بہم پہنچانے کی کوشش کریں۔

استنبول اور اس کے دلچسپ مناظر

مدّت سے آرزو تھی۔ کہ استنبول دیکھوں۔ آخر پوری ہوئی۔ اب تین ہفتے سے میں ہوں۔ اور استنبول کی گلیاں۔ نہ وہ ختم ہوتی ہیں۔ نہ میرا شوق۔ یورپ کے اکثر سیاحوں نے لکھا ہے۔ کہ یہ شہر تو لاجواب ہے۔ مگر اس کی گلیاں خراب ہیں۔ گلیوں میں صفائی کا انتظام ٹھیک نہیں۔ ان سے بدبو آتی ہے۔ ان میں قدم قدم پر کُتّے لیٹے رہتے ہیں۔ یہ سب کچھ سہی۔ لیکن اگر انہیں اس شہر کی بے انتہا دلچسپیوں کی شناخت کے لئے آنکھ دی گئی ہوتی۔ تو وہ ان عیوب سے قطع نظر کرکے اس کے محاسن کو دیکھتے۔ اور اب بھی کئی قدر شناس سیاحوں نے بیحد داد دی ہے۔ یہ عیوب عارضی ہیں۔ بہ نسبت سابق بہت کم ہو گئے ہیں۔ اور اُمید ہے۔ کہ دن بدن صفائی میں ترقی اور سڑکوں اور راستوں کی درستی پر زیادہ توجہ ہوتی جائے گی۔ دیکھنے کی جو چیز اس شہر میں ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اس کے بانیوں نے ان کے لئے ایسا موقعہ ڈھونڈھا ہے جس نے اُسے سارے جہان کا انتخاب بنا دیا۔ ایک طرف ایشیا اپنی قدامت کو سنبھالے کھڑا ہے۔ اور دوسری جانب یورپ اپنی جدّت طرازی پر اترا رہا ہے۔ اور درمیان میں استنبول ہے۔ گویا ایشیا کا یورپ سے ڈانڈھا ملا ہوا ہے۔ ایک طرف سے استنبول یورپ کی اقوام مختلفہ کا مرجع ہے۔ اور دوسری طرف سے ایشیا کی قومیں اس کی طرف کھنچی چلی آتی ہیں۔ خصوصاً ایشیا کی مسلمان اقوام کے لئے اس مقام کی قدرتی خوبیوں اور اس کے تجارتی فوائد کے سوا یہاں مذہبی کشش بھی ہے۔ مزید برآں خود ملک کے اندر بھی

مختلف مذاہب اور اقوام کی کمی نہیں نتیجہ یہ ہے۔ کہ ؎

جمگھٹا ہے اس میں تُرک و فرس و رُوم و زنگ کا
یعنی گلدستہ ہے اک گلہائے رنگا رنگ کا

پُل کی سیر۔ آؤ تھوڑی دیر کے لئے اُس پل پر کھڑے ہو جائیں۔ جو اس خلیج پہ بنا ہُوا ہے۔ جسے اہلِ یورپ "شاخِ زرّیں" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ دیکھنے کو تو یہ پُل پُرانا اور خستہ سا ہے۔ اور سُنتے ہیں۔ کہ کسی جرمنی کمپنی کو ایک نیا اور شاندار پُل بنانے کے لئے ٹھیکہ دیا گیا ہے۔ مگر اس کی دقیانوسی ساخت سے درگذر کر کے اُس انبوہ پر تو ذرا نظر ڈالو۔ جو پُل پر سے گزر رہا ہے۔ بوڑھے۔ جوان۔ پُرانے۔ نئے۔ عورت۔ مرد کالے۔ گورے۔ فرنگستانی اور ایشیائی کس طرح ملے جُلے گزر رہے ہیں۔ کوئی اکڑ کر نہیں چلتا۔ کہ اس مقبول گُزرگاہ سے ہو کر نکلنا صرف اسی کے لئے روا ہے۔ مساوات کے اصُول کا حق یہاں ادا کر دیا گیا ہے۔ اور تصویر کی بوقلمونی درجۂ کمال کو پہنچا دی گئی ہے۔ اس سے دلآویز تر تصویر چشم تصوّر نے بھی نہ دیکھی۔ سُرخ ترکی ٹوپیاں اور اُن کے کالے پھندنے سب سے پہلے اپنی کثرت کی وجہ سے نظر کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ مگر کسی پُرانی وضع کے بزرگ کی خوشنما قبا اور ٹوپی کے گرد سفید عمامے کے پیچ دامنِ دل کو کھینچتے ہیں۔ اور آنکھ کو کہتے ہیں۔ کہ دیکھ باوفا اس طرح نباہ کرتے ہیں۔ زمانہ بدل جائے تو بدل جائے۔ مگر یہ اپنے اصُول پر ثابت قدم ہیں۔ انہیں کے ساتھ وہ سبز عمامے والے حضرت کون گزر رہے ہیں؟ سبز عمامہ یہاں نشانِ سیادت ہے۔ سیّد سب سبز عمامہ پہنتے ہیں۔ اور یہ امتیاز اُن کے لئے مخصوص ہے اور کوئی سبز عمامہ نہیں پہن سکتا۔ اچھا تو یہ حضرت خاندانِ نبوّت کی یادگار ہیں۔ ان کے برابر ایک ٹوپی پوش فرنگی گذر رہا ہے۔ لیکن کس سادگی سے وہ سمجھتا ہے۔ کہ ہم جا دیگرے نسبت۔ نہ ہمارے ان حضرات کو یہ خیال ہے۔ کہ اس سے چھو گئے۔ تو دامنِ

عبا پلید ہو جائے گا۔ سامنے سے ایک ارمنی پادری آرہا ہے۔ سیاہ جوغہ کُھلی آستینیں سیاہ اُونچی ٹوپی۔ بہت بڑی داڑھی اور بال لمبے جنہیں وہ چوٹی کی طرح لپیٹ کر پیچھے لٹکائے ہوئے ہے۔ یہ نئی چیز دیکھنے میں آئی۔ یہی وہ عالی جناب ہیں۔ جو اکثر پیکے چپکے بکھیڑے کھڑے کر دیا کرتے ہیں۔ اس وقت تو بہت بھولے بھالے اور غریب سے نظر آتے ہیں۔ اور نہایت امن پسندی سے جا رہے ہیں۔ مگر ہیں طرفہ معجون مرکّب۔ عادات میں مشرقی۔ تعصب میں مغربی۔ آزادی کی اہلیت کم۔ مگر شوق زیادہ۔ لیکن ان کے دیکھنے میں کون زیادہ وقت صرف کرے۔ ان سے بڑھ کر ایک قابل توجہ نظارہ موجود ہے۔ وہ سیاہ ریشمی بُرقعے سے کیا چلے آرہے ہیں۔ آہا یہ تُرک مستورات ہیں۔ ترکوں کی اکثر رسمیں مغربی اور مشرقی تمدن کی ترکیب سے پیدا ہوتی ہیں۔ ان ہی میں ان کا پردہ ہے۔ جو نہ ہندوستان کے مسلمان شرفا کے ہاں کے پردے کی طرح حد سے بڑھا ہوا ہے۔ اور نہ یورپ کی بے پردہ قوموں کی طرح عورتوں اور مردوں کے بے باکانہ خلا ملا کی اجازت دیتا ہے۔ ہاں یہ ہے کہ ترکی عورتیں اپنے خاص برقعے پہن کر گھر سے نکلتی ہیں۔ بازار میں سودے خریدتی ہیں۔ ریل پر سوار ہوتی ہیں۔ جہاز پر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتی ہیں۔ مگر کیا ریل پر کیا جہاز میں ان کے لیے مردوں سے علیحدہ جگہ بنی ہوئی ہے۔ برقعہ عموماً ریشمی ہوتا ہے اور وہ کام دیتا ہے۔ جو ایک نہایت کھلی ساڑھی (جو انگریزی لباس کے اوپر اس لباس کو ڈھانپنے کے لئے باندھ لی جائے) دے سکے۔ ایک سیاہ ریشم کا نقاب منہ پر پڑا رہتا ہے۔ گو بعض سن رسیدہ عورات یا بعض منچلی نوجوان عورتیں اسے اُٹھا کر بھی چلتی ہیں۔ مستورات کے اُس جھنڈ میں جو نظر آیا تھا۔ ایک حبشی عورت بھی ہے۔ جو منہ سے نقاب اُلٹے ہوئے پیچھے پیچھے چل رہی ہے۔ یہ کوئی خادمہ ہے۔ جسے انہوں نے ساتھ لیا ہوا ہے لیکن حبشی عورت اپنے ملک کی اکیلی قائم مقام نہیں۔ جو اس پُل پر اس وقت چل رہی ہے۔ دو تین

حبشی مرد بھی چلے جا رہے ہیں۔ وہی چپٹی ناک۔ وہی سفید نہایت سفید دانت وہی موٹے موٹے ہونٹ۔ لباس پورا ترکی۔ یعنی عمدہ یورپین فیشن کا کوٹ پتلون اور اُس پر ترکی ٹوپی۔ صورت سے خوش حال معلوم ہوتے ہیں۔ ایک کی جیب سے سونے کی زنجیر بھی آویزاں ہے۔ یہ کون ہیں۔ اور کیا کام کرتے ہیں۔ کسی سے پُوچھو تو سہی۔ جواب یہ ملتا ہے۔ کام یہ کیا کریں گے۔ کسی بڑے حرم کے خواجہ سرا ہیں۔ چونکہ یہ قدیم رسم بڑے بڑے گھروں میں اب تک باقی ہے۔ یہ چند نمونے راہگزروں کے جو ہم نے انتخاب کیئے۔ ان سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ سب سفید پوش اور خوش حال ہی پُل پر سے گزُرتے ہیں۔ پھٹے کپڑوں والا غریب سائل بھی وہیں ہے۔ ایک طرف ایک نابینا حافظِ قرآن آیاتِ قرآنی بآواز بلند پڑھ رہا ہے۔ کہ کوئی اُس کی حالت پر رحم کھائے۔ اور اُسے کچھ دے جائے۔ کہیں مٹھائی والا مٹھائی بیچ رہا ہے۔ کہیں شربت والا شربت پینے کے لئے ہر ایک کو بُلاتا ہے۔ ایک سقّا بھی ہے۔ جو محض ٹھنڈا پانی پلا کر دھیلہ پیسہ لے لیتا ہے۔ مگر یہ سقّا ہمارے ہاں کے سقے کی طرح ایک بھاری چمڑے کی کھال کندھوں پر لادے ہوتے نہیں ہے۔ بلکہ ایک شیشہ پانی کا ہاتھ میں لئے ہے۔ جو ہمارے ہاں کے گلاب یا بید مشک یا کیوڑے کے شیشے کی طرح ٹوکرے میں رکھا ہوا ہے۔ اور اس میں سے پانی نکال نکال کر گلاسوں میں لوگوں کو پلاتا ہے۔ غرض استنبول کے اس ایک مقام کی رنگا رنگی کے بیان سے بھی قلم عاجز ہے۔ بہتر ہے کہ اب اس منظر کو چھوڑ کر کسی اور منظر کو لیں۔

والور۔ پُل کے وسط کے قریب جہاں ہم کھڑے یہ سیر دیکھ رہے ہیں۔ ایک کھڑکی کے گرد ہجوم ہے۔ لوگ کہیں جانے کے لئے ٹکٹ لے رہے ہیں۔ آئیے ہم بھی ٹکٹ لے لیں۔ ٹکٹ گھر کے پاس چند زینے نیچے اُتر کر ایک سیڑھی لگی ہے۔ اُس سے تختۂ جہاز پر چڑھ جائیے۔ جہاز دُخانی ہے۔ اسے عربی اور ترکی میں والور

کہتے ہیں۔ (یہ لفظ اصل میں فرانسیسی سے لیا گیا ہے) یہ جہاز مخصوصہ کمپنی کا
ہے جس کے جہاز استنبول کے قرب و جوار میں کئی دفعہ آتے جاتے رہتے ہیں
ان کا انتظام خاصہ ہے۔ اسی قسم کے جہازوں سے جو ہم نے اور جگہ دیکھے ہیں کسی
طرح بڑے نہیں۔ ہاں یہ فرق ضرور ہے۔ کہ کھانے پینے کی چیزیں بجائے ایک خاص حصہ
جہاز میں گراں قیمت پر ملنے کے تختۂ جہاز پر ارزاں بکتی ہیں۔ مسافروں کی آسائش
کے لئے متفرق چیزیں بیچنے والے کمپنی کی اجازت سے جہاز پر آجاتے ہیں۔ اور لوگ
بیٹھے کھاتے پیتے چلے جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ جہاز سقوطری کی طرف جسے
اسکوتری ابھی کہتے ہیں۔ اور قسطنطنیہ کا ایشیائی حصہ ہے۔ جارہا ہے۔ چلتے کو
بیس منٹ ہوئے ہوں گے کہ ہم ساحل ایشیا پر آپہنچے۔ کیا کہوں کن خیالات کا
ہجوم اس وقت دل پر ہوا۔ جس دن سے خاک پاک ایشیا کو چھوڑ کر یورپ آیا ہوں۔
اس دن سے اس مبارک سرزمین کے ساتھ محبت اور بڑھ گئی ہے۔ خیال آیا۔ کہ گو
وطن سے ایشیا کا گوشہ نہایت دُور ہے۔ پھر بھی ایشیا ہے۔ جسے دو سال بعد دیکھنا
نصیب ہوا ہے۔ اس سے مسرت ہوئی۔ ساتھ ہی خیال آیا۔ کہ ابھی پھر یورپ واپس
جانا ہے۔ اور وطن پہنچنے میں ابھی عرصہ باقی ہے۔ اس سے قلق ہوا۔ اتنے میں عقل
نے دل کو سمجھانے کی کوشش کی۔ کہ لنڈن بیٹھے وطن سے جتنی دُور تھے۔ دونوں کے
حساب سے دیکھو۔ تو ایشیا کے اس کنارے پر اس سے زیادہ دُور ہو۔ اگر بغداد کی
ریل بن چکی ہوتی۔ جب کسی قدر قریب ہوتے۔ آخر سب خیالات اور دلائل پر یہ خیال
غالب آیا کہ یہ ایشیا ہے۔ اگر اس میں کچھ شک بھی ہوتا۔ تو چند قدم چلنے میں شک
رفع ہو جاتا۔ گاڑیاں ایشیائی وضع کی مسافروں کو لینے کے لئے کھڑی ہیں۔ گاڑی
والے مسافروں کو بلانے میں اسی طرح ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ جیسے ہمارے
ہاں ہوتا ہے۔ گاڑیوں کے اڈے سے آگے چلیں۔ تو کئی دکانیں میوہ اور سبزی

بیچنے والوں کی ہیں۔ کہیں خربوزوں کے ڈھیر زمین پر لگے ہوئے ہیں۔ اور کہیں تربوزوں کے غریب لوگ وہیں خرید کر پاس بیٹھے کھا رہے ہیں۔ نانبائی کی دکان نان کباب گرما گرم کی دعوت دے رہی ہے۔ سگ و درویش شہر کے یورپی حصے میں بھی موجود تھے۔ مگر معلوم ہوتا تھا۔ کہ پہچانتے ہیں۔ کہ یورپ میں ہیں۔ یہاں وہ آگاہ معلوم ہوتے ہیں۔ کہ ایشیا ہے۔ اور وہ آزاد ہیں۔ اور کوئی آزاد ہو یا نہ ہو۔

ترکی قبرستان:۔ شہر کا چکر ختم کر کے بیرون شہر نکل جائیں۔ تو عجب عبرت خیز نظارہ پیش نظر ہوتا ہے۔ اس کو ذرا کا قبرستان میلوں میں ہے۔ اور سرو جو یہاں خفتگان خاک کی پاسبانی کرتے ہیں۔ سمندر سے ہی نظر آتے ہیں اس قبرستان کی تاریخ تو خدا ہی جانے۔ صدیوں سے آباد ہے۔ اسے دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے۔ جیسے شہر میں زندہ کوئی نہ ہوگا۔ اور شہر کی آبادی دیکھ کر (خدا اُسے چشم عالم سے بچائے) یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کوئی مرتا نہیں۔ ان قبروں کو ذرا غور سے دیکھنے سے پہلے ایک فاتحہ پڑھ کر ان دلبروں کے حق میں دعائے مغفرت کر لیں۔ جنہوں نے زمانۂ گذشتہ میں اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر ایشیا کا سکہ یورپ کے دل پر بٹھانے کی خاطر سرحد یورپ کو اپنا مدفن بنایا ہے۔ فاتحہ پڑھتے وقت حضور قلب حاصل کرنے کے لئے آنکھ خود بخود بند ہو گئی۔ بعد فاتحہ جو آنکھ کھلی۔ تو یہاں کے قبرستان کا ایک نیا دستور نظر آیا۔ ہر قبر پر ایک بڑا پتھر کا کتبہ ایستادہ ہے جس پر عربی یا ترکی میں مرحوم کے اوصاف لکھے ہیں۔ اور اس کے لئے دعائے خیر لکھی ہے۔ اور اس پتھر کے سر پر یا عمامے کی صورت ہے یا ترکی ٹوپی کی۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اس تربت میں مرد مدفون ہے۔ عورتوں کی تربت کے لئے نشان جدا ہے۔ جو عموماً ایک سنہری سا پھول ہوتا ہے۔ اگر کوئی عورت بیاہ کے بغیر مر گئی ہو۔ تو اس کے کتبے کی زینت خاص کوشش سے کی جاتی

ہے۔ گویا جس زینت سے وہ محروم گئی۔ اس کا کچھ حصہ اس کے مدفن کو دیا جاتا ہے۔ مجھے یہ رسم نہایت دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔ گو میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ اس کے جائز نہ جائز مناسب نامناسب ہونے کے متعلق بزرگانِ دین کی کیا رائے ہو۔

ترکی قہوہ خانہ:۔ یادِ رفتگان گو ہمارا ایک فرض ہے۔ اور اسی لئے اس کا ادا کرنا لازم سمجھا۔ لیکن زندوں کو زندوں سے زیادہ کام ہے۔ اور میں جانتا ہوں۔ کہ اکثر احباب کہیں گے۔ کہ ناظر کے ذکر میں پہلے سے ہی اسے قبرستان کہاں سے یاد آگیا۔ اچھا تو آیئے۔ اپنی کوفت رفع کیجیے۔ جہاز کا وقت آگیا ہے۔ اس میں سوار ہو لیجیے۔ بستا لیجیے۔ کچھ برف وغیرہ کا شوق ہو۔ تو کھا لیجئے۔ ایک یا دو گھنٹے میں آپ کو پھر پل پرے چلتا ہوں۔ اور اس پر سے استنبول کی طرف جاتے ہوئے۔ جو پہلا قہوہ خانہ آئے گا۔ وہاں آپ کو بٹھا دوں گا۔ بیٹھے بیٹھے جہان کی سیر کرتے رہیے گا۔ استنبول میں یوں تو سینکڑوں ریسٹوران یورپی نمونے کے ہیں۔ مگر اُن کی کیفیت سے عام طور پر معلوم ہوتا ہے۔ کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتے اور نہ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ہاں ترکی قہوہ خانہ یہاں کا ایک عجوبہ ہے۔ فرانس اور انگلستان وغیرہ میں جو رونق شراب خانوں کو ہے۔ وہ یہاں قہوہ خانوں کو ہے۔ جس طرح وہاں غریب سے غریب مزدور بھی تھوڑی سی شراب پینے شراب خانے میں ضرور جاتا ہے۔ اسی طرح یہاں کے مزدوری پیشہ اور کام کاج والے لوگ اور بہت سے بے کار لوگ بھی قہوہ خانے کو رونق دیتے ہیں۔ تیسرے پہر قہوہ جی یعنے قہوہ بیچنے والا چھوٹے چھوٹے رسیوں سے بنے ہوئے مونڈھے دُکان کے باہر فرش پر قطار در قطار رکھ دیتا ہے۔ یہاں تک کہ راستہ قریب قریب رُک جاتا ہے اور لوگ آکر اُن پر بیٹھنے شروع ہوتے ہیں۔ کوئی تو دن بھر کی محنت سے تھک کر آتے ہیں۔ اور آرام کے مستحق ہوتے ہیں۔ کوئی گھر کے آرام سے اُکتا کر باہر

نکل آتے ہیں۔ کہ راہگزر کے تماشے سے دل بہلائیں گے۔ وہیں حُقّہ پیتے ہیں۔ وہیں
قہوہ کی کئی کئی پیالیاں پی جاتے ہیں۔ اور اکثر ہاتھ میں تسبیح لے آتے ہیں۔ اِسے
بھی ہلاتے رہتے ہیں۔ یہاں عجیب عجیب فیشن نظر آتے ہیں۔ ایک کا انداز دوسرے
سے جُدا ہوتا ہے۔ مگر عادات میں اتحاد ہے۔ شطرنج کا شوق بہت عام ہے۔ اور
ہر قہوہ خانے میں کئی کئی شطرنج بچھے رہتے ہیں۔ اور ہر وقت لوگ کھیلتے رہتے ہیں۔
آپ کو اگر قہوہ کا شوق نہیں۔ تو شربت یا کوئی اور ایسی ہی چیز مانگ لیجیے۔ اور اس
گروہ کا جو یہاں جمع ہو رہا ہے۔ جزو بن جائیے۔ پھر دیکھیے۔ اگر گھنٹوں بیٹھنے کے
بعد بھی آپ کا جی اُکتا جائے۔ یہاں جو طرح طرح کے لوگ سامنے سے گذر رہے ہیں وہ آپ
کو تماشا سمجھتے ہیں۔ اور گھورتے ہیں۔ آپ اُنہیں تماشا سمجھئے۔ اور گھور لیجے بعوض
معاوضہ گلہ ندارد۔

ہیرو کا مشہور مدرسہ

ضلع مڈلیکس میں جو وسط انگلستان میں ہے۔ ایک چھوٹی سی مگر خوشنما پہاڑی پر ایک بڑا نامدرسہ ہے جس کی شہرت دُور دُور ہے۔ اس مدرسہ کی بدولت یہ چھوٹا سا قصبہ بھی جسے ہیرو کہتے ہیں مشہور ہو گیا ہے۔ اور ہیرو کے مدرسے کا معلّم اوّل ہونا علم و فضل کے درجۂ بلند کا ثبوت سمجھا جاتا ہے۔ چند سال ہوئے۔ ہندوستان کے لاٹ پادریوں کے لاٹ یعنی کلکتہ کے لارڈ بشپ پادری ولڈن صاحب تھے۔ اس عہدۂ جلیلہ پر مقرر ہونے سے پہلے پادری ولڈن صاحب ہیرو کے مدرسہ ہی کے افسر اعلیٰ تھے۔ انگلستان کے مشاہیر اور وزراء اور مدبر عموماً اس مدرسہ یا اس کے دوسرے حریف ایٹن کے مدرسہ کے تعلیم یافتہ ہوئے ہیں۔ اور ان لوگوں کو عموماً اپنے اپنے مدرسہ سے ایسا اُنس ہوتا ہے۔ کہ باپ کے بعد بیٹا اسی مدرسے میں پڑھنے جاتا ہے۔ اور بیٹے کے بعد پوتا شوق سے اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلنے کا منتظر رہتا ہے۔

۱۶ جولائی ۱۹۰۶ء کو اپنے ہم وطنوں کی ایک جماعت کے ہمراہ مجھے اس مشہور تعلیم گاہ کو سرسری طور پر دیکھنے اور اس کے حالات سُننے کا اتفاق ہؤا۔ مسٹر کولڈسٹریم صاحب نے غالباً پادری ولڈن صاحب کے توسط سے اس سیر کا انتظام کیا تھا۔ ہمارے لئے یہ سیر نہایت پُر لطف اور مُفید ثابت ہوئی۔ مدرسہ کے کتب خانہ کے محافظ مسٹر لاسیل صاحب جو فضیلت اور خوش خلقی کے جامع معلوم ہوتے تھے۔

مدرسہ کے دروازہ پر ہمیں ملنے کے لئے تشریف فرما تھے۔ اور سب سے پہلے ہمیں ایک بڑے کمرے میں لے گئے جسے اس مدرسہ میں "سپیچ روم" یعنی تقریر کا کمرہ کہتے ہیں۔ اس میں ایک ہزار آدمی کی نشست کی جگہ تھی۔ گو اس کا رقبہ بادی النظر میں یہ امید نہ دلاتا تھا۔ لیکن انگلستان اور دیگر ممالک یورپ میں جوجا بجا تمام ایسے مقامات میں تھیٹر کے طریق پر سیڑھیاں بسیڑھیاں بنا کر اور تعمیر کی صورت گول رکھ کر تھوڑی جگہ میں بہت سے آدمی بٹھانے کی ترکیب مروّج ہے۔ اس سے یہاں بھی کام لیا گیا تھا۔ یہاں ہمیں بٹھا کر لاسیل صاحب نے کہا۔ کہ اس مدرسہ کو ہندوستان سے چند خاص تعلقات حاصل ہیں۔ اوّل نوجوانانِ ہند میں ایک معقول تعداد سالہا سال تک اس مدرسہ سے جاتی رہی ہے۔ اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ اور اس ضمن میں لارڈ لٹن سابق وائسرائے ہند کا نام خصوصیت سے لیا۔ سب سے زیادہ جوش کے بعد جو نام ہماری جماعت نے سنا۔ وہ سر ولیم جونز مرحوم کا نام تھا۔ جس نے علوم سنسکرت کی تحصیل میں کمال پیدا کیا۔ اور علوم مشرقی کی قدردانی کی بنیاد اپنے ملک میں ڈالی۔ ولیم جونز نے اسی چار دیواری میں ابتدائی تربیت پائی تھی۔ اور اس وسیع علم کا جس کے سبب سے وہ مشہور ہے۔ بیج پہلے پہل اس کے دل میں یہیں بو یا گیا تھا۔ اس تمہید کے بعد لاسیل صاحب نے مدرسہ کی ابتدائی کیفیت ہمیں سنائی۔ کہ پہلے یہ مدرسہ ایک شخص لائن نامی کی وصیت سے بہت سے چھوٹے پیمانے پر اور بہت ہی محدود غرض سے قائم کیا گیا تھا۔ اس کا ابتدائی منشا مذہبی تھا۔ اور چونکہ لوگ اس زمانے میں لاطینی زبان کو بہت مقدس مانتے تھے۔ اس لئے اس کی وصیت صرف لاطینی پڑھائے جانے کے متعلق تھی۔ رفتہ رفتہ جب مدرسے کو وسعت ہوئی۔ اس کے مقاصد بھی بڑھنے لگے۔ اور طالب علم اور مضامین سیکھنے کی خواہش ظاہر کرنے لگے اس پر مدت تک بحث رہی۔ کہ کیوں کر مدرسہ کے اصلی مدعا میں خلل اندازی کرنے کے

بغیر اور کسی مضمون کی پڑھائی۔ اس میں ممکن ہے۔ مگر آخر فیصلہ یہی ہوا۔ کہ ریاضی۔ تاریخ
جغرافیہ پڑھائے جائیں۔ اور یہ مقاصد وسیع ہوتے ہوتے یہ نوبت پہنچ گئی ہے۔ کہ اب
سب مضمون قریب قریب یہاں پڑھائے جاتے ہیں۔ اور علوم جدیدہ اور طبیعیات
وغیرہ عملی چیزوں کی تعلیم بھی جاری ہوگئی ہے۔ البتہ طالب علموں کو اختیار ہے۔ چاہے
السنۂ قدیمہ کے علم ادب کا نصاب پسند کریں۔ اور چاہے زیادہ عملی اور مفید
نصاب طبیعات وغیرہ کا لے لیں۔ لاسیل صاحب نے یہ بھی بیان کیا۔ کہ عام طور
پر گمان کیا جاتا ہے۔ کہ ہیرو بہت دولت مند تعلیم گاہ ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے۔
کہ اس کے پاس سرمایہ بہت ہی برائے نام ہے۔ اور وقتاً فوقتاً اور عمارات بڑھانے
اور زمینیں خریدنے اور اور فوائد زیادہ کرنے کے لئے روپیہ چندہ کے ذریعے سے مدرسہ
کے معاونوں اور ہوا خواہوں سے مانگنا پڑتا ہے۔ غرضیکہ مدرسہ بالکل مکمل نہ سمجھنا چاہئے
چنانچہ یہ "سپیچ روم" بھی خاص چندہ سے تیار کیا گیا ہے۔ کیونکہ بڑے مجمعوں کے لئے
اس کی اشد ضرورت تھی۔ اور ہر سال کے سال اس میں ایک بڑا جلسہ ہوتا ہے جس میں
ملک کے اکثر شرفا شوق سے آتے ہیں۔ اور لڑکوں کو انعام ملتے دیکھتے ہیں۔ اور اُن
کی مفید تقریریں سنتے ہیں۔ اسی واسطے اس دن کو "سپیچ ڈے" یعنی روزِ تقریر کہتے
ہیں۔ کرسیوں کی طرف دیکھ کر لاسیل صاحب بولے۔ کہ ابھی اس کمرہ میں کرسیاں بھی
تو ہمارے حسب منشا موجود نہیں ہیں۔ چاہئے یہ کہ سارے ہال میں عمدہ لکڑی کی
ایک رنگ کرسیاں ایک ہی وضع قطع کی موجود ہوں۔ اس سے جگہ بھی کم رکتی ہے۔
اور وہ خوشنما بھی زیادہ معلوم ہوتی ہیں۔ اس سامان کے لئے روپیہ کی فکر تھی۔ ایک
مہربان خاتون نے تجویز پیش کی۔ مناسب ہے۔ کہ مدرسہ کے پرانے طلبہ سے درخواست
کی جائے۔ کہ اُن میں سے ہر شخص جو چاہے۔ اور توفیق رکھتا ہو۔ ایک کرسی کمرہ کی نذر
کر دے۔ اور اس کی پشت پر اپنا نام لکھوا دے۔ تاکہ مدرسہ میں اس کی یادگار بھی

رہے۔ اور مدرسہ پر بوجھ بھی نہ پڑے"۔ یہ ترکیب بہت کامیاب ہوئی۔ اور آٹھ سَو سے زیادہ کرسیاں اس طرح پرانے طلبا سے آچکی ہیں۔ ابھی پچھلی قطاروں میں چند بے جوڑ کرسیاں رکھی ہیں۔ مگر وہ بھی اب رفتہ رفتہ اٹھتی جاتی ہیں۔ اس تقریر کے بعد لاسیل صاحب ہمیں پُرانے مدرسہ کی طرف لے گئے۔ کمرہ سے نکلتے وقت ہم میں سے ہر ایک ایک خاص اثر اپنے دل پر لایا۔ جو خیالات میرے دل میں اُس وقت تھے۔ وہ یہ ہیں:-

۱۔ ہیرو جیسے بڑے اور نامی مدرسہ کی ابتدا معمولی ہی تھی۔ پس معمولی ابتدا کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیئے۔ کون جانتا ہے۔ کہ ہمارے ہاں تعلیم کی سرزمین میں جو چھوٹے چھوٹے پودے لگائے جا رہے ہیں۔ اُن میں سے کتنے ہیرو اور رائین بن جائیں گے۔ اگر ہمیں زمانہ نے مہلت دی۔ اور ہمارے قومی باغبان اُن پودوں کی خبر گیری سے غافل نہ ہو گئے۔

۲۔ ہیرو کو بھی آج تک روپیہ کی ضرورت ہے۔ اور قوم گھبراتی نہیں۔ اور روپیہ دیئے جاتی ہے۔ اور ہیرو میں بھی چندہ مانگنے کے لیئے وہ سب تدابیر کرنی پڑتی ہیں جس سے ہمارے ہاں کے تعلیمی کارکنوں کو سابقہ پڑتا ہے۔ اور جن سے وہ کبھی کبھی اُکتا جاتے ہیں۔ پس اُنہیں اُکتانا نہیں چاہیئے۔

۳۔ انگلستان میں بھی پہلے تعلیم گاہیں مکتب اور پاٹ شالا کی طرح تھیں۔ رفتہ رفتہ مکتب اور پاٹ شالا ترقی کرتے کرتے بڑے بڑے سکول اور کالج اور یونیورسٹیاں بن گئے ہیں۔ اور ان کو بھی مذہبی تعلیم کی جگہ یا اُس کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ کے داخل کرنے میں وہی مشکلات پیش آئی ہیں۔ جن کا ہم کو اس وقت سامنا ہے۔

۴۔ کرسیاں جمع کرنے کا چٹکلہ خاصہ رہا۔ کبھی کسی ایسی ہی ضرورت کے لیئے ہمارے قومی کالج اور مدرسے اور ان کے منتظمین بھی اس نسخہ کو برت کر دیکھیں۔

خیبر ہجوم خیالات کا ذکر تو پھر بھی ہو سکتا ہے۔ اس وقت سیر کی کیفیت کا بیان مقصود ہے۔ تقریر کے کمرہ سے نکل کر ہم پُرانے مدرسہ میں گئے۔ مدرسہ کا یہ حصّہ سُرخ اینٹوں کی ایک سادہ سی عمارت ہے۔ جس کے اندر لکڑی کی بنچیں رکھی ہیں۔ جو زمین سے کوئی دو بالشت اُونچی ہوں گی۔ گھِس گھِس کر اُن میں نشیب و فراز پیدا ہو گئے ہیں۔ جو نہایت چھوٹے پیمانے پر اردگرد کے قدرتی منظر کے نشیب و فراز سے مشابہ ہیں۔ ان چھوٹی بنچوں پر خدا جانے کتنی پشتوں سے طالب علم بیٹھتے رہے ہیں۔ دیواریں لکڑی کے تختوں سے منڈھی ہوئی ہیں۔ اور اُن تختوں پر اکثر طلبہ اپنا اپنا نام کندہ کر گئے ہیں۔ اسی کمرہ میں ایک تختہ پر ولیم جونز نے بھی اپنی طفولیت میں اپنا نام لکھا ہے۔ نام قائم رکھنے کا یہ شوق بھی قدرت نے ہر سینہ میں عجیب چیز پیدا کی ہے۔ طرح طرح سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ لیکن مشہور عمارات کی دیواروں پر نام کریدنا اس کی عام ترین اور شاید سب سے ادنیٰ صورت ہے۔ بعض تو ایسے نام ایسی دیواروں پر کندہ ہیں۔ کہ دُنیا اُن سے بے خبر ہے۔ اور دیواریں بھی کچھ نہیں بتاتیں۔ کہ وہ لوگ کون تھے۔ اور کیا ہوئے۔ لیکن کئی ایسے بھی ہیں۔ کہ وہ دیواروں سے اُڑ کر صفحۂ ہستی پر منقوش ہو گئے ہیں۔ اور پکار پکار کر کہہ رہے ہیں۔ ع

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

ولیم جونز کا نام بھی اُنہی ناموں میں ہے۔ بچپن میں جب اُستاد اور ہم سبق دونوں کی نظر بچا کر دیوار پر نام کریدرہا ہو گا۔ اُسے کیا خبر ہو گی۔ کہ تقدیر اُس کا نام علوم مشرقی کی لوحِ پائدار پر کندہ کر رہی ہے۔ اور اس کے نام کو حیاتِ جاوید کا خلعت بخشا جا رہا ہے۔

ہرانے مدرسہ کی سیڑھیاں اس تعلیم گاہ میں ایک خاص رسم سے منسوب ہیں۔ ایک اُستاد دن میں دو دفعہ ان پر کھڑے ہو کر حاضری پکارتا ہے۔ اور لڑکے

اپنی اپنی حاضری دے کر کھسکتے جاتے ہیں۔ یہ سیڑھیاں اُتر کر ایک خاصہ وسیع صحن ہے۔ جس میں پکا فرش ہے۔ مگر سڑک سے جو مدرسے کے پاس جا رہی ہے۔ یہ صحن بھی مرتفع ہے۔ اور مدرسہ کی تعمیر کی دوسری طرف بہت نشیب میں ہے۔ اس لئے اس صحن میں کھڑے ہو کر دُور تک گرد و نواح کے سبزہ زار کا نہایت فرحت بخش نظارہ دکھائی دیتا ہے۔ اس عمارت اور مدرسہ کے متعلق ایک اور چھوٹی سی عمارت کے درمیان ایک ٹکڑا زمین کا کوئی سات آٹھ گز لمبا اور پانچ گز چوڑا بیکار پڑا ہوا ہے جس پر کوئی عمارت نہیں۔ ہم نے پوچھا۔ یہ کیوں بے کار پڑا ہے۔ تو جواب ملا۔ محض قدامت پرستی کی وجہ سے ایک زمانے میں یہ لڑنے کی جگہ تھی۔ کہ مدرسہ میں اگر دو طالب علم کسی وجہ سے لڑیں۔ تو اور کسی حصے میں لڑنے کی اجازت نہ تھی۔ مگر اس چھوٹے سے ٹکڑے پر کھڑے ہو کر لڑنا اور ایک دوسرے کو مکے مارنا مباح تھا۔ اب وہ رسم عرصہ سے موقوف ہو گئی۔ مگر اس کا نام قطعہ زود کوب ہی رہا۔ اور اس لئے کوئی اس پر عمارت بنانے کی جرأت نہیں کرتا۔ ہندوستان میں یہ بات عام طور پر معلوم نہیں ہے۔ کہ انگریز قدامت پرستی اور اپنی پرانی رسوم بلکہ توہمات تک کی پابندی میں کسی سے کم نہیں۔ یہاں آکر کوئی غور سے دیکھے۔ تو چپے چپے پر ان کے پابندِ رسوم ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

پرانے مدرسے سے نکل کر کتب خانے کی طرف آئیے۔ ان دو نو عمارتوں کے درمیان سڑک حائل ہے۔ کتب خانے کی عمارت نسبتاً نئی اور زیادہ خوشنما ہے اس کا موقع نہایت ہی عجیب واقع ہوا ہے۔ اور اس کی کھڑکیوں سے وسطِ انگلستان کی قدرتی سبزی کا بہترین نمونہ نظر آتا ہے۔ کتب خانہ میں تمام نامور طلبہ اور اساتذہ کی بڑی تصویریں آویزاں ہیں۔ اور کوئی گیارہ ہزار کتابیں مختلف علوم کی موجود ہیں۔ اور دو اڑھائی سَو کتابیں بالاوسط ہر سال نئی خرید کے بڑھائی جاتی ہیں۔ بعض پرانے خطوط

اور مشاہیر کی اور نشانیاں اسی کمرہ میں شیشہ کی الماریوں میں سجی ہوئی ہیں۔ اور ہر اعتبار سے یہ کمرہ ایسا ہے جس میں بیٹھ کر پڑھنے کو بے اختیار جی چاہتا ہے۔

کتب خانہ کے قریب ایک دوسری عمارت ہے جو اس مدرسہ کا عجائب خانہ ہے یہاں یہ دستور ہے کہ ہر مدرسہ کے ساتھ سبق الاشیاء کے طور پر ایک عجائب خانہ رہتا ہے کہ جن چیزوں کا ذکر طالب علم پڑھیں۔ اُن کو اپنی آنکھ سے دیکھ بھی لیں تاکہ جو کچھ پڑھیں اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔ مگر یہ عجائب خانہ اس مدرسہ کی شان کے لائق ہے۔ کیونکہ مدرسوں کے معمولی عجائب خانوں سے زیادہ وسیع پیمانے پر ہے۔ ایک حصہ علوم طبیعات جدیدہ کے لئے مخصوص ہے۔ اور دوسرا کلاسیک یعنی علوم قدیمہ کے لئے ہے۔ اور دونوں کثرت سے استعمال کئے جاتے ہیں۔

اس کے قریب ایک گرجا ہے۔ جو یہاں ہر تعلیم گاہ کے ساتھ ہونا لازم سمجھا جاتا ہے۔ اس گرجے میں طلبہ اور اساتذہ ہر اتوار کو عبادت کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ اس کی تعمیر بھی مذہبی خیال کے لوگوں کے چندہ سے ہوئی تھی۔ یہ بات مجھے بہت دلچسپ معلوم ہوئی۔ کیونکہ یہ بعینہ اسی خیال کا پرتو ہے۔ جس سے بہت مخیر ہمارے ملک میں تعلیم گاہ کی مدد پر اس تعلیم گاہ کے احاطہ میں ایک عبادت گاہ بنانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور کارکن ان کی امداد کو بھی خوشی سے قبول کرتے ہیں کیونکہ وہ بھی ضروری کام ہے۔ اور ہر شخص حق رکھتا ہے۔ کہ اس چیز میں مدد دے جو اس کے خیال میں زیادہ وقعت کے قابل ہو۔ ذرا سی تلاش سے یہاں اور وہاں کی بہت سی باتیں مشترکہ ملتی ہیں۔ اور کیوں نہ ہو۔ فطرتِ انسانی تو آخر ہر جگہ ایک ہی ہے۔

ہیرو کے مدرسہ کے طلبا کی موجودہ تعداد پانچ اور چھ سو کے درمیان ہے اُن کے جھنڈ کے جھنڈ ہم نے جماعتوں سے نکلتے یا جماعتوں میں جاتے دیکھے۔ سب کی ایک وردی تھی۔ سیاہ صدری اور سیاہ کوٹ۔ کوٹ کی تراش بالکل

ویسی تھی۔ جو انگلستان میں عام طور پر شام کے لباس کے ساتھ پہنا جاتا ہے۔ یعنی جو آگے سے چھوٹا اور پیچھے کی طرف لمبا ہوتا ہے۔ آج کل غالباً موسم گرما کی وجہ سے سب خود رنگ فلالین کی پتلونیں پہنے تھے۔ اس لباس سے یہ جہاں سوں پہچانے جاتے ہیں۔ اور یہ یک رنگی بھلی معلوم ہوتی ہے

طلبہ کی بود و باش کے لئے ہیرو میں کوئی بڑا بورڈنگ نہیں ہے۔ اور نہ اُن کے قیام کی کوئی جگہ مدرسہ کی کسی تعمیر سے ملی ہوئی ہے۔ بلکہ اس کی بجائے یہ انتظام ہے۔ کہ قصبہ بھر میں جا بجا مکان مدرسہ والوں کی منظوری سے مقرر ہیں۔ جن میں ہر ایک میں بیس پچیس طلبہ کی سکونت ہے۔ اور ہر گھر میں اُن کی نگرانی پر ایک ماسٹر مقرر ہے۔ افسوس کہ ان گھروں میں سے کسی کو دیکھنے کا ہمیں موقع نہ تھا۔ اور اس لیئے اس طریق کے حسن و قبح پر کچھ رائے دینا مشکل ہے۔

جمناسٹک کی ورزش کے لئے ایک مکان قریب ہی موجود ہے۔ مگر گیند بلے وغیرہ کے لئے نہایت وسیع زمین کسی قدر فاصلہ پر ہے لڑکے کھیلتے بھی ہیں پڑھتے بھی ہیں۔ ایک دوسرے سے علمی ترقی میں مقابلہ بھی کرتے ہیں۔ اور اسی طرح رفتہ رفتہ دنیا وی زندگی کی جد و جہد کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ انگلستان کے ان بڑے مدارس کے طریق تعلیم پر بعض اعتراضات بھی کیئے جا سکتے ہیں۔ مگر اُن کے لئے علیحدہ مضمون درکار ہے ۔

نصائح رفاعیہ

مجھے استنبول کے سفر میں جو صحبتیں نصیب ہوئیں۔ اُن میں سب سے گہرا نقش دل پر اُس بزم مختصر نے چھوڑا۔ جو محمد ابو الہدیٰ سردار طریقت رفاعی کے ہاں دیکھی۔ یہ بزرگ تین سال سے مقربین بارگاہ سلطانی میں ہیں۔ اور دنیا کا زر و مال ان کے لئے ہر وقت حاضر ہے اس پر تواضع اور حسن خلق کا نمونہ ہیں اور دن رات سوائے یادِ حق اور تلقین شرع کے کوئی شغل نہیں رکھتے۔ ان کے دیکھتے دیکھتے کئی مجلسیں بنیں۔ اور کئی بگڑیں۔ کئی لوگ بڑھے۔ اور کئی گرے۔ مگر انہیں کسی سے سروکار نہ رہا۔ اور نہ ہے۔ ؏

رہتے ہیں سب کے درمیان سب سے الگ

ایک دن انہوں نے مجھے ایک چھوٹا سا رسالہ اُردو میں لکھا ہُوا عنایت فرمایا جس میں طریقہ مبارکہ رفاعیہ کے سب سے بڑے سرتاج حضرت سید احمد اکبر رحمۃ اللہ علیہ کے ایک سو اقوال کسی نے عربی سے ترجمہ کیے ہیں۔ میں نہیں چاہتا۔ کہ اس نعمت سے اکیلا مستفید ہوں۔ اس لئے ارادہ رکھتا ہوں۔ کہ اس رسالہ کو شائع کر دوں۔ پیشتر اس کے کہ وہ رسالہ علیحدہ چھپے۔ اور لوگ اس کے فیوض سے بہرہ اندوز ہوں۔ اُن نصائح میں سے بعض جو ہر ملت و مذہب کے اصحاب کے لئے یکساں دلچسپ ہیں۔ یہاں نقل کر دیتا ہوں۔ تاکہ اہل نظر دیکھیں۔ کہ حکمت کے کیسے دفتر ان مختصر فقروں میں بند کئے گئے ہیں:۔

(۱) ہمارا طریق ہے نہ مانگیں نہ پھیر دیں۔ اور نہ جمع کر رکھیں۔

(۲) دعویٰ تکبر کا نتیجہ ہے۔ دل اس کی برداشت نہیں کر سکتا۔ اور اسے زبان کی طرف پھینک دیتا ہے۔ احمق زبان اسے کہہ بیٹھتی ہے۔

(۳) تھوڑا ادب اچھا ہے۔ اُس علم و عمل سے جس کے ساتھ ادب نہ ہو۔

(۴) تیرا بھائی وہ ہے۔ کہ تیرا نفس اُس پر بھروسہ کرے۔ اور تیرے دل کو اس سے آرام ہو۔ اور تجھ کو خدا سے باز نہ رکھے۔

(۵) اللہ کے ساتھ رہ بہ صورتِ موافقت۔ خلق کے ساتھ بہ خیر خواہی۔ لیکن نفس کے ساتھ برسر پرخاش رہ۔

(۶) اُمید کو تازہ کرنا زمد ہے۔ نہ کہ کملی پہننا۔ اور موٹا کھانا۔

(۷) جس نے صبر کی زرہ پہنی شتاب کاری کے تیروں سے بچ گیا۔

(۸) حق خاص و عام کے دلوں پر پوشیدہ ہے۔ خواہ وہ حق پر ہوں۔ خواہ باطل پر۔

(۹) اعمال کے خرابوں کی مرمت خیال کے ہاتھوں سے نہیں ہو سکتی

(۱۰) بندۂ زر نہ خدا کا بندہ ہو سکتا ہے اور نہ خلقِ خدا کا دوست

(۱۱) مروّت کے معنے یہ ہیں کہ اپنے نفس پر اُس کی طاقت سے بڑھ کر بوجھ ڈالے

(۱۲) جب علم کسی راہ میں منزل بناتا ہے۔ تو جہل کو وہاں سے کوچ [illegible]

(۱۳) خوش خلقی فائدہ مند تجارت ہے۔ قناعت خزانہ ہے۔ دنیا لذّت گرفتار ہونا آبرو ہے۔ توکل پناہ ہے۔ اور عقل کشتی نجات

(۱۴) عذاب کی تلخی گناہ کی شیرینی کو بھلا دیتی ہے۔

(۱۵) دانشمند کا چراغ کبھی گل نہیں ہوتا اور نہ اُس کی [illegible]

کلیۂ کیمبرج

یونیورسٹی کا ترجمہ عموماً دارالعلوم کیا جاتا ہے۔ مگر مصر میں لفظ کلیّہ سے اس وقت یہی معنے لئے جاتے ہیں۔ مجھے یہ لفظ اختیار کرنے کے قابل معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اوّل تو لفظ ذا یونیورسٹی کا لفظی ترجمہ ہے۔ اور دوسرے مفرد ہونے کے سبب یا وہیں زیادہ مقبول ہونے والا ہے۔ کیمبرج یونیورسٹی دنیا کے مشہور ترین علمی مرکزوں میں سے ہے۔ اور انگلستان میں صرف ایک ہی کلیہ اس کے ہم پلہ ہے۔ یعنی آکسفورڈ۔ ان دو بڑے تعلیمی مقامات میں دیرینہ رقابت چلی آتی ہے۔ دونو ایک دوسرے کی عزت کرتے ہیں۔ اور دونو کے اساتذہ ایک دوسرے کی قابلیت کے معترف ہیں۔ لیکن ساتھ ہی دونو اپنی اپنی جگہ اپنے آپ کو افضل سمجھتے ہیں۔ ہمیں اُن کی اس تنازع سے سروکار نہیں۔ ہمارے نزدیک دونوں قابل شکریہ ہیں۔ کہ صدیوں سے علم کے دریا وہاں بہہ رہے ہیں۔ جن سے لاکھوں تشنہ کام سیراب ہو چکے ہیں۔ کوئی خوبی کسی میں زیادہ ہے۔ اور کوئی کسی میں۔ گذشتہ چھ سال میں کئی دفعہ میرا جی چاہا۔ کہ میں کیمبرج کے کچھ حالات لکھوں۔ لیکن دو وجہ سے میں نے اس ارادہ کو ملتوی رکھا۔ ایک تو یہ کہ میں نہیں چاہتا تھا۔ کہ کلیۂ آکسفورڈ دیکھے بغیر کیمبرج پر کچھ لکھوں۔ اور اتفاق ایسا ہوا۔ کہ کیمبرج میں کئی دفعہ جانا ہوا۔ مگر آکسفورڈ کی نوبت انگلستان سے روانہ ہونے کے قریب آئی۔ دوسری وجہ یہ تھی۔ کہ میں چاہتا تھا۔ کسی تعلیم گاہ کی نسبت کوئی رائے زنی عجلت میں نہ کروں۔ اس لئے اس مضمون کو آج

تک روک رکھا۔

کیمبرج کیا تھا؟ دریائے کیم کے کنارے چھوٹا سا قصبہ۔ مگر آج دُنیا کے مشہور اور قابل دید مقامات میں شمار ہوتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ قرونِ وسطیٰ میں بعض دیندار عیسائیوں نے مذہبی تعلیم کے لئے یہاں مدرسے کھولے۔ اور اس "تاریکی کے زمانے" میں یہاں علم کا چراغ روشن کیا۔ اُن کے جوش مذہبی کی پابندی سے نکل کر علوم متفرقہ کی تعلیم کا ذریعہ بن گئے۔ مذہبی رنگ کا اثر اب تک زور سے قائم ہے۔ کئی کالجوں کے صدر نشین اب تک بڑے بڑے پادری ہیں۔ طلبہ میں سے اکثر اب تک مذہبی تعلیم پانے۔ سندِ فضیلت حاصل کرنے اور اس کے بعد گرجے کی خدمت میں لئے جانے کی غرض سے کیمبرج آتے ہیں۔ بہت سے طالب علم ایسے بھی ہیں۔ کہ علوم جدیدہ کم اور الٰہیات زیادہ پڑھتے ہیں۔ اور الٰہیات کی تکمیل کے لئے لاطینی اور یُونانی کی تحصیل میں اسی طرح عمریں صرف کرتے ہیں۔ جیسے ہمارے مُلک کے مولوی عربی اور پنڈت سنسکرت کے حاصل کرنے میں۔

کیمبرج اور اکسفورڈ میں یونیورسٹی مراد ہے۔ چند کالجوں کے مجموعے سے جن سے ہر ایک اپنا علیحدہ سرمایہ اور علیحدہ آمدنی رکھتا ہے۔ اور اندرونی انتظام میں خود مختار ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اکثر حیثیتوں میں دوسرے کالجوں کے شریک حال ہے۔ ہر مضمون کے لئے یونیورسٹی کے مقرر کئے ہوئے اُستاد ہیں۔ اور جو سبق وہ پڑھاتے ہیں۔ اُن میں ہر کالج کا طالب علم جو وہ مضمون پڑھتا ہو۔ شریک ہوتا ہے۔ مگر اس کے سوا ہر کالج کے اپنے اتالیق علیحدہ ہیں۔ جو خاص اپنے ہاں کے طلبہ کو پڑھائی میں مدد اور مشورہ دیتے ہیں۔ اور اُن طلبہ کے چال چلن کے نگران ہوتے ہیں۔ کیمبرج اور اکسفورڈ کی بڑی خصوصیت وہاں کا قاعدہ سکونت ہے جس کے سبب ہر طالب علم مجبور ہے۔ کہ یا اپنے کالج کے بورڈنگ ہوس میں سکونت رکھے

یا شہر کے اُن چیدہ مکانوں میں جنہیں افسرانِ یونیورسٹی نے تحقیقات کے بعد قابلِ اطمینان قرار دیا ہو۔ اور جہاں ان قواعد کی پابندی ہوتی ہے۔ جو بورڈنگ میں رہنے والے لڑکوں کے لئے مقرر ہیں۔ چاشت اور دوپہر کا کھانا سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں کھاتے ہیں۔ مگر شام کے کھانے کے لئے انہیں اپنے اپنے کالج کے ہال میں حاضر ہونا پڑتا ہے۔ اور اپنے ہم مکتبوں کے ساتھ مل کر کھانا ہوتا ہے۔ ہال میں جانے کے لئے کالج کی وردی پہن کر جانا ضروری ہے۔ یعنے ہر طالب علم "کیپ" اور "گون" پہنے ہونا چاہئے۔ کیپ یونیورسٹی کی اصطلاح میں ایک چوگوشہ سیاہ ٹوپی ہے۔ جس سے ایک سیاہ ریشمی پھندنا لٹکتا رہتا ہے۔ شام کے بعد اگر کوئی طالب علم "کیپ" اور "گون" کے بغیر دیکھ لیا جائے۔ تو اُس پر جرمانہ ہوتا ہے۔ یا سخت باز پرس ہوتی ہے۔ اُن کی نگرانی کے لئے مُفتش مقرر ہیں۔ جنہیں وہاں کی اصطلاح میں پراکٹر کہتے ہیں۔ اور طالب علم کے لئے بعض اوقات اُن سے دوچار ہونا ایک سخت مصیبت کا سامنا ہوتا ہے۔ مُدعا اس سے یہ ہے۔ کہ اگر یونیورسٹی کا کوئی طالب علم شہر میں نکل کر کسی طرح کی بے قاعدگی کرتا ہو۔ تو جھٹ معلوم ہو جائے۔ اور یہ دھوکا نہ ہو۔ کہ طالب علم ہے۔ یا کوئی عام شہر والا۔

یہاں کے طلبہ کی طریقِ زیست کی یہ خصوصیت کہ مختلف کالجوں میں جُداگانہ زندگی بھی ہے۔ اور اس کے ساتھ مشترکہ زندگی بھی نبھتی ہے۔ کھیل کود اور ورزش کے معاملے میں خوب نظر آتی ہے۔ ورزش جسمانی کیمبرج میں تعلیم کا جزو ضروری ہے۔ اور ہر شخص قریب قریب کوئی نہ کوئی ورزش کرتا ہے۔ یوں تو گیند بلا فٹ بال ٹینس سب کھیل یہاں کھیلے جاتے ہیں۔ مگر کشتی چلانا سب سے مقبول ہے۔ کالج عموماً ندی کے کنارے بنے ہوئے ہیں۔ اُن کے عقب سے سیڑھیاں پانی میں اُترتی ہیں اُن سیڑھیوں کے قریب ہلکی کشتیاں کھڑی رہتی ہیں۔ بعض طالب علم اپنی کشتیاں

رکھتے ہیں بعض کرایہ پر لے لیتے ہیں ۔ تنہائی پسند آہستہ آہستہ اپنی کشتی آپ چلاتے ہوئے نظر آتے ہیں لطفِ صحبت کے شیدائی دو دو تین تین مل کر ایک کشتی میں بیٹھ جاتے ہیں ۔ اور باری باری کھیتے جاتے ہیں ۔ ہر کالج میں آٹھ چیدہ کشتی چلانے والوں کی ایک جماعت ہوتی ہے ۔ یہ کالجوں کے باہمی سالانہ مقابلے کے لئے مشق کرتے رہتے ہیں ۔ ابتدائے ماہ جون میں کشتیوں کی دوڑ ہوتی ہے ۔ اس وقت کالجوں کی باہمی رقابت کا تماشا دیکھنے کے قابل ہوتا ہے ہر کالج کے طلبہ اپنے کالج کی کشتی کے ساتھ ساتھ ندی کے کنارے دوڑتے اور دیوانہ وار شور مچاتے ہیں ۔ اپنے بہادروں کی ہمت بڑھانے کے لئے کبھی اپنے کالج کا نام لے کر نعرے لگاتے ہیں کبھی کشتی چلانے والوں میں سے ایک ایک کا نام لے کر تحسین و آفرین کہتے ہیں ۔ ندی کے دونوں کناروں پر زن و مرد تماشائی جمع ہوتے ہیں ۔ جو دُور دُور سے دوڑ کو دیکھنے آتے ہیں ۔ اس موقعہ پر اکثر طلبہ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو بیروں جات سے مدعو کرتے ہیں اور چند دن کیمبرج میں چہل پہل رہتی ہے ۔

یونیورسٹی کی مشترکہ زندگی کا سب سے بڑا مرکز وہاں کا "یونین" ہے ۔ سب کالجوں کے طلبہ اس میں شریک ہیں ۔ لڑکوں کی یہ سوسائٹی بڑی ہر دلعزیز ہے ۔ ایک طالب علم کے لئے کیمبرج میں یہ بہت بڑا اعزاز ہے ۔ کہ یونین کا پریذیڈنٹ منتخب ہو جائے ۔ پریذیڈنٹ تو ایک طرف نائب پریذیڈنٹ ہونا یا سیکرٹری ہونا بھی بڑا امتیاز ہے ۔ یونین میں مختلف مضامین پر ہفتہ وار نہایت پُرجوش اور لطیف مباحثے ہوتے ہیں ۔ بحث کے طریق میں پارلیمنٹ کے مباحثوں کی تقلید کی جاتی ہے ۔ گویا لڑکوں کے لئے فنِ تقریر کا ایک اعلیٰ درجہ کا مدرسہ ہے ۔ اور بسا اوقات ایسا ہوا ہے ۔ کہ کیمبرج کے ممتاز مقرر پارلیمنٹ کے نامی فصحا کی جماعت میں جا پہنچے ہیں ۔ مضامین کے انتخاب میں یہاں طلبہ کو کافی آزادی حاصل ہے

اور وہ بڑے بڑے سیاسی مسائل پر بھی بڑی عمدگی سے بحث کر سکتے ہیں۔ مناظرہ کے فریقین بڑے بڑے تیار ہو کر آتے ہیں اور مسئلہ زیر بحث کے متعلق پوری اطلاع بہم پہنچاتے ہیں۔ میں نے یونین کا مباحثہ سنا ہے پارلیمنٹ کی تقریروں سے اس کا رنگ ملتا ہے فرق صرف یہ ہے کہ بصورت سے لڑکپن کی و مغتنمت جوانی کا۔ یونین میں جو رائیں ظاہر کی جاتی ہیں۔ اُن پر پختگی کی مہر نہیں ہوتی کہیں کہیں خامی نظر آجاتی ہے مگر انہیں لوگوں میں سے چند آدمی جب پارلیمنٹ میں پہنچ کر ذمہ داری کے عہدوں پر سرفراز ہوتے ہیں۔ تو اس درجے کی متانت پیدا کرتے ہیں کہ اُن کا ایک ایک لفظ جچا تلا نکلتا ہے۔ اور ہر رائے غور و فکر کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔

کیمبرج میں اس وقت ہندوستانی طلبہ کی تعداد بھی خاصی ہے۔ اور وہ بھی یونین کی مجالس میں شوق سے شریک ہوتے ہیں بعض بعض نے اُس کے مناظروں میں نام بھی پیدا کیا ہے۔ پچھلے دنوں میں مسٹر ریڈی نام ایک صاحب مدراس کے گریجویٹ تھے۔ جو یونین کے سیکرٹری بھی رہے اور نائب پریزیڈنٹ بھی۔ نوجوان ہندوستانیوں میں بہت کم لوگ ایسے ہیں۔ جو اس خوبی اور فصاحت سے انگریزی میں تقریر کر سکیں۔ جیسے مسٹر ریڈی کرتے ہیں۔ کیمبرج میں تعلیم کی عجیب کیفیت ہے۔ یہ جگہ محنتی اور پڑھنے والے طالب علموں کے لئے ایسی ہی موزوں ہے جیسی آرام طلب اور نہ پڑھنے والے طلبہ کے لئے۔ انگلستان میں کسی شریف اور خوشحال آدمی کے لڑکے کے لئے کیمبرج یا آکسفورڈ میں تعلیم کے لئے بھیجا جانا ضروری ہے۔ مگر خوشحال لوگوں کی اولاد کی عادتیں عموماً زیادہ مسرفانہ اور اُن کی بود و باش زیادہ راحت پسند ہوتی ہے۔ اور انگلستان کچھ اس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں۔ وہ لڑکے وہاں کچھ شوقِ علم سے نہیں جاتے۔ بلکہ محض رسم کی پابندی سے کھنچتے ہیں۔ اگر وہاں نہ جائیں۔ تو ہم چشموں میں ذلیل سمجھے جائیں گے۔ مدرسہ سے

نکلے اور وہاں جا داخل ہوئے ۔ جوانی کے دن امیری کی وجہ سے مزاج میں لاپروائی ۔ اپنے ایسے فارغ البال نوجوانوں کی صحبت سمند ناز کے لئے تازیانہ بنتی ہے ۔ بجائے اس شوق کے تحصیل علم میں ایک دوسرے سے بڑھیں ۔ یہ مقابلہ کرتے ہیں ۔ کہ کون زیادہ خرچ کرتا ہے ۔ کپڑے کون اچھے پہنتا ہے ۔ ہمراہیوں کو کون زیادہ کھلاتا پلاتا ہے ۔ اور اس طرح نہ صرف اپنا وقت بیکار کھوتے ہیں بلکہ بہت سے متوسط درجے کے طالب علموں کو لے ڈوبتے ہیں ۔ مگر چونکہ عرصہ دراز سے ایسے طلبہ کیمبرج اور آکسفورڈ میں موجود چلے آتے ہیں ۔ اور جب تک قوم انگریزی کا متمول قائم ہے موجود رہیں گے ۔ اس لئے بہت سے سست طلبا کا گذارہ ، ان یونیورسٹیوں میں بلا تکلف ہو جاتا ہے ۔ مگر یہ جماعت بھی کیمبرج میں بالکل بیکار نہیں ۔ وہاں کی سوشل زندگی کا دارو مدار بہت کچھ ان پر ہے ۔ اور چونکہ کیمبرج کی سوشل زندگی ایک بڑی کشش ہے ۔ جو دُور دُور سے طلبہ کو کھینچتی ہے ۔ اس لئے یہ لوگ بھی اپنے کُلیہ کی آبادی کا باعث ہیں ۔ ایک خوبی بھی ان کی قابلِ داد ہے ۔ اور وہ یہ کہ ان میں سے اکثر کالجوں سے نکلنے کے بعد متین اور معقول آدمی بن جاتے ہیں ۔ اور طالب علمی کے زمانے کی بے اعتدالیاں اُن کی طبیعت پر بہت کم مستقل اثر چھوڑتی ہیں ۔ بخلاف ان کے ہمارے ہموطنوں میں سے اگر کوئی ان کی دیکھا دیکھی اس رنگ میں اُتر آئے ۔ تو اس کے لئے سنبھلنا مشکل ہو جاتا ہے ۔

کیمبرج میں جہاں ایک طرف یہ رنگین اور مسرف جماعت ہے ۔ وہیں دوسری طرف ایک معقول تعداد ایسے طلبہ کی ہے ۔ جو فی الحقیقت نشۂ علم میں سرمست ہیں یونیورسٹی کے کتب خانے اور لکچروں کے کمرے اُن کی دُنیا ہیں ۔ دوستوں سے ملتے ہیں ۔ مگر بقدر ضرورت ۔ کھاتے پیتے ہیں ۔ مگر بخیال صحت ۔ ورزش کریں گے ۔ تو صرف اتنی کہ جس سے صحت درست رہے ۔ سوتے جاگتے اُٹھتے بیٹھتے انہیں

ایک ہی دھیان ہے۔ اور وہ یہ کہ علم کی دولت کے ذخیرے جمع کرلیں۔ ہر فن کے مستند اُستاد یہاں کے ادیب ہیں۔ یہ شائقینِ علم اُن سے ملاقات پیدا کرتے ہیں۔ اور اُن کی صحبت سے مستفید ہوتے ہیں۔ اور جو کوئی اس صحبت سے فیض پانے کی اہلیت رکھتا ہو۔ اس کے لئے بہ اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ اور اصل منشاء تعلیم ایسی صحبتوں سے پُورا ہوتا ہے۔

کیمبرج اور آکسفورڈ کے اساتذہ بھی عموماً عجیب لوگ ہوتے ہیں۔ اُن میں سے اکثر اپنے اپنے فن میں سند اور حجت کا رتبہ رکھتے ہیں۔ اُس پر اُن کا عجز۔ اُن کا انکسار اُن کی سادگی دیکھنے کے لائق ہوتی ہے۔ طلبہ میں صرف انہی کو وہ منہ لگاتے ہیں جنہیں قابلِ تربیت پاتے ہیں۔ مگر اُن کے ساتھ اُن کا سلوک برادرانہ ہوتا ہے۔ وہ خود تمام عمر طلبِ علم ہیں بسر کرتے ہیں۔ اور اس لئے ایسے طالبِ علم کی جو سچ مچ طالبِ علم ہو۔ اُن کے دل میں خاص وقعت ہوتی ہے۔ اور اس حیثیت سے وہ لائق طالب علموں سے ملتے ہیں۔ یونیورسٹی کے پروفیسر عام طور پر وہی لوگ ہیں۔ جو اپنے زمانے میں ممتاز طالب علم تھے۔ یونیورسٹی کی محبت اور تعلیم و تعلم کا شوق اُس قدر غالب ہوا۔ کہ اور سب خیالات چھوڑ کر وہیں کے ہو رہے۔ اب شاگردوں میں جسے زیادہ قابل دیکھتے ہیں۔ اُسے وہیں گھیر لینے کی کوشش کرتے ہیں ممتاز طالب علم اپنے ہی کالج میں فیلو ہو جاتا ہے۔ اور پھر رفتہ رفتہ بڑھ جاتا ہے۔ فیلو ہونے کے زمانے میں اُسے گزارہ کے لایق مشاہرہ ملتا رہتا ہے۔ اور اس کا کام علمی تلاش اور جستجو ہوتا ہے کئی فنوں ہیں مشہور درسی کتابیں تلاش اور جستجو کے اسی منضبط طریق کا نتیجہ ہیں۔

کالجوں کے جس مجموعہ سے کیمبرج یونیورسٹی بنی ہے۔ وہ تعداد میں اٹھارہ ہیں اور اگر ان میں دو کالج جو مشہور عورتوں کی تعلیم کے لئے مخصوص ہیں۔ شامل کر لئے

جائیں - تو بیس کالج ہوتے ہیں - ان کے علاوہ ایک اکیسویں عمارت ہے - جسے "فٹز ولیم ہال" کہتے ہیں - اس میں ایسے طلبہ رہتے ہیں - جو یونیورسٹی میں تو داخل ہیں لیکن کسی خاص کالج سے تعلق نہیں رکھتے - کیمبرج میں یونیورسٹی کی فیس جُدا ہے - اس لئے کم استطاعت طلبہ جو دونوں جگہ کی بھاری فیس کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتے - وہ صرف یونیورسٹی میں داخل ہو جاتے ہیں - اور کالج کے اتالیقوں کی مدد کے بغیر امتحانات کی تیاری کرتے ہیں - ڈگری پانے کے لئے کسی کالج میں داخل ہونا ضروری نہیں - یونیورسٹی کے دفتر میں نام درج ہونا کافی ہے - مگر کالج میں داخل ہونا حُسنِ تربیت کے اعتبار سے مفید سمجھا جاتا ہے - کیونکہ کالج میں داخل ہو کر طالب علم کو وہاں کے معلّمین اور متعلّمین دونو سے ملنے اور مستفید ہونے کا حق حاصل ہو جاتا ہے - اور فٹز ولیم ہال کی سکونت سے طالب علم یونیورسٹی کی دُنیا میں رہ کر اُس دنیا سے الگ رہتا ہے - کالجوں والے ایک دوسرے سے ارتباط بڑھاتے ہیں - اور ان "نان کال" طلبہ کو اپنی برادری سے علیحدہ سمجھتے ہیں - حالانکہ کیمبرج اور آکسفورڈ کی زندگی کی بڑی خوبی جو اور مقامات میں کمیاب ہے باہمی طالب علموں کی مراو رہی ہے - جس سے بسا اوقات بڑے مفید نتائج نکلتے ہیں - گو کیمبرج میں سب کالج - کیا چھوٹے - کیا بڑے - اپنی اپنی جگہ مقتدر ہیں - اور کوئی کسی خوبی پر ناز کرتا ہے - اور کوئی کسی خوبی پر - تاہم بعض کالج خصوصیت سے نامور ہو گئے ہیں - کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ لوگ ان میں داخل ہونے کے آرزومند رہتے ہیں - لیکن انہیں موقع نہیں ملتا - کیوں کہ ان بڑے کالجوں میں یہ دستور ہو گیا ہے - کہ ایک تعداد مقررہ سے زیادہ طلبہ داخل نہ کئے جائیں - اس قاعدے کے دو مقصد ہیں - ایک یہ کہ طلبہ کی غیر معمولی کثرت سے تعلیم ناقص نہ ہو جائے - اور دوسرے یہ کہ نالائق کی بھرتی جہاں تک ممکن ہو کم رہے - ان ممتاز کالجوں میں سب سے اول نمبر عموماً

ؔ وہ لوگ جن کا کوئی کالج نہیں - اسی اصطلاح میں لفظ "کال" "کالج" کا مخفف ہے -

کالج شمار ہوتا ہے۔ یہ کالج ہنری ہشتم شاہ انگلستان نے ۱۵۴۶ء میں قائم کیا تھا۔ اس سے پہلے کی بنی ہوئی چند عمارتیں اسی میں ملا دی گئی تھیں۔ مثلاً "کنگز ہال" جو اڈورڈ سوم کی یادگار تھا۔ اور ۱۳۳۷ء میں بنا تھا۔ اور "مائیکل ہاؤس" جو ۱۳۲۴ء سے قائم تھا۔ اور شاہ اڈورڈ دوم کے ایک وزیر کی فیاضی کا نتیجہ تھا۔

ان کالجوں کے تاریخی حالات میرے خیال میں خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ کیونکہ اس ذریعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ مشہور یونیورسٹیاں ایک دن میں نہیں پیدا ہو گئیں۔ بلکہ صدیوں کی متواتر کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ ہمارے ہموطنوں میں جو لوگ انہیں سرسری طور پر دیکھ کر اپنے کالجوں کا مقابلہ ان سے کرتے ہیں۔ اُن کی طبیعت پر بعض اوقات مایوسی چھا جاتی ہے۔ ؎

"کہ جا یکہ دریاست من کیستم گر او ہست حقا کہ من نیستم"

لیکن ایسا ہونا نہیں چاہیئے بلکہ اس سے ہمیں یہ سبق لینا چاہیئے۔ کہ ملک کی تعلیم کے لئے ذرا سی دیر اور تھوڑی سی کوشش کرکے بہت بڑے نتیجوں کی دفعتہً توقع کرنا غلطی ہے۔ بجائے اس کے مستقل اور پُر زور کوشش جاری رکھنی چاہیئے۔ اس اُمید پر کہ آج جو بنیاد ہم ڈالیں گے۔ آئندہ نسلیں اُس سے پورے طور پر فائدہ اُٹھائیں گی۔ وہاں ایک ایک نواب اور ایک ایک امیر ایسے ایسے چشمے فیض کے جاری کر گیا ہے۔ کہ لوگ نسلاً بعد نسل اُن سے کام لے رہے ہیں۔ اور یہی مثال ہے جس کی پیروی ہمارے امراء کو کرنی چاہیئے۔ غور کا مقام ہے۔ کہ ان یونیورسٹیوں کے بڑے بڑے کالجوں کی بنیاد تو بادشاہوں اور اُمراء اور دیگر خوشحال افرادِ قوم نے ڈالی۔ لیکن نیک نامی ساری قوم کی ہو رہی ہے۔ بلکہ ان تعلیم گاہوں کی وجہ سے انگلستان کے علم و کمال کا بھرم دُنیا بھر میں بنا ہوا ہے۔

ٹرنٹی کالج کے بڑے دروازے سے داخل ہوتے ہی وہ عمارت نظر آتی ہے۔ جو

ڈاکٹر ہویل کی فیاضی سے بنی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف ۱۸۴۷ء سے ۱۸۶۶ء تک ٹرنٹی کے "ماسٹر"[1] رہے۔ اور وہ اس عمارت کا ایک حصہ ۱۸۵۹ء میں اپنے سامنے بنوا گئے۔ اور دوسرا حصہ ان کی وصیت کی رو سے اُن کے انتقال کے بعد بنوایا گیا۔ یہ عمارت طلبہ کے رہنے کے لئے ہے۔ اور جو کرایہ آتا ہے۔ اس سے قانون بین الاقوام کے طلبہ کی ایک جماعت کے وظائف اور ان کے استادوں کی تنخواہ نکلتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف دوہری خدمت اپنے کالج کی کر گئے۔ پہلے اپنے علم اور تجربہ کے پختہ ترین ثمر پندرہ سال تک کالج کی نذر کرتے رہے۔ اور مرتے پر اپنا اندوختۂ عمر یا شاید اپنے بزرگوں کا اندوختہ بھی کالج کو دے گئے۔ انگلستان میں اس قسم کے لوگ کے پیدا ہونے کی کئی وجوہات ہیں۔ جن میں ایک یہ بھی ہے کہ انگلستان میں اہل علم کی قدر و منزلت ہے۔ اور ایسے باکمالوں کے سامنے اہل دولت و مرتبت کو بھی سر جھکانا پڑتا ہے۔ مثلاً ٹرنٹی کے ماسٹر کو یہ حق حاصل ہے۔ کہ وہ کسی کے روبرو ٹوپی نہ اُتارے۔ گویا ہر کہ ومہ پر اس کا ادب واجب ہے۔ اس لئے کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے۔ کہ اُمراء کے لڑکے جنہیں علم کا شوق زیادہ ہو۔ خوشی سے کالجوں کی پروفیسری منظور کر لیتے ہیں۔ تنخواہ اگر کم بھی ہو۔ تو پرواہ نہیں کرتے۔ گھر میں کھانے کو موجود ہے۔ مگر اعزاز اور قدر دانی پر مرتے ہیں۔ اور اس کے سوا ضمیر اس خیال سے تسکین پاتا ہے۔ کہ دولت علم سے دوسروں کو مالا مال کر رہے اور زندگی کا کوئی مقصد رکھتے ہیں۔ دام و دد کی طرح کھانے پینے اور سو رہنے [illegible] نہیں کرتے۔

کالج کے بڑے دروازے کے شمال کی طرف گرجا ہے۔ جو کیمبرج اور آکسفورڈ قریب قریب ہر کالج کا ایک جزوِ ضروری ہے۔ گرجے کو جاتے ہوئے تین کمرے

[1] "ماسٹر" کیمبرج میں کالج کے پرنسپل یعنی افسر اعلیٰ کو کہتے ہیں۔

ملاتی ہیں۔ دروازہ کے قریب ہی ایک بالاخانہ میں وہ کمرہ ہے۔ جس میں سر آئزک
نیوٹن مشہور مہندس ۱۶۷۹ء سے ۱۶۹۶ء تک مقیم رہا۔ اس کے نیچے تھیکرے نامور
ناول نگار کا کمرہ ہے۔ اور اس کے مقابل گرجے کے پاس کا کمرہ وہ ہے۔ جس میں میکالے
رہتا تھا۔

قریب قریب ہر کالج کسی نہ کسی دیسی یادگار پر نازاں ہے۔ اور نوجوان طلبہ کی
ہمت بڑھانے اور انہیں شوق دلانے کا اس سے زیادہ موثر ذریعہ مشکل سے مل سکتا
ہے کہ انہیں معلوم ہو کہ ایسے نامور لوگوں نے وہیں تعلیم پائی تھی۔ جہاں اب وہ تعلیم
پا رہے ہیں۔ اور ایسے مشہور زمانہ اصحاب کی آنکھیں بھی اسی عمارت کے در و دیوار سے
آشنا رہ چکی ہیں۔ جس میں وہ رہتے ہیں۔ ان باتوں سے انہیں ان بڑے لوگوں کے ساتھ
ایک قسم کی یگانگت کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ یہ محسوس کرتے ہیں۔ کہ اگر اس تعلیم گاہ
کو جس میں وہ تربیت پا رہے ہیں۔ ایک مادر مہربان فرض کیا جائے۔ تو یہ بزرگ گویا
ان کے بڑے بھائی ہیں۔ جب سینکڑوں سینوں میں شوق ترقی جاگزیں ہو۔ تو آخر
کہیں نہ کہیں تو اپنا اثر دکھائے گا۔ اور انہی مقامات سے گردش دوران پھر کوئی نیوٹن
پھر کوئی تھیکرے پھر کوئی میکالے پیدا کرے گی

اب ہم گرجے کے قریب ہیں۔ ذرا اسے بھی غور سے ایک نظر دیکھ لیں۔ یہ ۱۵۶۱ء
میں تعمیر ہوا۔ مگر اٹھارویں صدی کی ابتدا میں اس کی مرمت ہوئی۔ اور بہت سی چیزیں
جو شکستہ ہو رہی تھیں۔ نئی بنائی گئیں۔ انیسویں صدی میں بہت سا چندہ اس گرجے کی
آرائش کے لئے کیا گیا۔ اس رقم سے چھت اور دیواروں کی تزئین ہوئی۔ اور دریچوں میں
خوش رنگین شیشے لگائے گئے۔ دیواروں پر جو تصویریں ہیں۔ ان میں سے مندرجہ
ذیل کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا:۔

حضرت آدم علیہ السلام۔ بہشت کا میوہ نوکاشت شدہ زمین۔ اور بہشت کی

چار ندیاں۔

۲۔ حضرتِ نوحؑ۔ زیتوں کا درخت۔ قوس قزح۔ ایک فاختہ مع ایک شاخ زیتون کے۔ ایک مُردہ کوّا پیٹ پانی میں پڑا ہے۔ اور ایک مور اور ایک مورنی شجرِ زیتون کے نیچے کھڑے ہیں۔

۳۔ حضرتِ ابراہیمؑ۔ شاہ بلوط کا درخت۔ اس کے نیچے ایک مینڈھا۔ جس کے سینگ جھاڑی میں اُلجھے ہوئے ہیں۔

۴۔ حضرت یُوشعؑ۔ انار کا درخت۔ انجیر اور انگور۔

یہ اور دیگر تصاویر اسی قسم کی ان قصّوں اور روایتوں کی تفسیر ہیں۔ جن کی طرف انجیل کے عہد عتیق میں جابجا اشارات ہیں۔ یورپ بھر کے گرجے اور عجائب خانے ان تصاویر سے بھرے ہوئے ہیں۔

رنگین دریچے تعداد میں پندرہ ہیں۔ اور ہر ایک میں مختلف صورتیں بنی ہوئی ہیں۔ ہر دریچہ بہ حیثیتِ مجموعی ایک خاص مضمون کی توضیح ہے۔ مثلاً ایک میں حضرت عیسیٰؑ کے سب حواری ہیں۔ دوسرے میں یہ دکھایا گیا ہے۔ کہ ابتدائی عیسائی کس وضع کے لوگ تھے۔ تیسرے میں مغربی عیسائیت کا نمونہ ہے۔ کہیں یہ دکھایا گیا ہے کہ موجودہ اصلاح شدہ کلیسا سے قبل انگلستان کی کلیسائی زندگی کس حالت میں تھی۔ اور قومی زندگی کس حالت میں اور بعد اصلاح کیا بن گئی۔ کہیں کالج اور یونیورسٹی کے بانیوں اور محسنوں کی تصاویر ہیں۔

گرجے سے نکل کر باب اڈورڈ ملتا ہے۔ جو ۱۸۶۱ء میں تیار ہوا تھا۔ اس سے ایک کھُلے صحن میں پہنچتے ہیں۔ جو سبز گھاس سے مزیّن ہے۔ یہ جگہ دلکش ہے۔ اور اس میں کھڑے ہو کر دیکھیں۔ تو سنٹ جان کالج اور دریا کا منظر نہایت خوشنما ہے۔ اس سے آگے صحن ہے۔ جس میں ایک خوبصورت فوارہ لگا ہوا ہے۔ جو ۱۸۶۲ء سے موجود ہے۔

آگے کالج کا بڑا ہال ہے۔ یہ بھی ۱۶۰۴ء اور ۱۶۰۵ء کے درمیان بنا ہے۔ لنڈن کے مڈل ٹمپل کے ہال کا نمونہ ہے۔ اور لمبا ظ رقبہ اور تزئین کے اسی کا مُشتے ہے۔ اس ہال میں بہت سی قد آدم تصویریں ہیں۔ جو بڑے بڑے اُستادوں کی بنائی ہوئی ہیں۔ اُن میں ایک تصویر ملک الشعرا لارڈ ٹنی سن کی ہے۔ جو والٹس نے ۱۸۹۰ء میں بنائی۔ یہ ملک الشعرا کی وفات سے صرف دو سال پہلے بنی ہے۔ اور اس لئے خصوصیت سے قابلِ قدر ہے۔

ہال کے مقابل مطبخ کی عمارت ہے۔ اور قریب ہی ایک اور صحن ہے۔ جسے "نیول کورٹ" کہتے ہیں۔ "نیول" فن تعمیر کے اُستادوں میں شمار ہوتا ہے۔ اور ٹرنٹی کی بہت سی عمارات اسی کی صناعی کی یادگار ہیں۔ مگر یہ صحن اُس کے نام سے یوں موسوم ہُوا۔ کہ اسے اُس نے اپنے صرف سے تیار کرایا تھا۔ گویا اپنے فن کے ذریعے کالج کی خدمت پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ اپنے جیب خاص سے بھی معقول مدد دی۔ اسی صحن کے گرد کے کمروں میں لارڈ بائی رن کے کمرے تھے۔ ٹرنٹی کے بڑے کتب خانہ کی عمارت اس صحن سے دائیں ہاتھ پر رہ جاتی ہے۔ اس کا نقشہ سر کرسٹو فرین کی صناعی کی یادگار ہے۔ اور وینس میں جو سینٹ مارک کی لائبریری تھی اس کی طرز پر یہ عمارت بنی ہے۔ ۱۶۷۶ء اور ۱۶۹۵ء کے درمیان پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اور اب کیمبرج کی خوب ترین عمارات میں شمار ہوتی ہے۔ یہ لائبریری طول میں دو سو فٹ عرض میں ۴۲ فٹ۔ اور اس کی چھت ۳۷ فٹ بلند ہے۔ اس میں کتابیں اس عمدگی سے سجائی گئی ہیں۔ اور روشنی کے آنے کا انتظام اس طرح کیا گیا ہے۔ کہ وہاں بیٹھ کر پڑھنے والے کا خواہ مخواہ دل لگے۔ لائبریری میں بہت سے بُت سنگ مرمر کے رکھے ہیں۔ جن میں لارڈ بائی رن کا ایک مشہور بُت قابلِ تذکرہ ہے۔ اس مشہور شاعر کے مداحوں نے چندہ کر کے ۱۸۳۲ء میں یہ بُت تیار کرایا۔ بدیں امید کہ اسے لنڈن میں سنٹ پال گرجے میں یا وسٹ منسٹرا بے میں جہاں اکثر مشاہیر کے بُت رکھے ہیں۔ جگہ مل جائے گی۔ لیکن پادری صاحبان نے دونوں جگہ اس مجسمے رکھے جانے کی اجازت نہ دی۔ ۱۸۴۲ء تک یہ بُت چونگی خانہ میں پڑا رہا۔ اس زمانے

میں ڈاکٹر وہول ٹرنٹی کی مسند کے صدر نشین تھے ۔ اُنہیں خبر ملی ۔ کہ ایک باکمال کے بُت کے ساتھ یہ ناانصافی تعصّب کی وجہ سے ہو رہی ہے ۔ اُنھوں نے کہا ۔ ہم اسے اپنے کالج میں خوشی سے جگہ دیں گے ۔ اور اس طرح یہ بُت لائبریری میں رکھا گیا ۔

کتب خانہ کے نوادر میں مندرجہ ذیل قلمی نسخے بہت قیمتی ہیں ۔ ایک شیشہ کی الماری میں ایک کتاب رکھی ہے جس میں ملٹن کے مسودات ہیں ۔ اور اس میں اس کی مشہور کتاب "پیرے ڈائس لوسٹ" یعنی "فردوس از دست رفتہ" کا پہلا خاکہ ہے ۔ جب وہ اسے ناٹک کی صورت میں لکھنا چاہتا تھا ۔ ایک الماری میں تھیکرے کے معروف ناول "ایسمنڈ" نامی کا مسودہ ہے ۔ اس سے بھی زیادہ بیش بہا مسودہ ٹنی سن کی "ان میموریم" یعنی "یادگار دوست" کا ہے ٹینیسن جب کیمبرج میں طالب علم تھا ۔ تو اس کا سب سے عزیز دوست "ہیلم" بھی وہیں پڑھتا تھا ۔ تقدیر سے ہیلم جوانی میں اپنے دوستوں اور عزیزوں کو داغِ مفارقت دے گیا ۔ ٹنی سن کے دل پر اس مرگ کا ایسا صدمہ ہوا ۔ کہ اُس نے اسی صدمہ کے اثر سے اپنی بہترین نظم لکھی ۔ ہیلم گذرنے کو تو اس جہان فانی سے گذر گیا ۔ مگر اپنے دوست کو شہرتِ جاودانی کی سند دے گیا ۔ اور ساتھ ہی خود بھی مشہور ہو گیا ۔ جب تک انگریزی زبان اور اس کی نظم زندہ ہے ۔ ٹنی سن کی "ان میموریم" زندہ رہے گی ۔ اور اس کے ساتھ ٹنی سن بعد ہیلم کے نام ۔ ٹنی سن بھی اس کالج کا طالب علم تھا ۔ اور اس کے کمرے "نیویل کورٹ" کے مقابل عین درمیان کے زینے پر تھے ۔

ٹرنٹی کی عمارتوں میں اب ایک اور چیز قابل بیان رہ گئی ہے ۔ اسے لشبس ہوسٹل کہتے ہیں یعنی لاٹ پادری صاحب کا بنایا ہوا مکان ۔ مقام لیچفیلڈ کے بشپ کی فیاضی کی یادگار ہے ایک سو طلبہ اس میں رہتے ہیں ۔ اور اس کا کرایہ کتب خانہ کی امداد میں صرف ہوتا ہے اسی طرح کیمبرج میں اکثر عمارتیں اور اکثر مکان دوسرے مفید مقاصد کے جامع ہیں ۔ اور اس قسم کی معقول خیرات سے قومی تعلیم کی کل انگلستان میں نہایت عمدگی کے ساتھ چل رہی ہے ۔

ہماری "اسپرانٹو"

یوُرپ میں آج کل ایک نئی زبان کا بہت چرچا ہے۔ جسے "اسپرانٹو" کہتے ہیں۔ شاید دُنیا میں یہ پہلی مصنوعی زبان ہے۔ جو کامیاب ہوتی نظر آتی ہے۔ گو زبانوں کی جڑ کو دیکھیں تو سب زبانیں کم و بیش مصنوعی ہیں۔ ان کی ابتدائی حالت میں چند انسانوں نے ضرور یہ قرار دیا ہوگا۔ کہ زبان و لب کی فلاں حرکات سے فلاں معنے لیے جائیں۔ مگر یہ پتہ نہیں چل سکتا۔ کہ کون سی زبان کس زمانے میں اس حالت ابتدائی میں تھی۔ بلکہ عام طور پر ہر قوم کی زبان زندگی کے ساتھ وابستہ معلوم ہوتی ہے۔ جب سے اُس قوم کی زندگی شروع ہوتی ہے۔ اُسی وقت سے اُس کی زبان اُس کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔ حالات کے تغیر کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔ حالات کے تغیر کے ساتھ تغیر پاتی ہوئی بتدریج بڑھتی جاتی ہے۔ اور اہلِ بصیرت کے لئے اس قوم کی زندہ تاریخ ہوتی ہے۔ مگر ایسا کم سُننے میں آیا ہے۔ کہ کوئی ایک شخص ایک زبان ایجاد کرے۔ یا چند آدمی مل کر ایک زبان گھڑ لیں۔ اور اس کے قواعد منضبط کریں۔ اور اس کے بعد اُس کی اشاعت کی کوشش کریں۔ اور یہ بنائی ہوئی زبان مقبول ہو جائے۔ اختلافِ السنہ سے جو مُشکلات سیر و ساحت اور تجارت کے راستے میں پیش آتی ہیں۔ اُن سے بچنے کے لئے ایک مشترکہ زبان ایجاد کرنے کی کوشش کئی مرتبہ یورپ میں ہو چکی ہے۔ مگر ناکام رہی۔ یہ آخری کوشش جو اسپرانٹو کے نام سے مشہور ہے۔ ایک روسی عالم کی محنت کا نتیجہ ہے۔ علامہ موصوف نے روسی اور فرانسیسی۔ انگریزی۔ جرمن اور اطالین زبانوں کی آمیزش سے یہ زبان

پیدا کی ہے۔ اور اس کے صرف ونحو کو بالکل باقاعدہ اور آسان بنادیا ہے۔ کوئی استثنائی قواعد اس میں داخل نہیں کئے۔ جن سے طالب زبان کو دقّت ہو۔ اور اس کا "اسپرانٹو" نام رکھا ہے۔ یہ اطالین زبان کا لفظ ہے۔ اور اس کے معنے ہیں اُمید۔ چونکہ اس کے بانی اور اس کے معاون کے نزدیک اس سے یہ اُمید بندھتی ہے۔ کہ یورپ کی مشترکہ زبان ہونے میں کامیاب ہوگی۔ اس لئے اس کا یہ نام رکھا گیا۔ اس کے ساتھ ایک رعایت اس نام میں اور بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ اس زبان میں یہ قاعدہ کلیہ ہے۔ کہ سب اسماء حرف واؤ پر ختم ہوں۔ اور اس لئے اس نام سے زبان کی ماہیت پر بھی کچھ روشنی پڑتی ہے۔

جب یہ زبان پہلے پہل ایجاد ہوئی۔ تو اکثر لوگ اس کی ہنسی اُڑاتے تھے۔ اور کہتے تھے۔ کبھی اس طرح بھی زبانیں بنتی ہیں۔ اور پھیلی ہیں۔ قدرتی طور پر بنتی ہیں۔ اور قدرتی اسباب سے بڑھتی ہیں۔ مگر آفرین ہے۔ اس کے بانی اور اس کے ہمراہیوں کی ہمّت اور تدبیر پر انہوں نے ناممکن کو ممکن بنادیا ہے۔ اور اب یورپ کے ہر بڑے شہر میں اسپرانٹو والوں کی ایک کثیر تعداد پیدا ہو گئی ہے۔ اور برلن پیرس اور لندن کی بڑی بڑی دکانوں پر لکھا ہوتا ہے۔ کہ یہاں "اسپرانٹو" بولی جاتی ہے۔ اس کے بانیوں کا یہ منشا نہیں۔ کہ یہ موجودہ زبانوں کی جگہ چھین لے۔ وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں۔ کہ ہر قوم اپنے گھر میں اپنی زبان اور اپنے علم ادب کو ہی ترجیح دے گی۔ اور اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنی زبان چھوڑکر اس مشترکہ زبان کو اختیار کرلے گی۔ بے سُود ہے۔ مگر وہ یہ چاہتے ہیں۔ کہ یہ مشترکہ زبان اُن سب مختلف زبانوں والی قوموں میں ایک مفید واسطہ بن جائے۔ اور خصوصاً تجارتی کاروبار میں سہولت کا باعث ہو۔ تاکہ "اسپرانٹو" جاننے والا یورپ کے ہر حصے میں اپنا کام نکال لے۔ علم لسان کے چند علماء کے علاوہ پہلے جس طبقے نے اس زبان کی طرف توجہ کی۔ وہ تجارت پیشہ لوگ تھے۔ کیونکہ انہیں اس کے اختیار کرنے اور اس کی اشاعت کرنے میں صریح فائدہ نظر آیا اس کے بعد اُن کی مثال کے اثر اور اُن کی

شیامنہ روز کی سعی کی بدولت اور لوگ بھی ماننے لگے۔ کہ اس زبان کو پھیلانا چاہیئے۔ اب ان لوگوں کو یہاں تک کامیابی ہوگئی ہے۔ کہ لندن اور پیرس کے اکثر مدارس میں یہ زبان داخلِ درس ہوگئی ہے۔ اور اُن لڑکوں کو جو تجارتی کاروبار میں پڑنا چاہتے ہیں تاکید ہے کہ وہ یہ زبان خوب سیکھیں۔ علاوہ ازیں اس کے حامی ہر برس ایک عظیم الشان کانفرنس یورپ کے کسی نہ کسی مشہور مقام میں کرتے ہیں۔ اور وہاں ہر ملک کے رہنے والے جمع ہوتے ہیں۔ اُس جلسے کی کارروائی سب اسی زبان میں ہوتی ہے۔ اور اراکین ایک دوسرے سے "اسپرانٹو" میں باتیں کرتے ہیں۔ میں جب شمالی فرانس میں بولون میں مقیم تھا۔ تو مجھے ان کا سالانہ مجمع دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس برس کیمبرج میں "اسپرانٹو" والوں کا سالانہ جلسہ ہوا ہے۔ اور کیمبرج جیسے علمی مراکز کی طرف سے اس جلسے کی اجازت اور تائید گویا اس زبان کے لئے انگلستان کی طرف سے فرمانِ منظوری اور اس کی کامیابی کے لئے ایک نیک فال ہے۔ اب اگر اس کے حامی اسی سرگرمی سے کام کرتے رہے۔ جو آج تک اُن کا شعار رہی ہے۔ تو وہ ضرور کامیاب ہوں گے۔ اور اسے آخر یورپ کی زبان عمومی بنا کے چھوڑیں گے۔

"اسپرانٹو" والوں نے کئی وسائل اس زبان کے مقبول بنانے کے لئے استعمال کئے ہیں۔ جابجا "اسپرانٹو" کی انجمنیں قائم کی ہیں۔ اُن انجمنوں کے جلسے وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے ہیں۔ اور اس میں اسپرانٹو کی مشق ہوتی ہے۔ اور اس کے ذریعے مختلف اللسان لوگ آپس میں تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔ سارے یورپ کی زبانوں کی مشہور اور مقبول ترین کتابوں کا اس زبان میں ترجمہ ہونا شروع ہوگیا ہے۔ کیونکہ یہ ثابت کرنا مقصود ہے۔ کہ لطیف سے لطیف خیالات بھی اس میں ادا ہو سکتے ہیں۔ ہر دلعزیز گیتوں کا ترجمہ بھی اسپرانٹو میں کیا گیا ہے۔ اور موسیقی کے بعض اُستادانِ فن اپنی دلکش آواز سے ان گیتوں کی دلچسپی بڑھاتے ہیں۔ کئی رسالے "اسپرانٹو" میں نکلنے لگے ہیں۔ اور "اسپرانٹو" کے ہوا خواہ بعض

اخبارات میں اپنے تجارتی اشتہارات اس زبان میں چھپواتے ہیں۔ تاکہ لوگوں کی نگاہیں اس کے الفاظ سے آشنا ہو جائیں۔ اور بیگانگی دُور ہو جائے۔ "اسپرانٹو" کے معاونوں کی سرگرمی کا یہ حال ہے۔ کہ سفر میں ہوں۔ یا حضر میں۔ جہاں کہیں کسی نئے شخص سے ملاقات ہوئی۔ پہلا سوال یہ کرتے ہیں۔ آپ "اسپرانٹو" جانتے ہیں۔ اگر اُس نے "اسپرانٹو" کا نام سُنا ہے۔ تو اس کے متعلق باتیں شروع ہو جاتی ہیں۔ اور اگر نہیں سُنا۔ تو مختصر سا حال اس کے آغاز اور اس کی ترقی کا سُنا کر اُسے اُس کی طرف توجہ کرنے کا شوق دلاتے ہیں۔ "اسپرانٹو" پر چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے گئے ہیں۔ وہ اُن لوگوں کے پاس اکثر موجود رہتے ہیں۔ اور نئے شائقین میں بانٹے جاتے ہیں۔

یہ ہے ایک مختصر سا خاکہ اُن کوششوں کا جو یورپ کی مختلف اللّسان قوموں میں رابطۂ اتحاد اور سہولت تجارت پیدا کرنے کے لئے ہو رہی ہیں۔ اور باوجودیکہ ایک نئی زبان کا عدم سے وجود میں لانا ایک کٹھن کام ہے۔ مگر "اسپرانٹو" کے حامی کمرِ ہمّت باندھے ہوئے مصروفِ سعی ہیں۔ اور کامیابی کے اُمیدوار۔ یہاں تک کہ انہوں نے اس نئی زبان کا نام ہی "زبانِ اُمید" رکھا ہے۔ اس خاک پاک ہند میں بھی جو ہمارا وطن ہے۔ ایک زبانِ اُمید موجود ہے۔ جو یورپ کی "اسپرانٹو" سے بہت سی باتوں میں ملتی اور بعض اعتبار سے فضیلت رکھتی ہے۔ مگر افسوس ہے۔ کہ ہم اس سے غافل ہیں۔ اور امکانات سے بے خبر ہیں۔ جو اُس کی ترقی میں پنہاں ہیں۔

ہماری "اسپرانٹو" وہی پیاری زبان ہے۔ جسے کوئی اُردو۔ کوئی ہندی اور کوئی ہندوستانی زبان کہتا ہے۔ ہم نام کے پابند نہیں۔ ہمیں کام سے کام ہے۔ جو نام کسی کو بھلا معلوم ہو۔ اُس نام سے اُسے یاد کرے۔ مگر اس کوشش میں رہے۔ کہ چار دانگ عالم میں ہندوستان کی اس "خداداد" "اسپرانٹو" کا چرچا ہو جائے۔ اُردو کو میں "خداداد اسپرانٹو" اس لئے کہتا ہوں۔ کہ اپنی یورپین بہن کی طرح یہ ایک تازہ انسانی ایجاد نہیں۔

ہے۔ بلکہ صدیوں میں اُن قدرتی اسباب کے جمع ہونے سے پیدا ہوئی ہے۔ جن سے دُنیا بھر کی زبانیں پیدا ہوئیں اور بڑھی ہیں۔ اور یہی سب سے بڑی فضیلت ہے۔ جو ہماری "اسپرانٹو"، کو یورپ کی "اسپرانٹو" پر حاصل ہے۔ اسی لئے اُردو کے پھیلانے کا کام بہ نسبت "اسپرانٹو" کے زیادہ آسان ہے۔ کیوں کہ ابھی کل کی بات ہے۔ کہ اسپرانٹو بولنے والوں کا وجود ہی نہ تھا۔ اور ہندوستانی بولنے والے ہمارے ملک میں صدیوں سے چلے آتے ہیں۔ یورپ میں "اسپرانٹو" کا لفظ اس کی ذاتی کامیابی کی توقع کے سبب "اُمید" نام رکھا گیا ہے۔ مگر ہندوستان میں ہندوستانی زبان کی کامیابی مُلک کی کامیابی ہے۔ اور مُلک کی بہتری اور اہل مُلک کے اتحاد کی اُمید کا صرف یہی پہلو ہے۔ کہ کم از کم سب ہم زبان تو ہوں۔ اختلافاتِ مذہبی تو کسی کے مٹائے مٹنے والے نہیں مگر ایک مُلک میں ایک حکومت کے زیر سایہ بستے ہوئے اور نقل و حرکت کے ذرائع کی کثرت کے باوجود ملکی زبان کا ایک نہ ہوسکنا اور اس کی اشاعت میں کوتاہیاں نہایت قابل افسوس ہیں۔

کئی زبانوں کا مجموعہ مرکب ہونے میں اُردو کو اسپرانٹو کے ساتھ پوری مشابہت ہے۔ اور بڑی خوبی یہ ہے۔ کہ ابھی اور الفاظ کی آمیزش کی گنجائش اس میں موجود ہے۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں کی موجودہ بولیاں جو اپنی اپنی جگہ قائم رہنے کے قابل اور قائم رہنے والی ہیں۔ ایک دوسرے سے بہت کچھ ملتی جُلتی ہیں۔ اور خصوصاً ہندوستانی کے الفاظ اُن میں بہت شامل ہیں۔ جو انگریزی الفاظ اب ہندوستان کی زبانوں میں مل کر جزوِ زبان بن گئے ہیں۔ اُن سے یہ مشترکہ حصہ ان سب زبانوں کا اور بھی زیادہ ہوگیا ہے۔ ایسی صورت میں اُردو کو عام رواج دیا جانا سب کی آسانی کا باعث ہے۔ اور بغیر کسی غیر معمولی تردّد کے ممکن ہے۔ کہ لوگ اس طرف مائل ہوں۔ یورپ جس کے لئے ایک زبان پیدا کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ دس بارہ مختلف

دُوَل کا مجموعہ ہے ۔ جہاں ہر حکومت میں زبان جُدا ۔ طرزِ حکومت جُدا ۔ اور قانون جُدا ہے ۔ ایک حکومت کے باشندوں کی اغراض اکثر دوسری حکومت کے باشندوں کی اغراض کے خلاف ہیں ۔ اور ایک سلطنت اور دوسری سلطنت میں رقابت موجود ہے ۔ مگر ان لوگوں کی وسعتِ خیال اور روشن دماغی دیکھیئے کہ ایسے بڑے اختلافات کو بھی مٹانے یا اُن کے دبانے کے لئے ایک نیا رشتۂ یگانگت پیدا کرنے کی فکر میں ہیں ۔ اور ہماری کوتاہ اندیشی کو دیکھیئے ۔ کہ ایک مُلک ۔ ایک حکومت اور مشترکہ ضروریات اور اغراض کے باوجود فکرِ ہم زبانی سے غافل ہیں ۔ حالانکہ ہمارے راستے میں وہ مشکلات بھی نہیں ۔ جو ان کے راستے میں ہیں ۔ کیسا عمدہ موقعہ ہے ۔ جو ہم کھو رہے ہیں ؎

اے دل بہ کوئے دوست گذارے نہ کردۂ — فرصت ز دست دادہ و کارے نہ کردۂ

میدان فراخ دیدہ و گوئے نہ بردۂ — شاہیں بہ دست و عزمِ شکارے نہ کردۂ

میرے خیال میں اب وہ وقت نہیں رہا ۔ کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں ۔ کہ ہماری زبان میں اگر قوتِ نمو ہے ۔ تو خود بڑھے گی ۔ اس میں شک نہیں ۔ کہ ہماری زبان میں ترقی کی طاقت موجود ہے ۔ اور وہ ہماری کوشش کے بغیر یا بے دلی کوشش سے بھی کچھ نہ کچھ بڑھ رہی ہے ۔ اُس کا ذخیرۂ ادب بھی روز افزوں ہے ۔ اس کے بولنے والوں کی تعداد بھی زیادہ ہوتی رہتی ہے ۔ اور مُلک کے دُور دراز گوشوں میں بلکہ دُنیا کے دوسرے حصّوں میں بھی اس کی آواز پہنچنے لگی ہے ۔ لیکن یہ جو کچھ ہو رہا ہے ۔ کافی نہیں ہے ۔ اس ترقی کی رفتار بہت زیادہ تیز ہو سکتی ہے ۔ اگر ہم اس کی خاطر کچھ تکلیف گوارا کرنے لگیں ۔

ہمیں اپنے سب بڑے بڑے شہروں میں اپنی زبان اُمید کی انجمنیں قائم کرنی چاہئیں ۔ جن میں اس کے شائقین ۔ اس کے دلدادہ ۔ اس کے ہوا خواہ بلا قید ملت و مذہب جمع ہوں ۔ اور اپنی اپنی محنت کے نتائج سے دوسروں کو مستفید کریں ۔

اس کے علمی اور ادبی ذخیروں کو بڑھائیں۔ ہمعصروں سے داد پائیں۔ اور آئندہ نسلوں کو ممنونِ منت کریں۔ وقتاً فوقتاً کوئی کانفرنس یا بڑا جلسہ بھی ہونا چاہئے۔ جس میں مُلک کے ہر گوشہ سے اس زبان کے مُصنّف۔ مولف مترجم۔ اخبار نویس سب جمع ہوں۔ یہ پہلا کام ہوگا جس میں نامور اہلِ قلم بلالحاظ مذہب ایک مشترک مقصد کے لئے جمع ہوں گے۔

اُن صوبجات ہند میں جہاں اُردو مادری زبان نہیں۔ ایک اور طریق عمل بہت مفید ہو سکتا ہے۔ مَیں نے انگلستان میں دیکھا کہ فرانسیسی زبان کے طالب علم فرانسیسی میں مہارت پیدا کرنے کے لئے یہ تدبیر استعمال کرتے ہیں۔ کہ کئی آدمی یکجا جمع ہو کر مشہور کتابوں کے انتخاب پڑھتے ہیں۔ اور لوگ سُننے آتے ہیں۔ اس سے تلفظ بہ سہولت کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ اور روزمرہ درست ہو جاتا ہے۔ فرانس میں تو مَیں نے فرانسیسی لوگوں کو اپنی زبان کی مشق کے لئے اسی طریق سے فائدہ اُٹھاتے دیکھا ہے۔

جن صوبجات ہند میں اُردو کا رواج نسبتاً کم ہے۔ مثلاً بنگال۔ مدراس اور بمبئی، وہاں اس قسم کی اُردو انجمنوں کی ضرورت ہے۔ ایسی ہی مجالس اسپرانتو کے حامیوں نے یورپ میں قائم کی ہیں۔ ان انجمنوں میں کچھ لوگ تو ایسے ہوں۔ جو بے تکلف اُردو بول سکتے ہیں۔ اور وہ اپنے گرد جمع کریں۔ ایسے لوگوں کو جو اُردو کے فوائد تمدنی۔ تجارتی اور سیاسی کو مدِنظر رکھ کر اسے سیکھنا چاہتے ہیں۔ جلسے کی کارروائی اُردو میں ہو۔ ضابطہ کی کارروائی کے علاوہ میل ملاپ اور بات چیت کے موقعے پیدا کئے جائیں۔ تاکہ سب اراکین کو تکلم کی مشق ہو۔ اور جلسہ کی دلچسپی بڑھانے کے لئے اُردو نظم و نثر کی مقبول کتابوں کے انتخابات وہاں پڑھے جائیں۔ اور اُردو کے مشہور گیت بھی کبھی کبھی گائے جائیں۔ پڑھنا بھی ایک خاص فن ہے۔ ہمارے مُلک میں بھی مروّج رہا ہے۔ اور اب

ایک دوسرے رنگ میں یورپ میں مروّج ہے۔ اچھا پڑھنے والا عمدہ کلام میں ایک نئی رُوح پھونک دیتا ہے۔ اور وہی انتخاب جو کتاب میں چھپا ہُوا صرف چند اہل نظر کو گرویدہ کرتا۔ ہوشیار پڑھنے والے کی زبان اور فن کی تاثیر سے خاص و عام کو قائل کر لیتا ہے۔ ایسے مشّاق پڑھنے والے آج کل ہمارے ہاں بہت کم ہیں۔ ان کی تعداد کو بڑھانا اور اُن کی حوصلہ افزائی کرنا بھی ایک مفید ذریعہ ترقی زبان کا ہے۔ اور اگر ہم اُن ذرائع سے جو اس مردِ عزیز زبان کی اشاعت کے ہمارے پاس موجود ہیں۔ کام لیں۔ تو کوئی وجہ نہیں۔ کہ ہماری "اسپرانتو" ایک نصف صدی میں یہ ہندوستان بھر کی زبان عمومی نہ بن جائے۔ اگر "اسپرانتو" کے چند مددگار چند سال میں کئی سَو سے کئی ہزار سے کئی لاکھ بن سکتے ہیں۔ تو کیا "ہماری اسپرانتو" کے بولنے والے اور کئی کروڑ آدمی اپنے ساتھ نہیں ملا سکتے۔ ہمّت کریں۔ تو منزل بہت دُور نہیں۔ اور ہمّت ہار بیٹھیں تو اس سے دشوار تر منزل کوئی ہو نہیں سکتی ✤

یورپ کے بعض دلچسپ

اور

تاریخی نظارے

مضمون ذیل آسمٰعیل شیخ صاحب کے کئی اُن مضامین کا خلاصہ ہے - جو انھوں نے بطور سفرنامہ تحریر فرماتے تھے - اگرچہ ہر ایک مضمون بجائے خود ایک عجیب چیز ہے مگر اُن کا ضروری خلاصہ یہی ہے - جو اس میں یکجا کر دیا گیا ہے -

کیسا ہی دلچسپ مقام کیوں نہ ہو - آدمی ایک جگہ رہتے رہتے اکتا جاتا ہے - لندن اس وقت مرجع انام ہے لیکن چہارشنبہ ۸ ار جولائی ۱۹۰۶ء کے دن کوئی ہمارے جی سے پوچھتا - کہ لندن سے جانے کی کس زور سے آرزو تھی - دوپہر ڈھل چکی تھی - دو بجنے کو تھے - کہ ہم[1] ریل پر پہنچے - چند دوست ہمیں وداع کرنے آئے تھے - اور کہہ رہے تھے - کہ ہم قابلِ رشک ہیں - کہ سوئٹزرلینڈ کی سیر کو جاتے ہیں - ہم بیتاب تھے - کہ گاڑی چلے - دو بج کر بیس منٹ گزرے - اور گاڑی چلی - لندن سے فوکسٹن تک دو گھنٹے کا رستہ تھا - بارہا دیکھا ہوا تھا - اس کے ہرے ہرے مرغزاروں سے انگلستان میں رہتے رہتے

---

[1] اس سفر میں میرے دوست شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی میرے ہمراہ تھے - اور اسی لئے جابجا لفظ "ہم" استعمال ہوگا ۱۲

نگاہ کافی آشنا ہو چکی تھی۔ مگر اُس دن میں خدا جانے کیا جادو کی تاثیر تھی۔ کہ وہ راستہ بھی غیر معمولی طور پر دلچسپ معلوم ہوتا تھا۔ اور وہ اونچے نیچے کھیت جن میں بھیڑ بیل کے گلے چرتے پھرتے تھے۔ نہایت دلفریب نظر آتے تھے۔ وہ کیا بدل گئے ہوں گے۔ ہماری نگاہ بدلی ہوئی تھی۔ یا آنے والے مناظر انگلستان کی ناہموار مگر سرسبز زمین پر اپنا سایہ ڈال رہے تھے۔

فوکسٹن پہنچ کر ہم جہاز میں بیٹھے۔ حسن اتفاق سے دریا میں تموج کم تھا۔ ہنستے کھیلتے کھاتے پیتے گھنٹہ بھر میں ہم نے بولون ساحلِ فرانس کو جا لیا۔ مسٹر کی جگہ موسیو اور موسیو کا شور ہے۔ فرانسیسی حمّال اسباب اُٹھانے کو دوڑے آتے ہیں۔ بات بات میں سر سے لے کر پاؤں تک حرکت کرتے ہیں۔ کچھ پوچھو۔ تو دونوں شانے ہلا کر اس طرح ژونہ سے پا[1] کہتے ہیں۔ کہ نیچے کا ہونٹ علامتِ انکار کے طور پر خود بخود آگے بڑھ جاتا ہے بھویں اُوپر کو کھنچ جاتی ہیں۔ اور پیشانی پر دو تین شکن پڑ جاتے ہیں۔ ہم اُن کی بات سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ وہ اپنے مطلب کی خوب سمجھتے ہیں۔ اسباب اُٹھا کر یہ جا وہ جا۔ بہت عنایت کی۔ تو اشارے سے بُلاتے جاتے ہیں۔ کہ اِدھر آؤ۔ اُدھر آؤ۔ کوئی جالے ریل پر سوار کرانے لئے جا رہے ہیں۔ مگر نہیں۔ دوآن[2] کا قضیہ پہلے درپیش ہے۔ فرانس میں تمباکو پر بہت محصول ہے۔ اور زیادہ تر اسی کی پرسش ہوتی ہے۔ کہ کہیں اسباب میں تمباکو تو نہیں۔ بعض دفعہ اسباب کھول کر دیکھتے ہیں۔ بعض دفعہ صرف پوچھتے ہیں۔ کوئی چیز چنگی کے قابل تو نہیں؟ اور اعتبار کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد ریل تیار ملتی ہے۔ اور حمّال اسباب لا کر گاڑی میں رکھ دیتے ہیں۔

ہم جہاز سے اُترنے کو تھے۔ کہ ایک انگریز ہم سے مخاطب ہوا۔ اور پوچھنے لگا۔ "کیا آپ مالٹا کے رہنے والے ہیں" ہم نے کہا۔ "نہیں۔ ہم ہندوستانی ہیں" وہ ہنسا اور

---

[1] میں نہیں جانتا۔ (فرانسیسی)
[2] چونگی خانہ۔ (فرانسیسی)

لیتے لگا عجیب بات ہے۔ اسی جہاز میں دو اور شخص ہیں۔ بالکل آپ کے ہم رنگ۔ میں نے اُن سے پوچھا۔ کہ آپ ہندوستان سے آئے ہیں۔ اُنہوں نے کہا۔ نہیں۔ ہم مالٹا کے باشندے ہیں۔ اب میں نے پوچھا۔ کہ آپ بھی اُن کے ساتھ ہوں گے۔ اور آپ سے پوچھا۔ تو آپ ہندوستانی نکلے۔ میں نے آج دو دفعہ غلطی کھائی۔ مگر میرا کیا قصور ہے۔ آپ کے رنگ اس قدر ملتے ہیں۔ ہم پوچھنے ہی کو تھے۔ کہ وہ مالٹا کے آدمی کہاں ہیں۔ کہ وہ سامنے آگئے۔ اُس انگریز سے وہ اُن سے باتیں ہو چکی تھیں۔ اُس نے ہمیں اُن سے ملا دیا۔ جب ہم سب وہاں سے فارغ ہو کر ریل میں سوار ہوئے۔ تو اتفاق سے ہم اور ہمارے ہم رنگ مالٹی ایک ہی کمرے میں تھے ہم نے اُن سے پوچھا۔ "آپ کہاں جاتے ہیں"۔ اُنہوں نے کہا۔ لوسرن۔ پھر کیا تھا۔ ہم اُچھل پڑے۔ کہ راستے بھر کے لئے رہبر خدا نے بھیج دیے۔ بشیر نے برمحل یہ شعر پڑھا ؎

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

ہم چلتے وقت اس خیال سے متردد تھے۔ کہ سوئٹزرلینڈ میں زبان نہ جاننے سے بہت دقت ہوگی۔ لیکن ان مالٹی حضرات کے مل جانے سے وہ تردد رفع ہو گیا۔ یہ یورپ کی کئی زبانیں جانتے تھے۔ اور لوسرن کی سیر پہلے بھی کر چکے تھے۔

ہمارے دو ہم سفروں میں ایک نوجوان تھا۔ ایک بوڑھا۔ نوجوان چرٹ اور سگرٹ کی تجارت کرتا تھا۔ اور بوڑھا مالٹا کے ایک مدرسے کا معلّم تھا۔ دونوں متوسط حالت کے آدمی تھے۔ مگر محض شوقِ سیر سے نکلے تھے۔ شمالی افریقہ کی سیر کرتے ہوئے سپانیہ پہنچے۔ وہاں سے انگلستان آئے۔ چند روز لندن میں رہ کر اب سوئٹزرلینڈ اور اٹلی کے راستے گھر جا رہے تھے۔ ہم نے اُن کی ہمت کی تعریف کی۔ انہوں نے کہا یورپ میں سیر و سیاحت معمولی زندگی کا ایک ضروری حصّہ ہے۔ ہم لوگ سال بھر محنت سے اپنا کام کرتے ہیں۔ لہٰذا دو مہینے ہر برس آرام اور تفریح کے لئے بھی چاہئے۔ اِس سے آدمی

تندرست رہتا ہے۔ اور باقی مہینوں میں کام اچھی طرح کر سکتا ہے۔ آرام کے دنوں میں گھر پڑے رہنے کی نسبت تبدیلِ آب و ہوا اور طرح طرح کے نظارے دیکھنا زیادہ مفید ہے۔ خصوصاً سیر سے انسان کے خیالات میں وسعت پیدا ہوتی۔ اور گھر میں گھسے رہنے کی جو تنگ خیالی ہوتی ہے۔ رفع ہو جاتی ہے۔ ادھر اُدھر کی چند اور باتیں کرنے کے بعد وہ آپس میں اپنی زبان میں باتیں کرنے لگے۔ اور ہم اپنی زبان میں۔ ایک دفعہ میں نے جو ذرا کان لگایا۔ تو اُن کی گفتگو میں کئی الفاظ عربی معلوم ہوتے۔ میں نے پوچھا۔ "آپ عربی بول رہے ہیں؟" انہوں نے جواب دیا۔ نہیں یہ مالٹی ہے۔ عربی اور اطالین کی ترکیب سے بنی ہے۔ اور اس میں بکثرت عربی الفاظ اب تک موجود ہیں۔ ایک عرصہ تک عربوں کا جزیرہ مالٹا میں عمل دخل رہا ہے۔ اور مالٹی زبان کی ترکیب اُس زمانے کا ایک پائدار نقش ہے۔

بولوین سے جب گاڑی چلی ہے۔ تو چھ بجے تھے۔ آٹھ بجے تو سات بولی تھی سٹیشن کے قریب آنے ہی دریچے سے سر نکال کر ہم نے بہت چاہا۔ کہ شہر کے نقشے کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ مگر بغیر اس کے کہ چراغوں کی روشنی یہ بتائے کہ خاصا بڑا شہر ہے۔ کچھ زیادہ پتہ نہ چلا۔ ہاں تھوڑی دیر سٹیشن کی سیر کی۔ اور پھر گاڑی میں آ بیٹھے۔ ہمراہیوں نے سونے کی تیاری کی۔ مگر مجھے نیند کیونکر آتی۔ سوئٹزرلینڈ کو دیکھنے اور ایشیا کے سوئٹزرلینڈ (کشمیر) سے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے میں ہمہ تن انتظار تھا۔ اور کہتا تھا۔ کہ صبح کب ہو گی۔ مشکل یہ کہ رات کو باغ و راغ کا نظارہ بھی ممکن نہ تھا۔ اور تو کچھ نہ ہو سکا۔ سٹیشن شماری جاری رہی۔ اگلے وقتوں کے لوگ انتظار میں اختر شماری کیا کرتے تھے۔ اب وہ ترکیب پرانی ہو گئی۔ ریل کے سفر میں رات کے وقت سٹیشن گننا نئے زمانے کی ایجاد ہے۔ سچ ہے۔ ہر زمانے کی ضرورتیں جُدا ہیں۔ اور ایجاد ضرورت کے بطن سے پیدا ہوتی ہے۔ یا جیسا انگریزی والے کہتے ہیں۔ "ضرورت ایجاد کی ماں

ہے۔ چنانچہ ریل کے سفر میں بیتاب طبیعتوں کے واسطے انتظار کی مشکل گھڑیاں آسان کرنے کے
لیے "سٹیشن شماری" ایجاد ہوئی۔ اگر کسی نے تجربہ نہ کیا ہو۔ تو میں سفارش کرتا ہوں۔ کہ یہ نسخہ
آزمانے کے قابل ہے۔ اختر شماری سے کم دلچسپ نہیں۔ اور طبیعت اس سے تھکتی کم ہے۔ نئی
سواریوں کی بیقراری کہ گاڑی میں جگہ ملے۔ اُترنے والوں کی بے تابی کہ جلد اُتریں۔ ریل کے
اہلکاروں کا اِدھر اُدھر یوں ٹہلنا۔ جیسے اس چھوٹے سے قطعۂ زمین کے خود مختار بادشاہ ہیں
سٹیشن پر روشنی کا زور سٹیشن کے باہر اندھیرے ہیں مسافروں اور لالٹینوں کی رنگا رنگی اگر کوئی
کہے۔ کہ یہ تماشا دلچسپ نہیں۔ تو اُس کا نام صاحبانِ مذاقِ سلیم کی فہرست سے خارج کر
دینا چاہیئے۔ میں ہر سٹیشن کو اُٹھ کر دیکھتا تھا۔ اور اس کا نام پڑھ کر پنسل سے اپنی
یادداشت کی کتاب میں ٹانک لیتا تھا۔ پہلے دو سٹیشن ذرا جلد جلد آئے۔ اور پھر دیر سے
آنے لگے۔ لاوآن۔ ریم۔ شاآون۔ شوبان۔ درتسو۔ بلفونٹ کی تو رسید دے سکتا ہوں۔ اس
کے بعد چشمِ انتظار کو بھی خواب نے آ لیا۔ رات آخر رات ہے۔ قدرت کا زبردست نظام
اپنے احکام کی تعمیل کرائے بغیر کسے چھوڑتا ہے۔ صبح کے قریب ذرا سی دیر کے لئے آنکھ لگ
گئی۔ اور انتظار کا خاتمہ ہو گیا۔ آنکھ کھلی تو معلوم ہوا زرن سٹیشن پر گاڑی کھڑی تھی۔ یہاں سے
گویا سوئٹزرلینڈ کا علاقہ اور جرمن زبان کا دور شروع ہوا۔ اب عمارات جرمن میں مکانوں
کے نام جرمن ہیں۔ کثرت جرمن بولنے والے لوگ۔ آ کر شریکِ راہ ہونے لگے۔

مگر یہاں اُن کی کسے فکر تھی۔ صبح صادق کا سہانا سماں سوئٹزرلینڈ کا خوبصورت
ملک۔ ریل کے دونوں طرف سبزہ ہی سبزہ اور سبزہ پر شبنم کے موتی بہار دے رہے تھے۔
میں کوٹ پہن کر بیٹھ گیا۔ اور علاقہ کی سیر کرنے لگا۔ اتنے میں سورج نے سر نکالا۔
درختوں کے پتوں کا ماہ جولائی کا گاڑھا سبز رنگ آغازِ بہار کے ہلکے دھانی رنگ کی
جھلک دکھانے لگا۔ مقام بال پر گاڑی رکی تو وہاں کی آبادی کو دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔
اور سب سے زیادہ خوشی یہ تھی۔ کہ گھڑی دو گھڑی میں لوسرن پہنچیں گے۔ صبح کے سات بجے

گاڑی ایک عالی شان سٹیشن پر تھی۔ ایک پُر فضا جھیل اُس کے کنارے درختوں کی قطار اور درختوں کے پیچھے بلند اور شاندار عمارتیں۔ یہی لوسرن تھا۔ دیکھتے ہی رات کی کلفت بھول گئی۔

لوسرن ا۔ سٹیشن نہایت عمدہ موقعہ پر واقع ہے۔ نکلتے ہی سامنے جھیل کا وسیع تختۂ آب ہے۔ دائیں ہاتھ عجائب خانہ کی عمارت اور بائیں ہاتھ کو بڑے بڑے ہوٹل۔ یہاں کسی نے نہیں پوچھا۔ کہ اسباب میں کیا ہے۔ یہاں کے لوگ مسافروں کو ہر طرح خوش کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اُن کی روزی مسافروں کی کثرت آمد و رفت سے ہے۔ ہم اپنے انہی دوستوں کے ساتھ ایک ہوٹل میں گئے۔ جہاں وہ پہلے ٹھہر چکے تھے۔ انہوں نے ہمیں کہا کہ ذرا سستا لیں۔ دوپہر کو جہاز پر سوار ہو کر جھیل کی سیر کو چلیں گے۔ ہم نے کہا۔ بہت خوب۔ لیکن سستانے کا وقت ہمارے پاس کہاں تھا۔ ہمیں دوسری صبح کے لئے کسی نئے نظارے کی فکر تھی۔ اور لوسرن میں جو کچھ دیکھنا تھا۔ اُس کے لئے یہی دن تھا۔ بس ہوٹل میں اسباب رکھتے ہی مُنہ ہاتھ دھو کر ہم باہر نکلے۔ کہ بارہ بجے تک نزدیک نزدیک کی چیزیں دیکھ آئیں۔

سوئٹزرلینڈ کا ہر حصہ ویسے تو حُسنِ قدرت کا ایک اعلےٰ نمونہ ہے۔ مگر لوسرن اور اُس کے قرب و جوار کو یہاں سینری[1] کا خلاصہ کہہ سکتے ہیں۔ حکومت کا صدر مقام اگر برن ہے۔ تو مناظرِ قدرت کا صدر مقام لوسرن ہے۔ کوہ الپس کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں کے دیدار اور اُس کے شفاف چشموں کی زیارت کے لئے اس سے عمدہ موقع مشکل ہے۔ کوہستان کے ہر قابلِ دید حصے میں یہاں سے پہنچ سکتے ہیں۔ مناظرِ قدرت

[1] مناظر کے لئے انگریزی لفظ ہے "سین" انگریزی میں منظر کو کہتے ہیں۔ ناٹک کے تماشے کے مختلف پردوں کو بھی سین کہتے ہیں۔ ناٹک والوں کے ذریعہ سے الفاظ اُردو میں مروّج اور بعض نامور مصنفینِ اُردو کی بدولت مستند ہو گیا ہے ۱۲

کے شیدائی دُنیا کے ہر حصّے سے یہاں آتے ہیں۔ اور محبُوبۂ بہار کو بہ صد رعنائی جلوہ گر پانے میں۔ موسمِ گرما بسر کرنے کے لئے اس سے زیادہ مزے کی جگہ کیا ہوگی۔ جنہیں دولت اور فراغت دونوں میسّر ہیں۔ وہ تو یہاں آکر مہینوں جانے کا نام نہیں لیتے۔ اس کو مرکز قرار دے کر گرد و نواح کی سیر کر آتے ہیں۔ اور پھر یہاں آجاتے ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے۔ کہ ہر سال بہار کے آغاز اور گرما کے اختتام کے درمیان یعنے اپریل کے شروع سے ستمبر کے آخیر تک کوئی تین لاکھ آدمی دوسرے مقامات سے یہاں آتے ہیں۔ ان میں آدھے اگر راہرو فرض کئے جائیں۔ جو آتے جاتے تھوڑی دیر کے لئے اس پُر فضا مقام کی سیر کرتے ہیں۔ تو آدھے ایسے ہیں۔ جو یہاں معقول عرصہ کے لئے قیام کرتے ہیں۔ انہی آنے جانے والوں سے یہاں کے کثیر التعداد ہوٹل اور دیگر مہمان خانے آباد ہیں۔ اور انہی کے طفیل سیر و سفر کے لئے ہر طرح کی آسائشیں یہاں مہیا ہیں۔ الپس کی کئی چوٹیوں تک ہلکی ریل جاتی ہے۔ اس کی سڑک کو دُور سے دیکھیں۔ تو سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی قلّہ کوہ تک چلی گئی ہے۔ گاڑی کو اس ڈھلوان سڑک پر لے جانے کے لئے اس کے انجن اور گاڑیوں کی ساخت میں ایسی کلیں لگائی گئی ہیں۔ جن سے گاڑی قابو میں رہے۔ اور نیچے کو لُڑک نہ جائے جھیل کی سیر کے لئے ہر وقت دُخانی جہاز چلتے ہیں۔ جو مختلف قابلِ سیر موقعوں پر ٹھہرتے ہوئے جاتے ہیں۔ اور ہر جگہ لوگ اُتر کر آگے تھوڑی دُور پیدل سیر تماشا کے لئے چلے جاتے ہیں۔ اس کے سوا گاڑیاں ہیں۔ گھوڑے ہیں۔ ہاتھ سے چلانے کی کشتیاں ہیں جس مذاق کا کوئی آدمی ہو۔ اپنی پسند کی سواری ڈھونڈ لے۔ اور سیر کرتا پھرے۔ سبزہ و گل اور کوہ و دریا کے تماشے کے ساتھ شہروں کی زندگی کے مزے ملانا چاہے۔ تو جھیل کے کنارے گھنے سایہ دار درختوں کی دوہری قطار ہے۔ وہاں کرسیاں اور بنچیں رکھی ہیں۔ لوگوں کا جماؤ رہتا ہے۔ بیٹھ جائے اور تماشا دیکھا کرے۔ شام کے قریب باجا بجتا ہے۔ شام کے بعد ناٹک وغیرہ کے تماشے شروع ہوتے ہیں۔ جھیل کے کنارے روشنی ہی روشنی نظر آتی ہے۔ اور مکانوں کے لیمپ

اور سڑک کی لالٹینیں اپنا عکس پانی میں ڈالتی ہیں۔ اور عجیب بہار دیتی ہیں۔ لیکن اگر کوئی شہروں کی ان معمولی دلچسپیوں سے گھبرا کر یہاں آیا ہو۔ اور گوشۂ تنہائی کا متلاشی ہو۔ تو وہ آبادی سے کچھ دُور نکل جائے۔ چاروں طرف مناظرِ قدرت اس کے مُونس و ہمدم ہوں گے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں ہوگی۔ اور برف پوش پہاڑوں کی دل لُبھانے والی ہوا۔ وہ ہوگا اور اس کے خیالات نہ کوئی روکنے والا نہ کوئی ٹوکنے والا۔ نہ اس تخلیئے میں خلل ڈالنے والا۔ اگر کہیں اسی شوق کا اُس کا ہم خیال اور بھی آنکلا۔ تو وہ اس گوشے کو آباد پاکر خود ہی گوشہ ڈھونڈھ لے گا۔

ہماری سَیر ان دونوں قسموں سے علیحدہ تھی۔ ہمارا اس پر عمل تھا۔ کہ جی بھر کر دیکھنا میسر نہ ہو۔ تو نہ ہونے سے ایک جھلک بھی بہتر ہے۔ جیسے تیتری باغ کی سَیر کرتی ہے۔ ایک پھول سے دوسرے پر ہے

ہر گلے سا رنگ و بُوئے دیگر است

اسی طرح ہم تھے۔ کہ ہر چیز کا تھوڑا تھوڑا نمونہ دیکھتے پھرتے تھے۔ ہر نئے مقام کو ابھی پہلا سلام۔ ابھی آخری سلام۔ جانتے تھے۔ کہ یہی ایک منظر ہے۔ جس کی اجازت ہے۔ پھر کہاں ہم اور کہاں یہ حُسنِ قدرت و صنعت کے جلوے۔

عجائب خانہ صلح و جنگ:۔ لوسرن میں پہلی چیز جو ہم نے دیکھی۔ وہ عجائب خانہ تھا۔ بیس مختلف حصّوں میں منقسم ہے۔ اس میں آلاتِ حرب اور طریقِ جنگ میں قدیم زمانوں سے لے کر آج تک جو تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ سلسلہ وار دکھائی گئی ہیں۔ اور اس کی منشا تحریکِ صلح عام کی تائید ہے۔ داخل ہوتے ہی ایک بڑا ہال ہے جو اسلحہ جنگ سے پُر ہے۔ وسط میں توپیں رکھی ہیں۔ پُرانی توپوں سے لے کر زمانہ حال کی کرپ توپیں تک یہاں موجود ہیں۔ اور ہر ایک کے اُوپر لکھا ہُوا ہے۔ کہ کون سی کس زمانے کی یادگار ہے۔ دیواروں پر ایک طرف نیزے۔ برچھیاں۔ تلواریں۔ اور دوسری طرف

طرح طرح کی بندوقیں سج رہی ہیں۔ ایک کمرہ اسلحۂ روما کے لئے ہے۔ اور ایک ازمنۂ متوسط یورپ کے لئے۔ جنگ سی سالہ اور جنگ ہفت سالہ میں جو اسلحۂ استعمال ہوتے تھے اُن کا علیحدہ مجموعہ ہے۔ پہاڑی لڑائی کا سین جُدا ہے۔ اور جنوبی افریقہ کی جدید لڑائی کا جُدا یہ نظارے تاریک کمروں میں بڑی خوبی سے دکھائے گئے ہیں۔ کہ دیکھنے والا اندھیرے میں ہوتا ہے۔ اور سپاہیوں کی تصویروں اور اسلحہ پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کے گرد جنگل پہاڑ اور لڑائی کے میدان کا نقشہ ہُو بہُو دکھائی دیتا ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ لڑائی ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ آخر میں جنگ رُوس و جاپان بھی موجُود ہے قلعہ بندی کے دستور کی ترقی کے مختلف مدارج بیماروں اور زخمیوں کے اُٹھانے اور لے جانے کی تدابیر۔ جنگ میں عارضی پُل بنانے اور توڑنے کے نمونے۔ بحری لڑائی کی خصوصیات سب کا ایک خاکہ ذہن میں آجاتا ہے۔ ان سب کے بعد صُلح کا محل آتا ہے۔ وہاں یورپ کے بڑے بڑے مُدبّروں کی تصویریں رکھی ہیں۔ جو صُلح عام کے حامی ہیں۔ اور جو مجالس صُلح میں شریک ہو چکے ہیں۔ ان تصویروں میں ایک ایرانی مدبّر کی تصویر دیکھ کر ہمیں خوشی ہوئی۔ اس تصویر کے نیچے لکھا تھا۔ ارفع الدولہ مرزا رضا خاں دانش۔ پرنس صُلح۔ اہل یورپ نے آج کل ایسی باتوں کا کچھ ایسا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ کہ ہمیں کسی ایشیائی کا مدبّروں کی صفِ اوّل میں کھڑا ہونا غنیمت معلوم ہُوا۔

اس کمرے میں جس پر صُلح کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ مختلف زبانوں میں صُلح کے متعلق کتابیں اور رسالے اور اخبارات رکھے تھے۔ جن میں سے اکثر مُفت تقسیم ہونے کے لئے تھے۔ اور ہر شخص مجاز تھا۔ کہ اُن میں سے چند چُن لے۔ ہم نے چند پرچے وہاں سے لئے۔ لیکن ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہُوا۔ کہ ٹرکی کے ارمنی وغیرہ باشندوں کے بعض نہایت جوش دلانے والے رسالے فرانسیسی زبان میں جن میں ترکوں کو یورپ سے نکالنے اور اُن کے خلاف اہل یورپ کو اُکسانے کے مضمون مندرج تھے۔ وہ بھی انہیں

کاغذات صُلح میں رکھے تھے۔ کیا مجلس صُلح ایسی ہی تدابیر صُلح پھیلانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اور اُن کے قول و فعل میں ایسی ہی سطابقت چاہیئے؟ حقیقت یہ ہے کہ صُلح عام کی تحریک سے مُدبّرین یورپ کا مقصود اصلی فقط اسی قدر ہے۔ کہ یورپ کی عیسائی سلطنتوں میں صُلح رہے۔ اور وہ سب مل کر باقی دُنیا پر اپنا غلبہ اور اقتدار قائم رکھیں۔ لیکن حقیقی صُلح ممکن نہیں۔ جب تک دل یورپ اور اُن کے مدبّروں کے دماغ سے اپنے املاک کی توسیع کی ہوس اور ایشیائی ممالک اور اقوام و مذاہب کی حقارت کا خیال نہ نکل جائے۔ کیونکہ یہی دو خیال فساد کی بنا اور جنگ و جدال کی جڑ ہیں۔ اس صُلح و جنگ کے عجائب خانے آلات حرب اور نمائش جنگ کو اسباب صُلح سے جو نسبت ہے۔ غالباً وہی نسبت ابھی یورپ میں شوقِ جنگ و شوقِ صُلح میں قائم ہے۔ صُلح کے متعلق باتیں ہیں۔ اور دوسروں کو نصیحتیں اور اپنے ہاں ہر قوم روز زیادہ زیادہ روپیہ سامان جنگ پر صرف کر رہی ہے۔ اور یورپ کی ذہانت اور اس کے علوم و فنون کی ترقی ایسی ایجادات کے کام آ رہی ہے۔ کہ وقت جنگ زیادہ سے زیادہ انسان تھوڑے سے تھوڑے وقت میں کس طرح بے جان کئے جا سکتے ہیں۔ اور زمین سے گولے مارنے کی بجائے آسمان پر چڑھ کر کس طرح آہن و آتش کی بوچھاڑ ہو سکتی ہے۔

برفانی باغ:۔ اس عجائب خانۂ صنعت سے نکل کر ہم ایک عجائب خانہ قدرت کی طرف گئے۔ جسے یہاں گلیسیرین گارڈن" یعنی تودہ ہائے برف کا باغ کہتے ہیں۔ برف کے یہ تودے اُس زمانہ کی یادگار ہیں۔ جب سارا سوئٹزرلینڈ برف کے نیچے دبا ہوا تھا۔ یہ زمانہ تاریخی کتب سے پہلے گزرا ہے۔ ماہرین علم طبقات الارض نے اس کا پتہ چلایا ہے۔ اور اب وہ یقینی طور پر ثابت کر سکتے ہیں۔ کہ ایک وقت میں روئے زمین کا سارا شمالی حصّہ ایک سطح برفانی تھا۔ کہیں اتفاق سے کوئی جگہ خالی تھی۔ تو وہاں بھی حضرتِ انسان کا وجود نہ تھا۔ البتہ کچھ حیوانات تھے۔ مگر اب اُن حیوانات کی بھی نسل

مفقود ہے۔ کہیں کہیں اُن کے پنجر اور ہڈیاں دستیاب ہوئی ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُن کی ساخت کیا تھی۔ اور موجودہ جانوروں سے کس قدر نرالی تھی۔ کہا جاتا ہے۔ کہ اس برفانی عہد سے قبل ایک زمانہ ایسا تھا۔ کہ ساری زمین پر پانی ہی پانی تھا۔ مگر اِس وقت اُس زمانہ سے بحث نہیں۔ بلکہ صرف عہدِ برف سے کام ہے جس کی یہ حیرت انگیز نشانی نُوسرن میں موجود ہے۔ برف کے پگھلنے سے جو سیلاب پہاڑوں کے اندر رواں ہُوا۔ اس میں کئی بڑے بڑے تودے برف کے جو پگھلنے سے بچ رہے۔ بہتے ہوئے آئے۔ اور اپنے زور میں پتھروں کو تراشتے ہوئے آخر خود ایک چکر میں آ پھنسے۔ یعنی ایسی جگہ پہنچے۔ جہاں وہ چاروں طرف مضبوط چٹانوں سے گھر گئے۔ اب نہ رُوئے "ماندن نہ راہ رفتن" جائیں تو کہاں جائیں۔ پانی ہے کہ اُوپر سے برابر آرہا ہے۔ اور انہیں حرکت دیے جاتا ہے۔ مگر یہ قلعہ بند ہیں۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر آرام سے بیٹھے تھے۔ اپنی جگہ چھوڑ کر اس مصیبت میں آن پھنسے کہ رات دن ایک مقام پر چکّی کی طرح گھوم رہے ہیں۔ خود بھی گھِستے ہیں۔ اور پتھروں کو بھی گھِساتے ہیں۔

یہ خدمت صدیوں سے ان کے سپُرد ہے۔ نہ کبھی رُخصت۔ نہ تعطیل۔ اتنی خیریت تھی کہ چشمِ مردم سے اُن کی یہ سزا پوشیدہ تھی۔ مگر آج کل انسان کو یہ جُرأت ہوئی ہے۔ کہ ہر جگہ کارخانۂ قدرت سے پردۂ راز اُٹھانا چاہتا ہے۔ چنانچہ بیچارے معتوب تودہ ہائے برف کی پردہ دری بغیر بھی نہ رہا۔ ۱۸۷۲ء تک یہ قطعہ زمین جہاں اب یہ عجیب برفانی باغ ہے۔ ایک چراگاہ تھا۔ اور اس کی ہری ہری گھاس کے نیچے یہ برفانی کارخانہ جاری تھا۔ مگر کسی کو اُس کی خبر نہ تھی۔ اتفاق سے ایک جگہ زمین میں سُوراخ ہو گیا۔ اور وہاں سے اس برفانی چکّی کی آواز آئی۔ کھودنے پر یہ عجوبہ نظر آیا۔ اور پھر ایک چکّی کے دریافت ہونے سے اسی قرب میں کئی اور چکیاں نکل

آئیں۔ اور اس حصّہ کو تماشائیوں کے محوِ حیرت کرنے کے لئے آراستہ کر دیا گیا۔ اس کھُدائی میں اُس عہد کے جانور اور درخت ملے۔ جو پتھر کی طرح سخت بن چُکے تھے۔ اب لوگ جوق در جوق ان عجائبات کو دیکھنے آتے ہیں۔ تاریخ و جغرافیہ دونوں علوم کے شائقوں کی دلچسپی کا سامان یہاں موجود ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے قدیم باشندوں کی جھونپڑیوں اُن کے ہتھیاروں اور اَوزاروں کے نمونے بھی اسی احاطے میں ایک جگہ دکھائے گئے ہیں۔ اور عام تماشائیوں کی دلچسپی کے لئے ایک نہایت خوش وضع بھُول بھلیاں بنائی گئی ہے۔ جو عربوں کے مشہور قصر الحمرا کی بھول بھلیاں کی نقل ہے بھُول بھلیاں سے نکلتے باغ کا وہ حصّہ سامنے آتا ہے۔ جہاں چٹان کاٹ کر ایک بڑا شیر بنایا گیا ہے۔ جس پر شہر لُوسرن کو ناز ہے۔ اور جو فی الواقع سنگ تراشی کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔

باغ سے لَوٹتے ہوئے **ہوف کرک** جو کیتھولک مذہب کا بڑا گرجا ہے۔ رستے میں پڑتا تھا۔ ہم نے اُسے بھی ایک نظر دیکھا۔ بلندی پر واقع ہے۔ اور بہت سی سیڑھیاں چڑھ کر اس کے دروازے تک پہنچتے ہیں۔ عام طور پر عیسائی گرجاؤں میں ایک مخروطی مینار ہوتا ہے۔ اس گرجا کی خصوصیت یہ ہے۔ کہ اس کے دو مخروطی مینار بنائے گئے ہیں۔ جنہیں جُڑواں مینار کہتے ہیں۔ گرجا کے اندر لکڑی کا کام بہت خوب صُورت بنا ہے۔ پندرھویں صدی عیسوی کی ساخت کا نمونہ ہے۔ اُس زمانہ میں اہلِ سوئٹزرلینڈ کو لکڑی کے کام کا بہت شوق تھا۔ گو اب بھی وہ اس فن میں پیچھے نہیں۔ اس گرجا کی شہرت صرف اس کی بڑائی اور وسعت کے لحاظ سے نہیں۔ بلکہ اُس کے ارغنون کی وجہ سے ہے۔ یورپ کے گرجاؤں کے ارغنون بجائے خود عجائبات ہیں۔ دھات کی لمبی لمبی بانسری نما نلیاں متوازی رکھ کر ایسی بلند اور سُریلی آواز پیدا کی جاتی ہے۔ کہ گرجا گونج اُٹھتا ہے۔ فنِ موسیقی کے ماہر

ایک ایک ارغنون کی ساخت میں اپنا کمال صرف کر دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ ارغنون جو ہوف کرک کی زینت ہے۔ گاسلر نامی ایک اُستاد نے ۱۶۵۰ء میں بنایا تھا۔ اس کے بعد ... نامی ایک اور اُستاد نے ۱۸۶۲ء میں اس کی تجدید کی۔ ۱۸۹۰ء میں پھر اس کی مرمت ہوئی ہے۔ چار ہزار نو سو پچاس ... یاں اس ارغنون میں ہیں۔ لوگ دور دور سے اس کا راگ سننے آتے ہیں۔ شام کے وقت ہر روز یہ ارغنون بجتا ہے اور اس کا داخلہ ایک فرانک دس آنے ہوتا ہے۔

جھیل کی سیر:۔ جھیل لوسرن جس سے شہر لوسرن نے نام پایا ہے۔ اس ملک کی نہایت خوبصورت جھیلوں میں سے ہے اور بعض اعتبارات سے بڑھ کر گنی جاتی ہے اس کا طول ۲۳ میل ہے۔ اور عرض آدھے میل سے لے کر تین میل تک ہے۔ چاروں طرف بلند پہاڑوں کی سرسبز چوٹیاں اور درمیان میں یہ جھیل عجیب بہار دیتی ہے جس سیاح کو فرصت ہو۔ وہ یہاں مہینوں رہے۔ اور ہر روز کشتی میں بیٹھ کر سیر کو جائے جہاں کہیں خشکی پر اُتر کر کوہستان کی سیر کرے گا۔ اُس کے لئے کوئی نہ کوئی قابل دید منظر موجود ہوگا ہمیں صرف ایک دن کی مہلت دی گئی تھی۔ اس لئے ہم گرجا سے واپس آتے ہی کشتی میں بیٹھ کر جھیل کی سیر کو نکلے۔ مطلع صاف تھا۔ ہوا خوشگوار تھی۔ گرد و پیش کے مناظر مزا دے رہے تھے۔ ابھی لطف سے سیری نہیں ہوئی تھی۔ کہ وہ سٹیشن آگیا۔ جہاں سے ہائی پہاڑی ریل پر بیٹھ کر کوہ الپس کی مشہور چوٹی "رگی کلم" کی سیر کو جاتے ہیں۔ ہم وہیں اُتر پڑے۔ اور ریل پر سوار ہو لئے۔

رگی کلم کا منظر:۔ ریل سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی پہاڑ پر چڑھنے لگی۔ ایسی ایسی ڈھلوان چوٹیوں پر چڑھتی ہے۔ کہ خیال ہوتا ہے۔ اب گری۔ اب گری۔ مگر فن انجینیری کی خوبی دیکھئے۔ گاڑیوں اور آہنی سڑک دونوں میں وہاں یہ خصوصیت پیدا کی ہے۔ کہ گاڑیاں لڑھکنے نہ پائیں۔ اور مزید احتیاط کے لئے اُوپر جاتے وقت انجن

نیچے سے اُوپر کو دھکیلے لئے جاتا ہے۔ اور رِگی پر جا کر ٹھہرتا ہے۔ جو اس سطح سے جہاں سے ریل ملی تھی۔ چار ہزار تین سو ساٹھ فٹ اور سطح سمندر سے پانچ ہزار نو سو پانچ فٹ بلند ہے صبح و شام سینکڑوں تماشائی اس چوٹی پر موجود رہتے ہیں۔ اور جو تماشا وہاں اُنھیں نظر آتا ہے۔ الفاظ اس کے بیان سے قاصر ہیں۔ تصور کیجئے۔ کہ چودہ جھیلیں چھوٹی بڑی اور اُن کے گرد کے اشجار و انہار۔ کوہ و ہاموں شہر و قریہ سب وہاں سے نظر آتے ہیں۔ اور یہ سین اہلِ نظر کے دل چھینے لیتا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ اس سے ذرا اُونچی چوٹیاں اسی کے قریب برف سے ڈھکی ہوئی نظر آتی ہیں۔ انگلستان اور امریکہ کی عورتیں جو مناظرِ قدرت کی شناسا آنکھ رکھتی ہیں۔ اس جنت نگاہ کی داد دیتے دیتے دیوانہ ہوئی جاتی ہیں۔ "آہاہا۔ اِدھر دیکھنا کیسا دلفریب سین ہے۔ اہو ہو۔ اُدھر دیکھو کتنا پیارا انظارہ ہے" ایشیائیوں میں اگر کوئی حُسنِ قدرت کے مزا لینے کی قابلیت رکھتا ہو۔ یا پیدا بھی کر لے۔ تو یہ جوش کہاں سے لائے گا۔ اور حُسنِ قدرت کے رُو برو یہ زبان آوری کہاں سے پائے گا۔ یاں تو حُسن چپ لگا دیتا ہے۔ اور اس کا رُعب مُہرِ لب بن جاتا ہے۔ ہم چُپ چاپ اس عجیب نظارے کو دیکھا کئے۔ اور ارد گرد کے شور سے بے پرواہ۔ شام تک اسی محویت میں پڑے رہتے۔ اگر ریل کی سیٹی یہ یاد نہ دلا دیتی۔ کہ شام سے پہلے واپس جا کر جھیل کے کنارے چراغاں کی سیر بھی دیکھنے کے لائق ہے۔ اُٹھے مگر بادلِ ناخواستہ۔ اسی چوٹی پہ ایک بڑا عالی شان ہوٹل مسافروں اور تماشائیوں کے آرام اور تفریح کے لئے بنا ہوا ہے۔ وہ سامنے تھا۔ اس کی صورت اور اس کے خوشنما صحن میں میزوں کے ارد گرد لوگوں کے جمگھٹے دیکھ کر ہمیں بھی یاد آیا۔ کہ چاء کا وقت ہے۔ وہاں چاء پی۔ تازہ دم ہوئے۔ اور ریل پر پہنچے۔ واپسی پر ریل تیز تر چلی۔ کوئی آدھ گھنٹے میں جھیل کے کنارے تھے۔ وہاں کشتی فوراً مل گئی۔ اور ہم اپنے قیام گاہ کے قریب آ پہنچے۔ تھوڑی دیر تک کنارِ آب سیر کرتے رہے۔ آخر تھک کر ہوٹل میں آئے۔ کھانا کھایا اور سو گئے۔ کیونکہ سفرِ اٹلی در پیش تھا۔

غرضیکہ لوسرن میں ایک دن اور ایک رات ٹھہر کر ہم اٹلی کی طرف روانہ ہوئے دن کے دس بجے جو گاڑی چلی۔ اُس نے پانچ بجے کے قریب ہمیں اٹلی کے مشہور شہر میلان میں پہنچا دیا۔ دن بھر سوئٹزرلینڈ کے نظر فریب سین آنکھوں کے سامنے رہے۔ اس سے زیادہ دلچسپ اور پُرلطف سفر کیا ہوتا؟ مگر ہر پھول کے ساتھ کانٹا لگا ہوا ہے راستے میں اس قدر ٹنل پڑے۔ کہ دھوئیں کے مارے بار بار دم گھٹتا تھا۔ اور رُوح کو جو تازگی اور فرحت سبزپوش پہاڑوں۔ اُن کی سفید چوٹیوں اور اُن کے آبشاروں کو دیکھ کر ہوتی تھی۔ وہ سب اس دھوئیں سے مُبدّل بہ پریشانی ہو جاتی تھی۔ کبھی صنعت اور اہلِ صنعت پر غصّہ آتا تھا۔ کہ اُنہوں نے اپنے طمع کی خاطر قدرت کے پاکیزہ اور شاندار مناظر کے ساتھ کس قدر زیادتی کی ہے۔ اور ان کی عمدگی اور پہاڑوں کے سکون میں کتنا خلل ڈالا ہے۔ مگر ساتھ ہی انصاف کہتا تھا۔ کہ اُن کی کوہ کنی کی داد دی جائے۔ اور چونکہ ان کا منشا اُن کارناموں سے محض ذاتی فائدہ یا ذاتی نمونہ نہ تھا بلکہ اُن کی یہ کوشش تھی۔ کہ ہزاروں بندگانِ خُدا جو ویسے اُن نظاروں سے بالکل محروم رہتے۔ اُنہیں اس سے بہرہ ور کیا جائے۔ اس لیے اُن کی محنتیں شکریہ کی مستحق ہیں۔ نہ کہ شکایت کی۔ یہ ٹنل ہی ہیں جن کی بدولت گویا زمین کی طنابیں کھینچ کر عصرِ جدید کے ان فرہادوں نے سوئٹزرلینڈ اور اٹلی کو ملا دیا ہے۔ سب سے بڑا ٹنل جو ہمارے راستے میں پڑا۔ وہ سنٹ گاتھرڈ کا مشہور ٹنل تھا۔ جس کے اندر ریل آدھ گھنٹے کے قریب رہی۔ اس لیے دوسری طرف مُلک کا نقشہ بدلنے لگا۔ بلند پہاڑوں کی جگہ میدان نظر آنے لگے۔ مگر یہ میدان سرسبزی میں رشکِ گلزار تھے۔ تھوڑی دیر بعد آسمان کے صاف نیلگوں رنگ اور آفتاب کی تیز چمک نے خبر دی۔ کہ اٹلی کی تاریخی سرزمین شروع ہوئی۔ اسٹیشنوں کے ناموں نے اس خبر کی تصدیق کی۔ لوگانو۔ کیاسو۔ کاموجس نام کو پڑھو۔ واؤ پر ختم ہوتا ہے۔ یہ احساس کہ ہم اٹلی میں ہیں۔ ایک عجیب کیفیت رکھتا تھا۔ انگلستان اور فرانس کے

مصنفین نے نظم و نثر میں اٹلی کی اس قدر تعریف کی ہے۔ اور بے شمار فسانے اور ڈرامے یہیں کے قصوں پر مبنی ہیں۔ یہاں کی تاریخ کا تاریخ یورپ پر بالخصوص اور تاریخ عالم پر بالعموم اتنا اثر پڑا ہے۔ کہ اس میں داخل ہوتے ہی خود بخود طبیعت میں ایک ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ یہی سرزمین بُت پرست روما کی شاہنشہی دیکھ چکی ہے یہی پاپائے اعظم کے خود مختارانہ تسلط سے پامال ہو چکی ہے۔ اور یہی کچھ عرصہ ہُوا۔ اپنے میزینی اور گیریبالڈی کے ذریعہ دُنیا کو سبق آموز آزادی دے رہی ہے۔ یہی وہ مُلک ہے جس نے فنِ تصویر و بُت تراشی کو کمال تک پہنچادیا ہے۔ اور جہاں اب بھی اس فنون کے طالب مشقِ فن بہم پہنچانے اور اساتذہ کی صحبت سے مستفید ہونے آتے ہیں۔ اور یہی مُلک ہے۔ جہاں کے باشندوں کو حُسنِ صورت میں یورپ کے شمالی ممالک سے امتیاز حاصل ہے۔ صباحت اور ملاحت میں یہاں آشتی ہے۔ اور بہت سی صورتیں ایسی نظر آتی ہیں۔ جس میں حسینانِ انگلستان کا سُرخ و سپید رنگ۔ خُوبانِ فرانس کی نزاکت اور ماہ رویانِ مشرق کی سی سیاہ آنکھیں۔ سب خُوبیاں پائی جاتی ہیں۔ جُوں جُوں ریل میلان کے قریب ہوتی جاتی تھی۔ شوق بڑھتا جاتا تھا۔ یہ غنیمت ہُوا کہ ریل شام سے پہلے پہنچ گئی۔ سٹیشن پر لکھا دیکھا۔ میلانو اور جی خوش ہو گیا۔ اُترتے ہی ایک ہوٹل میں اسباب رکھ کر بازار کا رُخ کیا۔ اور شام کے وقت کو یُوں استعمال کر لیا۔ سفر کی کوفت نے شب گردی کی کیفیت باقی نہ چھوڑی تھی۔ اس لئے رات کو بیہوش لیٹ گئے۔ اور دُوسرے دن صُبح سے باقاعدہ سیر شروع ہوئی۔

۲۱۔ جولائی۔ اٹلی میں ایک عجیب بات یہ تھی۔ کہ کہیں خُوبصُورت صاف اور کھُلی سڑکوں اور ایسی سربفلک عمارات کو چھوڑ کر جو ہندوستان کے بڑے شہروں کلکتہ، اور بمبئی میں بھی کمیاب ہیں۔ وہاں کئی باتیں ہمارے مُلک سے ملتی جُلتی ہیں۔ سب سے پہلے تو آب و ہوا ہے۔ گرمی کے موسم میں گرمی خاصی پڑتی ہے۔ اور شام کے وقت لوگ

اپنے اپنے گھروں سے نکل کر باہر بیٹھتے ہیں۔ کہ ذرا ہوا لگے۔ مکانوں میں ایک مشرقی رنگ موجود ہے۔ مثلاً بہت سے مکان امرا کے ایسے نظر آئے۔ جن کے بہت بڑے بڑے دروازے ہیں۔ اور ان دروازوں کے اندر صحن اور صحن میں چھوٹے چھوٹے باغیچے ہیں۔ بجائے اس کے کہ باغیچہ مکان کے گرد ہو۔ جیسے انگریزوں میں رواج ہے۔ امرا اور شرفا کی عورتیں سوائے اس کے گاڑیوں میں شام کے وقت سیر کو نکلیں۔ بازار میں بہت کم نکلتی ہیں۔ دوپہر کے وقت کاروبار بہت سست رہتا ہے۔ اور لوگ دوپہر کی نیند کے مزے سے آشنا ہیں۔ مقام غور ہے۔ کہ آب و ہوا کسی ملک اور اہلِ ملک کی عادات پر کتنا زبردست اثر رکھتی ہے؟ بازاروں اور کوچوں میں شور بھی انگلستان اور فرانس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ کئی لوگ جو ٹوکریوں میں رکھ کر یا چھکڑوں میں لاد کر ترکاری یا پھل پھول بیچتے ہیں۔ وہ تو اس طرح آواز لگاتے ہیں جیسے ہمارے ہاں کے دوکاندار۔ یہاں تک کہ میں نے میلان میں ایک صبح ایک فقیر کو بھی صدا دیتے سُنا۔ اور یورپ میں یہ پہلا موقعہ تھا۔ کہ ایسی صدا میرے کان میں پڑی اٹلی کا ٹھیک اندازہ کرنے کے لئے روما کو دیکھنا ضرور ہے۔ مگر افسوس تنگیٔ وقت نے ہمیں میلان اور وینس صرف دو مشہور مقامات کی سیر پر قناعت کرنے پر مجبور کیا۔ اور اُنہیں بھی جی بھر کر دیکھنے کا موقعہ نہ دیا۔

میلان میں ایک بڑی نمائش انہی دنوں میں ہو رہی تھی۔ اور یہ نمائش انٹرنیشنل یعنی بین الاقوام تھی۔ ہمارا بہت سا وقت اس نمائش میں صرف ہوا۔ لیکن اس کے تفصیلی حالات لکھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ صرف اسی صورت میں دلچسپ ہوتے۔ کہ انہی دنوں میں لکھے جاتے۔ جب نمائش جاری تھی۔ اُس زمین کا یہ رقبہ جس میں یہ نمائش ہو رہی تھی دس لاکھ مربع گز یعنی پیرس کی مشہور نمائش کے قریب قریب تھا۔ اور اس سارے رقبہ کا تیسرا حصّہ نمائش کی عمارات سے گھرا ہوا تھا۔ آسٹریلیا۔ بلجیم۔ بلگیریا۔ کنیڈا۔

چین۔ کیوبا۔ ڈنمارک۔ فرانس۔ جرمنی۔ جاپان۔ انگلستان۔ ہالینڈ۔ پرتگال سوئٹزرلینڈ ٹرکی اور ایران یہ سب ممالک اس نمائش میں شریک تھے۔ اور سب نے اپنی اپنی مصنوعات کے نمونے ان میں بھیجے تھے۔ ایک ہال میں بحری سامان کی نمائش تھی۔ ایک میں ریل کے انجنوں اور گاڑیوں کے عمدہ ترین نمونے رکھے گئے تھے۔ اور اس صیغے میں جرمنی آسٹریا اور ہنگری میدان مقابلہ میں اترے تھے۔ زراعت کے صیغہ میں کینیڈا کا حصہ نہایت خوبصورت اور شاندار تھا۔ بازار مصر کا نمونہ لوگوں کی تفریح کے لئے وہاں رکھا گیا تھا۔ جس میں قاہرہ کی زندگی کے خراب پہلو دکھانے کی کوشش غالب نظر آتی تھی۔ اہلِ یورپ مشرقی زندگی کی تصویر جب کبھی کھینچتے اور اپنے ابنائے وطن کو دکھاتے ہیں۔ تو اس کے تاریک پہلو کو ہی لیتے ہیں۔ ٹرکی اور ایران کے قالین عمدگی میں لاجواب تھے۔ مگر افسوس کہ اور کوئی مصنوعات وہاں سے قابلِ نمائش نہ نکلیں۔ ہماری آنکھیں نمائش میں ہندوستان کو ڈھونڈھتی تھیں۔ کہ کہیں اس کا بھی شمار بین الاقوام میں ہے یا نہیں۔ آخر بہت سی تلاش سے خیمۂ انگلستان کے سایۂ عاطفت میں کچھ جے پور کے ظروف اور کچھ بنارس کے دو پٹے ایک الماری میں سجے ہوئے نظر آئے۔ معلوم نہیں کس وجہ سے خود انگلستان کا حصہ اس نمائش میں بہت خفیف تھا۔ پس اس حصے میں سے ہندوستان کے حصہ میں کیا آتا۔ ہاں جو موجود ہو گیا یہی غنیمت۔ لیکن ہمارے ملک کو آئندہ ایسے مواقع سے فائدہ اٹھانے اور ہندوستان کی مصنوعات کو دنیا کی منڈیوں میں پیش کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ہندوستان کی بہت سی صنعتیں مٹ گئیں۔ اور مٹتی جاتی ہیں۔ پھر بھی ابھی یورپ و امریکہ کے خوش مذاق اور انصاف پسند قدردانوں سے باجِ تعریف لینے کے لئے دستکاری کے کافی نمونے ہم جمع کر سکتے ہیں۔ اگر اطرافِ ہند سے بہترین مصنوعات جمع کرنے کی ہم کوشش کریں۔

۲۲۔ جولائی۔ نمائش میں کام کی چیزوں کے علاوہ جن سے تجارت اور صنعت کی ترقی

کا حال دکھانا مقصود ہوتا ہے۔ ہمیشہ بہت سے کھیل تماشے لوگوں کو کھینچنے کے لئے لگے ہوتے ہیں۔ چونکہ ان دنوں نمائش کے سبب لوگوں کا مجمع زیادہ نمائش میں ہی ہوتا ہے اور شہر کی سڑکیں سوائے شام کے وقت کے سونی پڑی رہتی تھیں۔ اس لئے ہم نے ۲۲ ر جولائی کا بھی بیشتر حصہ نمائش میں ہی کاٹا۔ اور وہاں کے دلچسپ تماشوں میں سے بعض تماشے دیکھے۔

۲۳ ر جولائی۔ شہر میلان میں سب سے بڑھ کر قابل دید چیز وہاں کا گرجا ہے۔ جس کا شمار دُنیا کی مشہور ترین عمارتوں میں ہے۔ باہر سے تو ہم نے اُسے آتے ہی دیکھ لیا تھا آج اندر سے بھی دیکھا۔ اور اس کی چھت پر بھی چڑھے۔ یہ شہر کے مرکز میں واقع ہے ہمارا ہوٹل بھی اس کے قریب تھا۔ اور جب ہم باہر نکلتے تھے۔ تو راستے کا پتہ لگانے میں ہمیں اس سے بھی مدد ملتی تھی۔ اور کسی سے راستہ پوچھنے کی ضرورت بہت کم پیش آتی تھی۔ ورنہ زبان نہ جاننے کے سبب بہت مشکل ہوتی۔ اس گرجا کو یہاں ڈوَمو کہتے ہیں۔ اور کہا جاتا ہے۔ کہ شاید اس سے زیادہ خوبصورت گرجا دُنیا میں نہیں ہے۔ ۱۳۸۶ء میں اس کی بُنیاد رکھی گئی عجیب بات ہے۔ کہ گرجا بننے سے پہلے بھی یہ زمین معبد کے طور پر ہی استعمال ہوتی تھی۔ اور یہاں منروا دیبی کی پرستش کے لئے ایک مندر تھا۔ جو بنا ہونے کے وقت سے آج تک کم و بیش زیر تعمیر ہی رہا ہے۔ نپولین اوّل نے اس کے جلد مکمل کرنے میں بہت کوشش کی۔ مگر جلدی کا کام ویسا نفیس نہ بنا۔ جیسا باقی حصے کا کام ہے۔ جو پہلے سے تیار ہو چکا تھا۔ اندر باہر اس کی آرائش میں جو محنت صرف ہوئی ہے۔ وہ دیکھنے والے کو حیرت میں ڈالتی ہے۔ ہزاروں چھوٹے چھوٹے میناروں اور کنگروں کے ساتھ ساتھ چھ ہزار قد آدم بُت استادہ ہیں۔ جو آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ جس کونے سے اس عمارت کو دیکھو۔ ایک نیا حُسن نظر آتا ہے۔ اور ہر در و دیوار سنگ مرمر کے عمدہ کام کا ایک نمونہ ہے۔ اس کی عمارت جیسی باہر سے خوشنما ہے۔ اُسی قدر اندر سے شاندار ہے۔ ہم نے جس دن

اسے دیکھا۔ اُس دن ایک بڑا مجمع کیتھولک مردوں اور عورتوں کا اس میں مصروف عبادت تھا۔ مگر عمارت کا فقط ایک گوشہ اُن سے آباد تھا۔ اور باقی جگہ خالی تھی۔

ڈومو کے علاوہ اور بھی شاندار عمارتیں اس شہر میں ہیں۔ مگر ایسی اہمیت نہیں رکھتیں۔ شہر کے ہر چوک میں یا اور نمایاں مواقع پر بہت سے رومیں اور سنگین بُت استادہ ہیں۔ جو اہلِ مُلک کے مذاق بُت تراشی اور قدر دانی بزرگان مُلک وملت پر دلالت کرتے ہیں۔ یہاں لوگوں کی عادات اور چلنے پھرنے میں چستی اور چالاکی جو شمالی یورپ کی اقوام کا خاصہ ہے۔ نظر نہیں آتی۔ اور آرام طلبی کی طرف زیادہ مائل ہیں۔ فرانس کی طرح یہاں کے لوگ بھی باتیں کرتے وقت اپنے شانے ہلاتے ہیں۔ کھانے کا طریق گو سارے یورپ میں ایک ہے۔ پھر بھی اہلِ اٹلی کے کئی کھانے ہمارے ہاں کے کھانوں سے ملتے ہیں۔ خصوصاً سویّوں کا یہاں بہت رواج ہے۔ شوربے میں ڈال کر کھائی جاتی ہیں۔ حلوے یا کھیر کی صورت میں میٹھی پکائی جاتی ہیں۔ تلی ہوئی بھی کہیں کہیں بکتی ہیں۔ گانے کا شوق اُن لوگوں کو بہت ہے۔ اور اب تک یورپ کے بہت سے مشہور گوّیے اٹلی سے آتے ہیں۔ لباس میں بھی رنگینی یہاں پائی جاتی ہے۔ فرانسیسی کی طرح اہلِ اطالیہ کی زبان بھی شیریں ہے۔ اطالوی زبان فرانسیسی زبان سے بہت کچھ ملتی جلتی بھی ہے۔ ایک جگہ اس مشابہت سے خوب کام نکلا۔ فرانسیسی میں "نوت" کل کو کہتے ہیں۔ مجھے معلوم نہ تھا۔ کہ اطالی میں بھی اس کے لئے یہی لفظ ہے۔ صرف تلفظ میں ذرا فرق ہے۔ ایک ریسٹوران میں ہم بیٹھے تھے۔ وہاں کے ایک ملازم سے کھانا مانگا۔ مگر گونگوں کی طرح فہرست لے کر ایک چیز پر انگلی دھرتے تھے۔ اور کہتے تھے۔ کہ یہ لاؤ وہ جاتا تھا۔ اور آکر کہتا تھا۔ ٹرمینا[1] تو یعنی ختم ہو گیا۔ اب نہیں جانتے تھے

[1] یہی لفظ ہے۔ جو انگریزی میں بھی مستعمل ہے۔ ٹرمی نیٹ بمعنی ختم ہو گیا۔

ر شے کیوں کر کہیں کہ کچھ باقی بھی ہے ۔ ہاں نہیں۔ جب دو تین دفعہ اُس نے یہی
جواب دیا۔ مَیں تنگ آ گیا اور مَیں نے فرانسیسی لفظ کو اطالوی صُورت دی ۔
اور خفا ہو کر اُس سے کہا۔ "تو ترمینا تو؟" یعنی سب کچھ ختم ہو گیا؟ اتفاق سے یہ فقرہ
درُست تھا۔ وہ چونکّا ہُوا ۔ اور اُس نے وہ چیزیں گِن دیں۔ جو اُس کے پاس موجود
تھیں۔ اور اُن سے انتخاب کر کے ہم نے اپنا پیٹ بھر لیا ؏

عبدالبہا

حضرت عبدالبہا دُنیا کے مشہور ترین آدمیوں میں ہیں۔ یُوں تو ہر نئے مذہب اور اُس کی تاریخ کے بنانے والے کے حالات دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ مگر ایک ایسا نیا مذہب جس کی بنیاد ہمارے بزرگوں کے دیکھتے دیکھنے پڑی ہو۔ اور جس کی ساخت اب تک ہماری آنکھوں کے سامنے جاری ہو۔ معاصرین کے لئے خاص دلچسپی رکھتا ہے۔ اُن مذاہب یا فرقوں میں جو گذشتہ صدی میں پیدا ہوئے۔ شاید ہی کوئی ایسا ہو۔ جسے وہ اہمیّت حاصل ہے۔ جو اس فرقے کو جس کے سرگردہ حضرت عبدالبہا ہیں۔ یہ وہی فرقہ ہے۔ جو پہلے بابی کے نام سے اُبھرا۔ اور جس نے سرزمین ایران میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ اس کا بانی سیّد علی محمّد المعرُوف بہ "باب" تھا۔ اور اس عُرف کی وجہ تسمیّہ یہ تھی۔ کہ وہ اپنے آپ کو ایک آنے والے ہادی کا "دروازہ" یعنے پیش خیمہ بتاتا تھا۔ اُس پر عُلماء ایران نے کُفر کے فتوے دیے اور وہ زندان میں بھیجدیا گیا۔ اور آخر ۱۸۵۱ء میں اپنے مذہب کی اشاعت کے جرُم میں مارا گیا۔ اُس کے غائبانہ مدّاحوں اور معتقدوں میں ایک نوجوان بہاءاللہ نامی تھا۔ "باب" کی وفات کے بعد اس نے طہران میں اس نئے مذہب کی اشاعت شروع کر دی۔ حکومت نے اُسے بھی قید کیا۔ اور کچھ عرصہ بعد جلاوطن کر کے بغداد کو روانہ کر دیا۔ جب بہاءاللہ کا اثر بغداد میں پھیلنے لگا۔ تو علماء کے مشورے سے یہ انتظام کیا گیا۔ کہ اسے مع اُس کے بڑے بڑے ہمراہیوں کے قسطنطنیہ بھیج دیا جائے۔ بغداد سے رُخصت ہوتے وقت

اپریل ۱۸۶۳ء میں بہاء اللہ نے پہلے پہل اپنے خاص معتقدین کو یہ بتایا - کہ میں وہی شخص ہوں جس کی بابت "باب" نے پیشگوئی کی تھی - اور جس کے ظہور کے تم لوگ منتظر تھے۔ اُس دن سے بہاء اللہ کا اثر اور بھی ترقی کرنے لگا - اس لئے اس غریب الوطن جماعت کو قسطنطنیہ میں بھی چین نہ ملا - اور وہاں سے یہ لوگ ادرنہ کو روانہ کر دئے گئے۔ جو آج تک اس فرقہ کا صدر مقام ہے۔

بہاء اللہ نے جس دن سے اپنے "موعود" ہونے کا اظہار کیا - فرقۂ بابیہ میں دو جماعتیں ہو گئیں - جن میں ایک اس کی قائل تھی - اور ایک منکر - لیکن بابیوں کا گروہ کثیر اُسی کا طرفدار رہا - اور اُس دن سے اُس گروہ نے بجائے بابی کے بہائی نام اختیار کیا - اب بھی عام طور پر لوگوں میں یہ فرقہ بابی کے نام سے مشہور ہے - مگر خود یہ لوگ بہائی کہلانا پسند کرتے ہیں - بہاء اللہ نے ۱۸۹۲ء میں رحلت کی - اور معتقدین کو وصیت کر گیا - کہ اس کے بعد اس کا بڑا لڑکا عباس آفندی جانشین ہو - اور اسے "من اراد اللہ" کا لقب دیا - یعنی جو اس منصب کے لئے خدا کے ارادے میں تھا؛ مگر عباس آفندی نے عقیدتمندی کے لحاظ سے "عبد البہا" یعنی "بہا کا غلام" لقب اختیار کیا - آفندی ممدوح اسی لقب سے مشہور ہیں - گو عراق عرب میں لوگ انہیں زیادہ تر عباس آفندی کے نام سے ہی جانتے ہیں -

ہم فرقۂ بابیہ اور اس کی بڑی شاخ فرقۂ بہائیہ کے حالات کسی قدر بسط کے ساتھ پھر کسی موقعہ پر لکھیں گے - اس وقت فقط حضرت عبد البہا کے احوال و اقوال سے بحث مقصود ہے - کیونکہ وہ اب تک زندہ ہیں - اور لوگ دُور دُور سے اُن کی زیارت کے لئے آتے ہیں - اور اُن کی تعلیم و تلقین سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں - یہ عجب بات ہے - کہ امریکہ میں اُن کا اثر روز بروز ترقی پر ہے - امریکہ والے دہریت سے پریشان ہو کر روحانیت میں پناہ گزین ہونا چاہتے ہیں - اور اکثر متلاشی مذہب ہیں - اس لئے ہر نئے

مذہب کا ایک خاص اثر اُن پر پڑتا ہے۔ اور اسی لئے حضرت عبد البہا کے مُریدوں کو جو اشاعتِ مذہب کی غرض سے امریکہ گئے ہوئے ہیں۔ بہت کچھ کامیابی ہوئی ہے۔ اور کئی شہروں میں جماعتیں قائم ہو گئی ہیں۔ اور اُن جماعتوں کی طرف سے روپیہ جمع ہو کر اکّہ میں بغرضِ اشاعتِ مذہب پہنچتا ہے۔ نہایت خوبصورت اور نقش و نگار سے آراستہ عرضیاں طلبِ فیض روحانی کے لئے بھیجی جاتی ہیں۔ اور خود وہاں چھوٹے چھوٹے رسالوں اور عام فہم لیکچروں کے ذریعے سے بہائی فرقہ کی تعریف شائع کی جاتی ہے۔ تاکہ لوگوں کو اس کے اختیار کرنے کی ترغیب ہو۔ بمبئی کے مقبول رسالہ ایسٹ اینڈ ویسٹ میں کسی امریکن لیڈی کا ایک مضمون حال ہی میں شائع ہُوا ہے۔ جو اُس نے اکّہ کی زیارت اور حضرت عبد البہا کی خدمت میں حاضر ہونے کے بعد لکھا ہے۔ جس سے نہ صرف اُس کی عقیدت ٹپکتی ہے۔ بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ مغربی دُنیا سے جو زائر مشرق کے اس نسبتاً غیر محدود مقام تک فیض روحانی کے شوق میں آتے ہیں وہ مایوس نہیں جاتے۔ بلکہ ایک گہرا نقش دل پر لے کر جاتے ہیں۔ اور باوجودیکہ اس عالم ناپائدار کی چکّی میں آج کل غرب سنگ بالا اور شرق سنگ زیریں بنا ہُوا ہے۔ تاہم روحانیت میں زمانہ گذشتہ کی طرح آج ایشیا ہی کا رتبہ بڑھا ہُوا ہے۔ اور مشرق یدا علیٰ یعنی اُوپر کا ہاتھ اور مغرب یدِ اسفل یعنے نیچے کا ہاتھ ہے۔ ایک ہاتھ بخشنے والا ہے۔ اور دوسرا لینے والا۔

فرقہ بہائیہ کے مختلف بیانات نظر سے گزرے ہیں۔ اور یہ قرار دینا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُن میں سے کس کو قابلِ اعتبار مانا جائے۔ لیکن کسی اور بیان کو پیش کرنے سے پہلے تقاضائے انصاف یہ ہے۔ کہ خود اُس کے معتقدین کا بیان اُن کی زبان سے سُن لیا جائے۔ اور وُہ یہ ہے:۔

سعباس آفندی بمقام طہران ۲۳ مئی ۱۸۴۴ء کو پیدا ہوئے۔ عجیب بات ہے

کہ ان کا روزِ ولادت وہی ہے۔ جس دن "باب" نے اپنی تلقین شروع کی تھی۔ آپ اوائل عمر سے اپنے باپ کی خدمت میں حاضر اور اُن کی مساعی میں شریک رہے۔ سب سے پہلے اپنے باپ کے موعود ہونے پر ایمان لائے۔ اور آپ کی تربیت ایسے ڈھنگ پر ہوئی۔ کہ آپ اس تحریک کا مرکز بن سکیں۔ سارے بہائی آپ کو اپنا روحانی پیشوا مانتے ہیں۔ اور آپ کی بدولت مُریدین کو اس روحانی زندگی سے واقفیت ہوتی ہے۔ جو بہاء اللہ کے حصّے میں آئی تھی۔ اسی مرکز سے اب نورِ حق اطرافِ عالم میں پھیل رہا ہے۔

"بہاء اللہ کا مقصد یہ تھا۔ کہ تمام بنی نوع انسان کو روحانی طور پر جسم واحد بنا دے اور اس کی تلقین ایسی ہے۔ کہ ہر مُلک و ملّت کا انسان اس پر کاربند ہو سکتا ہے۔ اسی سبب سے مغربی دُنیا کے عیسائی، یہودی اور دہریئے۔ مشرقی دُنیا کے مسلمانوں زرتشتیوں برہمنوں اور بُودھ مت والوں سے رشتۂ اُلفت و ہم خیالی و ہم مذہبی جوڑ رہے ہیں"۔

حضرت عبد البہاء کی جو نصائح مریدوں کی ہدایت کے واسطے شائع ہوتی ہیں۔ وہ اُن بے شمار نصائح سے جو سب سے پُرانے مقدس مذہبوں کے پیشواؤں نے کی ہیں کچھ جُدا یا نئی نہیں۔ کیونکہ دنیا بھر میں بنیادی اُصول ایک ہی ہیں۔ اور انہی پر عمل کرنے سے سوسائٹی کی کَل چلتی ہے۔ یہاں اُن کی نصائح میں سے بعض بطور نمونہ نقل کی جاتی ہیں:-

"کسی کو رنج مت پہنچاؤ۔ ایک دوسرے سے بہت محبّت کرو۔ سب سے مہربانی کا برتاؤ کرو۔ اور اُن سے پاک طینتی سے محبّت رکھو۔ اگر تمہیں مخالفت برداشت کرنی یا سہنی پڑے۔ تو اُسے برداشت کرنا چاہئے۔ اگر مصیبت بہت سخت ہو۔ تو تمہیں خوش ہونا چاہئے۔ کیونکہ خاصان خدا کے لئے یہ انعام ہے"۔

"دوسروں کے عیوب کے متعلق سکوت اختیار کرنا لازم ہے۔ ان کے حق میں

دعا کرنی چاہیئے۔ مہربانی اور رِفق سے اُن کی مدد سے اُن کی مدد کرنا چاہیئے۔ تاکہ اُن کے عیوب کی اصلاح ہو جائے۔ بجائے بُرائی پر نظر ڈالنے کے ہمیشہ اچھائی پر نظر رکھو۔ اگر کسی میں دس اچھی خصلتیں ہیں۔ اور ایک بُری تو دس کو دیکھنا چاہیئے۔ اور ایک نظرانداز کر دینی چاہیئے۔ کسی کو لفظ نا ملائم نہیں کہنا چاہیئے۔ گو وہ ہمارا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ جو لوگ اوروں کے عیب ہمارے سامنے بیان کریں۔ اُنہیں اس سے روکنا چاہیئے۔"

"تلقینِ حق میں مصروف رہنا چاہیئے۔ کیونکہ ہمارے آقا نے فرمایا ہے۔ کہ ہم اس حکم کی تعمیل کے بغیر روحانی قوت اور ترقی حاصل نہیں کر سکتے۔ جس کسی کو یہ قوت حاصل ہے۔ اسے رضوانِ الٰہی حاصل ہے۔ ہمارے آقا نے یہ بھی فرمایا ہے۔ کہ" اس دَور میں جو بیج بویا جائے گا۔ خدا خود اپنی رحمت کے بادلوں سے اس کی آبیاری فرمائے گا۔ اور وہ بار آور ہوگا۔"

"ہمیں ایک دوسرے کا خادم بننا چاہیئے۔ اور یہ جاننا چاہیئے۔ کہ ہم ہر ایک سے کم ہیں۔ ہمیں یہ محسوس کرنا چاہیئے۔ کہ ہم ایک رُوح ہیں۔ جو بُت سے جسموں میں سرایت کئے ہوئے ہے جس قدر ہم ایک دوسرے سے محبت کریں گے۔ اُسی قدر خدا کے قریب تر ہوں گے ہماری محبت۔ ہماری اطاعت اور ہماری توحید محض اقرار زبانی نہ ہوں۔ بلکہ واقعی ہوں۔"

"ہمیں لازم ہے۔ کہ ہم ہر مریض کے لئے باعثِ شفا۔ ہر مغموم کے لئے باعثِ تسلی۔ ہر پیاسے کے لئے خوشگوار پانی۔ ہر بھوکے کے لئے خوانِ آسمانی۔ ہر متلاشی کے لئے رہبر۔ ہر کھیتی کے لئے مینہ۔ ہر اُفق کے لئے ستارے۔ ہر چراغ کے لئے روشنی ہوں۔ اور ہر شخص کے لئے جو آسمانی بادشاہی کی آرزو میں بیتاب ہو۔ اس بادشاہی کی خوشخبری دینے والے ہوں۔ ہمارے آقا کا قول ہے۔" انہی علامتوں سے خدا کے ہر ایک نیک بندہ کی پہچان کرنا۔"

عازمانِ انگلستان کے لئے

جو صاحبان تعلیمی اغراض سے انگلستان جانے کا عزم رکھتے ہیں۔ ان کی سہولت کے لئے لندن کی نیشنل انڈین ایسوسی ایشن نے ایک چھوٹی سی کتاب انگریزی میں تیار کر رکھی ہے جس سے انہیں تعلیم کے صیغوں میں داخل ہونے کی شرائط فیس کی شرح اور دیگر ضروری اخراجات کے متعلق معلومات حاصل ہو سکتی ہیں اسی کتاب میں اختصار کے ساتھ سب ضروری امور کا ذکر کر دیا گیا ہے اور اس اعتبار سے عازمانِ انگلستان کے لئے بہت مفید ہے۔ اس کی خوبی کی یہی دلیل کافی ہے کہ دس مرتبہ چھپ کر فروخت ہو چکی ہے اور اب گیارھویں دفعہ شائع ہوئی ہے اس مرتبہ صنعتی تعلیم کے کئی مرکزوں کی مختصر کیفیت بھی اس میں درج ہوئی ہے۔ کیونکہ اب روز بروز اس طرف لوگوں کا میلان ہوتا جاتا ہے اور یہ میلان ملکی ترقی کی ایک عمدہ فال ہے۔ کتاب کا نام "ہینڈ بک آف انفارمیشن فور انڈین سٹوڈنٹس" ہے۔ اور لاہور میں بی ایل سوری کی دکان پر بمبئی میں ڈی بی تارا پوروالا اینڈ سنز۔ اور کلکتہ میں تھاکر سپنک اینڈ کمپنی سے بہ قیمت ایک روپیہ مل سکتی ہے۔

اس کتاب کے آخر میں ایک باب ہے جس کا عنوان ہے "طلبہ کو نصیحت"۔ اس کے بعض فقرات کا ترجمہ یہاں نقل کر دینا خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ کیونکہ اس میں کئی ایسے سوالات کے جواب لکھے ہیں۔ جو لوگ وقتاً فوقتاً ہم سے کرتے ہیں۔ لندن میں اگر کوئی طالب علم کفایت سے رہے۔ تو ایک سو بیس پونڈ یعنی اٹھارہ سو روپے سالانہ سے لے کر ایک سو پچاس پونڈ یعنی ساڑھے بائیس سو روپے سالانہ تک میں اس کا گزارہ ہو سکتا ہے۔ اس رقم میں تعلیم کی فیس وغیرہ کے اخراجات شامل نہیں۔ بلکہ بود و باش کے ضروری اخراجات ہیں۔ البتہ اگر کوئی طالب علم اڈنبرا میں یا برطانیہ کے بعض دیگر شہروں میں جہاں لندن کی طرح گرانی نہیں رہے۔ تو اس سے کم میں بھی کام چل سکتا ہے۔

بعض لوگوں میں جو یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ اگر کوئی شخص گوشت سے پرہیز کرتا ہو اور صرف

نباتاتی اغذیہ کھاتا ہو۔ تو اُسے انگلستان میں گوشت مجبوراً کھانا پڑے گا۔ اور اس کے بغیر اس کی صحت میں خلل آجائے گا۔ یا آب و ہوا سرد ہونے کے باعث تندرست رہنے کے لئے شراب کا استعمال اس کے لئے ضروری ہوگا۔ یہ ہرگز درست نہیں۔" طلبہ کو چاہئے کہ لندن جاتے وقت بحری سفر کے اخراجات کے سوا تیس تیس پونڈ نقد (یعنی تین چار سو روپے) اپنے ساتھ لائیں۔ تاکہ اُن ضرورتوں کے لئے جو وہاں پہنچتے ہی پیش آتی ہیں وہ رقم کام آئے۔ انہیں کوشش کرنی چاہئے کہ اپنے زمانۂ قیام کے لئے تیس پونڈ کے قریب ہر وقت اپنے نام سے بنک میں امانت رکھیں۔ اور یہ رقم معمولی رقوم خرچ کے علاوہ ہو تاکہ اگر کبھی انہیں خرچ پہنچنے میں دیر ہو جائے۔ یا اچانک وطن جانے کی ضرورت پیش آجائے یا بیماری ہو۔ تو پردیس میں پریشان نہ ہونا پڑے۔" طالب علم کو چاہئے کہ ہندوستان سے محض انٹرنس کے درجہ سے کوئی اونچا امتحان پاس کر کے انگلستان کا قصد کرے تاکہ آتے ہی جس فن کی تحصیل کے لئے آیا ہے۔ اُس کے مطالعہ میں مشغول ہو جائے۔ اور اس کا وقت ضائع نہ ہو۔"

جو طلبہ آکسفورڈ یا کیمبرج یونیورسٹی میں جانا چاہیں۔ انہیں بتاکید یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ ہندوستان سے ڈگری لے کر یا ایسا امتحان پاس کر کے چلیں۔ جو آکسفورڈ اور کیمبرج میں بمنزلہ ریسپانشن یا لٹل گو کے جو وہاں کے امتحانات داخلہ ہیں سمجھا جائے۔ اور اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم اس قدر لاطینی سیکھ کر چلیں کہ آتے ہی ان امتحانات میں شریک ہو سکیں۔ کیونکہ لاطینی نہ جاننے کے سبب یا ہندوستان سے بڑے امتحان پاس کرنے کے بغیر چلنے کے باعث اکثر بہت سا قیمتی وقت اور کافی روپیہ ان امتحانات کی تیاری میں ضائع ہوتا ہے۔" "طالب علم کو مناسب ہے کہ وہ لندن پہنچنے سے پہلے اپنے کسی دوست یا واقف کو اپنے پہنچنے کی تاریخ سے بذریعہ خط یا تار مطلع کر دے۔ اگر کسی کا کوئی دوست یا واقف لندن میں نہ ہو تو وہ نیشنل انڈین ایسوسی ایشن کے آنریری سکرٹری کو اطلاع کر دے اُس جماعت کی طرف سے کچھ بندوبست اس کے لئے ہو جائے گا۔ اور کوئی شخص اُسے ریل پر لینے کے لئے بھیجا جائے گا۔

واضح رہے کہ یہ وہی ایسوسی ایشن ہے۔ جس کا کام نیک دل مس میننگ مرحومہ مدت العمر انجام دیا۔:

چند گھنٹے لورپول میں

سفرِ ٹرکی میں بے شمار اصحاب نے مجھ سے یہ سوال کیا۔ کہ میں نے انگلستان میں شیخ عبداللہ کوئیلیم (شیخ الاسلام جزائر برطانیہ) سے بھی ملاقات کی یا نہیں۔ اور اگر کی تو میری رائے اُن کی نسبت کیا قائم ہوئی۔ اور یہی سوال جب سے میں ہندوستان میں آیا ہوں۔ دُہرایا گیا ہے۔ اس لئے اس مختصر سی ملاقات کا حال جو مجھے شیخ ممدوح سے ایک مرتبہ نصیب ہوئی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ میں نے لندن سے بعض معاملات کے متعلق شیخ عبداللہ کوئیلیم سے خط و کتابت کی تھی۔ اور انہوں نے مجھے دعوت دی تھی۔ کہ لورپول جا کر اُن کے ہاں ٹھہروں۔ لیکن اس کا موقعہ نہ ملا۔ ایک دفعہ میں اتفاق سے مانچسٹر میں مقیم تھا۔ کہ ایک دن فرصت کا نکل آیا۔ اور یہ معلوم ہُوا۔ کہ لورپول وہاں سے قریب ہے۔ اور گاڑیاں بکثرت جاتی ہیں۔ اس موقعہ کو غنیمت جان کر میں روانہ لورپول ہُوا۔ اتنا تامل ضرور تھا۔ کہ بے اطلاع جاتا ہوں۔ خدا جانے شیخ ممدوح وہاں ہوں یا نہ ہوں۔ یا انہیں فرصت ملاقات ہو یا نہ ہو۔ لیکن چونکہ دوسرے موقعہ کا ملنا غیر متیقن تھا۔ جانا ہی مناسب سمجھا۔ خوش قسمتی سے شیخ ممدوح لورپول میں ہی تھے اور اپنے دفتر میں مل گئے۔ اور جس اخلاق سے باوجود کم فرصتی کے اور باوجود کسی ملاقاتی کی آمد کے لئے تیار نہ ہونے کے پیش آئے۔ اُس کا ایک گہرا نقش میرے دل پر ہے۔

مجھے اُن کے کاروباری دفتر کا پتہ معلوم تھا۔ جہاں وہ سالسٹر کا کام کرتے ہیں۔ شہر کے کامیاب سالسٹروں میں اُن کا شمار ہے۔ اور اُن کے وقت کا بیشتر حصہ اسی

کام میں صرف ہوتا ہے۔ میں جب گیا۔ تو وہ ابھی دفتر میں تشریف نہیں لائے تھے۔
اُن کے آدمی نے مجھے وہاں بٹھایا۔ اور کہا۔ کہ ابھی آتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں وہ تشریف
لے آئے۔ اور میرا کارڈ دیکھتے ہی مجھے بلایا۔ خوش ہو کر تپاک کے ساتھ ملے۔ مگر شکایت
کی۔ کہ میں نے انہیں پہلے سے مطلع کیوں نہیں کیا۔ میں نے اُن سے کہا۔ کہ میرا آنا اتفاقی
ہو گیا ہے۔ اور میں بہت تھوڑے سے وقت کے لئے آیا ہوں۔ اس لئے اسے آنے میں
محسوب نہ کیا جائے۔ جس کا وعدہ تھا۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئے۔ اور کہنے لگے۔ کہ میں
اس وقت بھی خیر مقدم کہتا ہوں۔ اور پھر آپ آئیں گے۔ تو پھر کہوں گا۔ اور میری خوشی
یہ ہے۔ کہ آپ کم از کم دو تین دن کے لئے آئیں۔ اور کوئی دن تعطیل کا درمیان ہو۔ تو
میں آپ کو جزیرہ میں لے چلوں۔ جہاں ہمارا گھر ہے۔ اور جہاں اب لورپول کا مختصر
سا اسلامی مدرسہ یتیم خانہ بھی بغرض سہولت منتقل کر دیا گیا ہے۔ میں خود اکثر وہاں
چلا جاتا ہوں۔ اور وہ جگہ بہ اعتبار صحت بخش آب و ہوا کے اس کارخانوں سے بھرے
ہوئے اور دھوئیں سے گھرے ہوئے لورپول پر قابلِ ترجیح ہے۔ میں نے بھی جزیرہ
کو دیکھنے کا شوق ظاہر کیا۔ اور کہا: میں کوشش کروں گا۔ کہ پھر آؤں۔ اور وہاں
کی سیر کروں۔ لیکن آج یہاں دو غرض سے آیا تھا۔ ایک آپ کی ملاقات سو ملا...
گئی۔ دوسرے آپ کے اسلامی عشق کے کام کا جو حصہ یہاں نظر آ سکتا ہے...
یا آپ کی معیت میں دیکھنا۔ یا آپ کے معتبر کے ساتھ جا کر دیکھنا۔ انہوں نے...
جو کچھ یہاں موجود ہے۔ وہ میں خود ساتھ چل کر آپ کو دکھلاؤں گا۔ اب یہاں صرف
ہمارے مسلم انسٹی ٹیوٹ کی عمارت ہے۔ اس میں ایک بڑا کمرہ ہے۔ جو لیکچر...
کے لئے ہال کا کام دیتا ہے۔ اور جمعہ کے دن مسجد کا کام۔ اگر آپ جمعہ کے دن تشریف
لائیں۔ تو پچاس ساٹھ نمازیوں کی جماعت آپ کو ملے گی۔ ہمارے رجسٹر پر نو مسلمو...
تعداد کئی سو تک پہنچ چکی ہے۔ مگر اُن میں سے بعض فوت ہو گئے۔ بعض کہیں دو...

علاقوں میں چلے گئے۔ اب بھی کوئی تین سو کے قریب انگریز لوریوں اور اُس کے گرد و نواح میں ایسے ہیں۔ جو ہماری جماعت میں شامل ہیں۔ ان میں سے جو جمعہ کے دن شہر میں ہوتے ہیں۔ وہ نماز جمعہ میں شریک ہو جاتے ہیں۔ مگر لیکچر کا دن اتوار کا ہے۔ اُس دن زیادہ مجمع ہوتا ہے۔ اور لیکچروں کے سننے کے لئے عیسائی بھی آتے ہیں۔ اور بارہا یہ ہُوا ہے۔ کہ وہ لیکچروں سے متاثر ہو کر رفتہ رفتہ مائل بہ اسلام ہو گئے ہیں۔"

میں نے سوال کیا۔
"یہ تو فرمائیے۔ کہ آپ جب اشاعت اسلام کرتے ہیں۔ یا فرائض اسلام ادا کرتے ہیں۔ تو اب بھی لوگ آپ پر اینٹ پتھر پھینکتے ہیں۔ یا نہیں۔ جیسے پہلے دنوں میں کیا کرتے تھے؟"

جواب:۔ "اب وہ نوبت نہیں۔ لیکن پھر بھی کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ لوگوں کا تعصب ابھی دُور نہیں ہُوا۔ گو ابتدا میں جو ہجوم ہوتا تھا۔ اور جو اذیتیں ہمیں دی گئیں۔ اُن سے نسبتاً امن ہے۔ میں بھی حتی الوسع احتیاط سے کام لیتا ہوں۔ اور نہیں [illegible] ہوں کو چھیڑ کا موقعہ نہیں دیتا۔ راہ میں انگریزی ٹوپی کی طرف اشارہ کر کے پوچھنے میں عموماً [illegible] ٹوپی اوڑھتا ہوں۔ اور فوراً ان لاکھوں انگریزوں میں مل جاتا ہوں۔ جو شہر کے کوچہ [illegible] میں پھرتے ہیں۔ اور جن سے کوئی تعرض نہیں کرتا۔ کون جانتا ہے۔ کہ یہ کوئیلیم جا[illegible]۔ اور بہت سے کوئیلیم جاننے والے ایسے بھی ہوں گے۔ جو یہ نہیں جانتے۔ کہ یہ عبداللہ [illegible] ہے۔ ابتدا میں لوگوں نے میرے کام میں خلل ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ یہ کہہ کر [illegible] شخص کے حواس میں خلل آگیا ہے۔ جو اپنے آپ کو مسلمان بتاتا ہے۔ جب میں نے [illegible] کوشش اور محنت سے یہ ثابت کر دکھایا۔ کہ سالسٹری کے کام کے لئے میں وُہی کوئیلیم ہوں جو اسلام قبول کرنے سے پہلے تھا۔ تو کاروبار کی پہلے کی سی حالت قائم ہوئی۔ اب میں اپنی اسلامی وردی صرف جمعہ کے دن پہنتا ہوں۔ اور باقی دنوں میں مثل اور لوگوں کے

رہتا ہوں؟

لورپول جانے سے پہلے میں نے شیخ کی ایک تصویر ترکی علماء کے لباس میں دیکھی تھی۔ اور یہی اُن کی وقتِ نماز کی وردی ہے۔ شاید اس لمبے اور کھلے لباس کی وجہ سے ہوگا۔ کہ وہ خاصے قد آور معلوم ہوتے تھے۔ مگر دیکھنے پر معلوم ہُوا۔ کہ آپ کا قد چھوٹا ہے۔ اُن کی صُورت زیادہ تیزی کا پتہ نہیں دیتی۔ مگر آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی ہے۔ اُن کا روزمرّہ کا لباس انگریزی مذاق کے اعتبار سے بہت سادہ ہے۔ اور وہ باوجود خوشحالی کے قریب قریب درویشانہ زندگی بسر کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کی گفتار میں بھی وہ بات نہیں۔ جو اُن کی تحریروں میں پائی جاتی ہے۔ گو طاقتِ زبان معمولی گفتگو میں بھی موجود ہے۔ اُن کا تلفظ اور لہجہ اس علاقہ کا تلفظ اور لہجہ ہے جس میں وہ رہتے ہیں۔ یہ بات شاید عام طور پر معلوم نہیں کہ انگلستان جیسے چھوٹے سے مُلک میں بھی مختلف حصّوں کے تلفظ اور لہجے میں فرق ہے۔ چنانچہ مانچسٹر اور لورپول وغیرہ میں ایسے الفاظ کو جن میں حرف بالفتح پڑھا جاتا ہے۔ بالضم بولتے ہی ہیں۔ مثلاً "کپ" (پیالہ) کو "کپ" اور "فن" (ہنسی تماشا) کو "فن" کہتے ہیں۔ اور ہمارے شیخ کوئیلم بھی اسی تلفظ کے عادی ہیں۔

دفتر میں کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد شیخ مجھے ایک ہوٹل میں کھانا کھلانے لے گئے۔ کھانے پر مختلف اسلامی مضامین کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ جن سے میں نے یہ اندازہ لگایا۔ کہ شیخ کا دل حقیقت میں نورِ اسلام سے منوّر ہے۔ وہ جو خدمت اسلام کی وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں خلوص سے کرتے ہیں۔ اگر اُن کو سلطانِ ٹرکی کے ہاں سے کچھ امداد ملتی ہے۔ یا وہاں اُن کی خدمات کی قدر کی گئی ہے۔ تو یہ اُن کی خوش قسمتی اور سلطان کی بیدار مغزی ہے۔ مگر میرے نزدیک یہ امداد یا قدردانی اُن کی مساعی کا باعث نہیں ہے۔ بلکہ اُن کی مساعی اُن کے دلی عقیدے کا نتیجہ ہیں۔ اور یہی وہ رائے تھی۔ جو میں نے اُن لوگوں کو دی جنھوں نے جابجا شیخ کی نسبت مجھ سے استفسار کیا یہ بھی بیان کیا۔ کہ شیخ عبداللہ کوئیلم

کے پکے مسلمان ہونے کی ایک اور شہادت بھی مجھے ملی ہے۔ جو قابلِ ذکر ہے۔ وہ یہ کہ مجھے لندن میں اُن کے چھوٹے صاحبزادے مسٹر بلال کوئیلم سے ملنے کا اتفاق ہُوا۔ جو باپ کے پیشے کی سند حاصل کرنے کے لئے لندن میں پڑھتے ہیں۔ اوّل تو اس نام سے ہی پیغمبرِ اسلام کی محبت ٹپکتی ہے۔ دوسرے اُن کی تقریر جو اسلام کے متعلق سُنی۔ تو جی خوش ہو گیا۔ اور معلوم ہُوا۔ کہ باپ نے خاص توجہ سے بیٹے کو اپنے مذہب سے آگاہ کیا ہے۔ اور یہ بات بغیر خلوص کے ممکن نہیں۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم پہلے مسلمانانِ لورپول کی قبور کو دیکھنے گئے۔ کوئی پچیس تیس قبریں ہوں گی۔ جو وہاں کے عیسائی قبرستان کے ایک گوشے میں بنی ہوئی ہیں۔ اور دیگر قبور سے الگ نظر آ رہی ہیں۔ کیونکہ قبلہ کے لحاظ کی وجہ سے ذرا سے آڑی بنی ہوئی ہیں۔ اور دوسری قبروں کی سیدھ میں نہیں۔ شیخ نے سُنایا۔ کہ وہاں مسلمانوں کو دفن کرنے کے متعلق بہت جد وجہد کا سامنا ہُوا تھا۔ اور بہت جھگڑے کے بعد وہ زمین جس میں انگلستان کے اِن اوّلین مسلمانوں کی قبریں بنی ہیں۔ مسلمانوں نے مول لی تھی۔ یادِ رفتگان سے شیخ کی آنکھیں پُر آب ہو گئیں۔ کیونکہ اُن سونے والوں میں بہت سے اُن کے رفیق و مُونس تھے۔ جنہوں نے ابتدائی تکالیف کے مقابلہ میں ان کا ساتھ دیا تھا۔ آخر ہم نے فاتحہ کے لئے ہاتھ اُٹھائے۔ کہ خدا ان مبارک ارواح پر رحمت فرمائے۔

قبرستان سے ہم انسٹی ٹیوٹ کی طرف آئے۔ مختصر سی عمارت ہے۔ جو موجودہ ضروریات کے لئے کافی ہے۔ اس عمارت کا ایک حصہ سہ منزلہ ہے۔ داخل ہوتے ہی دفتر کا کمرہ ہے۔ اُس کے آگے ہال کا بڑا کمرہ ہے۔ ہال میں کوئی تصویریں یا دیگر آرایش نہیں۔ صرف ایک چبوترہ تقریر کے لئے بنا ہے۔ اور نیچے کرسیاں رکھی ہیں۔ نماز کے وقت کرسیاں اٹھا دی جاتی ہیں۔ چبوترہ کی ساتھ کی دیوار پر جلی حروف میں امیر عبدالرحمٰن خاں مرحوم کے گراں بہا عطیہ کا ذکر ہے۔ جو پرنس نصر اللہ خاں کے ہاتھ

لورپول کی اسلامی جماعت کو دیا گیا تھا۔ اُوپر کے کمرے اس وقت خالی پڑے ہیں۔ یا اُن میں بنچیں کرسیاں وغیرہ رکھی ہیں۔ پہلے وہاں مدرسہ کی جماعتیں تھیں۔ اور ایک کمرہ امام مسجد کو ملا ہوا تھا۔ جو وہیں رہتا تھا۔ کچھ عرصہ تک بعض انگریزی دان ہندوستانی مسلمان اس خدمت پر مامور رہے۔ مگر آج کل کوئی آدمی اس مطلب کے لئے مقرر نہیں۔

انسٹی ٹیوٹ دیکھنے کے بعد میں شیخ سے رخصت ہونے کو تھا۔ مگر اُن کی مروت نے اجازت نہ دی۔ اُنھوں نے کہا کہ چند منٹ اور آپ کی معیت میں گزار سکتا ہوں۔ یہ کہہ کر میرے ساتھ ریل تک پہنچانے آئے۔ راستہ میں لورپول کا بڑا بازار اور ٹاؤن ہال بھی اُنھوں نے مجھے دکھایا۔ اور اس کے بعد پھر لورپول آنے اور اُن کے ہمراہ اُن کے مکان پر چلنے کی تاکید کر کے رخصت ہوئے :۔

ہندوستان کا اثر انگلستان پر

انگلستان نے جو اثر ہندوستان پر ڈالا ہے۔ وہ محتاج بیان نہیں۔ ہم روز قدم قدم پر اپنے گرد و پیش اُس کی شہادتیں موجود پاتے ہیں۔ کوئی گھر ایسا ہوگا۔ جس میں کچھ نہ کچھ نشانات انگریزی تہذیب کی تقلید کے نہ پائے جائیں۔ اکثر دیکھا جاتا ہے۔ بہت سی پرانی وضع کے گھرانوں میں بھی لڑکیوں کے جہیز تک میں ایک حصہ انگریزی سامان کا آنے لگا ہے۔ میز کرسی انگریزی وضع کا آئینہ چار گا سٹ وغیرہ چیزیں تو معمولی ہوگئیں۔ اور ہر کہ دمہ ان کی ضرورت سمجھنے لگا ہے۔ جو ذرا اور متمول ہیں۔ وہ نہایت شوق سے گھروں کو انگریزی فرنیچر سے سجاتے ہیں۔ کمروں کے نام انگریزی رکھتے ہیں کھانا انگریزی طریق سے کھانے لگے ہیں۔ پوشاک انگریزی پہنتے ہیں۔ اور اُن کے دیکھا دیکھی اور لوگوں کے سر میں بھی یہ ہی سودا سماتا جاتا ہے۔ اور تو اور زبان تک کو انگریزی اثر نے بدل دیا ہے۔ سینکڑوں انگریزی لفظ روزمرہ کی بول چال میں شامل ہوکر جزو زبان بن گئے ہیں۔ اور عالم و جاہل سب اُنہیں استعمال کرتے ہیں۔ بہت سے لفظ ایسے ہیں۔ کہ اُن کے لئے ہماری زبان میں نہایت وسیع اور نہایت آسان اور نہایت مختصر لفظ موجود ہیں۔ اُس پر بھی انگریزی کے رواج کی کثرت کے سبب سے لوگ عام طور پر اپنے لفظوں کی جگہ انگریزی لفظوں ہی کو زیادہ کام میں لاتے ہیں۔ میز کو ٹیبل کہنا۔ وقت پوچھنا ہو تو ٹائم پوچھنا ایسی مثالیں ہیں۔ کہ ہر شخص کو مستحضر ہوں گی۔ اور اس لئے زیادہ مثالیں دینے کی ضرورت نہیں۔

اس عام میلان کے تین بڑے سبب ہیں۔ سب سے اوّل یہ کہ سلطنت و حکومت کا اثر محکوم جماعت پر بہت زبردست ہوتا ہے۔ رعایا کا تخیل اکثر اپنے حکمرانوں کی عادت و رسوم کے متعلق یہ ہوتا ہے۔ کہ یہ عادات و رسوم حکومت کا جزو ہیں۔ اور ان کے اختیار کرنے سے گویا ہم عزّت کے مدارج میں سے چند درجے طے کر چکے ہیں موجودہ حکمرانانِ ہندوستان کا عالمگیر اقبال اور بڑھا ہوا اقتدار اس خیال کو اور بھی مضبوط کرتا ہے۔ "ہر عیب کہ سلطاں بہ پسندد ہنر است" ایک بہت پرانا مقولہ ہے۔ مگر اس وقت بھی ایسا ہی سچا ہے۔ جیسا کہ اس وقت تھا۔ جب یہ زبان زدِ خاص و عام ہوا۔ اور اسی سبب سے ہر انگریزی چیز آج کل پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے جو بُری بھی ہے۔ وہ ہماری نگاہوں میں اچھی اور جو اچھی ہے۔ وہ تو بہتر اور برتر نظر آتی ہے۔ دوسرا سبب ان چیزوں کی جدّت ہے۔ ہر نئی چیز زیادہ دلچسپ اور دلپسند معلوم ہوتی ہے۔ اور اس اصول کے موافق اگر انگریزی حکومت ہندوستان میں نہ بھی ہوتی تو بھی یہ چیزیں کم و بیش رواج پا جاتیں۔ اور اسی وجہ سے ان ایشیائی ملکوں میں جہاں بھی ایشیائی حکومت باقی ہے۔ انگلستان اور دیگر ممالک یورپ کا مال بکثرت جاتا ہے اور بکتا ہے۔ تیسرا سبب وہ حُسنِ ظاہری اور چمک ہے۔ جو یورپ کی صنائع کا خاصہ ہے۔ ذرا سی چیز کو چاہے اُسے کوڑیوں کے مول بیچنا ہو۔ یورپ کے تاجر اپنی کلوں کے ذریعہ ایسی جِلا دیتے ہیں۔ کہ دیکھنے والا ایک دفعہ تو پھڑک جاتا ہے۔ اور ایسی چیزیں بھی خرید لیتا ہے۔ جن کی اُسے ضرورت نہیں ہوتی۔

ہم پر مذکورہ بالا اسباب سے یورپ کا جس قدر اثر ہو کم ہے۔ اور یہ جو آہستہ آہستہ اثر ہوا اس وجہ سے تھا۔ کہ ہم لوگ بالطبع قدامت پرست ہیں۔ اور اپنی پُرانی چیزوں کو عزیز رکھتے ہیں۔ تغیّر و تبدّل سے ہم کو ایک قسم کی نفرت ہے۔ باوجود یکہ پُشت ہا پُشت سے معلوم کر چکے ہیں۔ کہ زمانہ انقلاب پسند ہے۔ اور آئے دن تبدیلیاں

ر تا رہتا ہے ۔ اس پر بھی بجائے اس کے کہ خود زمانہ کی ہوا کے ساتھ چلیں ۔ صدیوں سے
زمانہ کو کوستے چلے آتے ہیں ۔ اور یہ تماشا ہو رہا ہے ۔ کہ نہ وہ اپنی خو بدلتا ہے ۔ نہ ہم اپنی
خو بدلتے ہیں ۔ غرض ہم تو اس طرح بحیثیت محکوم ہونے کے اثر پذیر اور بحیثیت قدامت
پسند ہونے کے تاثر سے خالی چلے جاتے ہیں ۔ اور اس کشمکش میں ہماری زندگی بسر ہو رہی
ہے ۔ مگر تعجب تو یہ ہے ۔ کہ انگلستان بھی ہم سے کچھ اثرات لئے بغیر نہیں رہ سکا ۔

قوانین قدرت کے اسرار بھی عجیب ہیں ۔ اور قومیں اُن کے آگے ایسی ہی مجبور ہیں ۔
جیسے افرادِ انسانی ۔ فرض کیجئے دو شخص کچھ عرصہ تک باہم ملیں ۔ جن میں ایک زبردست
ہو ایک کمزور ۔ ایک کا دل و دماغ قوی ہو ۔ ایک کا ضعیف ۔ تو بھی یہ نتیجہ ہوتا ہے ۔
کہ یہاں زبردست کا اثر کمزور پر پڑا ۔ وہیں تھوڑا بہت کمزور نے بھی اپنے رنگ میں
رنگ لیا ۔ اسی طرح اقوام کی حالت ہے ۔ ممکن نہیں کہ کسی قوم کا سابقہ کسی دوسری قوم
سے پڑے ۔ اور وہ اُس سے متاثر ہونے سے بالکل بچ جائے ۔ انگریزوں نے اس قانونِ
قدرت کو مدِ نظر رکھ کے اور اُن سے پہلے جن قوموں کو ہندوستان سے سابقہ پڑا ۔ اُن کی
سوانح صفحاتِ تاریخ سے مطالعہ کر کے یہ تہیہ کر لیا ۔ کہ ہم قانونِ قدرت کی اس زد
سے بچیں ۔ اور بہت کچھ بچے بھی ۔ یہاں آ کر رہنے اور ہندوستان کو اپنا گھر بنانے کا
قصد تو اُن کی قوم کے کسی فرد نے آج تک کیا ہی نہیں ۔ افریقہ ۔ امریکہ اور آسٹریلیا سب
جگہ جا کر رہتے ہیں ۔ اور آباد ہو جاتے ہیں ۔ مگر ترک لازم ہے ۔ تو ہندوستان کا جو
محدود سے چند ضروریات ملک داری یا کاروبار کی وجہ سے برسوں کے لئے یہاں رہنے پر
مجبور ہوتے ہیں ۔ وہ بھی شہروں سے دور جنگل میں منگل مناتے ہیں ۔ موسم گرما میں پہاڑوں
پر انگلستان کی طرز معاشرت کا نمونہ پیدا کرتے ہیں ۔ اور اس پر قناعت نہ کر کے ہر دوسرے تیسرے
برس انگلستان کو دوڑ جاتے ہیں ۔ اور اس طرح اپنے ملک کی یاد اور وہاں کی عادات کا اثر تازہ رکھتے ہیں
بلکہ یہاں تک کوشش ہوتی ہے ۔ کہ انگلستان کے تازہ ترین فیشن رائج نہ پا جائیں ۔ اور وہ بیٹھ کر

وہی زندگی بسر کریں جو اُن کے ہم وطن انگلستان میں کر رہے ہیں۔ بچوں کی تعلیم و تربیت میں بھی یہی اہتمام کیا جاتا ہے۔ اور کوئی معزز اور متمول انگریز یہ گوارا نہیں کرتا۔ کہ اُس کے بچے ہندوستان میں تعلیم پائیں۔ چھوٹی سی عمر میں اُنہیں انگلستان بھیج دیا جاتا ہے اُن کی جدائی منظور کی جاتی ہے۔ مگر یہ نہیں پسند کیا جاتا۔ کہ وہ یہاں کی خو بو سیکھیں۔ مگر ان سب احتیاطوں پر کچھ تھوڑا سا اثر ہمارا ابھی انگلستان تک پہنچ گیا ہے۔ اور رفتہ رفتہ مستقل ہوتا جاتا ہے۔ اسے کم نہیں سمجھنا چاہئے۔ بلکہ وہ اسی اصول کا جس کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے۔ ایک بیّن ثبوت ہے۔ اور صاف ظاہر کرتا ہے۔ کہ کوئی دو قومیں جو آپس میں ملیں۔ ایک دوسری پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتیں ؎

کیا ہے ایک دستِ آرزو نے وار دو جانب
زلیخا کے جگر تک چاک ہے یوسف کے داماں کا

غور کرنے والے کو جو چیز آجکل انگلستان میں غیر معمولی نظر آتی ہے۔ وہ مختلف رنگوں کا شوق ہے جن لوگوں نے آج سے بیس برس پہلے انگلستان کو دیکھا ہے اور اب دوبارہ وہاں گئے ہیں مجھے اُن سے معلوم ہوا کہ پہلے مرد تو مرد عورتیں بھی شوخ رنگ کپڑا نہیں پہنتی تھیں۔ اوّل تو سیاہ رنگ کے سوا کسی رنگ کا کپڑا وہاں مقبول ہی نہیں۔ اور ہر موقع پر خواہ شادی ہو۔ خواہ غمی۔ اسی رنگ سے زیادہ تر کام لیا جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی رنگ کا شوق کرے بھی تو اکثر صوفیانہ رنگ پسند کئے جاتے تھے۔ نتیجہ اس کا یہ تھا۔ کہ کسی مجمع میں سوا سیاہ پوشی کی کثرت کے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اور وہ انگریز اور میمیں جو ہندوستان کو دیکھتے تھے۔ اور یہاں کے گلی کوچوں اور بازاروں میں اور میلوں کے موقعوں پر لوگوں کو رنگا رنگ کے لباسوں میں ملبوس پاتے تھے۔ ہمارے اس شوق کی بہت تعریف کرتے تھے۔ اور اسی بناء پر بلادِ شرق کو شاندار خوش رنگ اور رنگیلا بیان کرتے تھے۔ مگر اب انگلستان میں بھی موسمِ بہار میں کسی اور مقامِ تفریح پر مجمع ہو۔ تو لباسوں کی رنگینی کے اعتبار سے وہ

کسی مشرقی گروہ سے بہت پیچھے نہیں رہے گا۔ عورتیں تو رنگ کی انتہا سے زیادہ شائق ہوتی جاتی ہیں۔ اُودا اور بنفشئی رنگ نہایت مرغوب ہے بلاؤس بنفشئی۔ گون بنفشئی۔ ٹوپی پر پھول بنفشئی۔ بنفشئی چہرے پر ہلکی جالی کی نقاب اس کا بھی بنفشئی رنگ۔ اور دھوپ کے بچاؤ کے لئے اگر سن شیڈ ہاتھ میں ہے۔ تو وہ بھی بنفشئی ریشم کا۔ اس کے سوا اور بھی طرح طرح کے رنگ عورتوں میں مقبول ہوتے جاتے ہیں۔ پیازی آسمانی سبز اور بعض بعض جگہ سرخ۔ یہ سیلان روز بروز ترقی پر ہے۔ یہاں تک کہ مرد جو نسبتاً سادہ وضع کے پابند ہیں۔ رفتہ رفتہ رنگینی کی طرف مائل ہونے لگے ہیں۔ فوق البھڑک صدری پہننا۔ اب ایک معمولی بات ہوگئی ہے۔ اور ٹائی شوخ رنگ کی تو اب بڑے بڑے متین آدمی بھی پہننے لگے ہیں۔ دکانوں کی آئینہ دار کھڑکیاں آج کل رنگین کپڑوں سے مزین ہیں۔ اور کئی جگہ اُن میں جاپانی ریشم کے چوغے جن پر رنگا رنگ کے نقش ونگار ہیں۔ لٹک رہے ہیں۔ اکثر صاحبان ان چوغوں سے ڈریسنگ[ؔ] گون کا کام لیتے ہیں یعنی رنگین کپڑے پہننے کا شوق جو طبیعتوں میں پیدا ہوگیا ہے۔ اُسے گھر کی چار دیواری کے اندر پورا کرتے ہیں۔ اور باہر اپنی اُسی ملّی وضع کی پابندی قائم رکھتے ہیں۔

زنانہ لباس میں ایک چیز کچھ عرصہ سے رواج پا چلی ہے۔ جو قطعی ہندوستانی ہے۔ یعنی دوپٹہ۔ فرق صرف اتنا ہے۔ کہ لیڈیاں یہاں کی طرح اُسے اوڑھتی نہیں۔ بلکہ کندھوں پر ڈال لیتی ہیں۔ اس طرح سے کہ اُس کے دونوں پلّے آگے لٹکتے رہتے ہیں نفیس بنارسی ململ کے۔ طرح طرح کے بیل بوٹے دار اور کاڑھے ہوئے دوپٹے عام ہوتے جاتے ہیں۔ اور موسم گرما کے لباس کا ایک جزو بن چلے ہیں۔ بعض خاص موقعوں پر دوپٹے

---

[۱] زنانہ کرتہ۔ [۲] سایہ۔ [۳] ہلکی ریشمی چھتری جو صرف آفتاب کی شعاعوں سے بچاؤ کے لئے لگائی جاتی ہے۔ [۴] وہ کھلا چوغہ جو انگلستان میں صبح وشام معمولی کپڑے اُتارنے کے وقت پہنا جاتا ہے۔ اور جس کے نیچے رختِ خواب چھپا رہتا ہے ۱۲۔

اوڑھے بھی جانے لگے ہیں۔ ایک دفعہ مکتی فوج کا ایک نہایت عظیم الشان جلسہ لندن میں ہُوا۔ جس میں عام حاضرین کے علاوہ چھ ہزار زن و مرد فوج کی مختلف شاخوں کی طرف سے دُور دُور سے آکر شریک ہوئے۔ اس جلسہ میں جنرل بوتھ نے جو اس مذہبی فوج کا بانی اور سپہ سالار ہے۔ اپنی فوج کی عورتوں کو جن کی تعداد کوئی تین ہزار کے قریب ہوگی باریک ململ کے رنگے ہوئے دوپٹوں سے سجایا تھا۔ ہر نشست پر ایک رنگا ہُوا دوپٹہ پہلے سے رکھ دیا گیا تھا۔ اور یہ عورتیں اتنے ہی اپنی ٹوپی اتار کر کرسی کے نیچے رکھ دیتی تھیں۔ اور دوپٹہ اوڑھ لیتی تھیں۔ اُن کے گورے رنگوں پر سبز اور بسنتی دوپٹے عجب بہار دیتے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ جنرل بوتھ نے اپنے جلسے کا منظر کسی آسمانی دنیا میں منتقل کر لیا ہے۔ اور جو نیک عورتیں وہاں جمع ہیں۔ وہ اُس دنیا کے فرشتے یا حوریں ہیں۔ بوڑھے جرنیل کی جہاندیدہ نگاہ نے جو اس جلسہ کی شان بڑھانے کے واسطے دنیا بھر کے لباسوں سے اس ہندوستانی کا انتخاب کیا۔ یہ کوئی چھوٹی سی بات نہیں۔ بلکہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ ہماری چیزیں بتدریج انگلستان کے دلوں میں گھر کرتی جاتی ہیں۔ خواہ ہم خود اُن سے کتنے ہی متنفر ہوتے جائیں۔

انگلستان کے مذاق میں جو تغیر تدریجاً پیدا ہو رہا ہے۔ وہ کچھ لباس تک ہی محدود نہیں۔ کھانے کی چیزوں میں بھی اُس کا اثر نظر آتا ہے۔ قلیہ جسے انگریز کری کہتے ہیں۔ اب انگلستان کے ہوٹلوں میں اکثر تیار ہونے لگا ہے۔ اور بہت سے گھروں میں بھی رواج پا گیا ہے۔ اور یہ گھر نہ صرف اُن انگریزوں کے گھر ہیں۔ جو ہندوستان میں رہ چکے ہیں۔ بلکہ ایسے گھرانے بھی جنہیں کبھی یہاں آنے کا اتفاق نہیں ہُوا۔ اس غذا کا شوق کرنے لگے ہیں۔ اس کے پکانے کا مصالحہ ٹین کے ڈبوں میں بند ہو کر مہنگے داموں بکتا ہے۔ حالانکہ اُس میں بڑا جزو فقط ہمارے

ہاں کی پسی ہوئی ہلدی ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے انگریزی مطبخ پلاؤ سے آشنا ہو گئے ہیں۔ اور کباب سے بھی ناواقف نہیں ہے۔ ہندوستانی مٹھائیاں بھی کہیں کہیں پہنچنے لگی ہیں۔ اور ہندوستان کا مشہور میوہ آم بھی وہاں اپنا سکہ جماتا جاتا ہے۔ آم کی چٹنی اور آم کا مربہ تو بآسانی دکانوں میں مل سکتے ہیں۔ مگر اب کہیں کہیں آم کا اچار بھی پسند ہونے لگا ہے۔

یہ اثرات جن کا ذکر مثالاً کیا گیا ہے۔ انگلستان کی مجموعی قومی زندگی اور اس کی مستقل رفتار کے مقابلہ میں گو خفیف نظر آتے ہیں۔ تاہم باعتبار آئندہ تغیرات کے نشانوں کے خفیف نہیں ہیں۔ خصوصاً جب یہ دیکھا جائے۔ کہ خیالات تک میں بھی ہندوستان کا اثر پہنچ رہا ہے۔ آزادی مساوات اور حقوق کے خیالات جو صدیوں سے اہل انگلستان کی گھٹی میں پڑے ہیں۔ ضرور اب تک باقی ہیں۔ لیکن دیکھا جاتا ہے۔ کہ اکثر امرا اور مدبرین پر حکومت پسندی کا مذاق غالب آتا جاتا ہے۔ اور شوقِ جہانبانی جسے سیاسی اصطلاح میں امپیریلزم سے تعبیر کرتے ہیں۔ دماغوں میں سما کر آزادی اور مساوات کے تخیل کو مغلوب کرتا جاتا ہے۔ یہ خاص اثر ہمارے نزدیک قابلِ ستائش نہیں۔ لیکن یہاں ہمیں اچھائی یا برائی سے بحث نہیں بلکہ اس سے غرض یہ ہے۔ کہ امر واقعہ کیا ہے۔

اب تک جو اثر ہندوستان نے انگلستان پر ڈالا۔ اس میں ہماری ہمت یا کوشش کو کوئی دخل نہیں۔ اگر ہم ان بے شمار مواقع سے پورا فائدہ اٹھائیں۔ جو انگلستان پر اثر ڈالنے کے لئے ہمیں حاصل ہیں۔ تو ان اثرات کی رفتار زیادہ تیز ہو سکتی ہے۔ اور نتائج کی اہمیت بھی اُس نسبت سے بڑھ سکتی ہے۔

دُنیا کی دلچسپیاں

دُنیا بھی اِک بہشت ہے اللہ رے کرم
کن نعمتوں کو حکم دیا ہے جواز کا!!

آدمی بسا اوقات تکالیف کے صدموں سے گھبرا کر یا محنت کی سختیوں سے اُکتا کر کہہ اُٹھتا ہے۔ "دُنیا میں کیا آئے ایک آفت میں پھنس گئے" یا دُنیا ہے۔ کہ ایک سلسلۂ مُصیبت" کوئی اسے دوزخ سے تشبیہ دیتا ہے۔ کوئی دار المحن کے نام سے یاد کرتا ہے۔ گو عملاً سب اس کی محبت میں مُبتلا ہیں۔ اور سوائے چند خدا رسیدوں کے یہاں سے کُوچ کرنے کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ تاہم ایک زمانہ ہے۔ کہ اسے بُرا کہنے پر تُلا ہُوا ہے۔ ایسی حالت میں اُس حق پسند کی نظرِ غائر کی داد دینی پڑتی ہے۔ جس نے دُنیا کی اُلجھنوں سے قطع نظر کر کے اُس کی بے شمار دلچسپیوں کا دھیان کیا ہے۔ اور شکر گزاری کا ثبوت دیا ہے۔ اور غفلت کیش انسان کو یاد دلایا ہے۔ کہ اسے خالق نے کیسی کیسی نعمتیں بخشی ہیں۔ جن سے وہ ہر دم ہر لحظہ فائدہ اُٹھاتا ہے۔ اور اُس پر احسان مندی کا یہ حال ہے۔ کہ ذرا سی تکلیف پہنچے اُسے دنوں۔ مہینوں۔ بلکہ برسوں یاد رکھے۔ اور ہر ایک سے اس کی شکایت کرتا پھرے۔ اور جو لُطف ہر گھڑی نصیب ہُوا ہے۔ اُسے بھُول جائے۔ اور اُس کا شکر زبان پر لانا تو درکنار دل میں بھی کم آنے دے۔ جو قیود مذاہب نے بعض چیزوں کے متعلق لگا دی ہیں۔ ان سے تو گھبرائے لیکن ان کے مقابلہ میں جو چیزیں جائز کر

ن میں اور جن کی اجازت ہے۔ کہ کھلے بندوں لو دل کھول کر اُن سے حظ اُٹھاؤ۔ ان کا ذکر کرو کہ[1] بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ کا مفہوم اگر ذہن میں رہے۔ تو ایسی غفلت ممکن نہیں۔ مگر نسیان تو انسان کی گھٹی میں پڑا ہے۔ مُبارک ہیں وہ لوگ جو احسانات الٰہی کو نہیں بھولتے۔ اور ان کے سامنے دُنیا کی غموں کلفتوں اور رنج کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے۔

ذرا آنکھ کھول کر دیکھو۔ کیا بہار ہے۔ نسیم کے ہلکے جھونکے۔ بادِ صبا کی اٹکھیلیاں۔ بہتے ہوئے پانی۔ بہتی ہوئی ندیاں۔ شفاف جھیلیں۔ ذخار سمندر۔ آسمان سے باتیں کرتے ہوئے پہاڑ۔ اور اُن کی برف سے ڈھنپی ہوئی چوٹیاں۔ پھولوں کے تختے۔ اور پھلوں سے لدی ہوئی ڈالیاں۔ درخت اور اُن کے ہرے ہرے پتے۔ سبزہ اور اُس کا فرشِ زمرّدیں۔ پکتے ہوئے کھیت اور اُن میں قوتِ زندگی سے بھرے ہوئے سنہری خوشے نگاہ کے لئے جنت نہیں تو کیا ہے؟ بُلبُل اور اُس کی خوش نوائی۔ فاختہ اور اس کی کوکو۔ کوئل اور اس کی کوک۔ "پپیہا" اور اس کی "پی پی"۔ یہ نغمہ نہیں تو کیا ہے؟ اسی کو تو فردوسِ گوش کہتے ہیں۔ قدرت کا یہ ساز ہر وقت تمہارے خوش کرنے کو تیار ہے۔ اس کا سازندہ نہ کبھی تھکتا ہے۔ نہ اُس کی آواز میں ضعف آتا ہے۔ یہ وہ ساز ہے۔ جس کے لئے بگڑنا نہیں، بنا۔ اور قدرت کا حُسن کچھ مناظرِ کوہ و دشت اور باغ و راغ پر ہی ختم نہیں ہو گیا۔ نہ اُس کی آواز پرندوں کی خوش الحانی تک محدود ہے۔ آنکھ بینا ہو۔ تو ہر جگہ حُسن کا جلوہ ہے غزال کی آنکھ مور کے پر اور شیر کی کھال تو خوبصورت مشہور ہی ہے۔ مگر جن جانوروں کو حُسن سے بظاہر کچھ مناسبت نہیں۔ ان کو اگر باریک بین نگاہوں سے دیکھو۔ تو ایک ایک جامع اوصاف ہے۔ شکل پر کیا موقوف ہے۔ جوہر اچھے ہوں۔ تو کیا دل نہیں لے لیتے؟ شتر سوار سے پوچھو۔ جس کی سانڈنی لق و دق اور بے آب و گیاہ میدان کے کالے

[1] قرآن مجید میں ہے "اپنے خدا کی نعمتوں کا ذکر کر"

کوسوں کی منزل طے کرکے آئی ہے - کہ اُترتے ہی اُس کے گلے سے لپٹا جاتا ہے - اپنی اسائش کی فکر پیچھے کرے گا - پہلے اپنی وفادار سواری کے آب و دانہ کا بندوبست کرلے - نیز گام تازی اپنے یکہ تاز سے وہ پیار لیتا ہے - کہ کسی معشوق کو کم نصیب ہو - جس حرماں نصیب بڑھیا کے لڑکے لڑکیاں اُسے چھوڑ کر چل دیتے ہوں - اور جیسے تنہائی کی مونس ایک بلی نصیب ہوئی ہو - اُس سے اُس بلی کے حُسن دلفریب کی تعریف سُنو - اور جن ملکوں میں کتوں کو پالنے کا عام رواج ہے - اور مذہباً کوئی نفرت اُن سے موجود نہیں - وہاں ذرا کتوں کی قدردانی ملاحظہ کرو - اچھی اچھی حُسن کی پتلیاں اُن پر قربان ہوئی جاتی ہیں - اور کہتی ہیں "حُسن کی کان" "راحت کی جان" - اُس بڑھیا کے کان بلی کی "میاؤں" ہی میں موسیقی کے سارے سُر تال موجود پاتے ہیں - اور کُتّے کی وفاداری کی فدائی جوان عورت کے نزدیک اُس کی آواز چنگ و دف کی صدا ہے - اور دُنیا بھر کی مختلف اصوات کے ملنے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے - درد آشنا اہلِ دل مختلف سُروں کا ارگن سمجھتے ہیں - ان کے خیال میں کوئی سُر غلط نہیں - اور کوئی صُورت قبیح نہیں -

گرمی کے دن اور اُن میں ٹھنڈا پانی سردی کے دن اور اُن میں سُورج اور دھوپ برسات کا موسم اور اُس میں ابر اور گھٹائیں - بہار کی فصل اور اُس کا جوبن سب نعمتیں ہیں جن میں انسان کا حصہ ہے - قدرت نے اُس کی حفاظت کا ہر موسم اور ہر آب و ہوا کے مطابق کچھ نہ کچھ بندوبست کیا ہے - اور اس پر قادرِ مطلق کا یہ احسان مزید ہے - کہ اس کو ایک چیز ایسی دے دی ہے - جس کے زور پر یہ نہ صرف اپنی حفاظت کا بلکہ اپنے آرام اور آرائش کا پورا پورا سامان کرسکتا ہے - اور وہ چیز عقل ہے - عقلِ انسانی نے صفحۂ قدرت کے متن پر خوب خوب حاشئے چڑھائے ہیں - اور اُن میں عجب عجب گلکاریاں کی ہیں - خس خانہ و برفاب راحت گرما ہیں - تو قہوہ خانہ و گرمابہ فرحتِ سرما - باریک ریشمی ململ اور جالیاں گرمی کے لئے اور سمور اور پشمینہ سردی کے لئے پہننے کا سامان ہیں - جاڑوں کی

راتوں کے لئے لحاف اور گرمیوں کی تپش کے لئے پنکھے۔ یہ سب دولت مندوں کے لئے ہے۔ مگر غریب بھی خدا کے فضل سے محروم نہیں۔ لاکھ دولتوں کی ایک دولت قناعت ہے۔ جس کو نصیب ہو۔ اور غریبوں میں امیروں کی نسبت زیادہ ثابت ہے۔ امیر کو جوں جوں آرام کے اسباب ملتے جاتے ہیں۔ کے جاتا ہے۔ اور غریب کو جو مل گیا۔ اسی کو صبر شکر سے لے کر بال بچوں میں خوش ہو بیٹھتا ہے۔ گرمی میں دوپہر کے وقت درختوں کا سایہ اُسے خسخانے سے بہتر ہے۔ اور سردی میں سورج اُس کے کمرے کی انگیٹھی ہے۔ رات کو اگر سکلاٹ لحاف میسر نہیں۔ تو کیا ہوا گدڑی یا کملی میں لپٹا ہوا ہے۔ یا چند سوکھی لکڑیوں کا ایک ڈھیر جمع کر لیتا ہے۔ اور ان کو جلا کر اُس کے قریب رات کاٹ دیتا ہے۔ گھر ہو اور اس میں اتفاق تو ایسی غریبی بھی کٹ جاتی ہے۔ اور پھر دولت ڈھلتی ہوئی چھاؤں ہے کیا جو غریب ہیں۔ وہ ہمیشہ غریب ہی رہیں گے۔ کیا اُن کی اولاد کی کبھی نہیں سنی جائے گی؟ اُمید اُن کے کان میں یہ خوش آواز ڈالتی ہے ؎

رسیدہ مژدہ کہ ایام غم نخواہد ماند

چناں نماند و چنیں نیز ہم نخواہد ماند

انسان نہ دیکھے۔ تو اور بات ہے ورنہ خود اس سے کتنی بڑی افضل چیزیں حکمتِ ایزدی سے اس کی خدمت میں مصروف ہیں۔ آفتاب اُس کے لئے سمندروں کے پانی کو اُبالتا ہے۔ اُن کے بخارات کو اُڑا کر بادل بناتا ہے۔ بادل برستے ہیں۔ تو زمین سرسبز ہوتی ہے۔ پھر آفتاب چمکتا ہے۔ تو کھیت پکتے ہیں۔ اور میوے کھانے کے لائق بنتے ہیں۔ ہوا جو انسان کی زندگی کا سہارا اور بہت سی چیزوں کی ہستی کا راز ہے۔ انسان کے لئے چکی تک پیستی ہے۔ پانی چلتا چلتا انسان کے سو کام کر جاتا ہے۔ کھیتوں میں سے ہو نکلا۔ تو وہ ہرے ہو گئے۔ باغ میں جا پہنچا۔ تو اُس میں پھل پھول آ گئے۔ کشتی کو اس کی چھاتی پہ رکھ کر کہہ دو۔ کہ بھئی ذرا اسے بھی ساتھ لئے جانا۔ تو اُسے کچھ عذر نہیں۔

اُس میں دس ہیں، سو پچاس یا زیادہ آدمی چڑھ بیٹھیں۔ تو اُسے کچھ پرواہ نہیں۔ اور تو
اور بوجھ جتنا اور جس قسم کا چاہو۔ لاد دو۔ انکار نہیں۔ بہائے لئے جاتا ہے۔ آگ آدمی کے
لئے کھانا پکاتی ہے۔ روشنی مہیا کرتی ہے۔ اور اس کے سوا کسی اور کام میں جوت دو۔
تو اپنی قوت خدمت کے لئے حاضر کر دیتی ہے۔ ریلوے کے انجن۔ دخانی جہاز۔ اور
کارخانوں کی کلیں آگ ہی کے زور سے چل رہی ہیں۔ ان قوّتوں سے بالاتر ایک قوّت
ہے۔ جسے برق کہتے ہیں۔ یہ پہلے صرف چمک کر ایک آنِ واحد میں غائب ہو جاتی تھی۔
اور انسان کی شائق نظر کو ایک جھلک دکھا کر اُس سے اپنا چہرہ چھپا لیتی تھی۔ اسے دیکھ کر
انسان پہلے دہل جاتا تھا۔ یا غش کھا کر گر پڑتا تھا۔ اب یہ بھی عقلِ انسانی کی ترقّی کے
آگے سرِ تسلیم خم کئے ہوئے ہے۔ انسان کبھی اسے پیامبری کی خدمت سپرد کرتا ہے۔
اور کبھی اسے گھوڑے کی جگہ گاڑی میں جوتتا ہے۔ اور اُس پر غضب ہے۔ کہ جس نے
یہ عظمت اور عزّت دی۔ اُس کا شکریہ ادا نہیں کرتا۔

تمتع کے موقعے اس کثرت سے ہیں۔ کہ اُن کی کثرت طبیعت کو اُن سے غافل کر دیتی
ہے۔ کھانے کی چیزوں ہی کو دیکھو۔ سرد ملکوں کے خوش ذائقہ انگور اور سیب اور گرم
ملکوں کے مرغوب میوے آم اور خربوزے۔ قوّتِ ذائقہ کے لئے اس سے بڑھ کر لذت
کیا چاہتے ہو۔ لوگ انہیں بہشتی میوے کہتے ہیں اور مراد یہ لیتے ہیں کہ یہ بہشت سے آئے ہیں کتنا چھوٹا تخیّل ہے
یہی کیوں نہیں کہتے کہ یہ بہشت ہے جس میں ایسے ایسے میوے میسّر ہیں۔ اور انہیں پہ کیا منحصر ہے اپنی اپنی
جگہ ایک سے ایک بڑھ کر ہے۔ نگترہ اور نارنگی کھاؤ تو قلب کو تفریح ہو۔ اس سے بڑھ کر ان کی خوبی کیا ہوگی۔
مادی چیزیں ہیں مگر تفریحِ قلب کا مادہ ان میں موجود ہے۔ اور خوبانی کا تو قدرت نے اپنے ہاتھ سے جوڑا بنایا
ہے۔ ہیرے بادام اور پستے۔ ان سب کو برتو چکھے ہو اور پھر کہتے ہو۔ ہم پر منّ و سلویٰ نہیں اُترتا۔ اس
سے بڑا خوانِ کرم کون بچھا سکتا ہے۔ اور کس نے کبھی بچھایا۔ مَائِدَۃً مِّنَ السَّمَآءِ کی تفسیر ہے۔ کوئی پکا پکایا

۱ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُمت نے اُن سے یہ کہا تھا۔ کہ ہمارے لئے پکا پکایا (باقی بر صفحہ ۲۴۹)

ہوا ایک کھانا تو ان بہشتی کھانوں کے مقابلے میں پیش کرو۔ اور تمہارے پکائے ہوئے کھانے بھی تو انہیں کھانوں کی مکمل نقل ہے۔ حلوا جسے بادام بناتے ہو۔ کہ بادام کے ذائقے سے کسی قدر مشابہ ہو۔ اگر یہ قدرت کے مہیا کئے ہوئے مصالح نہ ہوں۔ تو تمہارا کوئی کھانا مکمل اور مزے دار نہ ہو۔ طرح طرح کی رقعہ روزی کرکے اُسے ان چیزوں سے سجا لیتے ہو۔ تو تمہارا دسترخوان پُر رونق ہو جاتا ہے۔ اور یہ من و سلویٰ بغیر اقرار احسان کے کھاتے کھاتے جب تھک جاتے ہو۔ تو بقلہا قثائہا پکارنے لگتے ہو۔ اُس وقت گاجر۔ مولی لہسن۔ پیاز۔ ماش اور مسور کی دال۔ کھیرا ککڑی وہ مزہ دیتے ہیں۔ کہ سیب و انگور اور سردے اور آم کو بھلا دیں سمجھتے ہو۔ کہ کتاب مقدس میں پرانوں کی کہانی بیان ہوئی ہے مگر یہ معلوم نہیں کہ تمہارے دلوں کا بنانے والا اور جاننے والا اس کہانی کے بیان میں فطرتِ انسانی کا راز بتا رہا ہے۔ تاریخ روز اپنے آپ کو دُہرا رہی ہے۔ اور تمہیں خبر نہیں ہوتی۔

ذائقے سے کہیں لطیف وہ حس ہے۔ جسے شامہ کہتے ہیں۔ اس میں نہ کچھ کھانا ہے نہ پینا۔ نہ چھُونے کی ضرورت ہے۔ صرف کسی خوشبو کے قریب آنے کی دیر ہوتی ہے۔ کہ مشامِ جان تازہ ہو جاتا ہے۔ دل میں مسرّت محسوس ہوتی ہے۔ اور باچھیں کھل جاتی ہیں خدا جانے اس میں کیا تاثیر ہے۔ اور اُس نے یہ اُڑ کر پہنچنے کی طاقت کہاں سے پائی ہے کہ آنکھ کو کوئی سبب نظر نہیں آتا۔ اور طبیعت ہے۔ کہ خوش ہوئی جاتی ہے۔ آدمی ایک ٹھنڈا سانس کھینچتا ہے۔ کہ شاید سانس سے شامل ہو کر یہ نعمت اندر چلی جائے۔ اور اپنی ہو رہے۔ مگر نہیں وہ ایک گزران لُطف ہوتا ہے۔ جو پل بھر میں چل دیتا ہے۔ اور وہی سانس جو اندر سے واپس آتا ہے۔ تو گرم اور افسردہ ہوتا ہے۔ اور اس میں خوشبو کا کوئی پتہ نہیں ہوتا۔ کبھی ایسے جنگل میں گزر ہو۔ جہاں گلاب کا تختہ کھلا ہوا ہو۔ یا جہاں

(بقیہ صفحہ ۲۴۸) اور چناچنایا دسترخوان آسمان سے اُترے۔ تو مانیں۔ آخر منّ و سلویٰ اُترنے لگا ۱۲

اور پہاڑی پھولوں کی مہک دُور سے آرہی ہو۔ اور تمہیں اپنی طرف بُلا رہی ہو۔ تو ضرور جی چاہے گا۔ کہ وہیں جھونپڑا بنالو۔ اور بیٹھ رہو۔ اگر یہ نہیں نصیب ہُوا۔ تو فصلِ گُل ہی کسی باغ میں جا نکلو۔ خوشبوئیں تو اچھی اچھی ہیں۔ مگر موتیا کھلی ہو۔ تو معلوم ہو کہ تیزی کے ساتھ مستی کس حکمت سے ملائی گئی ہے۔ اور پھر کیوڑے کی جنون انگیز خوشبو کرنے کی جانفزا مہک اور بیدِ مشک کی سوکھی لکڑی میں دھانی رنگ کے پھول اور اُن کی بھینی بھینی بو۔ کوئی کس کس حسن پر جان دے۔

اُستادِ قدرت کی اُستادی قابلِ دید ہے۔ ذہن انسان کی ترقی کے لئے کیسا زینہ بنایا ہے۔ مادی اشیاء آتی ہیں۔ مثلاً سردی۔ گرمی جن کے متعلق کھانا استعارے کے طور پر بولتے ہیں۔ لیکن جو فی الحقیقت کھانے اور چکھنے میں نہیں آتیں۔ دھوپ نظر بھی آتی ہے۔ محسوس بھی ہوتی ہے۔ بدن پر اثر بھی چھوڑتی ہے۔ مگر پھر بھی ایسی چیز نہیں۔ جیسے لونگ اور دارچینی۔ کہ کھانے سے بدن میں حرارت معلوم ہوتی ہے کہ کبھی کبھی دل تک بھی پہنچتی ہے۔ برف و باران کی وجہ سے ہو۔ تو ایک حد تک نظر بھی آتی ہے۔ پر اس قسم کی نہیں جیسے طباشیر اور سرد چینی کہ کھائیں۔ اور زبان سے لے کر دل تک ٹھنڈک پہنچ جائے۔ دوم درجے کی مادی اشیاء کے بعد خوشبو سبق دینے آتی ہے۔ کہ اس کا سبب تو نظر کے سامنے ہے۔ مگر وہ خود نظر نہیں آتی۔ ہاں اس کا اثر موجود ہے۔ اس کے بعد ایک چیز آتی ہے۔ جو خوشبو سے بھی بدرجہا زیادہ لطیف ہے۔ اور وہ "حسن" ہے۔ دیکھتے ہی دل قابو سے نکلا جاتا ہے۔ اس میں بیقراری اور تڑپ محسوس ہوتی ہے ایک قسم کی لذت اس نظارے میں شامل ہے جو اپنے ساتھ درد کی کیفیت بھی رکھتی ہے پر اتنی مرغوب ہے کہ کوئی اس درد سے خالی نہیں رہنا چاہتا۔ یہ لذت اور سب لذتوں سے نرالی ہے نہ اس کو کسی لذت سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ نہ اس کو کسی طرح بیان کر سکتے ہیں۔ بس اس کے آگے "حسن مطلق" کی شناخت تک ایک ہی زینہ رہ جاتا ہے۔ مگر انسانی بصیرت کی معمولی حد یہیں تک ہے۔ یہاں پہنچ کر

بہت سی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں - اور آخری زینے پر نظر ڈالنے کی تاب نہیں لا سکتیں کم لوگ ہیں جو آخری زینے پر کھڑے ہو کر موجوداتِ عالم پر نظر ڈالتے ہیں - یا اُن سے پرے تک دیکھتے ہیں - لیکن اگر آدمی غور کرے - تو قدرت نے سبق پڑھانے میں اور سبقوں کی ترتیب مکمل اور آسان کر دینے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا - اُس بینائی پر حیف ہے - جو اتنی قریب مثال کے ہوتے یہ کہے کہ مجھے نظر نہیں آتا - تو میں کیونکر مانوں - میں دیکھ نہیں سکتا - تو میں کیونکر متاثر ہوں - میں دُور ہوں - میں کیا کروں ؎

برین دو دیدۂ حیرانِ من ہزار افسوس
کہ با دو آئینہ رویش عیاں نمی بینم

لیکن ہم تو دُنیا سے آگے نکل چلے - ابھی تو اسی کی دلچسپیاں ختم نہیں ہوئیں - خیر اُن کا ختم ہونا تو مشکل ہے بمقصد صرف یہ ہے - کہ اُن میں سے جس ایک سلسلے کا بیان ہم نے شروع کیا تھا - اُس زنجیر کے ایک دو حلقے ابھی باقی ہیں - ہم نے "حُسن" کا نام لیا تھا - اُن چند لوگوں کو چھوڑ کر جو "حُسن" کی جھلک کو - دریا اور دیگر مناظرِ قدرت میں دیکھتے ہیں اور اس سے پھاند کر منزل کو جا لیتے ہیں -

"حُسن انسانی" میں دیکھ کر دُور ہی سے تڑپتے ہیں - اور تڑپتے تڑپتے منزل پر جا رہے ہیں - اُن بے شمار شالوں کی طرف آؤ - جو حُسن کو دیکھ کر اس کو اپنا بنانے کی آرزو کرتے ہیں - اور آسانی کے لئے اِس صیغے میں حُسنِ انسانی کے فدائیوں کو دیکھو - ان میں کتنی ایسے خوش قسمت ہیں - جو آرزو میں کامیاب ہوتے ہیں - جس حسین پر آغازِ عشق میں اُن کی نظر پڑتی ہے - آخر اُس سے ملنا ہو جاتا ہے - دنیاوی رسوم اور مذہبی قوانین دونوں اس اتحاد کو تسلیم کر کے اپنی منظوری کا سہرا طالب و مطلوب کو پہناتے ہیں - اور دُعا دے کر رخصت کرتے ہیں - کہ جاؤ خوش رہو - آباد رہو - پھلو پھولو - آگے چل کر درختِ امید ثمر لاتا ہے - حُسن پھر نئی کونپلیں نکالتا ہے - ماں باپ کے لڑکے لڑکی کی پیشانی میں پھر اُسی نور کی جھلک دیکھتے

ہیں جس نے انہیں جوانی میں ایک دوسرے کا دلدادہ شیدا کیا تھا۔ اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ اس کی ہر ایک بات میں اپنی کسی عادت کسی خصلت کسی کمالِ ظاہری یا باطنی کا نقش دیکھتے ہیں۔ اور باغ باغ ہوتے ہیں۔ یہ وہ خوشی ہے۔ جس کے ساتھ کی دُنیا میں کوئی اور مسرت نہیں ہو سکتی۔ پس پوچھو۔ کہ آیا جو نعمتیں جائز کی گئی ہیں۔ اُن کا پلڑا ممنوعات اور مکروہاتِ دنیا سے بھاری ہے یا نہیں۔ یہ خوش قسمت جوڑا تو جو جواب اس سوال کا دے گا وہ تو ہم سمجھ ہی سکتے ہیں۔ لیکن ممکن ہے۔ کہ کوئی اور یاس و حرمان کا ستایا ہُوا اول پکار اُٹھے۔ دُنیا کی خوبیاں تو گن ڈالیں۔ مگر تصویر کے دوسرے رُخ کو بھی دیکھو۔ غور کرو۔ دنیا میں کتنی مُصیبت ہے۔ کتنی بیماریاں ہیں۔ کتنا افلاس ہے۔ کیسی کیسی خونریزیاں ہیں۔ بجلی کتنے خرمن جلاتی ہے۔ آگ کتنے گھر پھونکتی ہے۔ موت کیسے کیسے خاندان تباہ کرتی ہے۔ غرض ہزار آفتیں ہیں۔ اور ایک انسان کی جان ہے ع

ہرچہ آید بر سرِ فرزندِ آدم بگذرد

یہ بیچارہ سب ستم سہے جاتا ہے۔ اور اُف نہیں کرتا۔ مگر یہ شکایت کرنے والے خواہ کتنے ہی حق بجانب ہوں۔ انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ دُنیا اضداد سے پیدا کی گئی ہے ہر ایک چیز کا وجود اس کے ضد کے باوجود اس کے ضد کے وجود کا متقاضی ہے۔ دُھوپ کے ساتھ سایہ لگا ہوا ہے اور دُھوپ کا احساس ناممکن ہوتا اگر ساتھ سایہ نہ ہوتا۔ ایک مثبت ہے دوسرا منفی، دونو لازم و ملزوم ہیں۔ دیکھنا یہ ہے۔ کہ حکمتِ بالغہ کا مقصد اصلی کیا ہے۔ اور اس میں انسان کا کیا حصّہ ہے۔ نگاہ میں وُسعت اور عمق پیدا ہو جائے۔ تو تمام تکالیف خیر محض دکھائی دیں۔ اور ہر منفی کی تہ میں کچھ مُثبت پنہاں نظر آنے لگے۔ یہی وہ سُرمہ ہے۔ جس کے لگانے ہی آنکھ گرد و پیش جنّت ہی جنّت دیکھتی ہے۔ اور دلِ مرحوم داغِ شیریں بیان کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر گاتا ہے

کہ دُنیا بھی اک بہشت ہے ٭

ایک مغربی درویش

دو گھنٹے پروفیسر ویمبری کی صحبت میں

شہر بوڈاپشٹ اس وقت زوروں پر ہے۔ اہلِ ہنگری اس کی رونق بڑھانے میں دل وجان سے کوشش کر رہے ہیں۔ دریائے ڈینیوب کے دونوں کناروں پر دُور تک اس پایۂ تخت کی آبادی چلی گئی ہے۔ اس کے عجائب گھر۔ اس کے مدرسے اس کی مجالس ملکی سب دیکھنے کے لائق ہیں۔ اور لوگوں کو دُور دُور سے کھینچتی ہیں۔ مگر اس کی مشہور یونیورسٹی میں چند باکمال ایسے جمع ہو گئے ہیں۔ جن کا اس کی شہرت کے بڑھنے میں ایک معقول حصہ ہے۔ اُن میں السنۂ مشرقی کے نامور پروفیسر ویمبری اہلِ کمال کی صفِ اوّل میں ہیں۔ میں جب پچھلے دنوں ایک دوست کی معیت میں سفر کر رہا تھا۔ تو ہمیں پروفیسر موصوف کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع مل گیا۔ حُسنِ اتفاق سے ایک انگریز مہربان نے ایک رسمی رقعہ تقریبِ ملاقات کے لئے دے دیا تھا۔ وہ ہم نے پروفیسر صاحب کے پاس بھیج دیا۔ اُس سے ملنے میں آسانی ہو گئی۔ مگر ملاقات کے بعد جس قدر خلیق اُنہیں پایا۔ اس سے معلوم ہُوا۔ کہ کسی رقعے کے بغیر بھی اُن کا خلقِ عمیم ہمیں لطفِ صحبت سے محروم نہ رکھتا۔

پروفیسر ویمبری انگلستان میں اور دیگر ممالکِ یورپ میں مشرقی معاملات کے

متعلق عموماً اور اسلامی معاملات کے متعلق خصوصاً نہایت باخبر مانے جاتے ہیں۔ اور کوئی دفعہ ہمیں اُن سے رائے میں اختلاف ہُوا ہے۔ تاہم اس امر کا اعتراف کرنا فرض ہے۔ کہ بہ اعتبار مغربی نژاد ہونے کے اُن کے معلومات تعجب خیز ہیں۔ اور کیوں نہ ہو۔ برسوں اسلامی ممالک میں رہے ہیں۔ اور عام یورپین لوگوں کی طرح نہیں۔ کہ الگ تھلگ۔ بلکہ گھل مِل کر ایک مُسلمان طالب علم کے بھیس میں درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ استنبول میں پرورش پائی۔ اس لئے تُرکی سہولت سے بولتے ہیں۔ تاتاری مدارس میں برسوں رہے۔ اور وہاں عربی فارسی اور دینیاتِ اسلام کی تحصیل کی۔ چونکہ اس زمانے میں درویشی رنگ اختیار کیا تھا۔ اس لئے اب تک اپنے آپ کو درویش کہتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے۔ کہ اُن کی طبیعت میں وہ رنگ بھی سرایت کر گیا ہے۔ گو اب اُن کی بُود و باش پوری یورپین ہے۔ اور صحبت بھی زیادہ اپنے مغربی بھائیوں سے ہے۔ تاہم پُرانا رنگ اِتنا گاڑھا تھا۔ کہ مٹ نہیں سکا۔ اب تک برابر جھلک دکھا جاتا ہے۔

ستمبر ۱۹۰۰ء کی ستائیسویں تاریخ اور جمعرات کا دن تھا۔ کہ کوئی گیارہ بجے کے قریب ہم نے پروفیسر ویمبیری کے دروازہ پر دستک دی۔ ہم انگریزی کپڑے پہنے ہوئے تھے مگر سر پر ترکی ٹوپی تھی۔ ایک خادمہ نے دروازہ کھولا۔ لیکن ہماری ٹوپیوں سے کچھ متحیّر نہ ہوئی۔ جس سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ اُس گھر میں ایسے ملاقاتی پہلے بھی آتے رہے ہیں۔ ہمارے کارڈ اور تقریبِ ملاقات کا رقعہ اندر لے گئی۔ اس کے بعد بہت جلد ہمیں بُلانے آئی۔ اور ہُن کے کتب خانے کے کمرہ میں پہنچا کر چلی گئی۔ کمرہ وسیع اور روشن تھا۔ ایک معقول قالین کا فرش چند کرسیاں ایک آرام کرسی اور دریچے کے پاس کونے میں ایک میز بس کتابوں کی الماریوں اور تین چار تصویروں کے سوا یہی سامان اُس وسیع کمرہ کی زینت تھا۔

ایک مُسن بزرگ میز کے قریب بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی اُٹھے۔ اور

تپاک سے ملے۔ ہاتھ ملایا۔ مزاج پرسی کی۔ اور میز سے ذرا فاصلے پر جہاں تین چار کرسیاں رکھی تھیں۔ وہاں ہمیں بٹھایا۔ خود بھی لکھنا چھوڑ کر پاس آبیٹھے۔ ہم نے دیکھا۔ کہ کسی قدر لنگڑاتے ہیں۔ قد میانہ ہے۔ یا اُس سے بھی کچھ کم بدن متوسط ہے۔ نہ فربہ نہ لاغر بال سفید ہیں۔

بیٹھتے ہی اُنہوں نے انگریزی میں پوچھا۔ کہ فارسی بولتے ہو۔ مَیں نے کہا۔ ہاں کسی قدر۔ بس پھر کیا تھا۔ فارسی میں باتیں ہونے لگیں۔ فارسی نہایت عمدہ بولتے ہیں۔ اور بڑی خوبی یہ ہے۔ کہ تلفظ اور لہجہ میں وہ نقص نہیں۔ جو اکثر یورپین علمائے علوم مشرقی میں پایا جاتا ہے۔

شاید مناسب ہو۔ کہ مَیں اُس گفتگو کے بعض حصے قریب قریب اُن الفاظ میں لکھ دوں۔ جو اُس وقت استعمال کئے گئے۔ کیونکہ میرے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی سادہ کتاب تھی۔ جس پر مَیں گفتگو کے نوٹ لیتا جاتا تھا۔

پروفیسر ومبیری۔ از دیدن شما خوشحال شدم۔ چند روزے مے شود کہ در روزنامہا مے خواندم کہ در استنبول تشریف دارید مورد التفات شاہانہ شدہ اید۔

جواب:۔ بلے قریب دو ماہ آنجا ماندیم۔ چہ خوب جائے است و خلق عثمانی چہ قدر خوب است۔ الحمد للہ کہ از التفاتِ شاہانہ ہم ممنون شدیم۔

پروفیسر:۔ بندہ ہم عثمانی ہارا خیلے دوست دارم۔ سالہائے دراز در استنبول بودم وقتیکہ در خدمت سلطان بودم۔ مرا رشید آفندی مے خواندند۔

جواب:۔ بندہ ازیں حال آگاہ نبودم۔ بایدکہ چیزے دیگر از احوالِ خود بفرمائید۔ کہ خیلے دلپذیر است۔

پروفیسر:۔ بیشتر از احوالِ خود در یک کتاب انگریزی نوشتہ ام۔ کہ نامش حکایت

ہند و جہد من" است۔ در لور ندہ چاپ شدہ است۔

اس پر اٹھے اور ایک الماری سے وہ کتاب اٹھالائے۔ میں نے اس کے چند عنوان سرسری طور پر دیکھے۔ اور ارادہ کیا۔ کہ ضرور پڑھوں گا۔ کیونکہ نہایت عجیب تھی۔ اس کتاب کے پاس ایک کتاب اور رکھی تھی۔ اس کی تقطیع اور جلد وغیرہ ہندوستان کی کتابوں کو یاد دلاتی تھی۔ میں نے پوچھا۔ وہ کونسی کتاب ہے۔ بولے خوب یاد آئی۔ یہ کتاب تمہارے لاہور کی چھپی ہوئی ہے۔ میری اس کتاب کا اردو میں خلاصہ چھپا ہے۔ اسے منشی محبوب عالم صاحب ایڈیٹر پیسہ اخبار نے شائع کیا ہے۔ اور "سفر نامہ پروفیسر ویمبری" اس کا نام رکھا ہے۔ کیا تم انہیں جانتے ہو۔ میں نے کہا۔ کہ جانتا کیا یعنے وہ میرے بڑے دوست ہیں۔ اور لاہور میں ہمارا وقت فرصت بیشتر اکٹھے صرف ہوتا تھا۔ اس سے بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے انہیں بتا دینا۔ کہ میں ان کے ترجمے کو کس قدر عزیز رکھتا ہوں۔ میں نے کہا۔ کہ میں یہ پیغام ضرور ان تک پہنچا دوں گا۔ اور یقیناً وہ اس سے بہت خوش ہوں گے۔

اب چونکہ ہم کتابوں کے پاس کھڑے تھے۔ انہوں نے اپنی بعض اور تصانیف دکھانی شروع کیں۔ مگر ان میں جس کتاب کا نام ہندوستان کے مذاق کے اعتبار سے قابل ذکر ہے۔ وہ "دی کمنگ سٹرگل فور انڈیا" ہے۔ یعنے وہ جدوجہد جو اہل ہند کو پیش آنے والی ہے۔ اس سلسلے میں ہندوستان کے متعلق جو بات چیت ہوئی۔ وہ قابل ذکر ہے۔

میں بہ ہند ہیچ نہ رفتہ اید۔ سیلے مثل شما را لازم نبود۔ کہ از سیاحت ہند غافل باشد۔

پروفیسر۔ خیلے آرزو داشتم کہ بردم۔ یک بار یکے از روسائے ہند۔ نواب عبداللطیف صاحب از کلکتہ۔ اِدعوت کردہ بود۔ وقریب بود کہ بردم لیکن

موانع چند مرا ازاں عزم باز داشت ۔ حالا پیر شدہ ام ممکن نیست ۔

میں ۔ چنداں پیر گشتہ اید ۔ و اگر پیر ہم باشید ۔ چوں ہمت جواں دارید ۔ بعدِ مسافت مضائقہ ندارد ۔

پروفیسر ۔ بلے راست است لیکن یک مانع دیگر است ۔ و آں سیاسی است مے دانید از قدیم با قوم انگلیس دارم و کنگ اڈورڈ بالخصوص بر حالِ درویش التفات بسیار دارد ۔ مے بینید آں تصویر از دست و آں دیگر از ملکۂ انگلستان است ۔ کہ ہر دو بدستِ خطِ خود شاں مرا عنایت فرمودہ اند ۔ حالا اگر بہ ہند روم ۔ ازیں مے ترسم ۔ کہ اگر بعضے از احوال ناملائم کہ میشنوم بچشم خود بہ بینم ۔ و دلم برائے مردم ہند بسوزد ۔ چیزے بہ نویسم کہ ازاں مردم انگلستان از من ناخوش شوند ۔

میں ۔ نزد من ہمیں یک وجہ قوی است کہ رفتن شما بہ ہند لازم مے گرداند ۔ اگر مرد مے ہمچو شما از اندیشہائے ایں چنیں عزم کارے بہ گذارد ۔ کہ از فرائض انسانیت است باز از دیگراں چہ توقع ؟

پروفیسر ۔ خوب اقطعیاً نا ممکن نیست باشد ۔ کہ روز برم ۔ چند روزے مے شود ۔ کہ وزیر صیغۂ معارف جاپان مرا دعوت کردہ است ۔ کہ سفر جاپان بکنم و اگر آنجا روم ۔ باید کہ ہند را ہم زیارت کنم ۔

یہ کہہ کر میز کی طرف گئے ۔ اور ایک خط ڈھونڈھ لائے ۔ جو انگریزی میں لکھا ہوا تھا ۔ اور جس میں جاپانیوں کی طرف سے فاضل نویسندہ نے پروفیسر صاحب کا شکریہ ادا کیا تھا ۔ کہ وقتاً فوقتاً اُن کے قلم سے جاپانیوں کے موافق مضمون نکلتے رہے ۔ اور یہ لکھا تھا ۔ کہ فرمانروائے جاپان مکاڈو ۔ اُمید ہے ۔ کہ جلد آپ کو کوئی نشانِ عزت بھیجیں گے ۔ اور اگر آپ یہاں آئیں گے ۔ تو ہم سب آپ کے نہایت ممنون ہوں گے ۔

اس میں ہندوستان کی موجودہ حالت اور وہاں کی سیاسی تحریکوں کا ذکر آگیا ۔ اور پروفیسر

صاحب نے کہا کہ مجھے ان لوگوں سے جو آزادی کے طلبگار ہیں۔ دلی ہمدردی ہے۔ اور میں یقین واثق رکھتا ہوں کہ آخرکار ہندوستان میں ہندوستانیوں کو اپنا انتظام آپ کرنے کا حق مل جائے گا۔ مگر اس معاملے کی کامیابی خود ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہے۔ اگر وہ عقلمندی سے چلیں گے اور قبل از وقت شورشوں سے جن کی خبریں ان دنوں کبھی کبھی آتی ہیں۔ اپنا کام خراب نہ کرلیں گے۔ تو انجام اچھّا ہوگا۔ آپ میرا یہ پیغام اپنے اہلِ وطن کو پہنچا دیجئے۔ اور کہئے کہ اُن کے ایک غائبانہ ہمدرد کی یہ بے غرضانہ رائے ہے۔ اور اُس پر عمل کرنا نہ کرنا اُن کی مرضی پر منحصر ہے۔ مگر یہ واضح رہے۔ کہ مجھے قریب قریب سب یورپی ممالک کے خیالات کا اندازہ کرنے کا موقعہ ملتا رہتا ہے۔ اور اُس تجربے کی رُو سے میں جانتا ہوں کہ اگر خامی اور ناتجربہ کاری کے ساتھ اہلِ ہند کی طرف سے کوئی عام شورش موجودہ طرزِ حکومت کے خلاف کبھی ہوئی۔ تو یورپ بھر کی ہمدردی انگلستان سے ہوگی۔ اور وہ سب کسی نہ کسی طرح انگلستان کی موافقت کریں گے۔ لیکن اگر اہلِ ہندوستان متانت کے ساتھ برابر ترقی کرتے رہیں۔ اور رفتہ رفتہ یورپ تک اُن کی قابلیت اُن کی معاملہ فہمی اُن کی صناعی اور اُن کی ہوشیاری کی شہرت پہنچ جائے۔ اور اُس وقت اپنے حقوق کا دعویٰ کریں۔ تو یورپ کی ہمدردی اُن کی طرف ہوگی۔ غرض اس سارے جھگڑے کی بنیاد محنت استقلال اور صبر پر ہونی چاہئے نہ کہ جلد بازی اور بے صبری پر۔

مَیں نے اس پختہ کارانہ نصیحت کے لئے اُن کا شکریہ ادا کیا۔ اور وعدہ کیا۔ کہ مَیں اُسے اہلِ وطن تک پہنچا دوں گا۔ اس کے بعد پھر کچھ کتابوں کی طرف ہم متوجہ ہوئے۔ ایک کتاب جو اُنھوں نے مجھے آغازِ ملاقات ہی میں دکھائی تھی۔ لیکن جس کی ورق گردانی باتوں میں نہیں ہو سکی تھی۔ وہ کتاب بابر نامہ تھی۔ اس کی تصحیح میں بہت اہتمام کیا گیا تھا۔ اس کا اصل نسخہ سر سالار جنگ مرحوم کے کتب خانہ میں تھا۔ وہاں سے منگوا کر نقل لی گئی۔ ایک انگریزی لیڈی نے یہ ساری محنت کی۔ پروفیسر صاحب نے اس کا ذکر اس لئے کیا تھا۔ کہ یورپ

کے بعض علم دوست لوگ مشرقی کتابوں کی اشاعت اور نگہداشت کے متعلق وہ خدمت کر رہے ہیں۔ جو اصل میں اہلِ مشرق کا فرض ہے۔ اور جس سے وہ غافل ہیں۔ اس کا جواب سوائے اپنی غفلت کے اعتراف کے کیا ہو سکتا تھا۔

بابرنامہ کے سرورق پر ایک شعر لکھا تھا۔ جو مجھے بہت پسند آیا۔ میں نے پروفیسر صاحب سے اس کی تعریف کی۔ وہ بھی پُرانے سخن فہم ہیں۔ اُنھوں نے جوش سے داد دی شعر یہ ہے ؎

بعد از وفات تربتِ ما در زمین مجو
در سینہ ہائے مردمِ عارف مزارِ ماست

ایک اور بڑی دلچسپ کتاب جو اُن کے ہاں دیکھی۔ وہ امیر البحر سید علی رئیس کے سفرنامہ کا ترجمہ تھا۔ یہ ترکی امیر البحر ہمایوں بادشاہ کے زمانے میں ہندوستان گئے تھے۔ اور جب شاہ ہمایوں کا زینہ سے گر کر انتقال ہُوا۔ اُس وقت ہندوستان میں موجود تھے۔

اِن باتوں میں جن کا خلاصہ اُوپر لکھا گیا ہے۔ ایک گھنٹہ کے قریب گزر گیا۔ میں نے اجازت مانگی۔ اور رخصت ہونا چاہا۔ مگر پروفیسر صاحب نے نہایت اخلاق سے روک لیا۔ اور کہا ؎

"اگر عجلت نہ باشد قدرے بہ نشیند کہ
آدم ایں چنیں ہر روز نمے آید"

ہم پھر بیٹھ گئے۔ خادمہ قہوہ لائی۔ ہم نے قہوہ پیا۔ کہنے لگے۔ کہ تمہیں ایک وقت ہمارے ساتھ کھانا کھانا چاہیئے۔ ہم نے اظہارِ ممنونیت کیا۔ مگر کہا۔ کہ معذور ہیں۔ آج کے دن یہاں ہیں۔ شام کو وائنا کی طرف روانہ ہوں گے۔ اس پر اُنھوں نے بہت افسوس کیا۔ کہنے لگے۔

"اگر تا فردا ہم اینجا باشید۔ یک پلاؤ بدست خود برائے شما درست بکنم کہ در ایام

درویشی مشق پختن بہم رسانیدہ ام"۔

میں۔ "مرحمتِ عالی زیاد لیکن بندہ معذور ہستم۔ امروز راہِ وطن گرفتن لازم است۔ سفرِ ما از قرار یکہ داشتیم۔ طول گرفتہ۔ حالا در لوندرہ کار داریم۔ باید کہ زود آنجا برسیم۔ ایں صحبت کہ بدست رسید۔ ایں را مغتنم خواہیم دانست۔ وایں روز در روزنامۂ یادگار خواہد ماند"۔

پروفیسر:۔ "لیکن آرزو دارم کہ شمارا باز ببینم۔ وقت مراجعتِ ہند کدام راہ مے روید۔ اگر ازیں راہ بیائید۔ باید مرا از اوّل اطلاعے بدہید کہ منتظرِ شما باشم"۔

میں:۔ "بچشم اگر ازیں راہ بازگردم۔ دیدنِ جنابِ شما فریضہ است۔ واز اوّل خبر خواہم داد خیلے مے خواہم کہ وقتِ بازگشت ایں ہم جاہا را دوبارہ ببینم و بہ استنبول ہم یکبار دیگر بُروم۔ لیکن گمان نہ دارم کہ ممکن نشود۔ اغلب آنست۔ کہ وا بور بزودی راہِ وطن گیرم"۔

اس گفتگو کے بعد پھر متفرق باتیں شروع ہوئیں۔ ایک تصویر دیوار پر ہمارے سامنے لٹک رہی تھی جس نے میری توجہ کو کئی بار اپنی طرف کھینچا تھا۔ کسی عالم کی تصویر معلوم ہوتی تھی ایک سجادہ پر ایک صاحب اپنی عبا پہنے بیٹھے تھے۔ پانی کا ایک گلی برتن پاس رکھا تھا عمامہ کا شملہ آگے کو لٹک رہا تھا۔ میں پوچھنا چاہتا تھا۔ کہ یہ کون صاحب ہیں۔ اور ان سے آپ کی کیونکر اور کب دوستی ہوئی۔ کہ انہوں نے میری راز جوی کو تاڑ لیا۔ اور کہا

"ہمیں درویش است۔ وقتے کہ در تاتار بودم

دریں لباس بُودم ایں از ان زمان یادگار است"

لارڈ کرزن کی کتاب فارس کے متعلق وہاں پڑی تھی۔ اُسے جو میں نے اُٹھایا۔ تو اُس کے اندر لارڈ کرزن کا ایک خط لکھا تھا۔ جو انہوں نے اپنی کتاب پروفیسر صاحب کو نذر کرتے وقت لکھا تھا۔ اس کو دیکھ کر بولے۔

"یکے از شاگردانِ من حاکمِ ہند بودہ است"

معلوم ہُوا۔ کہ لارڈ کرزن نے چند سبق ان سے لئے تھے۔ اور ڈاکٹر سٹائین جو پہلے پنجاب میں رجسٹرار تھے۔ وہ بھی پروفیسر صاحب سے تلمذ رکھتے تھے۔ اور لارڈ کرزن کے عہد میں اُن کو جو عہدہ وسط ایشیا میں تحقیقات وغیرہ کا سرکار کی طرف سے ملا تھا۔ اس میں غالبًا پروفیسر صاحب کی سفارش کو بھی دخل تھا۔

لارڈ کرزن اور وسط ایشیا کے تذکرہ سے افغانستان کا اور افغانستان سے امیر عبدالرحمٰن کا ذکر آ گیا۔ کہنے لگے امیر مرحوم نے بھی ایک مرتبہ بُلایا تھا۔ مگر جانا نہ ہو سکا۔ اُن کی دانشمندی اور تدبّر کی بے حد تعریف کرتے رہے۔ اور اُن کا ایک قول سُنایا۔ جو خالی از لطف نہیں۔ کہنے لگے۔ کہ رُوس اور انگلستان کا مقابلہ کرتے ہوئے ایک دفعہ امیر مرحُوم نے کہا تھا۔

"در پشتِ انگریز چیزے نیست مگر آب و در پُشتِ رُوس زمین است"

حکومت روس سے پروفیسر صاحب کو دیرینہ مخالفت ہے۔ مگر مسلمانانِ رُوس کی ترقی سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ مسلمانانِ رُوس کے کئی اخبار اُن کی میز پر رکھے تھے۔ اور انہیں وہ اکثر پڑھتے رہتے ہیں۔ کہنے لگے۔ کہ تمہارے رُوسی بھائی بہت معقول ترقی کر رہے ہیں۔ انہوں نے مجھے بتایا۔ کہ حال میں چھبیس اخبار نئے روسی مسلمانوں کی طرف سے جاری ہوئے ہیں جن میں بعض بہت قابلیت اور معقول درجہ کی آزادی سے لکھے جاتے ہیں۔ ان میں وقت نام روزانہ اخبار جو اورن برگ سے نکلتا ہے۔ سب سے بہتر ہے۔ قرآن مخبری ایک اور روسی اخبار انہوں نے مجھے دکھایا۔ جو قزآن سے شائع ہوتا ہے۔ رُوس کا ذکر کرتے ہوئے اُنھوں نے بتایا۔ کہ سلطان المعظم سے وہ ربط اب نہیں رہا۔ جو پہلے تھا۔ اس میں ایک بڑی وجہ یہ تھی۔ کہ وہ پروفیسر صاحب کو کہتے تھے۔ کہ رُوس کے خلاف لکھنا چھوڑ دیں۔ کیونکہ اُن کے مصالحِ مُلکی کے خلاف تھا۔ اور یہ چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اور اس کے سوا مجوزہ عثمانی یونیورسٹی کے بارہ میں اختلاف ہو گیا تھا کیونکہ سلطان المعظم کی مرضی

تھی کہ سروست تاریخ فلسفہ مغربی کی تعلیم اس میں نہ ہو۔ اور انہوں نے عرض کیا کہ بغیر فلسفہ وتاریخ یونیورسٹی نے منظور "
تیغیر میں عیسائیوں کے مذہبی تعصب کا ذکر کرتے رہے۔ کہتے تھے کہ کئی بھلے آدمی انہیں انجیل اور دیگر
مذہبی کتابیں اس نظر سے بھیجتے رہتے ہیں کہ عیسوی مذہب کی طرف مائل ہو جائیں اور اسلام کی تعریف
جو وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں۔ اس سے رک جائیں۔ کہنے لگے وہ نہیں جانتے کہ میں کوئی مذہب نہیں رکھتا
میں بارہا انہیں بتا چکا ہوں۔ کہ میں فیلسوف ہوں۔ اور جس مذہب میں جو خوبی دیکھتا
ہوں۔ اُس کے اظہار سے نہیں رکتا۔ باقی خود قید ملت سے آزاد ہوں۔ اور اتنی مدت آزادی
کا مزا چکھنے کے بعد اب آخری عمر میں گرفتار نہیں ہوں گا۔" ایک آخری لطیفہ اُن کا نقل کئے
بغیر میں اپنے مکالمے کے اس مختصر خلاصے کو ختم نہیں کر سکتا۔ اُنہوں نے مجھے بتایا۔ کہ مذہب
عیسوی کے بعض پیروؤں کے جوش کی یہ حالت ہے۔ کہ ایک عیسائی بی بی نے خط لکھا۔ کہ
اگر تم بیاہے ہوئے نہیں ہو۔ تو میں تم سے بیاہ کرنے اور اپنی ساری دولت تمہیں دینے کو
تیار ہوں۔ بشرطیکہ تم عیسائی ہو جاؤ۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کہ اس آخری دام میں بھی یہ
آزادہ رو مغربی درویش نہیں پھنسا۔

میں نے لندن واپس آکر پروفیسر صاحب کو ایک خط لکھا۔ اور اُن سے اُن کی تصویر
مانگ بھیجی۔ جواب نہایت عنایت آمیز ملا۔ اور تصویر بھی ساتھ آئی۔ میں اپنے پاس تو اُسے
اُن کی نشانی سمجھ کر شوق سے رکھوں گا ہی۔ لیکن میں چاہتا ہوں۔ کہ اُس کی ایک نقل میرے
دوستوں کو بھی پہنچ جائے۔ اس لئے اس مضمون کے ساتھ اُن کی تصویر بھی شامل ہے۔

دِل ہی تو ہے!

(ترجمہ از فرانسیسی)

وکلائے شہر میں موسیو مارگے کی فصاحت کی دھوم تھی۔ پہلے یہ شخص وکالت کرتا تھا۔ لیکن بعد میں سرکار کی طرف سے ایڈووکیٹ جنرل مقرر ہو گیا۔ جب کبھی عدالت سشن میں کوئی بھاری مقدمہ پیش ہوتا تھا۔ تو ملزم کے خلاف تقریر اُسی کے سپرد ہوتی تھی۔ اُس کی گونجتی ہوئی آواز مشہور تھی۔ اور اُس کی تقریر کی گرمی اور جوش نہایت پُر تاثیر تھا۔ معززین مرحوم لبطور جیوری کے ملزم کی قسمت کا فیصلہ کرنے بیٹھتے تھے۔ ہمیشہ اس کی تقریر سے متاثر ہو جاتے تھے۔ لب کشا ہونے سے پیشتر وہ ایک اثر حاضرین پر ڈال لیتا تھا۔ اُس کی صورت گویا اُس وقت مجسم انتقام ہوتی تھی۔ جس کا فرض تھا۔ کہ ملک کو جرم سے پاک کر دے۔ قانون تعزیرات کے عملدرآمد کرنے والے وزیرِ دولت کا جامہ اُسے خوب زیب دیتا تھا۔ اُس کا عدالت کے کمرے میں آکر اپنی کرسی پر بیٹھنا ملزم کے حواس باختہ کر دیتا تھا۔ خود دوسرے وکلا اُس کی لیاقت کے قائل تھے۔ اور سمجھتے تھے۔ کہ موسیو مارگے کو خدا نے اُس فصاحت کا جو فنِ وکالت کے لئے درکار ہے۔ خاص حصہ دیا ہے۔

موسیو مارگے اپنی تمام ہمت اس خدمت میں صرف کرتا تھا۔ اور اپنی قوت کا استعمال اس سختی کے ساتھ کرتا تھا۔ کہ گویا اُس کو نرم دلی اور رحم سے کچھ واسطہ ہی نہیں ضابطہ فوجداری ہاتھ میں لئے وہ ہر ملزم کے متعلق حکم مناسب لگا دیتا تھا۔ اور رحمدلی

اس حد تک بڑھی ہوئی تھی۔ کہ کسی نے کبھی اُس کو ہنستے نہیں دیکھا تھا۔ اُس کی روزمرہ زندگی ہر قسم کی تفریح سے خالی تھی۔ اور سب خوشیاں چھوڑ کر وہ کام میں محو تھا۔ لوگ اُس کی عزت کرتے تھے۔ لوگ اُس سے ڈرتے تھے۔ اور یہ جانتے تھے۔ کہ جس بات پر اَڑ جائے کبھی اُس سے ٹلنے والا نہیں۔ مگر حقیقت یہ تھی۔ کہ وسیومارگے کو ایک ایسی مصیبت کا سامنا ہو چکا تھا۔ جس کا صدمہ اُسے اندر ہی اندر کھائے جاتا تھا۔ اور اس لئے وہ چاہتا تھا۔ کہ سخت محنت سے اپنے غمِ جانکاہ کو کسی قدر گھٹا دے۔ ابتدائے عمر میں اس کی شادی ایک جوان شریف عورت سے ہوئی تھی۔ جس پر وہ دل سے فدا تھا۔ خدا نے اس بیاہ سے ایک لڑکا دیا۔ جو ماں باپ دونوں کی آنکھ کا تارا تھا۔ اُن کی جوانی کی خوشی اور اُن کے بڑھاپے کی اُمید مگر شامتِ اعمال سے لڑکا بگڑ گیا۔ اور اُس مایوسی نے باپ کا یہ حال کر دیا۔ شاید باپ کی طبیعت کی قدرتی سختی بھی کسی حد تک لڑکے کی خرابی کا باعث ہوئی ہو۔ کبھی کبھی یہ سوال مارگے کے دل میں کھٹکتا تھا۔ مگر پھر اُسے یہ خیال آتا تھا۔ کہ ماں کی طبیعت کی کمزوری لڑکے کے چلن کے بگڑنے کا باعث ہوئی ہو گی۔ لیکن ایسے واقعات کے صحیح اسباب کون بتا سکتا ہے۔ اور ذمہ داری کا ٹھیک حصہ دریافت ہونے کا کون سا ذریعہ ہے؛

موسیو مارگے نے لڑکے کی نافرمانی سے تنگ آ کر اُس کی اصلاح کی یہ تدبیر سوچی تھی۔ کہ جہاز پر اُسے معمولی ملاحوں میں نوکر کرا دیا جائے۔ تاکہ جہاز کی زندگی کی سختیاں اُس کی سرکشی کا علاج بنیں۔ اور جو طبیعت گھر میں ہر طرح کی کوشش سے راہِ راست پر نہیں آ سکی۔ وہ جہاز والوں کے احکام کی پابندی سے مائل بہ اطاعت ہو جائے۔ اُس نے جب لڑکے کو اپنا یہ فیصلہ سنایا۔ اور کہا کہ "تمہیں جانا پڑے گا" تو لڑکا ناچار بادلِ ناخواستہ گھر سے نکل پڑا۔ مگر سخت اندوہگین تھا۔ اور غم و غصّہ سے جل رہا تھا۔ ماں کی ماتا مشہور ہے۔ لڑکے کو رخصت کرتے وقت زار زار رونے لگی۔ مگر لڑکے کا دل اس بدسلوکی سے

پتھر ہو گیا تھا۔ اس نے نہ ماں کے آنسوؤں کی پروا کی۔ اور نہ ان نصائح کی۔ جو باپ نے وقتِ رخصت ضروری سمجھیں۔ دل ہی دل میں کچھ ارادہ کیا۔ اور چل دیا۔ جہاز کی سختی اس سے جھیلی جاتی۔ پہلے ہی مقام پر جہاں جہاز کنارے لگا۔ اُتر کر سیر کو گیا۔ اور پھر واپس نہ آیا۔ اُس دن سے برابر مفقود الخبر تھا۔ چھ سال گزر گئے۔ اور باپ کو معلوم تک نہ تھا۔ کہ مر گیا یا جیتا ہے۔

اوّل اوّل ماں باپ دونوں بیٹھے اپنی اس بد قسمتی پر افسوس کیا کرتے تھے کبھی بیٹے کو کسی مصیبت میں مبتلا تصوّر کرتے تھے کبھی ڈرتے تھے۔ کہ کسی قید خانے میں ہوگا۔ کبھی کہتے تھے کہ کاش یقیناً معلوم ہو جاتا کہ مر ہی گیا ہے۔ چار آنسو تو بہا لیتے۔ اس کشمکش اور قلبی تکلیف نے آخر ماں کی جان لی۔ ماں کو دمِ واپسیں تک بیٹے کی یاد تھی۔ خاوند کو جو آخری وصیّت کی یہ تھی۔

"اُسے معاف کر دو!"

لڑکا پہلے جا چکا تھا۔ بیوی یوں رُخصت ہوئی۔ اور بیچارہ موسیو مارگے ہمیشہ کے لئے اُن کا ماتم کرنے کو رہ گیا۔ اس حالت میں کام میں دل لگانا اور سخت محنت کرنا ہی اُس کے درد کا درماں تھا۔ اور اس لئے وہ کام میں اس قدر مصروف رہتا تھا۔

آج بھی حسبِ معمول موسیو مارگے کاغذات کا پلندا بغل میں دبائے کچہری کو گیا۔ دل میں مضمونِ تقریر سوچتا جاتا تھا۔ کہ قتل کے اُس مقدمہ میں جو عدالت کے سامنے پیش ہونے کو ہے۔ اور جس کا شہر بھر میں بہت چرچا تھا۔ یہ باتیں کہنی چاہئیں۔ اس مقدمے کی شہرت کا زیادہ تر باعث یہ ہوا۔ کہ قاتل نے عدالت میں اپنے نام بتانے اور ارادۂ جرم کی وجہ بیان کرنے سے قطعی انکار کیا۔ سیشن کے کمرے میں لوگ صبح سے مقدمہ سُننے کے لئے جمع تھے۔ اتنے میں چوکیدار نے اعلان کیا۔ "عدالت بیٹھتی ہے" اور افسرانِ سیشن سُرخ

چوغے پہنے کمرے میں داخل ہوئے۔ موسیو مارگے اُن کے پیچھے پیچھے تھا۔ وہ آتے ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور بغیر اِدھر اُدھر دیکھنے کے حسب عادت اپنے کاغذات میں معروف ہوگیا۔ تاکہ فردِ قرار دادِ جرم کی تیاری میں اگر کچھ کمی رہ گئی ہو۔ تو پوری ہوجائے۔ اور سرکار کی طرف سے مقدمہ اور مضبوط ہوجائے۔ اتنے میں ملزم بھی داخل ہوا۔ ایک جوان خوش پوشں آدمی۔ عین بہار شباب میں جس کی ظاہری حالت معمولی مجرموں سے بالکل علیحدہ تھی۔

صدر عدالت نے سوال کیا "تمہارا نام کیا ہے؟"

ملزم "مَیں پیشتر بھی اس سوال کا جواب دینے سے انکار کرچکا ہوں۔ میرا سر آپ کی عدالت کے حکم کی تعمیل کے لئے حاضر ہے۔ لیکن یہ میرا عزم مصمم ہے۔ کہ مَیں اپنا راز فاش کئے بغیر مروں گا۔ میرا نام ہرگز کسی کو معلوم نہ ہوگا"

اس آواز سے موسیو مارگے کانپ اُٹھا۔ کیونکہ اُس کے کان اُس آواز سے آشنا تھے اُس نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا۔ تو اُسے معلوم ہوا۔ کہ بدقسمت ملزم اُس کا گم شدہ لڑکا ہے۔

اُدھر ملزم نے بھی اپنے باپ کو پہچان لیا۔ اور اُس کا دل بھی بے اختیار پگھلا بچپن کے آرام کے دن اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ ماں باپ کی اُن دنوں کی ناز برداریاں یاد آئیں۔ اور ماضی و حال کا یہ تضاد اس قدر گراں گزرا۔ کہ اُسے غش آگیا۔

نوجوان کو اُٹھا کر باہر لے گئے۔ اور مقدمہ ملتوی ہوگیا۔ لوگ بھی اس غیر متوقع حادثہ سے متاثر ہوکر گھروں کو چل دئے۔ اور سوچتے جاتے تھے۔ کہ دیکھیں اس عجیب مقدمے کا انجام کیا ہوتا ہے۔

ایڈوکیٹ جنرل اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ تو اُس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ اور اس سے چلا نہیں جاتا تھا۔

کمرہ کا دروازہ اندر سے بند کیا۔ اور اپنے سر کو اپنے دونوں ہاتھوں سے دبا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ دل سے پوچھنے لگا۔ کہ کیا کیا جائے۔ مدعی بن کر بیٹے کا جرم خود ثابت کرنا اور اس کی جان لینا تو اُسے صاف ناممکن نظر آیا۔ البتہ یہ خیال آیا۔ کہ چپکے سے کوئی عذر کرکے کسی کو یہ راز جتائے بغیر یہ مقدمہ کسی اور وکیل کے سپرد کر دے۔ مگر مہر پدری نے گوشۂ دل سے آواز دی کہ بیٹا اگر بچ سکے تو کسی طرح سے اسے بچانا چاہئے۔ اس کی تائید میں اس مرنے والی کی آخری وصیت یاد آئی۔ کہ "اُسے معاف کردو" ان الفاظ کا یاد آنا تھا۔ کہ اسے اور سب کچھ بھول گیا۔ نہ یہ خیال رہا۔ کہ لڑکے کے کیا کیا قصور تھے۔ نہ یہ کہ اب وہ کسی جرم کا ملزم ہے۔ اتنا ہی یاد رہ گیا۔ کہ "میں باپ ہوں وہ بیٹا ہے" اور وہ ایڈوکیٹ جنرل جو سنگ دل مشہور تھا۔ زار زار رونے لگا۔ اور طبیعت ذرا سنبھلی تو اُٹھا اور اُس نے بے پس و پیش نوکری سے استعفیٰ لکھ کر عدالت میں بھیج دیا۔ اب کیا تھا۔ آزاد ہے۔ اور اپنی مرضی کا مالک اس نے معمولی وکیل کا لباس زیب تن کیا۔ اور یہ لفظ کہے :۔

اے میری پیاری بیوی۔ اے مرنے والی جس کی یاد میں میں آج تک ماتمی ہوں۔ لے میں تیرے حکم کی تعمیل کرتا ہوں۔ میں نے اُسے معاف کیا۔ اور میں اُس کی طرف سے وکالت کرنے کے لئے عدالت کے رُوبرو جاتا ہوں ؞

میر انیس

مغربی نقّادوں میں عموماً رسم ہے۔ کہ کسی شخص کے کلام کا موازنہ کرنے سے پہلے اُس کی سوانحعمری پر ایک سرسری نظر ڈال لیتے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں کے تذکرہ نویس بالعموم شعرا کے حالاتِ زندگی سے بالکل قطع نظر کرتے رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ کسی شاعر کا تذکرہ پڑھنے کے بعد اُس کی شخصیت کی نسبت سوائے نام اور ولدیت اور چند متفرق واقعات کے اور کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ ایسا کرنا اگر مختصر نویسی منظور ہو۔ تو خالی از فائدہ بھی نہیں۔ کیونکہ دُنیا کو مشاہیر کے نام کی نسبت اُن کے کام سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ اور اسی اصُول کو مدِّنظر رکھ کر اس مختصر نوٹ میں ہم زیادہ تر میر انیس کے کلام سے واسطہ رکھیں گے۔

اُن کی ذات و خاندان کی بابت صرف اس قدر کہ دینا کافی ہے۔ کہ اُن کا اسم گرامی میر ببر علی تھا۔ اور میر حسن جن کی مثنوی سحر البیان اپنی سلاستِ زبان کی وجہ سے آج تک مقبولِ ہر خاص و عام ہے۔ اُن کے جدِّ امجد تھے۔ اس طرح پر میر انیس کو شاعری گویا ورثے میں ملی تھی۔ اور اُن کا خاندان شاید اُردو ادب کی تاریخ میں اس حیثیت سے بالکل یکتا ہے۔ کہ اس کے حصّے میں پانچ پُشت تک شاعری کی دولت رہی ہے۔ جیسا کہ ناظرین پر واضح ہو گیا ہو گا۔ میر انیس کا خاندان شاہجہان آباد کی خاکِ پاک سے نسبت رکھتا تھا۔ لیکن نامساعدتِ زمانہ نے میر حسن کو مجبُور کیا۔ کہ لکھنؤ میں بود و باش اختیار کریں۔ میر انیس کی پیدائش و پرورش اُسی مردم خیز شہر میں ہوئی۔ اور یہ کہنا بے جا نہیں۔ کہ لکھنؤ نے میر انیس کو مرثیہ گو بنا دیا۔

مرثیہ گوئی کا رواج تو ایرانیوں کی تقلید کی وجہ سے اُردو شاعری کی ابتدائی حالت ہی میں شروع ہو گیا تھا ۔ چنانچہ سودا کے کلیات میں بھی چند مراثی پائے جاتے ہیں ۔ جو چنداں اعلےٰ پائے کے نہیں ۔ اور اس شاعر کے کلام کا شاید سب سے قابل قدر حصہ ہیں۔ لیکن انیسؔ و دبیرؔ کے زمانے تک مرثیہ گوئی شاعری کی نہایت ضعیف صنف تصور کی جاتی تھی ۔ اور مرثیہ گو کو بالعموم دیگر شعرا طنزاً بگڑے شاعر کے لقب سے یاد کرتے تھے ۔ انیسؔ و دبیرؔ کی خداداد ذہانت نے مرثیہ گوئی کو اُس معراج کمال پر پہنچا دیا جس پر کہ آج ہم اُسے پاتے ہیں ۔ اور مرثیے کی زمین کو اس قدر رفعت دی ۔ کہ ہمسرِ آسمان بنا دیا ۔

ہمارا خیال ہے ۔ کہ خود مرثیہ میں یہ صلاحیت موجود تھی ۔ کہ کسی صاحب کمال کے ہاتھوں سے فروغ پا جاسکے ۔ شاعری کے لئے اثر کا ہونا ضروری ہے ۔ اور ہماری شاعری کے جملہ اصناف میں کوئی صنف اس قدر مؤثر نہیں ۔ جیسا کہ مرثیہ ۔ کیونکہ اثر کے لئے صداقت لازمی ہے ۔ اور مرثیہ ہی ایک ایسی شے ہے ۔ کہ جس میں شاعر جو کچھ قلم سے لکھتا ہے ۔ اُسے دل سے اپنا دین و ایمان سمجھتا ہے ۔ پھر ممکن نہیں ۔ کہ اثر پیدا نہ ہو ۔ علاوہ بریں مرثیے کو اُردو شاعری کی دیگر شاخوں پر ایک اَور بھی فوقیت حاصل ہے ۔ وہ یہ کہ اس کا مقصد نہایت اعلےٰ و ارفع ہے ۔ اس کا منشا ان جذبات کو اُبھارنا ہے ۔ جو انسان کی ارفع یعنی رُوحانی خصلت سے تعلق رکھتے ہیں ۔ برخلاف اس کے غزل گوئی جس پر ہمارے اکثر شعرا کی توجہ مبذول رہی ہے ۔ اور جس پر اوائل عمر میں خود انیسؔ نے کافی قدرت حاصل کر لی تھی بالعموم طبع انسانی کی نسبتاً ادنیٰ خواہشات و جذبات کو اُکساتی ہے ۔

مندرجہ بالا سطور سے واضح ہو گیا ہو گا ۔ کہ انیسؔ کا پایۂ شاعری کس قدر بلند ہونا چاہئے مزید برآں اُن کی زبان کی صفائی ۔ خیالات کی نفاست و نزاکت ان کو اور بھی کامیاب بناتی ہے لکھنؤ کی صحبتوں نے انیسؔ کو بلاغت سکھائی ۔ لیکن ناسخ کی طرح بلاغت کے ساتھ اُس فصاحت کو ہاتھ سے نہیں دیا ۔ جو دہلی کے ساتھ دُور کی نسبت ہونے کی وجہ سے انہیں حاصل

تھی۔ لکھنؤ میں رہ کر عمر بھر دہلی کا روزمرہ استعمال کرتے رہے۔ اور جب کبھی کسی غیر مانوس ترکیب و محاورے کو استعمال کرتے تھے۔ تو فوراً بلا تامل کہہ دیتے تھے۔ کہ اہل لکھنؤ اسے پسند کریں یا نہ کریں۔ مگر احقر کے شہر اور گھرانے میں اسی طرح بولتے ہیں[1]۔ امر واقعی یہ ہے کہ انہوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے یہ بات محسوس کرلی تھی۔ کہ لکھنؤ کی زبان جو تکلفات و تصنع سے پُر ہے۔ کبھی دہلی کی سادہ[2] و شیریں زبان کے برابر مؤثر نہیں ہوسکتی۔

انیس کی شاعری میں علاوہ صداقت و اثر کے شاعری کے دیگر لوازمات تمام و کمال پائے جاتے ہیں۔ تشبیہ و استعارے کے وہ بادشاہ ہیں۔ اور کبھی تشبیہ کے معاملے میں اپنے طبقے کے دیگر شعراء کی تقلید میں صحتِ مذاق کا خون نہیں کرتے۔ بلکہ غیر معمولی نازک خیالی و حسنِ بیان کا ثبوت دیتے ہیں۔ کسی خوبصورت نوجوان کے رُخ پر سبزۂ آغاز ہوتے دیکھ کر اس سے بہتر کیا تشبیہ سوجھ سکتی ہے۔ کہ ع

دیکھو نئی بہار کہ سبزہ ہے پھول پر

یا اس سے بہتر کیا مطالعہ فطرت کا ثبوت ہوگا۔ کہ خزاں کے موسم میں درختوں کے پتوں کی کیفیت ان الفاظ میں بیان کی جائے ع

پتے برنگِ چہرۂ مدقوق زرد تھے۔

غرضیکہ اس قسم کی نازک خیالی کی مثالیں انیس کے کلام میں سے سینکڑوں کیا بلکہ ہزاروں دی جاسکتی ہیں۔ نازک خیالی اُن کا خاص جوہر تھا۔ ورنہ انصاف کی بات یہ ہے کہ زور و شکوہِ الفاظ میں ان کے ہمعصر مرزا دبیر بازی لے گئے ہیں۔ مگر کہاں بلبل کا نغمہ اور کہاں شیر کی گرج۔ دونوں چیزیں اپنی اپنی جگہ لاجواب ہیں۔ لیکن شاعری کے لئے تو کچھ اول الذکر

[1] ملاحظہ ہو۔ آب حیات [illegible] حسین آزاد ۱۲

[2] شمس العلماء مولوی سید علی صاحب بلگرامی جیسے اہل الرائے نے باوجود دلی سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھنے کے اس شہر کی زبان کو صفائی و شیرینی کے لحاظ سے لکھنؤ کی زبان سے بہتر قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو دیباچہ تمدن عرب

ہی زیادہ موزوں ہوتی ہے۔

انیس کی غزل گوئی کی طرف ہم بیشتر اشارہ کر چکے ہیں۔ صرف اس قدر اور کہہ دینا کافی ہے۔ کہ انیس کی جو غزلیات ہم تک پہنچی ہیں۔ وہ نہایت قابل قدر ہیں۔ لیکن ہم انیس کو بہت اعلیٰ پایۂ کا غزل گو ماننے پر تیار نہیں۔ اس وقت لکھنؤ میں غزل گوئی کا مرض عام تھا۔ اور ہر ایک موزوں طبیعت ورنگین مزاج نوجوان اس میدان میں طبع آزمائی کیا کرتا تھا۔ شاعروں کی قدردانی و داد اس شوق کو اور بھی بڑھا دیتی تھی۔ اور بڑھتی ہوئی مشق کا یہ نتیجہ ہوتا تھا۔ کہ ہر ایک شاعر و متشاعر کے کلام میں کوئی نہ کوئی خوبی ضرور پیدا ہو جاتی تھی۔ انیس کی غزلیات بھی خوبی سے خالی نہیں۔ لیکن بحیثیت غزل گوئی کے وہ دوسرے اساتذہ کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ نہیں کر سکتے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے۔ کہ اگر وہ غزل گوئی کی طرف توجہ کرتے۔ تو شعرا سے اس میدان میں بھی گوئے سبقت لے جاتے۔ بدقسمتی سے اب اس خیال کی تصدیق ہونی محال ہے۔ تاہم ہم اتنا کہنے سے باز نہیں رہ سکتے۔ کہ ہر ایک شخص ایک خاص کام کے لئے موضع کیا جاتا ہے۔ انیس کا کام فطرتاً مرثیہ کو فروغ دینا تھا۔ اور اس کام کو انہوں نے نہایت خوش اسلوبی سے پورا کیا ؞

خدمتِ قوم کے طریقے

خدمتِ قوم کے مختلف طریقے ہیں۔ اُن میں بعض مشکل ہیں بعض آسان۔ کچھ دیر طلب ہیں۔ کچھ زُود اثر۔ کچھ بے ثمر۔ بعض طریقے ایسے ہیں۔ جن میں شور و غل بہت ہے۔ اور اصلی فائدہ کم۔ بعض میں شور و غل کم ہے۔ اور ان کے نتائج بہت مفید ہیں۔ ہندوستان میں اوّل تو ابھی بہت تھوڑے لوگ ایسے ہیں۔ جو یہ شوق رکھتے ہیں۔ کہ خادمانِ قوم میں اُن کا شمار ہو۔ اور جو ہیں۔ اُن میں بیشتر ایسے ہیں۔ جو لہو لگا کے شہیدوں میں ملنا چاہتے ہیں۔ اور جن کی یہ خواہش ہے۔ کہ محنت تو پڑے کم اور مشکلات سے جہاں تک ہو سکے بچے رہیں۔ انتظار کی تکلیف نہ اُٹھانی پڑے۔ لیکن یہ چرچا ہو جائے۔ کہ ہم مُلک و قوم کے خیر خواہ ہیں کسی مُلک میں خدمتِ قومی کا شوق کم ہونا یا سچے خادمانِ قوم کی تعداد محدود ہونا قابلِ افسوس تو ہے۔ مگر خطرناک نہیں۔ کیونکہ قوم کی ترقی کے ساتھ ساتھ مفید افرادِ قوم کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ اور جو کمی قومی خدمت کے شوق کی پہلے محسوس ہوتی تھی۔ اس کی تلافی ہوتی جاتی ہے لیکن خادمانِ قوم میں ایسی پست ہمت جماعت کا پیدا ہو جانا جو کام کئے بغیر ہی دوری مانگے۔ اور اصلی خدمت کے بغیر صلہ کی طلبگار ہو۔ قوم کے مستقبل کے لئے ایک خطرۂ عظیم ہے۔ کیونکہ یہ ایک ایسا میلان ہے۔ جو قومی ہستی کو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھا جاتا ہے۔ اور قوم کے مجموعی کیریکٹر کو ناقص بنا کر اُسے روز بروز پستی کی طرف لے جاتا ہے۔

ہمارے مُلک میں قومی خدمت کا خیال ایک جدید خیال ہے اور اس کو عمل میں لانے کی جو صورتیں مروّج ہیں اُن میں سے اکثر مغربی دنیا کے نمونہ پر مبنی ہیں۔ جو چیزیں انگریزی حکومت کے ساتھ ساتھ اس مُلک میں آئی ہیں

اور جنہیں انگریزی راج کی برکتوں میں شمار کرنا چاہیئے - اُن میں خدمتِ قومی کا وہ طریق ہے
جسے سوسائٹی یا انجمن قائم کرنا کہتے ہیں - یعنی کوئی کام جو ایک فردِ واحد سے نہ ہو سکے -
اس کے اہتمام کے لئے چند افراد جو اس کے مفید ہونے کے معترف ہوں - اور ہم خیال
ہونے کے سبب مل کر کام کر سکیں - جمع ہو جائیں - اور جماعت کی برکت سے وہ کام
سرانجام ہو - اس نہایت کار آمد طرزِ عمل سے انگلستان کی حالت پر بے حد مفید اثر پڑا
ہے - اور اس کی آدھی ترقی اس اجتماعی قوت سے کام لینے کی بدولت ہے - ہمارے انگریز
دوستوں نے تو اس دلچسپی کی وجہ سے جو وہ ہمارے معاملات سے رکھتے ہیں - یہ مفید اور
مجرب نسخہ ہمیں بتا دیا - لیکن آفرین ہے ہم پر - کہ اس کا ایسا غلط استعمال شروع کیا - کہ اُس کے
فائدے نقصان سے مبدل ہونے جاتے ہیں "انجمن سازی" بجائے قومی قوت کے قومی ضعف
بنتی ہے - اور اگر انجمنیں اسی طرح بنتی اور بگڑتی رہیں - اور محبت اور اتفاق کی جگہ عداوت اور
نفاق کا سامان ہوتی گئیں - تو یہ یاد رکھنا چاہیئے - کہ جو نسخہ قوم کے ضعیف جسم میں قوت
بھرنے کے لئے استعمال کیا گیا تھا - ایک دن وہی اُس کی ہلاکت کا باعث ہوگا -

ہم بہت سے امور میں انگلستان کی تقلید کر رہے ہیں چنانچہ ہماری انجمنوں اور
سوسائیٹیوں کے قواعد انگریزی سوسائٹیوں کے نمونہ پر ڈھالے جاتے ہیں لیکن جو خیال
وہاں تحریک عمل کرتا ہے - اس خیال کا وجود ہماری سوسائٹیوں کے بانیوں میں کم پایا
جاتا ہے - انگلستان میں ایک شخص جب اس خیال سے اُٹھتا ہے - کہ اپنی قوم کو نفع پہنچائے
تو سب سے پہلے وُہ اپنے گرد و پیش نظر دوڑاتا ہے - کہ کون کون سے کام ہیں - جو
اچھی طرح ہو رہے ہیں - اور کونسا کام ہے جس کی طرف ابھی کسی نے توجہ نہیں کی - وہ دیکھتا
ہے - کہ بہت سے کام خوش اسلوبی سے ہو رہے ہیں - مگر بہت سے ابھی ہونے باقی ہیں -
اُن میں سے وُہ کوئی ایسی چیز اختیار کرتا ہے - جس سے اُس کی طبیعت کو خاص مناسبت
ہو - اور جس میں وُہ اپنی عمر بھر صرف کر دے - تو اُس کا جی نہ اُکتائے - اِس انتخاب کے بعد

وُہ اپنے ہم خیال دوستوں سے مدد مانگتا ہے۔ اور ایک چھوٹی سی جماعت قایم ہو جاتی ہے جو چُپکے چُپکے کام شروع کر دیتی ہے۔ اور جب تک وُہ ایک درجہ کامیابی کا حاصل نہیں کر لیتی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ پھر یہ نوبت آتی ہے۔ کہ اِس خیال کو عام کیا جائے! ور پبلک سے مدد چاہی جائے۔ اخبار والے اور دیگر اہل الرائے جن کے ہاتھ میں جمہور کی باگ ہوتی ہے۔ یہ دیکھ کر کہ کام صحیح اُصول پر شروع ہُوا ہے۔ اور اس کا ذمہ لینے والوں نے کچھ کر بھی دکھایا ہے۔ خوشی سے اِس سوسائٹی کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اور وہاں کی فیاض خوش حال اور روشن خیال پبلک امداد پر جُھک پڑتی ہے۔ اور سوسائٹی کو مالی اور اخلاقی مدد دے کر بڑے پیمانے پر مُفید اور کامیاب بنا دیتی ہے۔ برعکس اِس کے ہندوستان میں "انجمن سازی" ایک خبط کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے۔ جیسے دیکھو انجمن سازی کو بجائے قوم کے اُبھارنے کے اپنے اُبھرنے کا زینہ بنانے کی طرف مائل ہے۔ قوتِ فکر و تخیل میں کچھ ایسا ضعف آیا ہے۔ کہ کوئی نیا کام تجویز کرنے کی بجائے ہر شخص کا یہ میلان ہے۔ کہ وہی چیز اختیار کرے۔ جو پہلے سے موجود ہو۔ فرض کیجیئے۔ کسی ہمدردِ قوم نے کہیں ایک مقامی مدرسہ کھول رکھا ہے۔ تو جو دوسرا دعویدار ہمدردئ قوم کا وہاں پیدا ہوگا۔ نوّے فیصدی یہ امکان ہے۔ کہ وُہ بھی مدرسہ ہی جاری کرنا چاہے گا۔ اور دونوں مدرسوں اور دونوں بانیوں میں رقابت اور جدال کی بنیاد ڈالیگا۔ اگر کسی قدر دُور اندیش ہُوا۔ اور نئے مدرسہ کے قایم کرنے کی مشکلات اور صعوبتیں اُس کے ذہن میں آگئیں۔ تو وُہ پہلے مدرسہ کی کمیٹی میں شامل ہو جائیگا۔ مگر وہاں دونوں میں "دو بادشاہ در اقلیمے نہ گنجند" کی کیفیت پیدا ہوگی۔ اور عہدۂ سیکرٹری یا عہدۂ پریذیڈنٹ معاملہ متنازعہ فیہ بن جائے گا۔ کمیٹی ایک اکھاڑا ہوگی جس میں آدھے اہل شہر ایک طرف اور آدھے اہل شہر دوسری طرف مدتوں لڑا جھگڑا کریں گے۔ ہماری چھوٹی بڑی انجمنوں اور سوسائٹیوں میں یہ موادِ فاسد موجود ہے۔ اور ابھی وُہ قایم نہیں ہونے پاتیں۔ کہ یہ فسادات شروع ہو جاتے ہیں۔

ایک زمانہ میں ہم لوگوں کو یہ شکایت ہوتی تھی۔ کہ ہمارے حکّام وقت صرف اسی اعزاز کے قدر دان ہیں۔ جو وہ خود ملک کے ممتاز اشخاص کو بخشیں۔ اور اُن عزتوں کی قدر نہیں کرتے جو خاندان ملک اپنی قوم سے خدمات قومی کے صلہ میں حاصل کرتے ہیں۔ اب کچھ عرصہ سے حکّام نے اپنی روش کو ذرا بدلا ہے۔ اور وہ بھی اُن اصحاب کی طرف قدرے متوجہ ہوئے ہیں۔ جو خدمتِ قومی میں نام پیدا کر چکے ہیں۔ اِس سے اُمید تھی۔ کہ سچے خدمت گزار لوگوں کی ہمت بڑھے گی۔ اور اُنہیں نظر آئے گا۔ کہ اُن کے لئے قوم کی شکر گزاری یا اپنے خالق کی خوشنودی کے علاوہ دنیاوی اعزاز اور وجاہت کا صلہ بھی موجود ہے۔ مگر ہماری خوبیٔ قسمت۔ یہ تدبیر بھی اُلٹی ہی پڑتی نظر آتی ہے۔ حکّام کی توجہ ہوتے ہی۔ رقابتوں کی آفت اور ترقی کر گئی۔ بہت سے ایسے اشخاص جو بڑی پُری قومی خدمت کی طرف بھولے سے بھی رُخ نہیں کرتے تھے۔ اور اپنا شوقِ جاہ طلبی حکّام کی دلجوئی تک ہی محدود رکھتے تھے۔ حکّام کی نِگاہ اس طرف پھرتی دیکھ کر زور شور کے ساتھ خدمتِ قومی کے میدان میں کود پڑے ہیں۔ اور اپنی تمام عادات جو پہلے جاہ طلبی میں استعمال کی جاتی تھیں۔ اپنے ساتھ لائے ہیں۔ اب قومی مجالس میں یہ کوئی غیر معمولی نظارہ نہیں۔ کہ ایک دوسرے کو دھکیل کر آگے کھڑا ہو جائے۔ تاکہ لوگوں کی نگاہیں اُن پر پڑیں۔ شائد کہ حکّام میں سے کسی کی نظرِ کیمیا اثر بھی اُن نگاہوں میں شامل ہو۔ اِس کا نتیجہ یہ ہُوا ہے۔ کہ قومی جلسے بجائے قوم کے بعض شناسوں کے مشورۂ باہمی کے جلسے ہونے کے ایک دنگل ہو گئے ہیں۔ جن میں ہر پہلوان اپنا دم خم دکھاتا ہے۔ اور اپنے داؤں پیچ سے ناظرین کو محظوظ کرتا ہے۔

قوم ایک طرف تو اس مشکل میں ہے۔ کہ وہ اس طریقِ خدمتِ قومی کے سوا کسی اور طریق سے آگاہ نہیں۔ ایسے لوگ تو بہت کم ہیں۔ جو اِن نقائص کو جن کا ذکر اُوپر کیا گیا ہے۔ دیکھ سکیں اور اُن کے متعلق اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر سکیں۔ وہ انہی قومی دنگلوں اور

تماشوں کو قومی خدمت سمجھتے ہیں۔ اور انہی پہلوانوں کو قومی خادم۔ یہ سمجھ کر بعض تو صرف
اندھا دھند اُن کی پیروی کئے جاتے ہیں۔ اور بعض بدظن اور بددل ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔
مگر یہ نہیں کرتے یا کر سکتے۔ کہ اِس خرابی کی جو ہمارے قومی جلسوں اور ہماری انجمنوں میں
راہ پا گئی ہے۔ اصلاح کریں اور انجمنوں کو مفید قومی کاموں کے حقیقی مرکز بنائیں۔ اِس
مقصد کے حاصل کرنے کا ایک ذریعہ یہ بھی ہوگا۔ کہ لوگ یہ سمجھنے لگیں۔ کہ قومی خدمت کے
بے شمار طریقے ہیں۔ ایک یہی نہیں کہ کوئی شخص کسی سوسائٹی کی بنا ڈالے یا اُس کا اعزازی
عہدہ دار بن جائے۔ یا اس میں لکچر دے۔ یا جا بجا قومی جلسوں میں شرکت کے لئے پہنچے۔
یا چندہ جمع کرتا پھرے۔ یہ سب باتیں مفید ہیں۔ اور ہو سکتی ہیں۔ اگر نیک نیتی سے کی جائیں
لیکن اگر صرف نمود کے واسطے یا اور ذاتی اغراض کے لئے ہوں۔ تو چنداں مفید نہیں۔ بلکہ
بعض اوقات مضر بھی ثابت ہوتی ہیں۔ بہرحال یہ سب انجمنوں یا سوسائٹیوں کے قیام کے
لوازم ہیں۔ اور اسی ایک صورتِ خدمت کے انواع ہیں جس کا ہمارے مُلک میں زیادہ تر
رواج ہے۔ اس کے سوا جو صورتیں قومی خدمت کی ہیں جن سے لوگ کم آگاہ ہوتے ہیں۔
مگر جو مفید ہونے کے لحاظ سے کسی دوسری قسمِ خدمت سے کم نہیں۔ اُن کو پہنچاننا۔ اور
اس قسم کے خادموں کی قدردانی کرنا۔ یہ بھی مُلک اور اہلِ مُلک کا فرض ہے۔ وہ اصحاب جو
خدمت کے خاموش طریقوں میں سے کسی پر کاربند ہیں خود تو اُس کی پرواہ نہیں رکھتے
کہ مُلک اُن کی قدردانی کرے یا نہ کرے۔ مگر اُن کی قدر افزائی سے اور خادمانِ مُلک کو
ترغیب ہو سکتی ہے۔ کہ وہ بھی چُپ چاپ ایسے طریقوں کو اختیار کریں۔ جن سے نفع
زیادہ پہنچے۔ اور چرچا کم ہو۔ یہ چرچا اور داد کو ترغیب و تحریص کے لئے ضروری اور فائدہ
مند چیزیں ہیں۔ لیکن اِن کا حد سے زیادہ رواج ہونا خلوص کو زائل کرتا ہے۔ اور ملک
ضرورت ہے۔ ایسے خادموں کی جو اپنا فرض اس لئے ادا کریں۔ کہ وہ اُن کا [illegible]
نہ اِس لئے کہ فلاں جماعت ہم سے خوش ہوگی یا ایک خاص اثر ہم کو حاصل ہو جائے گا

حکّام ہمیں صلہ و انعام دیں گے سہ

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبین کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

جو شخص اپنے کُتب خانہ میں بیٹھ کر مدت العمر میں ایک ایسی کتاب لکھتا ہے جس کے مطالعہ سے ہزاروں افرادِ قوم مستفید ہوتے ہیں جس سے ملک کے ذخیرۂ لٹریچر میں ایک مفید اضافہ ہوتا ہے۔ اور جس سے کسی غیر مُلک یا قوم کے پڑھنے والے کی نظر میں مصنّف کی قوم کی نسبت اچھی رائے پیدا ہوسکتی ہے۔ ہماری رائے میں وہ شخص باوجود گوشہ نشین ہونے کے اور باوجود اپنی سادگی وضع کے ایک سچا خادم قوم یا دوسرے لفظوں میں محسن قوم ہے۔ جس کی خدمت کا شکریہ کافی طور پر ادا نہیں ہوسکتا اسی طرح ایک عہدہ دارِ سرکاری جو اپنا فرض منصبی دیانت۔ محنت۔ لیاقت سے ادا کرتا ہے خاصکر اس نیت سے کہ اس کی قوم کی نسبت گورنمنٹ کی رائے اچھی ہو۔ اور آئندہ اس کے ہم قوموں کو زیادہ سہولتیں اور زیادہ ترقیاں ملیں۔ یا اپنے ادائے فرائض میں اپنی قوم کے افراد کو جائز فائدے پہنچانے کی طرف مائل رہتا ہے۔ مُلک و قوم کے دلی شکریہ کا مستحق ہے۔ اور اس کا نام خادمانِ قوم کی معزز فہرست میں درج ہونا چاہیئے۔ علیٰ ہذا القیاس وُہ تاجر جو کوئی نیا صیغہ تجارت کا ڈھونڈ نکالتا ہے۔ اور اس سے آپ بھی فائدہ اُٹھاتا ہے۔ اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچاتا ہے۔ مُلک کی ایک اعلیٰ خدمت کر رہا ہے۔ ایک شخص جو دوسرے مُلک میں جا کر اقامت اختیار کرتا ہے۔ اس ارادہ سے کہ وہاں جو اس کے ہم وطن جائیں۔ اُن کی خدمت کرے۔ اور اپنی نیکی اور خوبی سے اُنہیں فائدہ پہنچائے۔ ملکی خدمت میں مصروف ہے۔ گو مُلک سے باہر ہے۔ اور گو اہل مُلک اُس کی خدمات سے ناواقف ہیں۔ کئی لوگ ہیں۔ کہ عام جلسوں کے ذریعے سے نہیں بلکہ خانگی طور پر گھر جا کر اپنے ہمسایوں اور دوستوں کو امور خانہ داری میں تربیتِ اطفال کے متعلق

یا تعلیم کے متعلق مشورہ اور امداد دیتے رہتے ہیں۔ یا اُن میں پڑھنے لکھنے کا شوق پھیلاتے
ہیں۔ یا انہیں کتابیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ وہ حقیقت میں زیادہ خدمت
کر رہے ہیں۔ بہت سے اُن لوگوں کی نسبت جن کی تقریروں سے مجالسِ قومی کے ہال گونج
رہے ہیں۔ اور جن کے کارناموں کے تذکروں سے اخبارات پُر ہیں۔ وہ اخبار نویس جو
ایمانداری کے ساتھ اپنے فرائض اخبار نویسی انجام دیتا ہے۔ اور جس کا مدعا یہ ہے
کہ ملک میں واقفیت عامہ ترقی کرے۔ اہلِ ملک روشن خیال ہو جائیں۔ اور واقعاتِ
عالم پر اُن کی نظر وسیع ہو۔ ملک کے سچے بہی خواہوں اور خدام وطن میں شمار ہونے کے
لائق ہے خواہ کسی عام جلسہ میں ایک مرتبہ بھی لب کشا نہ ہوا ہو۔ اور کسی انجمن کے
ارکین میں اس کا نام درج نہ ہو۔

غرض غور کرنے سے بے انتہا مثالیں ایسی خدمات کی جمع کی جا سکتی ہیں۔ جو خواہ
چھوٹے پیمانے پر ہوں یا بڑے پیمانے پر حقیقت میں قومی خدمات ہیں۔ اور قوم کے دلی
شکریہ کا استحقاق رکھتی ہیں۔ اور ہر قوم کا جو ترقی کی آرزومند ہے فرض ہے کہ سچے
خادموں اور مدعیانِ خدمت کی شناخت حاصل کرے۔ اور صادق دوستوں کے دل
بڑھائے۔ اور نرے دعویداروں کو جتا دے کہ وہ اُن کے فریب میں نہیں آئے
یہ جان لے کہ انجمن اور چندہ اور سکرٹری اور پریذیڈنٹ اور جلسہ اور وعظ گو نہایت
چیزیں ہیں جن کے بغیر متمدن زندگی خصوصاً زمانۂ حال میں ممکن نہیں تاہم یہ خدمت
کی مختلف صورتوں میں سے ایک صورت کی علیحدہ علیحدہ شکلیں ہیں۔ اور خدمت
سے بھی اچھی اچھی صورتیں رکھتی ہے۔ اور وہ صورتیں اپنی اپنی دلفریبیاں
ہیں۔

اِستانبول

قسطنطنیہ اور استانبول دو ناموں سے یہ شہر مشہور ہے۔ یہ دونوں اپنی اپنی جگہ تاریخی حکایات سے بھرے ہوئے ہیں۔

قسطنطنیہ! نام لیتے ہی کیا کیا نقشے آنکھوں کے روبرو آجاتے ہیں۔ روما کی عظیم الشان سلطنت کا زمانۂ عروج قسطنطین اعظم کا دور جسٹینین کا عہد۔ رومی قیصروں کی خواہش کہ ایک نیا روما بنائیں۔ اس خواہش کے پورا کرنے کے اہتمام اس کی تکمیل اور صدیوں کی تعمیرات۔ اب وہ سب کہاں ہیں؟ اسی نام میں پنہاں ہیں۔ اور چند شکستہ آثار کے سوا یہی اُن گذشتہ صدیوں کی یادگار باقی ہے۔

اِستانبول! اِس نام کے ساتھ قسطنطنیہ کے موجودہ فرمانرواؤں کی تاریخ وابستہ ہے۔ اور اُن کی عظمت و اقتدار کی حکایت گویا اس لفظ میں ہے۔ سلطان محمد فاتح کی مشہور فتوحات سے لے کر محمد خامس تک مختلف سلاطین عالی وقار کی کامیابیوں اور ناکامیوں کے تماشے اسی استانبول نے دیکھا ہے۔ اس کی سرزمین کا چپہ چپہ اپنے اندر ایک ہسٹری چھپائے ہوئے ہے۔ اور اس کی پرانی پرانی دیواریں اور پیچدار گلیاں اپنی اپنی کہانی کہہ رہی ہیں۔

لیکن اِس نادر شہر کی دلچسپی صرف تاریخی ہی نہیں جغرافیہ نے بھی اِس کی اہمیت بڑھانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ یورپ اور ایشیا کا مقامِ اِتصال یہی ہے۔ کرۂ زمین کے نقشے پر اگر نگاہ دوڑائیں۔ تو آسانی سے نظر آسکتا ہے۔ کہ لکھنے والوں نے اِسے "کلیدِ عالم" نہیں لکھا۔ جب تک عثمانی سلطنت برّی اور بحری قوت میں یورپ کی دوسری سلطنتوں

کے جوڑ کی تھی۔ اور عیسائی سلطنتوں نے مذہبی تعصب سے کام لیکر اس کے خلاف اتحاد نہیں کیا تھا۔ اُس وقت تک یورپ کی ہر سلطنت فرداً فرداً سلطنت عثمانیہ سے کانپتی تھی۔ کیونکہ اُنہیں معلوم تھا۔ کہ قسطنطنیہ کے محلِ وقوع نے اُسے کس قدر محفوظ بنا دیا ہے اور اسے دُوسروں پر حملہ کرنے کے لئے کس قدر آسانیاں دے رکھی ہیں خشکی اور تری دونو راستے اِس کے لئے یکساں کھلے ہیں۔ اب بھی اگر ترکوں کی بحری طاقت سنبھل جائے۔ اور اندرونی انتظام میں اغیار کی مداخلت نہ رہے۔ تو قسطنطنیہ کا محل وقوع اس کے مالکوں کو یہ موقعہ دیتا ہے۔ کہ وہ اپنے آپ کو زیادہ خطرہ میں ڈالنے کے بغیر دُوسروں کی عافیت کو معرضِ خطر میں رکھیں۔ اسی لئے تو اُن کے بیدار ہمسائے اُنہیں چین سے رہنے نہیں دیتے اور ہمیشہ "مشرق قریب" میں کوئی نہ کوئی بکھیڑا کھڑا رکھتے ہیں۔

علوم تاریخ وجغرافیہ کے اعتبار سے جو اہمیت اِستانبول کو ہے۔ اس کے علاوہ اس کے کوہ و دریا کا لُطف۔ اس کے باغ وراغ کے نظارہ کا شوق اس کی مخلوط آبادی کا تماشا اور موسم گرما میں اس کی آب وہوا کا اعتدال ہر سال دُنیا کے ہر گوشے سے لوگوں کو کھینچتا ہے۔ امریکہ کے لوگ جو سیر و سیاحت میں سارے جہان سے سبقت لے گئے ہیں۔ ہزاروں آتے ہیں۔ اگر آمدورفت میں گیرو دار۔ روک تھام اس قدر نہ ہو جس قدر اب ہے۔ تو اور بھی زیادہ آئیں۔ اِن کے علاوہ انگریز آتے ہیں فرانسیسی آتے ہیں جرمن آتے ہیں غرض یورپ کی ہر قوم کے افراد ہر وقت استنبول میں موجود رہتے ہیں۔ اور اِس کے حالات معلوم کرنے کے مشتاق۔ مگر مسلمانوں کے لئے استانبول میں ایک خاص کشش ہے۔ کیونکہ وہاں ایک روایت نہایت مقبول ہے۔ کہ اِس شہر کا فتح ہونا جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کی تصدیق کے لئے لازم تھا۔ مسلمانوں نے اِس کے فتح کرنے میں اپنا فرضِ مذہبی ادا کیا۔ اور اِس قبضہ کا قایم رکھنا اِسی اعتبار سے اُن پر واجب ہے +

فتوحات کی تاریخ میں شاید "فتح جلیل قسطنطنیہ"[1] سے بڑھ کر عجیب حالات کسی بڑے پایۂ تخت کے فتح ہونے کے متعلق مروی نہیں ہیں۔ جامع فاتح کے دروازہ پر وہ حدیث نبوی لکھی ہے جس سے فتح قسطنطنیہ کے لئے مسلمانوں کی متواتر کوششیں منسوب ہیں۔ حدیث شریف کی عبارت یہ ہے۔ لَتُفْتَحَنَّ الْقُسْطَنْطِيْنِيَّةُ فَلَنِعْمَ الْاَمِيْرُ اَمِيْرُهَا وَلَنِعْمَ الْجَيْشُ ذَالِكَ الْجَيْشُ[2]۔ اس پیشین گوئی سے بڑھ کر حیران کرنے والی پیشین گوئی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کے نصف اوّل میں عرب کے چند بادیہ نشینوں کو جو پیغمبر عرب کے زبردست مقناطیسی اثر سے اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ یہ مژدہ دیا جائے۔ کہ مسلمان قیصر رُومانی عالیشان سلطنت کی بنیاد اُکھیڑ دیں گے۔ اور خود اُس کی جگہ لیں گے۔ اور ان لوگوں کے عقیدہ کی پختگی کو دیکھئے۔ کہ وہ اُس بے سروسامانی میں بھی اس اُمید پر اُٹھ کھڑے ہوئے کہ وہاں پہنچنے کی دیر ہے پھر وہاں کی کلید ہمارے ہاتھ میں ہے۔

۶۶۸ء میں یعنی رسولِ مقبول صلعم کے وصال کے بعد تھوڑے سے عرصے کے اندر ہی ان باحوصلہ عربوں نے قسطنطین کے پایۂ تخت کے دروازہ پر آکر دستک دی حضرت ایوب انصاری علمبردار نبوی اس لشکر کے سرگروہ تھے۔ اُس زمانے میں شہر کے گرد مضبوط دیواریں تھیں۔ عیسائی خبر پاتے ہی دروازے بند کر کے قلعہ بند ہو بیٹھے۔ مسلمانوں نے باہر ڈیرے ڈال دیئے۔ آخر دونوں کی مڈبھیڑ ہوئی۔ مسلمانوں نے دادِ مردانگی دی۔ تعداد میں کم تھے۔ اور گھر سے منزلوں دُور۔ کئی خشک بیابان اور کئی دشوار گزار پہاڑی راستے۔ کئی دریا اور کئی وادیاں درمیان میں حایل تھیں۔ بھاگ کر جاتے تو کہاں جاتے۔ اور بھاگ کے

---

[1] اس نام کی ایک کتاب ترکی زبان میں شائع ہوئی ہے۔ جس میں اہم تاریخی واقعہ کی کیفیت شرح و بسط کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔

[2] ترجمہ۔ تم فتح کرو گے قسطنطنیہ کو۔ پس مبارک ہے وہ امیر جو اس شہر کا امیر ہو گا اور مبارک ہے وہ لشکر جو اس کا لشکر ہو گا۔

والے ہوتے۔ تو اتنی دُور کیوں آتے۔ کچھ لڑائی میں کام آئے اور کچھ وبا کی نذر ہوئے مگر مرتے ہوئے اپنے مغرور غنیم سے کہہ گئے "یہ نہ سمجھنا۔ کہ یہ ہڈیاں یہاں بے سبب گڑی ہیں۔ اِس خاک پر ہم بے وجہ نہیں لیٹے جب یہ ہڈیاں پیوندِ خاک ہو جائیں گی۔ تب اس خاک سے ایک خمیر اُٹھے گا۔ اور وُہ خمیر مایۂ دُکان اسلام ہوگا۔ جس کی گرم بازاری کا زمانہ آنے والا ہے"

یہ بہادر مرنے کو تو مر گئے۔ مگر عجب کام کر گئے۔ بجائے اِس کے کہ اُن کی یہ شکست مسلمانوں کی ہمّت کو شکست دے۔ اُن کے لئے اَور تازیانہ بنی۔ شبہ تو اُس زمانہ کے اُستوار عقائد میں راہ پا نہیں سکتا تھا۔ وُہ دِل سے مانتے تھے۔ کہ جناب رسالتمآب کی زبان وحی ترجمان سے جو بات نکلی ہے۔ وُہ پوری ہو کر رہے گی۔ خواہ اسباب اِس کے کتنے ہی مخالف کیوں نہ نظر آئیں۔ اب اُنہیں مزید ترغیب یہ ہو گئی۔ کہ اپنے شہیدوں کا خون بہالیں۔ اُن کی ہڈیوں کی حفاظت کریں۔ اُن کے مزار بنائیں۔ اور اُن مزاروں کو بے حُرمتی سے بچائیں۔ آئے اور بار بار آئے۔ عربوں نے سات سال متواتر حملہ کیا۔ خلفائے بغداد کے عروج کے زمانہ میں ہارون رشید آیا۔ اور اسکدار (سقوطری) پر اُس کا جھنڈا گڑ گیا۔ اُس وقت ایک ملکہ قسطنطنیہ کی حکمران تھی۔ اُس نے خراج دینا منظور کر کے صُلح کر لی۔ پھر ایک زمانہ گذر گیا۔ مگر مسلمان اس پیشین گوئی کو نہیں بھُولے۔ عثمانی تاجدار کوششیں کرتے رہے۔ لیکن جس نامور کے زورِ شمشیر سے آخر عَلَمِ قسطنطنیہ سرنگوں ہُوا۔ وُہ فخرِ خاندانِ عثمانی سلطان محمّد ثانی تھا۔ جس نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کو فتح کیا۔ اور فاتح کے لقب سے ممتاز ہُوا۔ اور اِسی نام سے آج تک دوست دشمن اُسے یاد کرتے ہیں۔ اُسی کے حُسنِ تدبیر نے خشکی پر کشتیاں چلا دیں۔ اور وُہ مہم سَر کی جس کی فکر میں مسلمان آٹھ سو سال سے تھے۔ مگر کامیاب نہ ہوئے تھے۔

۱۴۵۳ء سے لے کر آج تک استانبول سلاطینِ عثمانیہ کا دارالخلافہ چلا آتا ہے۔ سلطان محمّد

فاتح نے اپنی فتح کی کئی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ جن میں رومِ ایلی حصار اور جامع فاتح خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے بعد یہ رسم ہو گئی۔ کہ قریب قریب ہر سُلطان اپنے عہد کی یادگار میں ایک مسجد بنایا کرے۔ اور اسی لئے استانبول مساجد کے اعتبار سے شہرت خاص رکھتا ہے۔ شائد کسی اور اسلامی مرکز میں بڑی مسجدیں اس کثرت سے نہیں۔ سُلطانی مسجدوں کے بلند مینار دُور سے نظر آنے لگتے ہیں۔ اور آسمان سے باتیں کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ اِسکی صُورت کا یہی وہ حصّہ ہے جس پر فرنگستان کے بامذاق نظارہ پسند وجد کرتے ہیں۔ اور اس کی تعریف کرتے نہیں تھکتے۔ گو اُن کا جوشِ تعریف شہر میں قدم رکھتے ہی گلی کوچوں کی حالت دیکھ کر فرو ہو جاتا ہے۔ اور پھر مذمت بھی ایسی ہی کرتے ہیں۔ تاہم اس شہر کی دو خوبیوں کا وہ ہمیشہ اعتراف کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ دُور سے استانبول بجائے معمولی انسانی آبادی کے عالمِ بالا کی کسی بستی کی تصویر نظر آتا ہے جس کا نقشہ صاف نیلگوں آسمان کے وسیع کینوا[1] اس پر نقّاشِ ازل نے اپنے ہاتھ سے کھینچا ہے۔ اور دُوسرے یہ کہ تاریخی نشانیوں کی بوقلمونی کے لحاظ سے یہ دارالخلافہ اپنی مثال نہیں رکھتا۔

اصل میں پُرانا قسطنطنیہ تو وہی ہے جسے اب استانبول کہتے ہیں۔ مگر اب رفتہ رفتہ پھیلتے پھیلتے یہ نام کئی حِصّوں پر جو پہلے غیر آباد تھے۔ یا علیحدہ سمجھے جاتے تھے۔ حاوی ہو گیا ہے۔ اس کے اب تین بڑے حِصّے ہیں۔ استانبول۔ پیرا غلطہ اور اسکدار۔ اِن میں استانبول اور پیرا غلطہ یورپی ساحل پر واقع ہیں۔ اور اسکدار (سقوطری) ایشیائی ساحل پر۔ یورپی ساحل اور ایشیائی ساحل کے درمیان آبنائے باسفورس ہے! ور استانبول اور پیرا غلطہ کے درمیان "شاخِ زریں" کا پانی حائل ہے۔ شاخِ زریں پر صبح سے شام تک آئندہ و روندہ کی کثرت رہتی ہے۔ اور باوجود اپنی کہنگی کے یہ پُل نہایت دلچسپ ہے۔ دُنیا کی ہر قوم کا نمونہ اس پُل پر نظر آسکتا ہے۔ اور مشرق و مغرب کے سب لباسوں کی آمیزش

[1] انگریزی میں اُس کھُردرے کپڑے کو کہتے ہیں جس پر نقّاش تصویریں کھینچتے ہیں۔

اس کے منظر کو نہایت دلپذیر بناتی ہے۔ اسکدار کی آبادی بیشتر مسلمانوں کی ہے۔
استانبول میں بھی زیادہ تر مسلمان ہی آباد ہیں۔ گو تاجر اور دکانداروں میں عیسائی اور
یہودی بھی بکثرت ہیں۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا۔ کہ تجارت کا ایک کثیر حصّہ انہی کے ہاتھ
میں ہے۔ اِسی حصّہ میں ایا صوفیہ۔ اِسی میں باب عالی۔ بابِ مشیخت عدالتیں اور دیگر
دفاتر سرکاری ہیں۔ اِسی میں زیادہ تر مساجد۔ اسی حصّہ میں قسطنطنیہ کا مشہور عالم مسقّف
بازار ہے۔ اور یہیں خان والدہ میں ایرانی تجار کی بستی ہے۔ مسافر کی دلچسپی کے جس قدر
سامان اس حصّے میں جو پرانی چہار دیواری کے اندر ہے۔ موجود ہیں۔ اور کسی حصّے میں نہیں
پیرا غلطہ ایک دوسرے سے ملے جُلے ہوئے ہیں۔ لیکن اصل میں دو حصّے ہیں۔ پیرا مقامی
عیسائیوں اور یورپ کے عیسائیوں کی بُود و باش کا مرکز ہے۔ یہیں یورپی ہوٹلوں کے
نمونے کے ہوٹل ہیں۔ غلطہ میں غلطہ سرائے نامی شاہی محل ہے۔ جو سُلطان عبدالعزیز
کے زمانے سے مکتب سُلطانی کو دے دیا گیا ہے۔ یہیں غلطہ مینار ہے۔ جس پر
چڑھنے سے استانبول بہ تمام و کمال نظر آسکتا ہے۔

ایا صوفیہ

سجدہ کی آرزو ہو تو قسطنطنیہ میں ایا صوفیہ سے زیادہ کونسی جگہ اس کے لئے موزون ہوگی۔ زمین کا یہ قطعہ کوئی ڈیڑھ ہزار برس سے عبادت گاہِ خلائق چلا آتا ہے۔ پہلے جن کے پاس تھا۔ وہ اس میں اپنے عقائد کے موافق اس میں پرستش کرتے تھے۔ اب جن کے پاس ہے وہ اپنے عقیدے کے موافق اپنے معبود کی اطاعت کرتے ہیں۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس قطعۂ زمین کی قسمت میں قسامِ ازل نے ہر انقلاب کے بعد عبادت گاہ بننا لکھا ہے۔ یہ تو عام طور پر معلوم ہے۔ کہ جب مسلمانوں نے اس پر قبضہ کیا۔ اس سے پہلے یہ مشرقی یورپ کا سب سے بڑا اور سب سے مشہور گرجا تھا۔ مگر یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ کہ اس گرجے سے پہلے جسے مسلمانوں نے موجود پایا۔ یہ بنا کئی دفعہ خراب ہو چکی تھی۔ مگر یہ اجڑنے کے بعد پھر آباد ہوتی رہی۔ اور ہر صدی میں اسی ایک مقصد عبادت کے لئے مخصوص رہی۔ یہاں کہا جاتا ہے۔ کہ قسطنطین اعظم نے اس کی بنیاد رکھی۔ اور اس کے بیٹے کے عہد میں اس کی تکمیل ہوئی۔ سنہ ۳۶۰ء میں بڑی شان کے ساتھ اس کی رسم افتتاح [ادا] کی گئی۔ مگر ساری محنت اور سارا روپیہ برباد ہو گیا۔ کیونکہ سنہ ۴۰۴ء میں آگ نے اس کو پیوندِ زمین کر دیا۔ اور چونکہ اس عمارت میں زیادہ تر لکڑی سے کام لیا گیا تھا۔ [فق]ط راکھ کا ایک ڈھیر اس کا نشان رہ گیا۔ پھر طیودوسیوس ثانی نے اسے از سرِ نو تعمیر [کر]ایا۔ اور سنہ ۴۱۵ء میں اس کا افتتاح ہوا۔ مگر ابتدائے ۵۳۲ء میں پھر آگ نے اسے آ لیا۔ [لیک]ن ققنس وار یہ راکھ کے ڈھیر سے جی اٹھی۔ اور آتشزدگی کے چالیس دن بعد تعمیر

جسطنطین نے اُسے بنوانا شروع کر دیا۔ تعمیر عمارت پانچ سال دس مہینے جاری رہی اور ۵۳۷ء کے آخری مہینے میں اس کی رسم افتتاح پھر ادا کی گئی۔ قیصر جسطنطین نے اپنی ساری ہمت اس کے مضبوط اور عالیشان بنانے میں صرف کر دی تھی۔ لیکن اس دفعہ بھی اس گرجے کو دیر تک عافیت نصیب نہ ہوئی ۵۵۸ء میں ایک شدید زلزلہ آیا۔ اور اس سے اس کا سب سے بڑا گنبد ٹوٹ کر گر پڑا۔ اور گرجے کے منبر اور قربان گاہ وغیرہ اس کے نیچے دب کر ٹوٹ گئے ۵۶۲ء میں پھر اسے بنایا گیا۔ گنبد ۲۵ فٹ اور بلند کیا گیا۔ اور اس میں سولہ دریچوں کی بجائے چالیس دریچے روشنی کے لئے رکھے گئے۔ عجیب اتفاق ہے۔ کہ اس گرجے کو بارہا ان مصائب کا سامنا ہوا۔ اور تاریخ مذکورہ کے بعد بھی کئی دفعہ زلزلوں سے سخت نقصان پہنچتا رہا۔ اور اس کے کئی حصے گر گئے۔ مگر جب سے یہ عمارت مسلمانوں کے ہاتھ آئی ہے۔ اور خدائے واحد کی عبادت کے لئے وقف ہوئی ہے۔ اُس وقت سے کوئی ایسا حادثہ نہیں ہوا۔ جس سے یہ بالکل تباہ ہو جاتی۔ اور اس کے از سرِ نو بنانے کی ضرورت پڑتی۔ سلاطینِ عظام نے اس کی مرمت کی طرف ہمیشہ توجہ رکھی ہے۔ یہ بات قابل داد ہے۔ کہ سلاطین عثمانی نے اس کی اندرونی عمارت کو حتیّ الوسع بحال رکھا ہے۔ اور صرف وہ تبدیلیاں کی ہیں جو از روئے مذہب لابدی تھیں۔ اس لئے کیا عیسائی کیا مسلمان دونو کے لئے یہ مقام آج تک دلچسپ چلا جاتا ہے۔ تاریخی مذاق رکھنے والے عیسائی سیّاح اس کے ہر پرانے حصّے کو شوق سے دیکھتے ہیں۔ اور اس کے نقشے کھینچتے ہیں۔ اس کی مختلف زمانوں کی مرمّت کا پتہ چلاتے ہیں۔ اور تحقیقات کرتے ہیں۔ کہ کونسا حصّہ بالکل اُسی طرح باقی ہے۔ جس طرح جسطنطن کے زمانے میں تھا۔ اور کونسا اس کے جانشینوں کے وقت کی بنا ہے۔ مسلمان جاتے ہیں۔ اور خدا کی قدرت دیکھ کر حیران ہوتے ہیں۔ کہ کیسے کیسے انقلاباتِ زمانہ سے یہ عالیشان بنا اُن کی عبادت گاہ بنی۔

یہ عمارت باہر سے نہ پہلے کچھ بہت خوبصورت تھی۔ نہ اب ہے۔ گنبد اِس کے باہر سے سادہ رکھے گئے تھے۔ اور اسلام نے جو مینار بنائے ہیں۔ وُہ بھی سادہ ہیں۔ اور چونکہ اِس کے آس پاس جو عمارات اِس کے بعد بنی ہیں۔ اُن کی کُرسیاں اُونچی ہیں۔ اور اردگرد کی زمین کی سطح کو اُونچا کیا گیا ہے۔ اِس لئے اِس کی بلندی بھی باہر سے کم نظر آتی ہے۔ پہلے دن جب ریل میں قسطنطنیہ پہنچتے وقت مجھ سے کسی نے کہا۔ کہ وہ جامع ایا صُوفیہ ہے۔ اور میں شوق سے ریل کی کھڑکی سے دیکھنے لگا۔ تو مجھے حیرت ہوئی تھی۔ کہ ایا صُوفیہ کی اِس قدر تعریف کس بات کی ہے۔ لیکن اندر جاکر وُہ حیرت رفع ہوگئی۔ اور ایک اَور قسم کی حیرت اِس کی جگہ جاگزین ہوئی۔ یہ حیرت عمارت کی اندرونی خُوبیوں کے اثر نے پیدا کی۔ عیسائی ماہرانِ تعمیر لکھتے ہیں۔ کہ دُنیا بھر میں اَور کہیں عیسائیوں نے اُصولِ فن کی رُو سے اتنا مکمّل اَور ایسا خوبصورت گرجا نہیں بنایا۔ اگر محض گنبد سے فیصلہ کریں۔ تو یہ نتیجہ بدیہی ہے۔ رُوما کے مشہور پینتھیوں کے گنبد کا قُطر ایک سو تینتالیس ۱۴۳ فٹ ہے۔ سینٹ پیٹرس کے مُشہرۂ آفاق گرجے اَور فلارنس کے بڑے گرجے کے گنبد ایک سو چھبیس فٹ کا قطر رکھتے ہیں۔ اَور لنڈن کا سب سے بڑا گرجا سینٹ پولوس ایک سُو آٹھ فٹ کے قطر کا گنبد رکھتا ہے۔ حالانکہ اَیا صوفیہ کے گنبد کا قُطر ایک سُو اَناسی فٹ ہے۔ یہ بڑا گنبد چار بڑے محرابوں پر قائم ہے جو طول میں پچھتّر فٹ اَور عرض میں پچیس ۲۵ فٹ ہیں۔ گنبد کے نیچے کا حِصّہ جو اَیا صوفیہ کا وسطی قطعہ ہے۔ ایک بڑا مستطیل ہال دوسو پچاس ۲۵۰ فٹ لمبا اَور ایک سو فٹ چوڑا ہے۔ اِس کے دائیں بائیں دو منزلہ عمارت ہے۔ جس کی ایک طرف کی گیلری کا طول عرض ۲۶×۲۰۵ فیٹ ہے۔ نو دروازے اَیا صُوفیہ میں داخل ہونے کے ہیں۔ اور اُن میں سب سے بڑا دروازہ نہایت شاندار ہے۔ گو اِن دروازوں کی شان میں اب یہ فرق آگیا ہے۔ کہ عمارت کے نشیب میں ہونے کی وجہ سے دروازہ سے چند سیڑھیاں اُتر کر اندر جانا پڑتا ہے۔ حالانکہ پہلے جب اِردگرد کی زمین اِس عمارت کی کُرسی سے نیچے تھی۔ تو دروازہ چند

سیڑھیاں چڑھ کر آتا تھا۔

وسطِ مسجد میں داخل ہوتے ہی سنگ مرمر کا ایک بہت بڑا مٹکا پانی سے بھرا رکھا ہے۔ جس میں وضو کے لئے پانی ہے۔ یہ اُس موقع پر ہے جہاں گرجے کے زمانے میں عیسائی پانی کا ایک بڑا برتن رکھا کرتے تھے۔ اور اس برتن پر یہ عبارت لکھی ہوئی تھی وہ صرف مُنہ دھونا کافی نہیں۔ اپنے گناہوں کو دھوؤ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ قدیم زمانہ کے عیسائیوں میں عبادت سے پہلے وضو کا طریقہ جاری تھا۔ اور اب وہ اس سے غافل ہو گئے ہیں۔ اور جیسا کہ مسلمانوں میں وضو گناہوں کے دھونے کا نشان ظاہری سمجھا جاتا ہے ایسا ہی عقیدہ عیسائیوں میں بھی تھا۔

سنگ مرمر کے برتن سے ذرا آگے وسطِ عمارت کی طرف بڑھیں تو عین گنبد کے نیچے جا پہنچتے ہیں۔ اوپر کو نظر اُٹھائیں تو سب سے پہلے نگاہ چھت کے خوبصورت کام پر جا کے جمتی ہے۔ اور اس کے بعد اُس کے چاروں گوشوں میں ایک عجیب ہیئت کی چار تصویریں ایک دوسرے کے مشابہ دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے۔ کہ یہ کیا تصویریں ہیں۔ اور مسجد میں انکا کیا کام۔ یہ گرجا ہونے کے وقت کا بقیہ ہیں۔ چاروں مشہور فرشتے جن کے نام نصاریٰ و یہود اور مسلمانوں کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ اس گنبد کی چھت پر دکھائے گئے تھے۔ چونکہ اُن کا نہ مُنہ بنایا گیا ہے نہ سر۔ اس لئے یہ تصویریں محو کئے جانے سے بچ گئیں۔ باقی جو تصاویر اس گرجے میں تھیں۔ وہ سب مٹا دی گئی ہیں۔ اور وہ جو مٹ نہیں سکتی تھیں۔ وہ ایسی ترکیب سے ڈھانپ دی گئی ہیں۔ کہ مانع نماز نہ ہوں یہ تصویریں محض رنگ و روغن سے بنی ہوئی نہیں بلکہ موزائک کی بنی ہوئی ہیں۔ یہ فن اطالیہ میں بکثرت مروّج ہے۔ پتھر کے چھوٹے چھوٹے رنگین ریزے اِس خوبی سے چُنے جاتے ہیں۔ کہ انسانی صورتیں۔ گل بوٹے۔ کوہ و دریا جو چاہو در و دیوار پر نمایاں ہو جاتا ہے۔ اور دیوار کا جزو بن جاتا ہے۔ دیوار ٹوٹ بھی جائے لیکن اس کے رنگ میں فرق نہیں آتا۔ اور اس کے ٹکڑے عجائب گھروں

ہیں رکھے جاتے ہیں۔

دیواروں کی زینت میں اسلام نے یہ اصلاح کی ہے۔ کہ تصویروں کی بجائے اللہ ورسولؐ کا نام بڑی بڑی لوحوں پر خوشخط نستعلیق حروف میں لکھوا کر لٹکا دیا ہے۔ چاروں اصحاب کے نام نامی جلی حروف میں لکھے ہوئے لٹک رہے ہیں۔ محراب کی زینت دو بہت بڑی موم بتّیوں سے تھی۔ جو محراب کے دونو طرف استادہ ہیں۔ کوئی چار گز لمبی اور اسی نسبت موٹی ہیں۔ یہ بھی گرجے کی آرائش کا بقیّہ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ عیسائیوں کے گرجاؤں میں عموماً موم کی بڑی بڑی بتّیاں استعمال کی جاتی ہیں۔ لیکن چونکہ یہ محض روشنی کا ذریعہ تھا۔ اور اس پر کوئی شرعی اعتراض نہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے مسلمانوں نے اسے بحال رہنے دیا۔ رفتہ رفتہ ان بتّیوں کا یہاں تک رواج ہو گیا۔ کہ اس کے بعد استنبول میں مسلمانوں نے جو مساجد خود بھی بنائیں۔ اُن میں بھی محراب کے پاس ایسی بتّیاں استادہ ہیں۔ لیکن یہ محض زیبائش کے لئے ہیں۔ شائد کسی نہایت ہی خاص موقع پر جلتی ہوں۔ عام طور پر روشنی کے لئے بڑے بڑے آہنی جھاڑ چھت سے لٹک رہے ہیں جن میں بیسیوں چھوٹے چھوٹے بلّور کے چراغ آویزاں ہیں۔ جب کبھی یہ سب روشن کئے جاتے ہیں۔ تو عجب سماں ہوتا ہے۔

مسجد کا ممبر نہایت بلند ہے۔ اور دوسری مساجد میں بھی اِس کی تقلید کی گئی ہے۔ ہمارے ہاں ممبر اِس قسم کا نہیں ہوتا۔ اِس کے زینوں کے اختتام پر ایک مخروطی شکل کا مینار سا ہوتا ہے جس پر ہلال نشانِ اسلامی ہے۔ امام جب خُطبہ پڑھتا ہے۔ تو سب سے اُوپر کے زینہ پر یا اِس سے ایک زینہ نیچے کھڑا ہوتا ہے۔ اور اس کے دونو جانب دو جھنڈے آویزاں ہیں۔ کہتے ہیں۔ اب سے چند برس پہلے ایا صُوفیہ کا امام خُطبہ کے وقت تلوار بھی ہاتھ میں لے کر کھڑا ہوتا تھا۔ لیکن اب یہ رسم نہیں رہی۔ منبر کی پہلی سیڑھی کے سامنے ایک دروازہ ہوتا ہے جس پر یا تو سبز پردہ لٹکا رہتا ہے۔ یا دروازہ بند رہتا ہے۔ امام کا ایک لباس مخصوص ہے جو وُہ جمعہ کے دن پہنتا ہے۔

اور اسی کے رنگ سے اس کے رُتبے کی تمیز ہوتی ہے۔ اِن سب رسموں میں عیسائیت اور اسلام۔ مشرق اور مغرب دونو کے صدیوں تک ایک دُوسرے کے پہلو بہ پہلو رہنے کے آثار ویسے ہی نمایاں ہیں۔ جیسے ہندوستان کے مسلمانوں کی بعض عادات میں ہندو مسلمانوں کے تمدّن کا میل جول۔ ورنہ اسلام جب پہلے ریگستانِ عرب سے چلا تھا۔ تو سادگی ہی اس کی زینت تھی۔ اور اُسے عمامے کے رنگ اور قبا کی وضع کے امتیازات سے کچھ بحث نہ تھی۔

آیا صوفیہ کا ذکر ختم کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ جسٹنین کے زمانے کی تعمیر کے متعلق چند حکایات جو عیسائیوں میں مروّج ہیں نقل کر دی جائیں۔ اُن میں سے کئی درست ہیں۔ اور کئی محض فسانے معلوم ہوتے ہیں مگر دونو دلچسپ ہیں۔ جنوری ۵۳۲ء کی آتشزدگی کے بعد جب جسٹنین کو یہ گرجا دوبارہ بنانے کا خیال آیا۔ تو اُس نے ارادہ کیا۔ کہ ایسا گرجا بنے جس کی پہلے کہیں نظیر نہ ہو۔ جس دن سے عمارت شروع ہوئی۔ اس کی نگرانی کا کام اُس نے اپنے ذمّے لیا۔ دوپہر کو بجائے محلوں میں آرام کرنے کے وُہ خود جا کر تعمیرات کا معائنہ کیا کرتا تھا۔ اور ایسی عقیدت سے آتا تھا۔ جیسے زائر کسی مقدس مقام کی زیارت کو جاتے ہیں۔ گاڑھے کا ایک سادہ سا جامہ پہنے سر پہ ایک رومال باندھے۔ اور عصا ہاتھ میں لئے قیصر جسٹنین دوپہر کی دھوپ میں کام کی نگرانی کے لئے کھڑا ہوتا تھا۔ اور معماروں مزدوروں کی ہمّت اپنی مثال سے بڑھاتا تھا کسی کو انعام دے کر خوش کرتا تھا۔ اور کسی کو نرمیٔ گفتار سے گرویدہ۔ اِس کوشش کے باوجود پانچ سال دس مہینے میں عمارت ختم ہوئی تھی۔ یہاں تک تو روایت تاریخی ہے۔ لیکن اِس کے ساتھ اس زمانے کے عقیدت مند عیسائیوں نے عجیب حاشیے چڑھائے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ کہ جب خزانے میں مصارفِ تعمیر کے لئے روپیہ کافی نہ رہا۔ تو ایک فرشتہ سونے کی تھیلیاں خچروں پر لاد کر لایا۔ اور بادشاہ کو دے گیا۔ کہ باقی

عمارت اِس سے مکمل کرو۔ عمارت کا نقشہ بھی جسطنین کو ایک فرشتے نے خواب میں بتایا تھا۔ یہاں تک تو مضائقہ نہیں۔ خواب کی حقیقت انسان کے لئے ایک رازِ سربستہ ہے۔ لیکن روپیہ تو فرشتہ خواب میں نہیں دے گیا۔ بلکہ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ دن کو بیداری کے عالم میں لایا۔ اور جسطنین کے حوالے کر گیا۔ افسوس ایسے معجزات کا دروازہ اب بالکل بند ہو گیا۔ اب کسی کو یہ خوش قسمتی نیک سے نیک کام کے لئے بھی حاصل نہیں ہوتی۔ کہ روپوں کی بوریاں بندھی بندھائی آسمان سے چلی آئیں۔ تاریخ کی رُو سے یہ بوریاں رعایا کی محنت کی کمائی سے وصول کی گئی تھیں۔ اور ہر ادنےٰ و اعلےٰ پر ایک خاص ٹیکس اِس شاہی شوق کے لئے لگایا گیا تھا۔ جسطنین نے گو اِس عمارت سے اپنے مذہب کی خدمت کی اور اِس کی مستعدی اور سرگرمی اور موٹے موٹے کپڑے پہن کر اس کا درویشانہ اس خدمت کے لئے پھرنا۔ یہ سب چیزیں گویا ظاہر کرتی ہیں۔ کہ مذہب کی قوت اس سے یہ کام کرا رہی تھی۔ لیکن عمارت کی تکمیل پر جو کلمات اس کی زبان سے نکلے۔ وُہ یہ بھی ثابت کرتے ہیں۔ کہ مذہبی عقیدت کے ساتھ نمود کا شوق بھی اُس کے دل میں زور سے جوش زن تھا۔ یہ دیکھ کر کہ اِس عمارت کے ذریعے سے وُہ حضرت سلیمانؑ کے نام کی شان کو مات کرنا چاہتا تھا۔ اس کے مذہبی جوش کی قدر آدھی رہ جاتی ہے۔ تکمیلِ عمارت پر جو لفظ اُس نے استعمال کئے وُہ یہ ہیں۔ "خدا کا شکر ہے جس نے مجھے ایسے بڑے کام کے انجام دینے کے لائق سمجھا۔ اے سلیمان! میں تجھ سے سبقت لے گیا ہُوں"۔

اس زمانے میں اِس بات کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ کہ شانِ سلیمانی سے سبقت لے جانے کی کوشش میں جسطنین نے کتنا روپیہ خرچ کیا۔ مختلف بیانات ہیں اور مختلف رائیں۔ بعض نے لکھا ہے۔ کہ گرجے کی عمارت ابھی زمین سے دو ہاتھ بلند نہیں ہوئی تھی۔ کہ پینتالیس ہزار پونڈ یعنی چھ لاکھ پچھتر ہزار روپیہ صَرف ہو چکا تھا۔ اور کل خرچ تین لاکھ بیس ہزار پونڈ یعنی اڑتالیس لاکھ روپیہ ہُوا۔ بے جا تخمینہ نہیں۔ اور اُس وقت اشرفی کی جو قیمت تھی۔ اُس کو ذہن میں رکھ کر

حساب لگائیں۔ تو آج کل کے حساب سے اس کی لاگت اِس رقم سے کئی گنا زیادہ بیٹھتی ہے موجودہ صورت میں اِس کا اندازہ عقلاً دس لاکھ پونڈ یعنی ڈیڑھ کروڑ روپیہ کیا جاتا ہے۔

جسطنین کو چند دفعہ اپنی رعایا کے بعض لوگوں سے اس عمارت کے واسطے جسے وہ پہلی عمارت سے زیادہ وسیع بنا رہا تھا۔ زمین حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اس کی تحصیل کی نسبت عجیب روائتیں ہیں۔ ایک طرف ایک خواجہ سرائے کی زمین تھی۔ دوسری طرف ایک کفش دوز کی تیسری طرف انطیوکوس نامی دربان کا مکان اور چوتھی طرف ایک بیوہ بڑھیا کا گھر تھا نقشہ جو تجویز ہو چکا تھا۔ اُس کے مطابق یہ سب زمینیں درکار تھیں۔ خواجہ سرائے نے اپنی خوشی سے اپنی مِلک گرجے اور بادشاہ کی نظر کی کفش دوز اڑ بیٹھا۔ کہ میں نہیں دیتا۔ بڑی مشکل سے اِس شرط پر راضی ہُوا۔ کہ بادشاہ اصلی داموں سے دُگنے دام دے۔ اور اِس کے سوا گھوڑ دوڑ کے دن اُسے یہ حق عطا کرے۔ کہ اُس کے داخل میدان ہونے پر اُسی طرح خوش آمدید کے نعرے بلند ہوں جیسے خود قیصر کے لئے۔ قیصر نے یہ شرط منظور کر لی۔ اور اُس کا مکان لے لیا۔ دربان کی باری آئی۔ تو اُس نے بھی بیچنے سے عُذر کیا۔ اُس دربان کو گھوڑ دوڑ دیکھنے کا بیحد شوق تھا۔ بادشاہ کے ایک مشیر نے اُسے عین دوڑ کے وقت بند کر دیا وہ منتیں کرنے لگا کہ مجھے جانے دیجئے۔ مگر قیصر نے حکم دیا۔ کہ جب یہ مکان کے بیع نامہ پر دستخط کر دے۔ تو اسے جانے دیا جائے۔ یہ مرحلہ بھی اس طرح طے ہُوا۔ اب رہ گئی غریب بیوہ عورت۔ اس کے گھر کی قیمت کا اندازہ پچاسی پونڈ کیا گیا۔ اور بادشاہ نے اُسے پیغام بھیجا۔ کہ یہ رقم لے کر گھر خالی کر دے۔ اُس نے کہلا بھیجا۔ کہ میں بیچنا نہیں چاہتی اور جوش میں آکر پیغامبر کو کہا۔ کہ پچاس اشرفیاں تو کیا اگر تو پچاس قنطار سونے کے لائے جب بھی میں اپنا مکان نہ دُوں۔ بادشاہ پیغام سُن کر ناراض نہیں ہُوا۔ بلکہ خود اُس کے گھر گیا۔ اور اُس سے بہ منت درخواست کی کہ یہ زمین اس نیک کام کے لئے درکار ہے۔ مہربانی کر کے دیدے۔ اِس پر پیرزن آبدیدہ ہوگئی۔ اور اُس نے بادشاہ کے سامنے ادب سے دوزانو ہو کر عرض کی

کہ یہ ناچیز جائداد مجھ سے مُفت قبول کی جائے۔ اور اس کے عوض میں مجھ پر فقط یہ احسان ہو۔ کہ میری قبر اِس مقدس مکان کے ایک گوشے میں بنے۔ تاکہ مجھے اِس کا انعام آخرت میں ملے۔ بادشاہ نے بخوشی اِس شرط کو منظور کیا۔ اور کیا عجب ہے کہ ثواب کے دفتر میں اِس غریب بڑھیا کا ایثار جسٹینین کی لاکھوں اشرفیوں کے ثواب سے سبقت لے گیا ہو سہ

اگر بر پایٔ کُشند بہرام گورے ۔ نہ چوں پائے ملخ باشد زمورے

جہاں عیسائیوں میں اس واجب التعظیم مقام کی نسبت طرح طرح کے قصّے مشہور ہیں۔ وہیں مُسلمانوں کے ہاں بھی طرح طرح کی روایات اِس سے مربُوط ہو گئی ہیں۔ ایک روایت یہ ہے۔ کہ حضرت سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلم کے دُنیا میں تشریف لانے کے دِن صرف عجم میں قصرِ نوشیرواں ہی نہیں ہل گیا تھا۔ بلکہ مغربی دنیا میں عالیشان گرجے کی بنا بھی کانپ گئی تھی۔ اور اِس کا ایک حصّہ زلزلے سے گر گیا تھا مسجد کی ایک دیوار میں سُوراخ سا ہے۔ جس کی مٹی اَن پڑھ مسلمان عورتیں مُتبرک سمجھتی ہیں۔ میں نے چند فراجہ پوش عورتوں کو اُس سُوراخ میں انگلیاں ڈال ڈال کر اُس کی مٹی آنکھوں سے ملتے دیکھا۔ اس کے علاوہ وہ ہاتھ جو پتھر کے سُتونوں میں گڑا ہُوا ہے اور جس کی نسبت عیسائیوں کی روائتیں بیان ہو چکی ہیں۔ اس کی نسبت عوام اہلِ اسلام جو سُلطان محمّد فاتح کو قریب قریب ولیٔ کامل مانتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ کہ گرجا چونکہ قبلہ رُو نہ بنا تھا۔ اِس لئے اُسے جانبِ قبلہ کرنے کے لئے محمّد فاتح نے زور سے ایک ہاتھ مار کے اُس کا رُخ بدل دیا۔ اور یہ نشان اُس کے ہاتھ کا ہے۔ گویا اُس ہاتھ کو سُلطان محمّد فاتح کا ہاتھ ماننے میں مُسلمان اور عیسائی دونوں کی روایات متفق ہیں۔ صرف یہ فرق ہے کہ مُسلمان اِس کی وجہ کچھ اور بتاتے ہیں اور عیسائی کچھ اور۔

محرابِ مسجد کے قریب بڑے بڑے قلمی قرآن مجید رحلوں پر دھرے ہیں۔ آنے جانے والے اُن کی زیارت کر سکتے ہیں۔ اور بہت سے لوگ وہاں بیٹھے اُنہیں پڑھتے بھی رہتے ہیں۔ جس وقت مَیں اور میرے ہمراہی وہاں گئے۔ تو ایک غریب لڑکا حفظِ قرآن

میں مشغول تھا۔ ہم نے اُس سے کہا۔ کہ ذرا قرأت تو سناؤ۔ اُس نے نہایت عمدگی اور صحت سے پڑھ کر سُنایا جس سے ہم بہت محظوظ ہوئے۔

قرآن شریف کا جسے ہم سب حکمتوں کا خلاصہ مانتے ہیں۔ آیا صوفیہ میں پڑھا جانا ہمیں بہت موزون معلوم ہوا۔ کیونکہ صوفیہ کے معنے یونانی میں دانش و حکمت کے ہیں۔ اور یہ گرجا حکمت کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ اب جامع اسلامی بن گیا۔ تو بھی قرآن مجید کی بدولت کانِ حکمت رہا۔

بازارِ مُسقّف

بازارِ قدیم کی جو کہانیاں الف لیلہ میں ہیں۔ اُن کا نقشہ استانبول کے مُسقّف بازاروں کو دیکھ کر آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ بازار کیا ہیں بیسیوں بازاروں اور گلیوں کی ایک بھول بھلیاں ہے۔ اِس کے گرد مضبوط دیوار ہے اُوپر چھت ہے۔ اندر داخل ہونے کیلئے بہت سے دروازے ہیں۔ اور ہر دروازہ اور اُس کے سامنے کا بازار ایک خاص تجارت کے لئے مخصوص ہے کہیں زرگر ہیں۔ کہیں جوہری۔ کہیں بزّاز ہیں کہیں شال وقالین کے سوداگر۔ کہیں فرنگستان کا مال ہے۔ کہیں ایشیا کا۔ ایک طرف بروسہ کے ریشمی کپڑے اور خوبصورت تولیے رکھے ہیں۔ دوسری طرف ایران کے ظروفِ مسّی اور دیگر مصنوعات۔ ہر قوم کے سوداگر اس بازار میں ہیں اور قریب قریب دُنیا کی ہر زبان یہاں بولی جاتی ہے۔ عرب عربی بولتے ہیں۔ ایرانی فارسی۔ اِرمنی اور یونانی عیسائی اپنی زبانوں اور ترکی کے علاوہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی یا فرانسیسی یا جرمنی بولتے ہیں۔ بعض کئی کئی غیر زبانیں جانتے ہیں۔ رُوسی جاننے والے بھی موجود ہیں لیکن سب سے زیادہ مُروّج ترکی ہی ہے۔ اور اِسے اِس بازار میں کام کاج کرنے والے سب جانتے ہیں۔ بازار کی چھت پتھر کی ہے۔ اور بے شمار چھوٹے چھوٹے گنبدوں کا مجموعہ ہے۔ اِن گنبدوں میں دریچے ایسی ترکیب سے لگے ہیں۔ کہ روشنی صبح و شام بازار میں پہنچتی رہتی ہے۔ کچھ عرصہ ہوا لوہے کی مضبوط سلاخوں سے اُن گنبدوں کو سہارا دیا گیا ہے۔ کیونکہ ۱۸۹۴ء کے شدید زلزلے سے اِس بازار کا ایک حصّہ گر گیا تھا۔ اور

سینکڑوں جانیں تلف ہو گئی تھیں۔ اِس لئے احتیاطاً مُرمّت کے وقت لوہے کی کڑیوں سے چھت کو مضبوط کیا گیا۔ اور یہ بازار پھر ویسا ہی آباد ہو گیا جیسا زلزلے سے قبل تھا۔ لیکن مزے کی بات ہے۔ کہ بعض لوگوں کو اب تک اِس کے اندر جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ چنانچہ ہمارے ملاقاتیوں میں ایک صاحب اِس بازار سے بہت گھبراتے تھے۔ اور گھبرانے کی وجہ یہ بتاتے تھے۔ کہ وُہ زلزلے کے وقت بازار میں موجُود تھے۔ اور اتفاق سے بچ نکلے۔ مگر اُس دِن سے پھر اِس کے اندر نہیں گئے۔ ہم نے اُنہیں بارہا لیجانا چاہا لیکن وُہ جانے پر راضی نہ ہوئے۔

کہتے ہیں بہ نسبت سابق اِس بازار کی رونق میں کمی آگئی ہے۔ آج کل کچھ تو نئی یورپی چیزوں کے رواج سے یہاں گاہک کم آتے ہیں۔ کیونکہ تُرکی اُمراء کا رجوع پیرا کی یورپی دوکانوں کی طرف ہو گیا ہے۔ اور کچھ عام تموّل کی کمی کیوجہ سے بھی یہاں کی رَونق پہلی سی نہیں رہی۔ جنگ رُوس و رُوم کے وقت تک اِس میں قیمتی اشیاء کا لین دین بے انتہا تھا۔ اور ادنےٰ و اعلےٰ سب یہیں آتے تھے۔ ایک انگریز سیّاح جس نے اِس بازار کو اُس زمانے میں دیکھا ہے۔ اِس کی تعریف میں یُوں رطب اللسان ہے "وُہ دکانوں کی یہ مُسقّف قطاریں اگر سب جمع کر کے دیکھی جائیں۔ تو میلوں لمبی ہوں گی متحیّر سیّاح کی آنکھ بیچ بیچ بوجھ گلی سے اُن خوش منظر گلیوں کو دیکھتی ہے۔ جہاں دنیا بھر کی مصنوعات کی نمائش ہے۔ گھنٹہ بھر اِن گلیوں میں گھومتے رہیں۔ تو ایک جگہ دو دفعہ آنے کی ضرورت نہیں۔ اور اِس سارے عرصے میں آنکھ کہیں ہیروں پر پڑتی ہے کہیں سونے پر۔ کہیں کشمیر کے دوشالے ہیں اور کہیں چین کے ریشم۔ چمکتے ہوئے اسلحہ۔ مہکتی ہوئی خوشبوئیں مجلّا آئینے اور مُجلّا ظروف۔ زردوزی کے عجیب عجیب نمونے۔ مزیّن پاپوش۔ عنبر کے مہنال مُرصّع بجواہرات سب یہاں رکھے ہیں۔ کسی چھوٹی سی چھوٹی قطار کی طرف بھی دیکھو۔ تو دُنیا کا ہر رنگ اُن اشیاء میں موجُود ہے۔ جو وہاں نظر آتی ہیں۔ غرض یہ بالکل نرالا نظارہ۔ اُس کا شور۔ اُس کی حرکت اور اُس کی جدّت

جسے پہلی اسامی کو بالکل محوِ حیرت کر دیتی ہے ۔

اس زمانہ میں بہ اعتبار گراں بہا زر و جواہر پشمینے اور دوشالوں کی جگہ زیادہ تر سستے اور سستے مغربی مال نے لے لیا ہے ۔ اور یہ بازار اس تمام مال و متاع کا مالک ہونے کا فخر نہیں کر سکتا جس کا بیان ایسی مبالغہ [illegible] قدرتی ہے اس [illegible] نے لیا ہے۔ لیکن اب بھی اپنی قسم کے سب بازاروں سے جو بعض اور مقامات میں ہیں رونق پر ہے۔ قیمتی جواہرات ۔ سونے چاندی کے برتن ۔ ریشمی کپڑے اور کشمیری شالیں ۔ زردوزی کے اعلےٰ نمونے علی الاعتبار آج بھی اس میں مل سکتی ہیں ۔ اور ایسی دکانیں جو بظاہر بہت چھوٹی اور کم حیثیت نظر آتی ہیں ۔ لاکھوں روپوں کا مال رکھتی ہیں ۔ گاہک کے لئے اپنی جیب روپوں سے بھر کر جانے اور باہر کیسہ تہی آنے کے لئے اب بھی کافی سامان ہے۔ الوان گونہ گوں کی اب بھی وہی بہار ہے جو پہلے تھی اور آنے جانے والوں کی کثرت اور بھیڑ بھاڑ کا اب بھی یہ حال ہے کہ آدمی وہاں دن بھر بیٹھا سیر دیکھا کرے تو جی نہ بھرے ہر وضع اور ہر لباس کے لوگ سامنے سے گذریں گے۔ عورتیں بھی "فراجہ" پہنے سودا سلف لینے آتی ہیں۔ کہتے ہیں اب اُمراء کی عورتیں یہاں نہیں آتیں ۔ کیونکہ اُن کے استعمال کی چیزیں اِن دُکانوں میں نہیں ملتیں ۔ لیکن دُور سے آئے ہوئے مسافروں کو اس سے کیا غرض ۔ کہ اب جو عورتیں ہجوم میں انہیں نظر آتی ہیں طبقۂ اُمراء میں سے ہیں یا نہیں ۔ اُس کی نگاہ تصوّر کی مدد سے اِسی منظر میں جو پیشِ نظر ہے ۔ بغداد کی کہانیوں کی تصویر دیکھتی ہے ۔ اور وہ حیران ہوتے ہیں ۔ کہ مشرقی زندگی کا یہ دلچسپ نمونہ بیسویں صدی تک کس سخت جانی کے ساتھ زمانہ کی زد سے اپنے آپ کو بچائے ہوئے ہے ۔ اِس قسم کے بازار سب پُرانی قوموں نے اپنے اپنے ہاں بنائے تھے ۔ روما اور یونانِ قدیم میں یہ رسم تھی اور قسطنطنیہ میں شاہانِ بزنطائن کے عہد میں بھی یہ بازار تھا ۔ مسلمانوں نے اُسے اور رونق دی ۔ اب گو مذاقِ زمانہ بدل گیا ہے ۔ تاہم ایسے بازاروں کا شوق

کسی نہ کسی صورت میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ لنڈن میں بھی مُسقّف بازار دو ایک ہیں جنہیں آرکیڈ کہتے ہیں۔ گو بہت لمبے نہیں پھر بھی چھوٹے پیمانے پر اسی نمونہ کی تقلید ہیں۔ یورپ کے بعض اور شہروں میں مَیں نے لنڈن سے زیادہ لمبے مُسقّف بازار دیکھے ہیں۔ اس کے سوا یورپ کی بعض مقامی نمائشوں میں جو کئی کئی مہینے رہتی ہیں۔ اسی اصول سے کام لیا جاتا ہے۔ جس پر یہ پُرانے بازار قائم تھے۔ گویا یہ بازار ایسی نمائش کا کام دیتے تھے۔ جو ہمیشہ جاری رہے۔ شمالی ہندوستان میں جو نوچندی کے میلے اور نمائشیں ہوتی ہیں جہاں اسی طرح دُکانوں کی قطاریں حرفت وار لگتی ہیں۔ اور ہر پیشے کے لوگ ایک علیحدہ حصّہ اپنے لئے مخصوص کرلیتے ہیں۔ اُن کے وسیع میدانوں پر اگر ایک نہایت بڑا شامیانہ تان کر عارضی سقف کا کام لیا جائے۔ تو ایک صورت استانبول کے اُس بازار کی اُن میں پیدا ہو جائے۔ موجودہ زمانہ میں جو مارکیٹ بڑے بڑے شہروں میں بنی ہیں۔ وُہ بھی اسی قسم کی چیز ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے۔ کہ مارکیٹ میں زیادہ تر روزمرّہ کی ضروریات اور کھانے پینے کی چیزیں یکجا فروخت ہوتی ہیں۔ اور کپڑوں وغیرہ کے لئے کہیں کہیں ایک حصّہ الگ ہوتا ہے بخلاف اس کے اِن بازاروں میں کپڑے اور زیور اور سامانِ آرائش سب یکجا مہیّا ہیں۔ اور کھانے پینے کے لئے چند دُکانیں ہیں جہاں اِس بازار کے مُشتری تفریح کی غرض سے جاتے ہیں۔

جس کسی کو استانبول کے خاص مذاق کی چیزوں کے چکھنے کا شوق ہو جنہیں عثمانی بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ تو بڑے بازار کی دُکانوں میں اُن کے عمدہ نمونے مل سکتے ہیں۔ سوتلیج یعنی کھیر۔ محلّبی یعنی فیرینی کی کئی دُکانیں اِس بازار میں ہیں۔ ہندوستان کے فالودہ یا فیرینی بیچنے والوں کی دُکانوں سے کسی قدر مختلف ہیں۔ دُکان کے دروازہ پر ایک پردہ لٹک رہا ہے۔ اندر جائیں۔ تو سنگِ مرمر کے میز اور اُن کے ساتھ کُرسیاں یا مخملی گدّے دار بینچ موجود ہیں۔ آرام سے بیٹھ کر کھائیے۔ اگر زیادہ دیر بیٹھنا ہو۔ تو دُکاندار ایک آدھ روزانہ اخبار بھی آپ کے دل بہلانے کو پیش کر دیتا ہے۔ کئی دُکانوں میں عورتوں کی نشست

کے لئے علیحدہ کمرہ بنا ہے۔ وُہ آتی ہیں اور اُس کا پردہ اُٹھا کر اندر چلی جاتی ہیں۔ یہ گویا مرد خریداروں سے علیحدگی ہے۔ ورنہ اُنہیں دُکاندار سے پردہ نہیں۔ کیونکہ اندر وُہ نقاب اُلٹ کر بیٹھتی ہیں۔ اور کھاتی پیتی ہیں۔ اور دُکاندار برابر آتا جاتا رہتا ہے۔ جس سے اُس صُورت میں پردہ نہیں ہو سکتا۔

بازار کے وسط میں ایک حصّہ ہے۔ جہاں پُرانے اسلحہ اور دیگر انطیق اشیاء بکثرت رکھی ہیں۔ اِس حصّہ کو بزستان کہتے ہیں۔ اور اسی لئے اِس بازار کو بعض اوقات ترکی میں بزستان چارشی یعنی بزستان والا بازار کہتے ہیں۔ چارشی غالباً وہی لفظ ہے جو فارسی میں چارسُو ہے۔ اور ہمارے "چوک" کا مترادف ہے۔

شام کو یہ اور اس قسم کے سب بازار بند ہو جاتے ہیں۔ اِس لئے اِن کی سیر کا بہترین وقت دوپہر سے ذرا بعد ہے۔

اِس بازار کے نواح میں جو کھلے بازار ہیں۔ وُہ بھی بہت آباد ہیں۔ اور اس کی رونق کی زیادتی کا باعث ہیں۔ مگر بعض چھوٹے چھوٹے مُسقّف بازار اور بھی اسی قُرب وجوار میں واقع ہیں۔ اِن میں ایک بازار ہے۔ جہاں پُرانے کپڑے اور ارزاں چیزیں فروخت ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن چھوٹے بازاروں میں سب سے دلچسپ مصر چارشی ہے۔ جہاں مُشک وعنبر وعطریات۔ یونانی دوائیاں اور ہر طرح کے خشک میوے اور مصالح بکتے ہیں۔

اکثر بڑے بڑے مشرقی شہروں میں کُل دُکانداروں کی جو عادت ہے۔ کہ اپنی اشیاء کے دام اصل سے بہت بڑھا کر مانگتے ہیں۔ اور مُسافر کو لُوٹنے میں تأمل نہیں کرتے ہیں۔ وُہ یہاں بھی موجُود ہے۔ اُس ہر اجنبی کیلئے جو اِن بازاروں سے کچھ تحفے خریدنا چاہے لازم ہے کہ یا تو اپنے ساتھ کوئی باخبر رہبر رکھے جو ترکی زبان بھی جانتا ہو۔ اور یا کئی جگہ سے بھاؤ پُوچھنے اور نرخ کے مقابلہ کرنے کے بعد خریداری کرے۔ اُن دُکانداروں میں بعض ارمنی اور یونانی خصوصیت سے دھوکا دینے میں مشّاق ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے اکثر سیّاح جنہیں بیشتر عیسائی رہبروں کی وجہ سے زیادہ تر اُنہی سے سابقہ پڑتا ہے استانبول کے دُکانداروں کی نسبت اپنی رائے انہیں کی عادات کے مشاہدے سے قائم کرتے ہیں۔ وُہ اِن میں اور عثمانیوں میں آسانی سے تمیز نہیں کر سکتے۔

خان والدہ

بڑے مسقّف بازار کے قریب ایرانیوں کی تجارت کا مشہور مرکز خان والدہ ہے۔ یہ پُرانی کاروانسرائے ہے جس میں اب ایرانی تجار مستقل طور پر مقیم ہیں۔ اور اُن کا کاروبار بیشتر اِسی احاطے کے اندر ہوتا ہے۔ استانبول کی خصوصیتوں میں ایک یہ بھی ہے کہ اس میں کاروانسرائیں بکثرت ہیں۔ انہیں یہاں خان کہتے ہیں۔ اور ان کی تعداد چھوٹی بڑی ملا کر دو سو کے قریب ہے۔ ان کے نام عموماً اُن کے بانیوں کے نام سے لئے گئے ہیں۔ اور پُرانے زمانے میں استانبول کی تجارت کی ترقی کے اسباب میں ایک بڑا سبب یہ تھا۔ کہ مسافر تاجروں کو جو دنیا کے ہر گوشے سے اس بڑی منڈی کی طرف رُخ کرتے تھے۔ اِن مکانات میں ہر طرح سے آرام ملتا تھا اُن کی ساخت اسی ڈھنگ پر ہے جو ہندوستان کی کئی پُرانی سرائوں کی تعمیر میں برتا گیا یعنی چھوٹے چھوٹے حجروں کی قطار چاروں طرف ہے۔ اور عمارت میں لکڑی سے کام نہیں لیا گیا اینٹ اور چونے یا پتھر اور چُونے کی عمارت ہے۔ اور گنبد دار چھت ہے۔ وسط میں صحن ہے۔ اِن سرائوں میں رہنے کے لئے مذہب و ملت کی کوئی قید نہ پہلے تھی۔ نہ اب ہے۔ اور اس وقت بھی کئی سرائیں ایسی ہیں جن میں بخارا اور سمرقند تک کے لوگ ایشیا سے عرب اور حبشی افریقہ سے آکر مقیم ہوتے ہیں۔ ایک کوٹھڑی کرایہ پر لی۔ وہاں اسباب رکھا۔ اور کھانا کھانے بازار چلے گئے۔ روسی مسلمان جو حج کو جاتے وقت ادھر سے گذرتے ہیں۔ اُن میں بھی جو غریب طبقہ کے لوگ ہوتے ہیں۔ وہ انہیں سرائوں میں قیام کرتے ہیں۔ لیکن یہ عمارتیں آج کل زیادہ تر

تاجروں کے گودام وغیرہ کے لئے استعمال کیجاتی ہیں۔ اور ان میں سے بعض تجار کی کسی خاص جماعت کے لئے مخصوص ہوگئی ہیں۔ اِس آخری قسم میں کوئی عمارت خان والدہ سے زیادہ آباد اور پُر رونق نہیں ہے۔

استانبول سے باہر لوگوں کو عام طور پر یہ معلوم نہیں کہ اس عثمانی پایہ تخت میں ایرانی کس قدر آباد ہیں۔ اُن کی تعداد چالیس پچاس ہزار کے قریب ہے۔ اور صرف بعض اپنی اپنی جگہ اچھی حالت میں ہیں جو بالکل غریب اور بے ہُنر ہیں۔ وُہ مزدوری پیشہ ہیں اور حمالوں میں مزدوروں میں ملے جُلے کام کرتے ہیں۔ یہاں رہتے رہتے تُرکی سے سب آشنا ہوگئے ہیں۔ اور ترکی ٹوپی پہنے رہتے ہیں۔ اِس لئے آسانی سے تمیز نہیں ہو سکتے۔ لیکن کسی کو فارسی میں بات کرتے سُنیں تو خود بخود متوجہ ہو جاتے ہیں اُن سے اوپر جو طبقہ ہے۔ وُہ خوانچے والے ہیں کوئی میوہ بیچتا ہے۔ کوئی مٹھائی لیکن اکثر چائے پلانے کا کام کرتے ہیں۔ ایک بڑی سی سماوار ہر وقت گرم رہتی ہے۔ اور ایک طاق میں چھوٹے چھوٹے بلوّری گلاس رکھے رہتے ہیں۔ اُن میں بے دُودھ کی چائے یہ لوگ بیچتے ہیں۔ ہر ایرانی مزدُور صبح کو کام پر جاتے ہُوئے اُن کے پاس بیٹھ کر پیسے دو پیسے کی چائے پی جاتا ہے۔ اور یہ لوگ اِس ذریعے سے اپنا معقول گُذارہ کر لیتے ہیں۔ اِن کے اُوپر ایرانی دُکاندار ہیں جن میں سے اکثر خُشک پسا ہُوا قہوہ بیچتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ بساطی کی دُکان کرتے ہیں لیکن اِس گروہ کے سوا جسے استانبول کے ایرانیوں کا طبقۂ عوام کہنا چاہیئے۔ ایک معقول طبقۂ خواص ہے جس میں کئی لکھ پتی تاجر ہیں جن کی تجارت دُور دُور تک ہے۔ وُہ ایران کا مال استانبول میں بیچتے اور استانبول کا ممالکِ غیر میں بھیجتے ہیں۔

استانبول کی بیرُونی تجارت کا وُہ حِصّہ جو عیسائی اور یہودی تجّار سے بچ رہتا ہے۔ بیشتر انہیں کے ہاتھ میں ہے۔ کیونکہ عثمانیوں کو تا حال تجارت سے کچھ مناسبت نہیں۔

ایرانیوں کے لئے یہ بات بیشک قابلِ تحسین ہے۔ کہ وُہ وطن سے اتنی دُور محنت اَور سعی سے معقول روزی پیدا کرتے ہیں۔ اَور اپنے آپ کو اور اپنے بھائیوں کو نفع پہنچاتے ہیں خان والدہ کے اندر جائیں۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ دفعتاً روم سے ایران جا پہنچے۔ ایرانیوں کی حُبِّ وطنی نے اُسے ایران کا ایک چھوٹا سا خِطّہ بنا رکھا ہے ذہین اَور خوش مذاق نوجوان لوگ باطبع ہوتے ہیں۔ اَور ان کا مذاق ان کی طرزِ بود و باش سے نمایاں ہے۔ ہر ایک نے اپنے کمروں کے آگے درخت لگائے ہیں۔ انگور کی بیلوں سے برآمدے سجائے ہیں۔ اَور موسم گرما میں شام کے قریب چھڑکاؤ وغیرہ کر کے اُن درختوں کے سائے میں ہر ایک اپنی اپنی محفل گرم کرتا ہے۔ یہ لوگ نہی کھاتے کے کپڑے نہیں اَور نہ روپیہ حاصل کرنے کی دُھن میں دُنیا کے اَور سب شوقوں سے بے پرواہ ہیں۔ تاجر ہیں مگر ذی علم اَور علم دوست۔ شام کو جب کاروبار سے فارغ ہو کر بیٹھتے ہیں۔ تو اُن کے ہاں علم و فن اَور شعر و سخن کا چرچا ہوتا ہے۔

مجھے خان والدہ میں جانے کا کئی مرتبہ اِتفاق ہُوا محض شوقِ سیر تو ایک دفعہ لیجاتا مگر مرزا محسن اصفہانی معتمد التجار اَور حاجی زین العابدین مراغہ کی دوستانہ کشش کئی بار کھینچی مجھے اِن بزرگوں سے ملنے کا اتفاق دولتِ عالیہ ایران کے سفیر پرنس ارفع الدّولہ کے یہاں ہُوا۔ شاہِ ایران کی سالگرہ کے جشن کے دِن شریکِ جشن ہونے کو مدعو تھا۔ اَور اُس دن استانبول کے سب اکابر سفارت خانہ میں جمع تھے۔ میں نے وہاں اثنائے گفتگو میں جو اتحادِ اسلام کا ذِکر کیا۔ تو مجھے یہ دیکھ کر بے انتہا مسرت ہوئی۔ کہ جلسے کے بعد اکابر ایران میں سے کئی اصحاب نے بڑے زور سے اُس خیال کی تائید کی۔ اَور کہا۔ کہ موجودہ زمانے میں اسلام کی حفاظت اِسی صورت میں ممکن ہے۔ کہ مسلمانوں کے سب فرقے اپنے جُزوی اختلافات کو بُھلا کر ایک دُوسرے کی بھلائی کے لئے ساعی ہوں۔ اَور بھائی بھائی ہو جائیں۔ حاجی زین العابدین ایک مُسن بزرگ ہیں۔ جنہوں نے مدّت سے اپنی تحریروں

میں آزادانہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اور جن کی روشن خیال تحریروں سے سینکڑوں لوگ ایران میں روشن خیال ہو گئے ہیں۔ مرزا محسن صفہانی نوجوان ہیں اور حاجی صاحب کے ہمخیال۔ ان دونو صاحبوں نے مجھ سے میرا پتہ نشان دریافت کیا۔ اور دوسرے دن ہوٹل میں مجھ سے ملنے آئے۔ اس کے بعد میں باز دید کو گیا۔ پھر ایک دن معتمد التجار نے خان والدہ میں شام کے کھانے پر بلایا۔ اور اُس دن اہل ایران میں سے منتخب اور سرکردہ لوگ وہاں موجود تھے۔ اُس شب کی مجلس دیر تک نہ بھولے گی۔ اسی طرح وہ مجلس بھی بھلنے کی نہیں جو پھر ایک دن حاجی صاحب کے ہاں دعوت کے موقعہ پر ہوئی۔ لیکن وہ خان والدہ سے باہر تھی۔ اس مجلس میں علماء بھی تھے۔ اور رؤسا بھی۔ نئی روشنی کے لوگ بھی اور پرانی تعلیم کے تربیت یافتہ بھی۔ مذہبی تمدنی سیاسی سب قسم کے معاملات پر گفتگو ہوتی رہی۔ اور مجھے یہ دیکھ کر کہ سب مسائل پر اُن اصحاب کے خیالات معقول اور مناسب تھے بہت خوشی ہوئی۔ اور میں نے دل میں کہا۔ کہ اگر ایران میں اہل ایران کا کوئی معتد بہ حصہ ان خیالات میں رنگا جا چکا ہے۔ تو سمجھنا چاہئے۔ کہ ایران کے بھلے دن آنے والے ہیں۔

مذہبی تمدنی اور سیاسی معاملات پر اُن آرائے کا خلاصہ جو میں نے اس مجلس میں سُنیں۔ تین مختصر جملوں میں ہو سکتا ہے :-

۱۔ سُنی اور شیعہ کا جھگڑا اب ختم ہو جانا چاہئے۔ ورنہ دونو مِٹ جائیں گے۔ اپنے اپنے عقائد پر ہر شخص اپنے اپنے گھر عمل کرے۔ لیکن دنیاوی ترقی اور باہمی حمایت اور مُروّت کے راستے میں عقائد کو حائل نہ ہونے دے۔

۲۔ تمدن میں بعض اصلاحات ضروری ہیں۔ لیکن اُن میں اعتدال اور میانہ روی سے کام لینا چاہئے۔ مثال کے طور پر مسئلہ تعلیم نسواں لیجئے اس پر یہاں تک تو نئے پرانے سب متفق تھے۔ کہ تعلیم نسواں لابُد ہے۔ صرف اس بات میں اختلاف تھا۔ کہ کس حد تک تعلیم نسواں ہونی چاہئے۔ کثرت رائے یہی تھی۔ کہ مردوں کے مساوی

تعلیم ضروری نہیں کیونکہ مرد اور عورت کے فرائض جداگانہ ہیں۔

۳۔ سیاسی معاملات میں رعایا کے حقوق کی حفاظت اور رعایا کے انتظام میں شرکت اس زمانے میں نہایت ضروری ہے۔ اس کے بغیر کوئی قوم دیگر اقوام متمدنہ کے مقابلے کی تاب نہیں لا سکتی اس بارے میں وہ سب ایران میں پارلیمنٹ کی بنیاد پڑنے پر خوش تھے۔ اور اس کی کامیابی کے ساتھ اپنی ترقی کی سب امیدیں وابستہ سمجھتے تھے۔

سب سے ضروری اور حوصلہ بڑھانے والی بات وہاں یہ دیکھی کہ علماء ان خیالات سے موافقت کرتے تھے۔ اور فخر یہ کہتے تھے۔ کہ ایران میں جو سیاسی آزادی کی ابتدا ہوئی ہے اس کے بانی اور بڑے محرک علماء ہی ہیں۔ اور یہی لوگ رعایا کی طرف سے حقوق مانگنے کے لئے سینہ سپر ہو کر کھڑے ہوئے ہیں حقیقت میں علماء میں اور خصوصاً ایران کے علماء کی حالت میں یہ انقلاب کچھ معمولی انقلاب نہیں ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے۔ کہ اگر یہ با اثر طبقہ کسی خیال یا رائے کے موافق ہو جائے۔ تو اصلاح میں کس قدر آسانی ہوتی ہے۔

خان والدہ کی صحبتوں کی یہ گرمی ماہ مبارک محرم میں مبدل بہ مجلس عزاداری ہو جاتی ہے صحن کے وسط میں ایک مسجد ہے۔ اس کے قریب شامیانے لگا کر عزاخانہ بنایا جاتا ہے۔ اور اس میں محرم میں مرثیوں کی مجالس کے علاوہ پُرجوش ماتم ہوتا ہے جس سے دیکھنے والوں کے دل ہل جاتے ہیں۔

معزز ایرانی عموماً استانبول میں بھی اپنے ملک کا لباس پہنتے ہیں۔ یا اگر اور کچھ نہیں۔ تو کم از کم ٹوپی ایرانی ہوتی ہے۔ یعنی اونچی دیوار کی سیاہ بانات کی ٹوپی جو ہمارے ہاں ہندوستان میں بھی بعض جگہ مروج ہے۔ اور خان والدہ میں کئی پرانی وضع کے ایرانی اپنے گھیرے دار چُنے ہوئے کوٹ بھی پہنے تھے۔

ہیں۔ شہر کے اِس حصّے میں کئی ایرانی نان پز بھی بستے ہیں جو ایرانی روٹی بیچتے ہیں۔ غرض اِس قدیم عمارت کے اندر اور اِس کے قُرب و جوار میں ایران کا سماں آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ افسوس کہ قدیم ہونے کے سبب اِس کے بعض حصّے اب خطرناک ہیں۔ چنانچہ ایک حِصّہ ہمارے قیامِ استانبول کے زمانے میں ایک رات کو اچانک گِر گیا۔ رات کو چونکہ لوگ وہاں کم رہتے ہیں۔ اور وُہ حِصّہ اتفاق سے خالی تھا۔ اِس لئے یہ خیریت رہی کہ جانوں کا نقصان نہیں ہُوا۔ اب جب وُہ از سرِ نو بنایا جائے گا۔ تو نئی عمارتوں کی طرز پر بنے گا۔ زمانہ اسی طرح ہر دور میں ہر جگہ تبدیلیاں کرتا رہتا ہے۔ جو پُرانی چیزیں باقی ہیں۔ وُہ غنیمت ہیں۔ اُن کو دیکھ کر عہدِ رفتہ کی کہانیاں یاد آتی ہیں۔ اور اُس وقت کے تمدّن کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے۔
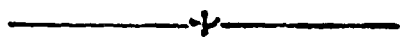
جامع ایوبؓ وہفت بروج

جامع ایوب شہر کی بڑی بڑی عمارتوں سے فارغ ہو کر فصیل قدیم کے باہر نکلیں۔ تو سب سے مقدم قابلِ دید جامع ایوبؓ ہے حضرت ایوبؓ انصاری سا مقرب صحابی جس قطعۂ زمین میں مدفون ہو۔ اس سے جو ارادت مسلمانوں کو ہونی چاہیئے وہ ظاہر ہے اُن کا عربوں کے حملۂ اول کے ساتھ۔ شہر کے گرد محاصرہ کیئے پڑے رہنا اور آخر یہیں بیمار ہو کر رحلت فرمانا تو تاریخوں میں مذکور ہے۔ لیکن فتح قسطنطنیہ سے پہلے عثمانیوں کو اُن کے مزارِ مبارک کا ٹھیک نشان نہیں معلوم تھا۔ اتنا سنتے تھے۔ کہ شہر کے باہر فصیل سے تھوڑے فاصلہ پر فلاں گوشے میں مدفون ہیں۔ شیخ شمس الدین (ابیض) نے جو عہد سُلطان فاتح میں ولیٔ کامل مانے جاتے تھے۔ سُلطان کو مژدۂ فتح دیا اور کہا۔ کہ حضرت ایوبؓ انصاری کے مزار کا نشان اُنہیں خواب میں بتایا گیا ہے۔ اِس نشان کے مطابق سُلطان محمدؒ فاتح نے مزار تعمیر کرایا۔ اور اِس کے ساتھ ایک شاندار مسجد بنوائی۔ یہ مسجد باوجود دُور ہونے کے استانبول کی آباد ترین مساجد میں سے ہے اور اِس مزار کی وجہ سے جو فروغ اور شہرت اسے حاصل ہے وہ مزید برآں۔ ہر روز ایک میلہ سا لگا رہتا ہے۔ اور جمعہ کے دن تو زائرین کی جن میں ہر طبقے کے زن و مرد شامل ہوتے ہیں۔ بہت ہی کثرت ہوتی ہے۔

استانبول میں ہر کہ ومہ اِس مقام کو مقدس سمجھتا ہے۔ اِسی تیمن اور تبرک کے خیال سے سلاطین اسلامیہ کی تاجپوشی پر نیا بادشاہ یہاں آتا ہے۔ اور باقی خاندان

سلطان عثمان غازی کی تلوار اپنے کمربند میں لٹکاتا ہے۔ اِس احاطے میں اور اس کے قریب مدفون ہونے کی سب کو آرزو رہتی ہے۔ اور جن لوگوں کو اس قبرستان میں اپنے خاندان کی قبروں کے لئے تھوڑی سی زمین میسّر آجائے وُہ اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھتے ہیں۔ پُرانے زمانے کے وُزراء اور اراکین دولت بیشتر اِسی قبرستان میں سو رہے ہیں۔ اور اِس سبب سے یہ علاقہ مسلمانوں کو اَور بھی عزیز ہو گیا ہے۔ اِس کے گرد چھوٹی سی آبادی ہے جو شہر سے جُدا ہے۔ یہ آبادی ساری مسلمانوں کی ہے۔ کیونکہ اِس مزار اور جامع کی تعظیم یہاں تک کی جاتی ہے۔ کہ غیر مذہب کے لوگوں کو نہ مسجد میں آنے کی اجازت ہے۔ نہ اِس علاقہ میں زمین یا مکان خریدنے کی۔

استانبول سے جامع ایوّب کو جانے کے کئی راستے ہیں۔ مگر سب سے آسان اور مقبُول راستہ یہ ہے۔ کہ بڑے پُل سے کشتی میں بیٹھ گئے اور عین جامع ایوّب کے سامنے جا اُترے۔ اُترتے ہی ہندوستان کے مشہور اولیا کی درگاہوں کا نظارہ یاد آتا ہے۔ احاطۂ مسجد کے باہر ایک بازار سا بن گیا ہے۔ جہاں دورویہ کچھ عارضی کچھ مُستقل دُکانیں لگی ہیں۔ نان بائی نان اور کباب بیچ رہے ہیں۔ کہیں دُودھ دہی کی دُکان ہے۔ کہیں سستی مٹھائی کی۔ کہیں میوہ فروش ہے کہیں گُل فروش۔ زائر آتے جاتے اِن دُکانوں میں بیٹھ کر آرام کرتے اور کھاتے پیتے ہیں۔ جُمعہ کے دِن بھیڑوں اور دُنبوں کے گلّے بھی اِس جگہ کے قریب کھڑے رہتے ہیں۔ کیونکہ اکثر لوگ اُس دن کسی نہ کسی آرزو کے پُورا ہونے کی منّت بڑھاتے اور قُربانی کرتے ہیں۔ گوشت وہیں غُربا اور فقراء میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ سائلوں کی بھی ویسی ہی کثرت رہتی ہے جیسے ہندوستانی خانقاہوں پر۔ اور چونکہ ہر شخص یہاں خیرات اور عبادت کے لئے تیار ہو کر آتا ہے۔ اِس لئے سائل عموماً یہاں سے محروم نہیں پھرتے۔

مَیں اِس مزار مبارک اور اِس جامع شریف کی زیارت کو ایک جُمعہ کے دِن گیا۔

اس مزار پر کئی تُربت دار شعین ہیں۔ اور اُن میں سے ہر ایک اپنے اپنے دِن باری باری سے حاضر رہتا ہے۔ اور اُس دن کی فتوحات اس کے حصّے میں آتی ہے۔ جس دن ہم وہاں گئے۔ اُس دِن حافظ علی حلمی آفندی کی نوبت تھی۔ وُہ نہایت التفات سے پیش آئے۔ ایک کنواں مزار کے گوشے میں ہے۔ جس کا پانی عورتیں آنکھوں کو لگاتی ہیں۔ اور لوگ تبرّکاً لے جاتے ہیں۔ حافظ صاحب موصوف نے اپنے ہاتھ سے وُہ پانی ہمیں پلایا۔ قرآن مجید کے قلمی نسخے جو وہاں رکھے ہیں دِکھائے۔ اور ہماری التماس دُعا پر ہاتھ اُٹھا کر دیر تک دُعا کی۔ اِس کے بعد جامع مسجد میں ہم نے دیکھا۔ کہ اِس مسجد میں تُرکی عورتیں نماز کے لئے بکثرت آتی ہیں۔ اور بعدِ نماز مسجد کے ایک گوشہ میں جو لوہے کی جالی کے ذریعہ باقی حصّے سے علیحدہ کیا ہُوا تھا۔ عورتوں کی ایک جماعت وعظ سُننے کے لئے بیٹھ گئی۔ اور وہاں ایک مولوی صاحب دیر تک وعظ کہتے رہے۔

استانبول میں جابجا آبادی کے ہر حِصّے میں نئے زمانے کے رسم و رواج کی قبولیت کے آثار نظر آتے ہیں۔ اور یورپ کا رنگ کم و بیش ہر طبقے پر اپنا اثر دکھا رہا ہے۔ مگر یہ حِصّہ اُس اثر اور اُن نشانات سے خالی ہے۔ یوروپ کے اِس کونے میں ایشیا کی قدامت اپنا لازوال ہونا ثابت کر رہی ہے۔ یورپ کے سیّاح جب یہاں کے ہجوم دیکھتے ہیں۔ یا اِس علاقہ کے اردگرد کے شہر خموشاں کی سیر کرتے ہیں۔ تو وُہ اُس سے مُتاثر ہُوئے بغیر نہیں رہتے۔

کشتی کے راستے کے سوا ایک اور راستہ جامع ایّوبؑ کو جانے کا ہے۔ جو پانی کے راستے سے زیادہ دلچسپ ہے۔ کشتی پر جانے سے اتنا لُطف ضرور ہے۔ کہ سمندر کے اُس بازو کا جو خشکی کی طرف پھیل کر استانبول کی رونق کا باعث ہُوا ہے اور شاخ زرّیں کہلایا ہے۔ اختتام پر نظر آجاتا ہے۔ لیکن خشکی کے راستے جائیں۔ تو یدی قلہ اور اور شہر کی قدیم دیواریں اور کئی پُرانے قلعے بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ اور اِس لحاظ

سے یہ راستہ قابلِ ترجیح ہے۔ یدی قلّہ خود تاریخی چیز ہے۔ یہ جامع ایوب کی طرح سلطان محمد فاتح کی نشانی ہے۔ اور پھر اس سے آگے دیوارِ شہر کے ساتھ ساتھ چلیں تو دائیں ہاتھ دیوار چلی جاتی ہے اور بائیں طرف قبرستان کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جو برابر جامع ایوب تک چلا گیا ہے۔

یدی قلہ | اب جہاں یدی قلّہ ہے۔ وہاں مسلمانوں کے عہد سے پہلے بھی ایک قلعہ نما عمارت تھی جس کے پانچ برج تھے۔ فتح کے وقت وہ مٹنے کے قریب تھی۔ سلطان فاتح نے از سرِ نو وہاں ایک مضبوط عمارت بنائی جس کے سات برج تھے۔ اس عمارت میں خزانہ سرکاری رہا کرتا تھا۔ اور پھر ایک مدت تک اس سے شاہی زندان خانہ کا کام لیا گیا۔ لندن میں جو کام لندن کے مشہور ٹاور اور پیرس میں وہاں کے باسٹیل سے لیا گیا۔ وہ کام قسطنطنیہ میں یدی قلّہ یعنی ہفت برج کے سپرد تھا۔ کئی مشتبہ اُمرا وہاں مقید رہے۔ اور مارے گئے۔ ایک سلطان وہاں مقتول ہوا۔ ممالکِ غیر کے لوگ وہاں محبوس ہوتے تھے۔ ایک عرصہ تک یہ دستور رہا۔ کہ جب ترکوں میں اور کسی دوسری سلطنت میں جنگ ہو جاتی تھی۔ تو اس دولت کا سفیر یدی قلہ میں قید کر دیا جاتا تھا۔ آخری سفیر جو وہاں قید ہوا۔ فرانسیسی سفیر تھا۔ لیکن پھر جب معاہدات کی رُو سے سفرا ہر حالت میں ایسے سلوک سے بری قرار دیئے گئے۔ تو یہاں سے بھی یہ دستور اٹھ گیا۔ اس عمارت کے تین برج گر گئے ہیں۔ اور اب صرف چار باقی ہیں۔ مگر پرانا نام چلا آتا ہے۔

ہفت برج پر گویا قدیم شہر کی حد ختم ہوتی ہے۔ شہر سے باہر نکل کر مزارِ ایوب کی طرف چلیں تو پرانے دروازے بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ سب سے پہلے توپ قپو یعنی توپ والا دروازہ ہے۔ مسلمانوں سے قبل یہ رومانس دروازہ تھا۔ کیونکہ اس کے قریب سینٹ رومانس کا گرجا واقع تھا۔ اسی دروازہ پر محمد

فاتح کی بڑی توپ نے متواتر گولہ باری کی تھی۔ توپ قپو کے بعد ادِرنہ قپو یعنی اڈریانوپل دروازہ آتا ہے۔ توپ قپو سے لے کر ادِرنہ قپو تک کی دیوار نہایت شکستہ ہے۔ آخری شدید زلزلے نے اس مضبوط دیوار تک کی بنیاد تک ہلادی۔ اِسی دروازے کے اندر مِہر ماہ کی مسجد ہے۔ جس کے زلزلے سے تباہ ہو جانے کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ لیکن ایک اَور مسجد قابلِ دید اِس دروازے کے اندر رہ گئی ہے۔ جسے ہم دیکھ سکتے ہیں۔ اِس کا نام قعریہ مسجد یعنی نشیب والی مسجد ہے۔ یہ ہے تو چھوٹی سی۔ مگر کوئی یورپین سیاح ایسا نہ ہوگا۔ جو اِسے دیکھے بغیر جاتا ہو۔ کیونکہ پہلے یہاں گرجا تھا۔ اَور گرجے کے زمانے کی تصویریں سقف اَور درودیوار پر اب تک موجود ہیں۔ تصویریں موزایک کے کام کا عمدہ نمونہ ہیں۔ اندرونی حِصّے کی تصویریں جہاں نماز پڑھی جاتی ہے۔ لکڑی کے تختوں سے ڈھانپ دی گئی ہیں۔ لیکن باہر کے حِصّے میں جو اب ڈیوڑھی کے طور پر مستعمل ہے تصویریں کھُلی رہتی ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریم کی تصویروں کے علاوہ کئی تصویریں انجیل کے عہدِ عتیق یعنی توریت اَور دیگر صحف کے قصص سے لی گئی ہیں۔

غرض اِس نواح میں یدی قلّہ سے لے کر جامع ایُّوب تک شہر کے درودیوار تاریخی حکایات کا ذخیرہ ہیں۔ اَور فصیلِ شہر کے باہر ایک سنّاٹا اَور ہُو کا عالم ہے۔ وہاں وُہ لوگ لیٹے ہیں۔ جو اِن تاریخی انقلابات کے معرکوں میں شریک تھے۔ اب وُہ مصائبِ دُنیا سے فارغ ہو کر چین کی نیند سو رہے ہیں۔ اَور بلند قامت سَرو اُن کی پاسبانی کر رہے ہیں۔ ہر رہگذر پر فرض ہے کہ مسلمان ہے۔ تو بہ نظر ثواب یہاں فاتحہ پڑھتا جائے۔ اَور کسی اَور مِلّت کا ہے تو ادب سے چُپ چاپ گزر جائے۔ کیونکہ سب کو ایک دِن خاک میں مِلنا ہے۔ اَور اِس لئے خفتگانِ خاک جو ہم سے پہلے منزل پر پہنچ گئے ہیں۔ ادب کے مستحق ہیں۔ شاید

یہاں کے قبرستانوں میں جو اَور درختوں کی جگہ سرو کے درخت لگانے کا رواج ہے۔ اس میں بھی یہی مصلحت ہو۔ کہ سرو ہر وقت خاموش ادب سے کھڑا رہتا ہے۔ اَور جب ہوا زور سے چلے۔ تو بھی اِس کی پتّیوں میں کھڑکھڑاہٹ نہیں ہوتی۔ شہرِ خموشاں کی خموشی اِستانبول کے ان بڑے قبرستانوں میں اپنا درجۂ کمال حاصل کئے ہوئے ہے۔ کہیں کہیں کسی خوش نصیب کی قبر پر پس ماندگان کی محبّت نے پھول اُگا دیئے ہیں۔ اَور عالمِ خموشی میں اُس کی قبر زبانِ حال سے کہہ رہی ہے۔ ؎

اے صبا بر برگہائے غنچہ پا آہستہ نہ
پاسبا نانند گُلہا صائبا خوابندہ است

کاغذ خانہ

غم و شادی دُنیا میں توام ہیں۔ قریۂ ایوبؑ سے اگر زائر چشم عبرت پُرآب لیکر نکلا ہو۔ تو کچھ دُور جا کر اس کے دل بہلانے کا سامان موجود ہے۔ ایوبؑ سے تھوڑے فاصلہ پر ایک سیرگاہ ہے۔ جہاں جمعہ کے دن عثمانی زن و مرد تفریح کے لئے جاتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی ندی جسے ترکی میں کاغذ خانہ صو کہتے ہیں۔ اسی وادی میں بہتی ہے۔ اور اسے شاداب کرتی ہے۔ درختوں کے جھنڈ یہاں نظر کو لبھاتے ہیں اور چاروں طرف لہلہاتے ہوئے کھیت آنکھوں کو طراوت بخشتے ہیں۔ ہوا صاف اور فرحت بخش ہے۔ اِس ندی کے کنارے ایک محل شاہی بنا ہے جسے کاغذ خانہ کوشک کہتے ہیں۔ اِس محل کے مقابل ندی کی دوسری جانب کھُلا میدان ہے۔ اِس میدان میں موسمِ بہار میں تفریح کے شائقین کے جمگھٹے ہوتے ہیں۔ اِس کا مزا دیکھنے کے لئے مئی یا جون کے مہینے میں وہاں ہونا چاہئے۔ ہم نے اِسے اگست میں دیکھا۔ اُس وقت ندی سُوکھ چلی تھی۔ کیونکہ اُس [illegible] پانی تین چار مہینے ہی رہتا ہے۔ چند کشتیاں پانی سے نکال کر کنارے پر رکھی ہوئی تھیں۔ اور سامنے کے میدان میں کہیں کہیں کچھ تماشائی نظر آتے تھے۔ [illegible] سنا ہے۔ کہ بہار میں اتنا ہجوم ہوتا ہے۔ کہ جو دیر سے آئے۔ اُ[illegible] بیٹھنے [illegible] نہیں ملتی۔ شوقین لوگ کشتیوں میں آتے ہیں۔ مقتدر اصحاب [illegible] خیمے [illegible] میدان میں لگے ہوتے ہیں۔ خورد و نوش کا سامان مُہیا ہوتا ہے۔ عورتیں [illegible] ہیں۔

دن بھر وہاں جماؤ رہتا ہے۔ شام کو میلہ ختم ہوتا ہے۔کچھ پانی کے راستے کشتیوں پر کچھ گاڑیوں میں کچھ پیدل گھر کو واپس جاتی ہیں۔

یورپ کے لوگ اِس سیرگاہ کے بڑے دلدادہ ہیں۔کیونکہ اِس مقام کی خوبصورتی کے علاوہ ترکوں کی معاشرت کا ایک ایسا پہلو اُنہیں یہاں نظر آتا ہے۔جو وہ اَور کسی طرح دیکھ نہیں سکتے۔اِس ندی کو انگریزی اَور فرانسیسی میٹھے آب شیریں یورپ کہتے ہیں۔کیونکہ ایشائی ساحل پر ایک اَور ندی گیوک صوئی ہے۔ اَور اُسے یورپ والے "آبِ شیریں ایشیا" پکارتے ہیں۔ وہ بھی نہایت خوش منظر مقام ہے۔ اناطولی حصار یعنی سلطان محمد فاتح کے اس قلعہ کے قریب واقع ہے جو اُس نے ایشیائی ساحل پر بنایا تھا جس کے مقابل رُوم ایلی حصار یورپ والے ساحل پر بنا ہُوا۔ اگر کسی کے پاس وقت وافر ہو۔تو وادیٔ آب شیریں کی سیر کے علاوہ اِس نواح کے اور قابلِ سیر حصے جو اسی طرف مگر ذرا فاصلے پر ہیں۔ دیکھ سکتا ہے۔کاغذ خانہ سے باغچہ کوئی اَور بیوک درہ کو راستہ گیا ہے۔اَور یہ دو نو مقامات نہایت سیر حاصل ہیں بعض سیاح قریہ بلغراد کے جنگل تک جاتے ہیں۔لیکن وہاں کے لئے سارا دن صرف کرنا پڑتا ہے۔ اَور ہم وہاں نہیں جا سکے۔ باغچہ کوئی کے قریب سلطان محمود اوّل کا مشہور "ایکوئی ڈکٹ" یعنی راہِ آب ہے۔ جو ۱۷۳۲ء میں پیرا غلطہ اَور بشکطاس میں پانی بہم پہنچانے کے لئے بنایا گیا تھا۔ سرما میں مینہ کا پانی دو بڑے حوضوں میں جو باغچہ کوئی سے میل بھر کے قریب بلندی پر واقع ہیں جمع کیا جاتا ہے۔اَور وادیٔ بیوک درہ سے ہوتے ہُوئے اِس "اکوئی ڈکٹ" کے ذریعے جو طول میں پانچ سو ساٹھ گز ہے۔اَور اکیس محراب رکھتا ہے۔ شہر میں تقسیم ہوتا ہے۔جہاں پانی بٹنا شروع ہوتا ہے۔اُس مُقام کا نام "تقسیم" پڑ گیا ہے۔

بلغراد کا جنگل اپنی وسعت اَور پانی کے حوضوں کی کثرت کی وجہ سے مشہور ہے۔

آس پاس کے دیہات میں اور شہر کے بعض حصّوں میں پانی وہیں سے جاتا ہے۔ اِستانبول کے عیسائی سیر و تفریح کے لئے اِس گاؤں اور جنگل کے گھنے سائے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور گرمی میں گروہ در گروہ یہاں آتے ہیں۔ اور اس جگہ کا نام اُنہوں نے "دافع غم" رکھا ہے۔ اِن کے لئے "بلغراد" وہی دلچسپی رکھتا ہے۔ جو ترکوں کے لئے کاغذ خانہ۔ معلوم نہیں۔ شروع میں اِس ندی کے پاس کے گاؤں کو کاغذ خانہ کس اعتبار سے کہا گیا۔ لیکن اب کاغذ خانہ ہنسی کھیل کے مقام کا مترادف ہو گیا ہے۔ ایک زمانہ میں بادشاہ کے حضور میں ایک مشہور نقّال لطائف و ظرائف کے لئے رہتا تھا۔ جسے کاغذ خانہ امامی کہتے تھے۔
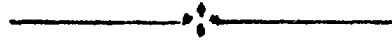
بوغاز واطہ لہ

استانبول میں ایک بڑی خصوصیت یہ ہے۔ کہ یہ بحر و بر کا جامع ہے جب جنگل اور پہاڑ کی سیر سے جی اُکتا جائے۔ تو باسفور حاضر ہے۔ ترکی میں باسفور کو بوغاز کہتے ہیں۔ باسفور یونانی زبان کا لفظ ہے۔ اِس کے معنے ہیں "راہِ گاؤ" قدیم یونانیوں میں ایک قصّہ مشہور تھا۔ کہ جوپیٹر دیوتا نے آیو کو اپنے اعجاز سے بچھڑا بنا دیا تھا۔ اور وُہ بچھڑا اِس پانی میں سے پیر کر گزرا۔ غالباً اِسی اعتبار سے یونانیوں نے اِس کا نام باسفور رکھا۔ ترکی لفظ بوغاز اِس سے بالکل جُدا ہے۔ اِس کے معنے ہیں دو پہاڑیوں کے درمیان کا درّہ۔ اور چونکہ ساحلِ ایشیا کی پہاڑیوں اور ساحلِ یورپ کی پہاڑیوں میں حدِّ فاصل ہے۔ اِس لئے اُسے بوغاز کہتے ہیں۔ سب سیّاح متفق اللّفظ ہو کر یہ کہتے ہیں۔ کہ بوغاز سے زیادہ خوش منظر جگہ دُنیا بھر میں ملنی مُشکل ہے۔ ہم نے کئی دفعہ بوغاز کی سیر کی۔ اُن میں دو موقعے خصوصیّت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ایک دن جب سفیرِ انگلستان کی ملاقات کے لئے ترآپیہ گئے۔ اور دُوسرے جس دن جلوس ہمایُوں کی رات بوغاز کے چراغاں کی سیر کی۔

سرائے قدیم کے قریب شاخِ زرّیں اور بحیرۂ مرمر سے اِس مشہور آبنائے کا مقامِ اتصال ہے۔ یہ آبنائے طول میں اُنتیس میل ہے۔ اِس کا عرض زیادہ سے زیادہ بیوک درہ کے قریب بقدر دو میل کے ہے۔ اور کم سے کم روم ایلی حصار

کے سامنے ہے۔ جہاں اِس کی چوڑائی کوئی آٹھ سو گز ہوگی۔ بڑے پُل سے مخصوصہ کمپنی کے جہاز دِن بھر بوغاز کو آتے جاتے رہتے ہیں۔ اِن جہازوں کے دو درجے ہوتے ہیں۔ اور اِن کا ایک حصّہ عثمانی مستورات کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ اس کے سامنے پردہ پڑا رہتا ہے۔ عورتیں "فراجہ" پہنے اور چارشف[1] مُنہ پر ڈالے آتی ہیں۔ اور پردے کی دُوسری طرف جا بیٹھتی ہیں۔ چونکہ بوغاز کے دونو طرف کے خوبصورت مکانات عموماً اُمراء کے ہیں۔ اِس لئے اِن جہازوں پر عثمانیوں کے طبقۂ اعلیٰ کی مستورات بکثرت سوار ہوتی ہیں۔ راستے میں جا بجا جہازوں کے اسٹیشن آتے ہیں کچھ لوگ اُتر جاتے ہیں۔ کئی نئی سواریاں جو منتظر کھڑی ہوتی ہیں۔ سوار ہو لیتی ہیں۔ بوغاز کے دونو کناروں پر کُل اٹھائیس سٹیشن ہیں۔ پندرہ ساحلِ یورپ پر اور تیرہ ساحلِ ایشیا پر۔ سارے جہاز ہر سٹیشن پر ٹھہرنے والے نہیں ہوتے بعض تیز رو صرف ضروری مقامات پر ٹھہرتے ہیں۔ اور بعض ہر جگہ رُکتے ہوئے جاتے ہیں۔

تراپیہ تک جاتے ہوئے ساحلِ یورپ پر کئی ضروری مقامات نظر آتے ہیں۔ پہلے نکلتے ہی توپ خانہ کی عالیشان عمارت ہے جس کے ساتھ ملی ہوئی دو مساجد نظر آتی ہیں۔ جامع سلطان محمود اور جامع قلیچ علی۔ اس کے بعد بشکطاش سٹیشن ہے۔ یہ محلّہ خیر الدین پاشا مرحوم کے مزار کے سبب مشہور ہے۔ اِس کے معنے ہیں۔ گہوارہ والی پہاڑی۔ اور یہ نام اسے اِس لئے دیا گیا۔ کہ خیر الدین پاشا کے مزار کی صُورت مہد کی سی ہے۔ خیر الدین وُہی نامور امیر البحر ہے۔ جس نے سُلطان سلیمان کے عہد میں یورپ کی اُس زمانے کی مجموعی بحری افواج کو شکستِ فاش دی تھی۔ جس نے الجزائر اور ٹیونس کو فتح کیا تھا۔ اور جس کے نام سے اُس زمانے میں یُورپ کے لوگ کانپتے اُسے خوفناک بار بروسا کہتے تھے۔

---

[1] ریشمی نقاب جو عموماً سیاہ ہوتا ہے کو کبھی کبھی کسی اور رنگ کا بھی ہوتا ہے۔ مگر اب تو یہ باتیں غالباً خواب و خیال ہو چکی ہیں۔

بشکطاش سے آگے بڑھیں۔ تو قصرِ چراغاں کی خوبصورت عمارت ہے سلطان عبدالعزیز مرحوم نے یہ محل بنوایا تھا۔ اور سلطان مراد یہیں نظر بند رہے قصرِ چراغاں کے عقب میں ہی قصرِ یلدیز بلندی پر واقع ہے۔ اور اس کی عمارت کے کچھ حصّے بھی جہاز پر بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے آگے سٹیشن اورتہ کوئی ہے۔ یہاں اچھے اچھے باغات ہیں۔ اور استانبول میں ان باغوں کے میوے اور پھول بکثرت پہنچتے ہیں۔ یہاں کنارِ آب ہجرہ دار چوبی عمارتوں کی ایک قطار چلی گئی ہے۔ یہ مسلمانوں کے موسمِ گرما کے رہنے کے گھر ہیں۔ اس قسم کے گھروں کو ترکی میں یالی کہتے ہیں۔ ارنود کوئی اور بیبک کے سٹیشن اس کے بعد آتے ہیں۔ ہز ہائی نس خدیو سابق اور ان کی والدہ اور اقارب کے محلات ان سٹیشنوں کے قریب ہیں۔ اور ان کے گرد کے باغات اور پانی سے ملی ہوئی سفید سنگِ مرمر کی سیڑھیاں ساحل کے اس حصّے کی زینت کا باعث ہیں۔ بیبک کے بعد رومِ ایلی حصار سٹیشن آتا ہے۔ اس مقام کی تاریخی اہمیت کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اس کی ساخت میں ایک خوبی یہ ہے۔ کہ اس کے برج پہاڑی نشیب و فراز پر اس ترکیب سے بنائے گئے ہیں کہ دیواروں کے ساتھ ملکر ان سے لفظِ محمدؐ پیدا ہوتا ہے۔ اور دور سے دیکھنے والے کو یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ مبارک نام دیو قامت حروفِ حجر سے لکھ کر اعلان کے طور پر ہوا میں معلق کر دیا گیا ہے۔ یہ سلطان محمدؐ فاتح کی ایجاد پسند طبیعت کی ایک ادنیٰ تعلیم کے اوپر کچھ فاصلے پر ایک نئی عمارت انگریزی قسم کی نظر آتی ہے۔ جو گرد و پیش کے منظر سے کچھ مناسبت نہیں رکھتی۔ یہ عیسائیوں کا ایک بڑا کالج ہے جسے مسٹر رابرٹ نام ایک فیاض امریکن نے قائم کیا ہے۔ عین پہاڑی کی چوٹی پر کالج کی عمارت سے بھی اوپر حاجی بکتاش ولی کا تکیہ ہے۔ جہاں اس مشہور فرقے کے درویش رہتے ہیں۔

جیسے بوغاز میں شہر کے پل سے دس بارہ میل تک جہاز میں جانا بہت دلچسپ ہے۔ ویسے ہی دوسری طرف بحیرۂ مرمر کی سیر اور چھوٹے چھوٹے جزائر کے اس مجموعہ کو دیکھنا جو اس کے اندر

دس بارہ میل تک جانے پر آتا ہے۔ نہایت پُر لطف ہے۔ ترکی میں جزیرہ اطہ[1] کہتے ہیں اور آرنشان جمع ہے۔ پس اطہ لرجزائر ہوئے۔ یہ جزائر تعداد میں آٹھ ہیں۔ لیکن آباد صرف تین چار ہیں۔ اور دو خصوصیت سے قابلِ دید ہیں۔ یعنی پرنکپو اور ہلکی۔ پرنکپو کو ترک بیوک اطہ یعنی بڑا جزیرہ کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ سب میں بڑا ہے۔ انگریزی میں ان سب کا مجموعی نام "جزائر شہزادگان" ہے۔ کہتے ہیں مسلمانوں کے عہد سے پہلے معتوب شاہزادے یہاں محبوس رہتے تھے۔ اِس لئے یہ نام رکھا گیا۔ یہ یونانیوں کی بستیاں ہیں۔ یونانی عیسائیوں کے رہنے کا مکان اور اُن کے یتیم خانہ کی عمارت نہایت بلندی پر واقع ہے۔ اور دور سے نظر آنے لگتی ہے۔ پرنکپو میں ہوٹل بہت کثرت سے بنے ہیں۔ اور جہازوں کے سٹیشن کے قریب سمندر کے کنارے چلے گئے ہیں سٹیشن کے پاس ہر وقت بہت رونق رہتی ہے۔ اور سمندر میں نہانے کی گاڑیاں بھی موجود ہیں جزیرہ کا یہ حصہ یورپ کے ساحلِ بحر کی زندگی کا نمونہ ہے۔ اور استانبول سے صرف عیسائی لوگ بلکہ متمول ترک بھی گرمی کے موسم میں دفتر یہاں سیر و تفریح کیلئے آتے رہتے ہیں سٹیشن سے اُترتے ہی ہلکی ہلکی گاڑیاں سیر کرانے کو تیار رہتی ہیں جو گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں جزیرے کا چکر لگا سکتی ہیں جزیرے کے گرد سڑک بہت عمدہ بنی ہے۔ جزیرے کے چاروں طرف پانی۔ وسط میں درختوں کے جھنڈ۔ کنارے کنارے سڑک سڑک کے اوپر چھوٹے چھوٹے خوش وضع باغات۔ اور باغوں کے پیچھے رنگا رنگ کے بنگلے۔ یہ سب ملکر ایک ایسی تصویر بنتی ہے۔ کہ آنکھ اُس کے دیکھنے سے سیر نہیں ہو سکتی۔ یہاں گدھے کی سواری کا بھی دستور ہے۔ یورپین لوگ یہاں گدھے پر خوشی سے سوار ہوتے ہیں ایک تو انہیں یہ انوکھی چیز معلوم ہوتی ہے۔ اور دوسرے بعض چھوٹے راستوں میں جہاں گاڑی کی سڑک نہیں ہے۔ وہ اِس سواری پر بآسانی پہنچ سکتے ہیں۔ یورپ میں بھی بعض جگہ سمندر کے کنارے بچوں کے لئے گدھے کی سواری کا دستور ہے۔ لیکن یہاں [illegible]

---

[1] تلفظ اَدَہ۔ کیونکہ ط کا تلفظ ترکی میں د ہے۔ جیساکہ طولمہ باغچہ میں۔

فرنگیوں اَور بانکی بانکی فرنگنوں کو گدھے پر بیٹھے دیکھ کر ہنسی آتی تھی۔
پرنکپو سے قریب ترین جزیرہ ہلکی ہے ۔ اَور اِس میں بحریہ کالج قابلِ دید ہے
افسوس کہ ہم اُسے اُتر کر نہ دیکھ سکے۔ جہاز پر ہی سے اس کی عمارت کو دیکھا۔ اَور
جہاز پر ہی مدرسے کے چند طلبہ سے ملاقات کا اِتفاق ہُوا۔ اِس کے دیکھنے کے
لئے ہمارا اِرادہ پھر ایک روز آنے کا تھا۔ مگر وُہ بہت سے اِرادوں کی طرح
ارادہ ہی رہا ۔ ع

بہت نکلے مرے ارمان ولیکن پھر بھی کم نکلے

ہرکیہ

صبح سے دوپہر تک راستے کی دلچسپیوں سے محظوظ ہوتے ہوئے ہم ہرکیہ پہنچے۔ اتفاق سے اُس دن عیسائیوں کا ایک تیوہار تھا جتنی عیسائی لڑکیاں کارخانے میں کام کرتی تھیں ۔ وہ رخصت پر تھیں۔ اور درختوں کے نیچے بیٹھی آرام کر رہی تھیں۔ اِن میں سے بعض کے لباس تو مغربی عیسائیوں کی طرح تھے۔ لیکن بعض بالکل ایشیائی لباس پہنے تھیں چھینٹ کی شلوار کی طرز کے پائجامے اور رنگین کُرتیاں ۔ پنجاب کے اضلاعِ سرحد کے رہنے والی عورتوں سے اُن کی وضع بہت ملتی تھی ۔ صحت و تندرستی میں بھی اُنہی کی طرح تھیں۔ اُن کی مسلمان بہنیں کارخانے میں کام کر رہی تھیں۔ دونو کے لباس میں زیادہ تمیز دوپٹے کی تھی ۔ عیسائی لڑکیاں اکثر کھلے سر پھرتی تھیں ۔ اور مسلمان لڑکیاں سب دوپٹے اوڑھے ہوئے تھیں ۔ مگر دوپٹے کچھ بہت بڑے نہ تھے محض سر کو ڈھانپتے تھے ۔

کوئی دو ہزار آدمی اس کارخانے میں کام کرتے ہیں ۔ اِن میں بارہ سو نو عمر یتیم ہیں کچھ لڑکے کچھ لڑکیاں مذہب و ملّت کی کوئی قید نہیں ۔ رعایائے سلطانی کے سب مذاہب اس میں داخل ہونیکا حق رکھتے ہیں ۔ اور داخل کئے جاتے ہیں ۔ یہاں قالین کا کام زیادہ تر عیسائیوں کے ہاتھ میں ہے ۔ قالینوں کے صیغے میں جو عورتیں اور لڑکیاں کام کرتی ہیں ۔ اُن میں اسوقت اسّی فیصدی عیسائی اور بیس فیصدی مسلمان ہیں لیکن کپڑا بُننے کے صیغے میں مسلمان زیادہ ہیں ۔ اور عیسائی شاذ ۔ لڑکیاں جو یہاں کام کرتی ہیں

عموماً گرد و نواح کے دیہات اور پہاڑی علاقے سے آتی ہوتی ہیں۔ اور یہیں رہتی ہیں۔ ان کے بسنے کے لئے عمدہ مکان بنے ہیں۔ اور اُن کی سکونت کا سارا خرچ کارخانے کے ذمے ہے لڑکوں کے لیے مکان علیحدہ بنا ہے۔ جو لڑکیوں کے مکان سے فاصلے پر ہے۔ اور لڑکیوں کے مکان میں کوئی مرد یا لڑکا نہیں جانے پاتا۔ یہ لڑکے لڑکیاں جو مزدوری کرتے ہیں۔ وہ اُن کے حساب میں جمع ہوتی رہتی ہے۔ اور جب وہ جوان ہو کر کارخانے سے نکلتے ہیں۔ یا اُن کی شادی ہوتی ہے۔ تو جمع شدہ رقم انہیں مِل جاتی ہے۔ بارہ گھنٹے کا دن شمار ہوتا ہے اور اس میں دوپہر کو ایک گھنٹہ کھانے اور آرام کے لئے ملتا ہے۔ ریشم کے محلے میں جو عورتیں کام کرتی ہیں۔ اُن کی مزدوری بالاوسط دو چرک[1] روزانہ ہے۔ جو کاریگر شال بنتے ہیں۔ اُن کی مزدوری چار چرک روز کے قریب ہے۔ اور جو لڑکیاں قالین بُنتی ہیں انہیں ایک روزانہ چرک ملتا ہے۔ اُن میں اکثر بہت چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ہیں۔ اور اُن کے لئے یہ بہت معقول مزدوری ہے۔

لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لکھانے پڑھانے کا انتظام بھی یہاں کیا گیا ہے۔ اور کام سیکھنے کے زمانے میں وہ مدرسے بھی جاتے ہیں۔ ایک رشدیہ مکتب لڑکوں کے لئے ہے۔ جہاں کوئی اڑھائی سو لڑکے پڑھتے ہیں۔ اور ایک مکتب ایک دُوسرے مکان میں لڑکیوں کے لئے ہے۔ جہاں سَو کے قریب لڑکیاں پڑھتی ہیں۔

یہاں کے مدرّس فارسی راشد آفندی نے اثنائے گفتگو میں ایک فارسی رُباعی پڑھی جس کا مجھ پر بڑا اثر ہُوا۔ وطن کی قدر غربت میں آتی ہے۔ اور وہ رُباعی یادِ وطن سے بے تاب کرنے کو کافی تھی۔ وہ معمّر آدمی تھے۔ علاقہ قفقاز میں ایک مقام ہے قبہ۔ وہاں کے رہنے والے تھے۔ مگر مُدّت ہوئی۔ آب ودانہ یہاں لے آیا اور پھر گھر جانا نہیں ہوسکا۔ ہمارے ساتھ

[1] چرک لفظی معنے چوتھائی حصہ۔ ایک چاندی کا سِکّہ ہے۔ جو یورپ کے فرانک اور ہندوستان کے دس آنے کے برابر ہوتا ہے۔

بابِ عالی کے ایک عہدہ[1] دار تھے۔ وہ بھی قفقاسی تھے۔ انہیں دیکھ کر بوڑھے کے دل میں یادِ وطن نے گدگدی کی۔ اور وہ یہ رُباعی پڑھ کر آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ خود بھی تڑپا اور ہمیں بھی تڑپا گیا۔ واپسی پر راستہ بھر میں یہی دو شعر پڑھتا آیا ؎

در غربت اگر مرگ بگیرد بدنِ من | آیا کہ کند قبر۔ کہ دوزد کفن من؟
تابوتِ مرا جانبِ بلندے بگزارید | تا باد برد بوئے مرا در وطن من

---

[1] جلال انسی بے مترجم بابِ عالی صیغہ مطبوعات اجنبیہ جو بابِ عالی سے ہماری معیت کے لئے مامور تھے۔ اور جن کا ذکر ان اوراق میں کئی جگہ آئے گا۔

اخباری دُنیا

بہ حیثیت اخبار نویس میرے لئے استنبول کی اخباری دنیا کو دیکھنا ضروری تھا۔ لیکن اگر مجھے خود کوئی تعلق اخبارات سے نہ ہوتا۔ تو بھی میں استنبول کی زندگی کے اس پہلو سے غافل نہ رہتا۔ کیونکہ مُلک کی ترقی کا ایک معیار اُس کے اخبارات کی حالت ہے۔ استنبول میں جیسے بولنے میں کئی زبانیں مستعمل ہیں۔ اسی طرح اخبارات بھی مختلف زبانوں کے اس دارالخلافہ میں موجُود ہیں۔ مسلمانوں کے ہاتھ میں جو اخبارات ہیں وہ ترکی زبان میں ہیں۔ اور عیسائیوں کے اخبارات عموماً دیگر زبانوں میں لیوانٹ ہیرلڈ روزانہ دو زبانوں میں چھپتا ہے۔ ایک حصّہ انگریزی ہوتا ہے۔ اور ایک فرانسیسی سٹامبول نام ایک اور فرانسیسی روزنامہ ہے۔ جو ہیرلڈ کا مدمقابل ہے۔ بعض عیسائی اخبارات عرب زبان میں نکلتے ہیں۔ جو رُوسی سے کسی قدر ملتی ہے۔ بعض کی زبان ترکی ہے۔ مگر عرب حروف میں لکھی ہوئی۔ لیکن ترکی اخبارات تعداد اور اشاعت میں ان سب سے زیادہ ہیں۔ اور انہیں ہر مذہب وملت کے لوگ پڑھتے ہیں۔ ترکی روزنامہ آج کل چار ہیں۔ صباح۔ اقدام۔ ترجمانِ حقیقت اور سعادت۔ اور جیسا کہ ہر جگہ فطرتِ انسانی کا خاصہ ہے۔ اِن میں باہمی رقابت ہے۔ ہم پیشہ لوگوں کی رقابت تو قدرتی بات ہے۔ اس پر اعتراض نہیں۔ لیکن رقابت کی بھی قسمیں ہیں۔ اور وہ جب یہ حد سے گذر جائے۔ تو ترقی کی مانع ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہندوستان کے دیسی اخبارات کے تجربے سے ظاہر ہے۔ افسوس ہے کہ استنبول کی اخباری دُنیا بھی ہمارے یہاں کی طرح

اس مرض میں مُبتلا ہے۔ اور وہاں یورپ کے دُوسرے پایہ تختوں کی طرح وہ جائز رقابت نہیں جو خوبیوں میں ایک دُوسرے سے بڑھنے کی ترغیب دیتی ہے ہمیں اس رقابت کا ایک ناگوار تجربہ ہُوا۔ اور وہ یہ کہ سب سے پہلے ہم نے "صباح" کا مطبع دیکھا اور اس اخبار میں ہمارے وہاں جانے کا ذکر شائع ہو گیا۔ اس کے بعد جو اقدام کے مطبع میں گئے۔ تو صاحبانِ اقدام کو ناراض پایا۔ کہ ہم نے "صباح" کو اُن پر ترجیح دی۔ حالانکہ ہمارا ہرگز یہ منشا نہ تھا۔ بلکہ محض اتفاقی طور پر ہمارے مطبع "صباح" میں جانے کی تقریب پیدا ہو گئی تھی۔ اور وہ یُوں۔ کہ صباح کے ایڈیٹر محمد توفیق آفندی سے استنبول پہنچنے سے پیشتر ریل میں ہی ہماری ملاقات ہو گئی۔ وہ گرمی کے سبب دیہات میں مقیم تھے۔ اور صبح اُٹھ کر اپنے دفتر کو جانے کے لئے اُسی گاڑی میں سوار ہوئے جس میں ہم تھے۔ چونکہ اپنی سیاحت میں ہندوستانیوں کو دیکھ چکے تھے۔ اِس لئے انہوں نے خیال کیا۔ کہ ہم ہندوستانی ہیں۔ اور عربی میں ہم سے پُوچھا۔ کہ ہم کہاں کے رہنے والے ہیں۔ مَیں نے کہا۔ ہند کے۔ اس پر باتیں شروع ہو گئیں۔ باتوں باتوں میں معلوم ہُوا۔ کہ وہ اخبار نویس ہیں۔ مَیں نے کہا۔ مَیں بھی اخبار نویس ہوں۔ وہ سُن کر بہُت خوش ہوئے۔ اور کہنے لگے "ہمارے دفتر کو دیکھنے کے لئے ضرور آئیے۔ آج تو ہفتہ ہے۔ جلدی دفتر بند ہوتا ہے۔ اور آپ کو بھی سفر کی کوفت ہو گی۔ کل یکشنبہ کو مَیں وہاں نہیں ہُوں گا۔ آپ دوشنبہ کو اگر آ سکیں۔ تو مَیں بہت ممنون ہونگا" ہم نے وعدہ کیا کہ آئیں گے۔ اس طرح ہم سب سے پہلے وہاں گئے۔ کارخانہ نہایت معقول حالت میں نظر آیا۔ عمارت نئی بنی ہے۔ مالک کارخانہ مہران آفندی نامی ایک ارمنی صاحب ہیں۔ اُن سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ تجارتی اصُول پر کارخانے کو چلاتے ہیں۔ لکھنے کا کام ایڈیٹروں کے سپُرد ہے۔ اور ان میں کچھ ارمنی ہیں۔ کچھ مسلمان ہیں۔ لیکن اخبار کے خریدار بیشتر مُسلمان ہیں۔ اور اس کی تحریر ایسی ہے۔ جس سے عیسائیت کا

کوئی اظہار نہیں ہوتا۔ اور سلطان المعظم کی مدح و ثنا اور خلافت کی تائید و حمایت اس اخبار میں دوسرے اخبارات سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ اخبار کے دفتر میں ایک ترجمان انگریزی دان بھی تھا۔ اس کے توسط سے ہم نے پوچھا۔ کہ اشاعت کا کیا حال ہے۔ کہنے لگے بہت اچھی ہے۔ بالاوسط تیس ہزار کے قریب بتائی۔ اشاعتِ استنبول میں دیگر مقاماتِ یورپ کے طریق پر ہے۔ یعنی زیادہ تر مدار روزانہ فروخت پر ہے۔ نہ کہ سالانہ خریداروں پر۔ روزانہ اخبارات کی قیمت یہاں سستی رکھی گئی ہے۔ اور یہ بھی ایک راز ان کی معقول اشاعت کا ہے۔ ادھنی فی پرچہ عام قیمت ہے۔ بازاروں کے موڑوں پر اخبار بیچنے والے کھڑے رہتے ہیں۔ اور ہر شخص ادھنی ادھنی کو ایک پرچہ لے جاتا ہے۔ ان کے علاوہ صرافوں کی دکانوں اور کتب فروشوں کے ہاں بھی اخبارات فروختگی کے لئے موجود ہوتے ہیں۔

صباح والوں کی ملاقات کے دوسرے دن بابِ عالی سے جلال بے ہماری رفاقت میں دیے گئے۔ دو تین دن بعد ایک دن وہ اور ہم اس چھوٹی سی تہ زمینی ریل میں سوار ہوئے۔ جو پُل سے غلطہ کو جاتی ہے۔ اور جسے "تونل" کہتے ہیں۔ ریل میں ایک صاحب اخبار "اقدام" کے ایڈیٹروں میں سے بیٹھے تھے۔ جن کا نام اسماعیل حقی آفندی تھا۔ جلال بے انہیں پہچانتے تھے۔ انہوں نے ملاقات کرائی۔ وہ کہنے لگے "ہمارے مطبع میں بھی آپ کو آنا چاہیئے۔ بلکہ صباح سے پہلے آپ کو ہمارے ہاں آنا چاہئے تھا کیونکہ وہ عیسائی کا پرچہ ہے۔ اور ہمارا پرچہ ایک مسلمان کی مِلک ہے۔ ویسے بھی اس سے مقدّم سمجھا جاتا ہے۔" مَیں نے کہا۔ کہ ہم آپ کے ہاں بڑے شوق سے آئیں گے۔ چنانچہ اس قرارداد کے موافق ہم مطبع اقدام میں گئے۔ اسماعیل حقی آفندی فارسی بولتے تھے۔ اُن سے فارسی میں باتیں ہوتی رہیں۔ پُوچھنے لگے "آپ کے استنبول آنے کا کیا مقصد ہے۔" مَیں نے کہا "سیر و سیاحت اور مسلمانانِ ہند اور عثمانیوں

کے درمیان رشتۂ محبت کی مضبوطی کے ذرائع ڈھونڈھتا - مَیں نے اس سلسلے میں اپنی مسرت کا اظہار کیا - کہ عثمانی اخبارات ہندوستان کے مسلمانوں کے حالات ہندوستان کے اخبارات کے حوالے سے درج کرتے رہتے ہیں - مگر افسوس ہے - کہ اُردو اخبارات سے براہِ راست ترجمہ کرانے کا کوئی انتظام نہیں بلکہ مصر کے اخبارات کے ذریعے انہیں خبریں ملتی ہیں - اور مصر کے اخبارات عموماً انگریزی اخبارات سے نقل کرتے ہیں ۔

اس کے بعد ہم نے سعادت کا مطبع دیکھا - جو دفترِ اقدام کے قریب ہی واقع ہے - اس کے مالک و اڈیٹر دو تعلیم یافتہ اور خوش خیال نوجوان ہیں - احمد بے اور نافذ بے - ان سے مل کر ہم بہت مسرور ہوئے - یہ پرچہ ایک زمانے میں بہت زور پر تھا - درمیان میں بند ہو گیا - اور اب پھر کچھ عرصے سے از سرِ نو جاری ہُوا ہے - اور اس کے کارکن اس کی کامیابی میں پوری سعی کر رہے ہیں - ان اخبارات میں سے ہر ایک کو تھوڑی سی مدد خرچ سرکاری طور پر بھی ملتی ہے - اور اس کا غیر متیقن ہونا اکثر ان کی حالت کو بھی غیر متیقن کر دیتا ہے ۔

ترجمانِ حقیقت کے مطبع میں ہم نہیں گئے - لیکن اس کے مالک و ایڈیٹر جودت بے آفندی سے ایک دن عزت پاشا کے کمرے میں سرائے ہمایوں میں ہماری ملاقات ہو گئی -

روزنانہ اخباروں کے سوا استنبول میں کئی ہفتہ وار پرچے اور دیگر متوقت الشیوع رسالے ہیں - اُن میں ثروت الفنون کا ذکر پہلے آ چکا ہے - بچوں کے لئے اور عورتوں کے لئے خاص پرچے علیحدہ ہیں - افسوس کہ عربی یا فارسی میں آج کل کوئی اخبار استنبول سے نہیں نکلتا - جب معلومات زندہ تھا - تو اس کا ایک پرچہ عربی بھی تھا - فارس میں ایک زمانے میں ایک اخبار نکلا تھا - مگر بعض مقامی مصلحتوں کی بنا پر

حکماً بند کیا گیا - مجھ سے اور جودت بے سے اس بارے میں گفتگو ہوئی - اور مَیں نے کہا کہ ایک اخبار عربی اور ایک فارسی مقامِ خلافت سے نکلنا ضروری ہے تاکہ اس بڑے اسلامی مرکز کے حالات شرح و بسط کے ساتھ دوسرے اسلامی مُلکوں میں معلوم ہوتے رہیں - عربی اخبار عرب و شام و مصر اور شمالی افریقہ کے دُوسرے حصّوں کے لئے مفید ہوگا - اور ہندوستان میں بھی پڑھا جا سکے گا - اور فارسی اخبار ہندوستان اور ایران اور افغانستان میں عثمانیوں کے متعلق صحیح اطلاعات کا ذریعہ ہوگا - اُنہوں نے کہا - کہ اگر حکومت سے اجازت مِل جائے - تو وہ فارسی اخبار نکالنے کو آمادہ ہیں - اس کے بعد مَیں نے بعض ارکینِ دولت کو اس ضروری امر کی طرف متوجّہ کیا - یہ نہیں کہا جا سکتا - کہ انہیں اس کے متعلق کوئی عملی کارروائی کرنے کا خیال رہے گا یا نہ رہے گا - اور ان کی کوشش کامیاب ہوگی یا نہ ہوگی - مگر اُنہوں نے مجھے یقین دلایا - کہ وہ ایک ایسے اخبار کی ضرورت کے معترف ہیں - اور حتّےٰ الامکان اس کے لئے اجازت حاصل کرنے کی سعی کریں گے -

اخبارات کے متعلق سب سے زیادہ دل خوش کُن چیز جو استنبول میں نظر آئی - وہ یہ تھی کہ ادنےٰ و اعلےٰ ہر طبقے کے لوگ اخبار کا شوق رکھتے ہیں - چھوٹے چھوٹے قہوہ خانوں میں بھی اخبارات رکھے ہیں - گو سب لوگ انہیں پڑھتے ہیں اگر یہ اخبار سب مضامین آزادانہ لکھ سکیں - تو دنوں میں قوم بیدار ہو جائے - مگر اب بھی عثمانی حالاتِ عالم سے بے خبر نہیں - کم از کم پایۂ تخت کا ہر عثمانی یہ کہہ سکتا ہے - ع

زِ کارِ جہاں بے خبر نیستم

لوگ اخبار غور سے پڑھتے ہیں - اور ذرا ذرا سی خبر بھی اُن کی نظر سے نہیں بچتی ہمارے وہاں پہنچنے کے متعلق جس دن اخبارات میں مضمون نِکلے - اُسی دن ہم نے

دیکھا۔ کہ بازاروں میں کئی لوگ ہم کو پہچانتے تھے۔ اور ایک دُوسرے سے کہتے تھے۔ کہ یہی وہ ہندوستانی ہیں۔ جن کے آنے کی خبر آج صبح پڑھی تھی۔ اور ہمیں راستہ بتانے میں غیر معمولی اخلاق سے کام لیتے تھے۔

اخبارات پر لوگوں کی اس توجہ کو میں اُن اخبارات کے حق میں فالِ نیک سمجھتا ہوں۔ اور اسی سے مجھے اُمید ہوتی ہے۔ کہ کسی دن یہ اخبار بہت مفید ثابت ہوں گے ؞

تربیتِ اطفال

ہر قوم کی زندگی میں تربیتِ اطفال ایک جُزوِ ضروری ہے۔ جس پر اُس کی آیندہ بقا موقوف ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر ازحد مسرت حاصل ہوئی۔ کہ عثمانیوں کو تربیت اطفال کا بہت خیال ہے۔ اور جس سلیقے سے متوسط طبقے کے عثمانی اپنے بچّوں کی پرورش کرتے ہیں۔ وہ ہر طرح تعریف کے قابل ہے۔ مشرقی اور مغربی دونوں تربیتوں کے مناسب ملاپ سے عثمانی بچّوں کے عادات و اطوار میں ایک عجیب جوہر پیدا ہو گیا ہے۔ وہ بزرگوں کے ادب میں پُورے ایشیائی ہیں۔ اور بزرگوں کے رُوبرو ہوشیاری سے بات چیت کرنے میں ان کی صحبت میں متانت کے ساتھ بیٹھنے اُٹھنے میں یورپ کی دیگر اقوام کے بچّوں سے کم نہیں۔

بچّوں کے لئے استنبول کے ہر حصّے میں ابتدائی مدرسے ہیں۔ اُن مدرسوں کے دیکھنے کا مجھے اتفاق نہیں ہُوا۔ مگر کئی گھروں میں چھوٹے چھوٹے بچّوں کو دیکھا۔ جو وہاں سے پڑھ کر آتے تھے۔ اور اُن میں سے بعض کی خواندگی کا امتحان بھی کیا۔ تو معلوم ہُوا۔ کہ خواندگی معقول ہے۔ قرآن مجید سب پڑھتے ہیں۔ ترکی کی ابتدائی کتابیں رواں پڑھ سکتے ہیں۔ اور اُن کا مطلب آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ حساب میں ضرب تقسیم تک سیکھ چکتے ہیں۔ اپنے مُلک کے جغرافیہ اور بعض تاریخی حالات سے بھی تھوڑی سی واقفیت رکھتے ہیں۔ ان ابتدائی مدرسوں میں چھوٹے چھوٹے لڑکے لڑکیاں دونوں پڑھتے ہیں اور بڑی لڑکیوں کے مکاتب علیحدہ ہیں۔

مدرسے کے بعد گھر میں بچّوں کی مائیں بہنیں اُن کی خواندگی کے دُہرانے اور اُن کی تمام تربیت کی ذمہ دار ہیں۔ اور یہی سب سے بیش بہا حصّہ اُن کی پرورش کا ہے۔ بچّوں کی حرکات سکنات دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔ لباس نہایت صاف اور ستھرا۔ اطوار دل لبھانے والے جب اُن کے بزرگوں کی ملاقات کے لئے لوگ آتے ہیں۔ تو بچے بھی سلام کرنے آتے ہیں۔ کمرہ میں داخل ہوتے ہی جُھک کر ہر بزرگ کے پُشت دست کو چومتے ہیں۔ اور پھر ادب سے ایک طرف کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اگر باپ کی طرف سے یا مہمان کسی کی طرف سے اشارہ پائیں۔ تو بیٹھ جاتے ہیں۔ ورنہ کھڑے رہتے ہیں۔ اور جو بات پوچھی جائے اُس کا مناسب جواب دیتے ہیں۔ اس کے بعد جب چاء یا قہوہ آئے تو اپنے ہاتھ سے پیش کرتے ہیں۔ بعض دفعہ گھر میں خادموں کے ہوتے ہوئے میں نے بچّوں کو خوش خوش یہ خدمت کرتے دیکھا۔ بہت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ لڑکیوں کی تربیت میں مدرسہ کی خواندگی اور سینے پرونے کی پڑھائی کے ساتھ خانہ داری کی تعلیم بھی شامل ہے۔ اور وہ ماں باپ کا ہاتھ بٹانے میں لڑکوں سے زیادہ سنعدی دکھاتی ہیں۔ اس صفت میں وہ یورپ کے خوشحال گھروں کی لڑکیوں سے بہتر ہیں۔ استنبول میں ان کی ظاہری صورت باعتبار پوشش اور وضع کے بالکل یورپ کی لڑکیوں کی سی ہے۔ بچپن میں سر پر دوپٹہ نہیں ہوتا۔ ایک کھُلا سا جامہ یورپی قطع کا زیب تن ہوتا ہے۔ پاؤں میں بُوٹ اور جُرابیں۔ اُن کی تعلیم میں بھی بہت سی باتیں یورپ کے طریق پر ہیں۔ مثلاً موسیقی کا سبق اُن کے نصاب میں موجود ہے۔ فرانسیسی زبان بھی سیکھتی ہیں۔ اس پر وہ یورپ کی خوشحال لڑکیوں کی طرح کھانے پکانے گھر بار کی خبر گیری اور بزرگوں کی خدمت اور بچّوں کی نگہداشت کے فرائض سے بے بہرہ نہیں رہتیں۔ عثمانی اس عمدہ مشرقی اصول پر کاربند ہیں۔ کہ لڑکیوں کو اپنے گھر میں جس قدر محنت اور کام کاج کی عادت ہو جائے۔ اسی قدر اُن کے لئے مفید ہے۔ جب بیاہی جائیں گی۔ اور اپنا گھر بار بسائیں گی۔

تو یہ مشق اُن کے کام آئے گی۔

ہمارے دوست جلال بے کی ایک صاحبزادی[1] کوئی نو سال کی ہو گی۔ ایک دن اُنہوں نے کہا۔ کہ اس کی خواندگی دیکھیئے۔ سب مضامین میں اُس نے معقول امتحان دیا۔ آخر ہم نے اُس سے کہا۔ کہ قرآن مجید بھی تھوڑا سا سناؤ۔ وہ پہلے ننگے سر بیٹھی تھی۔ دَوڑ کر دوپٹہ لے آئی۔ اور دوپٹے سے اپنی پیشانی تک ڈھانپ کے اس نے قرآن مجید پڑھنا شروع کیا۔ اس سے معلوم ہُوا کہ فرنگیوں کی ہمسائیگی اور دیگر اثرات سے گو بہت سی عادات اہل یورپ کی چُپکے چُپکے عثمانیوں میں گھُس آئی ہیں اور آتی جاتی ہیں۔ مگر اسلام کی خوبیاں اُن کے دل میں بدستور جاگزیں ہیں۔ اور وہ قرآن کی عظمت. اسلامی عبادات اور معتقدات میں کسی دوسرے مُلک کے مسلمانوں سے کم نہیں۔ نماز روزے کی تلقین بچّوں کے ہوش سنبھالتے ہی شروع کی جاتی ہے۔ اور اکثر اوقات مدّت العُمر کے لئے مفید ثابت ہوتی ہے۔ نوجوانوں اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں جتنی تعداد نماز ادا کرنے والوں کی تُرکوں میں مل سکتی ہے۔ شاید اور کہیں نہ مل سکے گی۔ اور عورتیں چونکہ ہر جگہ مذہبی اُمور میں مردوں سے زیادہ محتاط ہوتی ہیں۔ اس لئے عثمانیوں کی نئی تعلیم یافتہ ہوئی لڑکیوں میں بھی نماز روزے کا چرچا ہے۔

---

[1] تُرکی میں کسی لڑکی کا ذکر کرتے ہیں۔ تو اُسے کریمہ کہتے ہیں۔ اور لڑکے کو مخدوم۔ یعنی "آپ کا صاحبزادہ" کہنے کی بجائے کہیں گے۔ "آپ کا مخدوم" اور "آپ کی صاحبزادی" کہنا ہو۔ تو "آپ کی کریمہ"۔

تعلیم نسواں

بچّوں کی تربیت کی جس خوبی کا ہیں گئے ذکر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ تعلیم یافتہ ماؤں بہنوں کے بغیر ناممکن ہے۔ اور یہ عثمانی عورتوں کے تعلیم یافتہ ہونے کا ہی نتیجہ ہے۔ کہ اُن کے بچے ایسے سُلجھے ہوئے ہیں۔ اُن کے ہاں یہ بات کُلی طور پر مسلّم ہے۔ کہ عورتوں کی تعلیم ویسی ہی اہمیت رکھتی ہے۔ جیسے مردوں کی تعلیم۔ صرف درجے کا فرق ہے۔ عام طور پر زنانہ مدرسوں کی تعلیم مضامین کے لحاظ سے ہمارے ہاں کے ہائی سکول کے برابر سمجھنی چاہیئے۔ اور سینا پرونا کاڑھنا۔ نقّاشی۔ موسیقی وغیرہ ہنر اس کے علاوہ ہیں۔ اور باقی مضامین کے ساتھ ساتھ سکھائے جاتے ہیں۔ اس سے اُوپر کے مدارج کی تعلیم کے لئے کوئی مدرسہ یا کالج عورتوں کے لئے نہیں ہے۔ لیکن بعض اُمرا جو اپنی لڑکیوں کو یورپ کے اُونچے گھروں کی لڑکیوں کے برابر تعلیم یافتہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ یورپ سے اُستانیاں منگوا کر گھروں میں انہیں پڑھاتے ہیں۔ اور وہ لڑکیاں فرانسیسی یا جرمن زبان میں نہایت معقول دستگاہ پیدا کر لیتی ہیں۔ اور اُن زبانوں کے ادبیات سے عمدہ واقفیت رکھتی ہیں۔ گو زیادہ مشکل اور فکر طلب مضامین سے آشنا نہیں ہوتیں۔

ایک دن اتفاق سے ہمیں اپنے ایک دوست کے گھر ایک فارغ التحصیل لڑکی کی معلومات کا اندازہ کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ لڑکی مدرسے کی تعلیم دو سال ہوئے ختم کر چکی ہے۔ اور اب اُستانی ہے۔ لڑکیوں کے مدرسے میں معلّمۂ دوم ہے۔ اس

روز ا اپنی بڑھیا والدہ کے ہمراہ ہمارے دوست کے ہاں آئی ہوئی تھی۔ وہ اس مدرسے کے نگران ہیں۔ اُن سے کچھ کہنا سُننا تھا۔ اس لئے اپنی سند ساتھ لائی تھی۔ ہمارے دوست نے وہ سند ہمیں لاکر دکھائی۔ کہ اس سے معلوم ہو کہ کن کن مضامین میں استانی صاحبہ نے امتحان دیا ہے۔ دیگر مضامین کے علاوہ تاریخ۔ جغرافیہ۔ حساب۔ عربی۔ فارسی اور فرانسیسی سب اُس سند میں درج تھے۔ ہم نے کہا خاصی جامع تعلیم ہے۔ مگر دریافت کیا کہ ان مضامین میں کس درجے کی مہارت حاصل ہے۔ اُنہوں نے کہا۔ یہ آپ خود دریافت کر سکتے ہیں۔ ہم نے کہا۔ کیسے؟ اُنہوں نے کہا۔ ہم اُستانی کو اور اُس کی ماں کو اُوپر بلالئے لیتے ہیں۔ میں نے حیران ہو کر کہا کہ وہ پردہ دار ہیں کیسے آئیں گی؟ اُنہوں نے کہا۔ اُن کی والدہ تو ضعیفہ ہیں۔ اب منہ چھپیا کر نہیں پھرتیں۔ اور اُستانی صاحبہ ابھی بن بیاہی لڑکی ہیں۔ اُن کے لئے بھی منہ چھپانا ضروری نہیں۔ مجھے اس دستور کا پہلے علم نہ تھا۔ اور میں بازار میں بعض اوقات چند نقاب پوش عورتوں میں کسی ایک آدھ کو بے نقاب دیکھ کر متعجب ہوتا تھا۔ اور یہ سمجھتا تھا۔ کہ یہ پردہ کی پرواہ نہیں کرتیں۔ لیکن معلوم ہوا۔ کہ ترکوں میں لڑکی جب تک بیاہی نہ جائے اُس وقت تک مجاز ہے۔ کہ منہ پر نقاب نہ ڈالے۔ فراجہ اوڑھے رہنا اس کے لئے کافی ہے کوئی بہت ہی حیادار ہوئی تو اُس نے نقاب گرا لیا۔ ورنہ جو نہ گرائے اُس کا عمل خلاف رواج نہیں۔ پردہ عثمانیوں میں اوّل تو دیر سے شروع ہوتا ہے۔ یعنی بارہ تیرہ برس تک تو لڑکی محض سر پر دوپٹہ لے کر باہر نکل سکتی ہے۔ اور اس کے بعد فراجہ پہننا شروع کرتی ہے۔ چہرے کا پردہ اصل میں بیاہ کے بعد شروع ہوتا ہے۔

وہ اُستانی صاحبہ آئیں اور اُن کی والدہ بھی ساتھ تھیں۔ السّلام علیکم وعلیکم السّلام ہم نے تکلیف دہی کی معذرت چاہی اور کہا۔ کہ مدّعا اُن کا امتحان نہیں۔ بلکہ مروجہ تعلیم نسواں کا اندازہ کرنا مقصود ہے۔ انہوں نے کہا۔ آپ بے تکلف جس مضمون کے متعلق چاہیں سوال

کریں ۔ مَیں اپنی واقفیت کے مطابق جواب دوں گی ۔ اور اس سے اگر کچھ آپ کو عام تعلیم کے متعلق قیاس کرنے میں مدد مل سکے ۔ تو مَیں خوش ہُوں گی ۔ ہم نے پہلے اُنہیں حساب کا ایک سوال دیا ۔ جو اُنہوں نے سیاہ بورڈ پر ہمارے رُوبرو حل کیا ۔ پھر ایک عربی عبارت لکھوائی ۔ اور اُس کا ترجمہ پُوچھا ۔ پھر فارسی کے چند فقرے پُوچھے ۔ پھر فرانسیسی کے کچھ نام جغرافیہ میں ہندوستان کے شہروں کے پُوچھے ۔ ان کی سمت وغیرہ سے وہ واقف تھیں ۔ ہمارے دوست نے ایک آدھ سوال تاریخ عثمانی کا پُوچھا ۔ اُس کا اُنہوں نے خاطر خواہ جواب دیا ۔ اس کے بعد ہم نے اُن کا شکریہ ادا کیا ۔ اور اُن کی قابلیت کی تعریف کی ۔ انہیں دیکھ کر اور اُن سے یہ معلوم کر کے کہ سب اُستانیوں کو ملازمت ملنے سے پہلے وُہی سند حاصل کرنی پڑتی ہے ۔ جو اُن کے ہاں تھی ۔ یہ اطمینان ہُوا ۔ کہ تعلیم نسواں اچھے ہاتھوں میں ہے ۔

جتنے حضرات سے میری مُلاقات استنبول میں ہوئی ۔ قریب قریب سب نے مجھے پُوچھا ۔ کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں تعلیم نسوان کی کیا حالت ہے ۔ جس سے معلوم ہوتا تھا ۔ کہ اس مسئلے کے ساتھ انہیں بہت دلچسپی ہے ۔ پُرانی وضع کے علما تک کو میں نے عورتوں کی تعلیم کی ضرورت پر متفق پایا ۔ ہاں یہ فرق ضرور ہے ۔ کہ ان میں سے اکثر فرانسیسی وغیرہ کا سبق عورتوں کے لئے ضروری نہیں سمجھتے ۔ بلکہ وہ اور اُن کے ہم خیال عورتوں کی تعلیم کے اس پہلو کو مضر سمجھتے ہیں ۔ سال گذشتہ کے اوائل میں استنبول میں ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آیا ۔ وہ یہ کہ وہاں کے ایک اچھے گھر کی دو جوان لڑکیاں جن کا باپ ایک معزز عہدہ دار ہے ۔ اور جس نے نئے خیالات کے سبب انہیں فرانسیسی معلّمہ کی شاگردی میں دیا تھا ۔ آزادی کے شوق میں فرانس بھاگ گئیں ۔ شاید فرانس کی آزادانہ زندگی کے حالات پڑھ کر انہیں پردہ میں رہنا دشوار معلوم ہُوا ۔ اُنہوں نے کسی ذریعہ سے دو فرانسیسیوں سے رسم و راہ پیدا کی اور

گھر چھوڑ دیا۔ ماں باپ پر جو مصیبت گذری ہوگی۔ اُس کا تو کیا ٹھکانا ہے۔ وہ اپنی دوسری بہنوں کے حق میں کانٹے بو گئیں اور اُن کے اعتبار میں فرق ڈال گئیں۔ مگر خوش قسمتی سے ایسے واقعات شاذ ہیں۔ اور اُن سے یہ قیاس کر لینا درست نہ ہوگا۔ کہ سب عورتیں جو فرانسیسی پڑھ سکتی ہیں۔ ایسی ہیں۔ یا اپنی حالت سے بیزار ہیں۔ فرانسیسی پڑھنے والی عورتوں کی تعداد وہاں بہت ہے۔ اور اُن میں بہت سی عورتیں اپنے شوہروں کی وفادار بیبیاں اور اپنے والدین کی وفادار لڑکیاں ہیں۔ جو مرنا قبول کریں مگر اپنی آبرو اور اپنے بزرگوں کے ناموس پر کوئی دھبہ نہ آنے دیں۔ البتہ آزاد خیالی یورپ کے اکثر ادبیات میں پائی جاتی ہے۔ اور فرانسیسی میں اور زبانوں سے بڑھ کر ہے۔ یہ اپنا اثر لئے بغیر نہیں رہتی۔

عثمانی عورتیں کتابوں کے سوا اخبارات اور رسالے بھی بکثرت خریدتی اور پڑھتی ہیں۔ اور اس طرح مُلک کے اخبارات کی اشاعت بڑھانے میں مردوں کے شریکِ حال ہیں۔ اُن کا سیر کرنے یا خرید و فروخت کے لئے باہر نکلنا بھی اُنہیں گرد و پیش کی دُنیا کی خبر دیتا رہتا ہے۔ اور یہ کہنا بالکل مبالغہ نہیں کہ تعلیم اور واقفیت عامہ کے لحاظ سے عثمانی خواتین آج کل اسلامی دُنیا کی پیشرو ہیں۔

عُثمانی مُعاشرت

عُثمانیوں کے ہاں تربیتِ اطفال اور تعلیم نسواں پر جو توجہ ہے ۔ اُس کا ذکر ان کی عام معاشرت پر صاف نظر آرہا ہے ۔ اُن کی معاشرت بہت سی باتوں میں ایشیا اور یورپ دونو کے تمدن کی جامع ہے ۔ اور قدرت نے جغرافیائی اعتبار سے جو جگہ یورپ اور ایشیا کے درمیان اُن کے وطن کو دی ہے ۔ وُہی صُورت اُن کی عادات اور طریق بود و باش میں پیدا ہو گئی ہے ۔ یعنی مشرق و مغرب کے بَین بَین ۔

استنبول میں عثمانیوں کا لباس عموماً یورپ کا لباس ہے ۔ عہدہ داران و ملازمانِ سرکاری اور جدید تعلیم یافتہ اور سب کے سب تجارت پیشہ لوگ اکثر کوٹ پتلون پہنتے ہیں ۔ فقط علماء اپنی پُرانی وضع نباہنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ مگر اُن کے لباس میں بھی بعض چیزیں مغرب سے گھُس آئی ہیں ۔ کوٹ عموماً لمبا پسند کیا جاتا ہے ۔ اور لمبا اوقات وہ جس میں گلا کھُلا نہیں رہتا ۔ یہ لباس دفاتر اور عدالتوں میں جانے اور کاروبار کی مصروفیت کے لئے ہے ۔ اس کے بعد جب شام ہوتی ہے ۔ اور لوگ کاروبار سے فارغ ہوتے ہیں ۔ تو عثمانی اپنے آرام دہ ایشیائی کپڑے پہن لیتے ہیں ۔ جسے دیکھو ایک لمبا سا چوغہ جو ٹخنوں تک پہنچتا ہے ۔ پہنے ہوئے کھڑا ہے ۔ چوغے مختلف رنگوں کے اور بہت خوشنما ہوتے ہیں ۔ یہ گویا عثمانیوں کا رختِ خواب ہے ۔ علیحدہ رختِ خواب رکھنے کی عادت انگریزوں اور دیگر اہل یورپ میں بھی موجود ہے ۔ مگر عثمانیوں کی رسم میں اور انگریزی رسم میں فرق یہ ہے ۔ کہ انگریز رختِ خواب پہن کر باہر نہیں نکل سکتے

اور عثمانی اپنے ڈھیلے چوغے پہنے ہوئے شام کے وقت بازار میں بھی نکل آتے ہیں۔ مسجد میں چلے جاتے ہیں۔ اور بے تکلف دوستوں کے ہاں ملاقات کو بھی جا سکتے ہیں۔

اکثر گھروں میں عورتوں کا لباس یورپ کا لباس ہے۔ یہاں تک کہ امرا اور اہلِ دولت کے ہاں تو بیگمات کے کپڑے پیرس سے بنوائے جاتے ہیں۔

مکانوں کی آرائش میں بھی دو نورنگ پائے جاتے ہیں۔ ہر خوشحال عثمانی کے گھر میں اگر ایک آدھ کمرہ پرانے طریق پر آراستہ ہے۔ تو ایک آدھ نئی طرز کا ہے۔ پرانی آرائش یہ ہے۔ کہ دیواروں کے ساتھ ساتھ اونچی گدیلے دار نشستیں ہیں۔ فرش پر امرا کے ہاں قالین بچھا ہے۔ تو متوسطین کے ہاں نفیس بوریا۔ فرش کو عموماً پاک رکھتے ہیں کہ اُس پر نماز ہو سکے۔ اسلئے وہاں جوتا پہنے نہیں آتے۔ یا تو بوٹ کے اُوپر موزے چڑھا لیتے ہیں یا وہ بوٹ پہنتے ہیں۔ جس کے اُوپر ایک گرگابی سی چڑھی ہوتی ہے۔ جو کمرہ میں داخل ہوتے وقت اُتار دی جاتی ہے۔ اور اس طرح اس کے اندر کا حصّہ صاف اور محفوظ رہتا ہے۔ اِس لئے اس بوٹ کو پہنے ہوئے لوگ مسجد میں جاتے اور نماز پڑھتے ہیں۔

عثمانی خورد و نوش کے طریق میں بھی مشرقی اور مغربی رواج کی ملاوٹ نظر آتی ہے۔ کھانا اب عموماً میز پر چُنا جاتا ہے۔ اور لوگ کرسیاں بچھا کر گرد بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک ایک صاف پلیٹ ہر شخص کے سامنے رکھی ہوتی ہے۔ اور میز کے وسط میں سب کھانے چُنے ہوتے ہیں۔ یورپ میں عام طور پر ایک ایک کھانا لانے اور نوبت بہ نوبت پیش کرنے کا دستور ہے۔ مگر یہاں چُن دینے کا طریقہ مشرقی اور کھانے کا طریقہ مغربی کر دیا گیا ہے۔ اکثر جگہ چھُری کانٹا بھی میز پر دیکھنے میں آیا ہے۔ مگر بعض جگہ چمچے اور کانٹے صرف کھانا بڑی رکابیوں سے نکالنے کے لئے برتے جاتے ہیں۔ اور کھانے والے ہاتھ سے کھاتے ہیں۔ کھانے میں ترکوں کی بعض

چیزیں یُورپ کے مذاق کے موافق ہیں۔ مثلاً اُبلا ہُوا گوشت۔ اَور بعض ایشیائی مذاق کے مطابق مثلاً ترکاری کا سالن۔ لیکن ہندوستان کا سا نمک مرچ مصالح وہاں استعمال نہیں کیا جاتا۔ دو چیزیں استانبول میں بہت شوق سے کھائی جاتی ہیں۔ ایک وُہی جسے ترکی میں یُغرت کہتے ہیں۔ جو غالباً وُہی لفظ ہے جو فارسی کتابوں میں جُغرات لکھا جاتا ہے۔ اور دُوسرے نمکین چاول جن پر کھانے کا خاتمہ ہوتا ہے۔ ایک آدھ میٹھی چیز دسترخوان پر ضرور آتی ہے۔ اور سب کھانوں کے بعد میوے آتے ہیں۔ میووں میں انگور بہت کثرت سے ملتا ہے۔ اَور انگور کے موسم میں ہر کہ و مہ انگور کھاتا دکھائی دیتا ہے۔ امیر کے دسترخوان پر اگر کھانے کے بعد انگور تکلف کے ساتھ عمدہ پلیٹوں میں چُنا ہُوا نظر آتا ہے۔ تو غریب مزدور کے ہاتھ میں بھی اُس کا ایک بڑا سا خوشہ نان و پنیر کے ساتھ موجُود ہے۔

کھانا رسٹوران میں کھانا اور وہیں تفریح یا آرام کے لئے بیٹھے رہنا یہ رواج بھی یورپ سے آیا ہے۔ مگر جو رسٹوران عثمانیوں کے ہاتھ میں ہیں۔ اُن میں غذا ایشیائی اَور نشست کا انتظام یورپی ہے۔ میز کرسی اَور چھُری کانٹا تو موجُود ہے۔ مگر طشتری میں کباب سیخ اَور کوفتے دھرے ہیں۔ اَور مُنہ میٹھا کرنا ہو تو فیرینی حاضر ہے۔ ترکاری کا سالن بھی مل سکتا ہے۔ روٹی البتہ وُہی ملتی ہے۔ جو یورپ بھر میں مروّج ہے۔ جسے نان پاؤ یا ڈبل روٹی کہتے ہیں۔ ایک بڑی سی روٹی کا ایک ٹکڑا کاٹ کر ہر شخص کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔ جتنے رسٹوران اس قسم کے ہیں جہاں عثمانی زیادہ جاتے ہیں یا جو عثمانیوں کے ہاتھ میں ہیں۔ اُن میں کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونے اَور مُنہ صاف کرنے کا سامان موجُود رہتا ہے۔ یہ طریقہ اسلامی ہے۔ کیونکہ یورپ میں اگر ہاتھ صاف ہوں۔ تو کھانے سے پہلے انہیں دھونا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ اَور کھانے کے بعد ہاتھ دھونے یا مُنہ صاف

کرنے کا تو رواج یورپ میں بہت ہی کم ہے۔ نہایت پُرتکلّف موقعوں پر کھانے کے بعد بلوری پیالوں میں تھوڑا تھوڑا پانی کھانے کے اختتام پر حاضرین کے سامنے رکھا جاتا ہے۔ اِس میں ذرا اُنگلیاں ڈبو لیتے ہیں۔ کیونکہ وہاں سب چھُری کانٹے سے کھاتے ہیں۔ اور اِس لئے اُنہیں ہاتھ دھونے نہیں پڑتے۔

عثمانیوں کی ایک خوبی قابلِ داد ہے۔ کہ بعض بے ضرر باتوں میں فرنگستان کی تقلید کرنے اور دن رات یورپ کی عیسائی اقوام سے ملنے کے باوجود اُنہوں نے آج تک بہ حیثیتِ قومی شراب سے پرہیز قائم رکھنے میں اپنے اسلام کی پختگی کا ثبوت دیا ہے۔ یورپ بھر کے بڑے شہروں میں سے شراب کی فروخت سب سے کم استانبول میں ہے۔ اور جو بکتی ہے۔ اُس کے بھی صَرف کرنے والے بیشتر ملک کے عیسائی باشندے یا غیر ملکی عیسائی ہیں جو استانبول میں کاروبار یا ملازمت کے سلسلے میں مقیم ہیں۔ ترکوں میں بھی کچھ لوگ خصوصاً مغربی تعلیم پائے ہوئے یا طبقۂ اُمراء میں ایسے ہیں جو شراب پیتے ہیں۔ مگر اُن کو یہ مجال نہیں کہ وُہ علانیہ شراب پئیں۔ جو کوئی پیتا ہے چھُپا چوری پیتا ہے۔ شہر میں بالعموم اور خاص کر اُس حصّے میں جہاں مسلمان آباد ہیں۔ شراب بِکتی ہی نہیں۔ ہوٹل والوں کے پاس البتّہ موجود رہتی ہے۔ تاکہ وُہ اپنے اُن گاہکوں کو جو کھانے کے ساتھ شراب کے استعمال کے عادی ہوں وقت پر مہیّا کر دیں۔ یورپ بھر میں شراب کے استعمال کی کثرت ایک ایسی وباء ہے۔ جس کا زہریلا اثر وہاں کے دُور اندیش عرصے سے محسُوس کر رہے ہیں۔ اور اپنی قوموں کے مستقبل سے ہر وقت خائف رہتے ہیں۔ کہ اگر اس بلا کا یہی زور رہا تو یہ ضرور روزِ بد دکھائے گی۔ عثمانیوں کو یہ شعارِ اسلامی نباہنے سے کئی قسم کے فائدے ہُوئے ہیں جن میں سے ایک فائدہ یہ ہے۔ کہ اُن کی سپاہ صُوفی سپاہ ہے۔ اور اُن کے عسکریوں کی بہادری شراب سے جوش میں لائے جانے کی محتاج

نہیں۔ اور اس پر الیسی ہے۔ کہ پینے والے بہادروں کے نشے اُتار دیتی ہے۔
جہاں شراب سے عثمانیوں نے پرہیز کیا ہے۔ وہیں تمباکو کے استعمال میں دیگر اقوامِ یورپ کو بھی مات کر دیا ہے۔ تمباکو کا استعمال یوں تو دُنیا بھر میں عام ہے اور مشکل سے کوئی چیز خیال میں آسکتی ہے جو اس قدر ہر دلعزیز ہو۔ لیکن یورپ میں اِس کا رواج بہ حیثیّت مجموعی ایشیا سے زیادہ ہے۔ باوجود اِس کے کہ وہاں ہر مُلک میں تمباکو پر بہت بھاری محصُول کا بوجھ ہے اور اِس لئے بہت گراں بکتا ہے۔ پھر بھی غریب امیر سب اس کے دِلدادہ ہیں۔ اور غُرباء اپنی محدود آمدنیوں کا ایک معقول حِصّہ سِگرٹ اور تمباکو پر صَرف کر دیتے ہیں۔ ٹرکی میں تمباکو دیگر ممالک یورپ سے نفیس تر بنتا ہے۔ اور ٹرکی کے تمباکو کی یورپ بھر میں دھوم ہے۔ مگر باوجود اِس شہرت کے اتنا باہر نہیں جاتا۔ جتنا مُلک کے اندر خرچ ہوتا ہے کیونکہ مُلک میں ہر شخص اِس کا فدائی ہے۔ ہمارے ہاں ہندوستان میں علمائے دین اور دیگر مقدّس لوگ بالعموم تمباکو سے پرہیز کرتے ہیں۔ برخلاف اِس کے ٹرکی میں بڑے بڑے علماء بھی اِس شوق سے خالی نہیں۔ خود سگرٹ پیتے اور مہمانوں کو پلاتے ہیں۔ اور بہت ہی شاذ ہے کہ کوئی شخص اِس کی عادت نہ رکھتا ہو۔ سگرٹ کو ٹرکی میں جغارہ کہتے ہیں۔ لفظ سِگار کی صُورت بدل کر اس کی تصغیر بنالی ہے۔ اور جہاں جاؤ۔ جغارہ پہلے لاکر سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔ مجھے جب کبھی عُذر کرنے کا اتّفاق ہوًا۔ تو میرے عثمانی میزبان عموماً نہایت ہی تعجب سے پُوچھتے تھے۔ "کیا تمہارے ہاں لوگ جغارہ نہیں پیتے؟" میں کہتا تھا "ہمارے ہاں بھی بہت سے اِس کے شائق ہیں۔ مگر آپ سے کم۔ اور میں اُن لوگوں میں ہُوں جنہوں نے نئی تہذیب کا یہ تمغہ نہیں حاصل کیا۔" زیادہ قابلِ افسوس بات یہ ہے۔ کہ عثمانی خواتین میں بھی جغارہ کا رواج بہت ہے۔ اہلِ یورپ کسی تُرک خاتون کی جب

کبھی تصویر دِکھاتے ہیں۔ خواہ کہانیوں میں۔ خواہ سٹیج پر۔ اور خواہ تصویر خانوں کی دیوار پر۔ ہمیشہ اس کے ہاتھ میں سگارہ ہوتا ہے۔ جس سے دُھواں نکلتا ہوتا ہے۔ ممکن ہے وُہ اس میں کچھ مبالغہ کرتے ہوں۔ لیکن خود عثمانیوں نے یہ شکایت مجھ سے کی کہ مستورات میں یہ عادت بہت بڑھ گئی ہے۔ یورپ کے دُوسرے ممالک میں بھی بعض عورتیں کبھی کبھی سگرٹ کا شوق کرتی ہیں۔ مگر سوائے بعض بیباک عورتوں کے علانیہ سگرٹ پینا لیڈیوں کے لئے عیب سمجھا جاتا ہے۔ اور سب خواتین مردوں کے روبرو سگرٹ پینے سے رُکتی ہیں۔ اور مرد یہ احتیاط کرتے ہیں۔ کہ جہاں خواتین جمع ہوں۔ وہاں اوّل تو سگرٹ پیتے ہی نہیں۔ اور پئیں تو اُن سے معافی اور اجازت مانگتے ہیں۔

قہوہ کا استعمال عثمانیوں کے ہاں شائد سگرٹ سے بھی زیادہ بڑھا ہوا ہے۔ اور قہوہ گو بجائے خود ایسی بُری چیز نہیں۔ تاہم حد سے زیادہ کوئی چیز بھی اچھی نہیں ہوتی۔ اور عثمانی قہوہ پینے میں بسا اوقات حد سے گذر جاتے ہیں۔ قہوہ یورپ میں اُن کی بدولت مقبول ہوا ہے۔ اور ترکی قہوہ شہرۂ آفاق ہے۔ لنڈن کے بڑے بڑے ہوٹلوں میں کھانوں کی فہرستوں یا اشتہارات پر جلی حروف میں "ٹرکش کافی" لکھا ہوتا ہے۔ اور پیرس میں اِس کا شوق اور بھی زیادہ ہے۔ مگر وہاں اکثر لوگ دُودھ ملا کر کافی پیتے ہیں۔ حالانکہ تُرکوں میں بے شیر پینے کا زیادہ رواج ہے۔ بلکہ بہت جگہ تو شکر بھی نہیں ڈالتے۔ تلخ ہی پسند کرتے ہیں۔ ٹرکی میں جو پیالیاں قہوہ کے لئے مخصوص ہیں۔ وہ گو چھوٹی چھوٹی ہوتی ہیں۔ تاہم لوگوں کے ہاں ملاقات کو آنے جانے والے صبح سے شام تک تیس چالیس پی جاتے ہیں۔ عادت عجیب چیز ہے۔ اُنہیں کوئی فوری نقصان نہیں ہوتا۔ ورنہ جسے عادت نہ ہو۔ اُسے تین چار دفعہ قہوہ پینے سے نیند آنے میں دُشواری محسوس ہونے لگتی ہے۔

استانبول میں رہ کر قہوہ سے قطعی پرہیز مُشکل ہے۔ جب کوئی کسی سے ملنے جائے۔

توسب سے پہلی تواضع یہ سمجھی جاتی ہے۔ صاحب خانہ ابھی حرم سے نہ بھی برآمد ہُوئے ہوں تو سلیقہ شعار ملازم خود ہی قہوہ لے کر آموجُود ہوتے ہیں۔ فرض کیجئے کسی نے ابھی ایک پیالی ختم کی۔ اتنے میں صاحبِ خانہ برآمد ہوئے۔ وُہ آتے ہی سلام اور مزاج پُرسی کے بعد قہوہ منگوائیں گے اور دوبارہ پیش کریں گے۔ اب انکار بھی کرو تو وُہ اصرار کرتے ہیں اور پلا دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں "پی بھی لیجئے۔ ایک ذرا سے قہوہ سے کیا ہوتا ہے"! اگر آپ کے رُخصت ہونے سے پہلے اُن کا ایک آدھ مُلاقاتی اور آگیا۔ تو از سرِ نو قہوہ کا دَور چلتا ہے۔ غرض قہوہ اور جغارہ نوبت بہ نوبت پیش ہوتے رہتے ہیں۔ کوئی گھر میں ہو یا دفتر میں۔ دوست کے مکان پر ہو یا رستوران میں بعض پُرانی وضع کے لوگ رستوران میں جاکر نارگیلہ کا بھی شوق کرتے ہیں۔ یہ ہمارے پیچوان کی سی چیز ہے۔ صِرف اِتنا فرق ہے۔ کہ حُقہ تانبے یا پیتل کے بجائے بلّور کا ہوتا ہے۔ اور اِس میں صاف پانی ہر وقت بدلا جاتا ہے۔ اور جب کوئی شخص پیچوان کو مُنہ لگاتا ہے۔ تو بلوّری حُقّے میں پانی کے بُلبلے عجب بہار دیتے ہیں۔

اخلاق و آداب میں عثمانی اب تک اپنے ایشیائی بزرگوں کے پیرو ہیں بلکہ اُنہوں نے پُرانے آداب کی سادگی میں بہت کچھ تکلّف پیدا کر دیا ہے۔ ہندوستان میں لکھنؤ تکلّف کے لئے مشہور ہے۔ اور حیدرآباد کا تکلّف بھی کچھ کم نہیں۔ مگر استانبول میں جو تکلّف آدابِ صُحبت میں ملحُوظ ہے۔ وُہ اِن دونوں سے بڑھ کر ہے۔ فرض کیجئے۔ آپ ایک ایسے شخص کے ہاں جاتے ہیں جو عُمر میں یا علم میں یا رُتبہ میں آپ سے بڑا ہے۔ آپ کمرہ میں داخل ہوتے ہی جُھک کر سلام کرتے ہیں۔ اور اُس کے ہاتھوں یا دامن کی طرف بڑھتے ہیں۔ کہ ہاتھ یا دامن کو ادب سے بوسہ دیں۔ وُہ اپنا خلق یُوں ظاہر کرتا ہے۔ کہ اپنے ہاتھ یا دامن کو

کھینچ لیتا ہے اور کہتا ہے "اَسْتَغْفِرُاللّٰہ" یعنی آپ مجھے کیوں محجوب کرتے ہیں۔ میں اس قابل نہیں۔ کہ آپ میرے دامن کو بوسہ دیں۔ اور آپ سے مصافحہ کرتا ہے۔ اس کے بعد آپ کرسی یا دیوان پر بیٹھ جاتے ہیں۔ اب صاحب خانہ اپنی کرسی سے اُٹھ کر یا جھک کر سلام کو ہاتھ اُٹھاتا ہے۔ اور خیر مقدم کہتا ہے۔ آپ پھر اُسی سلام کے تشکر یہ میں سلام کرتے ہیں۔ اگر مجلس میں اور کچھ معززین حاضر ہیں۔ تو اب آپ اُن کو سلام کرتے ہیں۔ اور وُہ آپ کو۔ اس لمبی رسم کے ادا ہو چکنے پر قہوہ اور جغارہ کی باری آتی ہے۔ اور پھر کہیں کوئی مطلب کی بات شروع ہوتی ہے۔ اِس میں شک نہیں۔ کہ یہ رسوم پُر لُطف ہیں۔ مگر وقت کا بیحد خون کرتی ہیں۔ اور زمانہ اِن میں تھوڑی بہت ضرور ترمیم کر دیگا۔ گو اب تک اِن کے قدردان کثرت سے موجود ہیں۔ جو کوئی استانبول دیکھنے آتا ہے۔ اگر اُسے عثمانیوں سے ملنے جلنے اور اُن میں بیٹھنے اُٹھنے کا موقعہ ہوتا ہے تو اُن کے اخلاق کا ثنا خوان ہو جاتا ہے۔

عثمانی عورتوں کی حالت بھی وہی دو تمدنوں کے بَین بَین ہے۔ اُن کا لباس یورپی ہے۔ اور تعلیم بھی بہت کچھ یورپی۔ مستورات میں سیر کے لئے نکلنے ریل اور جہاز میں مستعدانہ سوار ہونے کی عادت مغربی ہے۔ تو قبور کی زیارت فقراء سے عقیدت مشرقی۔ شادی بیاہ میں ہندوستانی خواتین کے مقابلے میں اُنہیں ایک آسانی ہے۔ کہ اُن کے ہاں حلقۂ اِنتخاب وسیع تر ہے۔ لیکن یہ شرط کہ شادی کے معاملے میں وُہ اپنے والدین کے اِنتخاب کی پابند ہیں۔ شادی بیاہ کی رسُوم تُرکوں میں ایسی پیچیدہ اور ایسی مسُرفانہ نہیں جیسی ہندوستانی مسلمانوں کے طبقۂ اُمراء اور شُرفاء میں رواج پا گئی ہیں۔ اور اب شادی کے موقعے پر کوئی بڑا مجمع کرنے یا بڑی بڑی دعوتیں دینے کا بھی دستور نہیں رہا۔

گانے بجانے اور موسیقی کا شوق ہر قوم میں کم وبیش پایا جاتا ہے۔ اور ترک کچھ اِس سے مستثنےٰ نہیں۔ مگر رقص و سرود کی مجلسیں اُن کے ہاں عام نہیں۔ البتہ اُنہوں نے یورپ سے موسیقی کی باقاعدہ تعلیم کا دستور اخذ کرلیا ہے۔ اور اُسے لڑکیوں کے مدارس میں مضامین درس میں شامل کیا ہے۔ چنانچہ اکثر تعلیم یافتہ لڑکیاں اِس سے واقف ہیں۔ اور اپنے گھروں میں گاتی بجاتی ہیں۔ کہیں کہیں لڑکے بھی موسیقی سیکھتے ہیں۔ مگر وُہ بیشتر فوجی ملازمت کے لئے سیکھتے ہیں۔ اور فوجی بینڈ میں بھرتی ہو جاتے ہیں۔ ترکوں نے موسیقی کی کتابیں اپنی زبان میں یورپ کے نمونے پر تیار کی ہیں۔ اور بینڈ میں ہر بجانے والے کے آگے موسیقی کے اشارات کی ایک کتاب رہتی ہے۔ جسے دیکھ دیکھ کر اپنے سرگروہ کی اُنگلی یا چھڑی کے اشاروں پر وُہ چلتا ہے۔ ترکوں کی اِن کتابوں سے فارسی یا اُردو میں اِشاراتِ موسیقی بنانے میں بہت مدد مل سکتی ہے۔ کیونکہ اِن تینوں زبانوں کے حروف وُہی ہیں۔

شہر کے قریب سیر و تفریح کے لئے نکلنا بھی عثمانیوں کے ہاں بکثرت مرّوج ہے۔ حکومت کی طرف سے نقل و حرکت کے متعلق سخت روک تھام ہے۔ مُلک کے اندر ایک شہر سے دُوسرے شہر تک جانے کے لئے رعایائے عثمانی کو بھی تذکرہ یعنی پروانۂ راہداری حاصل کرنا پڑتا ہے۔ اِسی وجہ سے مُلک سے باہر جانے کے لئے تو اور بھی زیادہ باز پُرس ہوتی ہے۔ پس اب یہ لوگ دُکانِ خانہ میں بیٹھے ہیں۔ اور اِسی سے اُن کی ترقی بہت کچھ رُکی ہوئی ہے۔

تجارت اور صنعت کی طرف کو عام میلان نہیں ہے۔ اور اکثر ملازمت سرکاری کو ہی ذریعہ عزّت و دولت سمجھا جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہاں کے لوگوں میں تجارت اور صنعت کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتے معمُولی دُکان دار کو بھی لوگ عزّت سے بُلاتے ہیں۔ اور وُہ اپنے آپ کو عزّت کا مستحق سمجھتا ہے۔ بہت سی دُکانوں پر خوشخط قطعے

لٹک رہے ہیں جن پر "اَلْکَاسِبُ حَبِیْبُ اللّٰہِ" لکھا ہُوا ہے۔ یعنی جو شخص کسی جائز پیشے سے روزی کماتا ہے۔ خدا اُسے دوست رکھتا ہے۔

مذہبی فرائض کی پابندی تُرکوں میں اکثر اَور ممالکِ اسلامی سے زیادہ ہے۔ جمعہ کی نماز بڑی دھوم دھام سے ہوتی ہے۔ اَور شہر بھر کی جامع مسجدیں اُس دِن بھری ہوتی ہیں۔ رمضان میں مسجدوں کی رونق اَور سجاوٹ قابلِ دید ہوتی ہے۔ اَور افطاریوں کے جلسے نہایت پُر لطف۔ بڑی بات یہ ہے۔ کہ نئی روشنی کے لوگ فرانسیسی تربیت پائے ہوئے عثمانی بھی اِن فرائض سے غافل نہیں۔ نماز روزہ کے علاوہ وِرد وظیفہ کا یہاں بہت شوق ہے۔ اَور پیر و جوان جسے دیکھو ہاتھ میں تسبیح لِئے پھر رہا ہے۔ یہاں تک کہ تسبیح ایک قسم کا فیشن ہوگئی ہے۔ اَور کئی نمود کے طالب ایک خوبصورت قیمتی تسبیح ہاتھ میں رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اَور اِس عادت میں استانبول کے بہت سے عیسائی اِن کے شریکِ حال ہیں۔
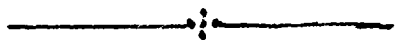
عیسائیوں سے تعلقات

تُرکوں اور عیسائیوں کے تعلقات باہمی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ اور تُرکوں کی موجودہ طرزِ معاشرت پر ان تعلقات نے گہرا اثر ڈالا ہے۔ ٹرکی میں دو قسم کے عیسائی نظر آتے ہیں۔ ایک مُلکی ایک غیر مُلکی۔ مُلکی عیسائیوں کا طریق بود و باش اور بہت سی اور باتیں اپنے مسلمان ہمسایوں سے ملتی ہیں۔ اوّل تو سب تُرکی زبان بے تکلف بولتے ہیں۔ اور گفتگو میں خالص اسلامی الفاظ بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً انشاء اللہ۔ استغفر اللہ۔ اُن کے کھانے پینے میں بھی وہی تُرکی مذاق موجود ہے۔ سالن بھی تُرکی طریقہ پر پکاتے ہیں۔ دُودھ۔ دہی۔ فیرینی وغیرہ اِن سب چیزوں کے اپنے تُرک ہمسائیوں کی طرح شایق ہیں۔ تُرکی مٹھائی جو یورپ میں "ٹرکش ڈیلائیٹ" یعنی فرحتِ ترکی" کے نام سے مشہور ہے۔ تُرکوں اور عیسائیوں دونوں میں مقبول ہے۔ رسٹوران میں اگر دو چار تُرک نارگیلہ پیتے نظر آتے ہیں۔ تو دو چار عیسائی بھی اِس کا شوق کر رہے ہیں۔ ایسے رسٹوران بکثرت ہیں جن کے مالک اور مہتمم عیسائی ہیں۔ مگر مسلمان اُن میں کھانا کھاتے ہیں۔ عیسائی بھی وہیں آتے اور اُنہی میزوں پر اُنہی برتنوں میں کھانا کھاتے ہیں۔ عیسائی دُکان دار اپنے مسلمان گاہکوں کی خاطر سے لحم الخنزیر سے اور غیر مذبوح گوشت سے پرہیز کرتے ہیں۔ اور اُسے اپنی دُکان میں نہیں رکھتے۔ اور اِس لئے عیسائی اور مسلمان دونوں کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اِن مقامات میں ملتے جلتے ہیں اِس کے علاوہ تفریحی مشغلے بیشتر مشترک ہیں۔ ناٹک وغیرہ کے تماشے عیسائیوں کے

ہاتھ میں ہیں۔ مگر وہ کھیل ترکی میں کرتے ہیں۔ اور تماشائیوں میں مسلمان شامل ہوتے ہیں اور عیسائی بھی۔ تماشے میں پارٹ کرنے والی عورتیں سب عیسائی ہوتی ہیں۔ کوئی مسلمان عورت پارٹ نہیں کرتی۔ مگر یہ عیسائی عورتیں زبان دانی میں ترکی عورتوں کی مدمقابل ہوتی ہیں اور عثمانی مستورات کی زندگی کی تصویر خوب اتار سکتی ہیں۔

غیر ملکی عیسائی بھی ٹرکی کے دارالخلافہ میں بکثرت رہتے ہیں۔ کچھ تجارتی ضرورتوں سے کچھ تعلیمی اور مذہبی کاموں کے لئے اور کچھ سیاسی معاملات کے متعلق۔ ان کی عادات میں اور ترکوں کی عادات میں بہت سا فرق ہے۔ مگر ان عیسائیوں کے ساتھ بھی استانبول میں عثمانیوں کی خاصی نہیں ہے۔ تالی ہمیشہ دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ اور یہاں یہ دیکھا جاتا ہے۔ کہ ترک اور عیسائی دونو اس کوشش میں رہتے ہیں۔ کہ باہمی میل جول بآسانی جاری رہے۔ ایک طرف تو ترکوں نے ان لوگوں کو بہت سی رعایتیں دے رکھی ہیں۔ اور دوسری طرف یہ لوگ بھی کسی قدر اپنا مزاج یہاں آکر بدل لیتے ہیں۔ فرانسیسی طبیعت تو سیال ہی ہے۔ ہر سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ مگر لطف یہ ہے۔ کہ جرمن اور انگریز بھی استانبول میں ذرا نرم ہو جاتے ہیں۔ انگریزوں کی نسبت یورپ میں ایک مثل مشہور ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے۔ کہ ان کی اکثر کی یہ حالت ہے۔ کہ جہاں ان کی حکومت نہ بھی ہو وہاں بھی یوں اکڑ کے چلتے ہیں جیسے ساری دنیا ان کے زیرنگیں ہے۔ مگر میں نے دیکھا کہ استانبول میں یہ کیفیت نہیں۔ بازاروں اور سڑکوں پر چلنے پھرنے میں جو مساوات حاکم و محکوم۔ مسافر و مقیم میں یورپ کے بڑے شہروں میں نظر آتی ہے۔ وہی نظارہ استانبول کے بازاروں۔ گلی کوچوں اور پلوں پر نظر آتا ہے۔ غریب۔ امیر۔ مسلمان۔ عیسائی۔ یہودی اور گبر سب ایک دوسرے کے ساتھ چل رہے ہیں۔ اور کوئی دوسرے سے تعرض نہیں کرتا۔ انگریز۔ جرمن اور فرانسیسی وہاں یہ توقع نہیں رکھتے کہ کوئی ان کے لئے راستہ چھوڑے اور نہ کسی کو درشت الفاظ

سے مخاطب کرتے ہیں۔ اور ترک بھی اُن پر کسی قسم کا تحکم نہیں کرتے۔ اور یہ دستور ترکوں میں کچھ اب سے نہیں۔ کہ ترک سیاسی کمزوری سے نرم ہو گئے۔ بلکہ اس بارے میں وہ ہمیشہ معقول اور آزاد خیال رہے ہیں۔ اور اپنے اقتدار کے زمانے میں اُنہوں نے بڑی بڑی رعایتیں عیسائیوں پر کی ہیں۔

ملکی عیسائیوں سے جو رعایتیں ترکوں نے کی ہیں۔ اُن میں سب سے اوّل مذہبی آزادی ہے۔ اور وہ بھی ایسے وقت میں جب دُنیا میں بہت کم ایسے حصّے تھے جہاں یہ خیال موجود تھا۔ ارمنی اور یونانی دونو گرجے اُس زمانے سے آج تک بالکل آزاد اور اپنے اندرونی انتظام میں خود مختار چلے آتے ہیں۔ اور اُن کے باہمی تنازعات جب ناگوار صورت اختیار کرنے لگتے ہیں تو اُس وقت ترکوں کا زبردست ہاتھ اُن کے درمیان آکر بیچ بچاؤ کرتا۔ اور اُنہیں خونریزی سے روکتا ہے۔ اِن دونوں فریقوں کے بڑے بڑے قسیس اور رہنما اب تک انعامات۔ تمغے اور جاگیریں پاتے ہیں۔

دوسری رعایت جو اُن کے ساتھ کی گئی یہ تھی کہ صیغہ فوج کے سوا باقی سب صیغوں میں انہیں ترکوں کے برابر حقوق دیئے گئے جس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ اس وقت بہت سے عیسائی مناصب جلیلہ پر ممتاز ہیں۔ ٹرکی کے سفیر اور قونصل بہت سے عیسائی ہیں اور بڑی بڑی تنخواہیں پاتے ہیں۔ اور اُن پر اِسی طرح اعتماد اور اعتبار کیا جاتا ہے جیسے کسی ترک پر کیا جاتا ہے۔ علوم و فنون کے مکاتب میں اور تمام اُن خیراتی کارخانوں میں جو سلطنت کی طرف سے قائم ہیں۔ عیسائیوں کے حقوق کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے کئی باتوں میں عیسائی بمقابلہ ترکوں کے آرام میں ہیں۔ اور اُن کے اُمور میں اس قسم کی مداخلت نہیں ہوتی۔ جیسے ترکوں کے معاملات میں۔ اُن تعلیم گاہوں میں جو عیسائی بچوں کے لئے قائم کی ہیں۔ سب سے بڑی تعلیم گاہ رابرٹ کالج ہے۔ اور یہ کالج کئی وجوہ سے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے جس پہاڑی پر سلطان محمد فاتح کی مشہور

یادگارِ روم ایلی حصار کے کھنڈر ہیں۔ اُس پہاڑی کی چوٹی پر قلعہ سے ذرا اُوپر اس کالج کی رفیع الشان عمارت اور اس کے ساتھ ایک وسیع میدان ہے۔ امریکہ کے ایک دولتمند رابرٹ نامی کی فیاضی سے یہ کالج قائم ہُوا ہے۔ اور اس کا منشا ممالکِ عثمانی کے عیسائی نوجوانوں کی تعلیم ہے۔ اس کے ساتھ ایک عالیشان بورڈنگ ہوس بنا ہے۔ اور اس میں تقریباً چار سو طالبِ علم رہتے ہیں جن میں بہت سے رعایائے عثمانی ہیں۔ اور کچھ طالبِ علم گردونواح کی ریاستوں سے بھی آئے ہُوئے ہیں۔ یہ سب انگریزی پڑھتے ہیں۔ اور دیگر السنۂ یورپ بھی حسبِ پسند سیکھتے ہیں۔ علوم و فنونِ جدیدہ میں اکثر کا درس یہاں دیا جاتا ہے۔ مگر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ طلبہ سیاسی جنگ کے لئے تیار کئے جاتے ہیں۔ مَیں نے اس کالج کا کتب خانہ دیکھا۔ اس میں دُنیا بھر کا ریولیوشنری لٹریچر ہے۔ یعنی وُہ کتابیں جو مختلف ممالک کے حصُولِ آزادی کی داستانیں بیان کرتی ہیں اور یہ سکھاتی ہیں۔ کہ فلاں زبردست سلطنت کس طرح اُکھاڑ کر پھینک دی گئی۔ اس کالج کے طلبہ عموماً اپنا مقصدِ زندگی یہ سمجھتے ہیں۔ کہ تحصیلِ علم سے فارغ ہو کر وُہ اپنی ہمت عیسائی اقوامِ مشرق کو مطلق العنان کرنے میں صرف کریں گے۔ اور اس کالج والے علانیہ یہ دعوے کرتے ہیں۔ کہ بلغاریوں کو جن لوگوں کی ہمّت سے آزادی حاصل ہوئی ہے۔ وُہ یہیں کے تعلیم یافتہ تھے۔ اور اب جو نئے لوگ پیدا ہونگے۔ وُہ باقی ماندہ اقوام کو تُرکوں کی حکومت سے نکالیں گے۔ یہ کالج کوئی چالیس سال سے جاری ہے۔ جب یہ قائم ہُوا۔ اُس وقت فرمانِ سُلطانی سے اِس کے بنانے کی اجازت دی گئی تھی۔ اور اِس کیلئے زمین عطا ہوئی تھی۔ اِس بے تعصّبانہ روش کا اب یہ انعام مِل رہا ہے۔ کہ اس کالج کی تعلیم کا خاص منشا عثمانیوں کی مخالفت ہے۔ مگر حکومتِ عثمانیہ کی طرف سے عیسائیوں کے حق میں نرمی کا برتاؤ برابر جاری ہے۔

طریقۂ مولویہ کی مجلس

مولانا روم کے نام لیوا ہر جمعہ اپنے تعلّق عقیدت کی یادگار تازہ رکھنے کیلئے مجلس سماع کرتے ہیں۔ بلادِ یورپ میں یہ لوگ درویشانِ رقاص کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ درویش اپنے یہاں کے برآمدہ میں سے اجنبیوں کو بھی تماشا دیکھنے کی اجازت دیتے ہیں۔ اور اسے ایک ذریعۂ آمد بنائے ہوئے ہیں۔ یورپ کے سیّاح بکثرت ہر جمعہ یہ تماشا دیکھنے آتے ہیں۔ اور اِسے عجائباتِ استانبول میں سمجھتے ہیں۔ اس مجلس کی صورت یہ ہے۔ کہ دو تین آدمی رہنما درویشوں میں سے ساز بجاتے ہیں۔ اور باقی رقص کے جامے پشواز نما پہن کر رقص کرتے ہیں۔ مگر اس رقص میں انہیں بیخود ہوتے نہیں دیکھا۔ غالباً اِسکی ابتدا تو یہی ہوگی۔ کہ صاحبانِ حال فرطِ بیخودی سے رقص میں آگئے۔ لیکن اب موجودہ یارانِ طریقت نے تو اسے ایک فن بنا لیا ہے۔ اور بیٹھے بیٹھے جھٹ اُٹھ کر ساز کی آواز کے ساتھ دست و پاء کی حرکات کو مِلاتے ہیں۔ اور رقص کرنے لگتے ہیں۔ ایک فاضل تُرک نے مجھے ایک حکایت سُنائی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا کا یہ منشا نہ تھا۔ کہ اُن کے سب پیرو بغیر صاحب حال ہونے کے یوں رقص کریں۔ اُس نے بیان کیا۔ کہ مولینا علیہ الرحمتہ ایک دفعہ تنہا بیٹھے تھے۔ حالتِ وَجد میں اُٹھ کر رقص فرمانے لگے۔ دو چار مرید جو آئے۔ اُنھوں نے مُرشد کو دیکھ کر تقلید کی۔ کچھ دیر کے بعد جب مولینا ہوش میں آئے تو مُریدوں کو اپنے گرد ناچتے پایا۔ ہنسے اور ارشاد فرمایا" مَیں نے تو کچھ دیکھا تھا۔ اِس لئے خوشی کے مارے ناچنے لگا۔ تم نے کیا دیکھا ہے۔ جو ناچ رہے ہو"۔ مثنوی شریف میں ایک لومڑی کی حکایت بھی ہے۔ کہ اُس نے اپنے حیلے سے شیر کو کنوئیں میں گرا دیا تھا۔ اور کنوئیں کے گرد خوشی سے ناچ رہی تھی۔

جنگل کے اور جانور آئے اور اُسے دیکھ کر ناچنے لگے۔ تو اُس نے اُنہیں کہا۔ کہ میں تو کچھ دیکھ کر ناچ رہی ہوں۔ تم بے دیکھے بھالے اور بے جانے بوجھے کیا کر رہے ہو۔ میرے فاضل دوست کہتے تھے۔ کہ اِس حکایت میں مولینا نے اپنے اِس واقعہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ مگر افسوس اُن کے نام لیوا اِس ہدایت کی طرف سے بے پرواہ ہیں۔ اس طریقت کے درویشوں کا ایک خاص لباس ہے۔ جس میں نمدہ کی لمبی ٹوپی خاکی رنگ کی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ اور وُہ ہر جگہ اس اپنی وردی سے پہچانے جاتے ہیں۔

تین سال کے بعد

داخلۂ وطن

میری غریب الوطنی کا زمانہ ختم ہُوا۔ میں نے تین سال بلادِ غرب کی ہوا کھائی۔ دُنیا کے اُس حِصّے کو دیکھا۔ جو آج کل علم و دولت کی کان اور تہذیب و تمدّن کی جان سمجھا جاتا ہے۔ وہاں بہت سی باتیں ایسی دیکھیں جن سے یہ ثابت ہُوا۔ کہ حضرت انسان خواہ تہذیبِ ظاہری کے کتنے ہی مدارج طے کیوں نہ کرلیں پھر انسان ہیں۔ اہلِ غرب میں وہی کمزوریاں موجود ہیں۔ جو اہلِ شرق میں ہیں فطرتِ انسانی وہی رنگ یورپ میں دکھاتی ہے۔ جو ایشیا کا خاصّہ سمجھا جاتا ہے۔ ایشیا اور یورپ کی اِس ہم رنگی کے باوجود بہت سی چیزیں ایسی نظر آئیں جن میں یورپ اس وقت ایشیا سے آگے ہے۔ اِن سب کی تفصیل کا جاننا ہمارے ابنائے وطن کے لئے مُفید اور ضروری ہے۔ اور جو کچھ اطلاع میں نے بہم پہنچائی ہے۔ وہ وقتاً فوقتاً اہلِ مُلک کی خدمت میں پیش ہوتی ہی ہے میں کچھ نہ کچھ تو اثنائے سفر میں لکھتا رہا ہوں۔ لیکن اب جب حضر میں اطمینان سے بیٹھنا نصیب ہُوا۔ تو معلومات مرتّب اور مکمّل صُورت میں نذرِ احباب ہوئیں۔ ایک حِصّہ سفرناموں کی صُورت میں (جن میں حالاتِ اِستنبول وغیرہ ہیں) اور ایک حِصّہ اوراقِ مخزن کے ذریعے۔ اب اِن معلومات سے فائدہ

اُٹھانا یا نہ اُٹھانا اہلِ مُلک کے اختیار میں ہے۔ اِس مرتبہ تو صرف اپنے دوستوں اور کرم فرماؤں سے دو دو باتیں کر لینے کا موقعہ ہے۔ میں جس دن سے بمبئی پہنچا ہوں اُس دِن سے آج تک احباب کی عنایت ہائے بے حد نے میرے دِن اور دِن کے ہر لمحے کو مصروف بنا رکھا ہے۔ ۷ رجون کو مجھے ساحلِ ہند نظر آیا۔ اس وقت کے جذبات الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتے۔ ہر چیز کی قدر اس سے دُور ہو کر یا اُسے کھو کر معلوم ہوتی ہے۔ وطن کی جو قدر غربت میں ہوئی۔ وُہ میرا ہی دل جانتا ہے۔ اور اب جس خلوص سے وطن نے مجھے اپنے دامنِ شفقت میں لیا ہے۔ اِس محبّت نے اور بھی گرویدہ کر لیا۔ کیونکہ بزرگانِ قوم و مُلک کی طرف سے جو احسانات ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ اُن کے بوجھ سے دبا جاتا ہوں۔

بمبئی میں جہاز سے اُترتے ہی ہمارے مخدوم قوم جناب نواب محسن الملک بہادر کی ملاقات۔ اور پھولوں کا پہلا ہار اُن مبارک ہاتھوں سے پہننا ایک ایسی عزّت ہے۔ کہ جس کے لئے تین سال کی بے وطنی اور ریاضت کوئی بڑی قیمت نہیں اور انجمن ضیاء الاسلام کے جلسے اسلام کلب کے "ایٹ ہوم" اور ڈنر سے فارغ ہو کر میں ۱۰ رجون کو بمبئی سے چلا۔ ایک دن گوالیار میں ٹھیرا۔ وہاں کے معزّزین کی مہمانداری اور خلوص دیر تک نہ بھولیں گے۔ گوالیار سے میں دہلی آیا۔ دہلی جتنا بڑا مرکز ہے۔ اُسی تناسب سے یہاں کے احباب کا مجمع تھا۔ انجمن بہبود اسلام دہلی نے دہلی کی ساخت کا سُنہری ہار جس پر انجمن کا نام لکھا تھا۔ مجھے ہدیۃً دیا۔ میں اس تحفہ کو نہایت عزیز رکھوں گا۔ خواجہ سیّد حسن نظامی کی معیت میں نہ صرف درگاہِ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی کی زیارت کا شرف مجھے حاصل ہُوا۔ بلکہ اُن کی بدولت قابلِ قدر تبرکات اِس درگاہ سے ملے۔ جو میرے لئے باعثِ فخر و سعادت ہیں۔ دہلی کے بعد انبالہ میں قیام ہُوا۔ انبالہ سے جو مدد مخزن کو ملتی رہی ہے اُس

سے ناظرین بخوبی آگاہ ہیں۔ اور اُس کو دیکھتے ہوئے جس سرگرمی سے اہلِ انبالہ نے بسر کردگئی اعجاز و نیرنگ میری عزت افزائی کا سامان کیا تھا۔ وہ ہرگز تعجب انگیز نہیں۔ انبالہ سے چلا۔ تو کچھ دوست لودیانہ کے اسٹیشن پر ملے۔ اور کچھ بعد کے مقامات پر جالندھر کا مجمع بلحاظ خوبی اور جوش کے دو آبہ پنجاب کے زندہ دلوں کا شایان تھا۔ مگر

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد۔

گاڑی وہاں صرف چند منٹ ٹھہری۔ اور مجھے اُسی روز لاہور پہنچنا تھا۔ اہلِ جالندھر کے ساتھ مفصّل ملاقات کا وعدہ کر کے آگے چلنا پڑا۔ امرتسر میں انجمن اسلامیہ کے زیرِ سایہ سرکردگانِ شہر نے اپنی مشہور مہمان نوازی کی داد دی۔ مگر وہاں بھی چار پانچ گھنٹے سے زیادہ قیام ممکن نہ ہوا۔ ۱۶ جون کی شام کو آخر گاڑی لاہور کے قریب آ پہنچی۔ میاں میر سٹیشن پر آنریبل میاں محمد شاہ دین صاحب نے دیدار ہمایوں سے شاد فرمایا۔ اور لاہور نے اپنے ناچیز خادم کے ہاتھوں ہاتھ لینے میں اپنی پوری قوت صرف کر دی۔ پُرانے پُرانے لوگ کہتے تھے۔ کہ ایسا مجمع کم دیکھنے اور سُننے میں آیا ہے۔ سینکڑوں احباب سے مِل سکا۔ اور سینکڑوں سے نہ مِل سکا۔ سینکڑوں ایسے رہ گئے جنہیں دُور سے بھی اس وقت نہ دیکھ سکا۔ بعد کو معلوم ہوا۔ کہ وہ بھی تشریف فرما تھے۔ اُس دن سے آج تک زائرین کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ اس تمام محبت اس تمام اعزاز کے لئے میں یارانِ وطن کا دل سے ممنون ہوں۔ مگر اس کے ساتھ میں ہرگز ایسا بے خبر نہیں۔ کہ یہ سمجھ بیٹھوں۔ کہ یہ سب کچھ میری ذات کے لئے یا میں اس کا مستحق ہوں۔ بلکہ میں جانتا ہوں۔ کہ یہ مُلک کی بیداری کا ثبوت ہے۔ مُلک میں اب کام کی قدر پیدا ہو چلی ہے۔ اور جو کوئی تھوڑی بہت خدمت قوم کی کرے۔ اُس کی حوصلہ افزائی کا خیال اب اہلِ مُلک کو ہو گیا ہے۔ اور یہ جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے۔ اسی حوصلہ افزائی کا ثبوت ہے۔

بزمِ ادب کے دوسرے مشاہیر

خدا کی ہستی

سُقراط حکیم نے سُن رکھا تھا۔ کہ ارسطا دیموس نہ قربانی کرتا ہے۔ نہ نماز و وظیفہ پڑھتا ہے۔ نہ مندروں کے پجاریوں کی وساطت سے اپنے کاروبار کی نسبت دیوی دیوتاؤں کا منشاء دریافت کرتا ہے۔ بلکہ اور لوگ جو ایسا کرتے ہیں۔ اُن پر ہنستا ہے۔ اس لئے موقع ملنے پر اُس نے ارسطادیموس کے ساتھ اس طرح پر گفتگو کا سلسلہ چھیڑ دیا۔

س۔ ارسطادیموس! کوئی شخص ایسے بھی ہیں۔ جن کی لیاقت کی وجہ سے تم اُن کی قدر کرتے ہو؟

ا۔ ہاں! کیوں نہیں!

س۔ بھلا اُن کے نام تو لو۔

ا۔ **ھومر**۔ رزم و بزم کی نظم میں۔ **ملیناپدیس**۔ رندانہ و مستانہ غزل خوانی میں۔ **نوفلنظ**۔ اندوہناک ناٹک میں **پُلِ قلنطس**۔ بُت تراشی میں۔ **ذوکسیط** وغیرہ وغیرہ۔

س۔ بھلا تم کن اُستادوں کو تحسین و آفرین کے لائق خیال کرتے ہو۔ آیا اُن کو جو

بے جان اَور بے رُوح صُورتیں اور مورتیں بناتے ہیں۔ یا اُن کو جو ذی رُوح اور ذی حیات جانتے ہیں۔ کہ اپنی مرضی سے چلتے پھرتے ہیں۔ اور گویائی و نطق سے بہرہ ور ہیں؟

ا۔ بیشک آخر الذکر کو۔ بشرطیکہ وہ عقل و شعور سے کام لیتے ہوں۔ اور اتفاقات و حادثات کے بھروسے پر نہ بیٹھے ہوں۔

س۔ بعض چیزیں ہیں۔ کہ اُن کی نسبت ہم نہیں کہہ سکتے۔ کہ وُہ کیوں بنائی گئی ہیں۔ بعض اَور چیزیں ہیں۔ کہ صریحاً اچھّی اور مُفید ہیں۔ اِن دونوں فریق میں سے تم کس کو عقل و شعور کا کام کہوگے۔ اَور کس کو اتفاق کا؟

ا۔ معقول تو یہ ہے۔ کہ جو چیزیں صریحاً اچھّی اور مُفید ہیں۔ اُن کو عقل و شعور کا کام جانیں۔

س۔ تو کیا تم نہیں خیال کرتے۔ کہ جس صانع نے آدمی کو دیکھنے کے لئے آنکھ۔ سُننے کے لئے کان۔ اور اَور چیزوں کے جاننے کے لئے باقی حواس دیئے اس کو انسان کی مصلحت اور منفعت منظور تھی؟ خُوشبوئیں کس کام آتیں۔ اگر اُن کے آنے کی سبیل یعنی ناک نہ ہوتی؟ حلق اور تالو کے مزے کس طرح لیتے۔ اگر مُنہ میں ڈالنے کی صلاحیت اَور تمیز نہ رکھی جاتی؟ آنکھ کیسی نازک شئے ہے؟ اِس کی حفاظت کے لئے پپوٹے ہیں۔ کہ دیکھنے کے وقت کھُلے رہتے ہیں۔ اَور سوتے ہی مُند جاتے ہیں۔ کیا اس انتظام میں تم کو پیش بینی اَور پیش بندی کا گمان نہیں گزرتا؟ دیکھو تو سہی کس خوُبی کے ساتھ پلکیں خاک دھول کو آنکھ کے اندر جانے سے روکتی ہیں۔ اور بھویں پیشانی کے پسینے کو بہ کر آنکھوں کے اندر اترنے اَور خلش کرنے سے باز رکھتی ہیں! کس حکمت کے ساتھ کان کو بنایا ہے۔ کہ کل آوازوں کا خیر مقدم کرتا ہے۔ اَور ایک دوسرے کا سدِّ راہ نہیں ہونے دیتا۔ جانداروں

کے جبڑوں کو دیکھو۔ کہ آگے کے دانت نوالہ کترنے اور پیچھے کی ڈاڑھیں اس کو نرم کرکے حلق سے اُترنے کے قابل بنانے کے لئے کتنی موزون ہیں۔ مُنہ کو آنکھ اور ناک کے تحت میں رکھا ہے۔ تاکہ اس کو ہدایت ہوتی رہے۔ کہ کونسی چیز اندر لے جانے کے کام کی ہے۔ اور کونسی نہیں ہے۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے۔ کہ جو اشیاء حواس کو پراگندہ کرنے والی ہیں۔ اُن کو حواس سے کتنا دُور رکھا گیا ہے۔ پس جہاں یہ احتیاط اور انتظام موجُود ہے۔ وہاں تم کو اس بات کے بتانے میں کیا تامّل ہوسکتا ہے۔ کہ آیا یہ پیش بینی کا نتیجہ ہے۔ یا محض اتّفاق وحادثات کا؟

ا۔ مجھے اِس بارے میں ہرگز ہرگز کوئی تامّل نہیں ہے۔ میں جس قدر غور و فکر کرتا ہوں۔ اسی قدر میری طبیعت یہ کہتی ہے۔ کہ یہ سب کچھ کسی ایسے صانع کی قدرتِ کاملہ کا ظہور ہے۔ جو نوعِ اِنسان کو سب سے عزیز رکھتا ہے۔

س۔ بھلا اِس باب میں تمہاری کیا رائے ہے۔ کہ اُس نے ہر جاندار میں اپنی نسل بڑھانے کی خواہش پیدا کی ہے۔ ماں میں اولاد کی اتنی مامتا اور محبّت رکھی ہے۔ اور پیدائش کے وقت سے آخیر دم تک ہر ذی حیات زندگی پر جان دیتا ہے۔ اور مَوت سے جی چُراتا ہے؟

ا۔ رائے کیا ہوتی۔ سوائے اِس کے کہ اُس نے اُن کی ذات اور نوع کے قیام کا پُورا پُورا اِنتظام کردیا ہے۔

س۔ بس یہیں تو خاتمہ نہیں ہوگیا۔ ابھی چلے چلو جواب دیئے جاؤ۔ شائد تم ہی مجھ سے کوئی سوال پوچھنے لگو۔ مجھے یقین ہے۔ اس بات سے تو تم بے خبر نہیں ہو۔ کہ تم کو عقل وشعور عطا کیا گیا ہے۔ پھر کیا تم یہ خیال کرتے ہو۔ کہ اور کوئی صاحب عقل وشعور کہیں ہے ہی نہیں؟ ذرا سوچو تمہارا بدن ایک مٹھی خاک سے۔

اس تودۂ عظیم کی جو تمہارے سامنے موجود ہے۔ وہ نمی جس سے یہ مٹی خمیر ہوئی ہے ایک قطرہ ہے۔ اِس بحرِ ناپیداکنار کا جو کُل روئے زمین پر محیط ہے۔ گویا تمہارا جسم ایک ذرّہ ہے۔ اُس مجموعۂ عناصر کا جس کی بے اندازہ مقدار دُنیا میں موجود ہے۔ پس اگر کوئی صاحبِ عقل وشعور کہیں نہیں ہے۔ تو تمہارا عقل وشعور ہی ایک ایسی شئے ہوئی جو تمہارے نصیب سے نہیں معلوم کہاں سے تم کو مل گئی اور تم شائد یہ کہو گے۔ کہ یہ تمام کائنات اور یہ کل اجسام واجرام کسی صاحبِ عقل وشعور کی مدد کے بغیر آپ ہی آپ یوں ہی مرتب ومنظوم ہو گئے ہیں؟

ا۔ میری سمجھ میں تو اور کوئی بات آتی نہیں اِس دُنیا میں جو چیز ہم بنتی ہوئی دیکھتے ہیں۔ اِس کا بنانے والا بھی نظر کے سامنے موجود ہوتا ہے۔ تم کہتے ہو۔ دُنیا اور اِس کے کل کارخانے کو دیوتاؤں نے بنایا ہے۔ اور وہی اِس کا اِنتظام کرتے ہیں۔ مگر وہ دیوتا ہیں کہاں؟ کہیں نظر تو نہیں آتے۔

س۔ تم اپنی رُوح کو بھی تو نہیں دیکھتے۔ جو تمہارے جسم کی حاکم ہے۔ لیکن نظر نہ آنے کے سبب سے کیا تم یہ نتیجہ نکالو گے۔ کہ تم جو کام کرتے ہو۔ وہ رُوح کی تحریک اور ہدایت کے بغیر خود بخود یُونہی چلا جاتا ہے؟

ا۔ دکچھ تذبذب کے ساتھ) میں خُدا کی تحقیر تو نہیں کرتا۔ میں تو یہ کہتا ہوں۔ کہ اُس کی ذات ایسی کامل اور غنی ہے۔ کہ اس کو میری اور میری بندگی کی ضرورت نہیں ہے

س۔ یہ سراسر غلطی ہے۔ بااین کمال واستغنا جب دیوتا تمہارا اتنا خیال کرتے ہیں۔ تو تمہارا فرض ہے۔ کہ تم بھی اُس کی اتنی ہی حمد وثنا کرو۔

ا۔ مجھے اِس بات کے کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کہ اگر مجھے یقین ہو جائے۔ کہ دیوتا اِنسانوں کے کاروبار میں دلچسپی ظاہر کرتے ہیں۔ تو میں ہرگز اُن کی بھینٹ پوجا میں کوتاہی نہ کروں۔

س - ہیں! ابھی تم کو یہی یقین نہیں ہے۔ کہ دیوی دیوتا انسانوں پر کیا کیا احسان کرتے ہیں! دیکھنے۔ سننے۔ چکھنے کی قوت تو جیسی اور جانوروں کو دی۔ ویسی ہی ہمیں دی ہے۔ مگر ٹانگوں پر کھڑا ہو کر چلنے کا شرف کیسا ہے؟ جانوروں کو یہ شرف نہیں ملا۔ اِس سے اِنسان کو کتنے فائدے ہیں! اِسی کی بدولت آگے دیکھتا ہے۔ دُور کی چیز تاک سکتا ہے۔ چوپائے اپنی ٹانگوں سے چلنے کے سوا اَور کوئی کام نہیں لے سکتے۔ اِنسان پر اِس معاملے میں بھی نفسِ علوی کا بڑا احسان ہے۔ اِس کو ہاتھ بھی دیئے ہیں۔ کہ اُن سے ہزاروں بڑے بڑے مُفید کام لیتا ہے۔ اَور فضیلت کے علاوہ بیحد مسرّت حاصل کرتا ہے۔ جانوروں کو زبان دی گئی ہے۔ مگر کلام کی طاقت اُن میں نہیں ہے۔ کلمہ زبانِ انسانی ہی پر موضوع ہوتا ہے۔ جو اِس کے خیالات کو ظاہر کرتا ہے۔ اَور دُوسروں تک پُہنچاتا ہے۔ اَور اِن چھوٹی چھوٹی باتوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ کہ اُنہوں نے اَور جانوروں کی لذت و راحت کو خاص خاص وقتوں اَور موسموں کے تابع رکھا ہے۔ اَور اِنسان کے لئے یہ سب قیدیں ہٹادی گئی ہیں۔ کہ ہر قسم کی راحت ہر وقت محسُوس کرتا ہے۔ اَور ہر نوع کی لذّت ہر موسم میں روا ہے۔

خُدا نہ صرف ہمارے جسم کی خبر لیتا ہے۔ بلکہ ہماری رُوح کی بھی خبر لیتا ہے۔ اس خالِق کُل نے ہمیں نہ صرف جسمانی فضیلت دی ہے۔ بلکہ سب سے بڑی بخشش جس سے اِس کی اِنسان پروری ظاہر ہوتی ہے۔ وُہ رُوحِ ناطق ہے۔ جو اس نے ہمارے قالب میں پھُونکی ہے۔ اور رُوح بھی جسے اشرف الارواح کہنا چاہئے۔ کیونکہ اَور کس جانور کی رُوح خدا کو جان سکتی ہے۔ اَور اُس کی قدرت کے کارخانوں کو پہچان سکتی ہے؟ کیا اِنسان کے سوا کوئی اَور ذی حیات بھی ہے۔ جو خُدا کی بندگی کرتا اَور اُسے پُوجتا ہے؟ کونسا جانور ہے۔ جو آدمی کی طرح بھُوک پیاس سردی گرمی

سے اپنا بچاؤ کر سکتا ہے ؟ اور کونسا جانور ہے جو آدمیوں کی طرح بیماری کی دوا کر سکتا ہے۔ اپنے قواء سے کام لے سکتا ہے تحصیلِ علم کر سکتا ہے۔ اور اپنی دیکھی بھالی سُنی سُنائی باتوں کو تمام و کمال یاد رکھ سکتا ہے ؟ اگر اس کی جسمانی اور رُوحانی فضیلتوں کا خیال کیا جائے۔ تو انسان اور جانداروں کے مقابلے میں الُوہیت کا مرتبہ رکھتا ہے۔ اگر اس کو بیل کا جسم دیا جاتا تو اس کی فہم کی رسائی کس کام آتی ؟ منصُوبے اور تدبیریں سوچ لیتا۔ لیکن اِن کی تعمیل بیل کیونکر کرتا ؟ برعکس اس کے بیل کو انسان کا جسم مِلتا۔ اور عقلِ انسانی نہ دی جاتی۔ تو دیگر بہائم سے کس بات میں افضل ہوتا ؟ دیکھو تو سہی دیوتاؤں نے عُمدہ سے عُمدہ جسم تم کو دے کر کیسی لطیف ترین و شریف ترین رُوح اُس میں پھُونکی ہے ! کیا اب بھی تم یہی کہے جاؤ گے۔ کہ وُہ تمہاری کچھ خبر نہیں لیتے ؟ دیوتاؤں سے تم کیا چاہتے ہو۔ جو تمہیں یقین ہو کہ ہاں وُہ تمہاری خبر گیری کرتے ہیں ؟

ا۔ مَیں چاہتا ہوں۔ کہ جس طرح تمہارے بیان کے مطابق تمہارے پاس اُن کے پیغام آتے ہیں۔ میرے پاس بھی آیا کریں۔ اور مجھے بھی وُہ براہِ راست مطلع کرتے رہیں۔ کہ میں کیا کروں اور کیا نہ کروں۔

س۔ کیا جب وُہ ایتھنز کے کل باشندوں کے لئے کوئی ہدایت کرتے ہیں۔ تو تم یہ خیال کرتے ہو۔ کہ وُہ تم سے مخاطب نہیں ہیں ؟ جب غیر معمولی حادثات و کرامات کے ذریعے سے وُہ کل اہلِ یُونان کو آنے والے واقعات سے متنبہ کرتے ہیں۔ تو کیا وُہ تمہاری طرف سے خاموش ہیں۔ اور ایک اکیلے اسطادیموس ہی کو بھُول جاتے ہیں ؟ لوگوں کے دلوں میں جو اُنہوں نے یہ اعتقاد پیدا کر دیا ہے۔ کہ رنج و راحت سب دیوتاؤں کی طرف سے ہے۔ وُہ رنج و راحت پر

قادر ہونے کے بغیر ہی پیدا کر دیا ہے؟ کیا تم یہ خیال کرتے ہو۔ کہ اگر یہ محض دھوکا ہوتا۔ تو انسان آج تک اس سے بے خبر رہتے۔ اور اس سے اپنے تئیں نہ بچاتے؟ کیا تم نہیں جانتے۔ کہ قدیم سے قدیم اور عاقل سے عاقل قومیں خدا پرست ہوتی رہی ہیں۔ اور ہر ایک انسان کی عمر میں خدا پرستی کی خواہش درجۂ کمال کو اس وقت پہنچتی ہے۔ جب اس کی عقل پختگی کی سمت الرّاس پر ہوتی ہے؟ اے عزیز! دھیان کر کہ تیرا نفس کس طرح سے تیرے جسم پر اپنی مرضی کے موافق حکمران ہے۔ اور یقین کر کہ اسی طرح ایک روح ہے۔ جو کل عالم پر حاوی ہے۔ اور اس کو اپنی مرضی کے موافق چلا رہی ہے۔ اس خیال کو دل سے نکال ڈال کہ تیری ناقص آنکھیں تو کوسوں دور کی چیز دیکھیں۔ اور خدائے تعالیٰ ایک ہی وقت میں سب چیزوں کو نہ دیکھ سکے۔ یہ خیال نہ کر کہ میں ایتھنز اور مصر اور سسلی کے معاملات پر جامعیت کے ساتھ غور و فکر کر سکتا ہوں۔ اور خدائے عزّوجل کل کائنات کے معاملات پر ایک ہی وقت میں غور نہیں کر سکتا۔ انسان کی احسانمندی کا امتحان جب ہوتا ہے۔ کہ اُس کے ساتھ کوئی سلوک کیا جائے اور اس کی دانائی کی آزمائش یوں ہوتی ہے۔ کہ اس سے کسی مشکل اور پیچیدہ معاملے میں مشورہ طلب کیا جائے۔ اسی طرح اگر تم خدا کی قدرت اور مخلوق پروری کا ثبوت چاہتے ہو۔ تو سچے دل سے اُس کی بندگی اور پرستش کرو۔ اس وقت تم کو یقین کامل ہو جائے گا۔ کہ خدا سب کو دیکھتا ہے۔ سب کچھ سنتا ہے۔ ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے۔ اور کل اور کائنات کا انتظام و انصرام کرتا ہے۔

جہارام

خوشی

دُنیاوی خُوشی کیا ہے؟ کیا وُہ خیالی صُورت جس کا ذکر تو ہم نے ہزاروں مرتبہ سُنا. مگر دیکھا کبھی نہیں؟ کیا وُہ جس کے وعدے ہم سے ہمیشہ ہوتے ہیں. اور ہمیشہ ٹُوٹتے ہیں۔ اور پھر بھی ہم اس کے وعدوں کا یقین کر لیتے ہیں؟ کیا وُہ جو بلا کسی حقیقت کے صِرف باتوں ہی باتوں میں بہلاتی ہے۔ اور پھل کے بجائے صِرف پھُول ہی میں ٹال دیتی ہے؟ جو لوگ اس کے مزے سے محروم ہیں. وُہ اس کے مشتاق ہیں. مگر جو اُس کا لُطف اٹھا چکے ہیں. وُہ اِس کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں. اُمیّد اس کی علم بردار ہے۔ مگر مایوسی بھی اس کے ہمرکاب ہے. اُمیّد ہمارے تخیّل پر مبنی ہے. اور اس کے حصُول کا ہمیں یقین دلاتی ہے. مگر مایُوسی ہمارے تجربہ کا نتیجہ ہے. اور ہم مجبوراً اِس کی بات کو صحیح مانتے ہیں. زندگی کے رقص کی تمام حرکات خُوشی پر مبنی ہیں. جو ہمیں پیچیدہ راستوں اور ٹیڑھی گھاٹیوں میں گزرنے کے لئے آمادہ کرتی ہے. مگر وُہ ہم میں سے کسی دو افراد کو بھی ایک ہی راستہ سے نہیں لے جاتی. ارسطپس[1] اس کو نفسانی حظائظ میں ڈھونڈتا ہے. سُقراط[2] صِرف حکمت میں اُسے پاتا ہے۔

[1] ارسطپس ایک حکیم گذرا ہے. جو حضرت مسیح سے چار سو برس پہلے یُونان میں پیدا ہُوا. جو سقراط کا شاگرد تھا. اُس کا طریقۂ زندگی اپنے اُستاد کی رائے اور عمل کے برخلاف عیاشانہ اور رندانہ تھا. اور محض نفسانی خوشی کو نیکی سمجھتا تھا.

[2] سقراط ۴۶۹ قبل مسیح میں پیدا ہُوا.

اُور اپی کیورس[1] اِن دونوں کو اس کا سرچشمہ بتلاتا ہے۔ غرض اُس نے ہر ایک پر اپنا مقناطیسی اثر کیا۔ لیکن کسی کو نگاہِ تلطف سے نہیں دیکھا۔ اگرچہ یہ لوگ بھی بہت سے اَور طالبین کی طرح اُس کے لُطف کی لاف زنی کرتے رہے۔ اس کی ناکامیابی دیکھ کر سٹواک[2] فرقہ نے اُس کے حصول کا ایک نیا اَور عجیب طریقہ نکالا یعنی اس کا طالب

---

[1] اپی کیورس یونانی فلسفی حضرت مسیح سے ۳۴۲ برس پہلے پیدا ہُوا۔ فلسفہ کی تحصیل ایتھنس میں کی۔ اور پھر ۳۰۶ قبل مسیح میں ایتھنس میں ایک باغ خرید کر وہاں سکونت اختیار کی۔ اَور اپنی تعلیم جاری کی۔ اس کی بڑی تعلیم یہ تھی۔ کہ اخلاق میں صرف خوشی سب سے بڑی نیکی ہے۔ اَور خُوشی عقل کی مدد سے حاصل کرنی چاہیئے۔ کیونکہ دانائی سب خُوبیوں میں افضل ہے۔ اَور صرف اخلاقی تکمیل سے خوشی میسّر آتی ہے۔ رُوح کے غیر فانی ہونے سے اُس نے اِنکار کیا۔ دیوتاؤں کے وجُود کو تسلیم کرتا تھا۔ مگر کہتا تھا۔ کہ انسانی معاملات سے وُہ تعارض نہیں کرتے۔ اس کی تصانیف سب معدوم ہوگئیں کچھ باقی ہیں ۲۷۰ قبل مسیح انتقال کیا۔

[2] زینو۔ ایک یونانی فلسفی سٹواک فرقہ کا بانی تھا۔ اِس کی تاریخ پیدائش نامعلوم ہے۔ مگر غالباً ۳۵۵ قبل مسیح پیدا ہُوا۔ اس کا باپ ایک سوداگر تھا۔ اَور اس نے اپنی پرورش بھی اپنے پیشہ کے مطابق کی۔ ایک ناگہانی حادثہ سے جیسے سوداگروں کو اکثر پیش آیا کرتے ہیں وُہ مُفلس ہوگیا۔ اَور اُس نے فلسفہ کی تحصیل شروع کی۔ مختلف مقامات میں مختلف فلسفیوں کے لکچر سُنے۔ مگر کسی سے اطمینان کُلّی نہ ہُوا۔ آخر خود بیس برس کی محنت شاقہ کے بعد حق کی تلاش کرتے کرتے اُس نے اپنی ایک جُدا تعلیم اختیار کی۔ زینو نہایت کمزور اَور منحنی سا آدمی تھا۔ اَور اُس کے چہرے سے تفکّر ظاہر ہوتا تھا۔ نہایت پرہیزگاری کی زندگی بسر کرنے کے بعد ۹۸ برس کی عُمر میں فوت ہُوا۔ اس کے ہم وطن اس کی بے انتہا عزّت کرتے تھے۔ اسکی تعلیم عملی زندگی کے مطابق تھی یعنی آدمی کا بڑا مقصد صحیح عقل کے مطابق بسر کرنا ہے نیکی یعنی کمال انسانیت صرف دانائی سے حاصل ہوسکتا ہے صرف نیکی ہی خوشی کی بنیاد ہے۔ تمام نیک کام یکساں نیک ہیں۔ اَور تمام بُرے کام یکساں بُرے ہیں نفسانی جذبات کو مغلوب کرنا اَور اُن سے آزاد رہنا کمالِ انسانیت ہے۔ اِس کے شاگردوں نے اس کی تعلیم کو بہت پھیلایا۔ کیونکہ اس کی تعلیم نہایت پسندیدہ اَور نہایت ہر دلعزیز تھی۔ ۲۶۳ قبل مسیح وفات پائی ۔۔

رہنا مگر اُسے بُرا کہکر اُس کے حصول کی طرف تکنا اور اُس سے احتراز کرنا ۔ غرض اُن کا متکبرانہ خیال یہ تھا۔ کہ جتنا اُس سے بچا جائے۔ اَور جتنا اُس سے بھاگا جائے۔ اتنی ہی وُہ ہماری طرف توجہ کرتی ہے۔ اَور ہمارے پیچھے دوڑتی ہے۔ اے خوشی تو بھی ایسی ہی دھوکہ دینے والی ہے۔ جیسے وُہ سکون جو طوفان کے آنے سے پہلے عالم پر چھا جاتا ہے۔ تو بھی طوفان کی تبسّم کُن بیٹی یعنی قوسِ و قزح کے مانند خوشنما ہے۔ لیکن صحرا میں سراب کی طرح تو ہمیں اس دھوکے میں رکھتی ہے۔ جس کو فاصلہ زیادہ کرتا ہے۔ اَور قُرب مٹا دیتا ہے۔ تاہم بغیر تلاش کئے اکثر تو مُیسّر آجاتی ہے۔ اَور جب تیری کوئی توقع نہ ہو۔ تو تُو آن موجُود ہوتی ہے۔

جو لوگ سرگرمی سے خوشی کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اُن سے وُہ کوسوں بھاگتی ہے۔ کیونکہ وُہ اُسے وہاں ڈھونڈتے ہیں جہاں وُہ ہوتی نہیں۔

انتھنی[1] نے اس کو محبت میں ڈھونڈھا۔ بروٹس[2] نے جاہ وجلال میں۔ اَور سیزر[3] نے حکومت میں۔ لیکن پہلا بے عزّت ہُوا۔ دوسرا نفرت کیا گیا۔ تیسرا احسان فراموشی کا شکار ہُوا۔ اَور تینوں کے تینوں مایُوس ہوکر بُری طرح ہلاک ہُوئے۔

---

[1] انتھنی مصر کی ملکہ کلیوپیٹرا کا سچّا عاشق تھا۔ مسیح سے چالیس یا پچاس برس پہلے ہُوا ہے ۱۲۔

[2] بروٹس ایک مشہور رومن ہے۔ جو سیزر کے قتل میں شریک تھا۔ ابتدا میں اسکو سیزر سے بڑی محبت تھی۔ اَور اُس کا دلدادہ دوست تھا۔ سیزر بھی اس پر پورا اعتماد کرتا تھا۔ مگر اُس نے قومی جوش میں آکر سیزر کے خلاف سازش کی۔ اَور اس کو قتل کرا دیا۔ مگر عام لوگ اس کے خلاف ہوگئے۔ اَور وُہ نہایت ذلت کی موت مرا۔

[3] سیزر روم میں سو برس قبل مسیح پیدا ہُوا۔ نہایت فیاض اور سخی تھا۔ بہادری میں شہرۂ آفاق تھا۔ بہت سے فتوحات اپنے مخالف لوگوں پر حاصل کرنے اَور اس کو کئی جگہ پر شکست دینے کے بعد اُس نے روم میں ایک خود مختار حکومت قائم کرنی شروع کی۔ اس کی عظمت اَور شان و شکوہ ضرب المثل ہے۔ آخر بروٹس اَور دیگر سازش کرنے والوں نے اِس کو سینیٹ کے دربار میں ۴۴ قبل مسیح مار ڈالا ۱۲۔

بعض پر وُہ عنایت کرتی ہے۔ مگر جب اُنہیں مزے میں غرقاب پاتی ہے۔ تو فوراً لُطف کی نگاہ کو بے رحمی سے بدل دیتی ہے۔ کسی کو وُہ اپنی شیریں شراب کے جام پر جام دیتی ہے۔ اور اس کو اتنا مدہوش کرتی ہے۔ کہ اس کی عقل زائل ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وُہ اپنے آپ کو مخلوقِ خُدا سے بالا تصوّر کرنے لگتا ہے۔ پھر اس کو اس حد پر چھوڑ کر پستی کی طرف دھکا دیتی ہے۔ حتےٰ کہ وُہ تحت الثریٰ میں پہنچتا ہے۔ کبھی کسی پر اُس برقِ تبسّم سے حملہ کرتی ہے جس کا شکار نپولین[1] ہُوا۔ اور اپنے دیوانہ کو ایسی اداؤں سے لُبھاتی ہے۔ جو روشن چہرہ والا چاند بھی اپنے شیفتہ چکور کے واسطے اپنے ٹھنڈے نور میں نہیں پیدا کر سکتا۔ مگر یہ سب کچھ لُطف و شفقت اُس غصّہ و غضب کا پیش خیمہ ہے۔ جس کا ظہور اس کی عادت میں داخل ہے۔ اور یہ کرم کی نگاہیں آثار ہیں۔ اُن فراق کے تیروں کے جن کا مزہ وُہ چکھانے والی ہوتی ہے۔ تاہم زمانہ اُس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہے۔ اور اس کو ملکہ جانتا ہے۔ جذبات اِس کے غلام ہیں۔ اور اس کے دربار میں دست بستہ اُس کے حکم کے منتظر کھڑے رہتے ہیں۔ اور اِس کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ اُس کے گرد بھی بڑے بڑے بادشاہوں کی طرح امراء۔ وزراء۔ اور ارکینِ سلطنت کی ہر وقت بھیڑ لگی رہتی ہے۔ اور اس لئے اس کی حضوری میں رسائی اور اُس سے ہم کلامی نہایت ہی مشکل ہے۔ جاہ طلبی۔ حرص۔ محبّت۔ اِنتقام سب کے سب اُس کے اور صرف اُس کے متلاشی کھڑے رہتے ہیں۔ مگر افسوس نہ اُن کی رسائی اُس تک ہو سکتی ہے۔ اور نہ وُہ خود اُن تک آسکتی ہے۔ لیکن وُہ اُن کے پاس اپنے ادنیٰ اور ذلیل ایلچی بھیجتی رہتی ہے۔ جاہ طلبی کے پاس طاقت کو۔ حرص کے پاس دولت کو۔ محبّت کے پاس رقابت کو۔ اِنتقام کے پاس پشیمانی کو۔ مگر افسوس یہ سب کیا ہیں؟ محض مایوسی کی دوسری صورتیں ہیں! نہ خوشامد سے نہ رشوت سے

[1] نپولین فرانس کا مشہور بادشاہ اور یورپ کا فاتح جزیرہ کورسیکا میں مارچ ۱۷۶۹ء میں پیدا ہُوا۔ ۱۲

اُس کو پھسلایا جا سکتا ہے۔ مگر ہاں اُس کے حصول کا بہترین ذریعہ اس دشمنوں کے ساتھ معرکہ آرائی کرنا ہے۔ کیونکہ خود اُس کو براہ راست خوشنود کرنا ممکن الوقوع نہیں۔ وہ لوگ جو اُس کے دشمنوں پر فتحیاب ہوتے ہیں۔ انہیں اُس کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ خود اُن کے پاس دوڑی آتی ہے۔ اگر وہ کسی اَور طرح حاصل ہو سکتی۔ تو سب سے پہلے بادشاہوں کا حصّہ ہوتی۔ کیونکہ اُن سے زیادہ اُس کے طالب اَور لوگ نہیں ہوتے۔ اَور وہ اتنی قدرت بھی رکھتے ہیں۔ کہ زیادہ سے زیادہ قیمت دے کر اُسے حاصل کر سکیں۔ لیکن وہ بادشاہوں کا بھی اتنا ہی لحاظ کرتی ہے۔ جتنا اُن کی رعایا کا۔ اَور اُن کے محلوں میں صرف اپنے نقیب مثلِ شان و شوکت جاہ و جلال۔ ساز و سامان وغیرہ کو بھیج کر اپنی آمد کا اُنہیں منتظر رکھتی ہے۔ مگر جاتی کبھی نہیں۔ آخر کیوں؟ کونسی چیز اُسے روکتی ہے؟

اوہ! اوہ!! وہ تو قناعت کی شیدا ہے۔ اور بھیس بدل کر اُس کی مُلاقات کو ہمیشہ جایا کرتی ہے۔ کہ تنہائی میں اُس کی صحبت کا لُطف اُٹھائے۔ اَور جنگل کی جھونپڑی کے اندر اُس کی نباتات کی دعوت میں اُس کے ہم پیالہ اَور ہم نوالہ ہو۔

تو ہاں اے مَلکہ۔ میری سچّی اَور سنجیدہ باتیں سُن۔ بادشاہ ایسی باتیں کم سُنا کرتے ہیں۔ لیکن تو سُن۔ میں نہ تجھ سے قطعی نفرت کرتا ہوں۔ اَور نہ تیرا دیوانہ ہوں تیرا لُطف عارضی ہوتا ہے۔ اَور تیری بخششیں تیری سلطنت کے اندر ہی اندر محدود ہوتی ہیں۔ تو بھی اَور بادشاہوں کی طرح دوسروں کا سہارا تکتی ہے۔ اَور اُن کی طرح اگر تو بھی اپنے سہارے سے محروم کر دی جائے۔ تو تو اپنے آپ کو بھی نہیں سنبھال سکتی۔ اگر قناعت تیرا ایک ہاتھ پکڑ کر اَور تندرستی دوسرا ہاتھ پکڑ کر تجھے سہارا نہ دیں۔ تو تو ایک نکمّے اَور فضول جسم کی طرح زمین پر گر پڑے۔

(ترجمہ) لطیف احمد پانی پتی

اعراف کی ایک رُوح

فرشتے آسمان پر اپنے اپنے عود بجا رہے ہیں۔ اور اُن کی سُریلی آوازیں مثل خوشبو کی لپٹوں کے خدائے بلند کے عرش تک پہنچتی تھیں۔ مگر سرا فیم کا راگ اپنے سب ساتھیوں سے شیریں اور دلفریب تھا۔ اور اُس میں خدائے غیب کی آواز اس طرح آتی ہوئی سُنی جاتی تھی "اے سرافیم۔ اِس آتشِ محبت کے صلے میں جو تیرے راگ سے نکلتی ہے۔ مانگ کیا مانگتا ہے۔ جو تو مانگے تجھے مل جائے" سرافیم بولا۔ سُنا ہے کہ کوئی جگہ ایسی ہے۔ جو اعراف کہلاتی ہے۔ جہاں دوزخ سے تو امن ہے۔ مگر جو بہشت کے مقابلے میں تکلیف کا گھر ہے۔ وہاں روحیں تیری عبادت کرتی ہیں۔ مگر اپنے گناہوں کی سزا پوری پوری پاتی ہیں۔ اے خدا مجھے اجازت دے۔ کہ کبھی کبھی میں اُن کے پاس ہو آیا کروں۔ اور اپنے عود کے راگ سے جس کو تیری تعریف نے مقدس بنایا ہے۔ اِن کی تکالیف کو تسکین دیا کروں"

"آواز آئی۔ کہ ہاں! اے فرشتوں میں سب سے زیادہ رحم دل! تیری دُعا مقبول ہوئی۔ اور اُسے بہت بھلی معلوم ہوئی۔ جو سزا و جزا دیتا ہے۔ ہاں محبت سے تیری تمنا بر آئی"!

سرافیم نے پھر تو خوب حمد گائی۔ اور جب راگ ختم ہو چکا۔ تو اپنے زمردین تخت پر سے اُٹھا۔ اور اپنے زنگار رنگ کے پروں کو پھیلا کر اُس غمناک مقام پر جو زمین کے بہت ہی قریب ہے۔ پہنچا۔ یہ مقام اُن رُوحوں کی چیخوں سے گونج رہا تھا۔ جو

تکلیف اُٹھانے کے بعد پاک ہو جاتی تھیں۔ بدنصیب روحیں یہاں سے اُن عالی شان مکانات کو دیکھتی تھیں۔ جو اُنہیں بعد میں ملنے والے تھے۔ اَور اس بلند مرتبہ مخلوق پر حسرت سے نگاہ کرتی تھیں۔ جو بقا کے چشمے سے سیراب ہو کر بہشت کے باغوں میں چہل قدمی کرتی تھیں۔ اور خیال کرتی تھیں۔ کہ اُن کی خوشی غیر متناہی ہے۔ یہ خیال تکالیف میں اُن کو تسلی دیتا تھا۔ اَور اعراف اَور دوزخ میں جو صحیح فرق ہے وُہ یہی ہے۔

پھر سرالیم نے اپنے پروں کو سمیٹا۔ اَور بلّوری دروازوں میں داخل ہو کر ایک ویران چٹان پر لیٹ گیا۔ اَور اپنا مقدّس راگ چھیڑا۔ فوراً ہی بدنصیب روحوں کو راحت سی محسوس ہونے لگی۔ اَور عذاب کے فرشتے عذاب دہی سے باز رہ گئے۔ اَور گنہگار روحوں نے چلّانا موقوف کر دیا۔ دُنیا کے زخم رسیدوں کے لئے جیسی نیند مرہم ہے۔ ایسا ہی سرالیم کا راگ اُن روحوں کے لئے تسکین بخش تھا۔ اِس عالم خاموشی میں سرالیم کو معلوم ہُوا۔ کہ صرف ایک آواز ایسی ہے۔ جو اِس کے راگ سے خاموش نہیں ہوئی۔ یہ ایک عورت کی آواز تھی۔ اَور وُہ نہایت زور سے چنگھاڑیں مارتی تھی۔ اَور کہتی تھی۔

"اے اَدن ہیم۔ اَدن ہیم مجھ کھوئی ہوئی کا تو رنج نہ کر۔"

"اس پر سرالیم کو بہت زیادہ خیال ہُوا۔ اَور اُس جگہ پہنچا۔ جہاں سے وُہ آواز آرہی تھی۔ دیکھتا کیا ہے۔ کہ نوجوان حسین لڑکی کی رُوح ایک چٹان سے مضبوط زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ اَور عذاب کے فرشتے اس کے نزدیک آرام سے پڑے ہیں۔ سرالیم نے اُن سے کہا۔ "کیا میرے راگ نے تمہیں ایسی لوری دی۔ کہ تم یوں مدہوش ہو گئے۔"

اُنہوں نے کہا۔ "کہ اس لڑکی کو ایک شخص کی یاد زیادہ تکلیف دہ اَور تلخ ہے۔ ہمارے عذاب سے۔ اَور اِسی لئے ہم نکمّے پڑے ہیں۔"

تب وُہ نیک فرشتہ اِس رُوح کے پاس پہنچا۔ اَور ایک ایسے لہجے میں اِس سے

مخاطب ہوا۔ کہ وہ چلّانے سے خاموش ہو گئی۔ "اور کیوں نہ ہو ہمدردی سے ہم کسی حالت میں لاپرواہ نہیں ہو سکتے" کس لئے اے لڑکی کس لئے تو اِسی غمناک لہجے میں روئے جاتی ہے؟ اور کیوں میرا راگ تجھے تسکین دینے میں ناکامیاب رہا! حالانکہ تیرے ساتھیوں میں سے بڑے سے بڑا مجرم بھی اِس سے تسلّی پاتا ہے"۔

اِس غریب روح نے جواب دیا۔ اے روشن چہرے والے اجنبی کیا تو مجھ سے مخاطب ہے؟ مجھ سے؟ جس نے خدا سے زیادہ خدا کے ایک بندے سے محبّت کی۔ اور اِسی لئے یہ بھگت رہی ہوں۔ لیکن مجھے معلوم ہے۔ کہ میرا غریب اُون ہیم میرے لئے دن رات روتا ہے۔ اور اُس کے رنج کا خیال میرے لئے زیادہ ناقابل برداشت ہے۔ اِن تکالیف سے جو یہ عذاب کے فرشتے مجھ پر ڈال سکتے ہیں"۔

نیک فرشتے نے پوچھا۔ اے لڑکی تجھے کس طرح معلوم ہے۔ کہ وہ تیرے لئے نالہ وزاری کرتا ہے؟

رُوح نے نہایت سادگی سے جواب دیا "اِس طرح کہ میں جانتی ہوں۔ کہ میں اِس حالت میں اِس کے لئے کس جانکنی سے تڑپتی ہوں۔ اِس نیک طبیعت فرشتے پر اس کا بڑا اثر ہوا۔ کیونکہ خدا نے اپنی مخلوق کی طبیعتوں میں قدرتًہ محبّت رکھی ہے۔ اور اُس نے کہا "میں تیرے غم کی کس طرح امداد کر سکتا ہوں"؟

روح اِس خوشی سے بیتاب ہوئی۔ اور اپنے غیر محسوس ہاتھوں کو پھیلا کر بولی؛

"اے مجھے اجازت دے۔ اے مجھے اجازت دے۔ کہ میں زمین پر ہو آؤں۔ صرف ایک ہی گھنٹے کے لئے تاکہ میں اپنے اُون ہیم کو ایک نظر دیکھ لوں۔ اور اپنی موجودہ تکالیف کو اُس سے چھپا کر اُس کے رنج و غم میں اُس کی تسلّی کردوں"۔

نیک فرشتے نے کہا" افسوس"۔ اور اپنی آنکھیں اُس سے پھیرلیں کیونکہ فرشتے دُوسروں کے سامنے نہیں روتے۔ افسوس! میں بے شک تیری یہ آرزو پوری کر دیتا۔ مگر تجھے نہیں معلوم کیا تاوان تجھے اُس کے عوض میں دینا پڑے گا۔ اعراف کی رُوحیں زمین پر جا سکتی ہیں۔ مگر ایسی واپسی پر اُنہیں ایک گراں تاوان دینا پڑتا ہے۔ غرض اگر تو ایک گھنٹے کے لئے زمین پر جانا چاہتی ہے۔ تو تیری یہ عذاب کی قید یہاں ایک ہزار برس اَور زیادہ ہو جائے گی"

رُوح نے چلا کر کہا" بس یہی نا! میں تو نہایت خوشی سے اِس کے لئے آمادہ ہوں۔ آہ! یقیناً آسمان والوں میں محبّت جاری نہیں ہے؟ ورنہ تجھے معلوم ہوتا۔ اسے آسمانی ملاقاتی! کہ وُہ ایک ساعت جو اپنے محبوب کی تسکین اَور تسلی میں ہم صرف کریں۔ قیمت میں اُن ہزار برسوں کے برابر ہے۔ جو ہمیں عذاب وتکلیف میں کٹیں۔ اے! تو مجھے اپنے اَون ہیم کو تسلّی اَور تشفّی دینے دے۔ اس کا مضائقہ نہ کر کہ مجھ پر کیا گزرے گی"

نیک فرشتے نے آنکھ اُٹھا کر اُوپر کی طرف دیکھا۔ اَور اُسے دُور سے دو شُعلیں نظر پڑیں۔ جو خدا کی عالم بین آنکھ سے نکلتی تھیں۔ اور جن کے دیکھنے کی تاب کوئی اَور نہ لا سکتا تھا۔ اُس نے خدائے لایزال کی یہ آواز سُنی "جو تجھ سے رحم کہتا ہے وُہ کر"

اُس نے پھر اس روح کی طرف نظر کی۔ اَور دیکھا کہ اُس کے ہاتھ اُس کی طرف التجائً پھیلے ہوئے ہیں۔ پس اس نے وُہ الفاظ پڑھے۔ جن سے اعراف کے دروازے کی کُنڈیاں کھُل گئیں۔ اور لو۔ وُہ رُوحِ انسانی دُنیا میں داخل ہو گئی۔

اُس وقت رات تھی۔ اَور لارڈ اَون ہیم اپنے محلّوں میں اپنے جگمگاتے تخت کے صدر پر بیٹھا ہوُا تھا۔ لمبے لمبے قہقہے باآوازِ بلند لگتے تھے۔ اَور مذاق اَور چُہل کی

آوازیں گونج رہی تھیں۔ لارڈ آون ہیم کا قہقہہ اور مذاق سب سے زیادہ بلند اور اور سب سے زیادہ محترم تھا۔ اُس کے دائیں پہلو پر ایک حسین لڑکی بیٹھی تھی۔ اور وُہ بار بار اوروں کی طرف سے مُنہ پھیر پھیر کر اُس کے کان میں کچھ کہتا تھا۔

اُس حسین اور نازک بیگم نے کہا "اور تیرے لفظوں کا کون شریف عورت اعتبار کرے گی۔ تو نے حسین آئینڈہ سے یہی قسمیں نہ کھائی تھیں۔ اور ایسا ہی اظہارِ محبت نہ کیا تھا؟ اُسے تو مرے ہوئے بھی صرف تین ہی مہینے ہوئے ہیں۔

نوجوان لارڈ آون ہیم نے جواب دیا "خدائے پاک کی قسم تو اپنے لاجواب حسن سے سخت نا انصافی کرتی ہے۔ نہیں تو میرا مضحکہ اُڑاتی ہے۔ آئینڈا سے میں اور محبت کروں!!! تو میں تیرے قابل کیونکر ہوں؟ آون ہیم کو جو کچھ محبت آئینڈہ سے تھی۔ وُہ اتنی ہی تھی۔ جو چند محبت انگیز الفاظ اور چند مرتبے کے تبسّم میں محدود ہو سکتی ہے۔ اور بس کیا یہ میرا قصور تھا۔ اگر اس بے وقوف نے اس عالمِ خلق کے معنے غلط سمجھے ہوں۔ میری پیاری۔ یہ دل تیرا ہی ہے" حسین بیگم بولی "تو کیا تجھے اُس کے مرنے کا افسوس نہیں ہوا؟" اُس نے کہا "ہاں ضرور ہوا۔ مگر صرف ایک ہفتے تک۔ اب تو میں تیری دلکش نگاہوں میں فوری تسکین پاتا ہوں"

اِس وقت لارڈ آون ہیم نے ایک سرد آہ اپنے پیچھے سے سُنی۔ مُنہ پھیرا۔ مگر کچھ نہ دیکھا۔ بجز ایک دھوئیں کے جو فوراً ہی اُڑ گیا۔ اور غائب ہو گیا۔

جب وُہ دھوکا کھانے والی آئینڈا کی رُوح اعراف میں واپس پہنچی۔ تو سرا ایم نے پوچھا۔ کیا تو اپنے محبوب سے نہیں ملی؟ اور اُس کام کو انجام نہیں دیا۔ جس کے لئے تو گئی تھی؟

غریب آئینڈا نے جواب دیا "عذاب کے فرشتوں سے کہدو۔ کہ اپنا عذاب شروع کریں"

"تو کیا صرف اسی بات کے واسطے تو نے ہزار برس اپنی قید میں تڑپوائے ہیں؟"

"افسوس،" آئیڈا نے جواب دیا "اِس ایک واحد گھنٹے میں زمین پر جو کچھ مجھ پر بیتی۔ اُس کے مقابلے میں ہزار برس کی اعراف کی تازہ تکلیف کچھ بھی نہیں"

سرالیم نے کہا۔ تو کیا بس یہی محبت ہے۔ جس کا دعویٰ دُنیا والے کیا کرتے ہیں؟؟؟

خواجہ لطیف احمد بی۔ اے

موسیقی

سوائے حُسن کے جہان بھر میں غالباً کسی شئے کو وُہ قبولیّت عام حاصل نہ ہوگی۔ جو موسیقی کو حاصل ہے۔ جدہر نظر ڈالئے جہاں دیکھئے۔ قلبِ انسانی اس پر فریفتہ و شیفتہ نظر آتا ہے۔ پتھروں کے پگھل جانے پہاڑوں کے ٹل جانے اور خود بخود آگ لگ جانے کے قِصّے غلط سہی۔ مگر اس میں کچھ کلام نہیں۔ کہ موسیقی کا جادو نہ صرف انسان پر بلکہ تمام جانداروں پر چلتا ہے۔

موسیقی کی بناوٹ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اِس کے اجزاء آواز کی ایک خاص قسم کی چال (جس کو "لے" کہتے ہیں) حِصّہ ہائے آوازلی ایک خاص ترتیب (جسے "تال" کہتے ہیں) اور خُود آواز (جس کو "سُر" کہتے ہیں) پہلے دو اجزاء عقلِ انسانی کی صنعت کا ایک اعلیٰ نمونہ ہیں۔ اور اِس بات کا ثبوت دیتے ہیں۔ کہ حُسن بزورِ ہنر صرف اور چیزوں میں پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ آواز میں بھی اُس کا ظہور ممکن ہے۔ یہ وُہ حُسن ہے۔ جس کا احساس جاہل سے جاہل شخص اور بیدل سے بیدل انسان کو ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے۔ کہ صاحبِ فہم اس احساس سے زیادہ لُطف اُٹھاتا ہے۔ اور مقابلۃً کم "سُر" موسیقی میں وُہ چیز ہے۔ جو دراصل موسیقی کی جان ہے۔ اور جس کے بغیر موسیقی موسیقی نہیں۔ غور سے دیکھئے۔ تو یہ "سُر" تاثر قلبی کا ہو بہو عکس ہے۔ کسی موسیقانہ آواز کو آنکھیں بند کر کے دھیان لگا کر سُنئے۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ کوئی اپنے دل کا حال ہُو بہو آپ سے کہہ رہا ہے۔

کبھی کسی رنج کو یاد کر کے آہ کھینچتا ہے۔ جس کو سُن کر آپ بھی بیتاب ہو جاتے ہیں۔ کبھی کسی لُطف کو یاد کر کے قہقہے لگاتا اور خوش ہوتا ہے۔ جس کے اثر سے آپ کا سارا غم والم دم بھر میں کافور ہو جاتا ہے۔ موسیقی کے ایجاد کرنے والوں کی قدرت اور وسعت خیال پر نظر کر کے حیرت ہوتی ہے۔ کہ تاثر سی لطیف چیز کو تقسیم کر کے کس کس انداز سے ترتیب دیا ہے۔ اور کس طرح ایک قطرے کو دریا بنا دیا ہے۔

موسیقی کا اثر دو طرح کا ہے۔ ایک تو وُہ جو تال اور لَے سے ظہور میں آتا ہے۔ یہ اثر عام وخاص دونو پر پڑتا ہے۔ دوسرا وُہ جو مختلف سُروں کی کیفیات کی وجہ سے طاری ہوتا ہے۔ اس کے لئے ذرا صاحب دل ہونا ضروری ہے ناٹک کے گانے۔ مجلس عزا کے سوز عشق و محبّت کے گیت سب اپنی تاثیر کے لئے سُروں کے محتاج ہیں۔ اور اس میں کچھ بھی شک نہیں۔ کہ موسیقی جب اِن جذبات کے ساتھ مِل جاتا ہے۔ تو جذبات کی تصویر اُترنا تو ایک طرف نقل کی کیفیت اصل سے بڑھ جاتی ہے۔

یوں تو موسیقی کس مُلک اور کس قوم میں نہیں۔ مگر جو بات ہندوستانی موسیقی میں ہے۔ غالباً کسی میں نہیں۔ اس کا کمال اس کے باریک باریک اخفیا آس کی سچّی اور اثر بھری، ڈوبی ہوئی کیفیات اس کی تال کی پُر لُطف پیچیدگی اس کے لَے کا لوچ اور تڑپ یہ سب وُہ چیزیں ہیں جن کا نشان یورپ کے ترقی یافتہ موسیقی میں کہیں نہیں ملتا۔ بلاشبہ یورپ کا موسیقی ابھی ترقی کی دَوڑ میں بہت پیچھے ہے۔ اور اس لائق ہے۔ کہ سالہا سال ہندوستانی موسیقی کے سامنے زانوئے ادب نہ کرے۔

ایک غلط سا خیال عام طور سے موسیقی کی قدیم مقرّرہ طرزوں کی نسبت پھیلا

ہؤا ہے۔ وُہ یہ کہ اِن میں سے ہر ایک طرز کسی خاص وقت کے ساتھ مخصوص ہے۔ اِس خیال کا باعث وُہ طرزیں ہیں۔ جو صبح کی چیزیں کہلاتی ہیں۔ اِن طرزوں میں مایوسی درد اور تفکر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اور صبح کے وقت ان کو گانے سے اِن سب کا اثر اور بھی زیادہ ہوجاتا ہے۔ اوقات پسند گروہ اِسی پر قیاس کرکے کہ دیتا ہے۔ کہ یہ چیزیں صبح سے مخصوص ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں۔ موسیقی کو اوقات سے کوئی ایسا تعلق نہیں۔ اگر ہے تو اتنا کہ بعض بے حد افسردہ طرزیں سوائے سکون اور سکوت کے عالم کے کسی دوسرے وقت نہیں کھلتیں اور سکون وسکوت کی موجُودگی ہر طرز کیلئے باعثِ فروغ ہے۔ چاہے سکون وسکوت صبح کو ہو دوپہر کو ہو آدھی پچھلی رات کو۔ یہ بات مانی جاسکتی ہے۔ کہ آدھی رات پچھلی رات اور تڑکے کی چیزیں کسی اور وقت میں وُہ لُطف نہیں دیتیں۔ جو مذکورہ اوقات پر دے جاتی ہیں۔ اِس لئے کہ وُہ چُپ چاپ وقت اِن درد بھری چیزوں کے لئے زیادہ موزوں ہیں۔ مگر یہ امر ہرگز ماننے کے قابل نہیں۔ کہ دن کی چیزیں بھی اِسی طرح رات کو کبھی نہیں کھلتیں۔ ہندوستانی تھیئیٹر کبھی اس بات کی پرواہ نہیں کرتے۔ اور جاننے والے خوب جانتے ہیں۔ کہ وُہ بالکل حق بجانب ہیں۔

کہتے ہیں۔ کہ یورپ کے موسیقی میں شادی اور غم کے لئے الگ الگ طرزیں مخصوص ہیں۔ ہندوستانی موسیقی میں بھی اِس قسم کا اِمتیاز ممکن ہے۔ مگر بہت مشکل ہندوستانی موسیقی وُہ بیش قیمت زربفت ہے۔ جس میں شادی وغم کے گنگا جمنی تار کچھ اِس طرح پیوست ہوتے چلے گئے ہیں۔ کہ ایک تار کو دوسرے تار سے الگ کر دکھانا اعجاز سے کم نہیں۔ بس ممکن ہے۔ تو صرف اس قدر کہ بعض چیزیں زیادہ افسردہ نظر آتی ہیں۔ اور بعض چیزیں زیادہ شگفتہ معلوم ہوتی ہیں۔ اِس افسردگی اور شگفتگی میں تال کا بہت بڑا دخل ہے۔ یہ تال وُہ چیز ہے۔ کہ خالص افسردہ سُروں

سے اگر اس کو چھپاں کر دیں۔ تو اِن کی افسردگی تک نسبتاً منسیاً ہو جاتی ہے۔

ہندوستانی موسیقی کے کمال کا باعث وہ عظیم الشان تاثر ہے جس کا وجود ہندوستان کے مشہور فلسفے میں پایا جاتا ہے۔ اس موسیقی کی بعض بعض طرزیں ایسی ہیں۔ کہ انسان کو مرغِ بسمل کی طرح تڑپا دیں۔ یا دریائے تحیّر و تفکر میں اس قدر غرق کر دیں۔ کہ دُنیا و ما فیہا کی خبر نہ رہے۔ یہ وُہ نکتہ ہے۔ جس کی وجہ سے بعض اکابرِ ملّت نے اشغالِ موسیقی کو ممنوع ٹھیرایا ہے۔ اور اس میں کچھ بھی شک نہیں کہ ہر شخص کو اِس آتشِ سیّال کا استعمال راس نہیں آتا۔ اُمرا جن کو سب کچھ حاصل ہے۔ اور صلحاء جو درد کے بڑھنے کو درد کا علاج جانتے ہیں۔ اِن اشغال میں انہماک رکھیں تو مضائقہ نہیں۔ عوام النّاس کو اور اُن عوام النّاس کو جو ہزاروں دبی آرزوئیں دلوں میں لئے ہوئے ہیں۔ موسیقی کی ہوا سے بچنا چاہئے۔ ورنہ موسیقی دبی ہوئی آگ کو بھڑکائے گا۔ اور اِس کا انجام عشق و دیوانگی ہوگی۔

(سید نذیر حسین)

ناکام محبّت

ایک روز کا ذکر ہے۔ میں ٹہلتا ٹہلتا دیہات کی طرف جانکلا چونکہ بہت دُور نکل آیا تھا۔ واپس ہوُا تو دم لینے کے لئے راستے میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی۔ کہ دُور سے ایک جنازہ آتا دکھائی دیا۔ نزدیک آیا تو معلوم ہوُا۔ کہ نوجوان لڑکیاں ایک تابوت کو اُٹھائے ہیں۔ اَور ایک جوان سب سے کسی قدر بڑی عمُر کی ہے۔ تابوت کے آگے آگے سفید پھُولوں کا ایک ہار ہاتھ میں لئے آرہی ہے۔ پوشاک اِن سب نازنینوں کی سفید رنگ کی تھی۔ تابوت کے پیچھے پیچھے متوّفی کے والدین تھے۔ جن کی وضع سے ظاہر تھا۔ کہ کوئی اچھے خوش حال انسان ہیں۔ باپ کے چہرے سے صبرو استقلال عیاں تھا۔ مگر جمی ہوئی نظر چڑھی ہوئی تیوری اَور جھُریوں دار چہرہ بتا رہا تھا۔ کہ اندر دل کی حالت کچھ اَور ہے۔ ماں اپنے خاوند کے بازو پر جھُکی ہوئی تھی۔ اَور رہ رہ کر بیتاب ہوتی تھی۔ میں جنازے کے ساتھ ہولیا۔ اوُر دفن کے بعد تک لوگوں کے ساتھ رہا۔ جب تابوت کو قبر میں اُتارا۔ ہے سہیلیاں پھُوٹ پھُوٹ کر رو تی تھیں۔ باپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اَور ماں کا یہ حال تھا۔ کہ کوئی تسلّی دیتا تھا۔ تو اَور بے چین ہوتی تھی۔ افسوس جس ماں کا گُلِ گلزار خوبی عین بہار میں یکایک یوُں پژمُردہ ہوکر رہ جائے۔ وُہ اگر یہ بھی نہ کرے۔ تو اَور کیا کرے!

قبرستان سے واپس ہوکر میں نے سارا حال معلوم کیا۔ اَور معلوم کرنے کو

ایک نہایت سادہ کہانی تھی۔ متوفی گاؤں کے ممتاز حسینوں اور سارے کسانوں کی لاڈلی
نوجوان لڑکی تھی۔ یہ اپنے ماں باپ کی اخیر عمر کی ایک ہی بچی تھی۔ اور دیہات کی سیدھی
سادھی معاشرت میں بڑے نازوں سے پل کر جوان ہوئی تھی۔ تعلیم اُس نے گاؤں
کے پادری سے پائی تھی۔ اور وہ اِس پر بے حد شفقت کرتا تھا۔ اِس کا نازک ڈیل ڈول
دلفریب خد و خال البیلا حسن خدا داد دلربا بھولا پن غضب کا الھڑ پن اور نیا دل یہ
کہتا تھا۔ کہ کھیت کے مضبوط مضبوط درختوں میں حسنِ اتفاق سے باغ کا ایک نازک
نونہال پھلنے پھولنے کو آ پڑا ہے۔ سہیلیاں اُس کے حسن کی برتری کو تسلیم کرتی تھیں۔
مگر حسد نہ کرتی تھیں۔ اِس کی بلا تصنع نرم مزاجی اور دلربا خوش اطواری تھی۔ کہ یہ خیال
ناممکن کیسا محالِ محض تھا۔ دیہات کا کونسا تہوار تھا جس میں ہماری خوبصورت کسان
لڑکی اپنی سہیلیوں سمیت شریک نہ ہوتی تھی۔ کونسی خوشی کی تقریب تھی جس میں اُس
کے قدوم میمنت لزوم سے لطف دوبالا نہ ہو جاتا تھا۔ ہرے بھرے جنگل میں جھولے
ڈالے جاتے تھے۔ پھول پہنے جاتے تھے۔ لٹائے جاتے تھے۔ اور ہزاروں طرح
کے دل بہلاوے ہوتے تھے۔ یہ جلسے گاؤں میں اکثر رہا کرتے تھے۔ اور ان موقعوں
پر کبھی کبھی شہر کے رہنے والے بھی تماشا دیکھنے کو آنکلتے تھے۔ ایک دفعہ ایسے
ہی موقع پر سپاہیوں کا ایک دستہ گاؤں کے قرب و جوار میں آکر ٹھہرا۔ بہت سے
سپاہی تماشا دیکھنے کو آئے۔ اِن میں ایک نوجوان افسر بھی تھا۔ اس پر اس گاؤں
کے رہنے والی ملکۂ حسن و جمال مرجع خاص و عام کا ایسا اثر ہوا۔ کہ بے دھڑک اظہار
محبت کرنے لگا۔ اُس کے محبت بھرے جملوں اُلفت کی نظروں پیار کے لہجوں
سینکڑوں ملائم اور دلپسند حرکات و سکنات نے اُس ننھے نازک بھولے بھالے
دل کو چٹکیوں میں موہ لیا۔ اِس کے دل میں نوجوان سپاہی کی محبت روز بروز بڑھتی
جاتی تھی۔ مگر اُسے معلوم نہ تھا۔ کہ کیا ہو رہا ہے۔ اور آخر کیا ہوگا۔ اِسے [illegible] کا خیال

تک نہ تھا۔ اُس کا منظورِ نظر جب پاس ہو۔ تو یہ اِس کی باتوں اُس کی حرکات و سکنات میں محو رہا کرتی۔ اور وُہ پاس نہ ہوتا۔ تو یہ ایام گذشتہ کے شیریں واقعات کو یاد کر کے جی بہلایا کرتی۔ اُفّوہ! اِس لڑکی کو اپنے محبوب سے کتنی محبّت تھی! نوجوان سپاہی کی سپاہیانہ خوبصورت وضع نے اِس پر جادو کر دیا تھا۔ اور اِس کے دِل کو چھین لیا تھا۔ یہ گویا اس کی پرستش کرتی تھی۔ اور اُسے ہمیشہ اپنے سے اعلیٰ اور برتر سمجھتی تھی۔ یہ بات نہیں۔ کہ اس پر دولت اور رتبے کا اثر پڑتا تھا۔ ہرگز نہیں۔ وُہ تو عقل وتمیز سلیقہ وشعور تھا جس کے باعث نوجوان سپاہی نے اُس کے دل پر قبضہ کیا تھا۔ یہ ہمہ تن گوش ہوکر اُس کی باتیں سُنا کرتی تھی۔ اور بے انتہا مُسرّت کے ساتھ اس کی طرف دیکھا کرتی تھی۔ اور جب کبھی اِس اثنا میں اپنا خیال آجاتا تھا۔ تو آپ کو بہت کم درجہ پاکر ایک ادائے دلربایانہ کے ساتھ جھینپ جاتی تھی۔ اِس کے عاشق کو اِس سے محبّت تو بڑی تھی لیکن اس قدر نہ تھی جس قدر اِس کو تھی۔ اگرچہ کھیل ہی کھیل میں اِس سے تعلق پیدا کیا تھا تاہم وُہ ایسا آوارہ و اُوباش نہ تھا۔ کہ کچھ بھی پروا نہ کرتا۔ وُہ اِس محبت کرنے والی کے اطوار، طرزِ معاشرت اور حیا و عصمت کو دیکھتا تھا۔ تو بے اختیار شادی کی تمنّا اس کے دل میں موجزن ہوتی تھی۔ مگر پھر اس کا اعزاز ظاہری خاندانی مرتبہ اور باپ کی معزّز اور پُرتمکین طبیعت یہ سب ایسی رکاوٹیں تھیں۔ کہ اُس کا دِل ٹوٹ جاتا تھا۔

یکایک رسالے کو کُوچ کا حکم ہُوا۔ اور اِس نے ہمارے نوجوان کی آرزؤں کا یک لخت خوں کر دیا۔ نوجوان نے چاہا۔ کہ اپنی محبوبہ کے نازک دل کو اس وحشتناک خبر سے صدمہ نہ پہنچایئے۔ اِسی لئے جب چلنے میں ایک دن رہا۔ تو مجبوراً شام کو سیر کرتے اِس سے ذکر کیا۔ اِس معصومہ کو جُدائی کا کبھی خیال بھی نہ آیا تھا۔ خبر کیا تھی ایک برقِ بلا تھی۔ کہ خرمنِ مُسرّت اور راحت کو دم بھر میں خاک سیاہ کر گئی۔ نازنین زار

زار مثل ابرِ بہار رونے لگی۔ عاشقِ صادق نے فرطِ محبت میں سینے سے لپٹا لیا نازک گلابی رخساروں کو چوما۔ اور یہاں تک کہا۔ کہ آؤ گھر چھوڑ دو۔ اور جہاں خدا لے جائے ساتھ چلی چلو۔ یہ اس قدر سادہ لوح تھی۔ کہ سراسیمہ ہو کر اُس کی طرف دیکھنے لگی۔ اور جب ذرا دیر کے بعد مطلب سمجھی۔ تو عجیب کیفیت ہوئی۔ زبان سے تو کچھ نہ کہا مگر اس طرح پیچھے ہٹی جس طرح کوئی افعی سے بچتا ہے۔ اور ایسی درد بھری نظر سے اُس کی طرف دیکھا۔ کہ نگاہ سینے کو چیر کر دل کے پار ہو گئی۔ پھر کلیجہ مسوس کر اپنی جھونپڑی کی طرف بھاگی۔ غریب سپاہی تکا بکا خفیف ہو کر رہ گیا۔

اگلے ہی دن رسالے کے ساتھ وہ اُس گاؤں سے چلا گیا۔ نئے آب و ہوا، نئے نئے منظروں نئی نئی تفریحوں اور نئے نئے رفیقوں نے اُس کی محبت کو بھلا سا دیا۔ تاہم خیمہ گاہ کی چہل پہل۔ زمانِ محاصرہ کی تفریح۔ فوجوں کی صف آرائی اور لڑائیوں کے شور و غل میں کبھی کبھی اُسے دیہاتی پرامن اور سادہ زندگی کے نظارے یاد آ جاتے تھے۔ ہائے وہ سفید جھونپڑی! وہ بٹیا جو رو پہلے نالے کے کنارے اوپر جھاڑی تک پہنچی تھی! وہ ننھی منی دیہاتی لڑکی جو اس کے بازو کے سہارے اِدھر اُدھر ٹہلا کرتی تھی۔ اور بے حد تمنا کے ساتھ اُس کی باتیں سنا کرتی تھی۔

محبوب کی جدائی سے بیچاری دہقان زادی کو بڑا بھاری صدمہ ہوا۔ اُس کی اُمیدیں خاک میں مل گئیں۔ پہلے کچھ دنوں تک تو غش آتے رہے۔ اور دوا... کے آنسو بہائے گئے۔ جب یہ شکائتیں دور ہوئیں۔ تو ایک گہری تاریک غم کی... دل پر چھا گئی۔ جس سے تھوڑے ہی عرصے میں جسم نازنین سوکھ کر کانٹا ہو... اِس نے چھپ کے سے سپاہیوں کو کوچ کرتے دیکھا تھا۔ اِس لیے... عاشق کو دور تک اِس قدر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا کہ دھیلوں... تھا۔ دور سے اب نقطہ ایک چمکتا تارا سا نظر آتا تھا! ہائے ایک

کہ آنکھوں سے نہاں ہوگیا۔ اور اُسے تاریکی میں چھوڑ گیا! لوگوں سے اُسے نفرت ہوگئی۔ اکیلی اُن روشوں پر ٹہلا کرتی تھی جن پر یہ اور اُس کا محبوب دونو اکثر پھرا کرتے تھے۔

جس طرح کوئی آہوئے زخم خوردہ سب کی نظروں سے پنہاں ہو کسی گوشے میں دور دکر جان کھویا کرتا ہے۔ وہی ہُو بہُو اس کی حالت تھی۔ شام کے وقت گنوالنیں اپنے اپنے کھیتوں سے آتی تھیں۔ تو اکثر اُسے کوئی غمناک گیت گنگناتے سُنتی تھیں۔ عبادت کی طرف اب اس کا میلان بہت زیادہ ہوگیا جب پاس سے گزرتی تھی۔ تو بڑے بوڑھے بھی اُس کی ناتوانی ولاغری پر ترس کھا کر اور اُس کی زاہدانہ صورت سے مرعوب ہوکر راستے سے ہٹ جاتے تھے۔ اُسے یقین ہو چلا تھا۔ کہ میں قبر کی طرف قدم بڑھائے جارہی ہوں۔ مگر قبر کا خیال اُسے تشویش میں نہ ڈالتا تھا۔ یہ تو اُسے آرام گاہ سمجھتی تھی جس رشتۂ سیمیں نے اُسے دُنیا سے باندھ رکھا تھا۔ وہ ٹوٹ گیا تھا۔ دُنیا کی کوئی خوشی اسے خوشی نظر نہ آتی تھی۔ سخت مجبور ہوکر اُس نے اپنے محبوب کو ایک آخری خط لکھا۔ اس میں یہ بیان کیا۔ کہ میں جان بلب ہُوں۔ اور یہ سب تمہاری کرتوت ہے۔ اِس خط میں اپنے تمام رنج والم بھی تحریر کئے۔ اور آخیر میں یہ لکھا۔ کہ میرے جی نے گوارا نہ کیا۔ کہ تمہیں معاف کئے بغیر مرجاؤں۔

بالآخر نقاہت اتنی بڑھی۔ کہ جھونپڑی سے باہر نکلنا محال ہوگیا۔ گر پڑ کر جھروکے تک پہنچ جاتی تھی۔ اور وہیں بیٹھی دن گزار دیتی تھی۔ اُس نے کبھی کسی کا گلہ نہ کیا۔ محبوب کا نام تک کبھی اُس کی زبان سے نہ نکلا۔ ماں کے سینے پر گردن ڈال دیتی تھی۔ اور چپکے چپکے روتی تھی۔ غریب والدین بیٹی کا یہ حال دیکھ دیکھ کر کُڑھتے تھے۔ مگر مایوس نہ ہوتے تھے۔ ابھی اِن کی اُمیّد تھی۔ کہ ہمارے خزاں رسیدہ

نونہال پر پھر ایک دن بہار آئے گی۔
ایک دن اسی صورت سے وہ اپنے والدین کے پاس بیٹھی تھی۔ دونو ہاتھ اُن کے ہاتھوں میں تھے۔ کھڑکی کھلی تھی۔ اور نرم نرم ہوا کے ساتھ اُس کے ہاتھوں کی پلی ہوئی حنا کی خوشبو مشامِ جان کو معطّر کر رہی تھی۔ باپ ابھی کتابِ مقدّس کے ایک مقام کو پڑھ کر سُنا رہا تھا۔ جہاں دُنیا کی بے ثبات راحتوں اور بہشت کی ابدی لذّتوں کا بیان تھا۔ آہ! معلوم ہوتا تھا۔ کہ اِس بیان سے اُسے تسلّی ہوتی ہے! والدین بڑی حسرت سے اُس کی صورت کو تک رہے تھے۔ جو کثرت رنج و غم کے باعث نورانی ہو چلی تھی۔ وہ ٹکٹکی باندھے ایک طرف کو دیکھ رہی تھی۔ اور نازک نیلی نیلی انکھڑیوں میں آنسو بھرے تھے۔ ایں! کیا وہ اپنے بے وفا محبوب کو یاد کر رہی تھی۔ یا اُس کے دل میں کچھ اور ہی خیال تھا۔
یکا یک گھوڑے کی ٹاپ کی آواز کان میں آئی۔ ایک سوار گھوڑا دوڑاتا جھونپڑی کے دروازے پر آیا۔ اور جھروکے کے نیچے آکر اُتر پڑا۔ بے چاری لڑکی نے ایک آہ منہ سی چیخ ماری۔ اور پھر اپنی جگہ لیٹ رہی۔ ہاں یہ اُس کا پشیمان عاشق تھا۔ وہ دوڑ کر اندر آیا۔ اور آتے ہی اُسے سینے سے لپٹا لیا۔ نحیف و زار جسم اور مردنی چھائے ہوئے زرد زرد پیارے چہرے کو دیکھ کر اِس کے دِل پر سخت چوٹ لگی۔ اِس میں اتنی طاقت کہاں تھی۔ بیٹھے ہی بیٹھے کانپتا ہوا ہاتھ اُس کی طرف بڑھایا۔ لبوں کو جنبش ہوئی۔ مگر کوئی لفظ مُنہ سے نہ نِکلا ایک عجیب محبّت بھرے تبسّم کے ساتھ نگاہ کی اور پھر سدا کو آنکھیں بند کر لیں۔
یہ ہے وہ کہانی جو مجھے لوگوں کی زبانی معلوم ہوئی۔ واقعات کس قدر سادہ تھے۔ مگر مجھ پر اُن کا اثر ایسا ہوا۔ کہ بیان نہیں کر سکتا۔ اِس کے بعد میں بارہا اِس گاؤں میں آیا۔ اور جب آیا ارادۃً قبرستان میں گیا۔ جاڑے کی ٹھنڈی شام

تھی۔ درختوں نے پتّوں کا پُرانا لباس اُتار دیا تھا۔ ہَوا خشک گھاس میں سے سَن سَن کرتی آتی تھی۔ اَور ہر طرف ویرانی اَور بے رونقی چھائی تھی۔ مگر معصوم گاؤں والی کی قبر پر سبز بیلیں چڑھی تھیں۔ اَور ہَری ہَری دُوب قبر کے تعویز پر لہلہا رہی تھی۔ وُہی پھولوں کا ہار جسے میں نے میّت کے روز دیکھا تھا۔ قبر پر لٹکتا تھا۔ پھُول تو مُرجھا کر خشک بھی ہو گئے تھے۔ لیکن احتیاط کرنے والوں نے یہ احتیاط ضرور کی تھی۔ کہ اُن کی سفیدی میں فرق نہ آئے۔ میں نے بہت سی عجیب وغریب یادگاریں دیکھیں۔ اَور ایسی ایسی دیکھیں۔ کہ سنگ دل سے سنگ دل ناظر کا دل بھی اُن کو دیکھ کر بھر آئے۔ مگر یہ ایسی یادگار تھی۔ کہ میرے دل پر جتنا اُس کا اثر ہُوا۔ اُتنا کبھی کسی کا نہ ہُوا تھا۔

(سیّد نذیر حسین)

غرناطہ

ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہر قوم کے عروج اور زوال کا ایک وقت مقرر ہے۔ جس طرح یونان کو زوال ہوا جس طرح روما تباہ ہوا۔ اسی طرح ہسپانیہ میں بھی مسلمانوں پر زوال آیا۔ سلطنتِ غرناطہ مسلمانوں کی آخری یادگار ہسپانیہ میں باقی رہ گئی تھی۔ ہر طرف سے دشمنوں کا نرغہ تھا۔ مگر واہ رے شجاعت سب کو برابر جواب دیتے رہے۔ آخر یہ ہوا کہ ابن احمر سلطان کے زمانہ میں صرف غرناطہ اور اس کا قرب وجوار مسلمانوں کے قبضہ میں رہ گیا۔

قرطبہ کے عوض اب غرناطہ اسلامی علم وہنر کا گھر ہوا۔ اس کی عمارت کی دھوم پڑ گئی۔ خود غرناطہ ایک خوبصورت شہر تھا۔ شہر کی بلند عمارتوں پر چڑھ کر نظر دوڑائی جاتی تو دُور تک ایک سرسبز شاداب میدان دکھائی دیتا تھا جس میں ندیاں انگورستان باغات اور نارنج کے جھنڈ نظر آتے تھے۔ اُندلس بھر میں کوئی اور شہر اس وضع اور آب وہوا کا نہ تھا۔ برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں سے جب ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں۔ تو سخت سے سخت گرمی میں جاڑے کا لطف پیدا ہو جاتا تھا۔

قصر الحمرا ایک سطح مرتفع پر قائم ہے۔ جس کے چاروں طرف کھڈ اور نالے ہیں۔ اور شمال کی طرف دامن میں دریائے ڈارو بہتا ہے۔ پتھر کی مضبوط دیواریں چاروں طرف سے قصر کو گھیرے ہوئے ہیں۔ ایک نہایت سنگین اور مضبوط برج کے نیچے قصر کا بیرونی دروازہ ہے۔ جس میں درِ عدالت نصب ہے۔ اس دروازہ

ہیں سلطان مسندِ عدالت پر بیٹھ کر دادِ انصاف دیتے تھے۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک چوک نظر پڑتا ہے جس کی ایک طرف چارلس پنجم شاہ ہسپانیہ کا تیار کردہ محل نامکمل حالت میں پڑا ہوا ہے۔ آگے چل کر ایک برآمدہ ملتا ہے جس سے گزر کر صحنِ حنائی میں داخل ہوتے ہیں۔ اِس صحن میں حنا کے بے شمار پودے ہیں۔ اِس کے بعد ایک تنگ راستہ سے نکل کر ایک اور صحن ۱۳۰ فٹ لمبا اور ۷۰ فٹ چوڑا ملتا ہے۔ اِس کے عین وسط میں ایک تالاب ہے جس میں سُنہری مچھلیاں تیرتی رہتی ہیں۔ دھوپ کا عکس جب مچھلیوں اور پانی پر پڑتا ہے۔ تو عجب بہار ہوتی ہے۔ چاروں طرف کونوں پرستون اور بھول بھلیاں ہیں۔ ہر وقت ایک سکوت کا عالم چھایا رہتا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر دیوانِ وکلاء میں جاتے ہیں۔ سلاطین بنی اُمیّہ اسی دیوان میں مسندِ خلافت پر متمکن ہوتے تھے۔ اُوپر کا ایک بلند گنبد ہے۔ چاروں طرف عربی خط اور عربی زبان کے کتبے دیواروں پر ایک کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ مناسب مناسب موقعوں پر بیل بوٹے بھی ہیں چھت پر دائرے تارے اور ستارے بنے ہوئے ہیں۔ جس سے گنبد میں گنبدِ نیلوفری کی شان پیدا ہے۔

مینار کی بھول بھلیوں کو طے کر کے ہم مینار کی چوٹی پر پہنچتے ہیں۔ یہاں سے میدان ویگا صاف نظر آتا ہے۔ سلطانہ کا کمرہ اِن ہی بھول بھلیوں میں ہے۔ جس کی کھڑکیاں میدان ویگا کی طرف ہیں۔ دروازہ کے نزدیک ہی سفید سنگ مرمر کے فرش میں متعدد سوراخ نظر آتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس فرش کے نیچے بخورات جلائے جاتے تھے۔ اور خوشبو اِن سوراخوں سے نکل کر کمرہ کو معطر کرتی تھی۔ نیچے پائین باغ ہے جس میں ایک مختصر سا چمن ہے۔ اِس کے قریب ہی شاہی حمام ہیں جن پر پچیکاری اور گلکاری کا کام دیکھنے اور تعریف کرنے کے قابل ہے۔ حمام کے بیچوں بیچ حوض ہے۔ جس کا پانی لہروں کے باعث آہستہ آہستہ گھٹتا اور بڑھتا رہتا ہے۔ سامنے

اُوپر کی طرز کی کھڑکیاں ہیں جن میں حمام کرنے کے وقت نغمہ و سرود سے کام لیا جاتا تھا۔

سب سے زیادہ مشہور و معروف قصر کا وہ حصّہ ہے۔ جو "بیت الاسد" یا "شیرِ دل کے صحن" سے موسوم ہے۔ ایک سو اٹھائیس سفید سنگِ مرمر کے ستون تین تین چار چار کے قطار میں نصب ہیں۔ اُن پر بارہ دریاں بنی ہوئی ہیں جن کے ستونوں کی خوبی۔ باریک گلکاری کی شان۔ سنہری اور روپہلی رنگ کی بہار نارنج نما گنبدوں خوبصورت میناروں اور محرابوں کی دلربایانہ کیفیت۔ شاعرانہ مزاج کے لئے تازیانہ کا کام دیتے ہیں۔ نیچے ایک خالی حوض ہے جس میں بارہ ہیبت ناک شیر کھڑے ہیں۔ اِن کے مونہوں سے کسی زمانہ میں پانی نکل کر حوض کو بھرتا رہتا تھا۔

اِس خوبصورت صحن سے آگے بڑھ کر دیوان بنی نصر ہے۔ کہتے ہیں۔ کہ بنی نصر کے سردار اسی جگہ سلطان ابوعبداللہ کے حکم سے تہ تیغ کئے گئے تھے۔

قصر زرلطیف ایک اور محل ہے جس کو قصر الحمرا کا تابستانی مقام کہنا چاہئے۔ ایک سادہ سا محل ہے۔ دیواریں چبوترے بارہ دریاں اور محرابیں سب کھنڈر پڑے ہیں۔ عربی گلکاری پر سفیدی کی پائدار نہیں ابھی تک قائم ہیں۔ مگر سنگ تراشی کے عجیب دلفریب نمونے ضائع ہو چکے ہیں۔ اور عمارت کی اندرونی خوبی عرصہ ہوا معدوم ہو گئی ہے۔ ہاں باغوں اور نہروں کا لُطف ضرور قائم ہے۔ ایک سبک رفتار نہر سنگ مرمر کی نالی سے ہو کر صحن میں اس طرف سے اُس طرف کو نکلی ہے۔ جس پر صنوبر و سرو کی گھنیری چھاؤں کا عکس پڑتا رہتا ہے۔ فوارے نلکے نلکیاں چھوٹے چھوٹے پانی کے برتن۔ نہر کے پیچ در پیچ راستے۔ نہروں کے اندر چھوٹی چھوٹی اور نہریں۔ یہ سب اس خوبی اور نفاست کے ساتھ باہم جمع کئے گئے ہیں۔ کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اور دل بے قابو ہو جاتا ہے۔

دو صدیوں تک مسلمانوں نے غرناطہ میں امن چین کے ساتھ حکومت کی۔ مگر آخر کہاں تک۔ شاہ فرڈیننڈ اور ملکہ ازبیلا کی شادی ہوتے ہی ہسپانیہ کی قوت یک جا مجتمع ہوگئی۔ یہی شگون مسلمانوں کے لئے بُرا ثابت ہؤا۔ سلطان ابوالحسن نے اپنی سی بہتیری کوشش کی اور مسیحیوں کا مقابلہ خوب خوب کیا۔ مگر پھر بھی سارے کے سارے مقبوضات یکے بعد دیگرے مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلتے گئے۔ بذیعہ لوہر کا محاصرہ کر لیا گیا۔ اور وُہ ہاتھ سے جاتا رہا۔ پھر یہاں تک ہؤا۔ کہ آخر غرناطہ بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ محاصرۂ غرناطہ کے بعد جب مسلمان میدان چھوڑ کر شہر غرناطہ میں پناہ گزیں ہوئے۔ تو در و دیوار سے نالہ و بُکاء کی آواز بلند تھی۔

خوبصورت غرناطہ حسین غرناطہ! تیرے نارنج اور حنا کی خوشبو اب بھی اُسی طرح عیش خانوں اور آرام گاہوں کو معطّر کرتی ہے بلبل کا نغمہ اب بھی تیرے دل کشا باغوں میں سُنائی دیتا ہے۔ تیرے سنگ مرمر کے کشادہ ایوانوں میں اب بھی فوّاروں اور نہروں کی چہل پہل نظر آتی ہے۔ مگر الحمراء کی جوت اور تیرے بادشاہوں کی شان وشوکت اب کہاں!

نذیر حسین ناشاد

علم کی خوشیاں

تلاشِ حقیقت جزوِ شرافت ہے۔ اور اس کا حصول داخل خوبی و زیبائی انسان کے دِل کا یہ پُرانا خیال ہے۔ کہ علم دولت سے بہتر ہے۔ اور یہ خیال بڑا گہرا مشترک اور صحیح ہے۔ جذباتِ انسانی کی اِس موجِ عظیم کو دیکھنا۔ جو جدتِ مدید سے بہرہ ہے۔ قوموں کی ترقی و تنزل کے اسباب پر غور و فکر کرنا۔ گرمی روشنی اور ہوا پر بحث کرنا۔ آسمان اور زمین کے متعلق جو کچھ انسان نے دریافت کیا ہے۔ اُسے جاننا عالمِ علم کیمیا سے یہ سُننا کہ خالق نے زمین میں کتنی تعجب انگیز خاصیتیں ودیعت کی ہیں۔ طبیعی دان سے یہ معلوم کرنا کہ اِس زمین سے پرے کئی اور زمینیں اتنی دُور ہیں۔ کہ روشنی جیسی تیز رفتار شئے بھی آج تک وہاں سے یہاں تک نہیں آئی۔ الغرض اِن سب چیزوں کا علم اور اُس ترتیب کا حاصل کرنا جو اُن کے علم کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ایک ایسی شئے ہے جس کے حاصل کرنے کے لئے ہمیں اپنی جوانی کے دنوں میں [illegible] جان کوشش کرنی چاہیئے۔

شعر کی دُنیا کی سیر کرنا اور اس فصاحت سے گرم جوش ہونا جو یونان اور رُوم کی سلطنتوں پر حاکم تھی۔ بڑے بڑے فلاسفروں کے ساتھ تمام چیزوں کی علتِ غائی تک جانا اور اس امر کا معلوم کرنا۔ کہ باوجود دُنیا کی بے ترتیبی ظلم اور تعدّی کے ایک شئے ہے جو کبھی نہ بدلے گی کبھی فناہ نہ ہوگی۔ اور ازل تک رہیگی۔ یقیناً اِن باتوں کو جاننے کے لئے ضروری ہے۔ کہ ہم بے نیند راتیں گزاریں۔

دل کو سخت محنت کریں۔ موجودہ خوشیوں کو نظر انداز کریں۔ ہمیشہ ستانے والی غریبی کو برداشت کریں۔ ظلمت غم اور نفرت سے نہ گھبرائیں۔ میں اُن شخصوں سے سوال کرتا ہوں جنہوں نے اپنے دماغ کو اچھی طرح سے تربیت دی ہے۔ کہ آیا اس تربیت میں اُنہیں ایک قسم کی تسلّی حاصل نہیں ہوتی۔ جو اُنہیں یہ کہتی ہے۔ کہ بے شک تم اپنی زندگی کے مُدعا کے حصُول میں بڑی کوشش کرتے رہے ہو۔ قدرت کا منشا تم نے پا لیا ہے۔ تمہارے قوائے عقلی و ذہنی نے اُس کام کو انجام دے لیا ہے۔ جس کی خاطر وُہ تمہیں عطا کئے گئے تھے۔ تم نے اُن کو ہیچ اور نفسانی لذتوں پر خرچ نہیں کیا بلکہ ایسی محنت پر لگایا ہے۔ جو اُن کی فطرت اور اصل کے عین مطابق ہے۔

علم کی زندگی عموماً تکلیف اور گناہ کی زندگی نہیں ہوتی۔ علم کا عاشق کسی شخص پر ظلم نہیں کرتا۔ کسی کی خوشی میں دخل نہیں دیتا۔ اس کی آرزو کسی کو برباد نہیں کرتی۔ اُس کا ضمیر کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ وُہ اپنی دُھن میں کسی شخص کو تکلیف نہیں دیتا۔ اور اپنی کامیابی سے ہر شخص کو فائدہ پہنچاتا ہے۔

جو شخص اپنی زندگی علم کی پری کے حوالے کر دیتا ہے۔ وُہ ایک ایسی خوشی حاصل کرتا ہے۔ جس کے ساتھ کوئی ملازمت وابستہ نہیں۔ اُسے ایسی خوشیوں پر بلاشبہ نفرت ہوتی ہے۔ جن کا حصُول خلافِ ہدایتِ ضمیر عمل کرنے پر مجبُور کرے۔ اس کی خوشیاں سب سے معزّز اور بے لوث ہوتی ہیں۔ اور جہاں تک انسان اس تغیّر و تبدّل کے دور میں ہمیشگی کی اُمید کر سکتا ہے۔ وُہ اِس قسم کی ہوتی ہیں۔ کہ قسمت بھی انہیں زائل نہیں کر سکتی۔ وُہ اُس کے ساتھ زندگی بھر لگی رہتی ہیں۔ اِس کی نیکیوں کو بڑھاتی ہیں۔ اور برائیوں کو کم کرتی ہیں۔

میں قسم کھا کر کہتا ہوں۔ کہ اگر مجھے علم کا شوق نہ ہوتا۔ تو میں ضرور مفلس ترین مزدور کی زندگی کو بڑے سے بڑے امیر کی زندگی پر ترجیح دیتا۔ کیونکہ انسان کے

دل میں آتش پرستوں کی آگ جیسی ایک آگ ہے۔ جو دن رات جلتی رہتی ہے۔ ضرور اس کے لئے کچھ ایندھن چاہئے۔ جو یا تو علم کا خاص عطر ہوگا یا گندے جذبات طبعی۔

اِس لئے جب میں یہ کہتا ہوں۔ کہ علم کو تا دم مرگ عزیز رکھو میری مراد یہ ہے کہ عزیز رکھو معصومیت کو۔ عزیز رکھو نیکی کو۔ عزیز رکھو چال چلن کی درستی کو عزیز رکھو۔ اس شے کو جو دولت مند ہونے کی صورت میں تمہاری دولت کو لوگوں کی نظر میں عزیز غریب ہونے کی صورت میں تمہاری غریبی کو معزز بنا دے گی۔ اور ان لوگوں کو تم پر ہنسنے سے روکے گی جن کے سینے نخوت و تکبر سے معمور ہیں۔ عزیز رکھو اس شئے کو جو تمہیں تسلی دے گی۔ تمہیں زینت بخشے گی۔ جو تکالیف اور مشکلات میں سپر ہوگی۔ جو تمہارے لئے تخیل کی دُنیا کا دروازہ کھول دے گی جس میں بڑے طبیعی دانوں بڑے بڑے مورخوں بڑے بڑے مصنفوں۔ بڑے بڑے فلاسفروں سے تم ہمکلام ہو سکو گے۔ اور اس دُنیا کی تکلیفوں کلفتوں بے انصافیوں اور ظلم و تعدّی کو بھول سکو گے۔

پس اگر کسی نوجوان نے اپنی زندگی کی کشتی علم کے بحر ذخار میں چھوڑ دی ہے۔ تو اُسے افسوس کرنا یا ڈرنا نہیں چاہیئے۔ اُسے چاہئے کہ اُن تکالیف سے جو علم کے ساتھ لگی ہوئی ہیں۔ نہ گھبرائے ظلمت سے نہ ڈرے مشکلات سے بیدل نہ ہو۔ تنگ و تاریک جھونپڑیوں میں گزارہ کرے۔ غم و افلاس کی کوئی پرواہ نہ کرے۔ اور علم کا پیچھا اس طرح کرے۔ گویا علم ہدایت کا فرشتہ ہے۔

نتیجہ اس کا یہ ہوگا۔ کہ علم اُسے رات کے اندھیرے سے نکال کر دن کے اُجالے میں لے آئیگا۔ اور دُنیا پر ظاہر کر دیگا۔ کہ وہ کتنی وسیع معلومات رکھتا ہے۔ کتنا تجربہ کار ہے۔ کتنا مُدلّل اور دُور اندیش ہے۔ اِس کی قوت متخیلہ کتنی طاقتور ہے۔ اُس کے قوائے کیسے عمدہ ہیں۔ اور اس کا سلوک اپنے ابنائے جنس کے ساتھ کیسا اچھا ہے

(ترجمہ از سڈنی سمتھ) (برکت علی ایم۔ اے۔ [illegible])

سیلِ زمانہ

بہے جا، بہائے لئے جا، نہ تجھ میں سلامتی، نہ تیرے کنارے پر سلامتی، مِٹے ہوؤں کے نشان مٹائے جا، تیراکوں کو ڈبا، غوّاصوں کو نہ اُبھار، یہی تیرا کام ہے۔

تجھ میں جو خوشنما ہرے بھرے جزیرے نظر آتے ہیں، جو پھولوں اور پھلوں سے مالا مال ہیں، جن میں خوبصورت پرند چہچہا رہے ہیں، کیا یہی لذایذ حیات ہیں؟ وہ حسین سحرکار عورتیں، جو ہاتھ میں ستار لئے دلربا گانے گا رہی ہیں، اور جادو بھری نظریں ڈال ڈال کر مجھے اپنی طرف بلا رہی ہیں۔ کیا یہی جوانی کی اُمنگیں ہیں؟ آہ! مجھے اِس جزیرے کو تو دیکھنے دے، اِن دیویوں سے، ان پریوں سے تو ملنے دے۔ اِن کے گانے سے اپنے دل کو راحت تو پہنچانے دے! مگر تو کس کی سُنتا ہے! تو نے کبھی کسی کی سُنی ہے جو میری سُنے گا۔ اچھا لے، تجھے بھی قسم ہے، بہائے لئے جا بھگائے لئے جا ذرا نہ ٹھہر!

مگر یہ تو بتا دے، تو مجھے کہاں سے لا رہا ہے۔ کب سے لا رہا ہے، کیوں لا رہا ہے، کب تک بہائے گا.........

یہ کیا، کیا اور تیزی سے بہنا، بھنور بن پڑنا، طوفان کا اُٹھنا، موجوں کا مجھے تھپیڑے مارنا، میرے سوالوں کا جواب ہے؟ تجھے میرے سوالوں سے غصہ آگیا، میں نے بے ادبی کی؟ اچھا، اچھا جواب نہ دے، بہے جا، بہائے جا!

میری رُوح متجسّس، مدید نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتی ہے۔ نینوا، بابل،

قدیم ہند، قدیم مصر کے ٹکڑے تجھ میں نظر آتے ہیں؛ واعظ کہتا ہے! باطل، باطل سب باطل ہیں۔"

"سکندر، ہنیبال، نوشیرواں، دارا" تیری موجوں سے کبھی کبھی ان آوازوں سے ملتی جلتی آوازیں آتی ہیں۔ کیا شہرتِ رفتگاں یہی ہے؟ فلاسفر کہتا ہے، دھوکا، دھوکا، سب دھوکا ہے؛ شہرت دھوکا ہے، نام و نمود دھوکا ہے، خود زندگی دھوکا ہے!

لیکن نہیں، میں نہ ملل سابقہ کو باطل، نہ شہرتِ رفتگاں کو دھوکا سمجھتا ہوں۔ اُن کی شہرت ہمت بڑھاتی ہے، لیکن یہ خیال کر کے کہ کیا ہُوں میں اور کیا ہے میری ہست و بود، دل بیٹھ جاتا ہے۔

اس لئے بہتر یہی ہے۔ کہ لاتعداد خس و خاشاک کی طرح، جو مجھ سے پہلے آئے۔ اور بعد میں آئیں گے۔ بہے جاؤں۔

پس اے سیلِ زمانہ، بہے جا، بہائے لئے جا، اور اُس بحرِ ناپیداکنار میں، اُس عمّان عظیم الشان میں، اُس اوقیانوس ابدیں، اب یا جب تیرا دل چاہے گرادے۔

بلدرم از بغداد

آہ! یہ نظریں!

(ایک ہندوستانی مغنیّہ کو)

تھکی ہوئی، تمام شبہائے عشق کی بقیہ مسرت مخمور سے تھکی ہوئی نظریں، تیری آنکھوں سے جو سرمست وشیدا اور لطف دقیقے دینے کے وعدے کرتی ہیں۔ ان آنکھوں سے نکلنے والی ہلکی نظریں!

اِن سیاہ آنکھوں کی سوزاں ظلمتوں میں، میں اک ایسا مبہم اشارۂ دعوت پاتا ہوں۔ کہ میری روح اِن نیوتوں کو دیکھ کے حرص سے لرزنے لگتی ہے۔ جب تک کہ تیرا لطف خریدا جاتا ہے۔ تو چاہے جتنی اونچی ہو، جتنی چاہے اونچی بن، عسر الحصول نظر آ، میں بھی اک پوری رات، اِک لمبی رات، تیرے یاسمینی سینے میں گزارنا چاہتا تھا۔ مگر میرے شوق، میری آتشِ اشتیاق کو جو تیرا کل وجود و روح چاہتی ہے۔ تیری بے ہیجانی، تیری بے حرارتی! تیری بے محبتی زائل کر دیتی ہے، بجھا دیتی ہے۔

تیرے چاہنے والے جو تیرے دل تک ذرا نہیں پہنچ سکتے، جو پیسہ دے کر تجھ تک پہنچتے ہیں، اُن کے لئے تیرے نشے کس قدر بار، تیرا اظہارِ شوق کس قدر جھوٹا، تیرا گلے ملنا کس قدر پُر اِستکراہ، تیرے بوسے کس قدر تھکے ہوئے اور سست ہیں۔

یہ جانتا ہوں مگر پھر وہی! یہ آنکھیں، یہ سیاہ آتش سی بھڑکنے والی سیاہ آنکھیں اور
اِن کی متلاشی ظلمتیں جو تجسس معلوم ہوتی ہیں۔ یہ غانماں سوز متانت ہیں۔ اِن کی تپش
میں جب میں اپنے تئیں پاتا ہوں۔ تو میں بھی یہ چاہنے لگتا ہوں کہ چاہے کچھ ہو۔ میں
بھی اِن آنکھوں کی ظلمتوں میں ڈوب جاؤں، میں بھی اِس آتش سے اپنے تئیں جلاؤں!
اِک رات تو اِن آنکھوں سے سرمست آلام ہوں اور اگر کہیں تُو اصلی محبت کرے، اُف!
کہیں تو اِک ذرا چاہے۔ اُس وقت دیکھنی ہو، اُس وقت کو سوچ کے اور اپنے پر نظر
ڈال کے، اپنی روح کو دیکھ کے، میں اِس طرح ڈرنے لگتا ہوں جس طرح اِک پُر
طوفان رات کی پُرشور تاریکی سے کوئی ڈرے۔

نہیں، نہیں، جا، جا، میں نہیں چاہتا۔ اور اپنے ساتھ اپنی اُس آواز کو بھی لے جا
جو میری روح کو زیر و زبر کر رہی ہے۔ اور اس تھکے ہوئے نشے کو بھی ساتھ لے جا
جو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ کسی محترز لغلگیری سے حاصل ہوا ہے۔

اِتنی دُور جا کہ تیری آواز کو، تیرے گانے کو نہ سُن سکوں، تجھے نہ دیکھ سکوں۔ اور
تو بھی اے موسیقی، آہ! اے موسیقی، تو بھی چُپ ہو جا۔ وہ غزل نہ گا، وہ راگ نہ گا، جو
مجھے زندگی کی سب سے بہتر اِک رات کی یاد دلاتا ہے۔ اُن حرارتوں کو، اُن شعروں کو
جو میری روح میں مستور ہیں، بحران وہیجان نہ دے۔

کیونکہ میں خود اپنے سے، اپنی طاقتِ تحمل سے شبہ کرنے لگا ہوں۔ کیونکہ میں ڈرنے
لگا ہوں کہ میں اِس عورت کے لئے سب کچھ کر گزروں گا، میں ڈرتا ہوں کہ میں اپنی
متانت کھو بیٹھوں گا، اپنی سلامتی، اپنی انسانیت جسے میں اب تک قائم رکھ سکا ہوں
ہاتھ سے دے بیٹھوں گا۔

چُپ رہ، دیکھ میں کانپ رہا ہوں، دیکھ میں مرا جا رہا ہوں۔

(یلدرم)

مجھے دیکھا کیوں

ایک ہندوستانی مغنّیہ کی طرف سے

آہ! یہ نظریں! بس لکھنے والے سے خُدا ہی سمجھے۔ اِس سے تو مَیں اندھی ہوتی۔ کہ نہ کوئی صاحب میری نگاہوں پر فریفتہ ہوتے اور نہ یُوں بھگو بھگو کر لگاتے۔ شکوہ شکایت تو آگے چل کر ہو گی۔ جناب پہلے تو یہ بتایئے کہ آپ نے "مجھے دیکھا کیوں" یہ وعظ و نصیحت منظور تھا۔ تو آپ نے اس طرف کا رُخ ہی کیوں کیا۔ پھر پوچھتی ہوں منّت سے پوچھتی ہوں۔ کہ آپ نے "مجھے دیکھا کیوں" شاید مجھے شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ کہ آپ نے میری آنکھوں کو دیکھا۔ اور تعریف کی۔ مگر صدمہ تو اس بات کا ہے۔ کہ آپ نے میرا دل نہ دیکھا۔ اُس کے زخم نہ دیکھے اُس کا جنازہ نہ دیکھا۔ اُس کی بے نشان قبر نہ دیکھی۔ اور تو اور اُس کے دوامی عُرس کا جو زندہ اشتہار اِن کالی کلوٹی آنکھوں میں تھا۔ اُسے بھی نہ دیکھا۔ حیف! حیف!!

جی ہاں! "شبہائے عشق کی بقیہ مُسرّتِ مخمور سے تھکی ہوئی نظریں"۔ سبحان اللہ۔ کس قدر اچھا کہا ہے! پھر فرمایئے گا؟ "مسرّتِ مخمور" اِس خوشی کا نشہ کہ چند بے درد نکتہ چین۔ آوارہ مزاج۔ خدائی خوار۔ "زر میخورم" کی ضرورت ہے۔ "آیئے"! "بیٹھیے" "خُوب" "بہت خُوب" "سُبحان اللہ" "واہ۔ واہ" کہیں؟ مجھ بدنصیب کی خوشی اور وہ بھی مخمور کر دینے والی خوشی کا اندازہ کس قدر صحیح کیا گیا ہے! بس مجھے کچھ اور کہنا۔ نہیں بھر پائے۔

میری سیاہ آنکھوں کی سوزاں ظلمتوں میں ایک مبہم اشارۂ دعوت پایا۔" ٹھیک پایا۔ میں بلاتی تھی کہ کوئی آئے۔ آ، میری بیکسی کو دیکھے۔ میری بے بسی پر رحم کھائے میرے زخمِ جگر پر مرہم لگائے۔ مجھے اس قعرِ بدنامی سے جو عورت کے لئے موت سے بدتر ہے۔ نکالے۔ ذرا سا سہارا ہی دے دے۔

مگر میری تقدیر دیکھنے والے کی رُوح ہمدردی سے بے چین ہونے کے بدلے ہُوس سے لرزنے لگی"۔ اور طُرّہ یہ کہ یہ بھی میرا ہی قصور ہے۔ سچی بات آدھی لڑائی ہوتی ہے میں بھی لڑتی۔ مگر چُپ ہُوں۔ اور دل کو مارلیتی ہوں۔ کہ جی ہاں میرا لطف خریدا جا سکتا ہے"۔ اور اسی سبب سے دیکھنے والے کا سارا شوق بجھ جاتا ہے۔ میری بے "ہیجانی" بے حرارتی۔ بے "مجبنی"۔ اُسے زائل کر دیتی ہے۔ بجھا دیتی ہے"۔

اُسے بھی جانے دیجئے۔ غضب تو یہ ہے مجھے بالکل مُردہ سمجھ لیا۔ میرا "اظہار شوق جھوٹا"۔ میرا "گلے ملنا پُر اشکراہ"۔ "میرے بوسے تھکے ہُوئے اور سست"۔ "پیارے دیکھنے والے برائے خدا دو چار گالیاں اور دیدو۔ کوئی ارمان باقی نہ رہ جائے فرمایئے" تیرا مرنا شعبدہ روحانی۔ تیرا جنازہ ایک خالی مچاند۔ تیری قبر ہاتھی پکڑنے کا گڑھا۔ تیرا حشر نشر۔ بیروپئے کا سانگ۔

افسوس! افسوس! ! مدّت بعد ایک شخص ملا۔ مگر راز دل سے ناآشنا!

لایق یلدرم بُہت کچھ کہنے کو جی چاہتا ہے۔ مگر مایوسی کہتی ہے صبر کر خاموش ہو جا! کیونکہ آپ اِس قدر بیزار ہُوئے۔ کہ ذرا سی دیر میں دُور دُور کرنے لگے۔ میں بھی مردُود میری آواز بھی مردود۔ میرا تھکا ہُوا نشہ بھی مردود۔ اور میرے ساتھ موسیقی اور شاعری سب مردود۔ بڑے سنگ دل ہو! شاید یلدرم کے معنے ہی سنگدل کے ہوں اچھا اے گُل یلدرم! آج سے میں ہر فرد کو یلدرم کہا کروں گی۔ سُنو گوشِ ہوش سے سُنو۔ کہ میں کون ہوں۔ میری حالت کیا ہے۔ اور کس کس کی گردن پر میرا خون ہے

پہلا گناہ میں نے یہ کیا۔ کہ عورت بن کر دُنیا میں آئی۔ بدظنی کی آماجگاہ بنی۔ رقابتوں کا مرکز ٹھہرائی گئی یہ سب میرا قصور ہے۔ مرد کا اس میں بالکل قصور نہیں ہے۔ بدصورت ہوتی تو یہی نیک سیرت مرد۔ زندہ درگور کر دیتے۔ اب جو خیر ذرا چار آدمیوں میں بیٹھنے کے قابل ہوں۔ تو میری کیا کیا ہجو کی جاتی ہے۔ نظریں تو نظریں گلے ملنے اور بوس و کنارتک کے طعنے دیئے جاتے ہیں۔ گانا نہ سیکھتی کہ نہ مغنیہ ہوتی۔ اور نہ مردوں میں بُلائی جاتی! مگر کیا میں نے اپنے شوق سے ایسا کیا؟ کیا مردوں کے دلی جذبات کی طلبِ صادق نے مجھ میں یہ حس پیدا نہیں کی؟ اے اہلِ دل مرد کیا اسے بھی میں اپنا ہی قصور تسلیم کر لوں؟ اور ہو مجھے اب اپنا اصلی قصور معلوم ہو گیا۔ عورت بھی ہوتی۔ خوبصورت بھی ہوتی گانا بھی سیکھتی مردوں سے بھی ملتی۔ مگر اپنا دل نکال کر پھینک دیتی۔ مرد تو یہی سمجھتے ہیں!

درنہ میری "بے حرارتی" "بے محبتی" وغیرہ کی کیوں شکایت ہوتی بات یہ ہے۔ کہ سب سے زیادہ ظلم عورت پر اور اُس کی نسائی ہستی پر تقدس نما لوگوں کی طرف سے ہُوا۔ انہوں نے خدا کا تو یقین کیا۔ مگر خدا کے بعد جیسا کہ حق تھا۔ عورت کا یقین نہ کیا۔ اکثر دل کو بند کر کے اُن کی زندگی بے سُری کر دی۔ اور اُن کے اور علمِ موسیقی کے درمیان ایک ایسا دزنی اور موٹا پردہ حائل کر دیا۔ جو نہ اُٹھائے سے اُٹھے۔ اور نہ پھاڑے سے پھٹے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے۔ کہ آج میں ہوں۔ اور میرا بدنام فرقہ ہے۔ ہمارے کلیجے ہیں اور پلید رموں کے تیر۔

ہم بھی انسان تھے۔ ہم بھی دل رکھتے تھے۔ ہمیں یوں "بارہ پتھر باہر نہ کیا جاتا۔ تو ہم بھی گھروں کی بستی ہوتے۔ مردوں کے غم گسار ہوتے ہم میں بے حرارتی۔ اور بے محبتی نہ ہوتی۔ ہمارا اظہار شوق جھوٹا نہ ہوتا

حیف اب ہمیں لوگ دیکھتے ہیں۔ تو کس کس نگاہ سے دیکھتے ہیں اُس وقت دیکھتے تو ضرور یوں دیکھتے ؎

دیکھنے کا تو مزہ یہ ہے سراپا دیکھے
دیکھ کر پاؤں ترا مُونہہ نہ کسی کا دیکھے

دیکھو مسٹر یلدرم۔ ایک نصیحت میری مانو۔ کہ آج سے کسی مغنیّہ کو نہ دیکھنا۔

اور یہ سزا اس قصور کی ہے۔
کہ آپ نے
"مجھے دیکھا کیوں"

بقلم "نسائی"

اخلاقی جرأت!

جرأت | جرأت یا دلیری کا بڑا تعلق دل سے ہے۔ اور جرأت یا دلیری کا وجود اُس خیال پر منحصر ہے۔ جو ہمیں اپنا کام بے کھٹکے جاری رکھنے کی تحریک دیتا ہے جرأت دو اقسام پر منقسم ہو سکتی ہے۔

جسمانی جرأت | (۱) جسمانی یا قدرتی جرأت۔ یہ وہ جرأت ہے جس کے بغیر سپاہی میدان جنگ میں اپنے کرتب اور فن نہیں دکھا سکتا۔ مثال کے طور پر ہم اس جگہ پومپی آئی کے سنتری کا ذکر کرتے ہیں جب کہ کوہِ آتش خیز وسو دیش انگارے اور پگھلنے والا لاوا اپنے راہ عدم کے ناکوں سے باہر پھینک رہا تھا۔ لوگ اس آفت ناگہانی سے پناہ حاصل کرنے کے لئے اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر نہایت ہی سراسیمگی اور خوف و ہراس کی حالت میں بھاگتے پھرتے تھے۔ اور تمام کوششوں کے باوجود اس بلائے آسمانی سے چھٹکارا نہ ملتا تھا۔ لیکن واہ رے سنتری! تیری ماں نے تجھ ہی کو جنا تھا۔ تو اپنی جان کا خوف نہ کھا کر لوگوں کو بچانے میں نہایت ہی سرگرمی سے کام لے رہا ہے۔ اور اپنے فرائضِ منصبی نہایت ہی مستعدی سے ادا کر رہا ہے۔ افسوس! اس جوانمرد اور جرّی سپاہی نے سینکڑوں مرد و زن کے اُوپر سے اپنی جان تصدّق کی۔ اور اسی کھینچا تانی کی حالت میں اپنی پیاری جان نہایت ہی جوانمردی سے لاوا کے نذر کی۔ اب احمد نگر کی چاند بی بی کی دلیری کو ملاحظہ فرمائیں جس وقت مغلوں نے شہر کی چار دیواری پر دانت پیس پیس کر حملہ کرنا شروع کر دیا تھا۔

اور قریب تھا۔ کہ احمد نگر کی فوج اس حملے کی تاب نہ لاکر ہتھیار ڈال دے۔ ٹھیک اُس دم یہ نیک اَور چاند سی بی بی زرہ بکتر پہن آلاتِ حرب سے جسم کو مزین کر ہاتھ میں تلوار پکڑے شگاف پر آموجود ہوئی۔ اور اپنے سپاہیوں کو جوشیلے الفاظ سے بڑھاوے دینے لگی۔ اَور مغلوں سے ایسی جان توڑ کر لڑی۔ کہ ان کے چھکّے چھوٹ گئے۔ لاچار مغلوں کی سپاہ کو مُنہ کی کھاکر واپس بھاگنا پڑا۔ ہندوستان کی تاریخ میں اس نیک اَور پارسا بی بی نے اپنی جسمانی یا قدرتی جُراُت کی وجہ سے ایسی لازوال شُہرت حاصل کر لی ہے۔ کہ چار دانگ عالم میں اس کا نام گونج رہا ہے۔ اور لوگ اِسے بڑی عزّت اور توقیر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

اخلاقی جُراُت | (۲) اخلاقی جُراُت کو ہماری عادات سے خاص تعلّق ہے۔ یہ ضروری نہیں۔ کہ جو لوگ جسمانی جُراُت کے مالک ہیں۔ وہ اخلاقی جُراُت سے بھی غلامی کا پٹہ لکھوالیں۔ بہت سے سپاہی لڑنے میں بے باک ہوتے ہیں لیکن اتنی تاب نہیں لاتے۔ کہ اپنے ہم چشموں کے مزاج اَور دل لگی اَور ہنسی کا مقابلہ کرسکیں۔ برعکس اِس کے ایسی نازک بدن گل اندام بیبیاں بھی ہیں جن میں انتہا درجے کی اخلاقی جُراُت پائی جاتی ہے۔ اِس سے وہ بہادری مُراد ہے جو انسان کو ایماندار اَور راست گفتار، قرض سے محترز اَور ہوائے نفسانی کا دُشمن ہونے اَور اپنے فرائض کو باحسن الوجوہ انجام دینے کی تحریک دیتی ہے۔

اخلاقی کم ہمتی | اخلاقی جُراُت کے نہ ہونے کی وجہ سے انسان کے چال چلن میں بڑا بھاری نقص واقع ہو جاتا ہے۔ اَور طاقتِ ارادی کچھ ایسی کمزور اَور قریب قریب باطل پڑ جاتی ہے۔ حالانکہ وہ یہ دیکھتا ہے۔ کہ یہ دُرست راستہ ہے۔ اَور دل سے چاہتا بھی ہے۔ کہ میں اسی راہِ مستقیم کا راہرو بنوں اور ٹیڑھے رستے کو بُرا سمجھتا ہے اَور اُس سے پرہیز کرنا چاہتا ہے لیکن پھر بھی وہی ٹیڑھا رستہ بصد ناز و ادا اس کو

اپنی طرف کشاں کشاں لئے آتا ہے۔ اور اِس میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں ہوتی۔ کہ اُس بے جا طریق سے نہایت ہی بہادری کے ساتھ پرے ہٹ جائے۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ چند ایک نظیریں اخلاقی جرأت اور اخلاقی کم ہمتی یا بزدلی کی ہدیہ ناظرین کریں۔

اخلاقی جرأت کی مثال | پہلے پہل اخلاقی جرأت کا ظہور یقیناً راست گفتاری میں ہوتا ہے۔ اگر ہم نے کوئی قصور کیا ہو۔ اور پھر بغیر کسی شرم یا حجاب کے اُس قصور کا نہایت ہی پاک باطنی سے اعتراف کریں۔ تو یہ اخلاقی جرأت کی ایک بڑی مثال ہے۔ دروغ گوئی اور فریب عموماً نتیجے ہیں بزدلی کے۔

اخلاقی کم ہمتی کی مثال | مندرجہ ذیل مثال اخلاقی کم ہمتی کی ایسی مثال ہے۔ جو عموماً ہندوستان کے ہر قبیلے اور ہر فرقے کی طرزِ معاشرت پر عائد ہوسکتی ہے۔ اور اِس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے۔ کہ اگر قبیلوں کے سرپرست اور بزرگ اخلاقی کم ہمتی کے ہاتھ نہ بِک جائیں۔ تو قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُن کی حالت میں ایک عظیم اِصلاح ہو جائے۔ مثال اخلاقی کم ہمتی کی یہ ہے۔ کہ ایک باپ کو اپنی لڑکی کی شادی عنقریب کرنی ہے۔ اور اُس کی ماہواری آمدنی صرف پچاس روپے ہے۔ اور بدقسمتی سے وہ اب تک ایک پائی بھی شادی کے لئے نہیں جمع کرسکا۔ لیکن اُس کی ظاہری حیثیت اس بات کی مقتضی ہے۔ کہ وہ شادی میں پانسو روپیہ صرف کرے۔ تو پھر اُسے کیا کرنا چاہیئے؟ کیا وہ نہایت ہی دلیری سے یہ کہہ دیتا ہے۔ کہ میرے پاس شادی میں اتنا روپیہ لگانے کو نہیں دھرا ہے۔ اور یہ عین حماقت ہے۔ کہ شادی کے لئے قرض دام لے کر رات دن کی فکر کا شکار بنوں؟ نہیں بلکہ ایسے اعلیٰ خیالات والے چند ہی بندے خدا کے ہیں۔ ورنہ ایک بڑی تعداد لوگوں کی ایسے موقع پر اپنی ناک ساک کی خاطر بے دھڑک روپیہ قرض لے لیتی ہے۔ اور انجام پر ذرا

غور نہیں کی جاتی۔ اور ایسے لوگ نہایت ہی بزدل اور جہالت سے اپنی گردن قرض کے جوئے کے نیچے دبا لیتے ہیں۔ ع

برین عقل و دانش بباید گریست

برخلاف اس کے جس شخص میں اخلاقی جرأت ہوتی ہے۔ وہ اپنی بساط سے زیادہ خرچ ہرگز نہیں کرتا۔ اور وہ قرض کے وبال سے خود ہی نہیں بچا رہتا۔ بلکہ وہ اپنے ملکی بھائیوں کے لئے خود ایک زندہ مثال بنتا ہے۔ اور اس طرح اُن کو اخلاقی جرأت کا سبق سکھاتا ہے۔

رفارمر اور اخلاقی جرأت ہر زمانے اور ہر وقت میں رفارمروں کو اخلاقی جرأت کی انتہا درجے کی ضرورت پڑتی رہی ہے۔ بہت دفعہ ایسا اتفاق ہؤا ہے۔ کہ ان کو تمام عمر ملزم قرار دیا گیا ہے۔ بعض کو جیل خانوں کی کڑیاں اور مصیبتیں جھیلنی پڑی ہیں۔ اور بہت سے رفارمروں نے اپنے ایمان اور عقیدے پر اپنی جانیں نثار کر دی ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں۔ جو دُنیا کی بہبودی کی مشین کے پہیئے ہیں۔ اور دنیا کی تاریخ میں ان کے نام نہایت ہی عزت کے ساتھ ابدالآباد تک قائم رہیں گے۔ اور سخت سے سخت مصیبت اور دشوار سے دشوار مُہم میں لوگوں کی دستگیری اور رہبری کریں گے۔

مارٹن لوتھر اخلاقی جرأت کے کرشموں کا اثر ناظرین کے دل پر قرار واقعی طور پر جمنے کے لئے ہم اُن کو مارٹن لوتھر کے زمانے کی یاد دلاتے ہیں۔ یہ پراٹسٹنٹ مذہب کا وہ چوٹی کا رفارمر ہے جس کی عظمت کا سکہ یورپ کے ہر گوشے اور ہر طبقے میں بیٹھ گیا ہے۔ لوتھر ۱۰ نومبر ۱۴۸۳ء میں بمقام ایسلبن (واقع سیکسنی) پیدا ہؤا۔ جب بڑا ہؤا۔ تو باپ کے حکم کے موافق قانون کے مطالعہ کی جانب رجوع کیا۔ لیکن جب اُس کا ایک عزیز دوست بجلی کے گرنے سے اُس کی آنکھوں کے سامنے مرا۔ تو اُس کا دل دُنیا کی تمام دلچسپیوں سے اُچاٹ ہو گیا۔ اور اُس نے بمقام ارفرٹ

ایک خانقاہ میں گوشہ نشینی اختیار کی۔ یہاں رہتے ہوئے لوتھر کو بہت عرصہ نہ ہُوا تھا۔ کہ ایک دن حسنِ اتفاق سے ارفرٹ کے کتب خانے سے ایک پرانی بائیبل لاطینی زبان کی اُس کے ہاتھ لگی۔ اور اس بائیبل کے پڑھنے سے لوتھر کو یہ واضح ہُوا۔ کہ رومن کیتھلک مذہب کے تمام طریقے بالکل لغو ہیں۔ اور پوپ کی حد سے زیادہ عظمت اُس کی نگاہ میں بے جا معلوم ہوئی چنانچہ اب وُہ پوپ کی شان وشوکت اور جبروت کے مٹانے پر تُل گیا۔ پوپ نے کئی مرتبہ اُس کو کبھی نرمی سے اور کبھی غیظ وغضب سے یہ کہا۔ کہ تو اِن حرکات سے باز آ۔ اور پھر یہ دھمکی بھی دی۔ کہ میں تجھ کو زندہ جلا کر خاک سیاہ کر ڈالوں گا۔ آخر لوتھر نے ۱۵۲۱ء میں ورمز کے مذہبی مجمع کے روبرو ایک لیکچر نہایت ہی جوشیلے الفاظ میں دیا۔ اور اس عام جلسے میں اپنے نئے مذہب کے اصول حاضرین کو سمجھائے۔ اور آخر میں کہا۔ کہ جن مذہبی اصول کی میں تلقین کرتا ہوں۔ اُن کا اقتباس میں نے خدا کے پاک کلام یعنی بائیبل سے کیا ہے"۔ اب میں اپنے ایمان سے ہرگز دست بردار نہیں ہو سکتا۔ چاہے پوپ اور دُنیا کے بادشاہ مجھ کو پابزنجیر زمین دوز جیلخانوں میں مقید رکھیں۔ خواہ زندہ گاڑیں اور چاہے وُہ جیتے جی جلا کر میرا نام ونشان تک باقی نہ رکھیں"۔

ذرا ایک لمحے کے لئے خیال کرو۔ کہ لوتھر کے گرد مخالفین کا ایک انبوہِ کثیر جمع ہے۔ جس میں ہر طبقے کے لوگ موجود ہیں شہنشاہ چارلس پنجم بھی وہاں ہے۔ اور جرمنی کے تمام شہزادے اور پوپ کے قاصد اور بڑے بڑے حکامِ وقت کی نگاہیں بھی لوتھر کے چہرے پر پڑ رہی ہیں۔ ایسے ذی اقتدار لوگوں کے سامنے مندرجہ بالا کلمات کا لوتھر کی زبان سے نکلنا اُس کی اخلاقی جرأت کا بڑا بھاری ثبوت ہے۔

سائنس اور اخلاقی جرأت | سمائلز لکھتا ہے۔ کہ دُنیا کی تمام بڑی بڑی مہمیں اخلاقی جرأت نے ہی سر کی ہیں۔ ہر قوم کی تاریخ کے پڑھنے سے واضح ہوتا ہے۔ کہ کوشش کے

میدان میں ترقی کے قدم اُن لوگوں نے ہی بڑھائے ہیں۔ جو دل کے دلیر تھے۔ اَور اخلاقی جُرأت اپنے حصّے میں رکھتے تھے" سقراط نے نیکی اَور حیاتِ جاودانی کی نسبت اپنے شاگردوں اَور عوام النّاس کو اعلیٰ درجے کی تعلیم دی تھی۔ لیکن یہ تعلیم اس زمانے کے لوگوں کے خیالات کے خلاف تھی۔ گورنمنٹ نے اُس کو متنبّہ کیا۔ کہ اس قسم کی تعلیم سے باز آئے۔ سقراط نے انواع و اقسام کی سختیاں جھیلیں۔ لیکن اپنے اُصول کی تلقین سے نہ پھرا۔ آخر حسب الحکم گورنمنٹ اس دلیر شخص نے زہرِ ہلاہل کا پیالہ پی کر اپنی جانِ شیریں کو خیر باد کہا۔ لیکن مرتے دم تک شاگردوں سے اپنے عقیدوں اَور اصولوں کا تذکرہ کرتا رہا۔ گلیلیو نے جو اطالیہ کا ایک بلند پایہ منجم گزرا ہے۔ لوگوں میں عام طور پر یہ مشتہر کیا تھا۔ کہ زمین سورج کے گرد پھرتی ہے۔ اِن الفاظ کے عوض جو مظالم اس کو سہنے پڑے تھے۔ اُن سے وُہ قریب قریب نیم مُردہ ہوگیا تھا۔ غرض اسی طرح نیوٹن کو بھی جرِّ ثقیل کی دریافت پر کافر قرار دے کر مجرم تصوّر کیا گیا۔ حالانکہ نیوٹن صاف دلی اور پاک باطنی کے لحاظ سے تمام دُنیا میں مشہُور ہے۔ لیکن غور کرنے کا مقام ہے۔ کہ اگر یہ سائینس دان حضرات سائینس کی معلومات کو اپنے سینوں میں دفن کئے ہوئے دفن ہوجاتے۔ تو پھر ہمیں اُن نئی معلومات سے محروم رہنا پڑتا۔ اَور سائینس کی ایک بڑی شاخ معرضِ ظلمت میں رہ جاتی۔

ہم اَور اخلاقی جُرأت | اپنے طریق و اطوار اور ڈھنگوں کو درست کرنے کے لئے ہمیں اخلاقی جُرأت کی سخت ضرورت رہتی ہے۔ نفسانی خواہشیں انسان کی جانی دشمن ہیں۔ مرتے دم تک ہم اپنی خواہشوں کی کشمکش اور اُلجھنوں میں گرفتار رہتے ہیں۔ اَور اگر ہم میں اخلاقی جُرأت موجود ہے۔ تو ضرور اِن نفسانی خواہشوں کو نیچا دکھاتے ہیں۔ اَور اِس طرح سے اپنی تمام زندگی کو اخلاقی عیُوب سے مُبرّا کر لیتے ہیں۔

اخلاقی جرأت کے حاصل کرنے کا وسیلہ | اس وقت بار بار جو سوال ہمارے دل میں پیدا ہوتا ہے۔

وُہ یہ ہے کہ "ہم اخلاقی جُرأت کو کیونکر حاصل کر سکتے ہیں"؟ اگر نفس کا شیطان تمہیں دھوکا دے کر اپنے دامِ گلوگیر میں پھنسانا چاہے۔ اور تم اُس دھوکے میں نہ آؤ بلکہ "نہیں" کہہ کر اُس کا دل جلاؤ۔ تو یہ اخلاقی جرأت کا پہلا کرشمہ ہو گا۔ جو تمہاری جانب سے ظہور میں آئے گا۔ اب جتنی مرتبہ تم نفس کشی سے اپنے فرائض کے سرانجام دینے کی طرف متوجہ ہو گے۔ اُسی قدر اخلاقی جُرأت تمہارے دل و دماغ میں طاقت پکڑتی جائے گی۔ لیکن نفس کی شرارتوں کو سہنے سے نتیجہ برعکس پیدا ہو گا۔

ایک مفید نصیحت | ہر کام کے کرتے وقت اور ہر بات کے کہتے وقت اگر ہر شخص مندرجہ ذیل نصیحت کو اپنے خیال میں رکھے۔ تو پھر کوئی وجہ نہیں۔ کہ وُہ اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہو۔

"جواں مرد اور مستقل مزاج بنو۔ اور ہر کام صرف خدا سے ڈر کر کرو۔ جو کام تم کرو۔ اور جو بات تم کہو اُس کے کرتے اور اس کے کہتے وقت اپنے دل سے یہ سوال کرو۔ کیا "جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں یا کہنا چاہتا ہوں درست ہے؟ اگر تمہارا دل جواب میں "ہاں" کہے تو پھر بہرصورت لوگوں کی مخالفت کے باوجود وُہ کام کرو۔ اور وُہ بات کہو۔ ممکن ہے کہ تمہارے بعض رفقا تمہارے مخالف ہو جائیں۔ ممکن ہے کہ لوگ تمہیں حسبِ دستور عزت کی نگاہ سے نہ دیکھیں لیکن تم اِن سب باتوں کی کچھ پرواہ نہ کرو مستقل مزاج رہو۔ اور مرد بنو۔ خُدا تمہاری مدد پر ہے۔ تمہیں اِس بات کا ذرا نہ خیال کرنا چاہیئے۔ کہ لوگوں کا تمہاری نسبت کیا گمان ہے۔ صرف یہ خیال ہمیشہ رکھو۔ کہ تمہارا مدعا ایمانداری پر مبنی ہو۔ اور اپنے ضمیر کے احکام کی پابندی کو اپنا فرض سمجھو۔ جو دل دُنیاوی آلائشوں سے پاک ہے۔ وُہ جُرأت بھی ضرور رکھتا ہو گا۔ کیونکہ پھر اُسے ڈر کس بات کا ہے؟ اخلاقی جُرأت سے ایسا طریقہ اختیار کرو۔ کہ زندگی کا دُشوار گزار سفر آسان ہو جائے۔"

خاتمہ:۔ بقول سمائلز بات ساری یہ ہے۔ کہ جوانمرد اور دلیر لوگ ہی خُدا کے ایسے بندے

ہیں۔ جو انسانی زندگی میں جان ڈال دیتے ہیں۔ اور وہ ہی دُنیا کی حکومت اور رہبری کے قابل ہیں۔ مرنے کے بعد کمزوروں اور ڈرپوکوں کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا۔ بلکہ ایک راست گفتار سچے اور صاحبِ جرأت شخص کی زندگی اس کے مرنے کے بعد بھی ایک ایسا روشن راستہ ہے۔ جو دُنیا کے بھولے بھٹکے مسافروں کی رہبری کرے گا۔ اور اس دلاور شخص کی سوانح عمری ایک ایسا دلچسپ سبق ہے۔ جس کو دُنیا کے سب لوگ شوق سے پڑھیں گے۔ اور اس کے خیالات اور اس کے جوش اور ولولے اور اس کی اخلاقی جرأت اپنے فائدہ بخش اثر سے نسلاً بعد نسلٍ لوگوں کے دلوں کو متاثر کرتی رہے گی ؎

زندہ است نامِ فرخِ نوشیرواں بعدل
گرچہ بسے گذشت کہ نوشیرواں نماند

(ڈپٹی لال نگم)

فلسفۂ جمال

انسان، حیوان، شجر، حجر، یہ نیلگوں آسمان، یہ چمکتے ہوئے ستارے، اور تمام ہمارے گردوپیش کی اشیاء میں سے کون سی ایسی چیز ہے۔ جو حسین اور جمیل نہیں ہے۔ اور وہ کون سی ایسی چیز ہے جس کو ہم خوبصورتی سے نہیں متصف کرتے۔ ہماری طبیعت جو اس حسن حقیقی کا ایک پرتو ہے۔ اور جو ازل سے حسن بینی اور حسن شناسی کا مذاق لے کر اس عالم کی سیر کو آئی ہے۔ جس کی پرورش و پرداخت محض حسن کے ہاتھوں ہوتی ہے۔ اور جس کو خدائے حسن یا فلسفۂ جمال کے موضوع حقیقی نے خود اپنے دستِ خاص سے بنایا ہے۔ ہر شئے کو جمیل و حسین دیکھنا چاہتی ہے۔

جب ہم اس جمیل الذات کے صنایع و بدایع پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو ہم کو ہر جگہ حسن و جمال کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اللہ جمیل و یحب الجمال کے اصول کو پیش نظر رکھ کر ہمارے روحانی مقتداؤں نے معرفت باری کا طریقہ محض عجائبات عالم اور اس کے صنایع بدایع پر نظر رکھنا تعلیم کیا ہے۔ اور ہمارے مادی مقتدا جس قدر عالم کی چھان بین کرتے ہیں۔ اور اس کے اجزاء کی تحقیق کرتے ہیں۔ اسی قدر ان کو حسن و جمال کے زیادہ جلوے نظر آتے ہیں۔

حسن کی پرستش دنیا میں لوگوں نے بہت کی ہے۔ کسی نے اس کو رب النوع قرار دیا ہے۔ اور کسی نے اس کو دیوی دیوتا مانا ہے۔ اور کوئی اس کو "گاڈز" کہتا ہے۔ مگر حیرت جو ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ گو اس لفظِ مشترک کا استعمال دنیا بھر کے

لئے کیا جاتا ہے۔ اور اس کا عمل مختلف الاقسام والماہیت اشیاء پر ہوتا ہے تاہم اس کی تعریفِ حقیقی ایک مدّت تک نہ ہو سکی۔

ابتدا سے لے کر اس وقت تک حکماء و فلاسفر نے اِس مسئلہ پر بہت کچھ غور و فکر کیا۔ مگر اُن کی عقلیں حُسن کی حد سے باہر اور اِس کی تشریح سے قاصر رہیں۔ چنانچہ حُسن کی منطقی جامع و مانع تعریف اس وقت تک کوئی موجود نہیں ہے۔ اور جو موجود ہے۔ وُہ اعتراضات سے خالی نہیں۔ یا تو اس میں تعمیم ہے۔ کہ اس میں حُسن کے علاوہ اَور دوسری چیزیں آکر شریک و شامل ہو جاتی ہیں۔ اور یا اس قدر تخصیص ہے۔ کہ اس کو پہنانے کے لئے خود حُسن کی قطع و برید کرنے کی نوبت آتی ہے اور ایسا ہونا بالکل اُصولِ عقلی کے مطابق اَور موافق ہے۔ کیونکہ اگر حُسن اضافی کی تعریف کرنا منظر ہے۔ (جس سے میری مراد کوئی خاص صفت یا نوع حُسن ہے) تو یہ کسی قدر آسان تھا۔ مثلاً عورت۔ مرد۔ گھوڑے۔ بیئر۔ کبوتر کے حُسن کی تعریف علیٰحدہ علیٰحدہ کرنا آسان ہے۔ مگر جب ہم لفظ حُسن پر ایک مجموعی نظر ڈالتے ہیں۔ اور حُسنِ کُلّی کی تعریف کرنا چاہتے ہیں۔ اور کُلّی حیثیت سے اس مسئلہ پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو ہم اس عظیم الشان سمندر کے آگے کھڑے ہو کر صرف اپنے خطوطِ نظر کی استقامت تو دیکھتے ہیں۔ لیکن اِس کا پتہ نہیں چلتا۔ کہ اس قلم شعاع کے انکسار کے بعد اِس خطِ عمودی سے آگے کیا ہے۔

خصوصاً اِس بات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہ اس معمول کے موضوع جس قدر ہیں۔ سب کی تاثیر نفس پر ایک ہوتی ہے۔ اور اگر اختلاف ہوتا بھی ہے۔ تو محض کم۔ ہماری حیرت اَور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ لیکن ہم اِن سب حیرتوں اَور کسلِ عقلی کو نظر انداز کر کے اپنی عقلِ رسا کے گھوڑے کو تازہ دم کر کے پھر میدانِ غور میں گرم سیر کرتے ہیں۔ تو ہم کو اپنی منزلِ مقصود کی روشنی دُور سے دکھائی دیتی ہے اور ہم کو رفتہ رفتہ آثارِ منزل نظر آنے لگتے ہیں۔ اور ہم اپنی منزل تک پہنچ جانے

ہیں کامیاب نظر آتے ہیں۔ اور اپنی ان تھک محنت کا نتیجہ ہم کو مل جاتا ہے۔
حکماء اور فلسفیوں کا حسن و جمال کے متعلق نہایت سخت اختلاف ہے۔ اور یہ اختلاف آرا کثرت آرا کا باعث ہوگیا ہے۔ لیکن اگر ہم اسراف میں اقتصاد کو کام میں لائیں۔ اور تعدد کو وحدانیت یا اس سے قریب کرنا چاہیں۔ تو یہ مذاہب مختلفہ کے مذہبوں کی تحت میں آجاتی ہیں۔ ان میں سے ایک تو وہ ہے۔ جو جمال کو محض ذاتِ مدرک (دیکھنے والے) تک محدود رکھتا ہے۔ اور ان اشیاء سے جو خارجی ہیں۔ یا قوّتِ ادراکیہ کا معقول ہیں۔ اس خوبی کو سلب کرلیتا ہے۔ دوسرا مذہب وہ ہے۔ جو یہ مانتا ہے۔ کہ نہیں جمال وحسن کا قیام ذاتِ مدرک میں نہیں ہے۔ بلکہ کسی کا حسین وجمیل ہونا خود اسی شئے میں قابلِ اعتبار ہے۔ اور اشیاء خارجی ہی خود حسین ہوتی ہیں۔ اس کو دوسرے الفاظ میں یوں کہو۔ کہ پہلے مذہب والے یہ کہتے ہیں۔ کہ جمال نہ تو ان اشیاء میں ہے۔ جن کو ہم دیکھتے ہیں۔ اور نہ ان باتوں میں جن کو ہم سنتے ہیں۔ بلکہ یہ صفت خود ہماری ذات میں ہے۔ اور ہم جس چیز کی طرف چاہتے ہیں۔ اس کو منسوب کر دیتے ہیں۔ دوسرے مذہب کے پیرو یہ بیان کر دیتے ہیں۔ کہ نہیں جمال ایک خارجی شے ہے۔ انتزاع ذہنی نہیں۔ بلکہ جن چیزوں کو ہم دیکھتے ہیں۔ اور جن باتوں کو ہم سنتے ہیں۔ ان میں جمال خود موجود ہے۔

پہلے مذہب کے ماننے والے تین اسکول ہیں جن میں اس امر پر تو اتفاق ہے۔ کہ حسن مدرک میں ایک شئے ہے۔ بلکہ اس کی ماہیت وحقیقت میں اختلاف ہے۔ پہلا اسکول تو یہ کہتا ہے۔ کہ جمال ایک لذیذ انفصال نفسانی کا نام ہے۔ جس کو ہر شخص اس وقت محسوس کرتا ہے۔ جب کہ اس کے سامنے اس انفصال میں لانے والی کوئی چیز آجاتی ہے۔ اس مذہب کو مثال میں یوں سمجھو۔ کہ ان لوگوں

کے نزدیک جمال کی حالت بالکل رنگ یا مزہ کی سی ہے۔ ذائقہ کی کئی قسمیں ہیں۔ ترش
میٹھا، پھیکا۔ یہ مزے خود چیزوں میں علیحدہ مستقلاً موجود نہیں ہیں۔ بلکہ مثلاً جب
کوئی امرتی کھاتا ہے۔ تو اس سے زبان کے اعصاب متاثر ہوتے ہیں۔ اور یہ
تاثیر دماغ کی طرف رجوع کرتی ہے۔ اسی تاثیر کا نتیجہ ہے کہ مزہ شیریں محسوس
ہوتا ہے۔ اور جب یہ شعور و احساس نفس کو حاصل ہوجاتا ہے۔ تو وہ اس کو
امرتی کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔ پس یہ معلوم ہوا۔ کہ شیرینی اس قوت کا نام
نہیں ہے۔ جو قوت ذائقہ کو متاثر کرتی ہے۔ بلکہ اس احساس کو کہتے ہیں۔ اسی طرح
رنگ کوئی مستقل چیز نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس روشنی کا نتیجہ ہے۔ جو ان اجسام ذی الوان
سے منعکس ہوتی ہے۔ بعینہٖ یہی حال جمال کا بھی ہے۔ جب ہم کسی شئے کو حسین یا
خوبصورت کہتے ہیں۔ تو اس شئے میں خود کوئی جمال نہیں ہوتا۔ بلکہ نفس کو لذت یا
انفصال اس کے دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی کا نام ہے جمال پھر ہم اس جمال کو
اس شئے کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ ابھی ہم لکھ آئے ہیں۔ کہ شیرینی ایک
خاص قسم کے احساس کا نام ہے جس کو ہم شئے خارجی کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔
لہٰذا جمال وہ قوت نہیں ہے۔ جو یہ انفصال پیدا کرتی ہے۔ بلکہ خود اس انفصال
کو جمال کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے جمال کا تعلق مدرک سے ہوگا نہ (شئے خارجی) سے

دوسرا اسکول اسی گروہ کا کہنا ہے۔ کہ جمال نام ہے۔ چند انسانی خیالات کے
مجموعہ کا۔ اس جمال کی تفصیل یہ ہے۔ کہ نفس انسانی بعض چیزوں کے دیکھنے اور
سننے سے خوش ہوتا ہے۔ اور جب وہ ان دیکھی یا سنی ہوئی چیزوں کا اعادہ کرتا
ہے۔ تو یہی پہلا انفصال پھر عود کرتا ہے۔ یا کبھی ایسا ہوتا ہے۔ کہ بعض چیزوں کو پیشتر
دیکھا تھا۔ اور ان سے طبیعت منفصل ہوئی تھی۔ اور اس کے بعد ایسی چیزوں کو دیکھا
کہ ان میں اور پہلی چیزوں میں مخالفت یا مشابہت ہے۔ تو یہ مخالفت یا مشابہت پہلی

کو یاد دلاتی ہے۔ اور وُہ پہلی چیز ایک انفصالِ لذیذ پیدا کرتی ہے۔
مثلاً ایک شخص نے ایک پارک دیکھا جس میں سبزہ لہلہا رہا ہے۔ جا بجا کیاریاں پھولوں سے بھری ہوئی ہیں۔ اور نفیس نفیس چھوٹے چھوٹے پودے ایک مناسب بُعد پر ایک ترتیب سے قائم ہیں۔ اور کہیں کہیں دُور دُور پر سایہ دار درخت جھوم رہے ہیں۔ فوارہ اپنی پُھہار چھوڑ کر نیا منظر پیش کر رہا ہے۔ تو یہ سبزی یا نظارہ مختلف دوسری صورتیں اور دوسرے انفصالات پیدا کرے گا۔ جن سے اور زیادہ مُسرّت انگیز انفصال پیدا ہوں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ دل و دماغ اِن انفصالات جمال سے پُر ہو جائے گا۔ پس جمال اِس فرقہ کے نزدیک مدرک کے اختلاف افکار اور اس کے انفصالات کی ترکیب کا نام ہے۔ جو مدرک میں پایا جاتا ہے نہ شئے خارجی میں۔
اِسی گروہ کا ایک تیسرا اسکول جمال کے متعلق "یہ تھیوری" قائم کرتا ہے۔ کہ جمال نام ہے۔ دل خوش کُن اوصاف کا مثلاً اگر کسی خط کو دیکھو۔ کہ وُہ منحنی کھینچا گیا ہے۔ اور اس کی رفتار بالکل دریا کی موج بنائی گئی ہے۔ تو وُہ خط مجھ کو خوبصورت معلوم ہوگا۔ وُہ خط اس وجہ سے خوبصورت نہیں ہے۔ کہ اس میں جمال وحسن پایا جاتا ہے۔ بلکہ اِس وجہ سے وُہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس میں ہنرمندی اور لطافت پائی جاتی ہے۔ جو اِسی صفات عقلیہ میں سے ہیں۔ جن سے نفسِ انسانی خوش ہوتا ہے۔ اور اسی وجہ سے اِس خط میں جمال وحسن پایا جاتا ہے۔ لہٰذا جمال کوئی خارجی شئے نہیں ہوتی۔ بلکہ خود ذات مدرک میں ہے۔
گو اِن میں سے ہر ایک اسکول کے دلائل نہایت کمزور ہیں۔ اور فرداً فرداً ہر ایک پر تنقید کرنا مشکل امر نہیں ہے۔ لیکن ہم اس مسئلہ پر نظر کرتے ہیں۔ کہ حسن وجمال ذات مدرک میں پایا جاتا ہے۔
اگر یہ مان لیا جائے۔ کہ حسن وجمال کا وجود خارجی نہیں ہے۔ بلکہ جب مدرک

کے وجود کا انحصار ہو جائے۔ تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ حسن کے وجود کا انحصار بھی ہو جائے۔ اگر کوئی دیکھنے والا موجود نہ ہو۔ تو کوئی شئے جمیل نہ ہو۔ مثلاً موتی جب دریا میں سیپی کے اندر ہو۔ تو وہ اِس بنا پر خوبصورت اور قابلِ قدر شئے نہ ہوگا۔ کہ اس کو کوئی دیکھنے والا نہیں ہے۔ یہ ایک نہایت مہمل بات ہے جس کو عقل سلیم جائز نہیں رکھتی۔

اب ہم اس گروہ کے مذاہب کی تحقیق کرتے ہیں۔ کہ حسن شئے خارجی میں پایا جاتا ہے۔ اِس کا انحصار ذات مدرک تک نہیں۔ اس گروہ کے بھی کئی اسکول ہیں۔ ایک تو یہ کہتا ہے کہ جمال نام ہے۔ جدت و غرابت کا جو اس مشہور مقولہ کے موافق ہے۔ کُل جدید لہ لذۃ۔ لیکن یہ مذہب بالکل غلط ہے۔ اور اس پر صاف طور سے یہ اعتراض ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ ضرورت نہیں ہے۔ کہ ہر جدید و غریب شئے حسین و جمیل ہی ہو۔ مثلاً جب کوئی پہلے پہل اونٹ کو دیکھتا ہے۔ باوجودیکہ وہ نئی چیز ہوتی ہے۔ گو اُسے دیکھ کر استعجاب ہوتا ہے۔ تاہم اِس کے بدنما ہونے کا خیال فوراً ہی ذہن میں آجاتا ہے۔ اور اس کی صورت مکروہ نظر آتی ہے۔

ایک دوسرا اسکول یہ مانتا ہے۔ کہ ہر جمیل و حسین شئے مفید و نافع ہوتی ہے۔ لہٰذا جمال نام ہے نفع اور فائدہ کا لیکن یہ مذہب بھی میری رائے میں مخدوش ہے۔ کیونکہ اس کا عکس یہ ہوگا بعض مفید اشیاء جمیل ہوتی ہیں جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ بعض مفید چیزیں ایسی ہیں جو جمیل ہیں۔ نفع اور جمال میں کوئی تلازم نہیں ہے۔ مثلاً گدھے کو دیکھو کہ کس قدر بدصورت ہے۔ مگر پھر اسی کے ساتھ نہایت مفید ہے۔ اِسی کے ساتھ مور کو دیکھو کس قدر خوبصورت ہے۔ مگر گدھے کے مقابلہ میں کچھ بھی مفید نہیں ہے۔

ایک اَور اسکول یہ خیال کرتا ہے۔ کہ جمال نام ہے وحدتِ تعدّد کا اِس وجہ سے

کہ عقل انسانی کا یہ مقتضیٰ ہے۔ کہ اشیاء کے مختلف اجزاء کو مجتمع اور وحدانیت کی صورت میں دیکھنا چاہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف نغمے ایک سُر یا لحن کی صورت میں جب جمع کر دیئے جاتے ہیں۔ تو بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں یعنی یک رنگی چیز نہایت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اور اگر تعدد کو وحدت کی صورت میں نہ جمع کریں۔ تو یہ خوبی و جمال مفقود ہو جائے۔ اگر کسی لحن میں صرف ایک ہی نغمہ ہو تو اس کا بار بار اعادہ ناگوارِ خاطر ہوتا ہے۔ مگر یہ بات بالکل غلط ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض ایک رنگ ہی کی چیزیں عمدہ ہوتی ہیں۔ مثلاً آفتاب کے غروب کے بعد جو آسمان کا رنگ ہوتا ہے۔ وہ نہایت درجہ بھلا معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس میں وحدت تعدد نہیں ہے۔ حالانکہ اس کے حسین اور خوبصورت ہونے سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا ہے۔

ایک اسکول اسی گروہ کا یہ بھی مانتا ہے۔ کہ جمال نام ہے ترتیب اور تناسب کا ترتیب کا مطلب یہ ہے۔ کہ شئے مرکب کے اجزاء اس ترتیب سے ہوں۔ کہ جس مقصود کے لئے وہ لائے گئے ہیں۔ اس کو پورا کرتے ہیں۔ مثلاً آنکھ آگے کے رُخ کے لئے نہایت موزون ہے اگر گردن کی طرف ہوتی تو یہ اپنا مقصد نہ پورا کر سکتی، لہذا ترتیب نہ پائی جاتی جس کا نام جمال ہے۔ تناسب سے یہ مقصود ہے۔ کہ کسی شئے کے بعض اجزاء کو بعض کے ساتھ مناسبت ہو خواہ زمانی اور خواہ مکانی اس طرح پر کہ اِن کے وجود کا جو مقصود ہے وہ پورا ہوتا ہو۔ مثلاً گھوڑے کے پیروں کا تناسب اس کے جسامت اور جُثّہ کے لحاظ سے اگر اسی کے ہاتھ پاؤں کے بجائے کتے کے ہاتھ پاؤں اس کو دیئے جاتے۔ تو وہ اِس بوجھ کو نہ اٹھا سکتے۔ اور تناسب نہ ہوتا جس کا نام جمال ہے۔ یہ مذہب سب مذاہب میں زیادہ مضبوط اور عمدہ ہے۔ گو اس پر بھی یہ اعتراض ہو سکتا ہے۔ کہ بعض قبیح چیزوں میں بھی تناسب پایا جاتا ہے۔ اِس کا جواب یہ ہے۔ کہ وہ قبیح اِس وجہ سے ہے کہ اُن میں پورا پورا تناسب نہیں پایا جاتا ہے۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں۔ کہ ایک ہی قطع کی چیز ایک قوم پسند کرتی ہے۔ اور دوسری قوم اس سے نفرت کرتی ہے۔ اِسکا کیا سبب ہے۔ اگر وہ حسین ہے۔ تو ہر حالت میں حسین ہونا چاہئے۔ اِسکا جواب یہ ہے۔ کہ اِسکا انحصار اختلاف مذاق پر ہے۔ (ضیاء الحسن علوی)

نابینا بیوی

(ایک شریف خاندان کی سچّی داستان)

کہتے ہیں حقیقت بعض اوقات فسانہ کو بھی مات کرتی ہے۔ یہ سچا واقع جو ذیل میں مندرج ہے۔ اِس قول کا مصداق ہے۔ شریف مزاج شوہر نے اپنی مروّت اور رحمدلی سے بیوی کی نابینائی پر پردہ ڈالا۔ خدا نے اُسے اِس کے صبر کا اجر اِس دنیا میں بھی دیا اور آئندہ بھی دے گا۔ (انشاء اللہ) اس خود غرضی اور نفسا نفسی کے زمانہ میں بھی دنیا نیک بندوں سے خالی نہیں۔

میرے گھر کے برابر۔ دیوار بیچ۔ ایک قاضی صاحب کا مکان تھا۔ یہ بیچارے ایک زمانے میں بڑے متموّل آدمی تھے۔ مگر ریاست کی زندگی اور خصوصًا ملازمت انقلاب کی تصویر ہؤا کرتی ہے۔ ذرا راجہ صاحب کے کان بھرے اور بے قصور آفت برپا ہوگئی۔ اسی طرح اِن شریف قاضی صاحب کے تموّل نے افلاس کا پہلو بدلا۔ اور فقط پچاس۔ساٹھ روپیہ ماہوار کی قلیل رقم بہ ہزار دقّت بچ بچا کر رہ گئی۔ اِسی پر بہ صبر شکر کر کے قانع تھے۔ اور اپنا اپنی بیوی اور بیٹی کا پیٹ پالتے تھے۔ عربی اور فارسی کی قابلیت کے لحاظ سے دُور دُور ان کا شہرہ تھا۔ اور باہر سے اکثر ایسے اشخاص مشکل مشکل مسئلے حل کرنے آیا کرتے تھے۔

قاضی صاحب کی صاحبزادی کی شادی کی تقریب جب ہوئی۔ تو نکاح میں مجھے بھی مدعو کیا گیا۔ گو چند در چند ضروریات کی وجہ سے میں شامل نہ ہو سکا۔ مگر ہمسایہ تھا۔ جو واقعات برات کے روز پیش آئے۔ اُن کی خبر برابر مل گئی بمعلوم ہُوا۔ کہ حسب معمول دُولھا صاحب کو پہلے سے اس لڑکی کی نسبت جس سے اب اُن کی قسمت وابستہ ہونے والی تھی کچھ بھی معلوم نہ تھا اور عین نکاح کے وقت نہ معلوم کسی بات کے علم پر۔ اُن نئی روشنی کے شیدا انگریزی تعلیم یافتہ دولھا صاحب نے شادی سے قطعی انکار کر دیا۔ طرفین کی بڑی بدنامی ہوئی۔ اور آخر کار برات یوں ہی واپس گئی۔ اِس کے بعد خود دولھا صاحب سے میری راہ و رسم ہو گئی۔ اور اس شادی سے انکار کرنے کی وجہ اُنہوں نے اس غریب لڑکی کی بدچلنی ظاہر کی۔ یہ بات سُن کر میرے خیالات بھی قاضی صاحب کی طرف سے خراب ہونے لگے۔ اور میں نے اُن سے ملنا جلنا کم کر دیا۔ کبھی کبھار وُہ اگر مجھ سے ملتے۔ تو شکایت کرتے۔ مگر میں ٹالے بالے بنا کر پیچھا چھُڑا لیتا۔ اور راستہ میں بھی اُن سے کترا کر نکل جاتا۔ وُہ دراصل مجھ سے محبّت کرتے تھے۔ اور میرے والد بزرگوار کے بڑے سچّے دوست تھے۔

اِسی طرح تقریباً چھ مہینے گزر گئے۔ اور اب گرمی کا موسم آپہنچا۔ میری والدہ ضعیفہ تو صحن میں ہی سو یا کرتی تھیں۔ مگر میں اکیلا چھت پر لیٹا کرتا۔ ایک دفعہ مجھے خوب یاد ہے۔ جمعہ کا دن تھا۔ چلچلاتی گرمی تھی۔ اور پہر بھر دن رہے سے ہی ہُوا بند ہو گئی تھی۔ دونوں وقت ملتے ہی مارا مار کر کے میں نے کھانا کھایا۔ اور حُقّہ لے کر سیدھا کوٹھے پر جا پڑا۔ چاروں طرف اُجلی اور شفّاف چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ اور تارے اکّا دُکّا نظر آتے تھے۔ ٹھہر ٹھہر کر ایک آدھ جھونکا ہَوا کا آہستہ آہستہ آتا۔ اور پسینے میں نہائے ہوئے بدن کو ٹھنڈا کر جاتا۔ دماغ میں عجیب فرحت ہوتی۔ اور تھوڑی دیر کے لئے میں پنکھا ہاتھ سے رکھ کر حُقّے کا ایک آدھ گھونٹ پی لیتا۔ دو تین گھنٹے یونہی

کروٹیں بدلتے۔ اور ہاتھ پاؤں مارتے کٹے۔ خدا خدا کرکے ۱۱ بجے ہوا ذرا سرسرائی۔ اور کچھ جان میں جان آئی۔ چونکہ پہلے سے ہی آنکھیں بند کرکے زبردستی نیند کو بلا رہا تھا۔ غنودگی آنے لگی۔ سناٹے کی وجہ سے اِدھر اُدھر کی آوازیں بھی رہ رہ کر آجاتی تھیں۔ یکایک مجھے یہ معلوم ہؤا۔ کہ کوئی میرے سرہانے بول رہا ہے۔ اور میں فوراً اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف گھوما۔ مگر آدمی نو آدمی۔ پرچھائیں تک نظر نہ آئی۔ تاہم پھر بھی میں اسی طرف متوجہ رہا۔ کہ ہوا کے جھونکے کے ساتھ ہی ایک دردبھری آواز آئی۔ اور مجھے معلوم ہوگیا۔ کہ وہ آواز قاضی صاحب کی مکان کی چھت پر سے آرہی ہے۔ اب میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اور سُننے اور سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد میرے خیال کے موافق ہوا کے ساتھ آواز آئی "خدا جانے۔ لوگ پاک کیا سمجھیں؟ اور کیونکر ہر جگہ میری بدنامی ہوتی ہو؟ مگر خیر۔ وہی ربّ العالمین خوب جانتا ہے۔ مجھے اور کسی سے غرض ہی کیا؟ مگر پھر بھی دُنیا میں بُرا نام نکل جانا بہت (آواز تھوڑی دیر کے لئے جاتی رہی اور پھر ہوا کے ساتھ آئی) پاک بے نیاز! ربّ العالمین" میرے اوپر رحم کر۔ میری مشکل کو آسان کردے۔ تیرا خوف ہر ہر لحظے بُری حالت کئے دیتا ہے۔ اور یہ شیطان مردود ہر دم کیسے کیسے بھلاوے دیتا ہے۔ غریبوں کی مدد کرنے والے! اب سوائے تیرے اور کس کا سہارا ہے۔ میں تجھ سے"...... (سکوت طاری ہوجاتا ہے۔ اور پھر ہوا کے ساتھ آواز آنی شروع ہوتی ہے)"...... اور یہ بھی ہے کہ پاک پروردگار! میں یہ نہیں چاہتی کہ میری شادی ہوجائے کیونکہ مجھ دُکھیاری۔ اندھی کو کون قبول کرے گا؟ مگر ہاں یہ ضرور ہے کہ میں پاک ہوں اور باعصمت ہوں۔ اور اب سے میں یہ چاہتی ہوں کہ میری بدنامی نہ ہو۔ اور بُرا کہنے والوں اور مجھ پر الزام لگانے والوں کا مُنہ تو بند کردے۔ ارحم الرّاحمین! تو خود دیکھتا ہے۔ کہ میں آج تک کس قدر نیک اور پاک ہوں"!

دہُوا رُک جانے کی وجہ سے تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو جاتی ہے۔ اور پھر یہ الفاظ سُنے جاتے ہیں)" ... بیشک ہے۔ آخر کو میں بھی جوان ہُوں۔ اپنی ہمجولیوں کی باتیں سُنتی ہوں تو ضرور رشک ہوتا ہے۔ مگر پاک بے نیاز! میں اس بات کی شکایت نہیں کرتی۔ کہ تو نے مجھے اندھا کیوں پیدا کیا؟ اور ہر ایک مجھ سے شادی کرتے کیوں کانوں پہ ہاتھ دھرتا ہے۔ میں ہر طرح تیری رضاء پر راضی ہُوں۔ اور ہر حالت میں تیرا ہزار ہزار شکر کرتی ہُوں۔ البتہ صرف ایک بات چاہتی ہوں۔ کہ یا تو تو جوانی کی اُمنگ اور جوش کو ملیا میٹ کر دے۔ کہ میری زندگی آرام سے بسر ہو۔ اور نہیں تو پھر عزّت و آبرو کے ساتھ میرا پردہ ڈہانک لے۔ مجھے اِس جھوٹی اور مکّار دُنیا سے باعصمت اٹھالے"! اِن آخری دَرد بھرے جملوں کے بعد پھر کوئی آواز قطعی نہ آئی۔ اور بڑی دیر تک کچھ زیادہ سُننے کی کوشش کر کے آخر کار میں لیٹ گیا۔ وُہ الفاظ میرے چوٹ کھائے ہوئے دل کے ساتھ نمک کا کام کرتے رہے۔ اور مجھے ساری رات آنکھوں میں کٹی۔

صبح ہوتے ہی میں نے جناب والدہ صاحبہ کی اجازت پر اپنے ایک دوست کے ذریعہ سے پیغام بھیجا۔ اور قاضی صاحب کی غلامی میں اپنے آپ کو دینا چاہا۔ مگر اُن نیچے اور پاکباز قاضی صاحب نے اُس کے جواب میں آبدیدہ ہو کر کہہ دیا۔ "اُن سے یہ کہہ دینا ابھی صاحبزادہ ہو۔ ناتجربہ کار ہو۔ کیوں اپنی زندگی تلخ کرتے ہو۔ وُہ بدنصیب لڑکی اندھی ہے۔ اور میں تمہارے مرحوم بزرگوار کا سچّا نیازمند ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری لڑکی کی وجہ سے تمہیں مصیبت اُٹھانی پڑے۔ اگر تمہیں اِس کی وجہ سے کوئی تکلیف پہنچی۔ تو میں قیامت کے دن تمہارے والد مرحوم کو کیا مُنہ دکھاؤں گا"۔ اِس جواب نے اور میرے درد بھرے دل نے تھوڑی دیر کے لئے مجھے بالکل سکتے میں کر دیا۔ مصیبت اور مایوسی کی زندہ تصویر میرے سامنے تھی۔

اور اُس نے میرے دل پر اِس قدر زیادہ اثر کیا تھا۔ کہ میری آنکھ سے ایک بھی آنسو نہ نکلتا تھا۔ بہ مشکل تمام میں نے قاضی صاحب کو کئی دنوں میں مجبور کر لیا۔ اور اُس مصیبت زدہ نابینا لڑکی کے ساتھ چُپ چُپاتے ہی شادی کر لی۔ اب وُہ کم نصیب لڑکی میرے گھر میں آئی۔ اور میری بیوی بن کر رہنے لگی۔ اُن کے خصائل کی نسبت میں بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ وُہ صبر۔ قناعت۔ سچّائی۔ ہمدردی۔ محبّت اور پاکبازی کی مجسّم تصویر تھی۔ اور اکثر اوقات پچھلی رات کبھی میری آنکھ کھُل جاتی۔ تو میں ایک عجیب موثر نظارہ دیکھتا۔ وُہ پلنگ پر لیٹے لیٹے نہایت عاجزی اور منّت وزاری کے ساتھ دُعا میں مشغول ہوتی اور ہزار ہزار طرح سے پہروں میری ترقی۔ آرام اور آسائش کی دُعائیں پھڑک پھڑک کر دل سے مانگا کرتی حتی الامکان میں بھی اُس کی خوشی کا خیال از حد رکھتا۔ اور کبھی اُس کی طرف سے غافل نہ ہوتا۔ جب تک میری والدہ ضعیفہ زندہ تھیں۔ میری نابینا بیوی کو میرے حاضر و غائب کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچی۔ مگر اُنہوں نے بھی ایک دن اِس دارِ فانی کو الوداع کہا۔ اور اُن کے صدمے نے اور زیادہ میری ہمّت پست کر دی۔ اب گھر میں صرف ایک خادمہ تھی۔ اور ڈیوڑھی پر فقط ایک نوکر۔ والدہ صاحبہ مرحومہ کی آنکھیں بند ہوتے ہی خادمہ نے اُسے تکلیف پہنچانی شروع کی۔ مگر میں سچ عرض کرتا ہوں۔ کہ کبھی بھُول کر بھی اُس نے خادمہ کی شکایت مجھ سے نہیں کی۔ اور مجھے اِس بات کی قطعی اطلاع نہیں ہوئی۔

ایک روز میں اتفاقیہ۔ خلافِ معمُول دوپہر کو گھر میں واپس آیا۔ جب کہ میری بیوی کھانا کھا رہی تھی۔ اور خادمہ دسترخوان کے پاس بیٹھی تھی۔ سالن وغیرہ دیکھ کر میری آنکھوں میں خوُن اُتر آیا۔ اور میں اس ماما کو بُرا بھلا کہنے لگا۔ کیونکہ پورے خرچ پر بھی کھانا بہت خراب تھا۔ اور اُس سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وُہ صرف مجھے اچھا کھلاتی تھی۔ اور میری غریب نابینا بیوی کے سامنے رُوکھی سُوکھی روٹیاں اور بچا کھچا

سالن رکھ دیتی تھی۔ اَور باقی سب اچھا اچھا نذر کر دیتی تھی۔ اُسی دِن سے میں صبح کو جب تک کہ میری قابلِ رحم بیوی ضروریات اور نماز سے فارغ نہ ہو لیتی تھی باہر نہ جاتا۔ اَور دوپہر سے پہلے واپس آ کر کھانا اُسی کے ساتھ کھاتا۔ پھر شام سے ہی گھر میں آ پڑتا اور تمام رات کہیں نہ نکلتا۔ اُس کی سچی محبت اور راستبازی نے اِس قدر میرے دل میں گھر کر لیا تھا۔ کہ اکثر ماما کے نہ ہونے پر مَیں خود کام کرتا۔ اَور اُس کے لئے وضو وغیرہ کے واسطے پانی لانے میں مجھے کچھ عار نہ آتی۔ اِس طرح گھر میں گھسے رہنے کی وجہ سے دوست احباب مجھ پر فقرے کسنے لگے۔ اَور ہر جگہ میرے ہم عمر میرا مضحکہ اُڑانے لگے۔ مگر اِس کا خیال میں نے کچھ بھی نہ کیا۔ اَور میرے معمول میں ذرّہ برابر بھی فرق نہ آیا۔ اُسی اثنا میں اُن نئے تعلیم یافتہ نوجوان کی شادی جنہوں نے میری نابینا بیوی پر بدچلنی کا جھوٹا الزام لگایا تھا۔ بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ اَور وُہ بہت خوشی کے ساتھ ایک متموّل لڑکی کو اپنے گھر لائے بمشکل سے ایک برس گزرا ہوگا۔ کہ شکر رنجی ہوئی۔ اور بڑھتے بڑھتے خانہ جنگیوں کی نوبت آئی۔ اگرچہ میں تو اب بھی ایک معزز آدمی کی بیٹی کی طرف ایسی باتیں منسوب کرنا لغو سمجھتا ہوں: تاہم تمام شہر میں یہی افواہ پھیلی ہوئی تھی۔ کہ اُن کی بیوی آوارہ اَور بدچلن ہے۔ اُنہوں نے اُسے نکال دیا۔ اُس نے اپنے میکے پہنچتے ہی نان و نفقہ اَور مہر کی نالش ٹھونک دی۔ اَور تعلیم یافتہ نوجوان کو چھٹی کا کھایا ہُوا یاد آ گیا۔ غرض خوب عرضی پرزہ ہوتا رہا۔ اَور اُن پر اُن کی بیوی کی ڈگری ہو گئی۔ اب انہوں نے خاندان کے بزرگوں کے سامنے منت سماجت کی اَور بہ مشکل تمام وُہ معاملہ رفع دفع ہُوا۔ اَور اِن کی بیوی پھر اِن کے گھر میں آ گئیں۔ مگر تھوڑے عرصے کے بعد وہی ٹھکا فضیحتی شروع ہو گئی۔ بہر حال اب اُس ڈگری کا خوف اُن کا غصّہ دباتا تھا۔ اَور یہ ہمیشہ اپنی بیوی سے جوتیاں کھاتے رہتے تھے۔ اِس دارِ ناپائیدار کے قانون کے موافق مجھ بدنصیب پر ایک اَور مصیبت

نازل ہوئی۔ اور میری نابینا بیوی کو بخار آنے لگا۔ میں نے ڈاکٹر، حکیم۔ مُلّا، سیانے۔ دوا۔ ٹھنڈائی۔ گنڈا تعویذ غرض کچھ نہ چھوڑا۔ مگر بخار میں کمی نہ ہونی تھی نہ ہوئی۔ وہ دن بھر اس مرض کی شدّت میں بلبلاتی رہتی۔ اور اُس کے حواس پریشاں رہتے۔ میں نے بالکل ہر جگہ کا آنا جانا چھوڑ دیا۔ اور ہر وقت گھر میں ہی رہنے لگا۔ وہ برابر چھ مہینے تک بیمار رہی۔ اور اِس عرصے میں ہر قسم کی خدمت میں نے ہی کی۔ یہاں تک کہ جو کی پر لے جانا۔ دوا ٹھنڈائی پلانی وغیرہ، میرا روزانہ معمول تھا۔ چونکہ اُسے آخر دنوں میں ڈاک بھی لگ گئی تھی۔ اِس لئے اُگالدان یا سیلپچی لاکر بھی اُس کے سامنے میں ہی رکھا کرتا تھا۔ اور اکثر قے کی جلدی اور گھبراہٹ میں ایسا بھی ہوا ہے۔ کہ میرے اُگالدان اُٹھانے اُٹھاتے اُبکائی آئی اور جوں ہی میں نے اُگالدان سامنے کیا۔ کہ اُس نے ڈالنا شروع کیا جس سے میرے ہاتھ بھی بھر گئے۔ اگرچہ میں تمام شہر میں اب تک نہایت نازک مزاج مشہور ہوں۔ مگر بخدا کبھی مجھے ہاتھ یا آستین بھرنے سے ایسی کراہت نہیں آئی۔ کہ اُس کی محبت پر غالب آکر مجھے اُس خدمت سے باز رکھتی۔ خدا خدا کرکے یہ زبین دیکھنے گئی۔ تو غشی نے آدبایا۔ جب دیکھو آنکھ بند۔ ایک دن اُس نے متواتر ۱۲ گھنٹے آنکھ نہ کھولی۔ اور مجھے ازحد تشویش ہوئی۔ رات کو تقریباً ۹ بجے جب کہ اُس کا سر میرے زانو پر تھا۔ اُسے ہوش آیا۔ اور چھوٹتے ہی اُس نے مجھ سے کہا "تم اِس قدر کیوں تکلیف اُٹھاتے ہو۔ کیوں مجھے شرمندہ کئے جاتے ہو۔ اوّل تو ماما موجود ہے۔ تمہاری ہر وقت گھر میں رہنے کی بھی ضرورت نہیں۔ اور اگر خیر تم نہیں مانتے تو خود ہر ایک کام کرنا بھی ٹھیک نہیں۔ میں تمہارے اِن احسانات سے کیونکر سبک دوش ہوسکتی ہوں۔ ایک غریب ماں باپ کی لڑکی۔ کم مایہ۔ اندھی بیکار لاچار خود دوسروں کی محتاج۔ خدا کے لئے مجھے اِس قدر محجوب نہ کرو۔ کہیں اِس شرمندگی سے مرجاؤں۔ اِس پر بھی تمہیں ماما کا اعتبار نہ ہو۔ تو اچھا یہ ہی کرو۔ کہ

اپنی شادی کسی سے کر لو۔ وہ تمام گھر بار کا انتظام خود کرلے گی۔ اور تمہیں اس قدر زیادہ دردسری نہیں کرنی پڑے گی۔ یہ نہ سمجھنا کہ مجھے سوکن کا کچھ خیال ہوگا کبھی نہیں ہرگز نہیں۔ بخدا میں تو صرف ایک اسی احسان کا کہ تم نے میرا سرتاج بننا پسند کیا۔ تمام عمر کسی طرح بدلہ نہیں دے سکتی۔ اور یہ بھی سُن لو۔ کہ سوکناپے کے پاجیانہ خیالات اس وقت آتے ہیں جب کہ ایک دوسری کی کسی بات پر قبضہ کرنا چاہے مجھے روپیہ پیسہ۔ حکومت برابری۔ مرتبہ وغیرہ کا قطعی خیال نہیں ہے اور نہ ہوگا۔ پھر ایسی حالت میں میں ایک کونے میں پڑی رہوں گی۔ اور وہیں دو روٹیاں کھا کر تمہاری بہبودی اور ترقی کی دعا میں بقیہ عمر گزار دوں گی۔ اس طرح رہنے سے اُسے بھی مجھ سے کسی قسم کی پرخاش نہیں ہوسکتی۔ جب میں اُسے اور تمہیں ہنستے بولتے سُنوں گی۔ تو بخدا میری طبیعت بے انتہا خوش ہوگی۔ کیونکہ واقعی میرے ساتھ شادی کر کے تم نے اپنے اوپر ایک بڑا ظلم کیا ہے۔ میں سمجھوں گی کہ خدا نے میرے اوپر مہربانیوں اور احسانات کا معاوضہ میرے سامنے دیا۔ سچ کہتی ہوں۔ کہ جہاں تک ہوسکے گا۔ میں اُس کی طبیعت پر میل تک نہ آنے دوں گی۔" کچھ نہ پوچھئے۔ کہ ان الفاظ نے میرے ساتھ کیا کیا؟ میرے خون میں چکر آیا۔ آنکھوں اور کانوں سے دُھواں نکلنے لگا۔ اور میں نے دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام لیا۔ حالت روز بروز خراب ہوتی گئی۔ اور چونکہ قاضی صاحب بھی اس عرصہ میں دُنیائے فانی سے رخصت ہوچکے تھے۔ اُس نے ایک دن اپنی والدہ کو بُلایا۔ اور اُن کے اور میرے سامنے نہایت دردبھرے الفاظ کے ساتھ مہر مُعاف کر دیا۔ اُدھر میں روتے روتے بیہوش ہوگیا۔ اُسی دن سے اُسے ہچکی لگ گئی۔ اور پانچ روز تک ہچکیوں میں مبتلا رہی۔ پانچویں دن صبح کو اُس نے نہایت رُک رُک کر نہ معلوم مجھ سے کیا کیا کہا۔ مگر آواز کی کمی اور ہچکیوں کے تار نے قطعی نہ سُننے دیا۔

اور کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ البتہ بڑی کوشش کے بعد صرف یہ جملہ سمجھ میں آیا "اگر تمہیں تکلیف ہوئی تو میری روح کو صدمہ ہوگا"۔ اُس دن ۸ گھنٹے برابر میری آنکھوں سے قسم کھانے کو بھی آنسو نہ تھما۔ شام ہوتے ہی وہ نیک اور راست باز نابینا مجھ کم نصیب کو آخری دم تک دعائیں دیتی رہی ملک بقا ہوئی۔ اور میں دُنیا کی تکلیفیں اُٹھانے کے لئے اکیلا رہ گیا۔ میں نے گھر سے نکلنا قطعی چھوڑ دیا۔ اور ہر وقت تنہائی میں اُس کی یاد میں آٹھ آٹھ آنسو رویا کرتا۔

راقم (ا۔ح)

اِس صبر کا اجر یہ ملا۔ کہ ا۔ح کی شادی اس واقعہ کے ایک سال بعد ریاست کے ایک معزز عہدہ دار کی لڑکی سے ہوگئی۔ اور وہ زیادہ تر ا۔ح کی کہانی ہی سُن کر متاثر ہوئے۔ اب اُنہوں نے اڑھائی سو روپیہ ماہوار کی آمدنی کی جائداد ا۔ح کے نام کر دی ہے۔ اور لڑکی جس سے اب شادی ہوئی ہے۔ پڑھی لکھی۔ باہنر اور حسن و وفا کی پتلی ہے۔ یہ اجر دُنیا میں ملا۔ اور آخرت کا حساب کون لگا سکتا ہے۔

سلطان حیدر۔ جوش۔ (دہلوی)

حضرتِ کُن

بعض لوگ خیال کرتے ہیں۔ کہ حضرتِ کُن پیدا ہوتے ہی رحلت فرما گئے۔ اور اب دُنیا میں اِن کا نام ہی نام باقی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ تمام موجودات کا وجود انہی جناب کے سہارے پایا جاتا ہے۔ یہ مر جاتے۔ جہاں سے گزر جاتے۔ تو یکون کی صورت نظر نہ آتی۔

لوگوں کو اُن کی موت کا شبہ اِس وجہ سے ہوُا ہے۔ کہ جو کرشمہ اُنہوں نے اپنی پیدائش کے وقت دکھایا تھا۔ وُہ دوبارہ نہ دیکھا گیا۔ اِن کی پیدائش سے پہلے نہ آسمان تھا نہ زمین۔ اور نہ یہ تمام غلطاں پیچاں چیزیں جو آسمان زمین پر چھائی ہوئی ہیں۔ اور یہ میاں آدم بھی جو آج حضرتِ کُن کی زندگی پر بحث کر رہے ہیں ظہورِ کُن سے اوّل غائب تھے۔ مختصر بات یہ ہے۔ کہ نا پیدا اور عدم کا لفظ بھی گُم تھا۔

حضرتِ کُن کے میلاد شریف کی کیفیت یوں بیان کی جاتی ہے۔ کہ جب خزانہ مخفی میں خود نمائی و خود آرائی کا جذبہ اُٹھا۔ اور اِس جذبہ نے سکوت معدوم کے دریا میں ایک لہر اور جنبش پیدا کی۔ خواہش نمود کا بادل گرجا۔ اور برسوں کی قید شدہ بجلی نے بادل سے باہر آکر چمکنا چاہا۔ تو سب سے پہلے حضرتِ کُن کو ولادت[1]

---

[1] یہاں ولادت نہیں۔ جو ماں باپ کے تعلق سے ہوتی ہے۔ اس قسم کی ہر ولادت سے قرآن شریف کی سورۃ اخلاص میں انکار کیا گیا ہے۔ ہم اِس منکر کو سچا جانتے۔ اور ڈر کے مارے ولادت کی تشریح کر دیتے ہیں۔ حسن نظامی۔

کا شرف عطا کیا گیا۔ جب یہ حضرت آغوش دہن سے باہر تشریف لائے۔ تو عجیب شان سے آئے۔

ہو حق نشاٹے ہیں زور سے تجلّی ہوئی۔ اور ایک سایہ نمودار ہوا۔ یہ سایہ تیزی سے گردش کرتا تھا۔ اور موجودہ عالم کی رنگا رنگ شکلیں اس میں یکے بعد دیگرے ظاہر ہوتی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ اس سایہ کی گردش آہستہ آہستہ تھمی۔ اور وجود عالم جم کر قائم ہو گیا۔

اس کے بعد نہ پھر کبھی ایسی تجلّی ہوئی نہ کوئی اس قسم کا دوسرا عالم ظاہر ہوا۔ اس واسطے بعض آدمی کہتے ہیں۔ کہ حضرتِ کُن چل ہی بسے ورنہ کبھی تو کوئی اور جلوہ دکھاتے۔

لیکن آدم زاد غلطی کرتے ہیں۔ جو مولانا کُن کو مُردہ تصوّر کرتے ہیں۔ وُہ زندہ ہیں۔ اور ہر روز تجلیاں نازل کرتے ہیں۔ یہ پُرانا کارخانہ شب و روز نئے رنگ بدلتا ہے۔ جناب کن نہ ہوتے۔ تو یہ نت نئی رنگینیاں کہاں سے آتیں۔ ہمارا تو اس پر ایمان ہے۔ کہ حضرتِ کُن زندہ ہیں۔ زندہ رہیں گے۔ اور مرنا ان کے لئے محال ہے۔ کلام ہے تو اس میں ہے۔ کہ آیا ان کی ولادت کی ضرورت بھی تھی یا نہیں۔ اور جب وُہ پیدا ہو ہی گئے۔ تو ان کا وجود کچھ کام بھی آیا یا یوں ہی افشائے راز کا دھبّہ ثابت ہوا۔

اس معاملہ میں دو خیال ہیں جحضرتِ کُن کے حمائتی جو آرائش [illegible] بہار کے شیدا ہیں۔ کہتے ہیں کُن نے بڑا احسان کیا۔ جو ہم کو راز کے بند صندوق سے باہر نکالا۔ اور عجیب و غریب تماشے دکھائے۔ مگر گروہ مست فلند جناب کُن کا بہت شکوہ گزار ہے۔ وُہ خیال کرتا ہے۔ کہ نہ یہ حضرت تشریف لاتے نہ ہمارے سکون وحدت میں طوفان آتا خشک و تر۔ خیر و شر۔ جاندار و بے جان سینہ سے

سینہ لگائے آرام سے سوتے رہتے۔
اب پہاڑ جنگل بیابان میں اکیلے کھڑے ہیں۔ اور شہروں کی رد لق اور چہل پہل کو ترستے ہیں۔ شہر رات دن کے غل و شور سے اکتا کر پہاڑوں اور صحراؤں کی تنہائی و خاموشی پر حسرت کے آنسو بہاتے ہیں۔ دریا شاکی ہیں کہ ہم بہتے بہتے تھک گئے۔ یہ کنارہ آرام سے بیٹھا ہے۔ یہ کیوں نہیں بہتا۔ کنارہ کہتا ہے۔ میں خود اپنی اُفتادگی سے نالاں ہوں۔ نقل مکان کر نہیں سکتا۔ ورنہ تمہاری طرح سیر کرتا پھرتا۔
سب سے زیادہ انسان اپنی تکلیفیں بیان کرتا ہے۔ بچپن اور جوانی۔ بیماری اور بڑھاپا۔ غریبی و امیری۔ نیکی و بدی۔ سب اِس کی جان کے لئے وبال بنے ہوئے ہیں۔ ہم بھی جہاں تک غور کرتے ہیں۔ انسان کی شکائتیں واجبی معلوم ہوتی ہیں۔ پر جہاں اس کو کُن کے سبب آزار دہ پراگندگی نصیب ہوئی ہے طرح طرح کی خوشیاں بھی ملی ہیں۔ جو درجوں اور حالتوں میں تقسیم ہو کر ایسی پُر لُطف بن جاتی ہیں۔ کہ عالم ایک جائی میں اِن کا حاصل ہونا کسی طرح ممکن نہ تھا۔

(حسن نظامی)
(از خانقاہ مبارک حضرت محبوب الٰہی)
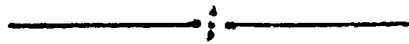
مغربی تہذیب

قوانینِ قدرت کا طرزِ عمل بھی عجیب واقع ہُوا ہے۔ اور زمانہ کی نیرنگیاں اور موجوداتِ عالم کے اختلافات بھی آئے دِن عجیب کرشمہ دکھایا کرتے ہیں۔ کبھی ایک قوم کا دورہ ہے۔ جس کو تھوڑے ہی عرصہ کے قیام کے بعد کسی نئی آنے والی قوم کے لئے جگہ خالی کرنا پڑتی ہے۔ گو زمانہ قیام کے بعد میں زیادتی یا کمی ہوجایا کرتی ہے۔ لیکن انجام سب کا ایک ہی ہوتا ہے۔ اس کی برقی قوّت ایسی طاقتور ہوتی ہے۔ کہ باوجود کثیر برائیوں اور متعدد قباحتوں کے اُس کی نرالی ادائیں اور انوکھی بندشیں اپنی طرف کھینچ ہی لیتی ہیں۔ گو اس میں سمیّت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ لیکن اہلِ دُنیا کچھ ایسے مہا لوٹ ہوجاتے ہیں۔ کہ کچھ سوجھ نہیں پڑتا۔ اور اندھوں کی طرح تقلید پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ ابتداءِ دُنیا سے سینکڑوں قوموں نے اپنا تمدّن قائم کیا۔ جس میں سے چینی۔ ہندی۔ مغربی۔ بابلی۔ کلدانی۔ رومن وغیرہ کے تمدّن کی شہادت تاریخ میں موجود ہے۔ جو وقتاً فوقتاً دنیا کے اسٹیج پر نمودار ہوئیں۔ اور جب تک زمانہ نے مُہلت دی۔ اپنے اپنے پارٹ ادا کر کے راہی ملک عدم ہوگئیں۔ یا افلاس و نکبت کے شکار ہوگئیں۔ اور ہمیشہ کے واسطے اپنی سطوت و حشمت وغیرہ کو خیرباد کہہ کر طوقِ غلامی گردنوں میں پہن لیا یا [illegible] محکومیت کی بیڑیاں پاؤں میں ڈال دی گئیں۔ اس سلسلہ میں آخری کڑی عربوں کی تھی۔ جس میں موجودہ مغربی تمدّن کی کُنڈی جوڑی گئی ہے۔ عربی تمدّن کا دور بھی حسبِ معمول کچھ عرصہ کے قیام کے بعد کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ کا مصداق بنا۔ یہ زمانہ یورپ کی جاہلیت

کا زمانہ تھا۔ نیم وحشیانہ حصوں میں عیسائیت کی برائے نام پیروی ہوتی تھی۔ لیکن نہایت بھونڈے طریقہ سے اور رومن کیتھلک پادریوں کی زبادتیوں کی وجہ سے بت پرستی تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ بلکہ دھڑلے سے کلیساؤں اور گرجاؤں میں تصویر پرستی ہورہی تھی۔ شمالی اقوام تو نری وحشی ہی تھیں جن کو ٹیوٹانک اقوام سے منسوب کرتے تھے۔ اوڈن وتہار کی ہر قبیلہ میں پرستش ہوتی تھی۔ طریقہ مدنیت بھی غیر مذہب اقوام سے ملتا جلتا تھا۔ اسلامی تمدن کو جب وسعت حاصل ہوئی اور عرب لوگ سمندر پار کرکے جبرالٹر کے اس کنارہ ہو گئے۔ اور مشرق کی طرح سے روم وغیرہ میں اسلامی تمدن کی اشاعت ہوئی۔ تو ان تاریک گھروں میں بھی روشنی نے جھانکنا شروع کیا۔ اور گال (فرانس) اٹلی (روما) و جرمنی کے علماء نے جوق درجوق علم کی تلاش میں قرطبہ وغرناطہ دمشق و دیگر شامی یونیورسٹیوں میں آنا شروع کیا۔ یہاں ان کو ایک نرالا عالم نظر آیا۔ موربیبی متمدن قوم کو دیکھ کر ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ اپنی قوم کی جہالت و ذلالت پر کفِ افسوس ملنے لگے۔ اور اپنے زخم خوردہ دلوں کا علاج صرف اپنی قوم کی اصلاح ہی کو سمجھنے لگے۔ اپنی قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے اور اُن کو زمانہ کا ساتھ دینے کے لئے سمجھانے میں وُہ مطعون بھی ہوئے سنگسار بھی کئے گئے۔ اور زندہ جلائے بھی گئے۔ لیکن حُبِّ وطنی اور قومی ہمدردی کا تخم اِن کے دلوں میں جڑ پکڑ چکا تھا۔ اور وُہ بغیر بار آور ہوئے رُکتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔

علم کے شوق نے علماء نصاریٰ کو اپنے پُرانے لٹریچر یونانی ولاطینی کے احیاء کا خیال دلایا۔ اور سینکڑوں طالب علم اس میں مصروف ہو گئے۔ اور دوسرے دَور میں تمام لٹریچر کو اپنی اپنی ملکی زبانوں میں ترجمہ کرڈالا۔

اِدھر کروسیڈس (صلیبی لڑائیوں) نے اُن کی اپنی فوجی کمزوریوں پر متنبہ کردیا۔ ان لڑائیوں نے واقعی عجیب اُلٹا اثر دکھایا۔ یعنی فاتح غسارہ میں رہے اور مفتوح فاتح

بن گئے۔ عرب تو اپنی فتح کے زعم میں ایسے مدہوش ہوئے کہ بالکل ملیامیٹ ہو گئے۔
اور جو کچھ آتا تھا وہ بھی کھو بیٹھے۔ وہ بھی بھولے جو کچھ کہ پہلے یاد تھا۔ اس کے برخلاف یورپین
لوگوں نے جو سبق اپنی شکستوں سے حاصل کیا۔ اُس کو ایسا ذہن نشین کر لیا۔ کہ بچہ بچہ
دنیاوی ترقی کی فکر میں مصروف ہو گیا۔ اپنی شخصیت کے قائم کرنے اور اپنی شکستوں
کا عوض لینے کا خیال موسمی ہوا کی طرح جگہ جگہ پھیل گیا۔ لوتھر و ناکس جیسے رفارمروں کی
دھواں دھار اسپیچوں کی آوازیں سوئٹزرلینڈ کے پہاڑی سلسلوں سے ٹکرا ٹکرا کر آواز
بازگشت کی طرح تمام صحرا میں گونج اٹھیں۔ اور عیسائی دنیا میں ایک ہلچل پڑ گئی۔ اوہام پرستی
اور جھوٹی عبادت کی زنجیروں کے توڑنے میں جن سے تمام یورپ جکڑا ہوا تھا۔ اُن کو
معجز نما کامیابی ہوئی سینکڑوں اہل قلم اِن کے ہم خیال پیدا ہو گئے۔ اور دُنیا کو دارالمحن
و محل صعوبت تصوّر کرنے کی بجائے اُس کو دارالراحت و جائے قیام پذیر خیال کرنے
لگے۔ سچی مذہبی آزادی نے ان کو سائنٹفک تحقیقاتوں اور تاریخی چھان بین و تمدّن کی
دریافتوں میں مصروف کیا۔ یہ زمانہ اصطلاحی معنوں میں "رینے ساں" سے تعبیر ہوتا ہے۔
سب سے اوّل ترقی کا دَور انگلینڈ میں شروع ہوا۔ گو علمی حیثیت سے کہنا چاہیئے
کہ عنوان اٹلی ہی سے ہوا۔ اور پولیٹیکل دَور اسپین و پرتگال میں سب سے قبل شروع ہوا۔
جنہوں نے یورپ کو آزادی کا سبق دیا۔ لیکن ان کی آزادی نری پولیٹیکل تھی۔ اور اپنے
مُلک کو غیر قوم سے آزاد کرنا صرف مقصود تھا۔ اِس سے یہ لوگ آگے نہ بڑھ سکے۔
حُرّیت کا حقیقی سبق اگر سچ پوچھو۔ تو انگلینڈ ہی میں دیا گیا۔ ذاتی نفاق شخصی کج بحثیوں
اور خاندانی مناقشات و مذہبی دلی اختلافات کو مُلکی بہبودی و قومی فلاح پر نثار کرنے
اور شخصی سلطنت کو بیخ سے اُکھاڑ ڈالنے کا سہرا اوّل اوّل انگلینڈ کے سر بندھا۔ اسی
مُلک میں رعایا کے حقوق کی مساوات۔ انسانی فرائض۔ گورنمنٹ کے حقیقی معانی اہل
مُلک کی ذمہ داری آزادی رائے و یگانگت کے راز کو افشا کیا گیا۔ نیوٹن کی تحقیقاتوں

بیکن کے فلسفہ اور شیکسپیئر کے ڈراموں نے ایک عجیب معجز نما اثر کیا۔ ملک کے ہر بچہ کی رگ و پٹھے میں آزادی کا خون موجزن ہونے لگا۔ اور جزیرہ کے کل باشندے شخصی حکومت کے قطعی دشمن ہو گئے۔ کرامول نے بالآخر شخصی سلطنت کی زیادتیوں سے تمام اہل جزیرہ کو نجات دلائی۔ اور پارلے منٹ کے ہاتھ میں قوم کی باگ دیدی گئی۔ لیکن یہ زمانہ جنگ و جدل کا زمانہ تھا۔ بحری سفر کے شوق نے بہت سی انجانی زمینیں اور نامعلوم جزیروں اور برّاعظموں کو پوشیدگی سے نکال کر جانی ہوئی دُنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ اور آئے دن کوئی نہ کوئی نئی زمین دریافت ہی ہوتی رہتی تھی جس کے قبضہ کرنے پر خوب کشت و خون ہوتا تھا۔ ماسوا اس کے یورپ میں بھی مثل ایشیاء کے شخصی شاہنشاہت کئی جگہ قائم تھی۔ جس کے ماتحت مختلف بادشاہ و حکمران اور چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں ہوتی تھیں۔ زمانہ وسطی بلکہ دو صدی قبل تک آپس ہی میں یہ تاجدار اڑا کرتے تھے۔ یا عناد و کینہ و حسد کی وجہ سے دُور دراز ممالک و مقبوضات میں لڑا جھگڑا کرتے تھے۔ اور ایک دوسرے کی اُکھاڑ پچھاڑ میں لگے رہتے تھے۔ آپس میں مل کر کام کرنے اور غیر یورپی اقوام کے مقابل متفق ہو کر سینہ سپر ہونے کا نایاب نسخہ ابھی اُن کے ہاتھ نہیں لگا تھا جس کی اہمیت نپولین نے اٹھارہویں صدی کے آخر میں یورپ کو سکھائی۔

'بھلی چیز ہر کسی کو اچھی معلوم ہوتی ہے'، انگلینڈ کی دیکھا دیکھی اس کے جنوبی دوسرے ہاتھ والے پڑوسی نے بھی پلٹا کھایا۔ اور وہاں بھی انگلش لٹریچر نے لوگوں کے دلوں میں آزادی کی اُمنگیں پیدا کر دیں۔ اور والٹیر و روسو جیسے اہل قلم پیدا ہو گئے جنہوں نے اپنی تصنیفات سے تمام ملک میں ایک شور برپا کر دیا۔ اور تمام کلب گھروں میں 'آزادی' آزادی کی صدائیں گونج اُٹھیں۔ یہ لوگ اپنے اُستادوں سے بھی بڑھ گئے۔ اور 'تخت' ہی کی ضرورت کو فضول و عبث خیال کرنے لگے۔ ایسے زمانہ میں اُن اشخاص

کو جو زمانہ کا رنگ دیکھ کر جد وجہد میں لڑکر نام کرجاتے ہیں۔ اچھا موقع اپنے نام چمکانے کا مل جاتا ہے۔ چنانچہ کارسیکا میں بھی ایک ایسا شخص پیدا ہو گیا جس نے موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اور اپنی خدا داد قوتوں کا استعمال شروع کیا۔ اس نے اپنے ملکی بھائیوں کو جو آپس میں پھٹے ہوئے تھے۔ اکٹھا کر کے غیر ممالک کے مقابل صف آرا کیا۔ اور اس تلاطم کو جو فرانس میں برپا تھا فرو کر کے دیگر یورپی ممالک کی طرف جنگی دریا کے بہاؤ کا رُخ پھیر دیا۔ جو اثر ان نپولینک لڑائیوں کا یورپ پر پڑا۔ وہ تاریخ د[illegible] کے متعلق ہے۔ البتہ اتنا بتلا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ یورپ کو مل جل کر کا[illegible] کرنے، اور ایک عام دشمن کے مقابل اکٹھا ہو کر لڑنے کے فوائد کما حقہ معلوم [illegible]

یُوں تو دو صدی قبل ہی سے لوگوں کے دلوں میں دُنیاوی جدّوجہد [illegible] ہو گئی تھی۔ لیکن عملی فوائد اس کے ان ہی لڑائیوں سے یورپ کو حاصل [illegible] زمانہ سے فائدہ اُٹھانے، ناسازگاری روزگار کا مقابلہ کرنے، ظا[illegible] بیرونی مشکلات پر غلبہ پانے اور قسمت کے پُرہیبت طلسم کے توڑنے [illegible] جب ہی ہاتھ لگی۔

آخری حصّہ اٹھارویں صدی کا علمی تحقیقاتوں اور سائنٹیفک آزمائشوں [illegible] انکشافات کے لحاظ سے بہت ہی کامیاب رہا۔ اور یورپی فلسفی کے ا[illegible] سے مبدّل ہوتے رہے۔

اُنیسویں صدی کا آغاز اسی پولیٹکل جدّوجہد سے ہُوا [illegible] میدان میں ہمیشہ کے واسطے ہو گیا۔ نپولین کے مقبّ[illegible] و آمان کا دَور شروع ہُوا۔ لوگوں کو اس بلائے سرجا[illegible] اور فساد کا خاتمہ ہو گیا۔ لوگوں کو چین سے بیٹھ کر کا[illegible] کا موقعہ ملا۔ امن کے قائم ہوتے ہی علم کا چرچہ جو اب [illegible]

محدود تھا۔ ملکوں ملکوں اور شہروں شہروں میں نئے نئے تعلیم سائنٹفک طریقہ پر دی جانے لگی۔ سائنس کی تحقیقاتوں اور کیمیاوی دستوروں اور مکینکل آزمائشوں کو جلا دینے اور عملی لباس نئے تراش و خراش کے [illegible] پہنانے کا خوب ہی موقعہ ہاتھ آیا۔ رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس کو بھی ترقی ہوتی گئی جو اب تک معلوم نہیں ہوئی۔ اس میں کلام نہیں کہ علم کی عمومیت نے ایک عظیم تغیر دنیا میں پیدا کر دیا ہے۔ سائنٹفک اور کیمیاوی تحقیقاتوں نے اور ایجادوں نے سفر کی راحتیں۔ نامہ و پیام کی آسانیاں۔ تجارتی کاروبار کی سہولتیں بہت کچھ بڑھا دی ہیں۔ ڈاکٹری و طب کی تحقیقاتوں نے بہبودی خلایق و آسائش عامہ میں بہت کچھ حصہ لیا۔ حریت کے سبق نے انسان کو اپنی حقیقت پہچاننے اپنے مساوی حقوق قائم کرنے میں بہت کچھ مدد دی عصبیت کو اپنے اصلی معنوں میں لوگوں نے سمجھا۔ بہت سی برائیاں جو شخصی سلطنتوں میں پائی جاتی تھیں رفع ہوگئیں۔ لیکن علم کا حقیقی مقصد جو ہے۔ اس سے لوگ عموماً بے بہرہ ہیں۔ مادیت نے کچھ ایسی سنگین چادر اہل یورپ کی آنکھوں پر ڈال رکھی ہے۔ کہ روحانیت سے بالکل منحرف ہوگئے ہیں۔ اور مذہب سے [illegible] بیزار۔ بلکہ مذہب کے نام سے ایسے مخوف ہوتے ہیں جیسے چھوٹے بچے ہوّا سے۔ [illegible] کو سدِ راہ ترقی' وسعتِ خیالات کا مانع' تعصب کی جڑ' اور کم بینی و کوتاہ اندیشی کا مؤید [illegible] وخون کا باعث' ٹھہراتے ہیں۔ مذہبی پیروی کی غیر موجودگی سے اُن کے افعال [illegible] ۔ اُن کے حرکات میں آوارگی۔ اُن کی طبیعتوں میں بے جا جوش اور طبیعتوں [illegible] ہے۔ خود بینی اور اپنے اشرف و بالا ہونے کا خیال بچہ [illegible] قوی تر قوت کے نہ ماننے سے اُن کے دل بے رحم [illegible] کے نہ قائل ہونے سے جانوریت اور بے موقعہ [illegible] ہے [illegible] نوع انسان کے لئے مضر و مہلک ثابت ہوتی ہے۔ [illegible] حاضر و ناظر نہ ماننے سے اِن کے قلوب شقی ہوجاتے ہیں۔ اِن کے اِدراک

وفہم میں حسِّ انسانی باقی نہیں رہتی۔ تمام اوصافِ حسنہ گو بالکل ہی زائل نہیں ہو جاتے۔ تاہم محبّتِ بنی نوعی، اور مخلصانہ اخوت، و برادرانہ برتاؤ، خاندانی خصوصیات، نام ونشان کو نہیں باقی رہتے۔ اسی خیال نے یورپ کو شروع سے دیگر ممالک کے غصب کرنے۔ کالے چمڑے والی اقوام کے تذلیل کرنے اور اُن کے ساتھ بعید از انسانی سلوک کرنے میں بے باک کر دیا ہے۔ بلکہ اس کو ان کے ہضم کرنے اور صفحۂ ہستی سے ناپید کر ڈالنے کا گویا ایک پروانہ دے رکھا ہے۔ مہذب یورپ آج جو کچھ افریقی باشندوں کے ساتھ کر رہا ہے۔ کون نہیں جانتا مشرقی نیم مہذب اقوام کی جو کچھ ذلّت یورپی اقوام کے روبرو کی جاتی ہے۔ کس سے پوشیدہ ہے۔ آسٹریلیا و امریکہ کے قدیمی باشندوں کے جگر چھیدے جا رہے ہیں۔ اِن کو زندہ جلایا جاتا ہے۔ لیکن مہذب یورپ کے تیور تک نہیں بدلتے۔ اور اُن مشتہران تہذیب و داعیان محبّ انسان کی اِن شرمناک واقعات سے آنکھ تک نہیں نیچی ہوتی۔ سروائول آف دی فٹسٹ کے مسئلہ نے گویا یورپ کو ظلم کرنے اور ملک کے ملک ہڑپ کر جانے کے لئے عام اجازت دے دی ہے۔ اگر دیکھا جاوے تو پُرانے مسئلہ یا ہندی مثل جس کی لاٹھی اُس کی بھینس، کو صرف ایک دوسرے قالب میں لاکر دُنیا کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اس صدی کی سب سے زبردست اور قابلِ ناز دریافت مسئلہ ارتقا ہے۔ جس پر آج یورپ کے فلسفی کو اس قدر فخر ومباہات ہے۔ لیکن اس کو بھی کچھ ایسا ناموزون لباس پہنایا ہے جس سے نتائج اچھے منصور نہیں ہوتے۔ ایک دوسرا فرقہ فلسفیوں کا ہے۔ جو اوپٹمیسٹ (   ) کے نام سے پکارے جاتے ہیں جن کا مذہب دُنیا کی ہر چیز کو اچھے معنوں میں لینا ہے۔ لیکن یہ لوگ حدِ اعتدال سے تجاوز کر گئے ہیں۔ اور مادیت کے خیال کو اور راسخ بنا دیا ہے۔ اِن کا ماحصلِ زندگی صرف دُنیا میں آرام کے ساتھ بسر کرنا۔ کھانا۔ پہننا۔ کھیلنا کُودنا۔ ناچنا۔ گانا۔ بجانا۔ پس جو کچھ ہے۔ وہ یہی ہے۔ چاہے اس میں کسی کی حق تلفی ہو۔

ان کو کوئی پرواہ نہیں۔ اگر کسی کو نقصان پہنچا ہے۔ ان کی بلا سے۔ دوسرے کا مال غصب ہوتا ہے۔ اور اپنے ملک کی جیبیں بھری جاتی ہیں تو عین راحت ہے۔ زیادہ اگر کیا تو اپنے ملک کی ترقی میں ہاتھ بٹانے کو تیار ہو گئے۔ اور دوسری اقوام کو الٹی چھری سے ذبح کرنے کے ساعی۔ ایک اور گروہ پارسیوسٹ کا ہے۔ خیر ان بے چاروں تک غنیمت تھا۔ کہ خدا کو صرف ایک عضو معطل بایوں کیئے کہ طاق نسیاں میں بٹھا رکھا ہے۔ لیکن اگیناسٹکس ددہریہ) تو سب سے بازی لے گئے۔ دہ سارا جھگڑا ہی مٹا دیا۔ یہ سب شاخیں ہیں یورپ کے مختلف خیالات کی جنہوں نے ارتقائی قوتوں کے زور سے اس درجہ تک ترقی حاصل کی ہے۔ لیکن یورپ اس شاخ میں کوئی نئی تحقیقات نہیں کر سکا۔ یہ سب یونانی فلسفیوں کا منبع ہے۔ اور ارسطاطالیسی۔ زینوئی۔ ولذتی۔ مذہبوں کی نیویں ہیں۔ جو آج یورپ میں پھیلتی جا رہی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ یورپ نے یونانی لٹریچر کے ترجمہ کرنے میں اوّل ہی سے غلطی کھائی ہے۔ کیمیاوی تحقیقاتوں میں البتہ بہت کچھ مدد ملی۔ لیکن اخلاقی و مذہبی عقائدی مسائل میں جس طرح سے کہ یونانی حکماء اپنی پروازوں میں چکر کاٹتے رہے۔ اور منزل مقصود کو نہ پہنچ سکے۔ اسی طرح آج یورپ کے فلسفی بھی تخالفِ آرا مسائل دلائیحل تحقیقاتوں میں مصروف ہیں۔ جو آئے دن مختلف خیالات کے لباس سے آراستہ ہوا کرتے ہیں۔ آج ایک فلاسفر کچھ کہتا ہے۔ اور کل وہ اپنی غلطی کو تسلیم کر کے ایک نیا راستہ علمی دنیا کے رُوبرو پیش کرتا ہے۔ کل کوئی کچھ اور بغرضیکہ ہر شخص اپنی اپنی ہانک دیئے جاتا ہے۔ لیکن حقیقت کو کوئی نہیں پہنچا۔ افراط تفریط بھی انسانی کیرکٹر میں ایک عجیب مہلک عارضہ ہے جس سے بہت کم لوگ مبرّی ہوتے ہیں۔ اور یہی ایک ایسی کمزوری انسان میں ہوتی جاتی ہے جس سے دُنیا کو بہت بڑا نقصان پہنچ جاتا ہے۔ حریّت نے یورپ کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا۔ لیکن اس کا بے جا استعمال جب سے شروع ہوا ہے۔ کچھ اچھے نتائج نہیں ظاہر ہوتے۔ طبقہ نسوان کو جب سے آزادی کا سبق دیا گیا۔ عجیب اُدھم اٹھا رکھا

ہے۔ حقوق پر حقوق اُن کو ملتے جاتے ہیں۔ لیکن ان کی تشفی پُری نہیں ہوتی۔ حرّیت نے اُن کو مساوی حقوق لینے پر آمادہ کر دیا ہے۔ اَور وُہ اپنے فرائض کو بھول کر مردوں کے کاموں میں دست اندازی کرنے پر کمربستہ ہوگئی ہیں۔ جو کام کہ مرد کرنے سے ڈرتے ہیں۔ اُن کو دریغ نہیں ہوتا۔ ہم برابر دیکھتے ہیں۔ کہ اب عورتیں اسٹرائکس (ہڑتال) میں مردوں سے دو قدم آگے بڑھی رہتی ہیں۔ لڑنے جھگڑنے بندوقیں چلانے اَور تلوار زنی کرنے میں اُن کو باک نہیں ہوتا۔ رجائیت کے غلبہ نے اُن کی نیچرل اداؤں اور دلربا کرشموں میں ایک ایسا انداز پیدا کر دیا ہے جس میں بے ساختہ پن نام کو نہیں ہوتا۔ اَور اپنی ترچھی چتونوں سے گھائل کرنے کے عوض ان کو اب شمشیر بکف ہونا پڑتا ہے۔ جو لطف پیدا کرنے کی بجائے بھونڈے پن سے مبدل ہو جاتا ہے۔ اپنا فرض منصبی ادا کرنے کے بجائے وُہ پولٹیکل معاملات میں نہ صرف دلچسپی ہی لیتی ہیں۔ بلکہ اس میں بہت بڑا حصّہ انہیں لوگوں کا ہوتا ہے۔ اِن کے رقیق القلب مزاجوں اور رحم آور طبیعتوں میں متضاد اوصاف بھرتے چلے جاتے ہیں۔ اُن کو اُمورِ خانہ داری میں مطلق لطف نہیں آتا۔ تنہائی کو نہایت عزیز رکھنے لگی ہیں۔ اَور آزاد زندگی بسر ہونے اَور غیر پابندی کے ساتھ اپنی عمر گزارنے کی ازحد خواہش مندرہتی ہیں جس سے دُنیا کو ایک عظیم نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ یہی حال طبقہ ذکور کا ہے۔ ان میں بھی عنانیت ایک خطرناک حد تک پہنچتی جاتی ہے۔ گو اب شخصی سلطنت کا نام تک یورپ میں باقی نہیں ہے۔ ہر جگہ آزادی رائے اَور انتخاب کا طریقہ رائج ہے۔ لیکن اس سے لوگ اب متنفر ہوتے جاتے ہیں۔ اَور اُس کو بھی غیر کافی تصوّر کرتے ہیں۔ سوشل ازم (   ) کا پریشان کن خواب جب سے یورپ نے دیکھنا شروع کیا ہے۔ سینکڑوں مہذب ڈاکو اَور راہزن بلکہ سینہ زور یورپ میں پیدا ہوگئے ہیں جو کسی کو برسرِ حکومت یا ذی اختیار دیکھنا گوارا نہیں کرتے۔ بادشاہ کا قتل کرنا عین ثواب ہے۔ کسی مالدار کو تہ تیغ کر ڈالنا

عین موجب راحت ہے۔ یہ مہذب ڈاکو کہیں تو اپنے کو سوشلسٹ سے تعبیر کرتے ہیں کہیں انارکسٹ اور کہیں نہلسٹ سے نامزد کرتے ہیں۔ اپنی اپنی سوسائٹیاں ہیں جو اُن کو ہر طرح کی مدد کرتی رہتی ہیں۔ اور اُن کے حق بجانب ہونے کی تائید کرتی ہیں۔ ان کے خاص خاص اخبار ورسالے چھپتے ہیں جو اوسط درجہ کے آدمیوں اور کم استعداد لوگوں کے بھڑکانے کا کام دیتے ہیں جس سے امن عام میں خلل پڑتا ہے۔ ان کو نہ تو اپنے مرنے کا ڈر ہے۔ اور نہ قید ہونے کا ہراس۔ لکھو کہا روپیہ کے اسلحہ وگولہ بارود خرید کرتے۔ اور بنی نوع کی آزادی کے درپے ہوتے ہیں۔ اسی طریقہ سے پولیٹیکل دائروں میں اور ملکی انتظامی حلقوں میں فرقہ بندیاں ہوتی جاتی ہیں۔ ہر ہر فرقہ اور ہر ہر پیشہ ور اپنے اپنے قائم مقام بڑھانے میں کوشاں رہتے ہیں جس سے لڑائی دنگا فساد روز کھڑا رہتا ہے۔ اور جو چالبازیاں اور مصلحت آمیز دروغگوئیاں رائیوں کے حاصل کرنے میں برتی جاتی ہیں۔ اس سے سچائی اور راست گوئی قلوب سے کافور ہو جاتی ہے۔ اور مدبران یورپ ان مکاریوں دغابازیوں اور فریبوں کے کچھ ایسے عادی ہو جاتے ہیں۔ کہ ہر جگہ اور ہر موقعہ پر فریب سے کام نکالنے میں عار نہیں ہوتا۔ پارلیامنٹ کے ہاؤسوں اور پبلک جگہوں میں سفید جھوٹ بولنے میں مطلق دریغ نہیں ہوتا۔ بیان کچھ کرتے ہیں ادا کرتے کچھ ہیں اور دکھلاتے کچھ ہیں۔ ظاہر میں تو نہایت ہی دوست اور ہمدم و رفیق نظر آتے ہیں۔ اگر کہیں پالیں تو کچا کھا جانے میں بھی منہ بند نہ رہیں۔ مختلف سلطنتوں کے مدبران اور بادشاہ و پریسیڈنٹ ایک ہی میز پر کھاتے ایک دوسرے کا جام صحت پیتے ہیں۔ اور ظاہری رابطہ اتحاد کو بہت کچھ مضبوط کر جاتے لیکن علیحدہ ہوتے ہی پولیٹیکل مصلحتوں کی وجہ سے بالکل بیگانہ بن جاتے ہیں جس سے اُن کے افعال و دلی خیالات میں کوئی تعلق سوا مکاری کے نہیں پایا جاتا۔ آج کل سارا دارومدار اخباروں پر ہے۔ اور جس بے احتیاطی اور بھدے پن سے آزادی کا استعمال اخباری دُنیا میں ہوتا ہے۔ وُہ روز کے واقعات کے پڑھنے سے معلوم ہوتا رہتا

ہے۔ خود غرضی اور ذاتی فوائد و مُلکی ترقی کے خیال نے کچھ ایسا ان لوگوں کو اندھا کر رکھا ہے۔ کہ کبھی سچے واقعات کے کہنے اور بے غرضانہ وغیر جنبہ داری کی رائے دینے کا اُن کو خیال نہیں ہوتا۔ یہاں بھی حضرتِ زر نے اپنی قوت کا ثبوت دے ہی دیا۔ یہ اخبار مختلف فرقوں کے یا سوسائٹیوں کے نکلتے ہیں۔ جن کی پالیسی اِس فرقہ کی رائے کے مطابق ہونی ضروری ہوتی ہے۔ جس کے وُہ آلہ ہوتے ہیں۔ اور ہمیشہ اختلاف پیدا کرنے ومباحث کے طول دینے میں کوشاں رہتے ہیں۔ لیکن اس کا اثر تمام مُلکی پالیسی پر پڑتا ہے۔ کیونکہ یہ سوسائٹیاں کل مُلکی شیرازہ کی ایک جزو ہوتی ہیں۔

دُنیا میں زیادہ حصّہ اوسط عقل والوں کا ہے، جو اپنی کج فہمیوں اور غلط رائیوں کی وجہ سے تغیر پیدا کر دیتے ہیں۔ اور تمام عالم میں بادشاہ سے لے کر باشندوں تک پر اُس کا اثر پڑتا ہے۔ ظاہر ہے جس میں ان کا فائدہ ہوتا ہے وہی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ اِس میں دغا ہو یا فریب اور یہ ہی ایک کمزوری وخامی ہے۔ جو آج کل اس قدر خرابی ڈالے ہوئے ہے۔ اور آنے والی صدیوں میں بھی اسی کا رونا رہے گا۔

سائنس کی تحقیقاتوں پر بھی مادیت کا پرتو خوب ہی پڑا ہے۔ اور یورپ کے سائنس دان وحکماء دن رات۔ ہلاک کُن آلات کی اختراع میں لگے رہتے ہیں۔ نئی نئی توپیں۔ جلد فیر کرنے والی بندوقیں اور زہر آلود سنگینوں کے تیار کرنے میں یورپی کارخانے رات دن مصروف رہتے ہیں۔ بمب۔ شل۔ بے دُود کی بارود اور گیس کے گولے جب سے یورپ میں رائج ہوئے ہیں۔ پدم ہا روپیہ اس پر صرف ہو چکا ہے۔ اور ہوتا رہتا ہے۔ بَری فوجی اخراجات روز بروز بڑھتے جاتے ہیں۔ اور جُوں جُوں دُنیا مہذّب ہوتی جاتی ہے چھوٹی چھوٹی ریاستیں بھی اِس خبط سے نہیں بچتیں۔ اور وُہ بھی حیثیت سے زیادہ جنگی اخراجات پر ضائع کرتی ہیں۔ بحری لڑائی کا جب سے جنون یورپ کے سر میں سمایا ہے۔ قومی روپیہ سنگریزوں کی طرح بہایا جا رہا ہے۔ جہاز

بھی ہر روز ایک نہ ایک نئی ساخت کے نکل ہی آتے ہیں جس کی خبر مشتہر ہوتے ہی دیگر سلطنتوں کو بھی طرز جدید کے جہاز بنوانے ضروری ہو جاتے ہیں جن پر کروڑہا روپیہ صرف ہو جاتا ہے۔ اور مقابلہ ہوتے ہی آن واحد میں جل کر یا ٹکرا کر غرق آب ہو جاتے ہیں۔ اور کروڑوں روپیہ دیکھتے ہی دیکھتے دریا برد ہو جاتا ہے۔ اور ہزاروں قیمتی جانوں کا نقصان ہوتا ہے۔ ہوائی جہاز کی بھی زمانہ دور نہیں ہے کہ اوپر ہی اوپر معرکہ آرائیاں ہوا کریں گی۔ اور ایک تیسری بساط بھی بچھنی شروع ہو جا دے گی۔ کیمیکل آزمائشوں نے سینکڑوں ایسی زہریلی اور مار ڈالنے والی چیزیں دنیا میں مروج کر دی ہیں۔ جو بات کرتے کرتے میں اپنا کام کر جاتی ہیں۔ بہت سے ایسے آلات چوروں اور راہزنوں کے لئے اِن موجدوں نے نکال دیئے ہیں۔ جو اپنا کام کا کام کر جاتے ہیں۔ اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں ہوتی۔ نقب زنی کے آلات اور دیگر سمیات جب سے اُن کے ہاتھ لگے ہیں۔ چوروں کی بن آئی ہے۔ اور چور بھی کون ہیں مہذب و تعلیم یافتہ بس غضب ڈھا دیتے ہیں۔ جب سے روزن ریز دریافت ہوئی ہیں گویا اُن کو طلسمی سرمہ مل گیا ہے۔ جو گھر کا فوٹو آنکھوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ اور جہاں جہاں چیزیں رکھی ہوتی ہیں۔ اُن پر ہاتھ صاف کرنے اور کامیاب واپس آنے کا گویا بیمہ ہے۔ ملکی مصلحتوں اور پولیٹیکل ضرورتوں نے لوگوں کو بھیس بدلنے اور اوزار وغیرہ کی مصنوعیت کو مباح کر دیا ہے۔ اور لوگ نہایت ہی بیباکی کے ساتھ دوسرے لوگوں کو فریب دینے اور سالہا سال پاس رہ کر چکمہ دے کر چلے آتے ہیں۔ جس میں اُن کی بڑی شہرت ہوتی ہے۔ اُن کو خلعت و تمغہ دئے جاتے ہیں میگزینوں میں تصویریں نکلتی ہیں۔ سامانِ عیاشی کے مہیا کرنے میں بھی سائنس دانوں نے بہت کچھ حصہ لیا ہے۔ غیر ضروری چیزیں اِس قدر موجود کر دی ہیں۔ جن سے زندگی نہایت گراں ہو گئی ہے۔ بلکہ ہر کس و ناکس کے لئے وبال جان بن گئی ہے۔ اور یہی

ایک ایسا فریب آزمودہ مرض یورپ میں پھیل گیا ہے۔ جو اُن کو مکاری فریب و دغا دینے اور ظلم وستم کرنے پر آمادہ کر دیتا ہے۔ بلکہ مجبور کرتا ہے۔ اور روپیہ کی مانگ بڑھتی جاتی ہے۔ باوجودیکہ خطہ کے خطہ غصب کرتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن ان کا جی نہیں آسودہ ہوتا سینکڑوں پولٹیکل چالیں چلی جاتی ہیں۔ ہزاروں صلحنامہ اور اتحاد نامہ ہوتے ہیں۔ کہ کسی طرح سے اُبیض نورانی کی زیادت حاصل ہو۔ لیکن اب مشرقی اقوام بھی چونکتی جاتی ہیں۔ اور وہ زمانہ زیادہ دُور نہیں معلوم ہوتا۔ جب ایشیائی یا یورپی میدانوں میں گذشتہ صدیوں کا سین کھنچنے لگے گا۔ یا اگر یورپ ہی کے میگزین میں آگ لگ گئی۔ تو سب کو خاکستر کر ڈالے گا۔ کیونکہ بارُود بھی خوب خشک ہو گئی ہے۔ اور تلواریں بھی نہایت دھاردار۔ اگر ہوئی تو خوب ہو گی۔ خدا وہ دن نہ دکھاوے!

عزیز الرحمٰن

ایک پھول کی سرگزشت

دیروز پئے گلاب مے گردیدم
پژمردہ گلے بر سر شاخے دیدم
گفتم توچہ کردی کہ ترا مے سوزند
گفتا کہ درایں باغ دمے خندیدم

میں آج سے پانچ روز قبل پیدا ہؤا۔ دو روز تک تو نیچر نے مجھے بچہ کی طرح ہری ہری پتیوں میں لپیٹ رکھا تھا۔ اور چھوٹے چھوٹے کانٹے میری حفاظت کے لئے مقرر کر دیئے تھے۔ انسان کا بچّہ تو پیدا ہوتے ہی روتا ہے چلّاتا ہے۔ اور ہاتھ پیر پٹکتا ہے۔ مگر میں کچھ ایسا سہما ہؤا تھا۔ کہ چُپ چاپ اپنی نازک نازک پتیوں میں لپٹا ہؤا پڑا رہا نہ آنکھیں کھولیں نہ کچھ دیکھا اکثر جانے کیا ہو جاتا تھا۔ کہ میں خوب زور زور سے ہلنے لگتا۔ گویا یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ کوئی مجھے زور زور سے جھنجوڑ رہا ہے۔ اس ہلنے سے تو میری روح کانپ اٹھتی اور میں اور زیادہ سہم جاتا جب میں دو روز کا ہؤا۔ اُس وقت مجھے باہر کی کچھ کچھ آواز سنائی دینے لگی۔ باہر میرے اور بھائی مجھ پر ہنستے قہقہہ لگاتے۔ اور یہہ کہتے تھے۔ کہ ”تو بھی کیا ڈرپوک ہے۔ ذرا باہر نکل اور دیکھ تو ہم کس مزے میں ہیں۔ لوگ ہماری کیسی تعریفیں کرتے ہیں۔ اور کیسی قدر ہوتی ہے۔ کوئی ہماری خوشبو سونگھتا ہے۔ تو کوئی ہمیں چومتا ہے۔ کبھی کسی کے سر پر بند ہتے ہیں۔ تو کبھی کسی کے گلے کا ہار ہو کر

رہتے ہیں۔ غرض ہم بڑے چین کرتے ہیں۔ ایک تُو ہے کہ سہمے ہوئے لپٹے ہوئے دَبکے ہوئے پڑا ہے"۔ یہ سن کر مجھے بھی کچھ گُدگُدی سی معلوم ہوئی۔ جی چاہتا تھا۔ کہ چہرے سے اپنے سبز نقاب کو اُلٹ دوں۔ باہر نکل آؤں کچھ دیکھوں کچھ دکھاؤں اپنے دوستوں کی چھیڑ چھاڑ میں شریک ہوجاؤں۔ مگر اِدہر حیا روک رہی تھی۔ اُدہر خوف غالب آرہا تھا۔ عجیب کشمکش تھی۔ دو دن تو اسی بے چینی میں گزر گئے۔ پھر تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ اپنے بھائیوں کی باتیں سُن سُن کر طبیعت بے اختیار ہوگئی۔ اور شوق نے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے بھی اب کے ٹھان ہی لی کہ تنگنائے عدم سے فراخ نائے ہستی کی سیر کرنے کو نکل آؤں مگر دن کی روشنی میں تو اس کی ہمت نہ پڑی علی الصباح کوئی ۴ بجے کے قریب مَیں اپنے ہرے ہرے نقاب میں سوراخ کرنے لگا۔ مگر یہ کچھ ایسا مضبوط تھا۔ اور کچھ میں ایسا نازک کہ مجھ سے سوراخ نہ ہوسکا۔ مگر دُنیا کی سَیر کے خیال نے مجھے ایسا بے قرار کردیا۔ کہ میں جُھنجھلا کر تڑپ کر مچل کر پھیل کر غرض کئی ترکیبوں سے اپنے نقاب کو اور اپنی پوشاک کو پھاڑنے لگا۔ آخرش ایک دھیمی آواز سے (جسے لوگ چٹخنا کہتے ہیں) میرا نقاب اُٹھ گیا۔ اِدہر اِس کا اُٹھنا ہی تھا۔ کہ اُدہر میری باچھیں کھِل گئیں۔ چہرا تمتما اُٹھا۔ ایک رنگ آتا تھا۔ اور ایک جاتا تھا۔ غرض خوشی کے مارے پھولا نہ سماتا تھا۔ شرمیلے چہرے پر ایک ہلکی سی گلابی رنگت چھا گئی تھی۔ اور میں چُھپکے سے باہر جھانکنے لگا۔ واقعی یہاں عجیب دلچسپی تھی۔ اطراف میں چھوٹے بڑے خوشنما درخت لگے تھے۔ زمین پر سبز فرش بچھا تھا۔ چھوٹے چھوٹے پودوں میں خُوشنما پھول لگے تھے۔ اس سین کو دیکھ کر خُوش ہُوا۔ مگر حیا نے یہاں بھی میرا دامن نہ چھوڑا۔ مَیں نہایت شرمایا ہُوا تھا۔ اپنی گردن جُھکائے ہوئے اور مُنہ چھپائے ہوئے تھا۔ مگر سچ یہ ہے۔ کہ اِس تاک جھانک میں مجھے مزا آرہا تھا۔ تھوڑی دیر میں ہَوا (نسیم سحر) چلنے لگی۔ مَیں تو بہت گھبرایا اور ڈر گیا۔ مگر میرے دوستوں کو کچھ ایسا مزا آیا۔ کہ مست

ہو کر جھومنے لگا۔ ایک دوسرے کو چومنے لگے۔ اُدھر تو یہ شرارت ہو رہی تھی۔ اور ادھر جھینپ کے مارے میری بُری حالت تھی۔ پسینہ میں شرابور ہو گیا۔ اتنے میں میرے ایک بزرگ دوست نے چلّا کر کہا "بیٹا اس وقت تو تمہارا حسن عجیب بہار دکھا رہا ہے۔ وہ تمہارے گلابی گلابی چہرہ کی جھلک اِن ہری ہری پتیوں میں سے ایک انداز کے ساتھ تمہارا جھانکنا۔ اس پر شبنم کے قطرے تو عجیب ستم ڈھا رہے ہیں۔ خدا تمہاری عمر دراز کرے۔ تمہاری بڑی قدر ہوگی"! یہ سُن کر میں اَور بھی جھینپ گیا۔

کچھ عرصے میں مشرق کی جانب سے روشنی دکھائی دی۔ پرندوں نے اپنی راگنیاں شروع کر دیں۔ تھوڑی دیر میں آفتاب بھی نکل آیا۔ اُس کی تیز تیز کرنیں گو مجھے ناگوار گزرتی تھیں۔ مگر اُن کا اثر مجھ پر مفید ثابت ہُوا۔ میں ڈیل ڈول میں بڑھنے لگا۔ ادھر تو آفتاب کی شعاعیں ستانے لگیں۔ اَور اُدھر ایک اَور غضب ٹوٹ رہا تھا۔ وہ یہ کہ چھوٹی چھوٹی چڑیاں مجھے دق کرنے لگیں۔ مجھ پر آ آکر بیٹھ جاتیں۔ اَور ٹھونگیں مارتی تھیں۔ میں نہ تو اتنا قوی تھا۔ کہ اُن کا بوجھ سنبھال سکتا۔ نہ یہ میری نزاکت کا پاس رکھتی تھیں۔ غرض یہ دن بھر عجیب مشکل سے کٹا کہیں یہ چڑیاں پریشان کر رہی تھیں۔ اَور کہیں گُھند ہُوا ستا رہی تھی۔ آخر کش شام ہو گئی۔ ہر چیز خوش نظر آنے لگی۔ چھوٹے چھوٹے پرندوں نے اپنی راگنیوں سے پھر ہمیں مست کرنا شروع کیا۔ آفتاب بھی اس وقت بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی سنہری کرنیں عجیب بہار دکھلا رہی تھیں۔ تھوڑی دیر میں لوگ بھی جوق جوق آنے لگے۔ کوئی ہمیں دیکھ کر تعریف کرتا تو کوئی ہمارے پودے تلے کی گھاس کے سبز فرش پر لیٹ جاتا۔ غرض عجیب چہل پہل تھی۔ تھوڑی دیر میں سورج غروب ہو گیا۔ لوگ جانے لگے۔ پرند خاموش ہو گئے۔ اندھیرا چھانے لگا۔ ہم بھی چپکے سے آرام کرنے لگے۔

بہت دیر اسی آرام میں گزر گئی تھی۔ کہ ناگہاں مجھے کچھ شور سنائی دیا۔ میں گھبرا کر اپنے خوابِ مست سے چونک پڑا۔ دیکھتا کیا ہوں۔ کہ میرے دوست آپس میں مذاق

کر رہے تھے۔ میں ہوشیار ہو گیا۔ آج تو واقعی میرا حُسن دوبالا ہو گیا تھا۔ کبھی میں اپنی مہک سے مست ہو جاتا۔ تو کبھی اپنے رنگ و روپ کو دیکھ کر خوش ہو جاتا تھا۔ اپنے حُسن کی آپ ہی تعریف کر رہا تھا۔ کہ میرے اسی دوست نے پھر چلا کر کہا۔ کہ "بیٹا آج تو تم اپنی پوری جوانی پر ہو"۔ یہ سُن کر میں شرما کر مُسکرایا اس کو دیکھ کر اُس نے کہا۔ "اُف یہ تبسّم تو غضب کر رہا ہے"۔ میں بہت ہی جھینپ گیا۔ ایسی حالت میں مجھے دیکھ کر میرے دوستوں نے مجھے دق کرنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر میں پو پھٹ آئی اُجالا ہو گیا۔ پھر وہی اگلے دِن کے لُطف آنے لگے۔ بُلبُلوں کی آواز کان میں پڑنے لگی۔ تھوڑی دیر میں بُلبُلیں آ کر پھر مجھے دق کرنے لگیں۔ مگر ایمان کی تو یہ ہے۔ کہ اِس ستانے میں مجھے بڑا لُطف آ رہا تھا۔ اُن کی میٹھی میٹھی آواز سے جی خوش ہو رہا تھا۔ ان میں سے ایک آ کر مجھ سے چمٹ گئی۔ اور اپنی سُریلی آواز سے مجھے اپنی رام کہانی سُنانے لگی۔ میں نے بھی کچھ اُس کی سُنی۔ کچھ اپنی سُنائی۔ اُسے تسلّی دی۔ منایا۔ سمجھایا۔ اور وہ خوش ہو کر پھُر سے اُڑ گئی۔ اِسی چہل پہل میں یہ چوتھا دن بھی گزر گیا۔ شام بھی ہو گئی۔ اِس شام کا مجھے بڑا انتظار تھا۔ کیونکہ اب تو مجھے بھی شوق ہو چلا تھا۔ کہ ذرا میں اپنا حُسن دکھاؤں۔ اور لوگوں سے کچھ تعریفیں سُنوں۔ شام کے وہی لُطف آنے لگے۔ اور لوگ بھی جمع ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں ایک بوڑھا میری طرف بڑھا۔ مجھے غور سے دیکھا۔ آہ بھر دیا۔ پھر کہنے لگا۔ "افسوس"۔ ع

جمع ہیں چند ورق وہ بھی بکھرنے والے

اِس دُنیا میں کیا رکھا ہے۔ اور یہاں آنے کا شوق کیوں ہوتا ہے۔ اب اِس پھُول کو دیکھو۔ یہ اپنے حُسن پر کیا اِترا رہا ہے۔ اپنی نزاکت پر کیسا نازاں ہے۔ اپنی خوشبو پر پھُولا نہیں سماتا۔ مگر اسے یہ نہیں معلوم کہ کل یہ نزاکت یہ حُسن یہ مہک سب خاک میں مل جائے گی۔ پنکھڑی پنکھڑی ایک ہو جائے گی۔ اور یہ برباد ہو جائے گا"۔

پھر مجھے غور سے دیکھا ہنس دیا اور چلا گیا۔ اس کی باتیں سُن کر میرا رنگ فق ہو گیا۔ اور میں کانپ اٹھا۔ اور یہی خیالات آنے لگے کہ میں کیوں پیدا ہوا۔ چار دن کے لطف کے بعد پھر بربادی اس سے بہتر تھا کہ میں پیدا ہی نہ ہوتا۔ اِن خیالات میں شام ہو گئی۔ رات ہو گئی۔ اور میں سو گیا۔

دوسرا دن نکل آیا۔ مگر میں انہی خیالات میں پریشان تھا۔ بدن میں چستی نہ رہی۔ پنکھڑیاں کچھ الگ معلوم ہوتی تھیں۔ اور میں پریشان تھا۔ اتنے میں میرے کان میں کسی کے پاؤں کی آہٹ آئی۔ میں چونک پڑا۔ دیکھتا کیا ہوں۔ کہ ایک نوجوان میری طرف بڑھا آرہا ہے۔ قریب آیا۔ اور یہ کہہ کر "یہ پھول اچھا ہے"۔ مجھے توڑ لیا۔ اُف! اس وقت میری عجیب حالت ہو گئی۔ سب خوشیاں خاک میں مل گئیں۔ سب مزے کرکرے ہو گئے اپنے دوستوں سے چھُٹ گیا۔ وطن سے الگ ہو گیا۔ اُس نے مجھے ایک رومال میں لپیٹ لیا اور لے کر چلا۔ بہت دیر کے بعد ایک جگہ آکر ٹھہر گیا۔ اور مجھے رومال سے باہر نکالا۔ دیکھتا کیا ہوں۔ کہ میں ایک قبرستان میں آگیا ہوں۔ تھوڑی دیر میں یہ ایک قبر پر بیٹھ گیا۔ اور اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا کر کچھ پڑھنے لگا۔ پھر جانے اُسے کس چیز نے ستایا۔ کہ

دل میں اک درد اُٹھا آنکھ میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے اُسے کیا جانئے کیا یاد آیا!

پھر مجھے اِس قبر پر رکھ کر کہنے لگا "اے پھول واقعی تجھ پر میں نے بڑا ظلم کیا۔ مگر یہاں میں تجھے اِس قبر میں سونے والے کے پاس چھوڑ جاتا ہوں۔ یہ بھی تیری طرح ستم رسیدہ ہے۔ اجل نے اسے بھی اپنے دوستوں سے الگ کیا۔ عزیزوں سے چھوڑا دیا۔ وطن سے بے وطن کیا تو اِس کے پاس رہ۔ اس سے باتیں کر۔ اِس کا دل بہلا۔ کچھ اُس کی سُن کچھ اپنی سُنا۔ اور اپنے دن گزار لے اب میں جاتا ہوں۔

ہاں یہ اگر میری نسبت کچھ پوچھے تو کہہ دیجو۔ کہ میں یہاں آتا ہوں۔ تیری یاد میں آنسو بہا جاتا ہوں۔ اور تیری زندہ تصویر جو میری آنکھوں کے سامنے پھرتی ہے۔ اُسی سے اپنے روتے ہوئے دل کو تسلی دیتا ہوں؟ یہ کہہ کر چلا گیا۔ میں نے اُس سونے والے کو جگانے کی کوشش کی۔ مگر بے سود۔ پھر میں چلّایا۔ پکارا۔ جھنجھلایا۔ چیخا۔ مگر وہاں اثر تک نہیں۔ پھر میں نے اسے سنایا۔ سمجھایا۔ مگر اس ظالم نے کروٹ تک نہ بدلی۔

ہوائیں غفلت کی چل رہی ہیں اُمنڈ رہی ہیں بلا کی نیندیں
کچھ ایسے سوئے ہیں سونے والے کہ جاگنا حشر تک قسم ہے

مَیں سخت پریشان ہُوا۔ اُور اس بے چارے کی ایسی حالت دیکھ کر مجھے سخت قلق ہُوا۔ یہ کون ہے کیسا ہے کہاں سے آیا اُور کیسے آیا۔ ان خیالات میں غرق تھا۔ کہ مجھے اس بوڑھے کی باتیں یاد آئیں۔ واقعی اُس نے سچ کہا تھا۔ کہ اس دُنیا میں کیا رکھا ہے۔ اُور یہاں آنے کا شوق کیوں ہوتا ہے۔ انہی خیالات میں مَیں پریشان تھا۔ کہ میری نظر ناگہاں اپنے جسم پر پڑی۔ دیکھتا کیا ہوں۔ کہ اب نہ مجھ میں وہ خوبی رہی نہ وہ مہک بدن ٹوٹ رہا ہے۔ پنکھڑیاں گر رہی ہیں۔ رگیں کھنچ رہی ہیں۔ میں گھل رہا ہوں۔ بکھر رہا ہوں۔ اور خاک میں مل رہا ہوں۔

محمد احمد خدنگ

ملکۂ محبّت

آفتاب و ماہتاب کچھ کے کچھ ہو جائیں۔ زمانہ کی رفتار میلوں اور کوسوں آگے بڑھ جائے۔ آسمان کروٹوں پر کروٹیں لے اور زمین چکروں پر چکر کاٹے۔ مگر قانونِ قدرت کے سنگلاخ پہاڑ اپنی جگہ سے سرکنے والے نہیں! چاند کی آب و تاب تاروں کی چمک دمک سورج کی طلوع و غروب کی ہیئتیں جو آج سے ہزار ہا برس پہلے تھیں وہی آج ہیں۔ اور اُس وقت تک اِسی طرح رہیں گی جب تک کسی ستارہ کی ٹکر یا صانعِ حقیقی کا حکم ان تمام اسباب کا خاتمہ نہ کر دے۔

کائناتِ دہر کے متضاد نتائج حیاتِ انسانی کی مختلف حالتیں انواع و اقسام کے تماشے رنگ برنگ کی کیفیتیں پیش خیمہ ہیں۔ اُس انقلاب کا جو عُمر کے باقی حصّہ میں ہونے والا ہے۔ اور خبریں ہیں۔ اُس وقت کی جب جسدِ خاکی اِن تغیّرات سے بے تعلق ہوگا۔ یہ واقعات اگر صنعت تسلیم کر لئے جائیں۔ تو لا جرم اِس کا صانع ماننا پڑے گا! وُہ نیچر ہو یا خدا۔ مگر اس استادی کے قائل ہیں۔ کہ باعتبار ضرورت پارس بنا کر بھیجا۔ اور کُندن بنا کر چھوڑا! کچھ ایسا دلچسپی کے سانچے میں ڈھالا۔ کہ اِس حیاتِ ناپائیدار پر کیسی ہی تکلیفیں اور کتنی ہی پریشانیاں کیوں نہ گزریں۔ آفتوں پر آفتیں آئیں مصیبتوں پر مصیبتیں ٹوٹیں چاہو کہ اِس پیرزال کی نیرنگیوں سے دِل اُکتا جائے مُمکن نہیں۔

اِسی منزل گاہِ راحت و عیش میں جہاں باجے گاجے کے غُل غپاڑے سے کان پڑی آواز نہیں سُنائی دیتی۔ وہاں شہر سے باہر ایک کونہ میں چھوٹا سا قبرستان بھی ہے۔ جس میں ٹوٹی پھوٹی پُرانی قبریں اِن خوشیوں کی بے ثباتی کا پتہ دے رہی ہیں! یہ مٹی

ہوئی صورتیں جو آج اِس سنسان میدان اور ہُو کے عالم میں بے خبر پڑی ہیں۔ کل اِسی
منزل گاہ میں شاداں و فرحاں پھر رہی تھیں! فارغ البالی کے چنور اُن کے سروں
پر سایہ کئے تھے۔ اور حیاتِ مستعار ان پر راحت و اطمینان کے پھول برسا رہی تھی۔
عزیزو! تعلقات کا اثر جیسا تم پر ہے۔ ایسا ہی اُن پر بھی تھا جس طرح تمہارے
دلوں میں ارمان ہیں۔ اِن کے بھی تھے! بادِ صبا کی اٹکھیلیاں جس طرح تمہارے ساتھ
ہیں۔ اِسی طرح اِن کے ساتھ بھی تھیں۔ یہ ہی چاند تارے جو آج تمہارے سامنے ہیں۔ اِن
کے سروں پر بھی تھے! قدرت کی تمام دلچسپیاں جوں کی توں ہیں مگر اس کی بہار
دیکھنے والے بدل گئے! یہ نیند کے متوالے جن کے ڈھیر پیشِ نظر ہیں۔ اِس فراقِ ابدی
سے خوش نہ تھے۔ جاگ سکیں تو اِن کو اُٹھاؤ اور اِن سے پوچھو۔ کس دل سے گئے۔ اور
کس حال میں رہے۔ بڑی طاقت ور تھی وہ چیز۔ جو اِن عزیزوں کو ایسی چہل پہل سے
اُٹھا لائی۔ اور اِس جنگل بیابان میں لا لٹایا۔ فاختہ کی کوُ نے اِن نو وارد مہمانوں کو لوری
دی اِملی اور نیم کی پتیاں اِن کو تھپکنے لگیں! گو یہ پیاری صورتیں ہمیشہ کو چھوٹ گئیں۔ اِن
کے شکوے شکایت سب ختم ہوئے۔ اور اب ہمیں اِن سے بات کرنے کی بھی فرصت نہیں!
کبھی تو اِن کی بھی خاطر منظور تھی! زندوں کی ملاقات کا لطف تو بہت اُٹھایا۔ آؤ آج
اِن مُردوں کی صحبت میں بھی شریک ہوں۔ واہ وا کیسی بارونق محفل جمی ہوئی ہے۔
چھوٹے بڑے بڈھے جوان ایک لباس ایک وضع ایک قطع ننگے سر ننگے پاؤں اپنے
اپنے کارناموں پر فخر کر رہے ہیں! بہت سے خُلق و محبت کے بندے ہیں۔ جو اپنی
بیش بہا زندگی دوسروں پر نثار کر گئے۔ گو خالی ہاتھ رہے اور خالی ہاتھ آئے۔ مگر
ایسے خزانے اپنے ساتھ لائے جو کبھی ختم ہونے والے نہیں کیسے مستقل مزاج لوگ
تھے۔ مصیبتیں جھیلیں۔ آفتیں بھگتیں مفلس جئے قلاش مرے مگر خلوص کے لہلہاتے
پھول جو ماں کے پیٹ سے لائے تھے۔ اُنہیں نہ مرجھانے دیا! دیکھو اور نظرِ غو

سے دیکھو! زندگی کا سہرا انہیں کے سر ہے جیتے جی تو اِن کی کچھ وقعت نہ تھی۔ مگر آج اِن کی صورتیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ بڑے بڑے عبادت گزاروں کی ٹکٹکی اِن کے چہرے پر بندھی ہوئی ہے۔ اور یہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے! حاصلِ عمر دوسروں کی نذر کر دیا۔ عزت کے خواہاں رہے نہ دولت کے طالب۔ اِن کی آرزو اِن کے ارمان۔ اِن کی خواہشیں اِن کی اُمنگیں جو کچھ تھیں یہ تھیں۔ کہ دوستوں کا دم بھرتے پیاروں کا نام لیتے دُنیا سے رخصت ہو جائیں! خوش نصیب تھے یہ آپ اور غنیمت تھی اِن کی زندگی!

جنگل بسانے والو! گو تم ہم سے رخصت ہو گئے۔ اور ایسے رخصت ہوئے۔ کہ اب نظر نہ آؤ گے۔ مگر زیست تھی تو تمہاری۔ اور انسان تھے تو تم۔ یہ چوٹی کی دُلہن یہ حسین ملکہ جو آج سُنہری کٹہرے میں تمہارے پاس آرام کر رہی ہے۔ تمہارے ہی قابل تھی۔ اب اِس کے قدر دان کہاں اور پوچھنے والے کدھر۔ خدا جانے کس صورت شکل کی عورت ہو گی جس کی قبر پر یہ کچھ نور برس رہا ہے۔ دو رویہ گملوں کی قطاریں رنگ برنگ کے پھول مقناطیسی اثر دکھا رہے ہیں۔ سرہانے سنگ مرمر کا ایک پتھر ہے۔ جس پر کندہ ہے۔ "ملکۂ محبت کی آرامگاہ"

راشد الخیری

بدنصیب کا لال

مُصیبت کا زمانہ پریشانی کے دن رات کا وقت برسات کا موسم مُفلسی بے کسی
بے بسی ماں باپ بھائی بند دیور جیٹھ ساس نند کچھ مر کر چھوٹے کچھ جیتے جی چھوٹے۔ دو دن
کی بیاہی چوتھی کھیل سسرال آئی۔ اِدھر بیٹی سوار ہوئی۔ اُدھر ماں کو بخار چڑھا۔ ہر چند ٹالا
مگر ایسی گھڑی کا چڑھا۔ کہ جان ہی لے کے ٹلا۔ دن بھر لوتھ پڑی رہی شام کو سرِ شام رات
کو سکرات صبح ہوتے ہوتے رخصت۔

چوتھی کی دُلہن گُم سُم سسرال سے چلی۔ اور روتی پیٹتی میکے آئی صبح کو پھول ہوئے
گھر میں مہمان بھرے تھے۔ باہر ابّا جان کا نکاح ہو رہا تھا۔ قصّہ مختصر اماں یوں گئیں۔
ابّا یوں گئے! اور کوئی اوّل تو تھا ہی نہیں جو تھیں بھی تو ایک رشتے کی نانی وہ
جٹھانی کے ٹکڑوں پر تھیں۔ ساٹھ پینسٹھ برس کی بڑھیا پھوس بھری بھنڈ
نہ پیٹ میں آنت بات کی نہ چیت کی کام کی نہ کاج کی ہونا نہ ہونا دونو یکساں
بھائی جس کے دم سے میکا ہے۔ بدنصیب دُلہن کا کوئی نہ تھا بھیں بہنیں
ایک چھوڑ دو دو مگر دونو اپنے اپنے گھر بار کی ایک خوشحال وہ پردیس دوسری
وہ کنگال بھی کیسی کہ اناج تک کو محتاج۔ غرض میکے میں تو نہ کوئی نام لیوا نہ پانی دیو
لے دے کر ایک باپ کا دم سمجھ لو۔ وہ کہیں بیٹی کل کی مرتی آج ہی مرجائے
اماں وہ ایک دفعہ کیا کئی دفعہ اور اپنوں میں نہیں محلے والوں تک کے
چوری چھپے نہیں ہانکے پکارے اور کھلے خزانے کہتی تھی زندہ کو رو تی

مُردے کو کفن بھی میّسر نہ ہو۔
ساس جب تک زندہ رہیں بہو کے قدموں کے نیچے آنکھیں بچھاتی رہیں۔ امیری نہیں غریبی اور غریبی کیسی کہ فقیری چھ ساڑھے چھ روپیہ کی آمدنی خرچ پورا کال پڑا ہوا مگر صبح کا ناشتہ مرتے دم تک ناغہ نہ کیا! وہ جیتی ہوئیں تو حمیدہ کو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ پیٹ بھر کر نہ ہوتی آدھا پیٹ۔ سالن نہ سہی روکھی۔ روکھی نہ ہوتی سوکھی۔ دو وقت نہیں ایک وقت۔ تازی نہیں۔ باسی۔ گھر کی نہیں بازار کی۔ بازار کی نہیں محلہ کی۔ غرض پوری آدھی اَدھی پَونی۔ اچھی بُری سَٹّم پسٹّم کسی نہ کسی طرح پیٹ میں پڑ جاتی۔ یہ نہ ہوتا کہ صاف تین وقت کا گڑ اکا گز رگیا۔ اور چوتھے وقت بھی اللہ ہی اللہ ہے۔
ساس کا مرنا بہو کے سر پر دُنیا بھر کی تکلیفوں کا دھرنا تھا۔ کچھ ایسی ہوا چلی۔ اور ایسا نصیبہ پھوٹا۔ کہ چاروں طرف سے مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ برس کے اندر ہی اندر گھر بھر کی صفائی ہوگئی۔ بیراں جی میں ساس۔ مدار میں دو نو نندیں۔ رجب میں دیور۔ غرض تین مہینے میں چار جنازے ایک گھر سے نکل گئے۔ ساری کائنات دو نو باپ بیٹے باقی رہے۔ شب برات کا چاند ایسا بھاگوان آیا۔ کہ ابّا جان بھی چل بسے۔ ٹنڈ دن ٹوں ایک میاں بیوی رہ گئے۔ پانچ روپیہ باپ کی پنشن کے تھے وہ بند ہوئے۔ ایک روپیہ ماں کے دم تک تھا۔ وہ بھی ختم ہوًا۔ آٹھ آنے چاہے کھاؤ۔ چاہے پیو چاہے اوڑھو چاہے بچھاؤ کچھ دن یوں بھی گزرے مگر کہاں تک اور کب تک کچھ نہ ہو۔ تو دو میاں بیوی میں سیر بھر آٹا تو روز ہو۔ مگر ہو کہاں سے۔ بیوی معذور میاں مجبور۔ اِس پر طرّہ یہ کہ اِدھر آیا زچہ خانہ اُدھر آیا رمضان دونوں کے چھکے ٹوٹ گئے۔ زچہ خانہ کا تو ایک بہانہ تھا دلوں میں غبار بھرے ہوئے تھے! میاں بیوی دیکھ دیکھ کر جلتے تھے۔ بیوی میاں کو دیکھ دیکھ کر جلتی تھی۔ اٹھائیسویں روزہ ہوگا۔ چار بجے کے قریب بیوی کو بخار چڑھا میاں سے کہنے لگی:۔

ایک روزہ اَور رہ گیا ہے۔ اللہ یہ بھی پورا کروا دے۔

میاں :- ایک ہو یا دو ہیں تو جیسا پریشان اب کے رمضان بھر رہا۔ میرا ہی دل جانتا ہے! امّاں جان کے سامنے میرے تیسوں روزے ہوتے تھے۔ اب ایک پہلا ایک منجھلا کُل دو ہوئے! کیا کھا کے رکھوں اَور کیا دیکھ کے کھولوں۔

بیوی :- مجھ سے پہلے رکھتے ہو تو خبر نہیں اگلے برس تو تم نے ایک بھی نہیں رکھا۔ تم کیا اللہ بخشے خود ابّا جان ہی گنڈے دار رکھتے تھے۔ گھر بھر میں ایک امّاں جان البتہ روزے کی پابند تھیں۔ باقی تو سب چھوٹے اور بڑے دن دہاڑے دھڑلے سے کھاتے تھے۔

میاں :- تم ایسی بیہودہ باتیں کیوں کرتی ہو۔ پندرہ دن کی بیاہی چار لوں کی دُلہن تم کو کیا معلوم کس کا روزہ ہے کس کا نہیں یا جو دل میں آیا کہہ دیا۔ جو منہ میں آیا بک دیا۔ رَو میں آئیں تو چھوٹے بڑے مردے سب زندے سب کو اُکھاڑ پھینکا۔

بیوی :- سبحان اللہ! دُولہن تھی اندھی تو نہ تھی! مُنہ پر گھونگھٹ تھا یا کانوں میں ٹھیٹیاں! دیکھتی نہ تھی سُنتی تو تھی! پکتا تھا اور میں جانتی نہ تھی کھاتے تھے۔ اَور مجھے خبر نہ ہوتی تھی۔

میاں :- جب کیا میں تو اب بھی۔ اَور فقط اندھی ہی نہیں۔ اِس کے ساتھ بدتمیز بے ڈھنگی پھوہڑ سلیقہ بلکہ اس سے بھی بدتر سمجھتا ہُوں۔ ایسی نیک قدم آئیں۔ کہ سب ختم ہو گئے۔

بیوی :- میں منحوس تھی کہ گھر بھر کو موس لیا۔ ساٹھ برس کے بڈھے پھوس کو میں کھا گئی۔ تم تو بھاگوان تھے۔ کہ میری جوان امّاں کو نوش جان کر گئے۔ تقدیر پھوٹنی تھی پھوٹ گئی۔ پیٹ بھرنے کو ٹکڑا نہ تن ڈھکنے کو چیتھڑا۔ فاقوں تک کی نوبت آ گئی۔ اور کیا ہو گا۔

میاں:۔ہم نے تو چڑھاوے ہی کے وقت کہہ دیا تھا۔کہ روکھی بلکہ سوکھی روٹی ہے۔اماں کی قبر پر جاکر جوتیاں مارو اندھی تھوڑی تھی۔کیا دیکھ کر کیا تھا۔ہاتھی جھوم رہے تھے؟

بیوی:۔کیوں مرے ہوؤں کا صبر سمیٹتے ہو۔خیر اس تُو تُو مَیں مَیں سے کیا حاصل میں ڈیڑھ کلام جانتی ہوں ہاتھ پکڑ کے نکال باہر کرو۔تم کو سلام تمہارے گھر کو سلام میں ایسے گھر سے باز آئی۔اشراف ہوں گی تو پھر نام نہ لوں گی۔

میاں:۔شرافت کیا ہوئی ایک آفت آگئی۔میری طرف سے تم بھی بسم اللہ کرو۔تم نام نہ لوگی۔تو میرا بھی کوئی پیغام نہ جائے گا۔بس اب مُنہ سے کہا ہے۔تو کرکے دکھاؤ۔

بیوی:۔آگ لگے ایسے بیاہ کو اور بھاڑ میں جائے ایسا سہاگ اذان کی آواز کان میں آرہی ہے۔روزہ سب گیا گزرا ہُوا۔

دن بھر کا روزہ رات بھر کا فاقہ مٹکے کے پاس گئی تو پانی کی بوند نہیں آبخورے میں نون ڈھونڈا وُہ نہ مِلا۔کٹورے میں دو چھوہارے رکھے تھے۔وُہ چوہا لے گیا۔ چولھے کے پاس یہ کہتی ہوئی آئی!

خاک میں ملوں میں رکھتی جو راکھ سے روزہ کھولوں۔

چوبیس پچیس گھنٹے کی بھوکی پیاسی بخار چڑھا ہُوا آنکھوں میں حلقے زبان پر کانٹے ہاتھ میں طاقت نہ پاؤں میں سکت روزہ کھول کر نماز کو چلی! چکر آیا اور چکر کے ساتھ ہی دیوار کی ٹکر اس زور سے لگی۔کہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔رو کر کہا۔

"بس بہت جی اب خدا مجھ کو موت دے"

بیوی نماز کو کھڑی ہوئیں۔میاں نے اپنا اسباب باندھنا شروع کیا۔اسباب ہی کیا تھا۔پُرانے تین جوڑوں کی ایک گٹھڑی ٹوٹا ہُوا حقہ پھٹی ہوئی رضائی چوپہا تکئے

ایک پیتھڑا دری۔ بیوی کھڑی دیکھتی کی دیکھتی ہی رہی۔ اور میاں اپنا استر بستر لے لوا یہ جا وُہ جا۔

گئے اور ایسے گئے کہ بچّہ تک ہوگیا۔ اور بچّے کے باپ نہ پلٹے۔

اچھے بُرے امیر فقیر کماؤ نکھٹو! شریف، رذیل، معزز، ذلیل، ہندو اور مسلمان، بڈھے اور جوان، شیخ، سیّد، مغل، پٹھان، پنجابی اور بنگالی، اسیری و استو اور دل والی کچھ دیکھے کچھ برتے۔ مگر یہ اندھیرا نہ کہیں دیکھا نہ سُنا۔ پورے دن بیوی پہلوٹھی کا زچّہ خانہ سر پر ماس نہ آدمی پاس تانبے کا برتن نہ گہنے کا تار۔ ماں سوتیلی، باپ بیزار اور میاں کو گھر میں قدم رکھنا حرام! کم بخت صورت شکل کا اچھا جوان تندرست پڑھا لکھا موٹا تازہ کچھ نہ ہوتا تو چپڑاسی تو ہو جاتا مگر کون ہوتا اور کیوں ہوتا۔ بُری صحبت نے غیرت اور حمیّت سب غارت کروا دی۔ مزے سے تاش پچیسی اور چین سے سُلفے کے دم لگاتے دن بھر پھڑوں میں رہے۔ رات کو جہاں جگہ ملی پڑ رہے۔

تکلیف ہو خواہ آرام عمریں ختم ہو رہی ہیں۔ اور زمانہ اُڑا چلا جا رہا ہے! وُہ دن آن بھی پہنچا اور نکل بھی گیا۔ کسی کا کام اٹکا نہیں رہتا خدا اُس کی بیوی کا بھلا کرے۔ ساس سے زیادہ اور ماں سے بڑھ کر خدمت کی۔ بچّہ ہُوا! پلا! پڑھا! جس رات کا یہ ذکر ہے۔ ماشاء اللہ برس سوا برس کا تھا۔

برسات کے دن تو تھے ہی مینہ کا برسنا کوئی نئی بات نہ تھی۔ مگر خرابی یہ ہوئی اِدھر تو مینہ اور مینہ بھی کیسا کہ موسلا دھار اور گھنٹہ نہ آدھ گھنٹہ بلکہ پورا چار پہر اُوپر سے چلی ہَوا اور وُہ بھی پُروا۔ ہَوا کیا ایک طوفان تھا۔ کہ مکان اور دکان دہے اور دالان اُڑ اُڑا کر کے آرہے تھے نہ اندھ بیاؤ کم ہوتا تھا نہ جھکڑ تھمتا تھا۔ رات کا سنّاٹا! ہَوا کا فرّاٹا! کڑک! چمک۔ مردوں تک کے کلیجے دہل رہے تھے۔ بارش کیا ایک آفت بلکہ قیامت تھی کہ جانوں کے لالے پڑ گئے۔ عورتیں اور مرد بڈھے اور جوان۔ گھر بار کمرے دالان

کپڑے لتّے اوڑھنا بچھونا! روپیہ پیسہ چاندی سونا. گہنا پاتا برتن بھانڈا پلنگ چارپائی سب چھوڑ چھاڑ انگنائی میں آ بیٹھے! بھیگیں گے تو بلا سے جان تو بچے گی۔ ہر طرف آفت بپا تھی! مکان گرا! دیوار آئی! سائبان اُڑا! چھپل نکلی! چھجہ پھولا زینہ پھٹا۔ آدھی رات اور خلقِ خدا کی گریہ زاری۔ مینہ کیا ایک چاند ماری تھی۔ کہ چاروں طرف سے دھوں دھوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

حمیدہ غریب بدقسمت بدنصیب عورت ذات نہ کوئی سنگ نہ ساتھ اِس قیامت کی گھڑی کو اکیلی کھڑی گزار رہی تھی۔ قدرت کے کھیل تھے چراغ تھا نہ تیل۔ اندھیر گھُپ اور اِس آفت کا سامنا! بدقسمتی سے دروازہ میں کواڑ بھی ایک تھا! ہوا کا جھکڑ کواڑ کی دھڑ دھڑ دم پر بنی ہوئی تھی۔ ذرا کھٹکا ہُوا اور جان نکلی! عالی شان محل اور بڑی بڑی حویلیاں پکّی پکّی محل سرائیں! کوئی گر رہا تھا کوئی جُھک رہا تھا کوئی بیٹھ رہا تھا! حمیدہ مظلوم کا مکان تو کس گنتی میں تھا لبی کوٹھڑی چھوٹا دروہ حمام والی دیوار شام ہی بیٹھ چکی تھی۔ پاخانہ اور پاخانہ کے ساتھ باورچی خانہ اب آئے۔

مینہ کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ اور حمیدہ کھڑی اللہ اللہ کر رہی تھی۔ آسمان پر نگاہ اور بچے میں جان۔ دروازے پر دھیان اور درے کی طرف کان۔ ایک آفت ہو تو کہی جائے۔ ہر طرف مصیبت ہی مصیبت تھی۔ حمیدہ اکیلی کا اللہ ہی بیلی تھا۔ چھت کہتی تھی اب گری۔ دروہ کہتا تھا اب بیٹھا۔ پہاڑ سی رات ایک کواڑ کا گھر جان کا خوف چور چکار کا ڈر جن بھوت کا اندیشہ۔ دل ہوا ہو رہا تھا۔ مٹی دوپہر ہی سے جھڑ رہی تھی۔ اب منڈیر کی اینٹیں بھی گرنی شروع ہو گئیں! اینٹوں کا گرنا تھا کہ حمیدہ بالکل ہی بے آس ہو گئی۔ بدحواس ہو کر بچہ گود میں اٹھا لیا اور انگنائی میں آن کھڑی ہوئی بچہ کا اُٹھانا تھا۔ کہ اِس اللہ کے بندے نے بلکنا شروع کیا۔ بہتیرا ہی بہلایا مگر تو بہ کس باپ کا بچہ تھا۔ جُوں جُوں چمکارتی تھی۔ اور دوگنا ہوتا تھا۔ تھپکایا دودھ دیا۔ بہلایا پھسلایا ٹہلی کلیجہ سے

لگایا۔ سب ہی کچھ کیا۔ مگر اُس کی ہچکی دھاڑ نہ تھمی! ہائے ماں تا اس برس بھر کی جان پر اپنی جوان جان قربان تھی۔ اِس پھول کے رونے میں سب بھول گئی۔ خدا خدا کرکے صبح ہوتے اِدہر مینہ تھما۔ اُدہر ہوا کم ہوئی۔ بچے نے بھی دم لیا۔ تو ذرا جان میں جان آئی۔ ایک ٹوٹی ہوئی کھٹولی اندر سے لائی پھٹی ہوئی دری اُس پر بچھائی اَور بچے کو کلیجے سے لگا کر انگنائی میں لیٹ رہی! بچہ ہلکان ہو کر جو پڑا۔ ادہر تلی لوری ادہر ہوا بکھوا دُودھ مُنہ میں لیتے ہی گلے میں ہاتھ ڈال کر سو رہا! اللہ اللہ! بچہ کا کلیجے سے لگ کر سونا تھا۔ کہ وُہ رات بھر کی مصیبت و پریشانی کچھ بھی یاد نہ رہی۔ میاں کی بے اعتنائی باپ کی لاپرواہی اپنی تنہائی سب بھول گئی! ماں تا کے جوش میں زور زور سے بھینچتی تھی اَور کہتی تھی۔

"میں کیا کسی کی پرواہ کرتی ہُوں۔ اللہ میرے بچے کی عمر میں برکت کرے۔ میرا میاں تو یہ ہے!"

زندگی کی تمام خوشیاں اور جوانی کی بہاریں اُس ننھی سی جان پر نثار تھیں! اس ہی دم کے ساتھ عمر کی تمام آرزوئیں اور ارمان لگے ہوئے تھے۔ لپٹ رہی تھی اَور لپٹا رہی تھی چمٹ رہی تھی۔ اَور چمٹا رہی تھی۔ حمیدہ مظلوم اِسی طرح قربان ہو رہی تھی۔ کہ برابر کی مسجد سے آذان کی آواز آئی! اُٹھی درود شریف کا جزدان بچے کے پاس لا کر رکھا۔ وضو کیا اور نماز پڑھنے کھڑی ہو گئی۔

(عبدالرزّاق)

زبان کی تمیز اور اُس کا فرق

زبان تو وہی ایک گوشت کی بوٹی ہے۔ جو دانتوں کی چار دیواری میں تالو کی چھت کے نیچے بل مارتی پھرتی ہے۔ کبھی تو ہونٹوں کے پھاٹک ہیں درّانہ آکھڑی ہوتی ہے۔ کبھی گردن نکال کر اِدھر اُدھر کھوپے کی طرح جھانکنے لگتی ہے کبھی میٹھی چیز کا مزا لیتی ہے۔ کبھی کھٹّے اور کڑوے سے مُنہ بناتی ہے۔ کوئی اُسے لِسان کہتا ہے۔ کوئی جِیب۔ کوئی تیل کہتا ہے۔ کوئی ٹنگ۔ کسی نے للّو کہہ لیا کسی نے رسنا۔ مگر ہماری مراد اِس جگہ روزمرّہ کی بول چال یا ہر ملک کی بھاکا سے ہے۔ اِس میں خواہ عورتوں کی بولی ہو۔ خواہ مردوں کی گنواروں کی گفتگو ہو یا شہر والوں کی لکھنؤ کی لغت تراشی اور سنانت ہو۔ یا دہلی کی سادگی اور سلاست۔ قلعۂ معلّٰی کی معاملہ بندی ہو۔ یا ثقات کی لطیفہ گوئی۔ شہدوں کا پھکڑ ہو یا آزادوں کی بدلگامی۔ پیشہ وروں کی اصطلاحیں ہوں یا دلّالوں کی رمزیں بچّوں کا اُوں اُوں اُوں مم مم کرنا ہو۔ یا بیگموں کا نِت نِت اور جم جم کہنا یہ ساری باتیں ہماری اُس زبان میں داخل ہیں۔ جس کا ہمیں بیان کرنا منظور ہے۔

عام زبان کسی خاص قوم یا شہر پر مخصوص نہیں ہے۔ یہی زبان ہے کہ جانوروں کے مُنہ میں ہے۔ اور یہی زبان ہے کہ آدمیوں کے دہن میں۔ اگر بُلبُل اپنے چہکنے سے خوش ہے۔ تو کوّا بھی اپنی کائیں کائیں میں مگن ہے۔ کوئل کوک کو اچھا جانتی ہے۔ تو مور جھنگارنے کو عمدہ سمجھتا ہے۔ مینڈک ٹرّانے میں

مست ہے۔ تو جھینگر جھیں جھیں ہیں پپیہا پی پی سے دل بہلاتا ہے۔ تو فاختہ کوُ کوُ سے دل خوش کرتی ہے۔ کُتّا بھونکنے کو بھلا سمجھتا ہے۔ تو شیر دھاڑنے کو پسند کرتا ہے۔ اونٹ کو بڑانا بھاتا ہے۔ تو بچارہ کو ڈکرانا پسند ہے۔ غرض ایک دوسرے کی زبان اور لہجہ کو بحیثیت مجموعی ہم بُرا نہیں کہہ سکتے۔ کس لئے کہ ہر ایک کی زبان بجائے خود عمدہ اور بہتر ہے۔ جو فصیح آدمی اپنی زبان سے کام لیتے ہیں۔ وُہی غیر فصیح اور جانور بھی کام نکال لیتے ہیں۔

زبان کیا ہے؟ منشائے دلی کے اظہار کرنے کا آلہ ہے۔ ایک زمانہ ہوگا۔ کہ ہم لوگ آنکھوں یا ہاتھوں کے اشارے سے کام لیتے ہوں گے۔ پھر ایک زمانہ وُہ ہوگا کہ ہم نے صرف اسموں سے کام نکالا ہوگا۔ اب ایک زمانہ یہ ہے۔ کہ ہم نے اسماء افعال روابط وغیرہ کو ملا جُلا کر ایک عمدہ تسلسل پیدا کر لیا۔ اور اپنے مفہوم کو اس طرح ادا کرنے لگے۔ کہ سامع کو کسی طرح کی دقت نہ رہی۔

اب اگر ہم طاقت ور۔ شہ زور۔ اور کسی جنگل یا پہاڑ کے محنت کش باشندے ہوں گے۔ تو ہمارا ایک ایک لفظ اور ایک کلمۂ جرأت۔ طاقت سختی۔ اکھڑ پن غضب خشونت کا جامہ پہنے ہوئے ہوگا۔ حاکم سے بھی بولیں گے۔ تو اکڑ کر ہی بولیں گے اخلاص کی بات بھی کریں گے۔ تو ایسی جیسے پتھر کھینچ مارا۔ اس میں بھی اگر بانگڑ میں ہماری بود و باش ہوگی۔ تو سب سے زیادہ کرخت لفظ زبان سے نکالیں گے۔ اور جو کھادر میں تو اِس سے دوسرے درجہ پر ہمارے الفاظ ہوں گے۔ اور جو ہم دال چپاتی کے کھانے والے ناز پروردہ عیش منانے والے ہوں گے۔ اور کبھی ریاضت کے پاس نہ بھٹکے ہوں گے۔ تو ہماری بات بات سے مسکینی غربت عاجزی سستی کاہلی ٹپکے گی۔

اُوپر کی بحث سے ثابت ہُوا۔ کہ کوئی ملک اور کوئی ولایت کیوں نہ ہو۔ اُس میں

دُو طرح کی زبان اور دُو طرح کے الفاظ ہوں گے۔ بعض الفاظ میں صرف لہجہ کا فرق ہوگا۔ بعض میں اصلیّت کا۔ اِس میں سے ایک زبان اکھڑ اور سخت کے نام سے جیسے گنواری یا جفاکش لوگوں کی بولی کہہ سکتے ہیں مشہور ہوگی۔ دوسری ملائم اور نرم جیسے شہری زبان کے نام سے موسوم کرنا بے جا نہ ہوگا تعبیر کی جائے گی۔

تجربہ سے ثابت ہؤا ہے کہ بارہ بارہ کوس فاصلے پر زبان بدل جاتی ہے۔ مگر خاص شہر میں بھی دو طرح کی زبان ہوتی ہے۔ ایک عام لوگوں کی جسے متعصّب لوگ زبان جُہلا یا ادنی آدمیوں کی بولی کہتے ہیں۔ دوسری خاص لوگوں کی جسے زبان شعراء یا فصحاء کہتے ہیں شعراء کی زبان میں بھی اختلاف ہے کوئی عام محاورے پسند کرتا ہے۔ کوئی خاص۔ جیسے اُستاد ذوقؔ اور حضرت غالبؔ اب اِن شہروں میں بھی فرق ہے۔ جو شہر کسی بادشاہ کا مدّت تک دار الخلافہ رہا ہوگا۔ اُس کی زبان اور شہروں کی نسبت عمدہ اور زیادہ شائستہ خیال کی جائے گی۔

باعتبار زبان تو ہر ایک زبان کا مرتبہ ایک ہی ہے۔ مگر اس لحاظ سے کہ دار السلطنت میں آکر ہر ایک لفظ سانچے میں ڈھلتا اور خراد چڑھتا ہے۔ اُسے سب پر ترجیح دے سکتے ہیں۔ اِس بات کے ثبوت میں ہزاروں دلیلیں موجود ہیں۔ اگر کوئی کشمیری ہندوستان کی زبان کو بُرا بتائے یا کوئی ہندی نژاد اصفہان کی زبان کو ٹکسال باہر ٹھیرائے۔ تو کوئی عقلمند تسلیم کرے گا؟

اب رہی یہ بات کہ زبان کی عمدگی کن باتوں پر منحصر ہے۔ سو یہ ہم کیا تمام عالم کھلے خزانے کہہ رہا ہے۔ کہ زبان کی خوبی۔ اُس کی سلاست۔ عام فہمی۔ نرمی۔ موزونی چھوٹے چھوٹے الفاظ بڑے بڑے معنی پر موقوف ہے۔ جو لفظ جہاں چسپاں ہو وہیں نگینہ کی طرح جڑا ہو۔ بچّوں سے لے کر بوڑھوں تک کی سمجھ میں آجائے۔ سو یہ

سلہ اصل خرّاد زبان فارسی خراط بزبان عربی۔ مگر روزمرّہ بول چال میں خراد آتا ہے ۱۲۔

زبان زیادہ تر عورتوں کی زبان میں پائی جاتی ہے یا اُن لوگوں کی بول چال میں جنہوں نے اپنے ماں باپ کی روزمرّہ کو معیوب نہ سمجھ کر اُس کے چھوڑ دینے پر کمر نہ باندھی ہو۔ اپنی اصل پر خود بھی قائم رہے ہوں۔ اور زبان کو بھی جوں کا توں بنا رکھا ہو۔ اگرچہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جو لوگ اوروں کی زبان کی حرف گیری کرتے ہیں۔ وہ بھی گھر میں جا کر اپنے بال بچوں کے ساتھ گفتگو نہیں کرتے۔ جو باہر لوگوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ اُن کی تحریر میں بھی وہ لفّاظی۔ سجع بندی۔ قافیہ پیمائی۔ خود رائی پائی جاتی ہے۔ کہ جسے سُن کر خواہ مخواہ آدمی کی طبیعت اُلجھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کوئی بات بناوٹ۔ اور آورد سے خالی نہیں ہوتی۔ اور اُن کا کلام محض بے لطف اور بے اثر ہوتا ہے۔ خواہ مخواہ عربی فارسی کے غیر مستعمل لُغت ٹھونس ٹھونس کر بھر دیتے ہیں۔ اگر کوئی عبارت لکھنے بیٹھے تو دس بیس لُغت کی کتابیں آگے رکھ لیں۔ اور اپنی بے معنی علمیّت جتانے کو بڑے بڑے لفظ چُن کر اُس عبارت میں داخل کرتے چلے گئے۔ اور اُس کا نام زبان علمی رکھ لیا۔ عربی لفظوں کو اِس طرح بھرا کہ ایک ایک بات کے چار چار مترادف لکھ دیئے۔ اُن کی بلا سے کوئی اُس سے فائدہ اُٹھائے یا نہ اُٹھائے کسی نے اس عبارت کو مجذوب کی بڑ جانا۔ اور کسی نے بلائے جان سمجھا۔ اگر وہ اخبار ہے تو پڑیاں بندھیں اور اگر کتاب ہے تو لڑکوں نے پٹاخے بنائے۔

جس طرح زبان کی خوبی سلاست پر موقوف ہے۔ اِسی طرح اُس کی تکمیل ہر قسم کے الفاظ کی دستیابی اور کسی طرح کی روک نہ ہونے پر منحصر ہے۔ اگر ہم اپنے ملک کے سخت الفاظ سے پرہیز کریں۔ اور اُن کو اپنی زبان پر نہ آنے دیں۔ تو سخت کاموں کے واسطے کہاں سے لفظ لائیں گے۔ اور سخت آلات کا نام کن کن لفظوں سے دھریں گے۔ ایسے لفظوں سے پرہیز کرنا۔ زبان کو آئندہ ترقی سے باز رکھنا ہے۔ ہاں غیر زبان کے اُن لفظوں کا استعمال کرنا جو بالکل ہمارے کانوں سے جُدا زبان سے

ناآشنا ہوں کسی طرح کارآمد نہ ہوگا۔ بلکہ اگر وہ لفظ ہمارے قواعد ولہجہ کے موافق ڈھالے جائیں گے۔ تو بھی پورا پورا مطلب نکالنے پر قادر نہ ہوں گے۔ مگر پہلی صورت جب تک اپنی زبان سے کوئی لفظ بنایا جائے۔ اور اس کی کامل ترقی ہو کام نکالنے کے لئے اچھی ہے۔ پہلی صورت کے مصداق ہمارے ہندوستان میں اُس شہر کے لوگ ہیں جہاں کے نوکر چاکر تک جن کو آٹھ پہر اُن لوگوں سے کام پڑتا ہے۔ اپنے آقا کی بولی نہیں سمجھ سکتے۔ اُن کی زبان پر عربی فارسی کے وہ لفظ چڑھے ہوئے ہیں جو شاید امیروں کے سوا اور لوگ لکھنے میں بھی مستعمل نہ کرتے ہوں گے۔ اور وہ بھی لکھتے ہونگے۔ تو لغت سامنے رکھ کر۔

پُرانی زبان کو جو تنزّل ہُوا ہے۔ اُس کا بڑا سبب یہی ہے۔ کہ غیر مانوس الفاظ کا رواج پانا۔ دُوسرے مُلک کے ایسے لفظوں کو جن کا ثانی اپنے مُلک میں موجود ہو۔ داخل زبان کرنا سخت سخت مخارج کے لفظوں کو مُخربہ اپنی زبان پر چڑھانا عام لوگوں کی زبان کو پایۂ اعتبار سے گرانا سہل المخروج لفظوں کو خیال میں نہ لانا علیٰ ہذالقیاس۔ اَور بھی ایسے ہی باعث ہوئے ہیں۔ کہ جہاں کوئی کرخت اور سخت لفظ لوگوں کی زبان سے نہ نکلا۔ یا تو اُس کو بالکل ترک کر دیا۔ یا کچھ سے کچھ کر لیا۔ اَور زبان کے آسان لفظ دیکھ کر اپنی زبان میں ملالئے۔ سخت زبان صرف کتاب ہی میں دھری رہ گئی۔

ایک زمانہ ہوگا۔ کہ تمام ہندوستان میں سنسکرت پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ عرصہ بعد اُس سے ملتی جُلتی ایک اور زبان بولی جانے لگی۔ اُس کے بعد پراکرت کا جھنڈا قایم ہُوا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ بھاکا اور پھر اُردو زبان کا رواج ہو گیا۔ اَور قدیمی زبان ایسی گُم ہو گئی۔ جیسے عنقا۔ البتہ سنسکرت کے وُہ الفاظ جو ہماری زبان سے آسانی کے ساتھ نکل سکتے تھے۔ آج تک جوں کے توں قایم ہیں۔ اور جو الفاظ اس زمانے میں پنڈتوں کے سوا اور لوگوں کی زبان سے صاف ادا نہیں ہو

سکتے تھے۔ یا تو وہ صرف کتاب میں ہیں۔ یا اُنہوں نے کوئی اور صورت قبول کر لی ہے یعنی کہیں سے کوئی حرف گرا دیا۔ کہیں کسی حرف کو کسی حرف سے بدل دیا۔ اور اپنا مطلب نکال لیا۔

ایک ہی ملک میں ایک زبان کے ہوتے جو دوسری زبان کا رواج ہوجاتا ہے۔ اُس کا سبب بھی یہی ہوتا ہے۔ کہ پہلی زبان اپنی سختی کے باعث ناگوار گزرنے لگتی ہے۔ دیکھو سنسکرت کے زمانے میں پالی اور پراکرت نے اپنا جھنڈا اگاڑ ہی دیا۔ ژند و پاژند کے وقت میں دری کا نقشہ جم ہی گیا۔ عبرانی کے وقت میں عربی نکل ہی آئی۔ اسی طرح ہر ایک ملک میں ہوتا آیا ہے۔ اور اکثر سخت زبانوں کا یہی حال ہوتا ہے۔

(سیّد احمد دہلوی۔ مؤلف فرہنگ آصفیہ)

کالرٹائی

ایک بزرگ جو انگریزی لباس کے مخالف تھے۔ اس کی مذمت کرتے ہوئے ایک دن فرمانے لگے "صاحب! اور سب باتیں تو پھر بھی کچھ سمجھ میں آئیں۔ مگر نہ آئی تو یہ کالرٹائی۔ ایک پٹہ سا گلے میں باندھ لیا۔ اور ایک رنگین جھنجھڑا اس کے اوپر لپیٹ لیا۔ اور لگے اِترا اِترا کر چلنے۔ کون سی خوبی اس میں ہے۔ کہ انسان ہر وقت کا ایک عذاب مول لے۔ ہم اگر یہ پٹہ پہنیں تو ہماری گردن اکڑ جائے۔ اوّل تو اس میں خوبصورتی ہی کون سی ہے۔ اور اگر ہو بھی تو ایسی خوبصورتی کو کیا کریں۔ جو وبالِ جان بن جائے۔"

نئی وضع کے چند حامی بھی پاس بیٹھے تھے۔ اُنہوں نے مقابلے میں آستینیں چڑھائیں۔ اور کالرٹائی کی خوبیاں گنوانے لگے۔ معترض ایک تھے۔ اور جواب دینے والے تین چار۔ مگر بوڑھوں کی ہمّت کا کیا کہنا۔ بڑے میاں سب کا برابر جواب دیتے رہے۔ اور آخر اگر جیت کر نہیں اُٹھے۔ تو ہار کر بھی نہیں نکلے۔ برابر کا جوڑ رہا۔ اور وُہ خود تو یہی کہتے ہوئے گئے۔ اور یہ بھگوڑے ہمارے سامنے کیا ٹھہریں گے۔ اِن کے اچھّوں کو بھی بھگا کے چھوڑیں۔ بڑے آئے وہاں سے کالرباز ٹائی خاں بن کے۔ میں ان کو کیا گانٹھتا ہوں۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ اگر یہ اپنی حرکات سے باز آجائیں ورنہ وُہ ذلیل کردوں گا۔ کہ یاد رکھیں۔

بڑے میاں اور اِن نوجوانوں کا مباحثہ بہت دلچسپ تھا۔ اس لئے جتنا یاد

رہ گیا۔ قلم بند کر لیا گیا۔ ممکن ہے کسی زمانہ میں جب کالر اور ٹائی بحث کی حد سے نکل چلیں۔ اور ہندوستانی انہیں ردیا قبول کر چکیں۔ لوگ اس کو شوق سے پڑھیں۔ چونکہ بڑے میاں وضع قدیم کی حمایت کرتے تھے۔ اور نوجوان طرزِ جدید کے طرفدار تھے۔ اس لئے سہولت کے لئے ہم ایک فریق کو قدیم اور دوسرے کو جدید کہیں گے بڑے میاں کے مُنہ سے کالر کے لئے پٹہ کا لفظ نکلنا ہی تھا۔ کہ طرزِ نو کے دلدادہ بول اُٹھے۔

جدید۔ ذرا تہذیب سے گفتگو کیجئے۔ ہم آپ کو بزرگ سمجھ کر آپ کا لحاظ کرتے ہیں۔ اور آپ کی وضع قطع پر اعتراض نہیں کرتے۔ واللہ دیکھ کر ہنسی آتی ہے۔ آپ کے لباس کے ہر حصّے پر سو سو پھبتیاں ہو سکتی ہیں۔

قدیم۔ آپ کے ہاں خدا جانے تہذیب کسے کہتے ہیں۔ مَیں تو آپ کی تہذیب کا قائل نہیں۔ میں نے تو ایک بجا اعتراض کیا ہے۔ یہ جو سفید سا پٹہ آپ پہنے ہوئے ہیں اسے پٹہ نہ کہوں تو اور کیا کہوں۔ میں تو صاف سچا آدمی ہوں۔ جو آنکھ سے دیکھتا ہوں سو زبان سے کہتا ہوں۔

جدید۔ تو آپ نے کالر فرما دیا ہوتا۔ اسے پٹہ کہنا تو لڑائی مول لینا ہے۔

قدیم۔ مجھے اوّل تو آپ کے انگریزی الفاظ آتے کم ہیں۔ دوسرے مجھے اُن سے نفرت ہے۔ میری زبان تو وہی زبان ہے۔ جو میرے باپ دادا کی تھی۔ آپ کی طرح نہیں۔ کہ زبان تک بھی آمیزش غیر سے پاک نہیں۔ آپ ہی فرمائیے کہ میں نے کیا بُرا کیا۔ اگر کالر کی بجائے اپنی زبان کا لفظ بول دیا۔ جب آپ پٹے کے پہننے سے نہیں گھبراتے۔ تو اس کا نام سُننے سے کیوں گھبراتے ہیں۔

جدید۔ دیکھئے پھر وہی بات۔ آپ کی چھیڑ کی عادت نہیں جاتی۔ ہم کچھ کہہ بیٹھے تو بُرے بنیں گے۔ پٹہ کُتوں کے گلے میں ہوتا ہے۔ کہ انسان کے۔ چونکہ یہ لفظ

عام طور پر انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اِس لئے اِس مفید اور کارآمد چیز کو جو تہذیب انسانوں کے لباس کا جزو بن گئی ہے۔ اُردو میں کالر ہی کہتے ہیں۔ جہاں ریل ٹکٹ لمپ کمپ وغیرہ سینکڑوں الفاظ انگریزی سے آکر اُردو میں شامل ہو گئے ہیں۔ اِسی طرح یہ ہے۔ معمولی سے معمولی دُکان دار بھی جانتا ہے۔ کہ کالر کسے کہتے ہیں۔ اور پڑھے لکھے آدمی تو سب سمجھتے ہیں۔ ایک آپ ہیں۔ کہ جان بوجھ کر انجان بنے جاتے ہیں۔

قدیم۔ مَیں تو جان کر انجان نہیں بنتا۔ نہیں جانتا جبھی تو پوچھتا ہوں۔ کہ اِس "پٹہ" سے آپ خفا نہ ہوجئے "کالر" کے پہننے سے کیا فائدہ ہے۔

جدید۔ ہاں یہ ہم آپ کو بتا سکتے ہیں۔ آپ ذرا غور کریں تو آپ کو خود ہی معلوم ہو جائے کہ کالر کیسی کام کی چیز ہے۔ اس کے پہننے سے کوٹ کی حفاظت مقصود ہے۔ آپ اپنے چوغے کو تو دیکھئے گلے کے قریب کیسا مَیلا ہو رہا ہے۔ اور کتنا بدنما بن گیا ہے۔ ہمارے کوٹ کالر کی بدولت صاف رہتے ہیں۔ علاوہ اس کے کتنا خوشنما ہوتا ہے۔ اور چہرے کو کس قدر رُعب دار بناتا ہے۔

قدیم۔ رُعب کی بھی ایک ہی کہی۔ رُعب جیسا ہمارے اپنے لباس میں ہے۔ وُہ آپ کے لباس میں کبھی پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ ایک دلیل کوٹ کو صاف رکھنے کی آپ نے دی ہے۔ اِس کے جواب میں مَیں کئی دلائل خلاف دے سکتا ہوں۔

(۱) پہننے میں تکلیف۔ میں نے دیکھا ہے کہ آپ لوگ اکثر آئینے کے سامنے کھڑے گھنٹوں تک "کالر" سے کشتی لڑا کرتے ہیں۔

(۲) کالر ہر روز یا دوسرے دن بدلنے میں زاید مصارف کا بوجھ پڑتا ہے۔

(۳) گلے کے گرد ایک طوق سا باندھے رہنا اپنے آپ کو خواہ مخواہ سزا دینا ہے۔

جدید۔ دیکھئے! آپ کی زبان پھر بے لگام ہوئی۔ آپ سے کوئی شریف آدمی کیا

بحث کرسکتا ہے۔ آپ بغیر بڑے استعاروں کے بے جا استعمال کرنے کے بات ہی نہیں کرسکتے۔"طوق" کہنے والے آپ کون ہوتے ہیں۔ طوق ہوگا آپ کے گلے ہیں۔

قدیم۔ خدا جانے آج کل کے صاحبزادے نازک مزاج کتنے ہوگئے ہیں۔ ذرا سی بات پر جامے سے باہر ہوئے جاتے ہیں۔ مَیں نے تو آپ دانستہ چھیڑ نہ کی تھی۔ یُونہی بے ساختہ طوق کا لفظ مُنہ سے نِکل گیا۔ میرا مطلب طوقِ لعنت سے تو تھا نہیں جو آپ نے سمجھ لیا ہے۔ مگر اب جو تم کہلواتے ہو۔ تو صاف کیوں نہ کہہ دوں۔ ہیں اِسے طوقِ غلامی تو ضرور سمجھتا ہوں۔

جدید۔ خُدا کی شان۔ آپ بھی ہمیں غلامی کے طعنے دینے کے لائق ہوگئے۔ آپ کی عُمر غلامی ہیں گزری۔ پہلے آپ ایک ریاست کی غلامی کرتے رہے۔ اَب وہاں سے آئے۔ تو ہر حاکم کی غلامی کرتے ہیں۔ اِس پر آپ کی بسر اوقات ہے۔ صُبح ہوئی اَور آپ کسی نہ کسی حاکم کے دروازے پر موجود۔ اس کو وسیلۂ عزّت وآبرو بنا رکھا ہے۔ اس پر یہ حوصلہ کہ ہم جیسے آزادمنش لوگوں کو غلام کہو۔ ہم نے جو تعلیم پائی ہے وُہ غلامی کی نہیں۔ آزادی کی تعلیم ہے۔ ہم نہ کسی حاکم کے ہاں جاتے ہیں نہ محکوم کے ہاں۔ ہم نے اسی لئے سرکاری ملازمت کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ کہ اس ہیں آپ کی طرح غلامی نہ کرنی پڑے۔ ہم تو یہ جانتے ہیں۔ آزادی ہاتھ سے نہ جائے۔ چاہے کھانے کو ساری کی جگہ آدھی ہی ملے

قدیم۔ زیادہ شیخی نہ بگھاریئے۔ مجھے آپ کی حقیقت خوب معلوم ہے۔ جسے آپ نے آزادی سمجھ رکھا ہے۔ وُہ تو ناتجربہ کاروں کی آزادی ہے۔ جو شیخی ہیں آکر اپنا نقصان کر بیٹھتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ آزاد ہیں حالانکہ سخت پابند ہیں۔ کالہ یُوں ہوا اور ٹائی یوں۔ دوسروں کے رسم ورواج کی یہ پابندی اور اس پر

آزادی کے دعوے۔ آزاد ہم ہیں کہ خوشامد سے کام بھی نکال لیتے ہیں۔ اور اس پر طرزِ بود و باش میں اور خیالات ہی میں غیروں کے محکوم اور پیرو نہیں۔ آپ لوگ آزادی کے جھوٹے دعویدار ہیں۔ اور ہم فی الحقیقت آزاد۔

جدید۔ اس پابندی کا کیا ہے۔ ہم اگر نئے رواج کے پابند ہیں تو آپ پرانے کے۔ بلکہ ہم نے آزادی سے کام لیا پرانے رواج کو بدل دیا۔ آپ اس کے اس قدر محکوم ہیں کہ آپ کو جرأت نہیں کہ کوئی نئی چیز اختیار کریں۔ مگر یہ سب بحث تو دور از کار ہے۔ ہم نے آپ کو کالر کے استعمال کے فوائد بتائے۔ آپ سے جب جواب بن نہ پڑا۔ تو آپ گالیاں دینے لگے۔

قدیم۔ گالیاں دینا اپنا تو دستور نہیں آپ کا ہو تو ہو ہاں دب کے کبھی کسی سے رہے نہیں۔ جواب ترکی بہ ترکی دینا جانتے ہیں۔ کج بحثی تو آپ نے شروع کی کہ کالر کے فوائد سے غلامی اور آزادی کی بحث میں جا پڑے۔ مگر یہ فرمایئے۔ کہ کالر کا تو کچھ فائدہ آپ بتا بھی سکے۔ اس ٹائی کا کیا جواب پیدا کر دگے۔

جدید۔ اس کا نہایت معقول جواب ہمارے پاس ہے۔ بشرطیکہ آپ اُسے سمجھ سکیں۔ دُنیا میں ایک چیز ہے۔ جسے "حسن" کہتے ہیں۔ فطرتِ انسان اس کی ہر جگہ متلاشی رہتی ہے۔ آپ اسے نہایت محدود معنوں میں لیتے ہیں۔ ہم نہایت وسیع معنوں میں ٹائی کالر کا حُسن دوبالا کرتی ہے۔ کالر کے بٹن کو چھپاتی اور سارے لباس کی زینت کا باعث ہوتی ہے۔ کالر ہو اور گلے پر سے کھُلا ہُوا کوٹ ہو تو ٹائی پہننا ضرور ہے۔

قدیم۔ گویا آپ اسے ایک بے ضرورت چیز مانتے ہیں۔ جو صرف زینت کے لئے لگائی جاتی ہے۔ اوّل تو مردوں کو زینت سے کیا کام یہ عورتوں کا حصّہ ہے۔ اور دوسرے کس قدر صرفِ بے جا اس پر کیا جاتا ہے۔ آپ کہتے ہیں۔ کہ گلے

سے کھلے ہوئے کوٹ کے واسطے ٹائی ضروری ہے۔ میں کہتا ہوں ٹائی کی خاطر گلے سے کھلا ہوا کوٹ ایجاد کیا گیا ہے۔ ورنہ ہر طرح سے اس کا بند رہنا مفید تھا۔ اہلِ یورپ یوں تو مردانہ لباس میں سادگی کے دعویدار ہیں۔ لیکن اگر غور سے دیکھیں۔ تو انہوں نے اِس میں اتنے تکلفات بڑھائے ہیں۔ اور اسراف کے اِس قدر دروازے کھول دیئے ہیں کہ کوئی حد نہیں۔ میرے خیال میں کالر ٹائی سب فضول خرچی اور تضیع اوقات کے بہانے ہیں۔ آپ نے کہا ہے کالر کوٹ کو بچانے کے لئے پہنا جاتا ہے۔ اور ٹائی کالر کا بٹن چھپانے کو۔ میرا خیال ہے۔ کہ کالر کوٹ کو بچانے کے لئے پہننا فقط ایک بہانہ ہے۔ بلکہ میں نے اکثر دیکھا ہے۔ کہ کالر انگریزی لباس اختیار کرنے کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ پہلے کالر پہننا اور بند گلے کا کوٹ۔ اِس کے بعد دوسروں کے کوٹ کھلے گلے کے دیکھ کر ایک ویسا ہی کوٹ بنوا لیا۔ اب ٹائی کی راہ نکلی۔ جب یہ سب ہو لیا تو کسی نے کہا اِن کے ساتھ پتلون زیب دیتی ہے چلئے پتلون بن گئی۔ اس کے بعد ٹوپی کی کسر رہ گئی۔ سو ہیٹ صاحب پہننے لگے ہیں۔ ارے میاں اتنے بہانے کیوں کرتے ہو۔ کہہ دو کہ ہم انگریز بنے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مگر یہ ملحوظ رہے کہ وہ منہ بھی لگاتے ہیں یا نہیں۔

جدید۔ حضرت اُن کے منہ لگنے کی یہاں کسے غرض پڑی ہے۔ یہاں تو یہ ... ہے کہ اچھی بات ہو وہ جہاں ہو اخذ کر لو۔ ایک انگریزوں پہ کیا ... اس وقت مہذب دنیا کی سب قوموں کے لباس میں یہ چیز ... ہم نہیں چاہتے کہ ہم کسی سے پیچھے سمجھے جائیں محض اس لئے کہ ہم ان کے لباس کی خوبی کو نہیں پہنچتا۔ کالر کے فوائد آپ سن چکے ... چیز ہے کہ جو لوگ انگریزی لباس بھی نہیں پہنتے وہ بھی اسے اختیار

ہیں بمبئی کے سیٹھوں کو دیکھو کالر کے اوپر پرانی وضع کا بند گلے کا کوٹ یا چوغہ پہنتے ہیں جس سے کوٹ محفوظ رہتا ہے۔ ٹائی کو اگر محض سبب زینت بھی مان لیا جائے تو بھی جائز چیز ہے۔ یہ مسئلہ درست نہیں کہ مرد زینت سے بالکل مستغنی ہے۔ مرد عورت دونوں ایک دوسرے کو خوش کرنے کے لئے ایک دوسرے پر اچھا اثر ڈالنے کے لئے بناؤ سنگار کے محتاج ہیں۔ صرف کم و بیش کا فرق ہے مردوں کے سادہ لباس میں شوخ ٹائی کی زینت بادلوں میں قوس قزح کا رنگ ہوتا ہے۔ آپ ناحق ان چیزوں کی مذمت کرتے ہیں۔ زمانہ ان کے موافق ہے۔ آپ کیا مقابلہ کر سکیں گے۔ اپنے ہی ننھے سے صاحبزادے سے پوچھئے تو ٹائی کی فرمائش کرے گا۔ اُس وقت محبت پدری کے تقاضے سے فرمائش پوری کرنی پڑے گی۔ اور اُس کے بعد اپنی ہی نگاہ سے بنظر انصاف پوچھئے گا۔ کہ ٹائی کالر پر بندھی ہوئی بھلی معلوم ہوتی ہے یا نہیں؟ ویسے بُرا کہنے کو کیا ہے۔ کالر ٹائی تو کیا آپ سارے جہان کو بُرا کہہ لیں۔ ع

ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

قدیم۔ آپ کی اس تقریر سے ہمارے خیالات تو بدل سکتے نہیں۔ ہم دلیل کے قائل ہیں۔ مگر آپ جس مدرسے میں پڑھے ہیں۔ وہاں معلوم ہوتا ہے۔ کہ دلائل کی جگہ زبان درازی کی تعلیم ہوتی ہے۔

محمد اکرام

ٹوپی

آج کل جو بعض نہایت اہم مسئلے ہندوستان میں اہل الرائے حضرات کے رُو برو ہیں۔ اُن میں ایک یہ ٹوپی کا مسئلہ بھی شامل ہے۔ قانون رازداری، قانون اصلاحِ تعلیم، تقسیم بنگالہ، یہ سب ضروری بحث ہیں۔ مگر ٹوپی کسی سے کم نہیں۔ وُہ مسائل جو محدود حلقوں پر اثر رکھتے ہیں۔ لیکن اس کا اثر عام ہے ممکن ہے آپ نے نہ سُنا ہو کہ ٹوپی کا مسئلہ نہایت اہم خیال کیا جاتا ہے۔ مگر آپ کے نہ سُننے سے کچھ اس کی اہمیت میں فرق نہیں آتا۔ یہ سب مسئلوں کے سر پر ہے۔ اِسی کا آج کل راج ہے۔ پگڑی بے چاری اِس کے مقابلے میں گرگئی ہے۔ چند دوراندیش خیرخواہانِ مُلک جانتے ہیں۔ کہ ہندوستان کے لئے پگڑی ضروری ہے۔ خدا وُہ دن نہ دکھائے۔ کہ اِس کی پگڑی اُتر جائے۔ مگر لوگ انہیں دقیانوسی سمجھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں؎

کہ دستار جز پیچ بر پیچ نیست
بر عاقلاں جز کلہ ہیچ نیست

کیوں نہ ہو سعدی سے بھی خوب کام لیا۔ اگر آج شیخ شیرازی زندہ ہوتے تو داد دیتے۔ انہیں معلوم نہیں تھا۔ کہ گلستاں کے لئے بھی بعض اور کتابوں کی طرح تحریف کی ضرورت پڑے گی۔ غرض ٹوپی کی طرف داری میں ہر طرح کے ذرائع استعمال کئے جاتے ہیں۔ مگر ٹوپی ہے کہ عقدۂ لاینحل بنی ہوئی ہے۔ دانایانِ فرنگ نے مُدتیں ہوئیں اپنے ہاں اِس مسئلہ کو حل کرلیا۔ اور اپنے مُلک کی آب و ہَوا اور

ضروریات کے موافق ایک وضع ٹوپی کی قائم کر لی۔ اُس دن سے سارا یورپ ٹوپی پوش ہے۔ اگر تھوڑی تھوڑی تبدیلی مختلف ممالک کی ٹوپیوں کی وضع میں ہے۔ تو وہ جزوی اُصول سب جگہ ایک ہے۔ اس کا کام سر کو سردی سے بچانا اور آنکھوں کے سامنے سایہ رکھنا اور ان کو آفتاب کی شعاعوں سے بچانا ہے۔ گویا ٹوپی بھی حکمت ہے۔ معلوم نہیں یہ حکمت اِس ٹوپی کی جبلی ہے یا حکیموں کے سروں پر رہتے رہتے اِس میں سرایت کر گئی ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اہلِ فرنگ کی ٹوپی ہے۔ اور گو باعتبارِ صورتِ ظاہری وہ حُسن کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ مگر حُسن باطن سے خوب آراستہ ہے ترکوں نے بھی جو یورپ میں آباد ہیں۔ ٹوپی کے مسئلے سے عرصہ ہُوا فراغت پائی ہے۔ اُنہوں نے ایک رنگ اختیار کیا ہے۔ جو ساری قوم میں مقبول ہے وضع قطع تراش خراش میں ترکی ٹوپی جیسے فیشن باطر پوش بھی کہتے ہیں۔ ٹوپیوں میں ایسی ہی ممتاز ہے۔ جیسے ترک باعتبار جسم اور قویٰ کے انسانوں میں۔ اِس کا موزون سُرخ یا سیاہی مائل رنگ اِس کی نرم نرم بانات۔ اِس کی لچک۔ اِس کی سہولت اور سب سے بڑھ کر اس کا لٹکتا ہُوا پھُندنا۔ دلفریب ہیں۔ اور ترکوں کے سُرخ وسپید چہرے پر تو یہ وہ بہار دیتی ہے۔ کہ العظمتُ لِلّٰہ۔ مگر باعتبار فوائد کے یہ جہاں ایجاد ہوئی ہے۔ وہاں کے لئے موزوں ہو تو ہو۔ مگر ایسے مُلک کے لئے جس میں انتہا درجے کی گرمی یا انتہا درجے کی سردی پڑتی ہو۔ یا باری باری دونوں موسم آتے ہوں یہ ناقص ہے ایرانیوں کے ہاں بھی اپنا قومی شعار موجود ہے۔ اور ایک انداز خاص ٹوپی کا رائج ہے۔ مگر واہ رے ہندوستان اونٹ کی طرح کوئی کل بھی تو سیدھی نہیں۔ اہل مُلک کو نہ سر کا ہوش نہ پاؤں کی خبر۔ بنگالی ہیں کہ ننگے سر پھرتے ہیں۔ اور مدراسی ہیں کہ ننگے پاؤں۔ بنگالی اگر ٹوپی پہننے کا تکلف فرمائیں گے بھی تو برائے نام وہاں سے چلئے صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کو لیجئے گرمی ہو یا سردی

تمام پرانے لوگ ایک چھ ماشے کی ٹوپی پہنیں گے۔ جو ہوا سے اُڑ جائے۔ کوئی خاص تقریب ہوئی یا میلا ٹھیلا ہوا۔ تو لبس دار اوڑھنے لگے۔ اِس سے ترقی کی تو ملبے سنارے کی نوبت آئی۔ اب یہاں سے تفرقہ شروع ہوا۔ نئی پود کا لباس اور پرانی کا اور۔ پھر ایک تفریق ثانی۔ ہندوؤں کی اور ٹوپی مسلمانوں کی اور۔ پھر آگے مسلمانوں میں اور تفریق۔ ٹوپی وہ نیرنگی دکھاتی ہے۔ کہ اگر کسی بڑے مجمع یا میلے یا تماشے میں لوگوں کی تصویر لی جائے۔ اور ٹوپیوں کے جتنے نمونے وہاں موجود ہوں۔ اُن کو جمع کیا جائے۔ تو سینٹ لوئس کی آئندہ نمائش کے لئے ایک خاصہ محکمہ ٹوپیوں کا قائم ہو سکتا ہے۔
ہندوستان جیسے مُلک میں یہ توقع رکھنا کہ یہ نازک مسئلہ کبھی پوری طرح سے حل ہو گا۔ اور سارے اہلِ ہندوستان کے لباس میں یک رنگی آجائے گی۔ محال کی توقع رکھنا ہے۔ گو اِس میں شک نہیں کہ ایسی یک رنگی قومیت کے لئے ضروری ہے۔ مگر کم از کم یہ تو ہو۔ کہ ہندوؤں میں سب ایک ٹوپی پر اور مسلمانوں میں سب ایک ٹوپی پر رفتہ رفتہ سب متفق ہو جائیں مسلمانوں میں ترکی ٹوپی پھیلتی جاتی ہے۔ اور بمقابلہ اور نمونوں کے حق بھی رکھتی ہے۔ کہ پھیلے مگر ابھی وہ وقت دور ہے۔ کہ یہ عکسی طور پر سب کے سر پر نظر آئے۔ آپ اگر اس کی مشکلات سے آگاہ نہیں۔ تو لیجئے سنئے۔ بہت لوگ اِس کے دشمن ہیں بعض نازک دماغ ہیں جنہیں اِس ٹوپی سے نیچریت کی بُو آتی ہے بظاہر ٹوپی ایک بے زبان بے گناہ چیز ہے۔ مگر ہمارے مُلک میں آکر اسے خاص اثرات حاصل ہو گئے ہیں۔ یہ انسان کے دل کو بدل سکتی ہے عقائد میں خلل ڈال سکتی ہے۔ اسے پہنا اور نیچری ہونے کا تمغہ حاصل کیا۔ ایک حلقہ حکّام کا ایسا ہے۔ جو اِس ٹوپی کو بے وفا سمجھتا ہے۔ اور کہتا ہے اِس کی ظاہری سیدھی سادی صورت پر نہ جاؤ۔ اِس میں بڑی بڑی شرارتیں نہاں ہیں۔ اُن کا خیال ہے۔ کہ جس نے ترکی ٹوپی پہن لی وہ فوراً ترک ہی بن گیا۔ اور ترکوں سے اور اہلِ فرنگ سے چشمک کچھ آج سے نہیں۔ مگر باایں ہمہ یہ چپکے چپکے

دلوں میں گھر کرتی جاتی ہے۔ اور جہاں کئی اشخاص اِس کے روز افزوں استعمال کو گھبراہٹ سے دیکھتے ہیں۔ وہیں بہت سی نگاہیں ترکی ٹوپی کی طرف اُمیدوں کے ساتھ اُٹھتی ہیں۔ کہ یہ کچھ کر کے دکھائے گی۔ ترکی ٹوپی میں صرف ایک عجیب بات ہے۔ ذرا مسجد میں کم جاتی ہے۔ اور اگر جائے تو دوسری ٹوپیاں اور عمامے اِسے کم نگاہی سے دیکھتے ہیں لیکن اِس کی کامیابی اسی میں ہے۔ کہ یہ ہر مقام کی سیر کرے۔ یہی نہیں کہ صرف بڑے بڑے انگریزی طرز کے جلسوں کے سٹیج پر ہی اپنے پھندنے کی نمائش میں مصروف رہے یا صرف سینہ تان کے بیٹھنے والوں کے مجمع کی زیب ہو۔ بلکہ خانہائے خدا میں بھی پہنچے جن میں داخل ہونے والوں کے سر نیاز زمین پر دھرے رہتے ہیں۔

ہم ہی میں بعض لوگ ہیں جو انگریزی ٹوپی کے حسنِ باطنی اور فوائد پر مٹے ہوئے ہیں۔ اِس بات کی داد دینی پڑتی ہے۔ کہ وُہ صورت پرستی کے رہگذرِ عام سے نکل کر سیرت پرستی کی منزل خاص تک پہنچتے ہیں۔ مگر سب یکساں نہیں بعض صرف اِسی لئے وُہ ٹوپی پہننا چاہتے ہیں۔ کہ وُہ صاحب لوگوں میں شمار ہوں۔ یہ صورت پرستی کا ایک ادنےٰ نمونہ ہے۔ اور قابلِ حقارت۔ میں نے دیکھا۔ کہ ایسے صاحبوں کی بھاری بھرکم ہیٹ پر وُہ ہماری پُرانی دقیانوسی چھ ماشے کی ٹوپی بھی ہنستی ہے۔ اِسی طرح میں اُن شخصوں سے بمشکل متفق ہو سکتا ہوں جو انگریزی ٹوپی کو سفر میں پروانۂ راہداری بناتے ہیں۔ اِن کی ٹوپی گویا زمانہ ساز ٹوپی ہے۔ میں نے اکثر اپنے ہم وطنوں سے جنہیں اِس مُلک میں سیاحت کا اتفاق ہُوا ہے۔ سُنا ہے کہ آدمی اوّل یا دوم درجہ کی گاڑی میں سفر کرنے کے مصارف برداشت کر کے بھی آرام نہیں پا سکتا۔ تاوقتیکہ لباس سے کم از کم کرسٹان نہ معلوم ہو۔ اور اِس لئے وُہ بلا تامل سفر کو روانہ ہوتے وقت انگریزی ٹوپی سر پر رکھ لیتے ہیں۔ اِس میں شک نہیں۔ کہ انہیں اِس صورت میں ریل کے ملازموں سے کام لینے میں قدرے سہولت ہوتی ہے۔ اور اگر کوئی صاحب لوگ ہم سفر ہوں۔ تو اُن سے

بھی جھگڑے کا خطرہ کم ہوتا ہے۔ مگر اِس آسائش کی اُمید پر وُہ انگریزی ٹوپی کی عزّت بڑھاتے اور اپنی ذاتی اور قومی عزّت گھٹاتے ہیں۔ گویا اِس کے یہ معنے ہیں۔ کہ اُن کے وُہ معزّز بھائی جو اپنے مُلک کا لباس پہنتے ہیں۔ اَور جو اُس کے ساتھ اگر چاہیں بھی تو انگریزی ٹوپی بغیر مضحکہ اڑوانے کے نہیں پہن سکتے۔ ہمیشہ ریل کے سفر میں بے پروائی کی نظر سے دیکھے جائیں۔ اور وُہ صرف اپنی فوری ضرورت کے وقت کو ٹال لیں۔ وُہ عزّت کیا ہے جو آپ کو اِس لئے ملے۔ کہ دوسرا شخص آپ کو وُہ نہیں سمجھتا۔ جو آپ فی الحقیقت ہیں۔ بلکہ کسی اَور کے دھوکے میں آپ کی عزّت کرتا ہے۔ عزّت وُہ ہے جو آپ کی اپنی مستقل ٹوپی کی ہو۔ نہ کہ مانگی ہوئی عارضی ٹوپی کی۔ ہماری سعی یہ ہونی چاہیئے۔ کہ ہم متفقہ طور پر ایک ٹوپی پسند کریں۔ اَور اُسے اپنا مُلکی اَور قومی شعار بنائیں۔ جس سے جہاں چاہیں پہچانے جاسکیں۔ اَور پھر اِس کوشش میں ہمہ تن مصروف ہوں۔ کہ وُہ ٹوپی اتنی قابلِ عزّت و وقعت ہو جائے کہ جو اُسے دیکھے پُکار اُٹھے۔ کہ یہ ایک معزّز قوم کا فرد آرہا ہے۔ ٹوپی مشرقی ممالک میں ایک نشانِ عزّت ہے۔ اِسے پُوری طرح معزّز بنانا چاہیئے۔

محمد اکرام

نوٹ:۔ ترکی ٹوپی کو ترکوں نے تو نکال ہیٹ اختیار کرلی۔ اب دیکھیں ہندوستان والے کیسے پسند کریں۔

دستار

ٹوپی پر جو مضمون لکھا جاچکا ہے۔ اِسے پڑھ کر ایک نقادِ سخن نے یہ رائے لکھی ہے۔ بہت سی ٹوپیاں ملاحظہ سے رہ گئیں۔ عمامے پر بھی نظر ہونی چاہیئے تھی" بے شک کئی ٹوپیاں ابھی منتظرِ توجہ ہیں۔ اور کیا عجب ہے۔ کہ اُن کی پرسش کا بھی کوئی دن آجائے۔ سرِ دست دستار سے دو دو باتیں ہوجائیں۔ خُدا جانے الفاظ میں تاثیر کہاں سے آجاتی ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ اِس سے آگاہ نہ ہوں۔ لیکن میرا یہ ایمان ہے کہ بعض لفظ بنے ہی ایسے ہوتے ہیں۔ کہ معزّز معلوم ہوں۔ اور بعض ایسے خفیف ہوتے ہیں۔ کہ نظر میں نہ جچیں۔ شاید کوئی صاحب کہیں کہ محض پُرانے اور دیر سے دل نشین شدہ خیالات سے کہتے ہو۔ مگر میرے ذہن میں لفظ دستار باوجود زمانہ کی ناقدر شناسی کے کانوں کو معزّز معلوم ہوتا ہے۔ اور ٹوپی باوجودیکہ قبول عام کا طرّہ اِس کے سر پر ہے۔ کچھ ہلکی سی چیز نظر آتی ہے۔ دستار کسی زبان میں اِس کا نام لو۔ ایک متانت اور ثقاہت کا بوجھ سنبھالے ہوئے معلوم ہوتی ہے پگڑی ہی دیکھیئے۔ تعدادِ حروف اور وزن تو وہی ہے جو ٹوپی کا۔ مگر اس سے کسی قدر بھاری بھر کم ہے۔ اِس کے تلفّظ میں بھی ایک قسم کی گرانی ہے۔ اور یہ گرانی کچھ لفظی ہی نہیں۔ قیمت میں بھی پگڑی ٹوپی سے گراں قدر ہے۔ ململ کی سادہ یا بیلدار ٹوپی چند آنوں میں ملے۔ تو پگڑی چند روپیوں میں۔ ٹوپی اگر طلائی کام کی۔ یا سلمے کی یا لَیس دار لو تو معمولی پانچ سات روپے میں۔ لیکن پگڑی اگر ریشمی یا زرکار یا اور

کسی طرح کے تکلف والی ڈھونڈو۔ تو بیس روپے سے لے کر سو روپیہ تک کی۔ کسی با مذاق آدمی کے سامنے اِس کا عربی نام لیجئے "عمامہ"۔ دیکھئے کتنی وقعت اُس کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اوّل تو عمامہ خود معتبر چیز ہے۔ دوسرے معتبروں کی صحبت میں معتبر بن گیا ہے۔ جب اِس کا ذکر سُنو کسی بزرگ کے نام کے ساتھ آتا ہے۔ کچھ نہ ہو تو زاہد یا شیخ گویا اُن کے ساتھ مخصوص ہو گیا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں ؎

دیکھنا محفلِ رنداں میں نہ آنا اے شیخ
یہ وہ محفل ہے کہ عمّامہ اُچھل جاتا ہے

اِس شعر سے دو مطلب نکلتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ شیخ صاحبِ عمّامہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اِس کے نزدیک عمّامہ عزیز ترین مقبوضاتِ ذاتی ہے جس کے متعلق خوف دلانے سے گویا اس کے شریکِ محفل ہونے کا احتمال بھی نہیں رہے گا۔ اِسی طرح ایک اور رند مشرب حضرت فارسی میں فرماتے ہیں ؎

در کوئے مغاں زاہد رہِ نیست تکلف را
گیرم کہ تو گنجیدی عمّامہ نمے گنجد

یہاں عمّامہ زاہد کی مِلک قرار دیا گیا ہے۔ اور اِس کا رُعب اِس درجہ ہے۔ کہ مجمعِ رنداں اِس سے گھبراتا ہے۔ اور اِس لئے چاہتا ہے۔ کہ عمّامہ اُن کے تخلیہ میں خلل انداز نہ ہو۔ اور اُس کو ایک ایسی بڑی چیز قرار دیتا ہے۔ کہ خود زاہد سما جائے۔ تو سما جائے مگر عمّامہ کے لئے گنجائش کہاں ؟ دستار کی فضیلت اِس سے ظاہر ہے۔ کہ دستارِ فضیلت کا ایک جزو ہے۔ پگڑی کی توقیر میں اتنا کہنا کافی ہے کہ اب تک ہمارے دیہات میں سر پر پگڑی ہونا سرداری کی علامت ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ بعض پرانے توہمات اور قدیم رواج ہیں۔ بلکہ ٹوپی پوش حکمران خود پگڑی کے قدر دان ہیں عدالتوں اور دفاتر سارے کا ایک ان لکھا قانون ہے۔ کہ لوگ پگڑی باندھ کر آئیں۔ کلکتہ میں بنگالی

ک جو ٹوپی اور پگڑی دونوں کی قید سے آزاد ہیں۔ اور قدرت کی بنائی ہوئی کھوپری اور
س پر روغن ناریل سے تربتر کنگھی کئے ہوئے بالوں کو کافی زینت سمجھتے ہیں عدالت
ں کرسی پر بیٹھتے وقت ایک گول سی بندھی بندھائی پگڑی سر پر دھر لیتے ہیں۔ وہی
شان محکومت ہے۔ اور وہی تمغائے لیاقت۔ گھر گئے اور پگڑی اُتار کر رکھ دی۔ گویا
لمی یا منصفی سے سبکدوش ہوئے۔ اور گھر پر سیدھے سادھے نرے پُرے بنگالی بن کے
رام اور بے فکری سے بیٹھ گئے۔ ادھر صوبجات متحدہ کی جانب چلے آیئے۔ اور دیکھیں گے
ہ پنڈت جی ہیں۔ تو اپنی گھٹی ہوئی پگڑی پر نازاں ہیں۔ اور سیٹھ جی مہاراج کو اگر کوئی چیز
ماشنوں۔ دلالوں اور عام بیوپاریوں سے ممتاز کرتی ہے۔ تو گلابی رنگ کی ایک ذرا
سی پگڑی ہے۔ جسے قالبوت پر رکھ کر باندھنے رہنا بعض غریب لوگوں کا ذریعہ معاش
ہے۔ اور صاحب کا تو کیا ہی کہنا۔ اُن کا عمّامہ تو مولویت کا ایک جزو ضروری ہے جنوب
ہو یا شمال۔ ہند ہو یا سندھ کشمیر ہو یا میسور۔ مولوی صاحب کا عمّامہ موجود ہے۔
تھوڑے تھوڑے فرق سے یہ دو شعر اکثر مولوی صاحبان کے لئے موزوں معلوم ہوتے
ہیں سہ

دنیا جاروب سر خاک ہے جامہ اُن کا — چھتریاں سر پر لگائے ہے عمّامہ اُنکا
سر پہ دستار فضیلت کی بہت بھاری ہے — پیٹ اُن کا تو کتب خانہ کی الماری ہے

جنوبی ہندوستان کو دیکھو۔ تو اہل مدراس نے پگڑی کی قدر پہچانی ہے یعنی اس
درجے تک کہ جُوتے کو بھی اتار پھینکا ہے۔ عجب مزا آتا ہے جب کسی پُرانے ڈھنگ
کے مدراسی کو دیکھیں۔ کوٹ بھی ہے۔ پتلون بھی کالر بھی۔ سر پر دوپٹہ بنارسی تیس چالیس
روپیہ کا بندھا ہُوا ہے۔ مگر پاؤں پر نظر ڈالو تو جرابوں کے تکلّف سے بھی فارغ ہیں۔
اچھے اچھے معزز ننگے پاؤں ریت پر یوں دوڑتے پھرتے ہیں۔ کہ دیکھنے سے تعلق
رکھتا ہے۔ اہل بمبئی کا تو کیا کہنا۔ اُنہوں نے تو عمامہ کو اپنی اصلی خوبی کے ساتھ قائم

رکھا ہے۔ مرہٹوں کی پگڑی بھی ایک خاص بانکپن رکھتی ہے۔ گو اس کے نیچے منڈے ہوئے سر کی نمائش اسے کسی قدر بدزیب بنا دیتی ہے۔ مگر بمبئی کے مسلمانوں کی خوبصورت عبائیں اُن پر لمبی لمبی قبائیں اور سروں پر خوشنما اور قیمتی عربی عمامے اِن کے تموّل اعتبار اور اعزاز کی مجازی علامتیں ہیں۔ کاش یہ عمّامے ساتھ علمی فضیلت بھی لئے ہوتے۔ پھر تو ہم مسلمانانِ بمبئی کو دوسرے مقامات کے لوگوں کے لئے نمونے کے طور پر پیش کر دیتے۔ پارسیوں کا لباسِ سر بھی درحقیقت ایک قسم کی بندھی بندھائی پگڑی ہے۔ اور وہ اس قدر بلند۔ دبیز اور مضبوط ہوتی ہے۔ کہ زبانِ حال سے یہ کہتی ہے۔ کہ اِس زمانہ میں ہندوستان کی قوموں کی لاج اسی پگڑی نے رکھی ہے۔ وسطِ ہند اور راجپوتانہ کی ریاستوں میں آئیں تو پگڑی ایک سپاہیانہ ٹھاٹھ بدلتی ہے۔ تصویریں ہوں تو دکھائیں۔ کہ فوجی جوان کس آن بان سے پیچدار دوپٹے زیبِ سر کرکے اِتراتے پھرتے ہیں۔ کلاہی کی بجائے کچھ دستاری سے کام لیا ہے۔ ایک طرف پگڑی کے پیچ کان سے دور اُوپر کی طرف بھاگے جاتے ہیں۔ ایک طرف پہاڑ کی چوٹی ہے۔ تو دوسری طرف وادی۔ غرض پگڑی کیا ہے نشیب و فراز عالم کی تصویر ہے۔ اِس پگڑی میں ایک چیز اور ہے۔ جس کے دکھانے سے عکسی تصویر بھی قاصر ہے۔ یعنی اس کے خوشنما رنگ معلوم ہوتا ہے۔ وردی میجر صاحب نے قوسِ قزح آسمان سے چھین کر سر پر لپیٹ لی ہے۔

یوں تو ہندوستان کے ہر حصّے میں دستار کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ مگر ہمارا پنجاب تو اِس کا گھر ہے۔ یہاں اس کی بن آئی ہے جتنی بڑی ہو اُتنے ہی آپ امیر اُتنے ہی آپ معتبر۔ چھوٹی سی پگڑی باندھ کر کوئی باہر نکلے تو کہتے ہیں۔ ارے میاں یہ کیا لنگوٹی سی سر پر باندھ رکھی ہے۔ بہاول پور۔ ملتان۔ ڈیرہ جات۔ اِن اطراف میں تو پورا تھان سر پر دھر لیتے ہیں۔ اور اس پر بھی قانع نہیں۔ اگر اور بڑے تھان ولایت سے بن کر آنے لگیں تو اس نواح میں بڑے گاہک ہیں۔ مگر پگڑیوں میں ایک

خوبی ہے۔ اُن کے پیچ ایسے عجیب ہوتے ہیں۔ کہ گویا بے قاعدگی لپٹی ہوئی ہے۔ بظاہر کوئی کدھر گیا ہے اور کوئی کدھر۔ اور ایک شخص کی بندش دوسرے سے نہیں ملتی۔ پیچ دیوانے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر اُن کی دیوانگی میں بھی ایک "ترتیب" ہوتی ہے۔ بڑے شہروں میں اور خصوصاً پنجاب کی ریاستوں کے دارالخلافوں میں رنگارنگ کی پگڑیاں عجب بہار دکھاتی ہیں۔ سرحد پنجاب پگڑی کو زیادہ وزن دار بنانے کے لئے ایک خاصہ بوجھل کُلاہ (جو چھوٹے پیمانے پر ایک مصر کا مینار ہوتا ہے مخروطی) جو جزو دستار قرار دیا گیا ہے۔ اور اس کی ساخت میں بہت محنت صرف کی جاتی ہے۔ اِس زمانہ میں زندگی کے مختلف صیغوں میں دستار کی ناموری بڑھ چلی ہے۔ کیا ہُوا اگر بنگالہ کے لوگ سر سے اُتار کر پھینکنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ اور بمبئی مدراس والے دستار وقتِ ضرورت پہنتے ہیں۔ جب تک پنجاب کے دم میں دم ہے۔ پگڑی کا بھرم کھلنے نہیں پائے گا۔ بلکہ اور لوگ بھی اِس کا دم بھرنے لگیں۔ تو عجب نہیں۔ کیا انہیں معلوم نہیں۔ کہ پنجاب میں سب سے زیادہ خصوصیت اِسے سکھوں کی قوم سے ہے۔ (اُن کے لمبے بال کسی اور لباس میں سے چھپائے ہی نہیں جا سکتے) اور سرکار دولت مدار کی نظر میں سب سے منظورِ نظر قوم اِس وقت سکھوں کی ہے۔ جو دستار کی فضیلت سے اب تک منکر تھے۔ اور اِس کی بزرگی میں شک رکھتے تھے۔ اِن کے لئے یہ دلیل قطعی ہو چکی ہے۔ کہ سکھوں کے سر پر پگڑی ہے۔ اور اس پگڑی پر لاٹ کرزن بہادر کا ہاتھ ہے۔

محمد اکرام

اگر میں صحرا نشیں ہوتا

اگر میں صحرا نشین ہوتا، تو طلوع و غروب آفتاب کے نظارے سے ہر روز متاثر ہو جاتا۔ چاندنی رات کو میں دیکھتا۔ کہ چاند اور ستارے زمین کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہے ہیں، اندھیری رات میں تمام عالم کی تاریکی اور ہر چیز کی خاموشی مجھ پر اثر کرتی اور میں اپنے دل میں عمیق جذبات محسوس کرتا۔ میں کسی وادی میں گذر رہا ہوتا پُر فضا گھاٹی کے پھول، اور ان پھولوں کو دیکھ دیکھ کر رنگین اور لطیف گانے والی بلبل، ہلکی آواز سے گرنے والے آبشار مجھے گھنٹوں حیرت زدہ رکھتے۔ اور میں پُر مسرت زندگی بسر کرتا۔

مگر شہر نشین ہوں، اور کیا دیکھتا ہوں؟ ایک غریب مزدور کا لڑکا سڑک سے گزر رہا ہے، ایک عالیشان محل کے سامنے (جس میں عیش و تنعم و گناہ کے سوا کچھ نہیں) کھڑا ہو جاتا ہے، کھڑکیوں کو کھڑا گِن رہا ہے۔ اور یوں اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔ آگے، ایک بڑی پُر رونق دُکان کے سامنے کھڑا حسرت سے مُنہ میں پانی بھر بھر آتا ہے، لیکن وُہ خرید نہیں سکتا۔

ایک بے والی، وارث لڑکی کو دیکھتا ہوں، اور سوچتا ہوں کہ اُس کا تبسم معصوم، ایک بوسۂ ناجائز پر (جس کے ساتھ اس کا پیٹ بھرنے کے لئے کچھ پیسے دیئے جائیں گے) قربان ہو جائے گا۔

پھر ایک شرابی سامنے سے گزرتا ہے، جس کی قوت معنویہ سب محو ہو چکی ہے۔

جو جان جان کر زہر پی رہا ہے۔

پھر ایک چور پر نظر پڑتی ہے جسے فلاکت و حاجت کے کوڑے نے چوری پر مجبور کیا، اور جسے، اوروں کو عبرت دلانے، اور اُسے آئندہ چوری سے باز رکھنے کے لئے، زندان کو لئے جا رہے ہیں! گویا فلاکت و حاجت زندان سے ڈرتی ہے!

ایک متعفن اور گھنی بیماری میں مبتلا فقیر کو دیکھتا ہوں، اور دیکھتا ہوں، کہ ایک مشیّن امیر، بھڑک دار فٹن میں بیٹھا ہُوا اِدھر اُدھر سے گزرتا ہے۔ اور اس فقیر کو دیکھ کر تنفر سے مُنہ پھیر لیتا ہے۔

آہ! شہر نشین ہوں، روتا ہوں اور کہتا ہوں۔

اے مایوس دلو، اے مدفن رہگزارو! تمہارا خیال مجھے رُلاتا ہے، تمہیں سوچتا ہوں۔ اور تم پر دل کڑھاتا ہوں جیسا میرا مایوس دل ہے۔ ایسے کتنے ہو چکے ہیں، اور کتنے اس وقت ہیں! شاید، پہلے اتنے دل خون نہ ہوتے ہوں گے، مگر اب؟ اب تو مجھے ہر جگہ سینہ چاکی، دل شکستگی نظر آتی ہے۔

دھڑک، دھڑک اے قلبِ یاس بنیاد! اپنے لئے، اپنے جیسے لاکھوں مصیبت زدہ دلوں کے لئے دھڑک ٹکڑے ٹکڑے ہو جا، جا، جا دور ہو جا، تیرا وجود میرے لئے بارِ گراں ہے، تو سزا رہے۔

سجّاد حیدر (از بغداد)

طوفانِ نوح

بعض الفاظ میں کچھ ایسا چلتا جادو ہوتا ہے۔ کہ زبان سے نکلتے ہی دلوں کو مسخر کر لیتا ہے۔ اور نظروں کے سامنے زمانہائے گذشتہ کا مرقع لاکر حاضر کر دیتا ہے۔ جو الفاظ زیب عنوان ہیں۔ ایک تاریخی واقعہ کی یاد دلاکر بدن پر رونگٹے کھڑے کر رہے ہیں۔ آہ! تاریخی واقعہ بھی کیسا عبرت ناک اور جگر خراش جس کے بالین پر حسرت و یاس کی گھنگھور گھٹائیں تلی کھڑی ہیں۔ اور جن کے سایہ میں زمانہ ماضی کھڑا ہؤا ڈاڑھیں مار مار کر فاتحہ خوانی کر رہا ہے۔ آؤ! قوتِ متخیلہ کی مقراض سے صدیوں کے گریبان کو چاک کریں۔ اور دیکھیں کہ اِس واقعہ کی ابتدا کیونکر ہوئی اور انجام کیا ہؤا۔

ایک جلیل القدر روحانی ڈاکٹر اپنی قوم کو امراضِ مہلکہ اور مزمنہ میں گرفتار پاتا ہے۔ اور اُن کی ردّی حالت دیکھ دیکھ کر کُڑھ رہا ہے۔ دفعیہ امراض کے لئے نسخوں پر نسخے تجویز کر رہا ہے۔ مگر قوم آہ! بدنصیب قوم بادۂ فناء میں سرشار جامِ بقا پینے سے انکار کر رہی ہے۔ تازیانۂ قہرِ خدا کا خوف دلاتا ہے۔ اور نہیں مانتی۔ عذاب آخرت کا فوٹو کھینچ کھینچ کر دکھا رہا ہے۔ اور مطلق پرواہ نہیں کرتی۔ خوشامد کرتا ہے۔ اور قوم ہنس ہنس کر ٹال دیتی ہے۔ لعنت ملامت سے کام لیتا ہے۔ اور قوم کانوں میں تیل ڈالے بیٹھی ہے۔ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَعَلٰی سَمْعِھِمْ وَعَلٰی اَبْصَارِھِمْ غِشَاوَۃٌ وَّلَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۔ آخر علاج کرتا کرتا مایوس ہو جاتا ہے

اَور بارگاہ قاضی الحاجات میں اس طرح مناجات کرتا ہے۔ بار الٰہا! ہماری قوم کی حالت سقیم ہے، اے معبودِ حقیقی گواہ رہ۔ کہ میں نے تبلیغِ احکام میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ اب اس قوم کی شقاوت اَور ضلالت دیکھی نہیں جاتی اے قہار اپنا قہر اِس قوم پر نازل کرتا کہ یہ بھی اپنے کئے کا مزا چکھے۔

دُعا قبول ہوئی پانی چڑھتا چلا آتا ہے۔ دریا پھیل پھیل کر جھیلوں سے جا ملے۔ جھیلیں اُبل اُبل کر سمندر سے ہم کنار ہوگئیں۔ سمندر نے بھی ہاتھ پاؤں نکالنے شروع کر دیئے۔ سرسبز میدانوں کو تاخت و تاراج کرتا۔ اس قومِ سیاہ کار کا تعاقب کئے چلا جا رہا ہے۔ اِن بدبختوں نے زمین پر کوئی جائے امن نہ پائی۔ تو پہاڑوں کی راہ اختیار کی۔ جہاں درندے اِن سے پہلے ہی سہمے ہوئے کھڑے ہیں۔ اَور کچھ ایسے حواس باختہ ہیں کہ اُن کی طرف نظر اُٹھا کر نہیں دیکھتے۔ پانی ہے کہ برابر اُٹھا چلا آ رہا ہے۔ انسان حیوان سب اپنی اپنی جانوں کو بچانے کے لئے اُوپر چڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اب موقع بہت نازک آ پہنچا اجل سروں پر منڈلا رہی ہے۔ چپّہ چپّہ جگہ پر انسانوں اَور حیوانوں میں کشت و خون ہو رہا ہے۔ اب تمام مکانات درخت ٹیلے اَور پہاڑیاں غرق ہو چکے۔ صرف بلند پہاڑوں کی خال خال چوٹیاں سطحِ آب سے کسی قدر بلند نظر آتی ہیں۔ بدلی چمک رہی ہے بادل برابر گرج رہا ہے مینہ ہے کہ موسلا دھار برسے چلا جاتا ہے۔ سمندر اچھل اچھل کر خانماں خرابوں کا شکار کئے جا رہا ہے۔ لو غضب ہو گیا۔ اب تو اُن سر بفلک چوٹیوں پر بھی پانی پھر گیا۔ کہاں ہیں کوہِ اطلس کی بلند چوٹیاں کہاں ہیں کوہِ انڈیز اور کوہ ہمالیہ کے عالی شان پہاڑ۔ جو نہایت نخوت سے اپنے سروں کو بلند کئے کھڑے تھے۔

اَب پانی کا چڑھنا بند ہو گیا۔ سمندر احکامِ ایزدی کی تعمیل کر چکا جس طرف نظر اُٹھا کر دیکھو ایک بحرِ ناپیدا کنار ہے۔ کہ سائیں سائیں کر رہا ہے۔ موالیدِ ثلاثہ میں سے

کوئی اِس عظیم الشان بربادی پر آنسو بہانے والا نہ رہا۔ سمندر کی لہریں تمام دُنیا کا چکر لگا رہی ہیں۔ اَور کوئی سدِ راہ نہیں پاتیں۔ اِس خوفناک سین کو دیکھ دیکھ کر ہمارے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوئے جاتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچّوں اور ننھے ننھے شیر خواروں کی لاشیں پانی پر بہتی چلی جا رہی ہیں۔ جن کی بھولی بھولی صورتیں دیکھ دیکھ کر کلیجہ مُنہ کو آتا ہے۔ آہ! یہ ننھا سا بچہ جس پر معصومیّت کھڑی رو رہی ہے۔ کِن کِن نازوں کا پلا ہُوا ہوگا۔ اِن جھنڈولے بالوں کو جو سطحِ سمندر پر پریشان ہو رہے ہیں کس پیار سے اِس کی ماں سُلجھاتی ہوگی۔ یہ حسرت و یاس کی تصویر مُنہ میں انگوٹھے لئے خویش و اقارب سے دُور دُنیا و مافیہا سے بے خبر جانِ شیریں موت کے حوالے کئے موجوں کے گہوارے میں جھولتا چلا جا رہا ہے۔ اے خدائے بزرگ و برتر کہاں ہے تیرا رحم۔ کیا تیرا قہر تیرے رحم پر غالب ہے۔ نہیں نہیں ہرگز نہیں۔ پھر تیرے رحم کو ہم کہاں تلاش کریں؟

دیکھو وُہ کشتی جس کا ناخدا نظر نہیں آتا۔ جس کو ملائکہ مقرّبین کھے رہے ہیں۔ اَور جس پر رحمتِ ایزدی اپنا سایہ ڈالے ہوئے ہے۔ موجوں کی تاریکی کو چیرتی پھاڑتی کس شان و شوکت کے ساتھ اِس بحرِ مَوّاج پر سوار موجوں کے گھونگٹ میں اُڑی چلی آ رہی ہے۔ اِس سے زیادہ قیمتی مال کسی جہاز میں آج تک نہیں لادا گیا۔ اَور نہ آئندہ لادا جائیگا۔ دینِ حق کے رہنما آئندہ نسلوں کے باوا آدم اِس پر سوار ہیں۔ اِس خوفناک وحشت کے سین کو طے کرتی کشتی فرّاٹے بھرتی چلی جا رہی ہے۔ کہ یکا یک پیندے سے رگڑ کی آواز پیدا ہوئی۔ اُس آواز کو سُنتے ہی کشتی کا دروازہ کُھلتا ہے۔ اور اِس میں سے یکے بعد دیگرے اِس کشتی کے راکب باہر آ کر سرِ عجز خاکِ نیاز پر رکھ کر اُس ذاتِ پاک کا شکر بجا لاتے ہیں۔ جس نے اپنی رحمتِ کاملہ سے اُن کو اِس طوفانِ عظیم سے نجات دی۔

سیّد شریف حسین

دوست کا خط

تو پیارے دوست کا خط ہے! تجھ میں وہ کون سی برقی شے بھری ہے جو میرے دل کو دھڑکاتی ہے، تجھے کھولتے وقت ہاتھ کیوں کانپنے لگتے ہیں۔ آخر تجھ میں اور کاغذوں سے کیا برتری ہے؟ تو بھی کاغذ کا ٹکڑا، وہ بھی کاغذ کے ٹکڑے، بلکہ وہ تجھ سے زیادہ بڑے ہیں۔ ہاں، باعث تفاخر و تفوق یہی ہے، کہ دوست نے تجھے لکھا۔ لبِ پان خوردہ سے، اُف، لبِ پان خوردہ سے لفافہ بند کیا؟ بے شک بے شک، یہ بہت بڑا تفوق ہے اچھا، میں تیرا امتحان لیتا ہوں۔ تجھے نمبر دیتا ہوں سو میں دیکھوں تجھے کتنے نمبر ملتے ہیں۔

اُن کے ہاتھوں سے چھوئے جانے کے ۴۰

اِس بات کے کہ دستۂ کاغذ میں سے تجھے ہی منتخب کیا ۵۰

اُن لبوں نے لفافہ کو بند کیا ۷۰

۱۶۰

ہیں! تو نے سو سے زیادہ نمبر پائے۔ نہیں یہ امتحان ٹھیک نہیں ہُوا، دوسرے طریقے سے شمار ہونا چاہیئے۔

اِس بات کے کہ تجھے میرے لئے منتخب کیا۔ اور کسی دوسرے کے لئے نہیں منتخب کیا۔ ۶۰

اِس بات کے کہ اُن کے قلم کی تحریر تجھ پر ہے ۴۰

اِس بات کے کہ اُن کے چہرے کا عکس تجھ پر پڑا، کیونکہ وہ فرماتے ہیں۔ کہ یہ

خطرات کو لکھا ہے۔
۵۰
کیا؟ پھر سو سے زیادہ ہوگئے، یہ ٹھیک نہیں۔ اچھا تیسری بار پھر امتحان۔ ۱۲۰
اِس بات کے کہ تو اُن کے مژدۂ صحت و خوشنودیٔ مزاج
کی خبر لایا۔ ۸۰
اِس بات کے کہ تجھے چاک کر دینے کا حکم ہے۔ ۱۰۰
یہ کیا؟ نمبر تو سو سے پھر بڑھ گئے۔
نہیں نہیں! میں بے فائدہ کوشش نہیں کرنے کا۔ تو امتحان سے بالا، موازنہ سے اعلیٰ، قیدِ مقابلہ و مقالمہ سے آزاد، پیارے دوست کا پیارا، پیارا، ہائے میں کیسے ظاہر کروں۔ کتنا پیارا خط ہے تو سینہ سے لگایا جائے گا۔ تو نظرِ اغیار سے بچایا جائے گا، (مگر حاشا) تو چاک نہیں کیا جائے گا۔ تو میرے پاس محفوظ رہے گا۔ اور میں ہزاروں مرتبہ تجھے تنہا گوشوں میں پڑھونگا۔

سجاد حیدر

احسان اور محبّت

احسان اگر مناسب طریقے پر کیا جاوے۔ تو زندگی میں ہر قسم کے بیرونی مفاد کا موجب ہو سکتا ہے۔ البتہ ہماری محبّت اُن کے دلوں میں پیدا نہیں کر سکتا۔ جن سے اس زندگی میں ہمیں واسطہ پڑتا ہے۔ احسان ہماری قدر و منزلت کا باعث ہو سکتا ہے۔ اور اکثر لوگوں کو ہمارے ساتھ ایسے سلوک پر آمادہ کر سکتا ہے۔ جو سچّی محبّت سے بہت کچھ مشابہ ہو۔ مگر حقیقی محبّت کا منبت دل ہے۔ جو خودرو ہوتی ہے۔ نہ کسی درجے کی سخاوت اُسے پیدا کر سکتی ہے۔ نہ قیمتی انعامات اس کو بڑھا سکتے ہیں۔ اور نہ کسی قسم کی فیاضی اِس کو قائم رکھ سکتی ہے۔ خود وُہ شخص جو ممنونِ احسان ہے اِس قدر قدرت نہیں رکھتا۔ کہ وُہ اپنے غیر مستقل جذبات کو کسی کی محبّت پر مجبُور کرے۔ اور اپنے اختیار سے احسان مندی کی حِسّ کو جذبۂ اُلفت میں تبدیل کرے۔

کسی قیمتی شئے کا عطا کرنا جو مناسب فیّاضی پر مبنی ہو۔ محسن کے لئے لوگوں کی رضامندی اور خوشی حاصل کر سکتا ہے۔ اور ممنون احسان پر اُن فرائض کی حِس کا بوجھ ڈال سکتا ہے۔ جن کی ادائیگی اِس پر واجب ہے۔ اور یہی حِسّ فی الحقیقت احسان مندی ہے۔ اور محض احسان مندی ہی جِس میں محبّت کا کوئی جز نہیں۔ کُل وُہ صلہ ہے جو ایک ممنون دل اِن منافع کے عوض میں پیش کر سکتا ہے۔ جو اُسے پہنچے ہوں۔

مگر محبّت اور احسان مندی دو مختلف جذبات ہیں۔ محبّت اکثر اوقات ایک خود مختار جوشِ طبیعت ہے جو بغیر ہماری خواہش کے دفعتًا وارد ہو جاتا ہے۔ اور

اکثر بغیر اُس کے کہ پہلے سے ہمارے دل میں کسی شخص کی قدر و منزلت ہو۔ ہم خود بخود یکایک اُس کے دلدادہ ہو جاتے ہیں۔ ہم بعض آدمیوں سے سچّی محبّت رکھتے ہیں۔ مگر نہیں جانتے کہ کیوں؟ ہمارے دل میں اُن کے تمام معاملات کے متعلق ایک جوش سا اُٹھتا ہے۔ ہم اُن کے قصوروں کو بالکل اُسی طرح نظر انداز کرتے ہیں۔ جیسے اپنی کمزوریوں کو اور اُن کی خوبیوں کو اُسی نگاہِ تحسین سے دیکھتے ہیں۔ جیسے ہم اپنی نیکیوں کو جب تک یہ جذبہ ہمارے دل میں موجود رہتا ہے۔ ہم مزے لیتے ہیں۔ اور نہایت شوق سے اُس کا حظ اُٹھاتے ہیں۔ اور اگر کبھی اُس سے رُکنا چاہتے ہیں تو نہایت آزردگی سے اور محبّت کا صلہ صرف محبّت ہی ہے۔ جس کی ہم توقع یا خواہش کرتے ہیں۔

برخلاف اِس کے احسان مندی خود بخود کبھی کسی دل میں پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ ہمیشہ نتیجہ ہوتا ہے۔ ہمارے سابقہ افعال کا جو ہمارے ارادے اور کوشش پر مبنی ہوتے ہیں۔ احسان کو ہم ایک قرض سمجھتے ہیں۔ اور جب تک ہم اِس کے بوجھ سے سبک دوش نہ ہو جائیں ہمارے دل پر ایک بوجھ سا محسوس ہوتا رہتا ہے۔ احسان مندی کا اقرار ایک عاجزی کا اظہار ہوتا ہے۔ اور بعض لوگ اس قسم کی عجز پسندی کے زیادہ عادی ہوتے ہیں۔ وہ تمام احسانات کو جن کے وہ ممنون ہیں۔ بار بار دوہراتے ہیں صرف اس لئے کہ وہ خیال کرتے ہیں۔ کہ ایسا کرنا احسان کے قرض میں سے کچھ نہ کچھ ادا کرنا ہے۔

پس محبّت تو ایک نہایت خوشگوار اور پسندیدہ دلی جذبہ ہے۔ مگر احسان مندی نہایت مدلّل ہے جب کبھی ہم اپنے محبوب کا تصوّر کرتے ہیں۔ تو یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ ہم اپنی پسند پر نازاں اور خوش نہ ہوں برخلاف اِس کے وہ شخص جس نے ہمیں احسان کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ ہمارے تصوّر میں مثل اُس شخص کے آتا ہے۔ جس نے ہماری آزادی چھین لی ہو۔ اِس لئے محبّت اور احسان مندی دونو جذبے کبھی ایک

دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔ بغیر اس کے کہ وہ ایک دوسرے کو درہم برہم نہ کریں۔ ان دونوں میں سے ہم صرف ایک دوسرے کو اپنے تعلقات کے بموجب کسی شخص کے لئے مخصوص کر سکتے ہیں۔ دونو کو ہرگز نہیں۔ بڑے بڑے احسانات کے قرض سے دل کا دوالہ نکل جاتا ہے۔ اور جس قدر زیادہ احسانات ہم پر کئے جاتے ہیں۔ اُن کی آئندہ ادائیگی کی اُمیدیں کم ہو جاتی ہیں۔ اور یہ بات اُس راہ میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ جو خلوص اور محبّت کی طرف لے جاتی ہے

پس اپنے تعلّقات کے دُرست رکھنے کے لئے صرف فراخ دلی ہی نہیں بلکہ تھوڑی سی عقل کی بھی ہمیں ضرورت ہے۔ اِس لئے کہ ہم اِن تمام احسانات کی قیمت کا (جو ہم لوگوں پر کرتے ہیں) خیال بھی نہ کریں۔ اور اُن کو جہاں تک ہو سکے۔ نہایت ہلکا اور ادنےٰ ظاہر کریں۔ محبّت ایسی ترکیبوں سے پیدا ہو سکتی ہے نہ زبردستی احسان کرتے وقت ہمیں اپنے آپ کو ایسا ظاہر کرنا چاہیئے۔ کہ گویا ہمیں خبر بھی نہیں۔ کہ ہم کسی پر احسان کر رہے ہیں۔ اور اس طرح دوسرے کے دِل کو پوری آزادی ہونی چاہیئے خواہ وہ ہماری محبّت قبول کرے یا نہ کرے کیونکہ اپنے احسانات کے اظہار سے محبّت کرنے کے لئے مجبور کرنا اگرچہ احسان مند کو احسان مند ہی رکھتا ہے۔ لیکن دل میں ایک نفرت سی ضرور پیدا کرتا ہے۔

اگر صرف اظہار احسان مندی کا حصُول ہی ہمارا مقصُود ہو۔ تو اُس کے لئے کسی بڑی ہوشیاری کی ضرورت نہیں۔ نفع رسانی مقتضی ہے۔ اِس بات کی کہ ممنون اِس نفع کا اقرار کرے۔ اور ہمیں حق حاصل ہے۔ کہ اپنے واجب کی ادائیگی پر مُصر ہوں۔

لیکن یہ نہایت ہی دُور اندیشی کی بات ہو گی۔ کہ اگر ہم ایسے موقعہ پر اپنے حق سے دست بردار ہو کر اِس کا تبادلہ اگر ممکن ہو تو محبّت سے کر لیں۔ ہمیں تو احسان کے بار بار دہرائے جانے سے خاک بھی فائدہ نہیں ہوتا۔ مگر لوگ جو اظہار احسان مندی

کرتے ہیں۔ اس سے بہتیرا کچھ نقصان اُٹھاتے ہیں۔ احسان مندی کے اظہار کا مطالعہ کرنا ایک ایسے قرض کا مانگنا ہے جس سے قرض خواہ کو ذرّہ برابر بھی نفع نہیں۔ مگر قرض دار اس کو نہایت ناراضگی سے ادا کرتا ہے۔

حکیم مینوس حکمت کی تلاش میں پھرا کرتا تھا۔ کہ رات نے ایک دفعہ اُسے پہاڑ کے دامن میں آ دبایا۔ بارش اور بادل کی کڑک نے اس تنہائی کو اور بھی ہیبتناک زیادہ بنا دیا تھا۔ کہ پھرتے پھرتے ایک فقیر کا جھونپڑا نظر پڑا۔ جس کی طرف وُہ مڑا۔ اور پاس پہنچکر فقیر سے اس میں رات بسر کرنے کی اجازت چاہی۔

فقیر نے ایک سخت لہجے میں کہا۔ کہ" اندر چلا آ۔ آدمی تو ہرگز بھی مستحق نہیں ہیں کہ اُن پر کوئی احسان کیا جائے۔ مگر اُن کے ساتھ ایسا سلوک کرنا جس کے وُہ مستحق ہیں۔ اُن کی احسان فراموشی کی مثال کی تقلید کرنا ہے۔ اندر چلا آ۔ بُرائیوں کی مثالیں بعض دفعہ ہمیں نیکیوں میں مستحکم بنا دیتی ہے"!

کچھ کھانے پینے کے بعد جو نباتات اور چائے پر مشتمل تھا۔ مینوس اپنے تعجّب کے اظہار کو نہ روک سکا کہ فقیر نے دُنیا کے لوگوں سے کیوں علیحدگی اختیار کی ہے۔ حالانکہ اُن کے افعال تو حکمت کے نہایت سچّے سبق سُناتے ہیں۔ فقیر برافروختہ ہوکر بولا" آدمی کا تو تو نام بھی نہ لے۔ میں اس کمینہ اور احسان فراموش دُنیا سے علیحدہ ہی بھلا۔ یہاں جنگل میں مجھے ایسے ہمسایوں سے واسطہ ہے۔ جو خوشامدی نہیں۔ شیر ایک فراخ دل دشمن ہے اور کُتّا ایک باوفا دوست۔ لیکن آدمی! کمینہ آدمی! زہر کا پیالہ دیتا ہے۔ اور جس وقت دیتا ہے۔ اُس وقت اُس کے لبوں پر تبسّم ہوتا ہے" حکیم نے دانائی سے کہا" شائید لوگوں نے تمہارے ساتھ بُرا سلوک کیا ہے"!

فقیر نے کہا" ہاں! لوگوں پر میں نے اپنی ساری دولت لُٹا دی۔ اور صرف

ایک یہ لکڑی یہ پیالہ اور یہ نباتات ہے۔ جو میرے پاس اِس وقت رہ گئے ہیں؛"
مینوس نے کہا۔ "تو تم نے کیا اپنی دولت کو بخشش میں صرف کیا تھا۔ یا صرف قرض دی تھی۔

فقیر بولا بے شک! میں نے لوگوں کو اپنی دولت بخش دی۔ قرض دینا کون سی خوبی ہے؟ حکیم نے پھر کہا۔ "تو پھر جو کچھ تم نے اُنہیں دیا۔ اُس کا اُنہوں نے اقرار اور اظہار بھی کیا؟"

فقیر نے چلّا کر کہا۔ ہزاروں دفعہ۔ وہ تو ہر روز میرے احسانات کے عوض میں شکر گزاری کا اظہار کرتے تھے۔ اور آئندہ احسانات کے واسطے طرح طرح کی التجائیں؛" مینوس مسکرا کر بولا۔ "اگر تم نے اپنی دولت کو بطور قرض نہیں دیا کہ وہ واپس کی جاتی۔ تو پھر یہ ناانصافی ہے۔ کہ تم لوگوں پر احسان فراموشی کا الزام لگاتے ہو۔ اُنہوں نے تو اقرار کیا کہ وہ تمہارے ممنون احسان ہیں۔ اور کیا تم اُن سے اُمید رکھ سکتے تھے؟ اُنہوں نے بلاشبہ تمہارا احسان اپنے ہی اظہار و اقرار احسان مندی کے سبب حاصل کیا؛" فقیر جواب سے متعجب ہوا۔ اور اپنے مہمان کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ "میں نے مینوس کا نام سنا ہے۔ اور تو یقیناً وہی ہے۔ میں اگرچہ اسی برس کا بوڑھا ہوں۔ مگر عقل کے لحاظ سے ابھی بچہ ہی ہوں۔ چل مجھے دنیا کی تعلیم میں لے چل۔ اور اِس طرح تعلیم دے جیسی کہ تو اپنے سب سے جاہل اور سب سے چھوٹے شاگرد کو دیتا ہے۔

میرے عزیز! بلاشبہ اِس زندگی سے سفر میں دوست مل جانا بسا غنیمت ہے۔ چہ جائیکہ چند مفت خور ہمارے احسان مند ہوں۔ اور چونکہ محبت زیادہ تر دل سے متعلق ہے۔ اِس لئے یہ احسان کے شکریہ کی نسبت زیادہ دیرپا ہے۔ جب ہم پر کوئی بڑا احسان کیا جاتا ہے۔ تو ہم ایک قسم کی بے چینی محسوس کرتے ہیں۔ کہ جلد اِس کا شکریہ

ادا کریں۔ اور جب یہ شکریہ ایک دفعہ رد کیا جاتا ہے۔ تو پھر کبھی دوبارہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور وہ دل جو اس قدر کمینہ ہے۔ کہ احسان کے عوض شکریہ کے فوری صلہ کو بھی روا نہ رکھے۔ وہ بجائے اس کے کہ احسان کے یاد کرنے پر کسی قسم کی بے چینی محسوس کرے۔ اپنی اس نئی حاصل شدہ آزادی پر نازاں ہوتا ہے۔ اور ایک حد تک اس ظاہرہ کمینہ پن سے خوش۔

البتہ اُن دو دوستوں کی صورت بالکل جداگانہ ہے۔ جن کے دل ملے ہوئے ہوں۔ عارضی جدائی بھی بے تابی کا موجب ہوتی ہے۔ اور اُس منقسم وجود کی طرح جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ انسان برج جوزا کی صورت میں پیدا کیا گیا تھا۔ اس کے دونوں طرف منہ تھے یعنی دو آدمیوں کو پشت کی طرف سے ملا کر کھڑا کر دیا جائے۔ تو اُس کہانی کے مطابق انسان کی اصل صورت ہو جائے گی۔ پھر انسان بیچ میں سے تقسیم کر دیا گیا۔ اور چونکہ دو آدمی ایک دوسرے کا جز ہیں۔ اس لئے ایک دوسرے کے ملنے کے نہایت مشتاق ہوتے ہیں اُن کی ہمدرد روحیں ایک دوسرے سے وصل کی خواہش کرتی ہیں۔ دونو کی خوشیاں ناممکن ہوتی ہیں۔ اُن کے سب سے خرم اوقات میں بھی جو بے چینی سے خالی نہیں ہوتے۔ وہ نہایت ہی ادنٰے بہانے ڈھونڈتے ہیں کہ اُس رکاوٹ کو جو اُن کے وصل میں حائل ہو دُور کریں۔ نہایت خفیف سا افراتفری اور ایک نہایت ادنٰے واقعہ دونوں کے وصل کا باعث ہو جاتا ہے۔

ایک دفعہ ایک فقیری باز اور اُس کی بیوی ہیں جو عام لوگوں کی طرح مشقت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اور جن میں کبھی کبھی شکر رنجیاں بھی ہو جاتی تھیں۔ کسی دن ایک بات پر شکر رنجی ہو گئی۔ اور اُس کو دونو نے جوش کے ساتھ قائم رکھا۔ بیوی کو یقین تھا۔ کہ وہ حق پر ہے۔ اور خاوند نے مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ کہ جو میں چاہوں وہی ہو جھگڑا طویل ہوتا گیا۔ اور دونوں کا غصہ اس درجے کو پہنچا۔ کہ دونو نے قسمیں کھا لیں۔ کہ آئندہ وہ

کبھی رات کو اکٹھے نہیں سوئیں گے۔ یہ قسم تیزئ مزاج کا نتیجہ تھی کیونکہ وہ اب بھی دلوں میں ایک دوسرے کے دوست تھے۔ پھر اُن کے گھر میں شل اور غریب آدمیوں کے کُل ایک ہی پلنگ تھا۔ تاہم اُنہوں نے اِس قسم کے پورا کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ رات کے وقت وہ اپنے درمیان میں ایک نفیری کا غلاف رکھ لیا کرتے تھے۔ تاکہ ایک دوسرے سے جُدا رہیں۔ اِسی طرح اُنہوں نے تین ہفتے گزارے۔

اِس اثنا میں دونو دل ہی دل میں اپنی اِس قسم کھانے کا افسوس کرتے تھے۔ اِن کا غصّہ فرو ہو چکا تھا۔ اور اُن کی محبّت عود کرنے لگی تھی۔ دونوں چاہتے تھے کہ اِس نفیری کے غلاف کو بیچ میں سے نکال پھینکیں۔ لیکن کسی میں اتنی جرأت نہ تھی۔ ایک دن جب رات کو وہ دونو جاگ رہے تھے۔ اور نفیری کا غلاف اُن کے درمیان میں تھا اتفاق سے خاوند کو چھینک آئی۔ بیوی نے حسبِ معمول کہا یَرْحَمُکَ اللہ۔ خاوند نے کہا۔ اے بیوی کیا تو اپنے دل سے یہ کہتی ہے؟" بیوی نے جواب دیا "ہاں میرے پیارے نکالس بیشک میں نہ دل سے یہ کہتی ہوں۔" میاں نے کہا "تو پھر اچھا ہم اِس غلاف کو بیچ میں سے کیوں نہ نکال ڈالیں؟"

(لطیف احمد)

رومِ مٹ گیا لیکن اُس کی عظمت و شان کی یادگاریں باقی ہیں۔ پُرانے رومیوں کی وسیع فتوحات کے نشان اور اُن کی تہذیب کے مٹے مٹے آثار چپّے چپّے پر سیّاح کی توجّہ کو اپنی طرف منعطف کر لیتے ہیں۔ اور ایک سرد آہ یا ایک ہمدردی کے آنسو کا خراج طلب کرتے ہیں۔ اور اِن یادگاروں میں شاید سب سے زیادہ قابلِ ذکر اُن بہادروں کی قبریں ہیں جنہوں نے اپنا خون پانی ایک کر کے رُوم کو روعتہ الکبریٰ بنایا تھا۔ اور اِس کی رفعت و شان کو ساری دُنیا سے منوایا تھا۔ رُوم کے قبرستان ایسے لوگوں کی نعشوں سے پُر ہیں جن میں سے ہر ایک بجائے خود اپنے مُلک کے لئے سرمایۂ ناز تھا۔ اور جن کے نام اِس وقت صِرف ایک وجہ سے مِٹ گئے ہیں۔ کہ اُن کی شہرت کو چند بزرگ تر ناموں نے اِسی طرح گھٹا دیا ہے جس طرح کہ چھوٹے چھوٹے ستارے آفتاب کی شعاعوں کے سامنے ماند پڑ جاتے ہیں۔ اِسی مردم خیز شہر کے ایک مشہور قبرستان میں جس میں ہرام کائس سٹس واقع ہے۔ ایک شمالی گلشن کے بھی دو دُور افتادہ پھُول دفن ہیں۔ جن کی مہک اِس وقت تعلیم یافتہ دُنیا میں ہر طرف پھیل رہی ہے۔ اِن میں سے ایک تو انگلستان کا ہونہار شاعر کیٹس ہے۔ جس کی شاخِ زندگی کو پھل لانے سے پہلے ہی موت کے تیز و بیرحم چاقو نے قطع کر دیا۔ اور دوسرا وُہ شاعرِ عندلیب صفت ہے۔ جس کا نام زیبِ عنوان ہے۔ وُہ مقام جہاں ایک پتّھر کی لاطینی میں لفظ کارِ کا رڈیم یعنی "دِل دہا" کندہ ہیں۔ ہر ایک شاعری کے دلدادہ کے لئے متبرک مقام ہے۔ کیونکہ اِس قبر میں

اُس شخص کی خاک دفن ہے۔ جسے اگر فخر روزگار کہیں تو بجا ہے۔ وہ اُن لوگوں میں سے ہے۔ جن کو روم کی پاک سرزمین میں دفن ہونے سے کوئی فخر نہیں۔ بلکہ جن کی خاک پر خود روم کو بھی ناز ہونا چاہئے۔ ہم جرأت اور یقین کے ساتھ روم سے سوال کر سکتے ہیں۔ کہ یوں تو تیری خاک میں لاکھوں ہی گوہر پنہاں ہیں لیکن تو ہی بتلا کہ ؎

دفن تجھ میں کوئی فخر روزگار ایسا بھی ہے
تجھ میں پنہاں کوئی گوہر آبدار ایسا بھی ہے

پرسی بیشی شیلے۔ انگلستان کے ایک پرانے امیرانہ گھرانے میں ۱۷۹۲ء میں پیدا ہوا۔ اس کے آباؤ اجداد طبقہ شرفا میں شمار کئے جاتے تھے۔ اور اکثر اعلیٰ اعلیٰ عہدوں پر ممتاز رہے تھے۔ شیلے کی پیدائش کے وقت اس کا دادا جسے بیرونٹ کا خطاب حاصل تھا خاندان کا سرپرست تھا۔ اور اس کا باپ پارلیمنٹ کا ایک سربرآوردہ ممبر تھا۔ شیلے کو شروع سے تعلیم و تربیت کے عمدہ مواقع حاصل تھے لیکن بچپن ہی سے اس کی بے چین طبیعت ہر قسم کی قیود سے اپنے تئیں آزاد کرنے کی خواہش مند تھی۔ اس کا رنگ ڈھنگ گھر میں بالکل نرالا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ "الولد سر لابیہ" مگر یہاں معاملہ برعکس تھا۔ مسٹر ٹیموتھی شیلے (پرسی کے باپ) اور پرسی کی اپنی طبیعت میں بُعد المشرقین تھا۔ پرسی کا باپ ایک معمولی عقل کا بھاری بھر کم مالدار آدمی تھا۔ لیکن پرسی کے دل میں وہ شعلہ پنہاں تھا جو خاص آسمانی نور کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے۔ اُس نے قدرت سے شاعرانہ طبیعت پائی تھی۔ اور علاوہ شاعرانہ طبیعت کے اپنے بنی نوع کی ہمدردی اس کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھی۔ جسمانی خوبصورتی اس نے اپنی ماں سے ورثے میں پائی تھی۔ جو غالباً ایک ذہین اور قابل عورت تھی۔ اس کے خط و خال نازک تھے۔ اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر روشن اور چمکدار تھیں۔ اور اس کے اعصاب نہایت کمزور اور اثر پذیر تھے۔ اس کی آواز البتہ نہایت تیز اور مہین تھی۔ اور بسا اوقات کانوں کو ناگوار گزرتی تھی۔

شیلے کی انسانی ہمدردی کچھ ابن السبیل تک ہی محدود نہ تھی۔ بلکہ اُس کے اپنے خویش و اقارب بھی اِس میں حصّہ لیتے تھے۔ اِس کو اپنے سب عزیزوں سے محبّت تھی۔ اپنے باپ سے اوائل عمر میں خاصی موافقت تھی۔ ایک مرتبہ جب ٹیموتھی شیلے سخت بیمار ہوئے۔ تو پرسی رات کو اپنے بچھونے میں سے نکل کر اکثر ان کی خبر لینے جاتا تھا۔ اور گھنٹوں ان کے کمرے کے دروازے سے لگا کھڑا رہتا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ شفقت اِسے اپنی بہنوں پر تھی۔ اور اِس کا اکثر وقت اُنہی کی ہمراہی میں کٹتا تھا۔ اِنہیں آرام دینے کے لئے وُہ خود تکلیف کا متحمّل ہو جاتا تھا۔ اور جس طرح بھی بن پڑتا تھا۔ انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اِس برادرانہ محبّت کا اِس کی شاعری پر بہت بڑا اثر پڑا جس عزّت و وقعت کی نگاہ سے وُہ طبقۂ اناث کو دیکھتا تھا۔ اِس کا پتہ لگانے کے لئے ہمیں اِس کے شروع کے حالات پر نظر ڈالنی چاہئے۔ اِس میں کچھ مشتبہ نہیں کہ اپنی بہنوں کی بڑھی ہوئی محبّت نے اِس کو عورتوں کی عزت کرنے کا پاک اصول سکھلایا تھا۔

شیلے کی ابتدائی تعلیم برانٹ فورڈ۔ اور بعد ازاں ایٹن کے مشہور آفاق سکول میں ہوئی۔ دونوں جگہ اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا گیا۔ کیونکہ اُستاد اور ہم مکتب دونوں اِس پُر اسرار لڑکے کو سمجھنے اور سمجھ کر ہمدردی کرنے سے قاصر تھے۔ شیلے کی عادات اور خصائل عجیب و غریب تھیں۔ اور خواہ مخواہ اُسے ہر کہ ومہ کی نظروں میں مشتبہ اور حقیر بنائے دیتی تھیں۔ مدرسے کی باقاعدہ تعلیم سے اُسے مطلق ہمدردی نہ تھی۔ گو لاطینی و یونانی شعرا کا کلام اکثر اُس کے زیرِ مطالعہ رہتا تھا۔ خصوصًا موخرّ الذکر زبان کے علم و ادب کا اسے بے حد شوق تھا۔ شیلے کو بعید از قیاس انسانوں۔ اور سحر و طلسمات کی داستانوں سے بھی بہت دل بستگی تھی۔ اور اِس میں شبہ نہیں۔ کہ اس قسم کی کتابوں کے مطالعہ سے اُسے اپنی قوّت متخیلہ کی ترقی میں بہت مدد ملی۔ لیکن ان کا ایک بڑا نتیجہ یہ بھی ہُوا۔ کہ اِن میں سے اکثر وقت لچر باتوں پر یقین کرنے لگا۔ اور کیمیاگری اور

ساحری کا شوق ہوگیا۔ اِس کا اکثر وقت علمِ کیمیا کے خطرناک تجربوں میں گزرتا تھا۔ جن کی وجہ سے وُہ اضحوکۂ روزگار بن گیا۔ اس کے ہم مکتب اسے حقارت بلکہ نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ اَور آزار دینے پر کمربستہ ہوگئے سارا مدرسہ ایک طرف تھا۔ اَور بیچارہ شیلے ایک طرف۔ مجنون شیلے کے نام سے اُسے خطاب کرتے تھے۔ اور رنج دہی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بسا اوقات مار پیٹ سے بھی نہ چُوکتے تھے۔ اِس قسم کے سلوک اور برتاؤ کا جو اثر شیلے جیسی نازک طبیعت کے لڑکے پر ہوسکتا ہے۔ وُہ واضح ہے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ ابتدا ہی سے اُسے ہر قسم کی قیود سے نفرت تھی۔ اب وُہ ہر ایک قسم کی حکومت اَور افسری کو ظلم اور غصب سے تعبیر کرنے لگا۔ اَور بااختیار لوگوں کے جبر و تعدّی اور ناانصافی کا نقش اس کے دل پر خوب جم گیا۔ انسانی آزادی اَور ہمسری کے تکلیف دہ خیالات اِس کے دل میں جوش مارنے لگے۔ اس زمانے کی ہَوا ہی میں کچھ یہ تاثیر تھی۔ ہر طرف انسانی ہمدردی کی صدائیں بلند تھیں۔ اَور ہر ایک فردِ بشر کو مساوات اَور برابری کی نگاہ سے دیکھنے کا سبق یورپ کے ہر ملک میں پڑھایا جارہا تھا۔ فرانس کی بغاوت اِسی فلسفہ کا نتیجہ تھی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے۔ کہ یہ فلسفہ ہی خود ایک بغاوت کے آنے کی خبر دیتا تھا۔ جس میں کہ یہ اُصول زبان اَور قلم کے ذریعہ سے نہیں۔ بلکہ زبانِ تیغ اور دہانِ توپ کے ذریعہ سے دُنیا کو تعلیم کیئے جائیں گے۔ شیلے کی اِس زمانے کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے۔ کہ اِس کی زندگی تلخ ہوگئی تھی۔ اور دنیوی مظالم و مصائب کا خیال ہر وقت اِس کی طبیعت میں خلش پیدا کرتا رہتا تھا۔ ہر قسم کی انسانی قیود یہاں تک کہ مذہب اور رسم و رواج کی کڑی زنجیر بھی اِس کی نظروں میں انسانی ترقی کی سدِّ راہ معلوم ہوتی تھی۔ اَور اُس نے اپنے دِل سے عہد کرلیا۔ کہ مَیں اُن میں سے کبھی کسی قید کا نہ تو پابند ہونگا۔ اور نہ اُن کی عزت کرونگا۔ کیونکہ یہ سب انسان نے خود اپنی نوع پر بے جا تشدّد اور تحکّم کی غرض سے قائم کررکھی ہیں۔

اور خدا کی ذات و الصفات سے انہیں کچھ تعلق نہیں ہے۔ اِس قسم کا خیال بے جا جرأت سے مبرّا نہیں۔ بلکہ یُوں کہنا چاہئے۔ کہ یہ بجائے خود ایک مجرمانہ خیال ہے۔ لیکن شیلے کے حق میں جو نتائج اس سے مرتب ہوئے۔ اُن کے سامنے ہم تھوڑی سی کم فہمی اور کوتاہ نظری کو بہ آسانی معاف کر سکتے ہیں۔

سکول کی ابتدائی تعلیم سے فارغ ہو کر یونیورسٹی کا ارادہ ہُوا۔ آکسفورڈ کے یونیورسٹی کالج میں شیلے کے اکثر بزرگوں نے تعلیم پائی تھی۔ چنانچہ وُہ بھی اِسی کالج میں داخل کیا گیا۔ اور بطور ایک انڈر گریجوایٹ کے یونیورسٹی کی ابتدائی تعلیم پانے لگا۔ یونیورسٹی میں آنے سے اُسے دو فوائد حاصل ہوئے۔ ایک تو یہ کہ چند ہم مذاق احباب مل گئے۔ اور دوسرے پہلے کی نسبت زیادہ آزادی اور تنہائی میسر آ گئی۔

لیکن شیلے جیسی طبیعت کو کہاں چین پڑتا ہے۔ اِنہیں تو ؏

بہر زمیں کہ رسیدیم آسمان پیداست

ہر جگہ کہنا پڑتا ہے۔ آکسفورڈ میں جبر و تشدد مفقود نہ تھا۔ اور اکثر پروفیسر سکول کے اُستادوں کی نسبت کچھ چنداں حلیم الطبع یا خوش مزاج نہ تھے۔ اِس پر طرفہ یہ ہُوا۔ کہ شیلے صاحب کو اپنی ایک رشتہ دار لڑکی ہیریٹ گرونامی سے بُہت کچھ اُنس ہو گیا تھا۔ لیکن اس کے والدین کو اِن دونوں کی شادی منظور نہ ہوئی۔ اور اِس کی نسبت ایک اَور جگہ ٹھہر گئی۔ شیلے کی طبیعت پر اِس واقعہ سے بہت صدمہ ہُوا۔ اَور ذی اختیار لوگوں کی ناانصافی کا اور بھی زیادہ یقین ہو گیا۔ اِن دِنوں طبیعت مذہب کے اُلجھیڑوں کی طرف زیادہ مائل تھی۔ ایک رسالہ "خدا کو نہ ماننے کی ضرورت" پر لکھ مارا۔ اور اِس کی ایک ایک جلد سب یونیورسٹی کے عہدہ داروں کے پاس تبلیغِ حق کی نیت سے بھیج دی۔ نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ یونیورسٹی سے بیک بینی و دوگوش نکالے گئے۔ اِس حرکت کو ہم صرف کم عمری اور حماقت پر ہی محمول کر سکتے ہیں خصوصاً اس وجہ سے کہ شیلے

دراصل ایک اعلیٰ وارفع ذات کا قائل اور خدا کی ہستی کو ماننے والا تھا۔ اُسے اگر کچھ پرخاش تھی تو عیسائیوں اور یہودیوں کے خدا سے جس پر (اس کے خیال کے بموجب) ظالم وجابر ہونے کا احتمال ہوسکتا ہے۔ لیکن ایسے باریک وفلسفیانہ نکتے اکثر یونیورسٹیوں کے انتظام میں خلل ڈالتے ہیں۔ اور ہمارے خیال میں جو سزا شیلے کو ملی وہ کچھ بے جا نہ تھی۔ تاہم ہمیں اس کی اخلاقی جرأت کی تعریف کرتے ہی بن پڑتی ہے۔

یونیورسٹی سے نکلتے ہی باپ بیٹوں میں ناچاقی ہوگئی۔ مسٹر سیٹمو بھی شیلے چاہتے تھے۔ کہ شیلے نادم ہوکر اپنے کئے سے تائب و پشیمان اور یونیورسٹی کے افسروں سے معافی کا خواستگار ہو۔ لیکن شیلے کا یہ زعم تھا کہ ؏

یہ وہ نشے نہیں جسے ترشی اُتار دے

دونوں میں ایک عرصے تک خط و کتابت کے ذریعے سے بحث ہوتی رہی کیونکہ شیلے اِن دنوں اپنے ایک دوست کے ہمراہ گھر سے دُور لنڈن میں براج رہے تھے۔ لیکن نتیجہ کچھ نہ ہوا۔ وہ اپنی ضد پر قائم یہ اپنی ہٹ پر تُلے رہے۔ ہمیں اِس اُنیس سالہ لڑکے پر حیرت ہوتی ہے۔ جو اتنی سی عمر میں یہ دم داعیہ رکھتا تھا کہ۔ ؏

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔

لندن میں ایک نیا گُل کھلا شیلے کی بہنیں لندن کے ایک زنانہ سکول میں تعلیم پاتی تھیں۔ اور اُن کا بھائی اکثر ان سے ملنے جایا کرتا تھا۔ اِسی اسکول میں ایک اور شانزدہ سالہ لڑکی ہیریٹ وسٹ برک نامی بھی پڑھتی تھی جس کا شیلے کی بہنوں سے بہت کچھ ارتباط واتحاد تھا۔ قدرتی طور پر شیلے اور ہیریٹ کو اکثر ایک دوسرے سے ملنے کا اتفاق پیش آتا رہتا تھا۔ بلکہ بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ ہیریٹ شیلے کے پاس اِس کی بہنوں کی طرف سے پیغامبر بن کر آتی تھی۔ ہیریٹ کا باپ ایک سخت گیر

اور بد مزاج آدمی تھا۔ اور وہ بےچاری اکثر اس کے ہاتھوں سے نالاں رہتی تھی۔ شیلے کو اس بدنصیب لڑکی سے ہمدردی سی ہو گئی۔ اور رفتہ رفتہ اس ہمدردی نے محبت کی صورت اختیار کر لی۔ ہیریٹ کے باپ کو بھی اس شادی میں کوئی اعتراض نہ ہو سکتا تھا کیونکہ وہ ایک ادنےٰ درجے کا آدمی تھا۔ اور شیلے جیسے عالی نسب کے ساتھ رشتہ ناطہ کرنا اس کے لئے عین عزت و افتخار کا باعث تھا۔ لیکن اِن دونوں نے مسٹر وسٹ برک کی اجازت کا بھی انتظار نہ کیا۔ اور چپکے چپکے شادی کر لی۔ یہاں اتنا بیان کر دینا ضروری ہے۔ کہ شیلے کو اُس وقت تک ہیریٹ کی طرف سے بالکل اطمینان نہ تھا۔ اور اتنی جلدی شادی کرنے کی محض یہ وجہ ہوئی۔ کہ ہیریٹ نے ایک دن اپنے باپ کی بدسلوکی کی بہت شکایت کی۔ اور یہ کہا کہ میں سخت مصیبت میں گرفتار ہوں۔ شیلے کا شاعرانہ دل موم ہو گیا۔ اور وہ حبالۂ ازدواج بندھ گیا۔ شادی کی خبر سُن کر مسٹر سیٹمبو تھی شیلے اپنے بیٹے سے بالکل دست بردار ہو گئے۔ اور ناکتخدا میاں بی بی کو مفلسی کا سامنا کرنا پڑا۔ کچھ عرصہ تک اِدھر اُدھر پھرتے رہے۔ اِس کے بعد آئرلینڈ میں ناراض رعایا کی گورنمنٹ کے خلاف مدد کرنے کی غرض سے چلے گئے۔ وہاں کچھ عرصے تک مقیم رہے۔ اور شیلے آزادی کے حامیوں کی دامے درمے قدمے سخنے مدد کرتے رہے۔ اور بالآخر اپنے تئیں گورنمنٹ کی نظروں میں مشتبہ بنا کر بمجبوری واپس ہوئے۔ اور آکر دوبارہ لندن میں سکونت اختیار کر لی۔

اثنائے سفر ہی میں کچھ نااتفاقیاں شروع ہو گئی تھیں خصوصاً اس وجہ سے کہ ہیریٹ کی ایک بہن الائزا ہر وقت سر پر مسلط رہتی تھی۔ اور شیلے کو یہ دخل درمعقولات نہایت ناگوار گزرتا تھا۔ لندن پہنچتے پہنچتے شیلے کے دل میں بہت کچھ تغیر ہو گیا۔ لندن میں آکر ایسے سامان پیش آئے جن کی وجہ سے یہ بےلطفی رفتہ رفتہ لاپرواہی بلکہ نفرت سے مبدّل ہو گئی۔ شیلے کے دل میں ہیریٹ کے سوا ایک اور نے گھر کر لیا۔ جو ہیریٹ کے برابر حسین اور ہیریٹ سے بدرجہا زیادہ لائق اور ذہین لڑکی تھی۔

لندن میں اُن دنوں ایک شخص ولیم گاڈون نامی رہتا تھا جس کی زندگی دُکان داری اَور فلسفے جیسے دو مخالف و متباعد مشاغل میں گزرتی تھی۔ اِس دُکان دار فیلسوف کی کتابیں آزادی کی کچھ بے جا اَور بجا چیخ پکار کی وجہ سے بہت مقبول اَور ہر دلعزیز بن رہی تھیں۔ شیلے کو بھی اِس سے زیادہ عقیدت تھی۔ اَور خط و کتابت کے ذریعے سے عقیدت کا اظہار بھی ہو چکا تھا۔ پہلا کام جو شیلے نے لندن میں آکر کیا۔ وہ یہ تھا۔ کہ تقدس مآب حضرت گاڈون کی زیارت سے مشرف ہوُا۔ اِس گاڈون کی ایک نوجوان بیٹی میری نامی بھی تھی۔ جس نے ذہانت اَور حسن اپنی ماں سے اَور فلسفہ اپنے باپ سے میراث میں پایا تھا۔ میری گاڈون کے خیالات انسانی تعلقات کے بارے میں بہت کچھ اپنے باپ سے ملتے تھے۔ دونو رسم و رواج کی قیود کو انسانی ترقی کے سدِّ باب کرتے تھے۔ شیلے کو اِس لڑکی کی گفتگو اَور صحبت میں وُہ دُنیا نظر آئی جس کی اِس کی آنکھوں نے کبھی پیشتر سیر نہ کی تھی۔ دونوں خودبخود ایک دوسرے کی طرف کھچنے لگے۔ اور دونوں نے ایک دوسرے میں اپنا سچا مشیر و مددگار پا لیا۔ میری اَور شیلے کا اجتماع دو روحوں کا اجتماع تھا۔ اَور ایسے ہی اجتماع کو ہم سچّی شادی کہہ سکتے ہیں۔ شادی کی رسم کو دونوں فضول بلکہ مضر خیال کرتے تھے۔ خود گاڈون ہی کی یہ تعلیم تھی۔ اِس لئے کسی سے کچھ کہے سُنے بغیر دونوں ایک دن بوُئے گُل کی طرح فرار ہو گئے۔ اور اُدھر گاڈون اَور اِدھر ہیربٹ ہاتھ ملتے رہ گئے۔ شیلے کا یہ فعل ہم لوگوں کی نظروں میں کسی قدر معیوب کیوں نہ ہو مگر اس میں کلام نہیں کہ اِس جیسی طبیعت اَور اِس جیسے خیالات والے شخص سے ایسے حالات میں محصُور ہو کر یہی توقع ہو سکتی تھی۔ ہیربٹ کی طرف سے اسے پہلے ہی بیزاری پیدا ہو گئی تھی۔ دُنیا کی نفرین اَور تعریف کی اِسے چنداں پرواہ نہ تھی۔ اِس پر یہ بات مزید ہوئی۔ کہ ایک ہم خیال اور ہمدرد رفیق مِل گئی۔ جو ساری عمر اس کا ساتھ دینے پر تیار تھی۔ دونوں نے دُنیا کی رائے کو بالائے طاق رکھ دیا۔ اَور جو اپنے جی میں آیا کر گزرے۔

شیلے کی زندگی کے اِس واقعہ پر مخالف و موافق تحریروں سے دفتر کے دفتر سیاہ کیئے گئے ہیں۔ اور بعض معتبر سوانح نویسوں نے ہیریٹ کے چال چلن پر بھی حرف رکھا ہے۔ ہم لوگ جو اِن سب معاملات کو دوسروں کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ صرف یہی کہہ سکتے ہیں۔ کہ واﷲ اعلم بالصّواب۔ لیکن اِس میں کلام نہیں کہ میرؔی کے نمودار ہونے سے پہلے ہی ہیریٹ اُور شیلے کا نباہ مشکل ہو گیا تھا۔ اَور اِن دونوں میں علیحدگی کا ہونا لازمی اور لابدی تھا۔ اِس ناگوار تذکرے کو ہم یہیں ختم کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ صرف اتنا اَور بتا دینا ضروری ہے۔ کہ ہیریٹ نے سال کے اندر ہی اندر کوئیں میں ڈوب کر خودکشی کر لی۔ اس وقوعہ کا شیلے کے دل پر بہت بڑا اثر ہُوا۔ اَور اِس کی آئندہ زندگی کو ہیریٹ کا خیال اکثر تلخ کر دیتا تھا۔

دوسری شادی کے بعد شیلے نے انگلستان کو خیرباد کہا۔ اَور اٹلی میں (جو اکثر انگریز شاعروں کا دوسرا وطن رہا ہے) سکونت اختیار کر لی۔ اِس عرصے میں اِس کی شاعری کو اکثر لوگ مان گئے تھے۔

میرؔی جیسی مونس و دمساز کے مل جانے سے شیلے کی شاعرانہ طبیعت اُور بھی چمک گئی۔ وُہ بات جو مضمون سُجھاتی اور دل کو گرماتی ہے۔ اب اِسے حاصل ہو گئی تھی۔ دونو میاں بی بی ہم مذاق تھے۔ دونوں کو علمی ذوق تھا۔ دونوں کے دل میں اپنے بنی نوع کا درد جاگزین تھا۔ اِن حالات میں تو کوئی معمولی شخص آدھا پونا شاعر بن جاتا پھر شیلے کا تو کیا مذکور جسے خدا نے پیدائش ہی سے حلیۂ شاعری عطا فرمایا تھا۔ ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر نظم شایع ہونے لگی۔ اور شائقین کے ہاتھوں میں گردش کھانے لگی تنقیدی دُنیا کے کان کھڑے ہوئے۔ کہ دُنیا کا ایک سب سے بڑا شاعر انگلستان میں نمودار ہُوا ہے۔ شیلے کی نظموں میں جو بات خصوصیت سے قابل ذکر ہے وُہ یہ ہے۔ کہ اُن میں ایک قسم کا قدرتی ترانہ اور شیرینی پائی جاتی ہے۔ جِس کی مثال دُنیا کی شاعری میں اَور کہیں نہیں

مل سکتی۔ اِس کی نظمیں کے سُننے سے کان کبھی سیر نہیں ہوتے۔ بلکہ ہمیشہ "ہل من مزید" کی تمنا رہتی ہے۔ بجائے شاعری کے انہیں اگر موسیقی کہا جائے تو بجا ہوگا۔ کیونکہ شاعری اور موسیقی کا اجتماع جس قدر شیلے کی نظموں میں پایا جاتا ہے۔ اِس قدر اَور کسی شاعر کے کلام میں نہیں پایا جاتا۔ علاوہ اِس ترانے کے اِس کا بڑھا ہوا تخیل خاص اِسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ شیلے جس دُنیا کی سیر کرتا تھا۔ وہ خلدِ بریں کی طرح خوبصورت تھی۔ اِس میں ہر ایک چیز قوس قزح کے رنگوں سے مزیّن نظر آتی ہے۔ اِس کا بِتّا بِتّا صنعتِ کردگار کا ایک اعلےٰ نمونہ ہے۔ اِس کا آسمان نیلم کو شرماتا ہے۔ اِس کی زمین ہمسرِ فلک ہے۔ اِس کا سمندر آبی پریوں کا مسکن ہے۔ جس کی ہر ایک موج بجائے خود ایک مہ جبین ہے۔ جو اپنے سیمیں بازو پھیلا کر ہمیں اپنی آغوش میں بُلاتی ہے۔ اِس کے طیورِ خوش الحان کی موسیقی ستاروں کو وجد میں لاتی ہے۔ اَور اِس کے باشندے ہم جیسے خطا و نسیان سے مرکّب۔ گناہوں سے ملوّث آدمی نہیں۔ بلکہ خوبصورت اَور خوب سیرت لوگ ہیں۔ جو فرشتوں کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ اَور جنہیں اشرف المخلوقات کہلانے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ اِس میں کلام نہیں۔ کہ اِس خیالی دُنیا کی سیر میں شیلے اکثر واقعیت کو ہاتھ سے دے دیتا ہے۔ لیکن شاعری کا صرف یہی منشا نہیں۔ کہ واقعات کو پیش کرے۔ بلکہ ہر ایک شئے میں حُسن کا مطالعہ کرے۔ اَور اِس منشا میں جس قدر کامیابی شیلے کو ہوئی ہے۔ اُس قدر اَور کسی شاعر کو نہیں ہوئی۔ کیونکہ وہ خُدا کو حُسنِ ازلی ہی سے تعبیر کرتا تھا۔ اَور کُل کائنات کو حُسنِ مجسّم خیال کرتا تھا۔

شیلے نے جو حصّۂ عُمر اٹلی میں گزارا۔ اِس میں دو واقعات قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو لارڈ بائرن اور شیلے کی پہلی ملاقات ہوئی۔ اَور بہت گہری ملاقات ہوئی۔ کیونکہ دونوں ایک عرصہ تک ساتھ رہے۔ اِس ملاقات کا اثر دونوں کی شاعری پر پڑا چنانچہ شیلے نے ایک نظم موسوم بہ "جولین اینڈ میڈالو" اِسی تقریب پر لکھی ہے۔ دوسرا امر جو ہمارے

لئے دلچسپی کا موجب ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ شیلے کی ملاقات ایک عجیب وغریب عورت ایمیلیا دیویانی نامی سے ہوئی جو اپنی مذہبی آرائے کی وجہ سے خانقاہ میں نظربند تھی۔ شیلے جیسے آزاد خیال شخص کو ایسی عورت سے ہمدردی پیدا ہونی ضروری تھی۔ اور اس پر یہ بات مزید تھی۔ کہ ایمیلیا دیویانی واقعی نہایت ذہین اور قابل عورت تھی۔ شیلے اس کی بیوی میری اور ایمیلیا تینوں میں بہت دلی دوستی ہوگئی۔ اور یہ دونو میاں بیوی اکثر اس سے ملنے جایا کرتے تھے۔ ہمارے شاعر کی ایک مشہور نظم "اے پی سائی گڈیان" اسی ایمیلیا دیویانی ہی کے شوق میں لکھی گئی ہے۔

جو زمانہ اٹلی میں گزرا۔ اس کو ہم شیلے کی عمر کا بہترین حصہ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن افسوس یہ کچھ بہت لمبا نہ تھا۔ انگریزی میں ایک مثل ہے۔ کہ وہ جن سے دیوتا محبت کرتے ہیں۔ جوان ہی مرجاتے ہیں"۔ شیلے بھی انہی منتخب چندیں سے ایک تھا۔ ایک روز کشتی میں سوار ہوکر لک ہارون کے قریب سمندر کی سیر کر رہا تھا۔ کہ طوفان نے آن لیا۔ شیلے کی کشتی میں صرف ایک شخص مسٹر ولیم نامی اور تھا۔ باقی سب دوست اور کشتیوں میں تھے۔ طوفان کی تاریکی میں کچھ پتہ نہ چلا۔ کہ کون کدھر جاتا ہے۔ آخر جب طوفان گزر گیا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ شیلے کی کشتی کا پتہ نہیں۔ بڑی تلاش سے دو تین دن کے بعد اس جواں مرگ کی نعش ساحل بحر پر ریت میں دبی ہوئی ملی۔

اٹلی کا ایک قانون تھا۔ کہ نعش وغیرہ ریت میں دبی ہوئی ملے۔ اُسے وہاں سے اُٹھایا نہ جائے۔ اس لئے لارڈ بائرن اور شیلے کے دیگر دوستوں کی یہ صلاح ہوئی۔ کہ پہلے نعش کو جلایا جائے۔ اور پھر راکھ کو دفن کردیا جائے۔

لاشے کو جلانے کا نظارہ نہایت عبرت خیز اور دردانگیز تھا۔ شیلے کے

ایک دوست (لیتھ ہنٹ) نے اِس وقت چشم دید کیفیت مندرجہ ذیل الفاظ میں قلم بند کی ہے" بحیرہ روم جو اب بالکل با امن اور صاف تھا۔ ساحل کے بوسے لے رہا تھا۔ گویا کہ اپنا صلح کا پیام دیتا تھا۔ زرد ریت اور نیلا آسمان عجیب انداز سے ایک دوسرے کے مقابل نظر آرہے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا پہاڑوں کی چوٹیوں کو چھُوتی ہوئی گزرجاتی تھی۔ آگ کے شعلے آسمان کی طرف زور و شور سے بلند ہو رہے تھے۔ اور اُن کے کپکپانے اور ہلنے سے ایک عجیب ناقابل بیان چمک پیدا ہوتی تھی"

ایک بات جو خصوصاً اِس واقعہ کے متعلق قابل ذکر ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ شیلے کا دِل شعلوں کی دستبرد سے محفوظ رہا۔ اور راکھ میں سے صحیح وسالم نکالا گیا۔

آہ! آگ کے بے رحم شعلے بھی شاعر کے نازک دل کی قدر کرتے ہیں لیکن اے موت! تیرا تیر کسی کو نہیں چھوڑتا۔

محمد سعید
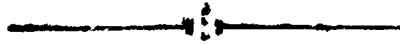
گالیاں

اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا۔ کہ گالیاں بھی انسان کے کلام میں ایک جزو ہیں۔ بہت کم لوگ ہیں۔ جو اُن سے بالکل پرہیز کرتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی گالی ہر شخص کی زبان پر غصّہ کے وقت آجاتی ہے بعض نہایت شریف اَور متقی لوگ جو عام طور پر گالی کو بہت بُرا سمجھتے ہیں۔ کسی وقت غصّہ کے مارے بیتاب ہو کر کسی کی شان میں تبرّے بازی کرتے ہیں۔ مگر صرف اِسی حالت میں کہ انہیں اپنی زبان پر قابو نہیں رہتا۔ وجہ یہ ہے کہ گالی دینے کی عادت اُس وقت پڑ جاتی ہے۔ کہ جب انسان نیک و بد میں تمیز نہیں کر سکتا اَور نہ اپنی عزّت و وقار کا چنداں خیال ہوتا ہے۔

سب لوگ ایک قسم کی گالیاں نہیں دیتے۔ رذیل بازاری لوگ جو فحش اَور غلیظ گالیاں بکتے ہیں۔ شریف وہ الفاظ کبھی نہیں مُنہ سے نکال سکتے۔ ہاں ہر سوسائٹی میں بعض لوگ ایسے ضرور ملیں گے۔ جو مہذّب اَور تعلیم یافتہ طبقہ میں میل ملاپ رکھتے ہیں۔ اَور خود بھی معزز ہوتے ہیں۔ مگر جب وُہ گھر میں آتے ہیں۔ یا ایسے لوگوں میں جاتے ہیں جن سے اُن کی نہایت بے تکلّفی ہو یا جو اُن سے ادنےٰ ہوں۔ تو وُہ ایسے ایسے کلمات کہہ ڈالتے ہیں۔ کہ اِن کی نسبت اِن کے مہذّب دوست کبھی ایسا گمان نہیں کر سکتے۔ مگر عادت ایک ایسی چیز ہے۔ کہ انسان پر کبھی نہ کبھی غلبہ پا لیتی ہے۔ اَور ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ شائستہ سوسائٹی میں کسی وقت اُن کے مُنہ سے ایسا لفظ نکل جاتا ہے۔ کہ اُن کو شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ مَیں نے ایک دفعہ دیکھا۔ کہ ایک بہت بڑے تعلیمی جلسہ میں جہاں

ملک کے برگزیدہ لوگ جمع تھے۔ اور ایک صاحب کسی خاص مضمون پر نہایت جوش کے ساتھ تقریر کر رہے تھے۔ اُن کے مُنہ سے بے تکلّف ایک غیر مہذب لفظ نکل گیا۔ جو معلوم ہوتا ہے۔ کہ معمولی بول چال میں اُن کا تکیۂ کلام تھا چنانچہ تمام لوگ باوجود آداب محفل کے بے اختیار قہقہ لگا کر ہنس پڑے۔ جو ندامت اُس وقت اِن بزرگ کو ہوئی ہوگی وُہ ظاہر ہے۔

مگر پیشتر اس کے کہ گالیوں کے اخلاقی پہلو کو لیں ہمیں دیکھنا چاہئے کہ اِن کا ماخذ کیا ہے۔ انسان کے تمام افعال کسی نہ کسی علت سے خالی نہیں ہوتے۔ اور ہر ایک رسم وعادت کی کوئی ابتدا ہوتی ہے۔ اور کوئی خاص ضرورت اِس کا موجب ہوتی ہے قیاس یہ کہتا ہے۔ کہ جوں جوں انسان کے باہمی تعلّقات بڑھے۔ اور تمدّن نے ترّقی کی۔ اِسی قدر زبان ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔ اِس لئے کہ انسان کے تعلّقات کا سب سے بڑا آلہ زبان ہی ہے۔ پھر تعلّقات کے بڑھنے سے محبّت اور نفرت بڑھنے لگی۔ اب یہ بات لازمی تھی۔ کہ محبّت اور نفرت کا اثر زبان پر پڑے۔ پس محبّت نے وُہ تمام الفاظ پیدا کئے۔ جو دعاؤں میں، تہنیتوں میں، تعریفوں میں، کہے جاتے ہیں اور نفرت نے تمام گالیاں۔ بد دعائیں اور نفرین و مذمّت کے کلمات کو ایجاد کیا۔ اور پھر مختلف حالات اور زمانوں مختلف طبیعتوں اور موقعوں نے اُن میں اِس قدر گوناگونی اور کثرت پیدا کر دی۔ کہ آج اگر کُل دُنیا کی صرف گالیوں کی ایک لُغت بنائی جائے تو اُمید ہے کہ نہایت ضخیم کتاب بن جائے۔

گالیوں کا امتحان کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ کئی قسم کی ہوتی ہیں۔ بعض دھمکیاں ہوتی ہیں۔ جو ایک انسان کے دوسرے پر غالب ہونے کا اظہار کرتی ہیں۔ بعض بددُعائیں جو بولنے والے کی اپنی عاجزی ظاہر کرتی ہیں۔ مگر اُس کے دل کی خواہش کو بتاتی ہیں۔ کہ اگر اِس کے اختیار میں ہو یا خُدائی طاقت اِس کے پاس ہو تو وُہ اس طرح خلق کو نقصان پہنچائے۔ انسان پر بعض اوقات اِن کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ اور دُکھے ہوئے دِل

کی بد دعا نہایت خوفناک سمجھی جاتی ہے۔ شعراء نے اِس خیال کو کئی طرح سے ظاہر کیا ؎

منجنیق آہِ مظلوماں بہ صبح / سخت گیرد ظالماں را در حصار

؎ بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دُعا کردن
اجابت از درِ حق بہرِ استقبال مے آید

بعض صرف دوسرے کی مذمّت ظاہر کرتی ہیں۔ اور بولنے والا دوسرے شخص کی نسبت بُری رائے کا اظہار کرتا ہے۔

گالیوں کی نسبت یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ کہ اگر مختلف قسم کی گالیوں کے الفاظ کے موضوع کی بابت سوچا جائے تو پتہ لگتا ہے۔ کہ وُہ انسان کی مختلف حالتوں پر اثر ڈالتی ہیں۔ اور جو چیز سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ اُس کی گالی سب سے زیادہ صدمہ پہنچانے والی ہوتی ہے۔ اور دل کو کڑوی لگتی ہے مثلاً مستورات کے حیا کا پاس ہر شخص کو بدرجۂ غایت ہوتا ہے۔ اور انسانی غیرت کا یہی تقاضا ہے۔ اِس لئے سب سے غلیظ گالیاں وُہ ہیں۔ جو اِس غیرت پر حملہ کرتی ہیں۔ اور ایک شریف آدمی کے لئے کوئی بات اِس سے زیادہ دل دُکھانے والی نہیں ہو سکتی جس قدر کوئی ایسی گالی جو اِس کے گھر کے پردہ عصمت کو ہدف بنائے۔

بعض گالیاں ایسی ہیں۔ جن میں خراب پیشوں اور بے حیائی اور بے عزّتی کی عادتوں سے نسبت دی جاتی ہے۔

اِن سے اُتر کر وُہ گالیاں ہیں۔ جن میں انسان کو ناپاک اور ادنےٰ حیوانوں سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔ اور نسبتاً بھلے مانس لوگ عموماً ایسی گالیاں طیش کے وقت بچّوں یا نوکروں کی تنبیہہ کے لئے بولتے ہیں۔ بد دعاؤں میں یا تو مخاطب کی اپنی یا اِس کے عزیزوں کی مَسرت چاہتے ہیں۔ یا اُن کے لئے کوئی سخت بیماری یا مُصیبت تجویز کی جاتی ہے۔

مگر سب قسم کی گالیوں میں ایک بات ظاہر ہے۔ کہ شاید انسان کا کوئی فعل اِس قدر بے سوچے سمجھے اور بے معنی نہیں ہوتا۔ ایک شخص دوسرے کو ہزار گالیاں دے ڈالتا ہے۔ جن میں دھمکیاں بھی ہوتی ہیں۔ بد دعائیں بھی مذمتیں بھی مگر سب سے نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ کہ بولنے والا اُس سے خفا ہے۔ اور اس وقت اِس کا غصّہ مشتعل ہے۔ بسا اوقات گالیاں دینے والا اُس شخص کا جسے گالیاں ملتی ہیں۔ دُنیا میں سب سے بڑا خیر خواہ ہوتا ہے۔ اور اگر وُہ شخص ایک لحظہ کے لئے سوچے کہ جو کچھ میرے مُنہ سے نکل رہا ہے۔ میرا دل اُس کی کہاں تک تصدیق کرتا ہے۔ تو وُہ دیکھے گا۔ کہ وُہ ایک محض عبث فعل کر رہا ہے۔ اور ہوا کو ناحق صدمات پہنچا رہا ہے۔ بارہا جسے صلواتیں سُنائی جاتی ہیں۔ وُہ موجود نہیں ہوتا۔ بلکہ کوئی فردِ بشر بھی پاس نہیں ہوتا۔ مگر دل کا غصّہ ہے۔ کہ آواز کی سینکڑوں شکلیں اختیار کر کے نکل رہا ہے۔ اور کہنے والے کے اپنے کانوں کو ہی اُس کا مزا آرہا ہے۔ کون شخص ہے جس نے سڑک پر چلتے گاڑیبانوں اور چھکڑے والوں کو اپنے گھوڑوں یا بیلوں کو ہزار ہزار گالیاں دیتے نہیں سُنا۔ کبھی اِس حیوان کی ماں اور کبھی اُس کی بہن معرضِ عتاب میں آرہی ہے۔ اور کبھی اُس کے پہلے مالک اور بیچنے والوں کی تواضع کی جارہی ہے۔ بعض لوگ جب کسی کام میں مصروف ہوتے ہیں۔ اور اِس میں کوئی مشکل پیش آجاتی ہے۔ مثلاً کیل گاڑنے یا دھاگے کی گانٹھیں کھولنے یا برسات کے باعث سخت ہوئے ہُوئے قفل یا کواڑ کھولنے میں دقّت ہوتی ہے۔ تو جب تک وُہ کام نہ ہو جائے۔ متواتر گالیاں دیئے جاتے ہیں۔

بعض دیوانے یا مخمور لوگ یونہی مغلّظات بکتے ہیں جو اُن کے دیوانہ پن کے یا حالتِ نشہ کے کرشمے ہوتے ہیں۔ اور نفس کی ناپاکی کو ظاہر کرتے ہیں۔

ہمارے مُلک میں جُہلاء جب خوشی میں آتے ہیں۔ تو تفریحاً ایک دوسرے کو گالیاں دیا کرتے ہیں۔ ہولی کا تہوار جو یہاں ایک مشہور تہوار ہے۔ اور موسمِ بہار میں

آتا ہے۔ اہلِ ہنود اس میں بہت خوشیاں مناتے ہیں۔ اِس میں ادنےٰ بازاری لوگ صرف دل لگی کے لئے ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہیں۔ بچّوں کو نئی سے نئی گالی سکھائی جاتی ہے۔ جو دُکان پر بیٹھ کر ہمسایہ دُکان والوں کو جن سے بے تکلّفی ہوتی ہے۔ گالیاں دیتے ہیں۔ اور اِس زرِ قلب کا خوب دل کھول کر لین دین ہوتا ہے۔ اِنہی دنوں میں بازاروں میں نوجوانوں کے بڑے گروہ ایک جگہ جمع ہو کر کسی خاص شخص پر آوازے کستے ہیں۔ جو اپنے کوٹھے پر بیٹھا اُن کا جواب دیتا ہے۔ اِسی مشغلہ میں بعض اوقات ساری ساری رات گزر جاتی ہے۔ جسے گالیاں دی جاتی ہیں۔ وُہ خاموش رہنا اپنی ہتک سمجھتا ہے۔ اور ہرچند اس کا گلا بیٹھ جاتا ہے۔ اور اُس کی آواز خستہ ہو جاتی ہے۔ اور بے خوابی کی زحمت برداشت کرنی پڑتی ہے۔ مگر وُہ یہ بے عزّتی ہرگز ہرگز گوارا نہیں کر سکتا۔ کہ اُس سے گالیوں کا جواب بن نہیں پڑا۔ یہی حال بعض عورتوں کا ہے۔ جنہوں نے زبانی لڑائی کو بے کاری کا ایک مشغلہ قرار دے رکھا ہے۔ بعض بدزبان عورتوں نے خوش مزاجی میں اِس بات کا اقرار کیا ہے۔ کہ لڑائی میں انہیں ایک قسم کا مزا آتا ہے۔ اور جب کئی دن سے وُہ کسی سے دوبدو نہیں ہوتیں۔ تو خواہ مخواہ کوئی بہانہ پیدا کر لیتی ہیں۔ بلکہ ایک خاص فرقہ کی عورتوں کی نسبت مشہور ہے۔ کہ جب اِن پر یہ ضدّی جذبہ غالب آتا ہے۔ تو وُہ اپنی ہمسائی کو بُلا کر لڑائی کی دعوت کرتی ہیں۔ اور اِس طرح ایک عظیم زبانی جنگ کی طرح ڈال دیتی ہیں۔ جو کئی کئی دن تک جاری رہتی ہے۔ نئی نئی اور فی البدیہ گالیاں جو اُن کا حاضر جواب دماغ ایجاد کرتا ہے۔ اُن کا دُور دُور کے گھروں میں چرچا ہوتا ہے۔ اور ہم چشموں میں بہت تعریف ہوتی ہے۔

ہمارے مُلک کی بعض اقوام میں بیاہ کے موقع پر جب دولھا والے برات لے کر آتے ہیں۔ تو دولھن والے گھر کی عورتیں اپنے سمدھیوں کو اور برات والوں کو مقفّےٰ گالیاں

دیتی ہیں جنہیں ٹھٹھیاں کہتی ہیں۔ اکثر فحش باتیں بے تکلفی سے کہی جاتی ہیں۔ اور وُہ عورتیں بھی جو عام طور پر بہت کم گو اور باحیا سمجھی جاتی ہیں۔ اس رسم میں شامل ہوتی ہیں۔ گویا وُہ خاص موقعہ اِن کو قبیح رسم کی اجازت دے دیتا ہے۔ اور اُن کے مرد بھی اِس سے اغماض کرتے ہیں۔ بلکہ بعض خوش ہوتے ہیں۔

بے معنی گالیوں کے ذکر میں اِس مذموم عادت کا بیان کرنا شاید بے جا نہ ہوگا جو بدقسمتی سے ہندوستان کے لوگوں میں موجود ہے اور وُہ یہ ہے۔ کہ چھوٹی لڑکیوں کو پیار کے موقعہ پر ایسے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے۔ جو دراصل نہایت دل دُکھانے والے ہوتے ہیں حالانکہ یہ محض ایک عادت ہے۔ اور اُن کے کہنے والے اِن لڑکیوں کو دل سے عزیز رکھتے ہیں۔ اور جس وقت یہ الفاظ کہے جاتے ہیں۔ باقی تمام حرکات نہایت ہی مہربانی اور ناز برداری کی ہوتی ہیں۔ مگر نتیجہ ہے۔ اہل ہندوستان کے اِس غلط اور خود غرضی کے خیال کا جس سے اُنہوں نے اپنے آپ کو اناث سے اس قدر بلند پایہ اور اُن کا حاکم مطلق سمجھ رکھا ہے۔ اور اُن پر طرح طرح کی غلامی کی قیدیں لگا رکھی ہیں۔

جو لوگ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوتے ہیں۔ اور جو اصلاحِ نفس اور اصلاح ابنائے جنس کے خواہاں ہیں۔ انہیں گالیوں سے قطعی پرہیز کرنا چاہئے نہ اِن ہی انسان کی تہذیب کا پہلا معیار ہے اور گفتار کا اثر انسان کے افعال اور اخلاق پر ہوتا ہے۔ کبھی کوئی شخص مہذّب نہیں بن سکتا جب تک اِس کی زبان مہذّب نہ ہو۔ گالیاں بدتہذیبی کا نشان ہیں۔ اور بے تہذیبی کی یادگار ہیں۔ اور ہر ایک شخص کو کوشش کرنی چاہئے۔ کہ وُہ اِن سے احتراز کرے۔ اور اپنی اولاد کو ایسے لوگوں کی ہم نشینی سے بچائے۔ جو دشنام دہی کے عادی ہیں۔ گالیوں کی عادت نہ صرف انسان کو اخلاقی اور روحانی اصلاح سے باز رکھتی ہے۔ بلکہ اچھی صحبت میں بیٹھنے کے ناقابل کر دیتی ہے۔ اور خودداری اور غیرت کا مادہ دُور کر دیتی ہے۔ اِس لئے کہ جو دوسروں کو بُرا کہتا ہے۔ وُہ سُنتا بھی ضرور ہے۔ بقول شخصے

دہن خویش بدشنام میالا صائب
کین زرِ قلب بہر کس کہ دہی باز دہد

مولوی عبدالرشید چشتی مرحوم
بی اے

ناکتخدا لڑکی

اے معزز خاندان کی کم سن پیاری لڑکی! تیرے خوبصورت چہرے سے عالی خاندانی کے آثار نمایاں ہیں۔ شریف والدین کے تعلیمی اثر نے تجھے چھوٹی سی عمر میں بُرد بار اور متین بنا دیا ہے۔ لیکن تقاضائے عمر کی بے چینیاں تیری صورت سے ٹپک رہی ہیں تیری بھولی بھالی باتیں پتہ بتا رہی ہیں۔ کہ بام عمر کی صرف دسویں سیڑھی تک تیرا قد پہنچا ہے۔ بس اب دو تین زینوں پر قدم رکھنے کے بعد تیری زندگی کا ایک نیا مرحلہ شروع ہوگا۔ کیا تجھے یہ لاابالی زمانہ یاد رہے گا۔ نہیں۔ پھر تو کسی اور زمانہ میں چلی جائے گی۔ تیرے اس مکان کی چار دیواری جو اس وقت تیری دُنیا ہے۔ اور تیرے مکان کی چند گز زمین جو تیری سیرگاہ ہے۔ پھر اُسے کہاں پائے گی۔ اے عیش و آرام کی گودیوں میں پلی ہوئی دوشیزہ لڑکی خدا کرے۔ تو جیسی خوبصورت ہے ویسی ہی خوش نصیب بھی ہو۔ تیرا نیک شوہر کسی شریف خاندان کا ممبر اور تعلیم یافتہ نوجوان ہو۔ اور یہ خدا کی دی ہوئی نعمت تیرے لئے سرمایۂ ناز ہو۔ تو اپنے ہم جنسوں میں فخر و مباہات کرے۔ اور وہ تیری عصمت اور سلیقہ شعاری کا قدردان ہو۔ بھولی ناسمجھ لڑکی ابھی تو تو گڑیوں سے کھیل رہی ہے۔ انہیں سے تیرا دل بہلتا ہے۔ اور انہیں کو تو پیار کرتی ہے۔ انہیں کو تو اپنے ہاتھ سے سی سی کر عمدہ کپڑے پہناتی ہے۔ اور انہیں کو تو اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے گھروندے یا طاق میں بٹھا کر اپنی صناعی کا تماشا دیکھتی ہے۔ اور دل ہی دل میں شاد ہوتی ہے۔ اللہ اللہ تو اس عالم کے مزے لوٹ رہی ہے جس کو دُنیا

سے کوئی تعلق نہیں۔ تیرا چھوٹا بھائی تجھ کو ستانے کے لئے تیری گڑیوں کو تتر بتر کر دیتا ہے۔ اور انہیں نوچ کھسوٹ ڈالتا ہے۔ تو تو کبھی رونے لگتی ہے۔ اور کبھی فریاد کرتی ہے کبھی اس شوخ لڑکے کو کوستی ہے۔ اور اگر زیادہ غصّہ آتا ہے۔ تو اُس کے دونو ہاتھ پکڑ کر زمین پر گرا دیتی ہے۔ وُہ چالاک لڑکا کیا صفائی سے ہاتھ چھڑا کر نکل جاتا ہے۔ اور تو منہ دیکھ کر رہ جاتی ہے۔ پھر تو آنسو پونچھ کر اپنی چیزوں کو ٹھکانے سے رکھتی ہے۔ پیاری زہرہ! (ہاں یہی تیرا نام ہے) جب تو نے اپنے ہمسائے کی لڑکی رشیدہ سے اپنے گڑیا کی شادی کی اور تیری ساری سہیلیوں نے خدائی رات میں ڈھول بجا بجا کر شادیانے گانے گائے کیا اُس وقت تجھے یہ خیال نہ آیا تھا۔ کہ تیرا دُولہا بھی آخر کوئی ہوگا۔ جو کسی روز اس گڑیا کی طرح تجھے بھی بیاہ لے جائے گا جس کو تو نے بنا سنوار کر بٹھایا ہے۔ نہیں تجھے یہ خیال کیوں آنے لگا۔ شرافت کا خون جو تیری رگوں میں شرم و حیا بن کر دورہ کر رہا ہے۔ وُہ ایسے معاملوں کی طرف تیرے ذہن کو منتقل ہونے نہ دے گا۔ تیری بھولی صورت کہہ رہی ہے۔ کہ شرم والی لڑکی ہے۔ تو میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ تیری چھوٹی سی چوٹی جو شفیق ماں نے اپنے ہاتھ سے گوندھ دی ہے۔ اِس کو بھی تیری بے پروائی سنبھال نہیں سکتی۔ آگے کے چھوٹے چھوٹے بال چوٹی سے کھل کر لچھے دار ہو گئے ہیں۔ اور چاندسی پیشانی پر لہرا رہے ہیں۔ تو گھبرا گھبرا کر اُن کو پیشانی سے ہٹاتی ہے۔ مگر وُہ حسین چہرے کی بلائیں لینے کو جھکے پڑتے ہیں۔ ظاہری نمائش اور مصنوعی آرائش سے تیری مستغنی طبیعت کو کس قدر نفرت ہے۔ قدرت کے پاک ہاتھوں کی بنائی ہوئی تصویر عصمت کا فرشتہ تجھ کو اپنے پروں میں چھپائے ہوئے ہے۔ کہ تیرے خداداد حُسن کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ بے مسّی کے چمکتے ہوئے خوشنما دانتوں کا سلسلہ سلکِ مروارید کو شرما رہا ہے۔ بغیر کاجل کے شرم و حیا بھری ہوئی آنکھوں کا جادو مہربان والدین

کا دل اُبھار رہا ہے۔ مگر ہاں اے نیک بخت زہرہ! آج تیری ماں کے کلیجے میں پنکھے کیوں لگے ہیں؟ تو اپنی ہم عمر سہیلیوں کے ساتھ ہنڈ کلھیا پکا رہی ہے۔ اور وہاں گھر کے بڑے بوڑھوں میں سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔

ناسمجھ لڑکی تو جس گھر میں پلی ہے۔ اِس کے در و دیوار پر اک حسرت بھری نظر ڈال کے الوداع کہ لے۔ اور اپنی پیاری پیاری گڑیوں سے بھی رخصت ہولے۔ اب تو اُن سے چھوٹ جائے گی۔ اور دُنیا داری کے کام تیرے گلے پڑیں گے۔ تجھے ایک نئے گھر میں جانا ہے۔ جہاں کا آسمان و زمین بھی تیرے لئے بے گانہ ہے۔ نئے نئے لوگ ہوں گے۔ نئی نئی صورتیں دیکھنے میں آئیں گی۔ تو اپنے گھونگٹ کے اندر رہی اندر حسرت بھری نظریں دوڑائے گی۔ مگر تیری پیاری سہیلیاں تجھے نظر نہ آئیں گی۔ بہت دن تیرا دم گھبرائے گا۔ جس نے تجھے اپنی گود میں پالا جس نے تیری ضد پوری کرنے کے لئے ہزاروں مصیبتیں جھیلیں۔ وہ عاشق زار ماں چھوٹ جائے گی۔ تیرے چاہنے والے رَضِینَا بِاَمْرِ اللہ کہہ کر تجھے اک ایسے اجنبی کے سپرد کر دیں گے۔ کہ جس کی صورت بھی آج کے سوا تو نے کبھی نہ دیکھی ہوگی۔ اب وہ ہمیشہ کے لئے تیرا چاہنے والا دولھا تیری نیک مزاجی اور سلیقہ شعاری کا قدردان ہوگا۔ تیری ماں نے اپنے کلیجے پر پتھر رکھ لیا تو ایک غیر شخص مگر وارثِ شرعی کے پہلو میں ہے۔ اپنے بھولے چہرے سے ہاتھ اُٹھا کر دیکھ۔ اُس کی مانوس نگاہیں محبت میں ڈوبی ہوئی تیرے دریائے حسن کی موجوں میں غوطہ کھا رہی ہیں۔ کیا تو اِس بات سے خوش ہے۔ کہ اک حسین نوجوان کے پہلو میں بیٹھی رہے؟ نہیں تو ابھی خوش نہیں۔ مگر آئندہ خوشی کی اُمید رکھ۔ ناسمجھ لڑکی! تیرے آنسو کیوں ڈبڈبائے ہوئے

ہیں۔ تو ہچکیاں لے لے کر کیوں رو رہی ہے۔ اب اپنا گھر کیوں یاد کرتی ہے۔ آنکھیں کھول اور دیکھ کہ اب یہی ہمیشہ کے لئے تیرا گھر ہے۔ اور یہ اجنبی جوان تیرا شوہر ہے زُہرہ! اپنے مُتّصل گریہ کو روک کہ ہچکی تھمے دل کو ٹھہرا۔ اور سُن دُکھیا ماں تجھے دُعا دیتی ہے۔ اور تجھ سے رخصت ہوتی ہے۔ میری پیاری بچّی میری نادان زُہرہ! خدا تیرے خاوند کو نیک ہدایت دے۔ وہ تیرا اَنلوا دیکھ کر کسی کا مُنہ نہ دیکھے۔ تیرا گھر آباد رہے۔ تو پھلے پھُولے ساتھ بچّوں کی ماں رہو۔

(منشی مہدی حسن احسن لکھنوی)

دربارِ بغداد کی ایک جھلک

تاریخ اسلام بتاتی ہے۔ کہ خلافتِ اسلامیہ کی اصلی سادگی خلفاء راشدین کے زمانہ تک قایم رہی۔ اور جب عنانِ سلطنت امیر معاویہ کے ہاتھ میں شخصی حکومت کی صورت میں آئی۔ تو جمہوری اصول کے خاتمہ کے ساتھ ابتدائی سادگی کی بنیاد بھی کمزور ہو گئی۔ اور بنی اُمیّہ کی مُلکی ترقی کے ساتھ شان و شوکت بھی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ عبد الملک اور ولید کے زمانہ تک اُس کی صورت ایک عظیم الشان خود مختار حکومت کی ہو گئی۔ لیکن پھر بھی بنی اُمیّہ کے تمام زمانہ حکومت پر ایک حد تک عربی آزادی۔ عربی بے تکلفی اور عربی اخلاق کا رنگ چڑھا رہا۔ یہاں تک کہ ایک بدوی تک کو دربارِ خلافت میں بار مل سکتا تھا۔ اور وہ نہایت بے تکلفی سے امیرِ وقت کی شان میں جو چاہتا تھا کہہ گزرتا تھا۔ لیکن جب زمانہ کی اُلٹ پھیر نے ابو مسلم خراسانی کو خاکِ ایران سے اُٹھا کر بنی اُمیّہ کو نیست و نابود کیا۔ اور تاجِ خلافت بنی عبّاس کے سر پر رکھا تو جس طرح ابتدائی سادگی کا خاتمہ دولت بنی اُمیّہ کے قیام کے ساتھ ہوا تھا یہی سہی عربی شان کا خاتمہ بنی عبّاس کے ہاتھ میں جن پر ایران کی آب و ہوا پورا اثر کر گئی تھی۔ علمِ سلطنت آنے کے ساتھ ہو گیا۔ اور منصور نے تو بغداد کو مدائن قدیم دار السلطنت ایران کے قریب آباد کر کے اِس امر کا اعلان کر دیا۔ کہ گویا سلطنتِ ایران دوبارہ زندہ ہو گئی ہے۔ بلکہ اِسی وجہ سے اُس نے یہ کوشش بھی کی گو کہ اِس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ کہ وہاں کے محلات کو اُکھاڑ کر سر زمین بغداد پر قائم کرے۔ خلفائے بنی عبّاس کے زمانہ

ہیں بوجہ اس کے کہ اکثر قبائل عرب کی نسبت گمان تھا۔ کہ وہ ہی اُمیّہ کے ہمدرد ہیں۔ اور ان کا عروج جو کچھ ہوُا تھا۔ وہ عجمی تلواروں کی بدولت ہوُا تھا۔ اس امر کی بھی قید باقی نہیں رہی تھی کہ ارکانِ سلطنت شرفائے عرب ہی سے ہوں۔ بلکہ ابتداء ہی سے اُن کے مشیر و ندیم اکثر ایرانی ہوتے تھے۔ اور اس وجہ سے سلطنت کی ترقی کے ساتھ قدیم عربی سادگی کی بجائے ایرانی تکلّفات قائم ہونے لگے۔ اور عام طرزِ معاشرت پر بھی ایرانی تمدّن کا رنگ چڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ آخر زمانہ میں خلفائے بنی عبّاس کچھ کلاہانِ ایران کی طرح کسی کو اِس قابل بھی نہ سمجھتے تھے۔ کہ کوئی اُن کی صُورت دیکھے۔ شخصی سلطنت میں یہ بہت بڑی خرابی ہے۔ کہ تمدّنی ترقی انحطاطِ قوّت کے دوش بدوش ہوتی ہے۔ اور اُسی کا یہ نتیجہ ہوُا۔ کہ جس قدر قوم میں تمدّنی ترقی ہوئی۔ اور سلطنت کی ظاہری شان و شوکت بڑھی۔ اسی قدر اصلی قوّت میں کمی ہوتی گئی۔ خلفائے اسلام کی سادگی کی یا تو یہ کیفیت تھی۔ کہ جب امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ تعالےٰ کے زمانہ میں قیصرِ رُوم کا قاصد آیا ہے تو آپ مسجدِ نبوی میں عام فقرا کے ساتھ سوتے ہوئے پائے گئے تھے۔ لیکن اِس کے ساتھ سطوت و جبروت کا یہ عالم تھا۔ کہ خسروِ ایران و قیصرِ روم باوجود ہزارہا کوس کے فاصلہ کے اپنے زرنگار تخت پر بیٹھے ہوئے لرزتے تھے۔ یہ تو پہلا سین ہے۔ اب آخری سین دیکھئے۔ کہ ظاہری شان و شوکت کا کیا عالم تھا۔ اور رعب و داب کی کیا کیفیت تھی۔ امیر معاویہ کے زمانہ سے قیصرِ قسطنطنیہ سے جنگ کا سلسلہ چلا آتا تھا۔ اور تختِ حکومت کے ساتھ یہ مرضِ مزمن بھی بنی عبّاس کو ملا تھا۔ خلیفہ المقتدر باللہ کے زمانہ میں بھی جو ۹۰۸ء میں تختِ خلافت پر تیرہ سال کی عمر میں متمکن ہوُا۔ یہ موروثی مرض اپنی بہار دکھا رہا تھا۔ اور ۹۱۷ء میں ادہر تو المقتدر کی یہ حالت ہوئی۔ کہ اندرونی بغاوتوں نے سر اُٹھایا۔ اُدہر ملکہ زُوکو جو اپنے فرزند قسطنطین ہفتم کی طرف سے فرماں روا تھی اِس امر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کہ اپنے لشکر کو سرحدِ شام سے ہٹا کر مشرقی سرحد پر بلغاریہ

کے نیم وحشی گردہوں کے حملہ سے محفوظ رکھنے کے لئے جمع کرے۔ غرضکہ فریقین کے ایسے حالات تھے۔ کہ صُلح کو بمقابلہ جنگ کے غنیمت سمجھتے تھے۔ لیکن چونکہ حال میں اسلامی سپاہ کو زیادہ کامیابی ہوئی تھی۔ اِس لئے تقدیم ملکہ ہی کی طرف سے ہوئی۔ اَور اس نے اپنی طرف سے دو سفیر جن کے نام۔ جان رہاڈنیس اور میکائیل ٹوکزادس تھے۔ صلح کرنے کے لئے بھیجے۔ جس باعظمت دربار میں یہ سفیر امیر المؤمنین کے حضور میں حاضر ہوئے تھے۔ اِس کے حالات ابھی تک "تاریخ خطیب" کے صفحوں میں جس کے تین نسخے برٹش میوزیم میں موجود ہیں۔ دستبُردِ زمانہ سے محفوظ ہیں۔ اَور ان سے ایسی قوی روشنی بنی عبّاس کی شان وعظمت اور اس زمانہ کی طرزِ معاشرت پر پڑتی ہے۔ کہ اس وقت کے تمدّن کی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اِن حالات کی اشاعت اس زمانہ میں اور بھی زیادہ مناسب ہوگی۔ کہ لارڈ کرزن کی جاہ پسندی نے دربار تاج پوشی کے ذریعہ سے اس امر کی کوشش کی کہ ایشیائی شان وشوکت کی ایک ایسی یادگار قائم کی جائے۔ کہ اس کی مثال زمانہ قدیم میں بھی نہ مل سکے۔ لیکن اس قدیم دربار کے حالات کے پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے۔ کہ گو اہل یورپ مادی ترقی میں ہم سے کہیں آگے بڑھ گئے ہوں۔ لیکن جہاں تک کہ ظاہری شان وشوکت اَور تزک واحتشام کا تعلّق ہے۔ وُہ اہلِ ایشیا کے پاسنگ کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اِس دربار کے حالات بیان کرنے میں ہم نے اس سے زیادہ تصرّف نہیں کیا ہے۔ کہ تمام معتبر روایتوں کو ایک سلسلہ میں منتظم کردیا ہے۔ جب قیصر روم کے سفیر تکریت پہنچے۔ تو دربارِ خلافت سے حُکم ہُوا۔ کہ وُہ ابھی دو مہینہ تک وہیں رکھے جائیں۔ چنانچہ اِس کے بعد ان کو آگے بڑھنے کی اجازت ہوئی۔ اَور جب بغداد میں پہنچے۔ تو ایک عالیشان محل ان کے رہنے کے لئے دیا گیا۔ جس کا نام دارسعید تھا۔ اور وہاں بھی دو مہینہ تک ان کی ضیافت اَور مہمانی ہوتی رہی۔ ادہر المقتدر نے ارادہ کرلیا۔ کہ سفرائے روم کو خلافتِ اسلامیہ کی شان وعظمت کا ایسا تماشا دکھایا

جائے۔ کہ وُہ اپنے بادشاہ کی بے حقیقتی کے قائل ہو کر صلح کو ذریعۂ نجات سمجھیں۔ اور آئندہ لڑائی کا نام نہ لیں۔ غرض دو مہینے تک برابر محلات شاہی کی آراستگی ہوتی رہی۔ اور جب تمام ساز و سامان درست ہوگیا۔ تو سفیروں کو اطلاع دی گئی۔ کہ وُہ تیار رہیں۔ صُبح کو شرفِ باریابی حاصل ہوگا۔ دوسرے روز صبح ہی سے تمام شہر میں عجب دھوم دھام مچی ہوئی تھی۔ ایک لاکھ ساٹھ ہزار سوار اور پیدل زرق برق لباس پہنے اور مختلف قسم کے مرصّع ہتھیاروں سے مسلح باب الشماسیہ سے لے کر ایوانِ خلافت تک دو صفوں میں خوش ترتیبی سے کھڑے کئے گئے۔ سواروں کے زین سونے اور چاندی کے تھے۔ اور اُن کے سامنے ان کے کوتل گھوڑے مرصّع زیور اور قیمتی زینوں سے آراستہ استادہ کئے گئے تھے۔ ہر گلی کوچہ میں خلائق کا عجب اژدحام تھا۔ غرضکہ سڑکوں بازاروں دوکانوں بالاخانوں پر جہاں نظر جاتی تھی۔ لوگوں کے پُر اشتیاق چہروں کے سوا کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔ موقع کی دُکانوں اور بلند بالاخانوں کو لوگوں نے بہت بہت سے درہم دے کر کرایہ پر لیا تھا[1]۔ دریائے دجلہ میں بھی عجب عالم تھا قسم قسم کی کشتیاں اور زورقیں اور بغلے جو نہایت نفاست کے ساتھ آراستہ کئے گئے تھے۔ خوشنما ترتیب سے جمع تھے غرضکہ جس طرف دیکھو عجب سماں نظر آتا تھا۔ اتنے میں سفیر بھی گھوڑوں پر سوار ہو کر دارِ سعید سے روانہ ہوئے۔ آہستہ آہستہ تمام شہر کا چکّر کاٹتے ہوئے ایوانِ خلافت کے دروازہ پر پہنچے۔ جس کا نام باب عامّہ تھا۔ ایوان خلافت کی آراستگی کا کیا پوچھنا۔ اڑتیس ہزار کمخواب کے پردے جن پر سنہری کلابتوں سے گل و گلشن اور ہاتھی اور گھوڑوں اور اونٹ اور شیروں اور پرندوں کی خوبصورت تصویریں کڑھی ہوئی تھیں۔ جابجا اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ بسنا (جو خجستان میں ہے) اور ارمن اور واسط اور بہسنا (جو سرحدِ روم پر ہے)

[1] اس زمانہ میں ایسے موقعوں پر یورپ کے شہروں میں بڑے بڑے کرایہ دے کر لوگ بالاخانہ وغیرہ لیتے ہیں۔ اس بیان سے معلوم ہوگا۔ کہ یہ طریقہ قدیم سے چلا آتا ہے۔

کے بنے ہوئے پھولدار اور سادے خوشنما پردے بھی جا بجا لٹکے ہوئے تھے۔ اور صرف دبیق کی کامدانیوں کی تعداد بھی اڑتیس ہزار تھی۔ ساڑھے چار ہزار تو صرف سُنہرے کمخواب کے پردے تھے۔ اور بائیس ہزار مجرم اور دار الجرد (فارس میں ہے) اور الدّردق (دغجستان میں ہے) کے بنے ہوئے رنگ برنگ کے قالین اور فرش راستوں اور دیوان خانوں میں بچھے ہوئے تھے۔ اور اسی قسم کے نرم اور قیمتی قالینوں پر چل کر سفیر لوگ باب العامہ سے لے کر دربار تک پہنچے۔ لیکن ان میں وہ قیمتی اور خوش وضع قالین شامل نہیں تھے۔ جو طبرستان اور دبیق کے بنے ہوئے تھے۔ اور خاص دربار کے کمروں میں دوسرے قالینوں پر بچھے ہوئے تھے۔ مگر اُن پر جُوتے پہن کر چلنے کی اجازت نہ تھی۔ محلات میں فوج کو دخل نہ تھا۔ بلکہ صرف خواجہ سرا اور حاجب اور رُومی و حبشی غلام متعین تھے۔ اور زرق برق لباس پہنے ہوئے محلّات کی چھتوں اور کمروں اور راستوں میں صف بستہ کھڑے تھے۔ اِن خواجہ سراؤں کی تعداد سات ہزار تھی جن میں سے چار ہزار رومی اور تین ہزار حبشی تھے۔ اِن کے علاوہ حبشی غلاموں کی تعداد بھی چار ہزار تھی۔ سفیر جب باب العامہ میں داخل ہوئے۔ تو ابو عمر طرطوسی جس کا لقب صاحب السلطان تھا۔ اور جو سرحد شام کی فوج کا سرگروہ تھا۔ ایک سیاہ قبا پہنے اور تلوار پر تلے میں لگائے اُن کے ہمراہ ہوا۔ اُن کو پہلے اس محل میں لے گیا جس کے چار طرف عالی شان دالان بنے ہوئے تھے۔ جن کے ستون سنگ مرمر کے تھے۔ اور ان کی داہنی طرف پانچ سو خوبصورت صبا رفتار گھوڑیاں جن پر سونے اور چاندی کے زین تھے۔ کھڑی ہوئی تھیں۔ اور بائیں طرف بھی پانچ سو گھوڑیاں جن کی پُشت پر کمخواب کے زین پوش اور چہرے پر سُنہری سہرے لٹکتے تھے نظر آتی تھیں۔ ہر ایک گھوڑے کے سامنے ایک ایک سائیس جگمگاتا ہوا لباس پہنے ہوئے کھڑا تھا یہ تماشا دیکھنے کے بعد بہت سے آراستہ دیوان خانوں اور چھتوں سے گُزر کر باغِ حیوانات میں داخل ہوئے۔

اُس محل کے سامنے ایک باغ تھا۔ جہاں ہر قسم کے چرند اور پرند جمع تھے۔ اور وہ
اُن لوگوں کو آتا ہُوا دیکھ کر اکٹھے ہو کر باغ سے نکلے اور محل کے سامنے آکر اُن کو
سُونگھنے لگے۔ اور اُن کے ہاتھوں سے کچھ کھا کر چلے گئے۔ اس کے بعد سفیر اس محل میں
گئے۔ جس کا نام دارالفیل ہے اور وہاں چار ہاتھی کھڑے تھے۔ جن پر طاؤسی اطلس
کی جھُولیں پڑی ہُوئی تھیں۔ اور ہر ایک کی پُشت پر آٹھ آٹھ شیدی اور نیزہ باز آگ
لئے ہوئے بیٹھے تھے۔ اِن کو دیکھ کر آدمیوں پر بہت ہی خوف طاری ہؤا۔ اس کے
بعد وُہ ایک محل میں گئے۔ جہاں سو شیر تھے۔ پچاس داہنی طرف اور پچاس بائیں طرف
اور ہر شیر کا محافظ زنجیر پکڑے ہوئے کھڑا تھا۔ اس کے بعد سفیر الجوشق المحدث میں
پہنچے۔ جس کی چہار طرف خوش قطع باغ تھے۔ ایک باغ کے وسط میں ایک قلعی دار ٹین
کا حوض تھا۔ اور اس میں حسین چشمہ سے پانی آتا تھا۔ اس کی ندی بھی ٹین کی بنی ہوئی تھی۔
جو چمک میں چاندی کو مات کرتی تھی۔ اِس حوض کا طول تیس ہاتھ اور عرض بیس ہاتھ تھا۔
اور اس کے چاروں طرف کونوں پر ایک ایک خوشنما کوشک تھی۔ جن میں زرّین کرسیاں
بچھی ہُوئی تھیں۔ جو دیبق کی بیش بہا کامدانیوں سے آراستہ کی گئی تھیں۔ اور کوشکوں
کے اُوپر کے حصہ پر دیبق کا سنہری کام تھا۔ اس حوض کے چاروں طرف تختے تھے۔ جن میں
چار سو کھجور کے درخت تھے۔ ان میں سے ہر ایک درخت کا تنہ بلندی میں کم سے کم
پانچ ہاتھ تھا۔ اور اس میں جڑھ سے لے کر چوٹی تک ساگوان کا خول چڑھا ہؤا تھا۔
جس پر خوبصورت کھدائی کا کام تھا۔ اور اس پر جابجا تانبے کے حلقے جن پر سونے
کا ملمع تھا چڑھے ہُوئے تھے۔ لطف یہ ہے کہ سب درخت پھلدار تھے۔ اور اُن کا پھل
تقریباً ہر موسم میں رسیدہ ہوتا تھا۔ اور سڑتا نہ تھا۔ باغ کے اطراف کناروں پر دستنبویہ
قسم کے سردوں کی بیلیں ہوتیں۔ اس محل کے دیکھنے سے فارغ ہونے کے بعد وُہ دارالشجرہ
میں آئے جہاں ایک مدوّر حوض کے وسط میں جس میں شفاف پانی بھرا ہُوا تھا۔ ایک

چاندی کا درخت تھا جس کا وزن پانچ لاکھ درہم (تقریباً ڈیڑھ لاکھ تولہ) تھا۔ اس درخت کی اکثر شاخیں چاندی کی تھیں۔ مگر کچھ سونے کی بھی تھیں۔ اور رنگ برنگ کے پتّوں سے لدی ہوئی۔ ہر طرف ہوا میں پھیلی ہوئی تھیں ہوا کے جھونکوں سے درخت کے پتّے ہلتے۔ اور چڑیاں خوش الحانی سے گاتی اور سیٹی بجاتی تھیں۔ اس محل کے ایک طرف حوض کے داہنی اور بائیں طرف پندرہ پندرہ سواروں کی قدِ آدم مورتیں تھیں۔ جو گھوڑیوں پر سوار تھے۔ اور جن کا لباس اور گھوڑیوں کا ساز و یراق سر سے پاؤں تک کمخواب کا تھا سواروں کے ہاتھوں میں لمبے لمبے نیزے تھے۔ اور وہ ان کو مقابل کی صف کی طرف بڑھائے ہوئے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ گویا اب حملہ کرتے ہیں۔ اور چیزیں تو تھیں ہی لیکن جس قدر حیرت رُومیوں کو اس درخت کے دیکھنے سے ہوئی تھی۔ اتنی کسی چیز سے نہیں ہوئی۔ دارالشجرہ کے عجائبات کی سیر سے فارغ ہو کر رُومی قصر الفردوس میں داخل ہوئے۔ یہاں بیش بہا قالین اور نفیس ساز و سامان اس کثرت سے تھا۔ کہ کچھ بیان نہیں ہو سکتا اور اِس قصر کے دیوان خانہ کی دیواروں پر دس ہزار سنہری زرہیں لٹکی ہوئی تھیں۔ اِس کے بعد سفیر ایک پتلے ہوئے راستہ سے گزرے جس کا طول تین سو ہاتھ تھا۔ اور اِس کے دونوں طرف کی دیواروں کو مختلف قسم کے ہتھیاروں سے مثلاً ڈھالیں خود خنجر بنجے زرہ بکتر اور مرصّع تیر و کمانوں سے سجایا گیا تھا یہاں بھی دائیں اور بائیں دو ہزار خواجہ سرا رُومی و حبشی دو صفوں میں کھڑے ہوئے تھے۔ آخر کار اِس طور پر تئیس محلّات کی سیر کرنے کے بعد سفیر لوگ قصر التعین میں داخل ہوئے۔ یہاں خاص خلیفہ کے خدمت گزار غلام خوبصورت اور قد آور نفیس لباس پہنے۔ اور مرصّع ہتھیار لگائے کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تلواریں اور تیر اور عصا تھے۔ اِس کے بعد حبشی غلاموں اور نائب حاجبوں اور چوب داروں اور باڈی گارڈ اور قائدوں (جنرلوں) کے بیٹوں کی صفوں سے گزرتے ہوئے دیوان خانہ کے قریب

پہنچے۔ اور پہلے وہ ایک عالی شان قصر میں داخل ہوئے جس کی آرائش کو دیکھ کر وہ سمجھے۔ کہ یہیں امیر المومنین برآمد ہیں۔ مگر اُن کو بتایا گیا۔ کہ یہاں صرف امیر المومنین کا حاجب نصر الکشادی اجلاس کرتا ہے۔ اس کے بعد اُن کو ایک محل میں لے گئے۔ یہ محل پہلے محل سے بھی آرائش میں بڑھا ہوا تھا۔ اس لئے انہوں نے سمجھا کہ اب کی دفعہ تو ضرور شرفِ حضوری نصیب ہوگا۔ مگر جب دریافت کیا تو معلوم ہوا۔ کہ یہاں ابن الفرات وزیر اعظم برآمد ہیں۔ اس کے بعد اُن کو ایک قصر میں لے جا کر بٹھایا گیا۔ جس کے ایک طرف دریائے دجلہ عجب مستانہ چال سے بہہ رہا تھا۔ اور دوسری طرف ایک ہوشربا باغ تھا۔ اور قصر کی دیواریں بیش قیمت زرّین پردوں سے چھپی ہوئی تھیں نیچے رنگ برنگ کے قالین بچھے ہوئے تھے۔ اور چہار طرف خواجہ سرا ہاتھوں میں تلواریں اور عصا لئے ہوئے کھڑے تھے۔ توشہ خانوں کے دروازے کھول دئے گئے تھے۔ اور زیور اور جواہرات دلہن کے جہیز کی طرح خوبصورتی سے سجائے گئے تھے۔ خاص امیر المومنین کے جواہرات کشتیوں میں چُن کر جن پر سیاہ کمخواب کے کشتی پوش پڑے ہوئے تھے۔ قطار در قطار سیڑھیوں پر رکھے ہوئے تھے۔ ان تمام محلّوں میں کثرت سے صقالبہ خواجہ سرا صراحیاں لئے پھرتے تھے اور مہمانوں کو برف سے سرد کیا ہوا پانی اور شربت اور فقاع (بیر) پلاتے تھے اور اُن میں سے چند سفیروں کے ہمراہ بھی تھے۔ اور جب وہ کہیں تھک کر بیٹھ جاتے۔ تو اُن کو پانی پلاتے تھے۔ اس طرح پر اُنہوں نے سات جگہ پانی پیا۔ تھوڑے انتظار کے بعد باریابی کی اجازت ہوئی۔ اور ایک سُرنگ میں داخل ہو کر قصر التاج میں پہونچے۔ جو دریائے دجلہ کے کنارے پر ہے۔ اور جونہی کہ اُنہوں نے اندھیرے سے نکل کر اُجالے میں قدم رکھا۔ تو ایک عجیب سماں نظر آیا۔ المقتدر باللہ ایک آبنوس کے تخت پر جس پر دیبق کے زربفت کی مسند بچھی ہوئی تھی جلوہ گر تھا اور اس کے جسم میں دیبق کے زرنگار دیبا کا لباس تھا۔ اور سر پر ایک اونچی قلنسوہ[1] تھی۔

[1] یہ وہی ٹوپی ہے جس کو اب قلندری ٹوپی کہا جاتا ہے۔

تخت کے سیدھے ہاتھ کی طرف نو کنٹھے بیش بہا جواہرات کے جو ثوباج کی قسم کے تھے۔ (ثوباج کی نسبت سمجھا جاتا ہے۔ کہ وُہ نظر بد کے مضر اثر کو دفع کرتا ہے) لٹکائے گئے تھے۔ اور اسی طرح بائیں طرف اُتنے ہی کنٹھے لٹک رہے تھے۔ اِن کنٹھوں کے تمام جواہرا چھے وزنی اور خوش آب تھے۔ اور سب سے بڑے جواہرسے تو ایسی نور کی شعاعیں نکل رہی تھیں کہ آفتاب کو بھی مات کرتی تھیں۔ خلیفۃ المسلمین کے سامنے اس کے پانچوں بیٹے کھڑے تھے۔ داہنی طرف تین اور دو بائیں طرف سفیر ہاتھ باندھ کر سرنگوں کھڑے ہو گئے۔ اور اِن میں سے ایک نے خواجہ سرا مونس اور نصر الکشادی حاجب سے جو مترجم تھے عرض کیا "کہ میں جانتا ہوں۔ کہ آپ کے آقا کا یہ منشا نہیں ہے۔ کہ ہم اپنی رسم کے مطابق سربسجود ہو کر آستانہ بوسی کریں۔ اور اگر ایسا منشا ہوتا تو ہم بخوشی اِس رسم کو ادا کرتے۔ لیکن دیکھو کہ اب ہم وُہ کر رہے ہیں۔ جو کبھی آپ کے سفیروں کو ہمارے یہاں نہیں کرنا پڑتا یعنی ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ لیکن یہ بھی ہماری رسوم اور آداب کے خلاف نہیں ہے"۔ اُس کے بعد ایک گھنٹہ تک وُہ اسی طرح دست بستہ امیر المومنین کے حضور میں کھڑے رہے۔ اس کے بعد امیر المومنین نے اپنے دستِ خاص سے جوابی فرمان سفیروں کو حوالہ کیا۔ اور وُہ اس کو ادب سے بوسہ دے کر طالب رخصت ہوئے۔ جب اجازت ہوئی۔ تو باب الخاصہ سے نکل کر دجلہ کے کنارے پہونچے اور امیر المومنین کی خاص کشتیوں میں سوار ہو کر دار السعید کو روانہ ہوئے وہاں پہونچکر اُن کو پچاس تھیلیاں درہموں کی ملیں جن میں سے ہر ایک تھیلی میں پانچ ہزار درہم تھے۔ اور ابو عمر کو خلعتِ خاص عطا ہوا۔

اس کے بعد صُلح ہو گئی اور ایک لاکھ بیس ہزار دینار دے کر مسلمان قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔ اِس آخری کیفیت سے ہمارے پہلے دعوے کا ثبوت ملتا ہے۔ کہ گو یورپ نے شان و شوکتِ ظاہری کے لحاظ سے عجیب و غریب ترقی پائی ہے۔ مگر سطوت و جبروت کے لحاظ سے زمانہ سابق سے کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا۔

(محمد عزیز مرزا)

خطِ تقدیر

"دنیا میں ایسی بہت سی باتیں ہیں۔ جو فلسفہ کے خواب و خیال میں بھی نہیں آئیں"
کہتے ہیں کہ شہر لکھنؤ میں ایک بڑا دقیا دان پنڈت تھا۔ قدرت نے اس کو سوچنے والا دل اور دیکھنے والی آنکھیں عطا کی تھیں۔ ایک روز شام کے وقت وُہ تن تنہا دریا کے کنارے ایک دور اُور غیر آباد مقام پر سیر کر رہا تھا۔ کہ اس کی نگاہ ریت پر کسی آدھی دبی ہوئی چیز پر پڑی۔ جو سورج کی مغربی شعاعوں میں آئینہ کی طرح چمک رہی تھی۔ پاس جاکر اُٹھائی تو کیا دیکھتا ہے۔ کہ مُردے کی پیشانی کی ہڈی ہے۔ قریب تھا کہ ہاتھ سے گرا دے۔ مگر یکایک اُس کی نگاہ چند لکیروں پر پڑی۔ جو اس پر کچھ بے قاعدہ سی کھچی ہوئی تھیں۔ اَور چیونٹیوں کی رفتار سے مشابہ تھیں۔ پنڈت بہت سے ایسے علموں سے ماہر تھا جن سے عوام الناس ناواقف ہیں۔ اَور ایسی پُر اسرار باتیں پڑھ سکتا تھا۔ جن کا دوسروں کو علم نہیں۔ اُس نے مُردے کی پیشانی کی تحریر کو دیکھ کر اُس کے نوشتۂ تقدیر کو اپنے عِلم کی رُو سے اِس طرح پڑھا۔

"جہاں کہیں سے بن پڑے بُری بھلی طرح اپنا پیٹ پالو۔ گلیوں اَور کوچوں میں مارے مارے پھرو۔ کھیت اور میدان میں سو۔ دریا کے کنارے پر کُتّے کی موت مرو۔ پھر دیکھو ہوتا کیا ہے۔"

یہ الفاظ حیرت خیز اَور تعجب انگیز تھے۔ اور اِن کا مطلب اِس سے بھی زیادہ وحشت زا تھا۔ مگر جس بات سے برہمن حیران تھا وُہ یہ تھی کہ یہ تحریر اس وقت لکھی گئی تھی۔ جب

یہ شخص پیدا ہؤا تھا۔ اَور خدا جانے۔ کس کس مصیبت اَور آفت سے اِس نے زندگی کے دن پورے گئے ہوں گے۔ اب موئے پر سو دُرّے کی مثال وُہ کیا ہے۔ جو اِس غریب کو سہنا ہوگا۔ اے مرے ہوئے! خُدا معلوم کس قدر عرصہ ہؤا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے گوشت و پوست کا نشان بھی باقی نہیں رہا۔ اَور ہڈیاں گل سڑ کر غبار ہوگئی ہیں اس پر اب کیا باقی رہا ہے۔ جو اِس کے پیش آئے۔ اسی پیچ و تاب میں برہمن نے ٹھان لی۔ کہ اب دیکھنا چاہئے کہ پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ اَور ہڈی کو احتیاط سے اپنی دھوتی کے دامن میں باندھ کر گھر کی طرف روانہ ہؤا۔ گھر پہنچ کر اس نے بڑی حفاظت سے اُس ہڈی کو اپنے کمرے میں ایسی چیزوں کے ساتھ جن کی اپنے پیشے کے متعلق اس کو ضرورت پڑتی تھی اَور جہاں اس کی نجوم اَور رمل کی کتابیں رہتی تھیں نہایت پوشیدہ طور پر رکھا ہر روز صبح کے وقت اپنا بستہ کھولتا۔ اَور خبرداری سے جب کوئی دیکھتا نہ ہو۔ اِس میں سے بدیں خیال وُہ ہڈی نکالتا۔ اَور دیکھتا کہ اس میں کوئی تغیر تو واقع نہیں ہؤا۔ اسی طرح مدّتیں گزر گئیں۔ اَور کچھ بھی ظہور میں نہ آیا۔ اِس اثنا میں برہمن کی عورت اِس کی تمام کارروائی سے آگاہ ہوگئی۔ اور دل ہی دل میں بے قرار تھی کہ الٰہی یہ کیا کرتا ہے۔ اَور تاک میں رہتی کہ برہمن کسی وقت غافل ہو۔ اَور میں اس کا بستہ کھول کر اس راز سے واقف ہو جاؤں۔ ایک روز قریب کے گاؤں میں ایک بچّہ پیدا ہؤا۔ اَور برہمن کو صبح سویرے موتھ اندھیرے وہاں سے بلاوا آیا۔ اَور اُس کو فی الفور اپنے مذہبی فرائض ادا کرنے کے لئے جانا پڑا۔ عورت جو موقعہ کی تلاش میں تھی وقت کو غنیمت سمجھی اَور فوراً برہمن کی کوٹھڑی میں گھُس اَور بستہ کھول گوہرِ مقصود نکالا تو سوائے اُس استخوانِ بوسیدہ کے اَور کچھ برآمد نہ ہؤا۔ بہت سٹ پٹائی کوئی بات سمجھ میں نہ آئی۔ آخر سوچی کہ ہو نہ ہو یہ ہڈی میری سوت کی ہے۔ اَور برہمن کو اِس سے اِس قدر محبت تھی۔ کہ میرے بعد بھی اِس کی پیشانی اِس حفاظت

سے رکھی ہے۔ اور صبح صبح اُٹھ کر اِس کی پوجا کیا کرتا ہے۔ بس یہ خیال آنا تھا۔ کہ آتش حسد سے آگ بگولا ہو گئی۔ ہڈی کو باورچی خانہ میں لے جا کر سِل بٹے سے پیس کر سُرمہ کیا۔ اور بدررَو میں ڈال دیا برہمن نے آ کر دیکھا۔ تو وہاں کچھ بھی نہ پایا۔ آخر اپنی بیوی سے پوچھا تو دُم پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ گئی۔ اور گالی گلوچ کا ایسا طوفان اُٹھایا۔ کہ بیچارہ برہمن مُنہ دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ آخر جب اُس نے بتایا۔ کہ میں نے اُس کُتیا مُردار کی ہڈی جس کا تم روز درشن کرتے تھے۔ اور جس کی پوجا کے بغیر تم رہ نہیں سکتے تھے۔ بدرو میں ڈال دی تو اُس نے وہاں جا کر دیکھا۔ مگر سوائے ایک بھوری بھوری خاکستر کے جس میں پاخانہ سے میلا کچیلا پانی بہہ کر مل گیا تھا۔ اور کچھ نہ پایا۔ غرض استخوان شکستہ کا یہ انجام ہوا۔ اور یوں اس خوفناک نوشتۂ تقدیر کی آخری پیشین گوئی پوری ہوئی۔

برہمن کچھ موُنھ میں بڑبڑاتا باہر چلا گیا۔ اور جورو اپنی کامیابی پر گویا پھولی جامے میں نہ سماتی تھی۔ رات کو خاوند اور بیوی آرام کے لئے اپنے کمرے میں گئے بیوی تو سو گئی۔ اور خاوند کو موت اور حیات کے پیچیدہ مسئلے سوچتے سوچتے آدھی رات ہو گئی۔ اسوقت اس نے جو آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو اپنے بستر کے عین برابر چھت میں سے ایک باریک سا تاگا لٹکتا ہوُا پایا پہلے تو کچھ خیال نہ کیا۔ مگر رفتہ رفتہ تاگا بڑھ کر اس کی چارپائی کے قریب پہنچنے لگا۔ برہمن آنکھیں ملنے لگا۔ اور قریب تھا کہ اپنی بیوی کو آواز دے کہ تاگا ایک نہایت زہریلا سانپ بن گیا۔ اور اس نے برہمن کی بیوی کی ناک پر کاٹ کھایا۔ پیشتر اس کے کہ برہمن اُٹھ کر بیٹھے۔ سانپ ایک روزن دیوار میں سے نکل کر کمرہ سے باہر ہو گیا۔ یہ بمشکل اُٹھ کر دروازہ کھول کر باہر نکلنے کو تھا۔ کہ سانپ نے ایک خوفناک بھیڑیئے کی شکل اختیار کی۔ اور ایک ہمسایہ کے بچے کو جو صحن میں سو رہا تھا پھاڑ کھایا۔ برہمن نے اب جان ہتھیلی پر رکھ لی۔ اور اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ اتنے میں بھیڑیئے نے ایک نوجوان کی شکل اختیار کی۔ اور برہمن کی طرف مڑ کر متبسم نگاہوں سے دیکھا۔ برہمن نے

دل کو اپنے دونو ہاتھوں سے تھام لیا۔ اور اس کے پاؤں میں گر پڑا۔ کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ اِس نوجوان نے جواب ایسی آواز سے جس میں نہ خفگی تھی نہ ناراضگی تھی دیا کہ میں موت کا گماشتہ ہوں۔ اور دنیا میں جس جس طرح لوگوں کی موت لکھی ہوئی ہے۔ اِس کو پورا کرنے آیا ہوں۔ بس اب میرا پیچھا نہ کرو۔

برہمن اپنی جان سے ہاتھ دھو چکا تھا۔ تعاقب سے باز نہ آیا۔ فرشتہ نے پھر مُڑ کر کہا۔ کہ اب کیا چاہتے ہو۔

برہمن نے کہا کہ میں صرف اس قدر پوچھنا چاہتا ہوں۔ کہ میری موت کس طرح لکھی ہے۔

موت کے گماشتہ نے کہا۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ تم دلیر آدمی ہو۔ مگر اب بھی اس کی آواز میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے ترس اور خوف پایا جاوے۔

برہمن اپنی بات پر اڑا رہا۔ اور پھر وہی سوال کیا۔ اس پر فرشتہ نے رعد کی آواز میں جواب دیا کہ تم دریائے گنگا میں کامِ نہنگ کا طعمہ بنو گے۔ کیا تم اپنی تقدیر سے بھاگ سکتے ہو۔ اور پیشتر اِس کے کہ برہمن اس خوف ناک پیشین گوئی کے معنے سمجھے۔ نوجوان ہوا ہو گیا۔

برہمن نے گھر آ کر۔ اپنی جورو کا کریا کرم کیا۔ اور ہمیشہ کے لئے اپنا گھر بار چھوڑ دیا۔ اس نے اپنے دل میں مصمم ارادہ کر لیا۔ کہ ہیبت ناک گنگا کے نزدیک نہ رہوں گا۔ غریبی ہو یا کچھ ہو۔ مگر ایسی جگہ جا کر رہونگا۔ جہاں لوگوں نے اِس خوفناک دریا کا نام بھی نہ سُنا ہو۔ کہنا آسان ہے مگر کرنا مشکل ہے۔ بجائے اِس کے کہ مغرب کی طرف جاتا۔ (جہاں خواہ لوگوں نے گنگا نام تو سُنا ہوگا۔ مگر اس کی شکل نظر نہ آتی) وہ مشرق کی طرف روانہ ہُوا اور آخر کار برما کے علاقہ میں پہنچ گیا۔ یہاں بود و باش اختیار کر لی۔ ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنا کر اُسے سجایا۔ اور اپنے کاروبار میں مشغول ہُوا اِس کی لیاقت اور دانشمندی کا شُہرہ

ہوگیا۔ اور وہاں کے مہاراج ادہراج کے دربار تک اس کی رسائی ہوگئی۔

اتفاق سے مہاراجہ کو اپنے لڑکے کے واسطے ایک لائق پنڈت کی ضرورت تھی۔ اس کے فضل و کمال کا شہرہ تو سُن ہی چکا تھا۔ اب دیکھا تو ہمہ دانی اور دانشمندی میں اُسے کہیں بڑھ کر پایا۔ غرض اپنے لڑکے کا اتالیق مقرر کیا۔ برہمن کا حال کسی کو معلوم نہ تھا۔ اور اس نے اپنی پہلی عمر کے واقعات کی طرف کبھی اشارہ ہی نہ کیا۔ لڑکا اس اثناء میں بڑا ہوگیا۔ اور اب وہ وقت آپہنچا کہ مہاراج نے اپنے تمام ارکین سلطنت کو جمع کرکے دریافت کیا کہ شہزادہ کی تعلیم کا کیا بندوبست کرنا چاہئے۔ سب نے عرض کیا۔ کہ نوجوان شہزادہ تمام علوم میں یکتا اور سارے فنون میں کامل ہوگیا ہے اب مناسب ہے کہ گھر سے باہر قدم رکھے۔ اور سیرِ ممالک سے اپنی نظر کو وسیع کرے چنانچہ سب سامانِ سفر تیار ہوا۔ اور شہزادہ نے اپنے اتالیق سے کہا کہ آپ بھی تشریف لے چلیں۔ اتالیق نے صاف انکار کردیا۔ یہ خبر مہاراجہ تک پہنچی۔ جس نے پنڈت کو ہمیشہ نہایت مطیع اور وفادار پایا تھا۔ اس کو اس سے نہایت مایوسی ہوئی۔ اور پنڈت سے بضد ہوا۔ کہ آپ کو ضرور شہزادہ کے ہمراہ جانا ہوگا۔ پنڈت کو اب انکار مشکل ہوگیا۔ اور ناچار اپنی رام کہانی اور گنگارانی کی واردات سُنانی پڑی اس پر درباری اور خود شہزادہ بھی خوب قہقہہ لگا کر ہنسے اور پنڈت کو توہم پرستی پر خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ پنڈت بہت کھسیانہ ہوا مگر سب کے اصرار و خوشامد و انعام بیش بہا کے وعدوں سے شہزادے کے ہمرکاب جانے پر راضی ہوگیا لیکن شہزادے اور اُس کے باپ سے اِس امر کا وعدہ لے لیا کہ اگر کہیں شہزادہ دریائے گنگا کے نواح میں پہنچ جائے۔ تو میں اپنے وطن کو لوٹ آؤں گا۔

شگن دیکھ کر شہزادہ روانہ ہوا۔ اور بہت سے مقامات کی سیر کی یہاں تک کہ اِن کا کیمپ جنوبی بنگال میں پہنچ گیا۔ برہمن نے اپنا وعدہ یاد دلایا مگر شہزادہ نے ایک نہ سُنی اور اپنا تمام فلسفہ اور منطق برہمن کو سمجھانے میں خرچ کر ڈالا۔ کہ آخر آپ کو اس مقدس دریا سے کیوں نفرت ہے۔ پھر

کہا کہ تنخواہ و انعامات موجودہ سے دس گُنا لیجئے اُور ایک بار میرے ساتھ چل کر دریا کے کنارے پر کھڑے ہو جائیے۔ ورنہ لوگ کیا سمجھیں گے۔ کہ آپ ساد اتنا ایسی وہمی باتوں کے خیال سے اپنے اوپر جگ ہنسائی کراتا ہے۔

شہزادے کا اصرار۔ انعام کی توقع اِس پر ہمراہیوں کی چھیڑ چھاڑ برہمن کے شکوک لگے زائل ہونے۔ اَور انجام کار وُہ راضی ہو گیا۔ فوراً ایک سو سُورما جوان۔ زرہ بکتر پہنے۔ ہتھیاروں سے اوپچی بنے۔ ڈھال تلوار لگائے اُچھل پڑے اور دریا کے کنارے پہنچے۔ شہزادہ اور اتالیق بھی آکر اپنے گھوڑوں سے اُترے۔ اَور دریا کی طرف دیکھنے لگے۔ پانی کس قدر صاف اَور دریا کیسا خاموش تھا۔ اِس کے تمام وسعت پر ایک لہر تک نہ تھی۔ کیا اِس میں گھڑیال ہوگا؟ سب بے اختیار ہنسنے لگے۔ یہاں تک کہ خود برہمن بھی اِس خوشی میں شریک ہونے سے باز نہ رہ سکا۔ اَور وُہ بھی مُسکرانے لگا۔

شہزادہ کے حکم پر ایک سو سپاہی پانی میں کُود پڑے۔ اَور ننگی تلواریں ہاتھ میں لئے ایک ایسی جگہ حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ جہاں کمر تک پانی آتا تھا۔ اِس حلقہ میں شہزادہ کو اشنان کرنا تھا۔ اِس وقت شہزادے نے مُسکرا کر اپنے اتالیق کی طرف دیکھا۔ جس پر برہمن سے نہ رہا گیا۔ اَور اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیکر کہنے لگا۔ میں ایسا بُزدل بھی نہیں ہوں۔ کہ آپ کے ساتھ ایسی جگہ جہاں ایک سو مسلح جوان کھڑا ہے نہ نہا سکوں۔ اِس طرح سے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے مزے مزے کی باتیں کرتے دونوں پانی میں اُترے اَور اس حلقہ میں جا کھڑے ہوئے۔ سورج اندر با ہر تھا۔ نہانے والوں نے اشنان کا گیت گانا شروع کیا۔ ایک لحظہ میں سب کا اپنے سر پانی میں ڈبو کر غوطہ لگانا تھا۔ کہ یکایک شہزادہ ایک بھیانک اَور مہیب گھڑیال بن گیا۔

گھڑیال نے گرج کر کہا۔ کہ او برہمن میں وہی اجل کا گماشتہ ہوں۔ اَور برہمن کو کمر سے پکڑ کر مسلح آدمیوں کی صف چیر کر گہرے پانی میں لے گھُسا۔ اَور نظروں سے غائب ہو گیا۔

(عالم خیال)

ملکۂ بلقیس

میرا نام "نقاب پوش" ہے۔ میں صحرائے اعظم کا رہنے والا اور بدؤں کے ایک قبیلہ کا سردار ہوں۔ عربی علمِ ادب کی تمام مشہور کتابوں پر مجھے عبور حاصل ہے۔ اور میں زبان عربی کا ادیب مانا جاتا ہوں۔ میرا پیشہ تاخت و تاراج ہے۔ صحرائے اعظم سے گزرنے والے مسافر میرا نام سنتے ہی اپنی جان و مال سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں جس قبیلہ کا میں سردار ہوں۔ اُس کے قانون معاشرت و تمدن کا مجموعہ یہ فقرہ سمجھا گیا ہے کہ "جس کی لاٹھی اُس کی بھینس" میرے قبیلہ کے سب زن و مرد پیر و جوان اپنے چہروں پر ایک قسم کی نقاب ڈالے رہتے ہیں جس میں سے صرف ناک اور آنکھیں دکھائی دیتی ہیں۔ اپنی اپنی نقاب ہم کھانے کے وقت بھی نہیں اُتارتے۔ ہم اِس کے یہاں تک عادی ہو گئے ہیں۔ کہ جو بغیر نقاب ہو۔ ہم اُس کو غیر سمجھتے ہیں۔ اور اگر کوئی ہم سے مارا جائے۔ اور اُن کی نقاب گم ہو جاوے (نقاب کے گم ہونے کی فقط یہی صورت ہے) تو جب تک ہم اُس کے چہرے پر نقاب نہ ڈالیں ہم اُس کو پہچان نہیں سکتے۔ اِس لئے ہمارا نام نقاب پوش ہو گیا۔

میرے پہلے ہی سفر کا انجام نہایت عجیب ہوًا۔ میرا گزر ایسے خطرناک راستوں سے ہوًا۔ جن پر کبھی انسانی قدم نہ پڑا ہو گا۔ اِس لئے اس کا مختصر سا بیان خالی از دلچسپی نہ ہو گا۔

قریب دو ماہ قمری سے ہمارا طائفہ جس میں تین سو جوان مشہور و مسلح شامل تھے۔ ایک کمین گاہ میں پڑا ہوًا تھا۔ ہم کو اطلاع مل چکی تھی۔ کہ تاجروں کا ایک قافلہ ہاتھی دانت

اور دیگر قیمتی اشیائے تجارتی سے لدا ہُوا آرہا ہے۔ ہمارا ارادہ تھا۔ کہ اوّل تو اُس کارواں سے صحرائے اعظم کے (جس کو ہم اپنی میراث و جاگیر خدا داد سمجھتے تھے) محصول راہداری کا مطالبہ کیا جائے۔ ورنہ بصورت انکار کارواں کے کل زر و مال کو مالِ غنیمت سمجھ کر اُس پر قبضہ کر لیا جائے۔

ہم کارواں کا انتظار نہایت بے صبری سے کر رہے تھے۔ کہ ہمارے جاسوسوں نے جو نہایت ہوشیاری سے اپنے فرائض ادا کر رہے تھے۔ خبر دی کہ ابھی کارواں کے آنے میں ہمارے حدود تک دو ہفتے باقی ہیں۔ میرے دل میں خیال آیا۔ کہ اس اثناء میں گرد و نواح کی چٹانوں اور پہاڑوں کی سیر کی جائے۔ جن پر مسلمان فاتحوں کی یادگاریں کندہ ہیں چنانچہ ایک روز علی الصبّاح میں اپنی سریع السیر سانڈنی پر مسلمان فاتحوں کی یادگاروں کے معائنہ کے لئے نکلا۔

آفتاب نکل آیا تھا۔ اور میں اُس کی شدید حدّت میں اُس ریگستان کی طرف جا رہا تھا۔ جس میں پانی عنقا تھا۔ اور جس کی وسعت کا صحیح اندازہ ہم صحرا نشین بھی آج تک نہیں کر سکتے۔ کیونکہ پانی کے نایاب ہونے کے باعث متواتر منازل کا طے کرنا ناممکن محض ہے۔

شام ہونے کو تھی۔ اور میری صبا رفتار سانڈنی کہیں دم بھر کے لئے بھی نہ ٹھہری تھی۔ اب چونکہ نماز مغرب کا وقت قریب تھا۔ میں نے مُہار کھینچی۔ اور سانڈنی کو روکا۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر محمل سے نکلا فرض نماز ادا کیا۔ اور کچھ کھجوریں کھا کر شفق کی آتشگوں سُرخی کو دیکھتے دیکھتے خوابِ پریشاں دیکھنے لگا۔ دوسرے اور تیسرے روز بھی اُسی سنسان ویرانے میں بڑھتا گیا۔ جہاں کہ جُھلسنے والی تیز اور زہریلی سموم میری پیشانی پر اس طرح آ کے لگتی تھی۔ گویا کسی تنور سے شعلے نکل نکل کر آتے تھے۔ اور جہاں میری جلتی ہوئی آنکھوں کو منتہائے نظر تک پھیلی ہوئی بالو اور اُفق کے سوا اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اپنے ہمراہیوں سے جُدا ہو کر چھٹے روز جب دن ڈھلنا شروع ہُوا۔ میں نے اپنے

سامنے بلند پہاڑوں کا سلسلہ دیکھا اگرچہ میں اپنی مرزبوم کے جغرافیائی حالات وخصائص سے بخوبی آگاہ تھا۔ لیکن اِس سے پہلے میں نے اِن پہاڑوں کا ذکر تک بھی نہ سُنا تھا۔ اس لئے مجھے یقین ہوگیا۔ کہ میں غلطی سے وُہ راستہ بھُول آیا ہُوں۔ جو ان چٹانوں کی طرف جاتا ہے۔ جن پر کتبے کندہ ہیں۔ اَور اب میں کسی نامعلوم سرزمین میں آگیا ہوں۔ کئی بار اس چٹانی نالے میں ہمارا گزر ہوُا تھا جس میں میرے ہمراہی پڑے ہوئے تھے۔ لیکن ہم سے کبھی کوئی اُس حصّہ صحرا سے آگے نہ گیا تھا۔ جہاں جابجا بوسیدہ انسانی ہڈیاں دکھائی دیتی تھیں۔ کیونکہ وہاں مشکیزہ یا پکھال کا پھٹنا یا اُونٹ کا لنگ ہونا موت کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

میں ناقابلِ ضبط گھبراہٹ سے پہاڑوں کی طرف دیکھنے لگا۔ متواتر چھ روز کڑکتی ہوئی دھوپ میں سفر کرنے اَور تکان کے باعث بالکل مضمحل وخستہ ہوگیا تھا۔ ریگ آمیز گرم لو سے میرا دم رُکتا تھا۔ میری سبک سیر سانڈنی بھی میری طرح درماندہ ہو رہی تھی۔ اِس لئے ایسی جگہ بے سروسامانی کی حالت میں رات کاٹنے سے میرا دل کانپ رہا تھا۔

اگرچہ پہاڑیوں کے عقب میں مہتاب نکلا ہُوا تھا۔ لیکن جو منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ اُس پر نہایت خفیف اَور دھندلی سی روشنی پڑ رہی تھی۔ طوعاً وکرہاً میں نے سانڈنی کو بٹھایا۔ اَور خود ایک ریت کے ٹیلے پر بیٹھ گیا۔ اَور زانوؤں کو سینے سے لگائے نہایت گہرے غور اَور فکر کی حالت میں بیٹھا بیٹھا اونگھنے لگا۔

پیشتر اِس کے کہ وُہ زعفرانی خط جو شاہ نیّر کا ہرا دل سمجھا جاتا ہے۔ آسمان پر نمودار ہُوا۔ میں چند سورتوں کی تلاوت کر کے اپنی سانڈنی پر سوار ہو لیا تھا۔ اَور عزم بالجزم سے اُس نامعلوم سلسلہ کی طرف رُخ کئے چلا جاتا تھا۔ مشکیزہ جو میرے پاس تھا۔ اِس میں اب صرف اس قدر پانی رہ گیا تھا۔ جو ہمارے قیام گاہ تک کافی ہو سکے اَور علیٰ ہذا القیاس کھجوریں بھی نصف سے کم رہ گئی تھیں۔ اِس لئے میں نے روزے رکھنے شروع کئے۔

ریت نہایت نرم اور فریب دہ تھی۔ میری اُونٹنی کے اسفنج آسا پاؤں ریت میں

دھسے جاتے تھے۔ تین گھنٹہ کی کڑی مسافت کے بعد میں پہاڑ کی دو خوفناک چوٹیوں کے دامن میں پہنچا۔ اور اِس ڈر سے کہ مبادا ریگ رواں میں دَب جاؤں۔ اس جگہ کھڑا ہوگیا۔ مجھے قریب ہی دو پہاڑیوں کے درمیان ایک تنگ راستہ نظر آیا۔ اُس راستہ کے دروانہ پر دو دیوہیکل بُت دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ ان شکلوں کو دیکھ کر مجھے یقین واثق ہُوا کہ اب میں منزل مقصود پر پہنچ گیا ہوں۔ میں نے سانڈنی کو اور آگے چلایا۔ اور اُن بتوں کے پاس پہنچا۔ یہ بت سنگ سیاہ کے بنے ہوئے تھے۔ اور بلندی میں قد آدم سے دہ چند تھے۔ ایک اُن میں سے خوبصورت عورت کا تھا۔ جو اپنے دائیں ہاتھ کو آسمان کی طرف اُٹھائے ہوئے تھی۔ دوسرا ایک زنِ فرتوت کا تھا۔ جو نہایت کریہ المنظر تھی۔ اور اپنے چہرے کو نیچے جھکائے ہوئے تھی۔

میں عالمِ تحیّر میں دم بخود اس سرزمین کو دیکھ رہا تھا جو میں نے پہلے کبھی دیکھی نہ تھی لیکن ہر لحظہ بڑھنے والے استعجاب نے مجھے وہاں نہ ٹھہرنے دیا۔ میں اپنی اونٹنی کی مہار پکڑے۔ اس سنگلاخ وادی میں بڑھتا گیا حتیٰ کہ ایک سرسبز وسیع میدان میں پہنچا جہاں مجھے ایک ویران مگر عظیم الشان شہر کے کھنڈر دکھائی دیئے۔ میں سکتے کے عالم میں اُس حیرت انگیز نظارہ کو دیکھنے لگا۔ جس کا مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا۔ مُنہدم معبدوں کے شکستہ ستون اور بڑی بڑی مسمار شدہ اور ٹوٹی پھوٹی لیکن عالی شان عمارتیں جن پر سکوت اَور خاموشی کا عالم طاری تھا۔ گذشتہ عظمت و شوکت کا زبانِ حال سے فسانہ کہہ رہی تھیں۔ جا بجا شکستہ حال مینار اَور بُرج اِستادہ تھے۔ اِس شہر کے فراخ اَور چوڑے بازاروں کے نشان موجود تھے۔ ایک عقاب ہُوا میں اُڑ رہا تھا۔ اَور صرف وُہ عُقاب ہی اُس وقت اُس ویران شہر کی ذی حیات مخلوق تھا۔ اُونٹنی کو میں نے باندھ دیا۔ اَور آپ آگے چلا۔ یہ شہر کسی زمانے میں اپنے وقت کی تہذیب اَور شائستگی کا مرکز تھا۔ اَور اس کی نسبت مندرجہ ذیل روایت مشہور ہے۔

اس شہر کی فرماں روا صاحبِ جاہ و حشم شاہزادی بلقیس تھی جس کا ذکر ہمارے صحیفۂ لازوال میں بھی آیا ہے۔ اور یہی شہر سبا تھا جو کبھی دنیا میں سب سے بڑا اور متموّل دارالسلطنت تھا۔ روایت سے صرف اسی قدر پایا جاتا تھا۔ کہ یہ شہر صحرائے اعظم میں کہیں آباد تھا۔ لیکن اِس کا صحیح پتہ کسی نے بھی دریافت نہ کیا۔ اگرچہ یہ مشہور عام تھا۔ کہ اِس کا دروازہ پہاڑ کی مخروطی شکل کی چوٹیوں کے درمیان ہے۔ اور اس کے آس پاس ایسی ریگ رواں ہے۔ کہ کوئی وہاں جانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

میں نے نہایت سُرعت کے ساتھ منہدم ستونوں پر چڑھنا شروع کیا۔ اُن پر کچھ حروف کندہ تھے۔ لیکن میرے لئے وہ راز سربستہ سے کم نہ تھے۔ ناگاہ میری نظر ایک اَور عالی شان محل پر پڑی۔ جو ایک جانب پہاڑی پر واقعہ تھا شہر سے اُس محل تک ایک وسیع زینہ پتھر کا بنا ہؤا تھا جس کی دونو جانب دو بت کھڑے تھے وہ صورت شکل میں بالکل اُن سے مشابہ تھے۔ جو شہر کے باہر دروازے پر تھے مجھے شک ہؤا۔ کہ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ لیکن پھر اپنے آپ کو یقین دلا کر کہ میں اپنے ہوش و حواس میں ہوں۔ میں نے اپنا بھالا سنبھالا۔ اَور زینے پر چڑھنے لگا۔ جو شہزادی بلقیس کے محل کو جاتا تھا۔ ابھی میں نے پہلے ہی اڈے پر قدم رکھا تھا۔ کہ میری آنکھیں بجلی کی سی کوند سے خیرہ اَور میرے کان ایک ایسی گرج کی آواز سے بہرے ہو گئے جس سے زمین میں زلزلہ پیدا ہو گیا میں نہایت تذبذب میں تھا۔ اور دل میں خیال کرتا تھا۔ کہ یہ کہیں میرے شامتِ اعمال کی اطلاع نہ ہو۔ لیکن میں نے استقلال کو ہاتھ سے نہ دیا۔ اَور زینہ پر نہایت تیزی سے چڑھے گیا۔ چند منٹ میں اُس حسین اَور صاحبِ جبروت ملکہ کے محل کے دروازہ پر جا کھڑا ہؤا۔ میں اندر داخل ہونے ہی کو تھا۔ لیکن جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ کیونکہ میں نے دیکھا۔ کہ محل کا فرش آبِ رواں کا تھا۔ جہاں مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ اَور درمیان میں ایک سونے اَور عاج کا شاہ نشین تھا۔ جس پر ملکہ بلقیس کا جڑاؤ تخت رکھا تھا۔ جو نیلم و الماس اور جواہر سے مزیّن و مرتب تھا۔

میں نے پانچوں کو اُٹھاکر پانی میں اُترنے کا ارادہ کیا۔لیکن میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی کیونکہ چمکیلے اور صاف سطحِ آب پر شفّاف بلوریں فرش تھا جو گرم موسم میں بھی محل کو سرد خانہ بنائے رکھتا تھا۔میں تخت کے نزدیک گیا۔اور اپنے بھالے سے ایک الماس کا ٹکڑا اُکھاڑا جو بیضۂ کبوتر کے برابر تھا۔پھر میں قصرِ شاہی کی سیر کرنے میں مصروف ہؤا۔اور ایوان شاہی کی مسطح سقف پر سے شہر کی طرف نگاہ ڈالی۔میں اپنے تخیّل میں پھر اس کو آباد دیکھنے لگا۔اور اُس کی عظمت کی شان دیدۂ دل کو نظر آنے لگی۔بلقیس کے ٹڈی دل لشکر جوق جوق جنگ کے واسطے نکلنے لگے۔اور حسین و شان دار ملکہ خود سنہری رتھ میں جلوہ افروز ہوئی۔پھر میں دیر تک اُس قصرِ شاہی کے دیوانِ خاص نشست گاہوں۔خواب گاہوں جلوخانوں آئینہ خانوں اور دیگر عجیب و غریب ایوان کو دیکھتا رہا۔حتیٰ کہ مجھے ایک چھوٹا سا حجرہ پہاڑ کی طرف نظر آیا۔میں نے دیکھا۔کہ اس میں نہایت قیمتی و بیش بہا اسباب تھا۔تمام سامانِ آرائش مُطلّا تھا۔سقف کے شہتیروں میں ہیرے جڑے ہوئے تھے۔جو سورج کی شعاعوں سے روشن و درخشاں تھے۔مقابل کی دیوار میں ایک اور دروازہ تھا۔جو نہایت مستحکم و مضبوط لوہے کا بنا ہؤا تھا۔جب میں نے پوری طاقت سے اُس کو کھولا۔تو مجھے ایک تنگ و تاریک غار سا دکھائی دیا۔میں نے اُس دروازے کو بغور دیکھا۔اس میں بڑی بڑی آہنی چٹکنیاں لگی ہوئی تھیں جو سخت چٹانی زمین میں جاکر بند ہوئی تھیں۔مجھے خیال آیا۔کہ یہاں ملکہ کا خزانہ دفن ہوگا۔میرے دہان طمع میں پانی بھر آیا۔میں نے وہیں ایک مشعل سی بنائی۔اور اُس تنگ و تاریک غار کی کوٹھڑی کے اندر گیا۔جوں جوں میں آگے بڑھتا تھا۔کوٹھڑی وسیع ہوتی جاتی تھی۔اور ہوا اس قدر گرم تھی۔کہ میری پیشانی سے پسینے کے قطرے ٹپکنے لگے۔ایک پُرانی تلوار۔ایک زنگ آلود خود اور ایک شکستہ زرہ وہاں پڑی ہوئی مجھے دکھائی دی۔جس سے معلوم ہوتا تھا۔کہ کبھی یہ غار آمد و رفت کی جگہ ہوگی۔اس لئے مجھے مالامال ہونے کی اُمید میں اَور بھی ترقی ہوئی۔اور میں آگے آگے بڑھا۔ہر لحظہ گرمی کے بڑھنے سے

مجھے حیرانی ہوئی۔ لیکن میں پھر بھی آگے ہی قدم اُٹھاتا گیا۔ میں نے مشعل کو سر کے برابر بلند رکھا۔ میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش میں پپوٹوں سے باہر نکلی پڑتی تھیں اور میرے پاؤں راستہ کے ناہموار ہونے کی وجہ سے ٹھوکریں کھاتے تھے۔ دفعتہً ایک سخت کڑک کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ اور ساتھ ہی ایک بھاری ضرب میرے سر پر لگی۔ میں بے ہوش ہوکر گر پڑا۔ مجھے یہ معلوم نہیں۔ کہ میں کس قدر عرصہ اُس تاریک غار میں پڑا رہا۔ جب میں نے نہایت آہستگی اور تکلیف سے آنکھیں کھولیں۔ تو مجھے معلوم ہؤا۔ کہ میرے چہرہ پر میری نقاب نہ تھی۔

آنکھ کھلتے ہی مجھے یہ بھی معلوم ہؤا۔ کہ میری پیشانی پر کسی نے پٹی باندھ دی ہے۔ اور میرا مجروح زخمی سر کسی عورت کے ہاتھ پر ہے۔ زنانہ لہجہ میں کسی نے کہا۔ "اطمینان سے لیٹے رہو۔ اور حرکت نہ کرو۔" میں نے آتشدان کی دھیمی روشنی کی مدد سے دیکھا۔ کہ جس حسین دوشیزہ کے ہاتھ پر میرا سر ہے۔ اس کے خط و خال عربی ہیں۔ اس کا رنگ فرنگیوں کا سا ہے۔ اس کے سر پر چھوٹی سی ٹوپی ہے۔ جس میں موتی ٹنکے ہیں۔ اِس کی طلائی چوڑیوں اور پازیبوں میں ہیرے جڑے ہیں۔ میں نے خیال کیا۔ کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ لیکن میں نے ہوش و حواس کو بجا کیا۔ تو مجھے معلوم ہؤا۔ کہ ہم دونو ایک چھوٹے سے کمرے میں ہیں جس میں سُرخ رنگ کے پردے لٹکے ہوئے ہیں۔ اور ایک طلائی عود دان سے کمرہ مہک رہا ہے۔ اور میں ایک خوبصورت پلنگ پر لیٹا ہؤا ہوں۔ جس پر ریشمی گدیلے اور تکیئے لگے ہوئے ہیں۔

میں نے پوچھا۔ "میں کہاں ہوں؟" نازنین نے جواب دیا۔ "اب تم محفوظ ہو۔ تم نے اس شہر ویران میں بہ نیت فاسد داخل ہونے کی جُرأت کی۔ اور تم پر غضب نازل ہؤا۔" میں نے کہا۔ "اور تم نے مجھے دیکھ لیا تھا؟" اُس نے سر کی حرکت سے کہا۔ "ہاں۔" وہ اپنی روشن اور شرمگیں آنکھوں کو نیچے جھکائے رہی۔ اور کچھ توقف کے بعد بولی۔ "تم اس شہر میں آئے ہو جس پر خدا کا غضب ہے۔ جو یہاں آتا ہے۔ وہ بھی مغضوب ہو جاتا ہے۔

تم ملکۂ بلقیس کا خزانہ لوٹنے کی نیت سے یہاں آئے اور معتوب ہوئے۔ لیکن بعض اوقات شر میں خیر مخفی ہوتی ہے۔ کیونکہ تم مصیبت میں میرے رفیق ہو گئے۔ میں بے اختیار بول اٹھا۔ "مصیبت میں! تم کون ہو؟" نازنین۔ "میں بلقیس ہوں۔ اُس ملکہ بلقیس کی یادگار جو شہر سبا کی بادشاہزادی تھی۔ میں اُس کے دفینہ کی محافظ ہوں۔ اور ملکۂ بے تاج اور فرماں روائے بے زینت محل جو تم نے دیکھا ہے۔ یہ میری ملکیت ہے۔ اور جس تخت سے تم ایک الماس چرا لائے ہو۔ اُس پر بیٹھ کر میں ملک تنہائی پر بادشاہت کرتی ہوں۔ اگرچہ تاریخی دنیا میں میرا نام ملکہ بلقیس کی جانشین بلقیس ہے۔ اور میرے قبضہ میں اس قدر گنجینہ ہے۔ جس کا کوئی صحیح اندازہ نہیں کر سکتا۔ لیکن میری رعایا کی تعداد چودہ سے زیادہ نہیں جو کہ میرے متعلقین ہیں۔ اور اس محل میں میرے ساتھ رہتے ہیں۔ تم دیکھ چکے ہو۔ کہ ہمارا شہر جو کبھی نہایت پُر رونق و آباد تھا۔ اور جس کے نہایت عالی شان ہیکل کے پندرہ دروازے تھے۔ تباہ ہو گیا۔ صرف میں اور میرے خاندان کے لوگ بچ رہے ہیں۔ افسوس میں بھی جلدی قبر کے مُنہ کا نوالہ ہونے والی ہوں۔ بلقیس کا نام صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا۔" میں نے کہا۔ "آپ ایسی افسردہ و ملول کیوں ہیں۔ آپ کو ماشاءاللہ شباب صحت اور سب کچھ خدا نے دیا ہے۔" وہ کہنے لگی۔ "نہیں تم نہیں جانتے۔ میری قسمت کا فیصلہ ہو چکا ہے۔" میں نے پوچھا۔ "وہ کیا؟" اس نے جواب دیا۔ "سُنو میں سُناتی ہوں۔ دو مہینے کا ذکر ہے۔ کہ میں اپنے بوڑھے چچا کے ساتھ ایک دور دراز شہر میں کچھ ضروریات خریدنے کے لئے گئی جیسا کہ سال میں دو دفعہ ہمارا معمول ہے۔ واپسی پر ہم کو صحرائے اعظم کے طوفان سے بچنے کے لئے ایک قبیلہ کے خیموں میں پناہ گزین ہونا پڑا۔ وہاں اس قبیلے کے سردار نے مجھ سے اظہار تعشق کیا۔ لیکن میں نے اُس کی درخواست سے انکار کیا۔ اِس پر اُس نے کہا خواہ کچھ ہو وہ ضرور مجھ کو اپنی بیوی بنائے گا۔ میں نے اس کو نہایت حقارت آمیز تبسم سے جواب دیا۔ وہ غالباً میرے نام و مکان سے بھی ناآشنا تھا۔ دوسرے روز بھی ہم اُن کے پاس ٹھہرے

رہے۔ جب رات ہوئی۔ تو میں نے پہرہ دار کو اپنے ہاتھ کی انگوٹھی دی۔ اور اپنے چچا کے ساتھ وہاں سے بھاگ نکلی۔ ہم چاندنی کی چاندنی میں شہر سبا کی طرف اُڑتے آرہے تھے۔ چار روز تک ہم نے رستے میں کہیں دم نہ لیا۔ پانچویں دن میری اونٹنی ریگ رواں میں دھنس گئی۔ اور اس سبب سے ہمارا شہر سبا میں پہنچنا دشوار ہوگیا۔ میں اپنی چالاکی اور عیاری پر نازاں ہو رہی تھی۔ ایک سو قدم کا فاصلہ طے ہؤا ہوگا۔ کہ میں نے اتفاقاً مڑکر دیکھا۔ تو ایک سوار تن تنہا ہمارے پیچھے آتا دکھائی دیا۔ جب میں نے غور سے دیکھا۔ تو یہ وہی سردار تھا۔ وُہ زین میں بے حس و حرکت بیٹھا ہؤا تھا۔ اور ہماری طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ میرے چچا نے میرا اضطراب دیکھ کر مڑ کر دیکھا۔ اور کہا۔ "بے شک وُہ ہمارے تعاقب میں آرہا ہے"!

اُس رات میں نے اپنے کُنبے کے سب لوگوں کو یہ سارا ماجرا کہہ سُنایا۔ اور وُہ سب اس بات پر آمادہ ہوگئے کہ اُس قبیلے سے لڑائی کی جائے۔ اُنہوں نے مجھے بھی ہمراہ چلنے پر مجبور کیا۔ لیکن میں نے انکار کر دیا۔ کیونکہ میں شہر سبا کی ملکہ اور بے قیاس گنجینہ کی محافظ ہوں۔ اب وُہ اُس گروہ کے ساتھ لڑائی کے ارادے پر مجھے اکیلی چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ ان کو گئے ہوئے آج دسواں دن ہے۔ کل تم یہاں آئے۔ تمہارے چہرے پر نقاب پڑا ہؤا تھا۔ جب تم محل میں پھر رہے تھے۔ میں تم کو دیکھ رہی تھی۔ اور جب تم اُس غار کی طرف چلے۔ جس میں وُہ گنجینہ مدفون ہے۔ تو میرے دم میں دم آیا۔ کیونکہ میں جانتی تھی۔ کہ تم قبر کے مُنہ میں جارہے ہو۔ اس غار میں ایک کل لگی ہوئی ہے جس کو خود ملکہ بلقیس اوّل نے تجویز کیا تھا۔ جب کوئی بے خبر اندر آجاتا ہے اس کو اس کل کی کمانی معلوم نہیں ہوتی۔ جب وہ اس کے نزدیک پہنچتا ہے۔ تو اس کے سر پر ایک بھاری لوہے کا گرز پڑتا ہے میں نے بات کاٹ کر کہا۔ جو میرے سر پر لگا تھا۔ اُس نے افسوس آمیز تبسم سے سر کو ہلایا پھر کہنے لگی۔ "جب میں تمہیں دیکھنے گئی۔ تو تمہارا نقاب چہرے سے ہٹا ہؤا تھا۔ اور تمہاری صورت و شکل اس شخص سے بالکل مختلف تھی جس کا خوف میرے دل میں سمایا ہؤا تھا۔ میں نے تمام رات تمہاری تیمارداری کی ہے۔ اب دن چڑھ آیا ہے۔ اور تم رو بصحت ہو۔" مَیں نے کہا کہ "میری زندگی کے کچھ

دن باقی تھے۔ کہ میں اس آفت سے بچ گیا۔ نازنین نے کہا " بے شک کئی اُولوالعزم بہادر اور دلاور اِس غار میں جاتے ہی راہیِ ملکِ عدم ہوئے ہیں "۔ میں نے کہا۔ اب تنہا تم اپنے خزانے کی محافظ ہو۔ واقعی تم بھی اُس ملکہ کی طرح دلیر اور شجاع ہو جس کے مقابلہ کے لئے کئی سلاطین کو اپنے بے قیاس لشکروں کے ساتھ پسپا ہونا پڑا۔ اُس نے ایک آہِ سرد بھری اور کہا " ملکہ سبا کا فرض ہے کہ اس محل میں رہے۔ اور اِس ویران شہر پر حکومت کرے۔ افسوس میں کسی کی بیوی نہیں بن سکتی "۔ میں نے کہا جو تم کو ڈراتا ہے۔ وُہ دھوکے میں ہے وُہ بولی " نہیں اُس سردار نے کہا تھا کہ اگر میں اس کے ساتھ عقدِ نکاح پر راضی نہ ہونگی۔ تو وُہ میرے سارے کُنبے کو تباہ کر دیگا۔ اور جب تک میں اس کے قبضہ میں نہ آجاؤں گی۔ وُہ ہم کو باغی سمجھے گا۔ میں نے کہا تو پھر یہاں سے بھاگ ہی کیوں نہ جائیں۔ میں تم کو وہاں لے چلوں گا۔ جہاں تم بالکل حفظ دامان میں رہو گی۔ اگرچہ ہم قزاق ور اہزن ہیں۔ لیکن تمہارے ساتھ کسی قسم کا نا ملائم سلوک نہ ہوگا۔ اس نے اپنے سر کو ہلایا اور محل کے باہر قدم رکھنے سے انکار کیا۔ جب میں نے دیکھا۔ کہ وُہ اس بات پر راضی نہیں۔ تو میں نے کہا۔ اچھا میں تمہاری مدد کو تیار ہوں۔ اُس نے کہا " تو آؤ پہلے اس تخت کو غار میں لے چلیں۔ یہ کہہ کر وُہ مجھ کو ایک پوشیدہ دروازے سے بڑے ایوان میں لے گئی جس میں فرشِ بلوّریں کے نیچے آبِ زلال بہ رہا تھا۔ ہم دونو نے تخت کو اُٹھایا۔ اور غار کے دروازے پر پہنچے۔ پھر اُس نے ایک مشعل روشن کی اور بڑی مشکل سے میں تخت کو کشاں کشاں اس کے پیچھے لے چلا۔ چند قدم چل کر وُہ اُس کل کو کُنجی دینے کے لئے جھکی تاکہ وُہ گرز نہ گر پڑے دائیں طرف ایک اور مخفی دروازہ تھا۔ اور آگے ایک وسیع کمرہ تھا جس میں طلائی زیور بیش بہا جواہر پڑے ہوئے تھے۔ ایسے جواہر میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ بعض کو بے اختیار میں نے ہاتھ میں اُٹھا لیا۔ طلائی طشت۔ جڑاؤ زرہیں اور تلواریں جن کے دستوں اور میانوں میں ہیرے اور نیلم جڑے ہُوئے تھے، منڈھائے نا شگفتہ۔ الماس ناتراشیدہ۔ جڑاؤ انگشتریاں اور کانوں کی بالیوں کا میرے پاؤں کے

نیچے فرش تھا۔ دیواروں کے ساتھ بڑے بڑے پتھر کے صندوق رکھے تھے۔ جو کبھی کھولے نہ گئے تھے۔ بلقیس نے مجھے بتایا۔"کہ اُن میں وُہ تحائف مقفل و سربستہ ہیں۔ جو حضرت سلیمان نے ملکہ بلقیس کو بھیجے تھے"! ایک صندوق کا پتھر ایک جگہ سے ٹوٹا ہُوا تھا۔ میں نے اُس کے اندر ہاتھ ڈالا۔ الماس کے ٹکڑے نکالے۔ جن کی نظیر دنیا میں ملنی مشکل ہے میں حیرانی میں مستغرق تھا۔ اور دل میں اُس گنج فراواں کا خیال کر رہا تھا بلقیس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔"کہ اس محل کے متعلق ایک اَور تعجب خیز بات ہے سُنو کیا تم کو کچھ آواز سُنائی دیتی ہے"۔ میں نے کان لگایا۔ تو ایک گونج کی سی آواز سنائی دی۔ میں نے کہا یہ کیا ہے بلقیس بولی"اِس پہاڑ میں کوئی آتشی مادہ ہے۔ یہ آواز اسی کی ہے۔ اَور اِسی طرح سالہا سال سے جاری ہے۔ مجھے یاد ہے۔ کہ میرے بچپن کے زمانہ میں ایک دفعہ کلۂ مخروطی سے ہم نے دُھواں نکلتے دیکھا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے۔ کہ جہاں ہم کھڑے ہیں۔ اس جگہ سے وُہ مادہ کچھ بہت دُور نہیں ہے۔ چنانچہ اس کمرے کی دیواریں گرم ہیں"۔ میں نے دیوار پہ ہاتھ رکھا۔ اِس قدر گرم تھی۔ کہ میں نے فوراً ہاتھ اُٹھا لیا۔ بظاہر معلوم ہوتا تھا۔ کہ صرف ایک دیوار سنگین ہمارے اَور اس مادۂ آتشین کے درمیان ہے۔ بلقیس کہنے لگی"زمانہ گذشتہ میں اس کی نسبت عقیدہ تھا۔ کہ اس پہاڑ میں دوزخ ہاویہ ہے۔ جس میں ملحد اَور کافر ڈالے جائیں گے۔ اُن کو وہاں کھانے کے لئے مردار گوشت اَور پینے کو پگھلی ہوئی رال ملے گی"! میں نے کہا"خدا آپ کو حفظ و امان میں رکھے"! بلقیس"اَور تم پر بھی خدا رحم کرے۔ اب میں نے تم کو اپنے بزرگوں کا راز بتا دیا ہے۔ تم میرے ساتھ اقرار کرو۔ جب تک میں اَور میرے خاندان کے لوگ شہر سبا میں ہیں۔ تم کبھی اس خزانے پر قبضہ کرنے کی تمنّا دسعی نہ کروگے"۔ میں نے کہا"اگرچہ میں قزّاق ہوں۔ لیکن خدا کو حاضر و ناظر جان کر آپ سے عہد کرتا ہوں۔ کہ میں کبھی آپ کا راز افشا نہ کروں گا۔ اَور نہ ہی آپ کے دفینہ پر قبضہ کرنے کا قصد کرونگا۔ اب سے میں آپ کے گھر کو اپنا گھر سمجھوں گا میں ناسپاس و احسان فراموش نہیں۔ بلقیس مہ

مجھے تم پر پورا اعتماد اور اعتبار ہے" یہ کہہ کر اس نے اپنا نازک ہاتھ جس نے میری پیشانی پر پٹی باندھی تھی۔ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے اپنی جیب سے وہ الماس جس کو میں نے تخت پر جڑا ہوا پایا تھا۔ نکالا۔ اور اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ لیکن اس نے واپس لینے سے انکار کیا۔ اور کہا "یہ شہر سبا کی یادگار تم اپنے پاس رکھو" اس کمرے کی ہوا سے ہمارا دم گھٹ رہا تھا تخت کو ہم نے ایک طرف رکھا اور ہم باہر نکل آئے۔ اور بڑے ایوان میں جس نے شہر سبا کی شان و شوکت کے نظارے دیکھے تھے جا بیٹھے۔ بلقیس مجھ کو عجیب عجیب تصاویر اور کتبوں کی حقیقت سنانے لگی پھر اس نے مجھے بہت سی بزم ہائے راز و نیاز و بزم ہائے عرش آئین کی کہانیاں سنائیں۔ جو کہ اس عظیم الشان ایوان میں ظہور پذیر ہوئی تھیں۔ شام تک ہم دونوں اسی ایوان میں بیٹھے رہے اور بلقیس ازمنہ گذشتہ کے بڑے بڑے واقعات بیان کرتی رہی۔ پھر مجھے اس نے انگوروں کا رس اور کچھ کھجوریں دیں۔ جب ہم وہاں سے اٹھ کر ایوان میں سے گزر رہے تھے۔ تو اس نے ایک چیخ ماری۔ اور ہاتھ کے اشارے سے مجھ سے کہا "دیکھو وہ یہاں پہنچ گئے ہیں۔ جونہی اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔ معاً ایک ستون کے عقب سے ایک مردود نے اس پر حملہ کیا۔ اس نے پھر زور سے چیخ ماری۔ لیکن پیشتر اس کے کہ وہ اس کو چھوئے میں نے اپنی تلوار سے اس پر حملہ کیا۔ اور وہ لڑکھڑاتا ہوا نیچے پتھروں پر جا پڑا۔ اس اثنا میں دس بارہ آدمی اس سردار کے ہمراہی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ بلقیس پہلے ہی خوف زدہ کانپ رہی تھی۔ مجھ سے جلدی مگر نہایت آہستگی کے لہجے میں کہا "آؤ آؤ۔ صرف ہم اس طرح بچ سکتے ہیں" یہ کہہ کر وہ نہایت تیزی سے بھاگی۔ اور ہمارے دشمن ہمارے پیچھے دوڑے۔ میرے چہرے پر نقاب نہ تھا۔ اس لئے ہمارے حملہ آوروں کو یہ معلوم نہ تھا۔ کہ میں قبیلہ نقاب پوش سے ہوں۔ میں اور بلقیس ایوان بہ ایوان بھاگتے ہوئے اس غار میں پہنچے۔ اور تاریک جگہ میں بلقیس نے ایک دروازہ کھولا۔ مجھے اندر دھکیلا خود بھی اندر آ کر دروازہ بند کر دیا۔ پھر ہم خاموش وہاں بیٹھے رہے۔ ہم کو کوئی آواز سنائی نہ دی۔ معلوم ہوتا تھا کہ حملہ آوروں نے ہمارے پیچھے آنے

کی جرّات نہ کی بلقیس نے آہستہ سے مجھے کہا۔ یہ راہ باہر پہاڑ پر جانکلتی ہے ہم بچ سکتے ہیں۔ ہم اندھیرے میں اپنے گھٹنوں اور ہاتھوں پر آگے بڑھنے گئے۔ قریب آدھ گھنٹے کی سخت مصیبت کے بعد ہم کو خفیف سی روشنی نظر آئی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد ہم کھُلی ہوا میں جاکھڑے ہوئے بلقیس نے کہا ابھی ہم کو اُوپر چڑھنا چاہیئے۔ ہم پہاڑ کی دوسری جانب چلے جائیں گے۔ ہم ابھی تھوڑی ہی دُور چڑھے تھے۔ کہ ہمارے متعاقب سردار نے ہم کو للکارا۔ میں نے مڑکر دیکھا۔ تو ہمارے بالکل قریب تھے۔ لیکن ہمارے اور اُن کے درمیان چٹان کا ایک نہایت خطرناک کنارہ جو پچاس فٹ کے قریب آگے کو جھکا ہوا تھا۔ حائل تھا۔ اِس لئے ہم ایسی جگہ تھے۔ جہاں اُن کا پہنچنا ناممکن تھا۔ بلقیس نے بھی اُن کو حقارت آمیز تبسّم سے دیکھا۔ اُس سردار کی آتشِ کینہ اور بھی بھڑک اُٹھی۔ اُس نے اپنے ہمراہی سے تیر و کمان لیا۔ اور بلقیس پر تیر برسانے شروع کئے۔ پیشتر اس کے کہ میں اُس کو زمین پر لٹا سکوں۔ بلقیس نے ایک چیخ ماری اور لڑکھڑا کر گر پڑی۔ قاتل ہنس پڑا۔ میں نے ایسا وحشیانہ اور بے رحم قتل کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مجھے اپنی جان کے لالے پڑتے نظر آئے۔ میں جلدی مُنہ کے بل لیٹ گیا۔ اور اُوپر کو رینگنا شروع کیا۔ وُہ سردار اپنے ہمراہیوں کو مخاطب کرکے کہنے لگا" دیکھو اِس کی پہنچیاں اور گلے کا ہار اُتار کر مجھے دے دو۔ اور باقی زیور تم آپس میں بانٹ لو۔ اِس کے ہمراہیوں نے زیور اُتارنے میں اپنی سنگ دلی اور وحشیانہ پن کا پورا ثبوت دیا۔ پھر وُہ مجھ پر تیر پھینکنے لگے۔ جب شام کی تاریکی نے مجھے اُن کی نظروں سے غائب کردیا۔ تو میں بے دم ہوکر ایک چٹان کی اُڑ میں بیٹھ گیا۔ وہاں سے اُن کے فرودگاہ میں مجھے آگ جلتی نظر آتی تھی۔ آدھی رات کے وقت میں نے ایک گرج کی آواز سُنی۔ اور پہاڑ کانپ گیا۔ صبح ہوئی تو میں نے دشمنوں کو واپس جاتے دیکھا۔ اُن کے جانے کے تین گھنٹہ بعد میں بلقیس کی نعش کے پاس آیا۔ اُس پر بے شمار کوّے اور گدھ جمع ہورہے تھے۔ مجھے رنج و تاسف نے تنہائی میں آگھیرا۔ اور میں دیر تک نعش کے پاس بیٹھ کر اشکِ خون بہاتا رہا۔ پھر محل کی طرف گیا۔ میں نے دیکھا۔ کہ غار کے مُنہ سے دھواں نکل رہا ہے۔ میں نے

آگے جانے کی کوشش کی۔ مگر گرمی اَور دھوئیں کی وجہ سے نہ جا سکا۔ جب میں نے غور سے دیکھا۔ تو دھوئیں کے ساتھ غار کے مُنہ پر گرم راکھ اَور پگھلی ہوئی گندھک آ رہی تھی۔ مجھے یقین ہُوا۔ کہ وُہ دیوار پتھروں کی ٹوٹ گئی ہے۔ اَور اب جلدی ہی یہ محل بلکہ ویران شہر سبا راکھ میں دب جائیں گے۔ میں اپنی جان بچا کر بھاگا۔ جو الماس بلقیس نے مجھے اپنے ہاتھ سے دیا تھا۔ میری تلوار کے قبضہ میں جڑا ہُوا ہے۔ جب کبھی تلوار کے قبضے پر میرا ہاتھ پڑتا ہے۔ تو مجھے وُہ دِلفگار واقعہ یاد آجاتا ہے۔ اور بلقیس کی پیاری صورت آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ جو اس دُنیا سے یُوں ناشاد و نامراد گئی۔ اَور میں دستِ حسرت و افسوس مل کر رہ جاتا ہوں۔

نورالدین عنبؔر

سودائے سنگین

فرامرز مرزبان جمشید جی سے، بمبئی کے قلابہ اسٹیشن پر اتفاقاً ملاقات ہوئی۔ اور اس ملاقات نے مجھے بہت حیرت میں ڈالا۔ سال بھر سے میں نے اُسے دیکھا نہیں تھا، اس عرصہ میں اُس میں کس قدر تغیر ہو گیا تھا، اُس وقت اُس کے ہلکے چہرے کے اوداس رنگ پر مسرتِ شباب کا غازۂ گلگوں پھرا ہوا تھا، آج ایک انجمادِ عنبریں ایک سانولے پن کے ساتھ ساتھ چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ اُس کی ہلکی سُرخی مائل مونچھوں میں جنہیں اس وقت وُہ کاسمیٹک لگا لگا کے فوجی ڈھنگ پر سیدھی اور نوک دار بنایا کرتا تھا۔ اور جن سے اُس کے چہرے کی زنانہ ملاحت پر ایک مردانہ وقار پیدا ہو جاتا تھا۔ آج ایک پریشانی تھی، اور اضطراب کی تکلیف دہ کیفیت کے ساتھ کھلے ہوئے ہونٹوں پر ایک تمکن برس رہی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نوجوان پر بھی جو ہمیشہ بنے سنورے رہنے کے لئے مشہور تھا، زندگی کی کسالتِ غم چھا گئی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ مجھے دیکھ کے خوش ہوگا۔ برخلاف اس کے میں نے دیکھا۔ کہ اس اتفاقیہ ملاقات سے جس میں اُسے مجھ سے بات کرنی پڑی۔ وُہ بیزار معلوم ہوتا تھا۔ ذرا سا ہٹ کے، میرے بیٹھنے کے لئے اس نے بنچ پر جگہ دی، اس لئے کہ قواعدِ اخلاق کی مخالفت صریح نہ ہو۔ اس کے پتلے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ مگر پیدا ہوتے ہی مر گئی۔

یہ پُر اجتناب طرزِ قبول ایسی نہ تھی۔ کہ مجھے اس بات کی ہمت دلاتی کہ میں اپنی پُرانی عادت کے موافق "تم" سے اُسے خطاب کرتا، اس لئے میں نے کہا۔

"مدتیں ہوئیں، "آپ" سے تو ملاقات ہی نہیں ہوتی۔

"ہاں" اور یہ کہہ کے اپنی بائیں کہنی کو بنچ کے ہتے پر ٹیک کے بیٹھ گیا۔ نگاہ فرش کے پتھروں پر گاڑ دی۔ اور سگرٹ کی راکھ کو گرانے کے لئے، سگرٹ پر اپنی انگلی آہستہ آہستہ مارنے لگا
نگاہ تو اس کام پر، مگر خیال کہیں اور، اس حالت میں اُس نے، اپنا فقرہ جاری رکھا۔
"ہاں پچھلے سال اس واقعہ کے بعد، میں والدہ کے ساتھ بمبئی آیا تھا، اُس وقت سے اب تک بند ورہ میں ہیں، کبھی یہاں آتے ہی نہیں آج کا آنا مستثنٰے سمجھنا۔ کس واقعہ کا مجھ سے ذکر کر رہا تھا؟
ٹوٹے ٹوٹے فقرے کہتا تھا، آنکھیں سگرٹ سے نہ ہٹاتا تھا۔ پھر گویا اِس بات سے متعجب ہو کر کہ ایک ہی دفعہ اس قدر باتیں کر گیا، وہ یکایک اپنے فقرے کو تمام کئے بغیر رُک گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ یہ نوجوان جس کی تمام گذشتہ زندگی مجھے معلوم تھی، یاس کی ہوائے گراں سے بے تاب ہے۔

یہ نوجوان جو ہمیشہ متبسّم و ظریف رہتا تھا۔ یہاں تک کہ اپنے آلام عاشقانہ میں بھی کوئی ایسی حکایت ضرور کہتا۔ جو تمہیں خوش کرتی، اپنی سب سے زیادہ یاس انگیز حسّیات و کیفیات کی رفیق اور پُر تاثیر زبان سے تصویر کھینچتے ہوئے، یہ دیکھ کر اس کی سرگذشت تمہارے دل میں رقت پیدا کرنے کو ہے؛ ایک نہایت ہی چھوٹا سا لطیفہ اپنی سرگذشت میں غیر معلوم طریقہ سے داخل کر کے، تمہارے مونہہ سے ضرور ہی قہقہہ نکال لیتا، غرضکہ یہ ہمیشہ لطیف و شوخ، ہمیشہ متاثر، لیکن ساتھ ہی ہمیشہ ہنسنے ہنسانے کے بہانے ڈھونڈنے والا نوجوان، اس وقت کے اُکھڑے اُکھڑے رنجیدہ خیالات میں مستغرق نوجوان سے اس قدر دُور نظر آتا تھا کہ ..... فرامرز کو میں برسوں سے جانتا تھا یہ اک شاعر تھا، حساً و فکراً شاعر اگرچہ لسانا نہ ہو۔ اپنی تمام ہیئت معتوبہ کے ساتھ شاعر تھا۔ کہ زندگی کو نورِ شعر میں دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ اُن بدبختوں میں سے تھا جو زندگی کی مادّیات کے تھپیڑوں کے کھانے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ حالانکہ اُن کا خستہ و مجروح اور ہائے ستم! شاعرانہ دل مثل ایک مریض بچے

کے اُن تھپیڑوں کے کھانے کی طاقت نہیں رکھتا... مگر اُس کی طبیعت میں ایک میلان نشوونما کہ سب سے زیادہ مکدر زمانے میں اپنے پُر ملال چہرے پر اک مسکراہٹ ضرور رکھتا تھا۔ اس تبسم سے میں یہ سمجھتا تھا کہ اُسے زندگی کی مادیات سے جب پالا پڑتا ہے۔ تو اُن کے یقین نہ کرنے میں ثابت قدم رہنا چاہتا ہے۔ اور اس طرح اپنے تئیں دھوکا دیتا ہے۔ خود کہا بھی یہی کرتا تھا" زندگی میں سے موسیقی اور شعر، پھول اور روشنی، اور پھر ان سب کا مجموعہ ان سب کا ماحصل عورت کو نکال ڈالو، پھر دیکھیں کیونکر دنیا میں زندہ رہنے کی قوت اپنے میں پاتے ہو"؟

اگر زندگی انہیں چیزوں سے عبارت ہوتی۔ اور اُن کی حقیقت بھی صرف تخیل سے مرکب ہوتی۔ تو ہم سب کتنے خوش قسمت ہوتے۔ مگر یہ رنگین چیزیں ہوا ہیں۔ اور رنگ، کہ اُڑ جاتی ہیں۔ غائب ہو جاتی ہیں اور یہ عورتیں؟ کتابِ حیات کی اس جلد کو ایک جلد زر اندود کی شکل میں دور ہی سے دیکھتا تھا۔ اُسے پڑھنے، اس کے بابوں اور صفحوں کو جو آنسوؤں سے لکھے گئے ہیں۔ ابھی دیکھنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ ابھی اُسے یہ حقیقت معلوم نہیں ہوئی تھی، کہ زندگی میں شعر، ایک نوحۂ ماتم، موسیقی، اک فغانِ یاس، پھول، ایک منجمد قطرۂ گریہ۔ روشنی، اک امیدِ گریزاں، کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اور بھی اُس نے یہ نہیں معلوم کیا تھا کہ عورت بھی اُس سراب کی مانند ہے کہ ڈھونڈھو مگر نہیں ملتا، دکھائی دینا معلوم ہوتا ہے۔ مگر ہاتھ نہیں آتا۔

پہلے اُس سے ہفتہ میں ایک دفعہ تو ضرور ملاقات ہُوا کرتی تھی۔ ملاقات کا وقت گزرتے ہُوئے زمانے کی تلافی کر دینے کے لئے کافی ہوتا تھا۔ اِس ملاقات میں سوائے اپنی عاشقانہ زندگی کے، وُہ کسی دوسری زندگی سے واقف ہی نہ تھا۔ تمام صفحوں کو مجھے دکھاتا۔ سات آٹھ مصرعوں میں اس ملاقات اور پچھلی ملاقات کے درمیان کے زمانہ کی تاریخ سُنا دیتا۔ کبھی ایک لفظ ہی ہفتہ کی رپورٹ سُنانے کے لئے کافی ہوتا تھا۔ یہاں تک

کہ بعض مرتبہ بات کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ مجھے دیکھ کر اُس کا خوش خوش مسکراتا یا منہ بناتا مجھے کل حال بتا دیتا تھا۔

یہ راز کہنا اور سننا، کس طرح اور خاص کر کس لئے شروع ہوا تھا؟

مجھے یاد پڑتا ہے، کہ مجھے اپنا راز دار بنانے کی علوت کی ابتدا اُس طرح کی تھی۔ ایک دن صبح۔ آج کی قلابہ سٹیشن کی ملاقات سے پانچ سال قبل۔ اپالو بندر پر میں نے اُسے دیکھا۔ اپالو بندر پر صبح کے وقت اُس کا ہونا، اس وقت کی زندگی کے لحاظ سے ذرا عجیب شے تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نے اُس کی وجہ بتائی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اُس دن اُس کی طبیعت میں باتیں کرنے کا بہت جوش تھا۔ اور چونکہ اُسے ایک ایسا آدمی مل گیا تھا۔ جس سے وُہ دل بھر کے باتیں کر سکتا تھا، اس لئے وہ خوش معلوم ہوتا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا بھائی کیا اچھا ہُوا تم مل گئے، تم سے مشورہ کروں گا۔ مجھے ایک شادی کے لئے ایک ہدیہ تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ (کہتے وقت ہنسنے اور اپنے تئیں بے پروا ظاہر کرنے کی کوشش کرتا تھا) ہمارے عزیزوں میں سے ایک لڑکی بیاہی جانے والی ہے۔ اس کے مناسب ایک ہدیہ تیار کرنے کے لئے میں نے کس قدر اپنی طبیعت پر زور ڈالا، اور انتخاب کرنے تک کن مشکلوں کا سامنا ہُوا۔ پہلے میں نے چاہا۔ کہ کوئی جڑاؤ زیور دوں، مثلاً ایک فیروزہ یا عقیق کی انگوٹھی یا ایک ننھی سی، سونے کی سینے پر لگائے جانے والی گھڑی، مگر میں نے اس خیال کو چھوڑ دیا۔ کیوں کہ ان چیزوں کے دینے میں کوئی نزاکت طبع ظاہر نہیں ہوتی ان چیزوں کے دینے کے یہ معنے ہوتے کہ میں اُس کے مذاق پر حکمانہ اثر ڈالنا چاہتا ہُوں۔ "ایسی انگوٹھی پہنو، ویسی گھڑی لگاؤ" کے قبیل سے اس پر ایک دباؤ ڈالنا ہُوا۔ اس کے علاوہ اس میں ایک خواہش نمائش بھی تو ملی ہوتی گویا میں (میری چیز وُہ ایک ہی بات ہے، اس کی انگلیوں میں، اُس کے سینے پر نظر آؤں۔ سچ پوچھو تو اس میں ایک گنوارپن کا پہلو بھی تو نکلتا ہے۔ ہے نا؟ یہ ایسا ہی ہے جیسا ایک تحفہ دینا جس کی قیمت بھی اُس پر کھدی ہو۔

یہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جائیں۔ دیکھنے والے آنکتے اس انگوٹھی کی لاگت پچاس روپیہ کی ہوگی، یہ گھڑی ڈیڑھ سو کی ہوگی۔"

یہ فرامرز جمشید جی اُس دن، پدو بندر میں کھڑا، کبھی اس پاؤں پر زور دے کے کبھی اُس پاؤں پر، اس طرح چھوٹی چھوٹی باتوں کو نہایت وضاحت سے بیان کر رہا تھا، اور فلسفہ ہدایا پر لکچر دے رہا تھا، پانچ سال بعد اُس بڑے نوجوان سے کتنا الگ کس قدر دُور نظر آتا تھا۔ جو سر نیچا کئے، رنجیدہ شکل میں سگرٹ کی راکھ گرا رہا تھا۔ اور مجھ سے آنکھیں نہ ملانی چاہتا تھا غرضیکہ اُس دن فلسفہ ہدایا پر لکچر دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"میں نے پھر ایک اور چیز سوچی، انگریزی اور ہندوستانی مٹھایاں کا اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کی جو مل سکیں، تاج محل ہوٹل کی مٹھائیاں، خوانڈانٹ وغیرہ کا ایک خوان بھیجوں۔ مگر ان کی صرف ایک دو دن کی زندگی ہوتی، میں چاہتا تھا کہ" فرامرز کی اصلی تمنا میں ان تمام باتوں سے سمجھ رہا تھا۔ اس کا بلا لزم' مجھے اس قدر سمجھانا، ایک شادی کے تحفہ کے لئے اس قدر تفصیلات بیان کرنا، ان باتوں میں جو وہ بیان کر رہا تھا، وہ مطالب جو وہ بیان نہیں کر رہا تھا صاف جھلک رہے تھے۔

کہنے لگا: "آخر کار انتخاب کر ہی لیا۔ آؤ دکھاؤں۔" یہ کہتا ہوا مجھے گھسیٹ کر مارکس اینڈ کمپنی جوہریوں کے ہاں لے گیا۔ وہاں ایک کمرے میں لے جا کر، بیچنے والے سے پوچھنے لگا: "سنگار دان تیار ہو گیا؟"

سنگار دان تیار ہو چکا تھا۔ وہ لایا گیا۔ یہ چاندی کا (جس پر سونے کا پانی پھرا ہوا تھا) ایک جڑاؤ سنگار دان تھا، جو ایسی نزاکت و نفاست سے بنایا گیا تھا، کہ بنانے والے نے اپنی حسنِ طبیعت کو ایک ایک خط میں صرف کیا تھا۔ ڈھکنے پر چاندی کے مجسّم پھول اور پھل مثلاً سیب اور نارنگی کے پھل۔ اور گلاب کے پھول بنے ہوئے تھے۔ ان میں جا بجا موتی ٹکے ہوئے تھے۔ اندر کے خانے، لونڈر اور عطروں کی شیشیوں اور قیمتی صابونوں سے بھرے ہوئے

تھے۔ اُن کے اُوپر ایک چاندی کی کشتی تھی جس میں مخمل بچھی ہوئی تھی۔

کہنے لگا "میں نے اِس کو منوایا۔ اس میں عطر ہوں گے؛ عطر میں بسے ہوئے رومال ہوں گے۔ سنگار کی چیزیں ہوں گی۔ خوشبوئیں ہوں گی۔ اُبٹنے ہوں گے پوڈر ہوں گے۔

وُہ چیزیں ہوں گی جو اس کے مشامِ خیال میں برسوں تک کسی وقت بہار کی زندگی کی خوشبوئیں پہونچائیں گی۔۔۔۔۔۔

غرضیکہ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وُہ اپنے تئیں بھُول گیا تھا۔ اور مجھے اپنا رازدار سمجھ کے باتیں کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ مجھے یہ سمجھانے لگا۔ کہ اس تحفہ کو کیوں انتخاب کیا۔ وُہ باتیں جو اس کے قلب میں بھری پڑی تھیں کسی کو سنا کے خالی کرنا چاہتا تھا۔ شاید اُس دن میں نہ ہوتا۔ اُسے کوئی دوسرا ملتا، اُسی سے یہ سب باتیں کہتا۔

"سمجھتے ہو؟ اس تحفے کے مطلب، اس ہدیہ کے ماخذ، اس کی روح کو پورے طور پر محسوس کرتے ہو؟ اس طرح میں اس کے کپڑوں تک میں حلول کر جاؤں گا، یہ چیزیں اُس تک ایک بوئے امل پہونچائیں گی؛ اس کے خوابِ نوشین میں بھی میری کوئی چیز ہوگی؛ میں اس کے نہانے کے پانی تک میں نفوذ کر جاؤں گا۔ اُبٹنا مل کے، جب وُہ اپنی ہتھیلیوں میں چلو بھر بھر کے پانی لے گی، تو میں اس کی پتلی انگلیوں کے بیچ میں سے آبشارِ مسرت بن بن کے اُسے ایک لطیف اور معطر ٹھنڈک کی بہار دوں گا۔ اور جب وُہ نہا کے تولیہ سے بدن ملے گی۔ تو اُس کے مُنہ اس کی گردن اُس کے کندھوں سے، گویا میری روح کا ایک نفیس خیال اور غبار صاف وسفید بن کر، ایک معطر بوسہ، پر اُن کی طرح اُڑے گا۔ اُس کے بعد اپنے رومال کو وُہ لونڈر کے دو قطروں سے تلے گی؛ اور جب وُہ اُسے سونگھے گی۔ تو گویا میں اُس کی تمام اعماقِ روح میں پہنچ جاؤں گا۔۔۔۔۔"

یہاں تک پہنچ کے اُس نے یکایک معلوم کیا۔ کہ وُہ ضرورت سے زیادہ کہہ گیا۔ اور وہاں تک بڑھ گیا کہ اب واپس ہونا ممکن نہیں، یہ دیکھ کے اُس نے میرے ہاتھ

اپنے ہاتھ میں لے لئے اور اپنے تمام اضطرابِ قلب کو ایک چھوٹی سی آہ میں قید کرکے کہنے لگا:" آہ! اس قصّہ کو میں تمہیں کسی اور دن سناؤں گا"!

غرضیکہ فرامرز نے مجھ سے اپنے فسانۂ دل کا کہنا اس طرح شروع کیا تھا: اوّل اوّل ہماری ملاقات محض ادبیات کے جلسے ہُوا کرتے تھے وُہ بھی فارسی ادبیات کا عاشق، الفنسٹن کالج سے فارسی میں آنرز کا گریجوایٹ ہیں فارسی ادبیات کا دلدادہ، وُہ قاآنی کے قصید سے اور پروفیسر شہباز اور حافظ کی غزلیں سنا سنا تا فسانۂ دل سنانے لگا۔ اُس دن کے بعد ہر ملاقات میں اس فسانۂ دل کے باب بڑھنے لگے، یہاں تک کہ میں اُس کی تمام سرگذشتِ حیات سے واقف ہوگیا۔ گویا اُس کی عاشقانہ زندگی ایسی زندگی تھی کہ میں بھی اُس میں شریک تھا۔ اور ہم دونوں مل کے اُس زندگی کو بسر کر رہے تھے۔ اُس وقت میں نے یہ قطعی رائے اپنے دل میں قرار دے رکھی تھی۔ کہ فرامرز کا یہ عشق، اوّل اور آخری ہوگا۔ لیکن وُہ اُسے قبول نہ کرنا چاہتا تھا۔ اگر اُس کے ادّعا پر اعتبار کیا جاتا۔ تو یہ عشق محض ایک بچپن تھا؛ ایک لڑکپن کا کھیل کہ معلوم نہیں کب سے شروع ہُوا، مگر شروع ہو کے جاری رہا۔ اس کے متعلق جو اُسے باتیں یاد تھیں ہنس ہنس کے (گویا انہیں اہمیّت نہ دینی چاہتا) بیان کرتا اور بیان کرتے وقت اس لڑکپن پر تعجب کرتا نظر آتا؛ لیکن نہ معلوم کیوں، ایک تاثیرِ عمیق، اس ہنسی، اس خندۂ استہزا کے پردے کو چیر کے، نوجوان آدمی کے دل میں ایک غیر قابلِ شفا زخم کو ظاہر کرتی تھی۔ جو اس عشق سے پڑ گیا تھا۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ یہ عشق کیا تھا، مذاق تھا، وُہ کہتا "میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔ کہ اس تمام دورۂ عشق میں، بیاہ کرنا، یا سادہ عشق و محبّت کی حد سے آگے بڑھنا، یا بڑھنے کی جُرأت کرنا ہم دونوں کے خیال میں بھی نہیں آتا تھا۔ ہم بس سادہ ایک دوسرے کے عاشق ہیں۔ گویا ہم دونوں نے ایک وقت مقرّرہ کے لئے حسن و عشق کا ایک مضحک ناٹک کھیلنے کا ارادہ کیا تھا، اور ہم دونوں ایکٹر تھے۔ پردہ گرنا، تماشہ

ختم ہوتا اور ہم دونوں ایک دوسرے سے نہایت خوشی سے ہاتھ ملاتے۔ اور ایک دوسرے کا شکریہ ادا کرتے۔ کہ خوب پارٹ کیا، اور اِس تماشے کو جسے ہماری زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا، وہیں چھوڑ کے، ہر اک اُس راستے پر پڑ لیتا جو ہمارا طالع معیشت ہمارے لئے ہمیں بتاتا۔ ہم دونوں اسے جانتے تھے، اور اس کے متعلق گفتگو کرنے کی بھی ضرورت نہ سمجھتے تھے۔ وُہ اکثر اپنی شادی کے متعلق اپنے تصورات مجھ سے بیان کیا کرتا، جن گھرانوں سے اُس کے لئے پیغام آتے۔ اُن کے متعلق مجھ سے رائے پوچھتا" یہاں تک کہ ایک دن ماں، بیٹی کا ایک جوڑا اُس کے گھر آنے والا تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ دونوں ماں بیٹی اُسے انتخاب کرنے کی نیت سے آ رہی ہیں، اُس دن، میں نے ہی اُسے بتایا کہ کیا کپڑے پہننا چاہئیں۔ اور کیا سنگار کرنا چاہئے۔ ازدواج حقیقتِ زندگی سے اس قدر متعلق ایک چیز تھی کہ اُس کا سوچنا بھی ممکن نہ تھا۔ میں تو اُس مناسبت، (یا اگر آپ اسے اس لفظ سے یاد کرنا چاہیں تو، اس عشق کے جہتِ شعری کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی زندگی کو ایک خوابِ ابدی محبّت میں رکھ کے، اپنی زندگی بھی اُسی مدہوشی میں گزارنا چاہتا تھا۔ بس اس قدر اور کچھ نہیں، پھر گویا ان تمام حجتوں کی تائید کے لئے اس کے لبوں پر ایک ایسا تبسم، اور اس کی آنکھوں میں ایک ایسی نگاہ رچا ہوتی تھی۔ جو مجھ سے بھی ایک صدقۂ تصدیق مانگتی نظر آتی تھی۔ کہ اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا۔ کہ ان کٹھ حجتوں سے خود اُس کا دل بھی مطمئن نہیں ہوا۔ اگر میں ایک لفظ بھی ایسا کہہ دیتا۔ جس سے شبہ ہوتا کہ میں ان حجتوں پر یقین نہیں کرتا، یا ذرا سا بھی خیال ایسا ظاہر کرتا۔ کہ میں اُس کی غلطِ حسّیات سے جنہیں وُہ کوشش کر کے بڑھانا چاہتا تھا، ہٹانا چاہتا ہوں، تو میں یقین رکھتا ہوں۔ کہ وُہ ایک دم سارا اعتراف کر لیتا، رو پڑتا۔ اور کہتا کہ میں اس کے عشق میں مر رہا ہوں۔ لیکن اگر میں ایسا کرتا۔ تو حقیقت میں گویا میں اُس کی موت لاتا۔ وُہ اپنے دل کو دھوکا دینا چاہتا تھا؛ اور مجھے بھی لازم تھا۔ کہ میں اس معاملہ میں اس کی تائید کروں؛ ورنہ اس کے

دل پر حقیقت ظاہر کرنے کی چوٹ لگانا یعنی یہ کہنا۔ کہ دراصل تم اُسے از جان و دل چاہتے ہو، گناہ تھا۔ مجھے یہی لازم تھا۔ کہ میں اُس کی اس کوشش میں کہ وُہ اپنے زخمِ دل کو ڈھانپتا، اور اس سے نگاہ ہٹانا چاہتا تھا، اس کی مدد کردں۔ اور اس طرح اُس کی سلامتی کی خدمت کردں۔

لیکن کبھی کبھی وُہ مجھ سے کھل جاتا، اور ایک دوسرے لہجہ میں کہتا،
"کہیں تمہیں خبر ہو کہ ان تمام حرکتوں سے جو لڑکپن سے زیادہ کچھ نہیں کبھی کبھی مجھ میں اک عجیب تاثیر حسرت پیدا ہوتی ہے۔ ہاں میں اُس کا اعتراف کرتا ہوں کبھی کبھی ایک ایسی حسرت پیدا ہوتی ہے۔ کہ میں رونے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ مگر ایسا کیوں ہے؟ جب کہ یہ لڑکپن ہنسی کھیل سے آگے کے درجہ کی کوئی چیز نہیں، جب کہ اگر اس پر غور کیا جائے۔ تو اس کی قیمت ایک قہقہہ سے زیادہ نہیں، جب یہ حالت ہے تو یہ حسرت کیوں؟
سوچا تو خود ہی اس کی حقیقت مجھ پر ظاہر ہوئی۔ ہمارا یہ کھیل ہمیشہ رہنا چاہئے تھا، اُسے تا ابد ایک لڑکی رہنا چاہئے تھا، اور مجھے تا ابد نوجوان لڑکا رہنا چاہئے تھا، یہ حالت، بڑھنے والی کبھی نہ گھٹنے والے برسوں کی لاتناہی مدّت کے ساتھ قایم رہنا جاری رہنا چاہئے تھی۔ یہ خواب بغیر اس کے کہ حقیقت کا ضربہ اس پر لگے، بہ افق گریزاں بغیر اس کے کہ حد پر پہنچے، یوں ہی دراز ہوتے رہنا چاہئے تھا۔ مگر یہ ممکن نہ تھا۔ ضرور ایک نہ ایک وقت آتا۔ کہ ضربۂ حقیقت اس شگوفہ خیال پر پڑ کر اُسے بکھیر دیتا۔ آخر وُہ وقت آیا۔ اس کے مقابلہ کے لئے ہم کیا کر سکتے تھے؟ بیاہ؟ اس کا نتیجہ بھی یہی نہ تھا؟ کیونکہ بیاہ کے بعد یہ خواب بالکل ملیامیٹ نہ ہو جاتا؟ مگر نہیں ملیامیٹ نہیں ہُوا۔ ہمیں اس زندگی کے شعر کو یاد رکھنا مقصود تھا، سو وہ شعر اب بھی شعر بکر د تازہ ہے؛ اس کی یاد زندہ رہے گی اور زندہ ہے۔ اب ہم ایک دوسرے کا خیال کرکے مگر زیادہ لاہوتی، زیادہ روحانی مناسبت کے ساتھ (یہاں تک کہ اب اس کے متعلق

باتیں بھی نہیں ہوتیں) زندگی بسر کر رہے ہیں۔ گویا دُور سے، یادِ ایام کے ساتھ ایک خاموش عاشقی معشوقی لیکن ....." لیکن کے بعد فقرے کو پورا نہیں کرتا، پھر اس تقریر کو جسے میں کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھا۔ ایک لمبے اور ٹھنڈے سانس سے، جس میں بڑی کوشش سے وہ ایک قہقہہ بھی شامل کر سکا، ختم کر کے کہنے لگا" کیا معلوم تم میری اِن بے تکی باتوں پر دل میں کس قدر ہنستے ہو گے، اور میری حقارت کرتے ہو گے، اور اگر سچ پوچھو تو ساری اصل و حقیقت، سارا لُطف شعر یہاں ہے"۔ یہ کہہ کے اپنے چہرے پر شوخی اور شرارت کا رنگ لا کے، مثلاً سامنے چوپاٹی پر سمندر کے کنارے بنچ پر کوئی حسین پارسن بیٹھی ہوئی اس کی ریشمی ساڑھی کو سمندر کی ہَوا ہٹا کے، اُس کی گوری گردن، اور ہلکے کپڑے میں چھپے ہوئے سینے کی جھلک دکھاتی کن آکھیوں سے اس کی طرف اشارہ کرتا۔

میں اپنے دل میں کہتا" بد قسمت بیمار، غیر قابلِ شفا بیماری میں بیمار"، لیکن نوں بعد ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ گویا اُسے اپنی بیماری کا علاج مل گیا تھا۔ اب ایک نشوۂ بے قید کے ساتھ اُن لوگوں کی طرح جو زندگی میں مزہ ہی مزا کرنا چاہتے ہیں، اُس نے اپنے تئیں اندھا دُھند عیش میں ڈال دیا۔ ایک جاڑے کا موسم متواتر گرانٹ روڈ کے تھیٹروں ہی میں گزارا مجھ سے کہتا" دن سوسو کے گزارنا بھی کیا مزے کی چیز ہے۔ انسان چونکہ سورج کو نہیں دیکھتا؛ اس لئے اُسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی دوسری دُنیا میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ رات کی زندگی گویا کرۂ ماہتاب میں جا کر زندگی بسر کرنے، سی معلوم ہوتی ہے۔ چاہو تجربہ کر کے دیکھ لو"۔

اسی عرصہ میں اُس نے الفرڈ تھیئٹر کی ایکٹرسوں میں سے ایک سے دوستی پیدا کر لی، اور اس کے ایک واقعہ کو ایک مبہم واقعہ کے طور پر مجھ سے بیان کرنے لگا" گوہر جان کس قدر بھولی لڑکی ہے۔ ہرگز خیال میں نہیں آسکتا کہ کس طرح یہ بھولی بھالی لڑکی

اسٹیج پر آکر شیطانی مسکراہٹ سے، مٹک مٹک کے، چمک چمک کے سینہ کو اُبھار اُبھار کے، تمام تماشہ دیکھنے والی خلقت کی حریص نظروں کے سامنے عشوہ فروشی کرتی ہے۔ ایسی بچپن کی سی باتیں کرتی ہے کہ دل بے اختیار قربان ہونے کو چاہتا ہے۔ کمپنی کے ساتھ ہندوستان کے سارے شہروں میں پھر آئی ہے۔ لیکن یہ خیال کرتی ہے کہ یہ سارے شہر ایک خطِ مستقیم ہیں، گویا ایک تار کے اوپر سلسلہ بسلسلہ بندھے ہوئے ہیں۔ ایک دن مجھ سے پوچھنے لگی بمبئی کے بعد کون سا شہر آتا ہے۔ اوّل میں نے اس سوال کو سمجھا نہیں؛ لیکن خود ہی ایک کے بعد ایک دیا سلائی رکھ کے مجھے سمجھانا اور گنانا شروع کیا۔ بمبئی کے بعد دلی، دلی سے لکھنؤ پھر بنارس، پھر امرت سر، پھر لاہور، پھر حیدرآباد، پھر کلکتہ آتا ہے، اور اس بات سے جھلّا کے کہ میں اتنی دیر میں سمجھا تا ہوں مجھی سے پوچھنے لگی، اس کے بعد؟ اس وقت میں بھی دیا سلائیاں رکھ کے گنانے لگا، مدراس، مدراس کے بعد پشاور، پھر بنگلور، پھر رنگون، پھر احمد آباد، پھر ٹمبکٹو۔ یہ آخری نام سن کے، مارے خوشی کے اُچھل پڑی" ٹمبکٹو، ٹمبکٹو خوب نام ہے وہاں ناٹک بھی ہوتا ہے کہ نہیں۔ اگر کہیں میں کہتا کہ ہاں ہوتا ہے۔ تو وہ شاید وہاں تک جاتی؛ مگر کہیں دفع بھی ہو کیونکہ میری طبیعت اس لڑکی سے بھر گئی۔

فرامرز کی طبیعت ہر کسی سے بھر جاتی تھی۔ یہ لڑکی بمبئی سے چلی گئی؛ شاید ٹمبکٹو کا ناٹک دیکھنے گئی ہوگی، کہ میں نے سنا کہ فرامرز نے کمبالا ہل میں اک جرمن گورنس سے راہ رسم پیدا کی ہے۔ اس زمانے میں مجھ سے اک دفعہ ملتے ہی اس گورنس کے متعلق اپنی رائے بیان کرنے لگا" اس قدر کھاتی ہے، اس قدر کھاتی ہے کہ نفرت ہو گئی، اگر تم کہیں اُسے اپنے ہونٹوں اور دانتوں سے ادھ کچے بیف سٹیک کا خون پونچھتے دیکھو۔ تو..... اُف" حضرت کا عشق بہت سے بہت اک مہینہ رہتا تھا۔ اس ایک مہینہ میں نہایت بے پروا اور خوش خوش نظر آتا۔ کہ یکایک پھر اُس پر تھکن اور غم کیسی چھا جاتی،

مگر ہر وقت یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ ایک خیال، جو اُس کے دل میں ایسا بیٹھ گیا ہے۔ کہ ہٹائے نہیں ہٹتا، اُسی کا تعاقب کرتا پھرتا ہے۔ مگر وُہ ہاتھ نہیں لگتا۔

اُس کے ان تمام کھیل تماشوں، ان تمام دل بستگیوں، اور پھر ان تمام کسالتوں میں یہ صاف نظر آتا تھا۔ کہ وُہ اُس پہلے اُس سچے عشق کی جراحت کے لئے ایک غیر قابل حصول دوا تلاش کرتا پھرتا ہے۔ ہر نئی دل بستگی ختم ہونے کے بعد کسی نہ کسی بہانے سے اُس پہلے عشق کی بحث چھیڑ دیتا۔

اک دن اتوار کا دن تھا، وُہ گاڑی پر میرے ہاں آیا۔ اور باہر سے یہ کہلا کے بھیجا کہ "جلد کپڑے پہن کے آئیے، میں گاڑی میں انتظار کر رہا ہوں"۔ مجھے چوپاٹی پر لے جانا چاہتا تھا، یہ بھی اک وہ دن تھا، جب کہ اُس کے نت نئے تعلقوں میں سے ایک تعلق ختم ہوا تھا، آج کل وُہ تھیٹر کی مخلوق، اور وہیں کی سڑکوں میں چکر لگایا کرتا تھا۔ گرانٹ روڈ چھوڑ کے چوپاٹی پر جانے کے ارادے پر میں نے تھوڑا سا مسرت آمیز تعجب ظاہر کیا۔ وہ کہنے لگا "ہاں میں وہاں کی تمام ناپاکوں اور ناپاکیوں سے بیزار ہو گیا۔ اب میں ایک ایسی صورت دیکھنے کے لئے محتاج ہوں۔ کہ کچھ تو مجھے پاک کرے، ایک ایسی صورت جو مجسّم آسمانی شعر ہو"

آج ایک پارسی تہوار تھا؛ سمندر کے کنارے شام کے قریب پارسیوں کا نظر فریب مجمع تھا؛ اُن کی رنگا رنگ کی ساڑھیاں، جنہیں بنگالنیں، مرہٹنیں سب ہی پہنتی ہیں۔ مگر جنہیں حسنِ طبیعت کے ساتھ پہننا صرف یہ ہی جانتی ہیں۔ ہوا میں لہرا رہی تھیں؛ لڑکیاں، بال کھولے، باندھے طرح طرح کی پھول دار ٹوپیاں پہنے سمندر کے کنارے گھونگے اور سیپیاں جمع کرتی تھیں۔ آسمان پر قوس قزح نکلی ہوئی تھی۔ جس کے کنارے سمندر سے آکر ملتے معلوم ہوتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ قوس قزح کی اقلیم میں، قوس قزح کی پریاں پھر رہی ہیں؛ اور قوس قزح کی ملکہ کا یہ حکم ہے۔ کہ جسے رنگ کی لطافت سے لگاؤ

نہ ہو۔ وہ یہاں نہ آئے۔ مسلمان عورتیں یہاں نہ تھیں۔ وہ پھولوں کے درمیان، سمندر کے کنارے آبشاروں کے قریب، سبزے کے اُوپر، موسیقی سے بھری فضا میں کب ہوتی ہیں؟

ہم دونوں نے تھوڑی دیر خاموش دو چکر لگائے۔ وہ کبھی گہری نظریں ڈالتا، کبھی ایک طرف کو سر جھکاتا؛ گویا کسی خیال میں غرق تھا، یکایک کہنے لگا، ہاں یہ چہرہ بے شک ایک لاہوتی شعر ہے؛ بشرطیکہ اس چہرے کا بھولا پن، فرشتہ پن قائم رہے۔ اور اُس دوسری میں دیکھو، پلکیں کس بلا کی، تم نے کبھی خیال کیا ہے۔ بعض اوقات ایک مبہم سما نظر آتا ہے۔ اور اک دم نظر سے غائب ہو جاتا ہے۔ پھر دوسرا چہرہ نظر پڑتا ہے۔ اُس کے نقش جم رہے ہوتے ہیں؛ اُس کی تصویر لوحِ دل پر کھینچی ہوتی ہے۔ کہ یکایک ایک خیالِ موہوم کی طرح وہ بھی نظر سے دور ہو جاتی ہے۔ غرضیکہ یہ چہرے جو پورے نہیں دیکھے جاتے۔ پورے نہیں دیکھے جاتے سے میرا مطلب، دل بھر کے نہیں دیکھے جاتے، ان باصرہ فریب مناظر میں دماغ کے اندر ایک خواب کی سی کیفیت لا کر گڑبڑ پیدا کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ چہرے مل ملا کے ایک کا تبسم، دوسری کی نظر تیسری کی ادا، چوتھی کے بال ایک پُرلطف مجموعہ دماغ میں پیدا کر دیتے ہیں؛ پھر اس طرح سے بنا ہوا مجموعہ ...." یہاں تک کہہ کے یکایک ٹھٹکا، اور ٹھٹک کے ایک سامنے سے گزرنے والی فٹن پر نظر ڈالی۔ ہاں بے چارہ تمام اس طرح سے بنے ہوئے مجموعوں کے ذریعہ سے اُسے ہی، اُس پہلے عشق کی ہی جستجو کرتا تھا۔ جانے میرے دل میں یہ خیال کیسے آیا، شاید اس اُمید پہ کہ اُس بیماری کی جسے اس ملاقات میں اُس نے بصراحت ظاہر کیا تھا، یہ دوا ہو گی۔ میں نے کہا:۔ تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ اُس نے مجھ پر ایک ایسی نظر ڈالی۔ گویا اُس سے کوئی بڑی حیرت انگیز بات کہی گئی؛ پھر ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہنے لگا:" دیکھو یہ فکر فوراً قابلِ عمل فکر تو نہیں!" میں نے اس ہنسی کے جواب کا کچھ جواب نہیں دیا تھا۔ وہ تھوڑی دیر

چپ رہا۔ اور سامنے سے گزرنے والی گاڑیوں پر نظر ڈالتا رہا، پھر یکایک میری طرف منہ پھیر کے کہنے لگا "لیکن بھائی جان، میں کس کے ساتھ شادی کر دوں"؟

میں اس عرصہ میں اس بات کو بھول بھی گیا تھا، نہ معلوم دفعتاً اُس کا خیال اس بات کی طرف کس طرح گیا، میں فوراً جواب دے نہ سکا۔ لیکن اُس نے جواب کی حاجت ہی نہ چھوڑی، کہنے لگا "اور کس لئے شادی کروں، بیاہ شادی سے انسان ایک نہایت اچھی عورت، اور شاید نہایت خوبصورت بچے حاصل کر سکتا ہے مگر اس کے سوا؟

"اس کے سوا اور کیا چاہئے ہو۔ اس میں بھی ایک شعریت ہے۔ بلکہ اصلی شعرِ حیات اسی میں ہے۔ مگر اس کو محسوس کرنے کے لئے، اس کا لطف اُٹھانے کے لئے قلب کو بہت سی چیزوں سے خالی کرنا ضروری ہوگا"۔

وُہ رُکا، پھر اُس نے جواب دیا "میں اپنے دل کو خالی نہیں بلکہ مختلف چیزوں سے اس قدر بھرنا ٹھونسنا چاہتا ہوں۔ کہ آخر تاب نہ لاکر پھٹ جائے"۔ پھر رُکا، تھوڑی دیر کچھ سوچتا رہا، اور پھر گزرنے والی گاڑیوں پر نظر ڈالتا رہا۔ اس کے بعد ایک شدید حرکت کے ساتھ میری طرف مڑکے، اُس نے اوّل دفعہ مجھ سے اعتراف کیا "کبھی یہ خیال کرتا ہوں کہ اس وقت میں نے بڑی غلطی کی۔ شائید اگر اس کے ساتھ شادی کر لیتا، تو ممکن ہے کہ اس اضطرابِ دل کو سکون ملتا۔ آہ تم کیا جانو کہ مجھے کبھی کبھی کیسا سخت اضطراب ہوتا ہے"۔

آخر اس بدبخت شخص نے، جس کے منہ سے یہ اظہارِ حقیقت نکل آیا تھا، پہلے آہستہ سے اپنے ہاتھوں میں میرے ہاتھ کو لے لیا۔ اور پھر گویا اپنے اضطراب کے درجۂ شدت کو جتانے کے لئے اپنی پوری قوت سے میرے ہاتھ کو دبا ڈالا۔ اُس کے ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈے تھے۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا۔ کہ کیوں ازدواج کا ذکر اُس سے کیا۔ کیونکہ یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس ذکر سے میں نے اُس کے کیسے حساس نقطۂ قلب کو ٹھیس لگائی۔ گویا میں نے اپنی انگلی تلاش کر کے اُس کے زخم پر رکھ دی۔ اور ایسی ٹھیس لگائی

جس سے اُس کو جتنی تکلیف پہنچ سکتی تھی پہنچ گئی۔

غالباً یہ میرا آخری سیر تھی، اس کے بعد میں بمبئی سے چلا آیا۔ کہ قسمت نے اِس مرتبہ پھر اس نوجوان کو، میری راہ میں، وکٹوریا ٹرمی نس پر، مگر کسی قدر تبدیل شدہ حالات میں لا ڈالا۔

آخر جب اُس نے سگرٹ کی راکھ گرا کے سر اُٹھایا۔ تو میں نے "آپ" کو علیحدہ رکھ کے پوچھا:۔ اُس واقعہ کے بعد بمبئی آنے کا ذکر تم نے کیا تھا، وُہ کون سا واقعہ تھا؟

اس نے ایک دفعہ گویا گہرائیوں میں سے، عالمِ اسرار کے اعماق میں سے نکلنے والی نظر سے مجھے ٹکٹکی باندھ کے دیکھا۔ اس نظر میں ایک ایسی غیر معمولی چیز تھی۔ کہ اُس نوجوان سے جسے میں برسوں سے جانتا، اور جس سے محبّت کرتا تھا، میرے دل میں ایک لرزۂ بارد پیدا ہو گیا۔ اس سیکنڈ میں اس شخص کے اور میرے درمیان۔ اس کا سبب، میں نہیں جانتا۔ ایک ہوائے بارد و منجمد مجھے آ کے لگی۔ اور مجھے ٹھٹھرانے لگی۔

وُہ اپنی عجب نظر سے ٹکٹکی باندھے رہا۔ اور میرے سوال کا جواب تو نہ دیا، بلکہ خود مجھ سے پوچھنے لگا:" آج شام کو کہیں نہیں کچھ کام تو نہیں، کسی سے وعدہ تو نہیں؟"

میرے جواب نفی پر، اُس نے تھوڑا سا تردّد کیا، آخر کہنے لگا۔

تو آج شام میں تمہیں نہیں چھوڑنے کا، آج رات کھانا میرے ہی ساتھ کھانا" اور جب اُس نے یہ دیکھا کہ مجھے جواب موافق کے دینے میں تھوڑا سا تردّد ہے، تو نہایت درجہ صمیمیت اور عاجزی کی آواز سے کہنے لگا:" میں التجا کرتا ہوں"!

آج کی شام، جو وقت فرامرز کے ہاں گزرا وُہ میری زندگی کے مستثنےٰ گھنٹوں میں سے ہے۔ وُہ مجھے اپنے ساتھ بندورہ لے گیا، اور شام تک درختوں میں چپ چاپ کبھی کسی منظر کی طرف اشارہ کر کے کبھی کسی معمولی سے مضمون کے متعلق ایک آدھ بے ربط لفظ کہہ کے، مجھے اِدھر اُدھر ٹہلاتا رہا۔ میں بھی حقیقت یہ ہے۔ کہ اس سکوت سے خوش تھا

آخر گھر لوٹ کے کہنے لگا۔" بہت بھوک لگی ہے، کھانا، کھانا چاہئے"! میں ایک غیر معلوم سبب سے گھبرایا ہوًا تھا۔ ہم نے کھانا کھایا جیسے کھایا گیا۔ کھانے کے بعد اپنے خاص کمرے میں لے گیا۔ اور کہنے لگا" یہ میرا کمرہ ہے"!

یہاں تاریکی تھی۔ داخل ہوتے وقت، کثیف تاریکی کی وجہ سے مجھے کوئی چیز نظر نہ آئی۔ اس وقت۔ شائد اس تاریکی کے سبب سے مجھ پر اک ڈر طاری تھا۔ کہ اس پر میں غالب نہیں ہو سکتا تھا۔ آخر مجھے دیا سلائی کی رگڑ کی آواز آئی۔ اُس روشنی میں جو یکایک میری آنکھوں میں آئی۔ میں نے دیکھا کہ اُس کی لرزہ دار شکل مبہم، ہاتھ بڑھا کے دیا سلائی سے موم بتی جلا رہی ہے۔ بتی سے اک سُرخ غبار روشنی نکلنا شروع ہوًا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بتی اس کمرے کے کثیف ظلمت کو زائل کرنے کے لئے اپنے میں کافی قوت نہیں پاتی، مگر اپنی کوشش کے پورے حملے کر رہی ہے۔ اور اس وقت کچھ تاریک کچھ روشن حالت میں میں نے دُنیا کا سب سے عجیب ایک کمرہ دیکھا۔ ساری دیواروں پر سُرخ کاغذ لپٹا ہوًا تھا۔ اور ایک غیر منتظم ہوس کے ساتھ، دیواروں پر طرح طرح کے چوکھٹوں میں طرح طرح کی تصویریں چینی کی رکابیاں جڑی ہوئی تھیں، بریکٹوں پر کہیں تاج محل کی سنگ مرمر سے بنائی ہوئی نقل، کہیں سنگ مرمر کے یا پینل کے بُت، کہیں پنکھے۔ غرضیکہ سینکڑوں رنگوں کی چھوٹی چھوٹی چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ مثلاً ایک چینی کی رکابی تھی جس پر ایک تصویر منقش تھی۔ ایک گھنے درختوں کا جنگل ہے اس میں ایک بارہ سنگھا ہے جس کے سینگ ایک درخت کی شاخ میں اُلجھ گئے ہیں۔ اور وہ اُنہیں چھڑانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس رکابی کے پاس ہی اک بریکٹ پر، ایک لکڑی کے بنے ہوئے چھوٹے سے مندر میں (جس کے اُوپر سیپیاں چپکی ہوئی تھیں) وشنو مہاراج کا ڈراؤنا بت رکھا ہوًا تھا۔ ایک اور تصویر تھی جس میں ایک وحشی صورت لڑکی بیٹھی تھی جس کا آدھا دھڑ سیاہ زمین میں غائب تھا اور

بالوں سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ تصویر کے نیچے دو جاپانی پنکھوں کو کھول کے اور دیوار میں گاڑ کے ایک عظیم تیتری کی شکل بنائی گئی تھی۔ غرضیکہ ان دیواروں میں کوئی کونا کھدرا ایسا نہ تھا کہ اُس میں فرامرز کے فکر عجیب نے ایک ہوش مجنونانہ کے ساتھ اپنا آشیانہ نہ بنایا ہو۔ ان سب کے بعد ایک کونے میں لکھنے پڑھنے کی میز! اس کے پاس ایک چھوٹی سی گول میز، اور ایک گھومنے والی کتابوں کی الماری۔ اُن کے اُوپر مختلف گلاس، کاسے، البم، کاغذ، کتابیں تھیں۔ زمین پر قالین کے اُوپر بھی چھوٹی بڑی کتابیں کھلی اور بند پڑی ہوئی تھیں۔ پاس ہی اک چیتے کی کھال بچھی ہوئی تھی۔ اور اُس پر مختلف چیزیں بے ترتیبی سے بکھری ہوئی تھیں۔ میز پر ایک گلدان میں ایک عجیب سوکھا پودا لگا ہوا تھا۔ جس کے پتے چھتری کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ اس تمام گڑبڑ پر اگر سو دفعہ نظر ڈالی جائے تو ہر دفعہ اک نئی چیز نظر آئے، چھوٹی چھوٹی لاتعداد چیزیں تھیں۔ جن کے وہاں ہونے کا کوئی سبب نہیں معلوم ہوتا تھا، اور پھر ان سب عجیب چیزوں کو ایک لرزش حیات دینے والی موم بتی تھی، جس میں سے مختصر سی سُرخی مائل روشنی نکل رہی تھی۔

میں ایک آرام کرسی میں بیٹھ گیا، وہ میرے مقابل مگر کچھ فاصلہ پر کھڑکی کے پاس ایک چوکی پر بیٹھا، اور بلا کسی تمہید کے یکایک، چار گھنٹے اوّل کی گفتگو پر پلٹ کے خشک آواز سے کہنے لگا" اس واقعہ کی تمہیں خبر نہیں؟ لو میں تمہیں بتاتا ہوں، میرے ساتھ اُس نے بے وفائی کی۔"

میری زبان سے بے اختیار "کس نے" نکلا۔

فرامرز نے فوراً جواب دیا "اُس نے"

اُس میں اُسے دُور سے، اس مختصر روشنی میں جس کے ساتھ، کھڑکی سے داخل ہو کر اب چاند کی روشنی بھی شامل ہو گئی تھی۔ ایک خیال، ایک شکل مبہم کی طرح دیکھ رہا تھا۔ اس روشنی میں وہ زیادہ ضعیف، زیادہ زرد نظر آتا تھا۔ اور اس کی اسرار انگیز آنکھوں

ہیں، جو مجھ پر گویا برف باری کر رہی تھیں۔ اور زیادہ وحشت معلوم ہوتی تھی۔ مجھ پر اپنی باتوں کا اثر معلوم کرنے کے لئے نظر ڈال رہا تھا۔ یکایک اپنی جگہ سے اُٹھا، اور میرے سامنے آیا۔ میں پہلے ہی ہمدردی کے ساتھ سُن رہا تھا، کہ اُس نے بھرّائی ہوئی آواز سے کہنا شروع کیا:۔

میں سچ کہتا ہوں۔ میں بس اس کی توقع نہ رکھتا تھا۔ اس شام کو جب کہ آخری دفعہ ہم تم دونوں چوپاٹی پر تھے، وُہ بھی وہاں تھی اَور سچ کہوں؟ میں اُسے ہی دیکھنے وہاں گیا تھا۔ کیونکہ ایک دن خواہ مخواہ میرے دل میں اک شبہہ پیدا ہو گیا تھا۔ اگر کہیں بے وفائی کرتی ہو تو؟ میں نے ہر چیز کا تحمّل کیا تھا، لیکن یہ خیال کہ وُہ اُس پاکیزہ عشق کی یاد میں صادق نہیں ہے۔ اَور میرے علاوہ کسی اَور کو دل میں رکھتی ہے، مجھے مارے ڈالتا تھا۔ اُس نے بیاہ کیا، یہ اُس کا حق ہے نا؟ مگر اُس عشق کی یاد سے بے وفائی کرنے کا وُہ حق نہیں رکھتی تھی۔ اُس دن میں نے اُسے ہنستے دیکھا۔ ایک نوجوان کے ساتھ ہنس رہی تھی، یعنی کہ میرے ساتھ بے وفائی کر رہی تھی۔ اَور مجھے یقین ہے کہ صرف مجھے مار ڈالنے کے لئے ایسا کر رہی تھی۔ تمہیں معلوم نہیں کہ اُس دن میں نے کیسی طاقت فرسا کوشش سے اپنی طبیعت کو روکا۔ کہ دوڑ کے اُس کی گاڑی پر چڑھ کے اُس کا مُنہ نوچ لوں"!

یہ کہتے وقت کانپ رہا ہے، گویا اس بے وفائی کے وہمی خیال ... دگرگوں ہونا چاہتا ہے۔

میں نے کہا "لیکن صرف اُسے ہنستا دیکھنا کافی سند نہیں، خاص ... اور اُس کا بات چیت کا بھی تعلّق نہیں رہا تھا۔ علاوہ ازیں تم ...

بات پوری نہ ہونے دی، میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اَور نرم آواز ... خیال بنانے کے لئے کہنے لگا "نہیں نہیں، وُہ میرے ساتھ بے وفائی ...

ہے تم بھی اُسے یقین کرتے ہو، تم بھی اُس کی دہشت ناپیز، مجھے مار ڈالنے والی قوت سے واقف ہو۔

واقف ہی سمجھنا چاہیئے تھا۔ کیا بحث کرنا، لازم یہی تھا۔ کہ اعتراض نہ کروں۔ کہنے لگا: "ابھی تم میری ہنسی اُڑانا چاہتے تھے، یہ کہنا چاہتے تھے، کہ میں نے بھی تو اُس کے ساتھ بے وفائی کی؟ ہے نا؟ مگر یقین مانو کہ وُہ تمام عورتیں، جن سے میں ملتا تھا، وُہ دل بہلا دیتے تھے؛ وُہ اُس عذاب اور اضطراب کے گھٹانے کے لئے کھلونے تھے۔ جو اُسے نہ بھولنے کی وجہ سے میرے دل کو پریشان کئے ہوئے تھا میری زندگی میں اگر کھلونا کوئی چیز نہ تھی، تو صرف وُہ تھی میں اُسے ہمیشہ صاف و پاک ہمیشہ پُرشعر و خیال دیکھتا، اور ایک پاکیزہ اُفق سے اُٹھے ہوئے سحاب پارہ میں دفن کرنا چاہتا تھا۔

پھر ایک ٹھنڈا سانس بھر کے کہنے لگا: آہ یہ عورتیں! مجھے ان کا کیسا تلخ تجربہ ہوا ہے۔ جانتے ہو یہ کیا ہیں؟ یہ پھول ہیں جن کی دُور ہی سے سیر کرنی چاہیئے، کیونکہ جو چیزیں ان میں ڈھونڈی جاتی ہیں، وُہ اُن میں نہیں ہوتیں، عورت ایک رنگ ہے کہ اُسے دیکھنے ہو تو تمہیں مست و مدہوش کرتا ہے۔ مگر یہ رنگ اس لئے بنا ہے۔ کہ صرف دُور سے دیکھا جائے اِسے چھونا مت، کیونکہ چھوتے ہی اُڑ جائے گا۔ اور ایک پژمردہ داغ کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا۔ یا عورت ایک روشنی ہے۔ نظر فریب و دل یاز، ایک خندۂ ضیا ہے۔ اس کی طرف ہاتھ نہ بڑھانا، کیونکہ روشنی غائب ہو جائے گی، اور خندۂ ضیا کے بدلے، تاریکی رہ جائے گی۔ اُف! عورت سے توقع ہوتی ہے قصیدہ کی، دیتے ہیں زخم، غضب یہ کہ یہ زخم بالکل باریک خط سے ہوتے ہیں؛ فوراً بھر جاتے معلوم ہوتے ہیں؛ مگر جن ناخنوں سے یہ زخم بنتے ہیں؛ اس میں ایک قطرہ زہر ہوتا ہے۔ وُہ اس زخم میں نفوذ کر جاتا ہے؛ اور آہستہ آہستہ اس آگ کی طرح جو کرۂ زمین کے پیٹ میں ہے۔ اور وہاں دھاتوں کو پگھلا رہی ہے؛ یہ بھی تمہارے

خون میں گھس جاتا ہے؛ اور جہاں گھستا ہے، اُسے مسموم ہی کر دیتا ہے، ہر قطرۂ خون میں ایک قطرہ مہلک اور بڑھاتا ہے؛ یہاں تک کہ تمہاری زندگی زہریلی ہو جاتی ہے۔ تم ہنستے ہوتے ہو، تمہیں کچھ خبر نہیں ہوتی، وہ اپنے فرضِ تخریبیہ کو پورا کرتا ہوتا ہے تم اس وہم میں ہو۔ کہ تم زندگی بسر کر رہے ہو، وہ تمہیں مار رہا ہوتا ہے۔ ثانیہ بثانیہ تمہاری زندگی میں سے ایک ایک ذرّہ لے کر تمہیں برباد کرتا ہے۔ اُکھاڑتا ہے جلاتا ہے۔"

اب اُس کی آنکھوں کی ایک کیفیّت۔ کس لفظ سے تعبیر دوں؟ ایک جان کنی کی سی کیفیّت پیدا ہو رہی تھی؛ اور گویا اُس سے ایک بحرِ حزیں کی سیاہ موجیں جوش مار رہی تھیں۔ میں اس کی باتوں میں ذرا سا ہرج بھی نہ کرنا چاہتا تھا، صاف تو یوں ہے۔ کہ اس غیر معمولی زبان میں اس غیر معمولی آدمی کے ساتھ بحث کرنے کی ہمّت نہ رکھتا تھا، اور ان آنکھوں کے مقابلہ میں میرے دل میں کبھی ڈر، کبھی رحم پیدا ہوتا، اور میں اپنے سیگرٹ کے دھوئیں کی آڑ میں اُن آنکھوں سے چھپنے کی کوشش کر رہا تھا، صرف اُس کی باتیں سُننا چاہتا تھا۔ وہ یکایک کھڑا ہو گیا۔ اب اُس کی طبیعت میں ایک ہیجان تھا، کہنے لگا:۔

تم سے ایک بات کہوں؟ صرف تم سے کہوں گا؟ کیونکہ تم سے کسی قسم کا اندیشہ یا خوف نہیں ہے۔ اس وقت تک میرے نزدیک دُنیا میں اگر ذی حیات کوئی چیز تھی تو صرف وہ تھی۔ اُس کے بعد وہ بھی مر گئی؛ میرے نزدیک بالکل مر گئی۔ اب.... دیکھو میں تمہیں بتلاؤں، یہ کہہ کے اُس نے میرا بازو پکڑ لیا۔ پھر ذرا جھک کے سامنے کمرے کے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا، اور کہنے لگا دیکھتے ہو؟"

مجھے معلوم نہ تھا۔ کہ وہ کس چیز کو دکھانا چاہتا تھا، میں نے پوچھا: "کسے"؟ وہ ہاں ہوں ہی سے اشارہ کرتا رہا؛ اور اُس چیز کا نام لئے بغیر کہتا رہا: "اُسے! آخر

مجھے معلوم ہُوا۔ جو چیز مجھے دکھائی جا رہی تھی؛ وُہ سنگ مرمر کا ایک بُت تھا۔ ایک عُریاں لڑکی جو سنگ مرمر کے ایک کُرہ پر ایک پاؤں سے کھڑی تھی۔ اور گویا اپنے تئیں سنبھالنے کے لئے اپنے دونوں ہاتھوں کو اُٹھائے ہوئے تھی۔ بُت تراشی کا ایک لطیف نمونہ!

فرامرز میرا شانہ پکڑے رہا اَور گویا اس لئے کہ کوئی اَور نہ سُن لے، آہستہ آہستہ کہنے کے لئے مجھ سے اور آ ملا۔ اَور مجھے سمجھانے لگا۔ کندھا پکڑے جانے کی تضییق، میرے مُنہ پر اُس کے سانس کا لگنا مجھے گھبرا رہے تھے، وُہ سمجھا رہا تھا:۔

"ایک رات تھی، آج کی سی اُجالی رات نہیں، برسات کی گھُپ اندھیری رات تھی۔ کتنا زمانہ ہُوا۔ مجھے یاد نہیں۔ اندھیری رات تھی۔ میں اسی کمرے میں تھا۔ اَور بتّی نہیں جل رہی تھی۔ میں اِس اندھیری رات میں بجلی کی سَیر کر رہا تھا؛ مگر اُس کا خیال کرکے، تم نے تاڑوں پر کبھی بجلی کو بھی کوندتے دیکھا ہے۔ دیکھو اس کھڑکی سے وُہ دکھائی دیتے ہیں۔ اُس رات یہ تاڑ اَور سیاہ معلوم ہوتے تھے۔ ایک سیاہی طاری تھی۔ کہ بجلی اُس سے جنگ کر رہی تھی، اَور غائب ہو ہو جاتی تھی؛ ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ اہرمن اپنے لمبے ہاتھوں کے لمبے ناخن بڑھا بڑھا کے، گاڑ گاڑ کے سینۂ ظلمت کو پھاڑ رہا ہے۔ اَور اُس سے ایک لمحہ کے لئے ایک شلالۂ خون نکلتا ہے۔ اَور پھر سیاہی میں غائب ہو جاتا ہے۔ میں اُس کی سَیر کر رہا تھا۔ مگر خیال میں وہی تھی۔ یکایک مجھے کمرے میں ایک حرکت سُنائی دی، اور کوئی سانس لیتا ہُوا معلوم ہُوا۔ میں مارے ڈر کے کانپا اَور پھر جم کے رہ گیا۔"

اب میرے کندھوں کو اور دبا رہا ہے۔ اَور گویا کہیں وُہ نہ سُن لے، مجھ سے اَور آ ملا، اَور ہاتھ سے اُسے دکھا کے اَور آہستہ آہستہ کہنے لگا:

"یہ تھی، ہاں یہی۔ اس کرہ کو اپنے پاؤں تلے لڑھکاتی میرے پاس آئی، اَور آتے

وقت، اُس تاریکی میں لرزتی اور قد میں بڑھتی جاتی تھی۔ اس کے بعد بجلی جو چمکی۔ تو میں نے اُسے صاف اور واضح طور پر دیکھا۔ میرے پاس آئی! میرے کندھوں کو اَور دبا رہا تھا، مجھ سے اَور ملتا جاتا تھا؛ میرے پاس آئی۔ اَور اپنی عریاں باہیں میرے گلے میں ڈال دیں۔ تاڑوں کی تاریکی پر اہرمن اپنے چمک دار جنگلوں سے خون گرا رہا تھا، کہ ہم ایک لمحہ میں ایک بوسۂ محبّت کے ساتھ ایک عمر بسر کر گئے۔ اب اس رات کے بعد، ہر رات تاریکی میں، لرزتی لرزتی، اپنے کُرّہ کو لڑ ھکاتی لڑھکاتی اَور آگے آنے وقت قد میں بڑھتی بڑھتی آتی ہے۔ اور اپنی عریاں باہیں میرے گلے میں ڈال دیتی ہے۔ اَور ایک لمحہ میں، اُس لمحہ میں جو ایک عمر کے طول کی برابر ہوتا ہے۔ مجھے وُہ لُطفِ زندگی دیتی ہے، جو کسی عورت میں نہیں، خاص کر اُس میں نہیں جس نے میرے ساتھ بے وفائی کی۔ اَور یہ میرے ساتھ بے وفائی نہیں کرنے کی!"

اِس تقریر کو ختم کر کے، فرامرز نے میرے کندھے چھوڑ دیئے۔ دو تین قدم پیچھے ہٹ کے کُرسی پر بیٹھ گیا، کہنی گھٹنوں پر رکھ کے، سر اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ کمرے کی نیم تاریکی میں مجھے ایسا نظر آیا۔ کہ رو رہا تھا۔ اب مجھے معلوم ہوُا۔ ہائے بے چارے کا دماغ!

میں بمبئی سے چلا آیا، مگر فرامرز سے پھر ملنے کو دل چاہتا ہے۔ خبر نہیں اُس نے اپنے اس پرستیدہ سنگین سے بھی کہیں بے وفائی تو نہ دیکھی۔

(سجّاد حیدر)

پیرس کا ایک کروڑپتی

موسیو شوشارد پیرس کی تجارتی دنیا میں ایک نہایت نامور شخص تھا - کچھ عرصہ ہوا فوت ہو گیا ہے - کپڑے کی دکانوں میں شاید سب سے بڑی دکان پیرس میں اُسی کی تھی - یہ شخص بالکل اپنی قوتِ بازو سے دولت مند بنا تھا - یہ تو ظاہر ہے کہ تجارت میں اس کا دماغ لڑتا تھا - مگر اس کی طبیعت کی بڑی خصوصیت یہ تھی - کہ وُہ نئے نئے خیال اور نئی نئی ترکیبیں کاروبار کی ترقی کی ایجاد کرتا رہتا تھا - پیرس کی عورتوں میں اِس کا نام زیادہ تر اِس لئے یادگار رہیگا - کہ وُہ کپڑوں کے ٹکڑوں کی سیل[1] کا بانی تھا - سُنا ہے کہ جب اُس نے پہلے پہل اپنے کارندوں کو حکم دیا - کہ قیمتی ریشموں کے ہزاروں نئے تھانوں کو پھاڑ کر مختلف ماپ کے چھوٹے بڑے پارچے کر دیئے جاویں - اور وُہ یوں بیچے جائیں - کہ گویا بچے کھچے ٹکڑے ہیں تو نہ صرف اَور سوداگر اس خبر کو سُن کر حیران ہوئے - بلکہ خود اُس کے ملازم متحیر تھے - کہ یہ کیسا حکم ہے ؟ مگر جس قدر کامیابی اس کی دکان کو اس تدبیر سے ہوئی - اِس سے ثابت ہو گیا - کہ اس کا خیال بہت دُور پہنچا تھا - اُس کے ہم سروں نے بھی تھوڑی دیر بعد اس کی تقلید شروع کی - اور اب فرانس میں یہ رواج بہت عام ہے - اور دوسرے ملکوں میں بھی پسند کیا جانے لگا ہے -

---

[1] لفظی معنے فروخت کے ہیں - اصطلاح میں فروخت کے اُس طریق کو کہتے ہیں - جس میں سال تمام کے موقع پر دکان کی سب چیزیں رعایتی قیمت پر بیچی جاتی ہیں ۱۲ -

دُکان کے اشتہار کے لئے ایک اَور خوبصورت تجویز اُسے سوجھی تھی۔ اَور وُہ یہ کہ رنگا رنگ کے چھوٹے چھوٹے بیلون ربڑ کے اُس نے بنوائے۔ جن پر دُکان کا نام لکھا ہوُا تھا۔ یہ بیلون اُن بچّوں کو جن کے والدین اس دُکان سے سودا لینے آتے تھے مُفت دیئے جاتے تھے۔ اَور اس طرح ہر بچّہ اس دُکان کا اشتہار ان بیلونوں کو ہَوا میں اُڑا اُڑا کر دیتا پھرتا تھا۔

آج کل کپڑے کی بڑی بڑی دُکانوں میں گاہکوں کے چائے پانی کا انتظام اَور اِس کے لئے ایک خاص کمرہ ایک معمولی بات ہے۔ جہاں دُکان کی طرف سے اُن کی تواضع کی جاتی ہے۔ مگر شائد پیرس میں سب سے پہلے موسیو شوشار کو ہی یہ سُوجھی تھی۔ کہ اپنے ہاں کے خریداروں کو مُفت چائے قہوہ وغیرہ پلائے اَور اُس زمانہ میں اِس خاص صیغے کی طرف خلقت کا اس زور سے رجوع ہوُا تھا۔ کہ وُہ خود اس بات کو تسلیم کرتا تھا۔ کہ اس تجویز کی کامیابی تکلیف دہ ثابت ہونے لگی ہے۔

موسیو شوشارو نے بے انتہا روپیہ پیدا کیا۔ اَور مرتے وقت نہایت فیّاضی سے اُسے مفیدِ عام اور خیراتی کاموں میں لگا گیا۔ وُہ لاوارث تھا۔ مگر اپنے دوستوں اور ملازموں سے جاتے جاتے ایسا سلوک کر گیا۔ جو عزیزوں اَور رشتہ داروں سے بھی مشکل ہو سکتا ہے۔ ایک لاکھ بیس ہزار پاؤنڈ یعنی اٹھارہ لاکھ روپیہ اپنے کارخانے کے ملازموں میں تقسیم ہونے کے لئے اُس نے چھوڑا۔ اپنے دوست اَور مشہور مُلکی مدبّر جارج لیگ کو چار لاکھ اسّی ہزار پونڈ۔ اُس کی بیوی کو چالیس ہزار پونڈ۔ اور اس کے دونوں بیٹوں کو چالیس چالیس ہزار پونڈ دے گیا۔ فگارو نام ایک اخبار پیرس سے روزانہ نکلتا ہے۔ وُہ اُسے پسند تھا اس کے ایڈیٹر کے حق میں اَسّی ہزار پونڈ کی وصیّت کی۔ پیرس کے غرباء کے لئے آٹھ ہزار پونڈ اَور ایسی ہی متعدّد اَور رقمیں وہاں کے خیراتی کارخانوں کے لئے

چھوڑ مرا۔ ایک نیک دل خاتون میڈم بورسین جس کے حق میں یہ وصیّت تھی۔ کہ جو کچھ مندرجہ بالا تقسیم کے بعد بچے وُہ اُسے مل جائے۔ فیّاضی میں وصیّت کرنے والے کے برابر ثابت ہوئی۔ اور متوفّی کے جنازے کے روز اس نے اعلان کیا۔ کہ وُہ غُربائے پیرس کے واسطے چالیس ہزار پونڈ وقف کرے گی۔ جنازہ اس دھوم سے اُٹھا۔ کہ سارے پیرس میں یہ چرچا تھا۔ کہ اس شان کا جنازہ کم دیکھنے میں آیا ہے۔ یہ عجیب بات ہے۔ کہ متوفّی نے اپنی تجہیز وتکفین کے متعلّق سارا انتظام خود کر رکھا تھا۔ اور کسی کو اس کے مرنے کے بعد کچھ تکلیف اس اہتمام کے لئے اُٹھانی نہیں پڑی۔ اس نے اپنی محنت نیکی اور لیاقت سے اپنی زندگی میں بڑے سے بڑے اعزاز حاصل کئے۔ پریذیڈنٹ بولے اس سے دوستانہ مراسم رکھتا تھا۔ اور اس کی بڑی عزّت کرتا تھا۔ جیا تو نیک جیا۔ اور مر کے بھی نام کر گیا۔

مسز عبدالقادر

حصّۂ نظم

(ڈاکٹر سر اقبال)

کوہستانِ ہمالہ

اے ہمالہ اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ پہ کچھ ظاہر نہیں دیرینہ روزی کے نشاں تو جواں ہے دورۂ شام و سحر کے درمیاں
تیری ہستی پر نہیں بادِ تغیّر کا اثر
خندہ زن ہے تیری شوکت گردشِ ایّام پر

امتحانِ دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو پاسباں اپنا ہے تو دیوارِ ہندوستاں ہے تو
سوئے خلوتگاہِ دل دامن کشِ انساں ہے تو مطلعِ اوّل فلک جس کا ہو وہ دیواں ہے تو
برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالمتاب پر

سلسلہ تیرا ہے یا بحرِ بلندی موج زن رقص کرتی ہے مزے سے جس پہ سورج کی کرن
تیری ہر چوٹی کا دامانِ فلک میں ہے وطن چشمۂ دامن میں رہتی ہے مگر پرتو فگن
چشمۂ دامن ہے یا آئینہ سیّال ہے
دامنِ موجِ ہوا جس کے لئے رومال ہے

ابر کے ہاتھوں میں رہوارِ ہوا کے واسطے تازیانہ دے دیا برقِ سرِ کہسار نے

اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو بھی جسے دستِ قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لئے

ہائے کیا جوشِ مسرت میں اُڑا جاتا ہے ابر
فیلِ بے زنجیر کی صورت چلا جاتا ہے ابر

جنبشِ موجِ نسیمِ صبح گہوارہ بنی جھومتی ہے کیا مزے لے لے کے ہر گُل کی کلی

یُوں زبانِ برگ سے کہتی ہے اِس کی خامُشی دستِ گلچیں کی جھٹک میں نے نہیں دیکھی کبھی

کہہ رہی ہے میری خاموشی ہی افسانہ مرا
کُنجِ قدرت خانۂ قدرت ہے کاشانہ مرا

نہر چلتی ہے سرودِ خامُشی گاتی ہُوئی آئینہ سا شاہدِ قدرت کو دِکھلاتی ہُوئی

کوثر و تسنیم کی مانند لہراتی ہُوئی ناز کرتی ہے فرازِ راہ سے جاتی ہُوئی

چھیڑتا جا اِس عراقِ دل نشیں کے ساز کو
اے مسافر دِل سمجھتا ہے تری آواز کو

لیلیٔ شب کھولتی ہے آ کے جب زلفِ رسا دامنِ دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا

وُہ خموشی شام کی جس پر تکلّم ہو فدا وُہ درختوں پر تفکّر کا سماں چھایا ہُوا

کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پر
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رُخسار پر

وُہ اُچھالی پنجۂ قدرت نے گیند اک نُور کی جھانکتا ہے وُہ درختوں کے پرے خورشید بھی

دل لگی کرتی ہے ہر پتّے سے جس کی روشنی میرے کانوں میں صدا آتی مگر کچھ دُور کی

دِل کی تاریکی میں وُہ خورشید جاں افروز ہے
شمعِ ہستی جس کی کرنوں سے ضیا اندوز ہے

وُہ اصُولِ[1] حق نمائے نقشِ ہستی کی صدا رُوح کو ملتی ہے جس سے لذّتِ آبِ بقا

۱؎ بدھ مذہب کی طرف اشارہ ہے ۱۲ -

جس سے پردہ رُوئے قانونِ محبّت کا اُٹھا　　جس نے انساں کو دیا رازِ حقیقت کا پتا
تیرے دامن کی ہَوا میں سے اُگا تھا یہ شجر
بیج جس کی ہند میں ہے چین و جاپاں میں ثمر
تُو تو ہے مُدّت سے اپنی سرزمیں کا آشنا　　کچھ بتا اُن رازدارانِ حقیقت کا پتا
تیری خاموشی میں ہے عہدِ سلف کا ماجرا　　تیرے ہر ذرّے میں ہے کوہ الپس[۱] کی فضا
ایک جلوہ تھا کلیمِ طورِ سینا کے لئے
تو تجلّی ہے سراسر چشمِ بینا کے لئے
اے ہمالہ داستاں اُس وقت کی کوئی سُنا　　مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اُس سیدھی سادھی زندگی کا ماجرا　　داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلّف کا نہ تھا
ہاں دکھا دے اے تصوّر پھر وُہ صبح و شام تُو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایّام تُو
آنکھ اے دل کھول اور نظّارۂ قدرت کو دیکھ　　اِس فضا کو اِس گُل و گلزار کی رنگت کو دیکھ
اپنی بستی دیکھ اور اِس کوہ کی رفعت کو دیکھ　　اِس خموشی میں سرِ درِ گوشۂ عزلت کو دیکھ
شاہدِ مطلب ملے جس سے وُہ ساماں ہے یہی
دردِ دل جاتا رہے جس سے وُہ درماں ہے یہی

(اقبال)

حُسن اور زوال

---

[۱] کوہ الپس۔ یُونان میں ایک پہاڑ ہے جس پر قدیم یونانی خیالات کے مطابق دیوتاؤں کے دربار ہوتے تھے۔۱۲

اصل خیال جرمن نثر میں دکھایا گیا ہے۔ میں نے
تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ اردو نظم میں منتقل کر دیا (اقبال)

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا
جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا؟
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا
شبِ درازِ عدم کا فسانہ ہے دنیا
ہوئی ہے رنگِ تغیر سے جب نمود اس کی
وہی حسین ہے حقیقت زوال ہے جس کی
کہیں قریب تھا یہ گفتگو قمر نے سنی
فلک پہ عام ہوئی اخترِ سحر نے سنی
سحر نے تارے سے سن کر سنائی شبنم کو
فلک کی بات سنا دی زمیں کے محرم کو
بھر آئے پھول کے آنسو پیامِ شبنم سے
کلی کا ننھا سا دل خون ہو گیا غم سے

چمن سے روتا ہوا موسمِ بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

([illegible])

ایک پرندے کی فریاد

آتا ہے یاد مجھ کو گذرا ہوا زمانہ
وہ جھاڑیاں چمن کی وہ میرا آشیانہ
وہ ساتھ سب کے اڑنا وہ سیر آسماں کی
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا مل کے گانا
پتوں کی ٹہنیوں پر وہ جھومنا خوشی سے
ٹھنڈی ہوا کے پیچھے وہ تالیاں بجانا
آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی
اپنی خوشی سے جانا اپنی خوشی سے آنا
لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم
شبنم کا صبح آکر پھولوں کا منہ دھلانا
وہ پیاری پیاری صورت وہ کامنی سی مورت
آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانہ

تڑپا رہی ہے مجھ کو رہ رہ کے یاد اُس کی　　تقدیر میں لکھا تھا پنجرے کا آب و دانہ

اِس قید کا الٰہی دُکھڑا کسے سُناؤں

ڈر ہے یہیں قفس میں مَیں غم سے مر نہ جاؤں

کیا بدنصیب ہوں مَیں گھر کو ترس رہا ہوں　　ساتھی تو ہیں وطن میں مَیں قید میں پڑا ہوں

آئی بہار کلیاں پھولوں کی ہنس رہی ہیں　　مَیں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں

باغوں میں بسنے والے خوشیاں منا رہے ہیں　　مَیں دل جلا اکیلا دُکھ میں کراہتا ہوں

آتی نہیں صدائیں اُن کی مرے قفس میں

ہوتی مری رہائی اے کاش میرے بس میں

ارمان ہے یہ جی میں اُڑ کر چمن کو جاؤں　　ٹہنی پہ گُل کی بیٹھوں آزاد ہو کے گاؤں

بیری کی شاخ پر ہو ویسا ہی پھر بسیرا　　اِس اُجڑے گھونسلے کو پھر جا کے مَیں بساؤں

چُگتا پھروں چمن میں دانے ذرا ذرا سے　　ساتھی جو ہیں پُرانے اُن سے ملوں ملاؤں

پھر دن پھریں ہمارے پھر سَیر ہو وطن کی

اُڑتے پھریں خوشی سے کھائیں ہوا چمن کی

جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے　　دل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے

گانا اِسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے　　دُکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے

آزاد جس نے رہ کر دن اپنے ہوں گذارے　　اُس کو بھلا خبر کیا یہ قید کیا بلا ہے ؟

آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے

مَیں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دُعا لے

(ڈاکٹر اقبال)

ہمارا دیس

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اُس کی یہ گلستاں ہمارا

غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

پربت وُہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وُہ سنتری ہمارا وُہ پاسباں ہمارا

گودی میں کھیلتی ہیں اُس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جس کے دم سے رشکِ جناں ہمارا

اے آبِ رودِ گنگا وُہ دن ہے یاد تجھ کو
اُترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

بانگِ درا

نیا شوالہ

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو بُرا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بُت ہو گئے پُرانے

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

تنگ آکے مَیں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے

کچھ فکر پھوٹ کی کر مالی ہے تو چمن کا — بوٹوں کو پھونک ڈالا اِس بس بھری ہوا نے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے

آ مِل کے غیریت کے پردوں کو پھر اُٹھا دیں — بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دُوئی مٹا دیں

سُونی پڑی ہُوئی ہے مُدّت سے جی کی بستی — آ اک نیا شوالہ اِس دیس میں بنا دیں

دُنیا کے تیرتھوں سے اُونچا ہو جس کا تیرتھ — دامانِ آسماں سے اُس کا کلس مِلا دیں

پھر اک انوپ ایسی سونے کی مُورتی ہو — اِس ہردوار دل میں لاکر جسے بٹھا دیں

سُندر ہو اُس کی صُورت چھب اُسکی موہنی ہو — اُس دیوتا سے مانگیں جو دِل کی ہوں مُرادیں

زُنّار ہو گلے میں تسبیح ہاتھ میں ہو — یعنی صنم کدے میں شانِ حرم دِکھا دیں

پہلو کو چیر ڈالیں درشن ہو عام اُس کا — ہر آتما کو گویا اک آگ سی لگا دیں

آنکھوں کی ہے جو گنگا لے کے اُس سے پانی — اس دیوتا کے آگے اِک نہر سی بہا دیں

ہندوستاں لکھ دیں ماتھے پہ اُس صنم کے — بھُولے ہُوئے ترانے دُنیا کو پھر سُنا دیں

ہر صُبح اُٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے — سارے پُجاریوں کو مَے پیت کی پلا دیں

مندر میں ہو بُلانا جس دم پُجاریوں کو — آوازۂ اذاں کو ناقوس میں چھُپا دیں

اگنی ہے وہ جو نرگن کہتے ہیں پیت جس کو — دھرموں کے سب بکھیڑے اِس آگ میں جلا دیں

ہے رِیت عاشقوں کی تن من نثار کرنا

رونا سِتم اُٹھانا اور اُن کو پیار کرنا

(اقبال)

محبّت

عروسِ شب کی زُلفیں تھیں ابھی نا آشنا خم سے — ستارے آسماں کے بے خبر تھے لذّتِ رم سے

قمر اپنے لباسِ نو میں بیگانہ سا لگتا تھا
ابھی امکاں کے ظلمت خانے سے اُبھری ہی تھی دنیا
کمالِ نظمِ ہستی کی ابھی تھی ابتدا گویا
سُنا ہے عالمِ بالا پہ کوئی کیمیا گر تھا
لکھا تھا عرش کے پایہ پہ اِک اکسیر کا نسخہ
نگاہیں تاک میں رہتی تھیں لیکن کیمیا گر کی
بڑھا تسبیح خوانی کے بہانے عرش کی جانب
پھرایا فکرِ اجزا نے اُسے میدانِ امکاں میں
چمک تارے سے مانگی چاند سے داغِ جگر مانگا
تڑپ بجلی سے پائی حور سے پاکیزگی پائی
ذرا سی پھر ربوبیت سے شانِ بے نیازی لی
پھر ان اجزا کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی میں
مہوّس نے یہ پانی ہستیٔ نوخیز پر چھڑکا
ہوئی جنبش عیاں ذرّوں نے لطفِ خواب کو چھوڑا

ابھی واقف نہ تھا گردش کے آئینِ مسلّم سے
مذاقِ زندگی پوشیدہ تھا پہنائے عالم سے
ہویدا تھی نگینے کی تمنّا چشمِ خاتم سے
صفا تھی جس کی خاکِ پا میں بڑھ کر ساغرِ جم سے
چھپاتے تھے فرشتے جس کو چشمِ روحِ آدم سے
وہ اِس نسخہ کو بڑھ کر جانتا تھا اسمِ اعظم سے
تمنّائے دلی آخر بر آئی سعیِ پیہم سے
چھپے گی کیا کوئی شے بارگاہِ حق کے محرم سے
اُڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلفِ برہم سے
حرارت لی نفسہائے مسیحِ ابنِ مریم سے
فلک سے عاجزی افتادگی تقدیرِ شبنم سے
مرکّب نے محبّت نام پایا عرشِ اعظم سے
گرہ کھولی ہنر نے گویا اس کی کارِ عالم سے
گلے ملنے لگے اُٹھ اُٹھ کے اپنے اپنے ہمدم سے

خرامِ ناز پایا آفتابوں نے ستاروں نے
چمک غنچوں نے پائی داغ پائے لالہ زاروں نے

از اقبالؔ

سوامی رام تیرتھ

ہم بغل دریا سے ہے اے قطرۂ بے آب تُو!　　پہلے گوہر تھا بنا اب گوہرِ نایاب تُو!

آہ! کھولا کس ادا سے تو نے رازِ رنگ و بُو
میں ابھی تک ہوں اسیرِ امتیازِ رنگ و بُو

مِٹ کے غوغا زندگی کا شورشِ محشر بنا
یہ شرارہ بجھ کے آتش خانۂ آذر بنا

نفیِ ہستی اک کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا
لا کے دریا میں نہاں موتی ہے اِلّا اللہ کا

چشمِ نابینا سے مخفی معنیٔ انجام ہے
تھم گئی جس دم تڑپ سیماب سیمِ خام ہے

توڑ دیتا ہے بُتِ ہستی کو ابراہیمِ عشق
ہوش کی دارُو ہے گویا مستیٔ تسنیمِ عشق

کیا کہوں زندوں سے مَیں اُس شاہدِ مستور کی
دار کو سمجھے ہُوئے ہیں جو سزا منصور کی

[illegible]

شیخ عبدالقادر کے نام

اُٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا اُفقِ خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں

ایک فریاد ہے مانندِ سپند اپنی بساط
اسی ہنگامے سے محفل تہ و بالا کر دیں

پھونک ڈالا تھا کبھی دفترِ باطل جس نے
حدّتِ دم سے اُسی شعلے کو پیدا کر دیں

اہلِ محفل کو دِکھا دیں اثرِ صیقلِ عشق
سنگِ امروز کو آئینۂ فردا کر دیں

جلوۂ یوسفِ گم گشتہ دکھا کر اُن کو
تپش آمادہ تر از خونِ زلیخا کر دیں

تنِ آتش زدۂ شوق کو مانندِ سرِشک
قطعِ منزل کے لئے آبلۂ پا کر دیں

اس چمن کو سبق آئینِ نمو کا دے کر
قطرۂ شبنمِ بے مایہ کو دریا کر دیں

رختِ جاں بتکدۂ چیں سے اُٹھا لیں اپنا
سب کو محوِ رخِ سعدائے و سلیمیٰ کر دیں

درد ہے سارے زمانے کا ہمارے دل میں
جنس کمیاب ہے۔ آ۔ نرخ کو بالا کر دیں

دیکھو! یثرب میں ہُوا ناقۂ لیلےٰ بے کار
قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں

زاہدِ شہر کہ ہے سوختۂ طبعی میں مثال
خشک ہے اِس کو غریقِ نمِ صہبا کر دیں

بادہ دیرینہ ہو اور گرم ہو ایسا کہ گداز
جگرِ شیشہ و پیمانہ و مینا کر دیں

سنگ رہ شاخ چمنی ہم لے نشیمن کیلئے
اپنے بے دردوں کو آمادۂ ایذا کر دیں

گرم رکھتا تھا ہمیں سردیٔ مغرب میں جو داغ
چیر کر سینہ اُسے وقفِ تماشا کر دیں

شمع کی طرح جئیں بزم گہِ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

ہر چہ در دل گذرد وقفِ زبان دارد شمع
سوختن نیست خیالے کہ نہاں دارد شمع

(از اقبال)

ستارہ

قمر کا خوف کہ ہے خطرۂ سحر تجھ کو
مآلِ حُسن کی کیا مل گئی خبر تجھ کو

متاعِ نُور کے لُٹ جانے کا ہے ڈر تجھ کو
ہے کیا ہراس فنا صورتِ شرر تجھ کو

زمیں سے دُور دیا آسماں نے گھر تجھ کو
مثالِ ماہ اُڑھائی قبائے زر تجھ کو

غضب ہے پھر تری ننھی سی جان ڈرتی ہے
تمام رات تری کانپتے گذرتی ہے

چمکنے والے مسافر! عجب یہ بستی ہے
جو اوج ایک کا ہے دُوسرے کی پستی ہے

اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اِک ولادتِ مہر
فنا کی نیند مئے زندگی کی مستی ہے

وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گُل
عدم عدم ہے کہ آئینہ دارِ ہستی ہے

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں

(از قبال)

دو ستارے

آئے جو قِراں میں دو ستارے کہنے لگا ایک دُوسرے سے
یہ وصل مدام ہو تو کیا خوب انجامِ خرام ہو تو کیا خوب
تھوڑا سا جو مہرباں فلک ہو
ہم دونو کی ایک ہی چمک ہو
لیکن یہ وصال کی تمنّا پیغامِ فراق تھی سراپا
گردش تاروں کا ہے مقدّر ہر ایک کی راہ ہے مقرّر
ہے خواب ثباتِ آشنائی
آئین جہاں کا ہے جُدائی

(از قبال)

پیامِ عشق

سُن اے طلبگارِ دردِ پہلو! میں ناز ہُوں تو نیاز ہو جا
میں غزنوی سومناتِ دل کا ہوں تو سراپا ایاز ہو جا

نہیں ہے وابستہ زیرِ گردوں کمالِ شانِ سکندری سے
تمام ساماں ہے تیرے سینے میں تو بھی آئینہ ساز ہوجا

غرض ہے پیکارِ زندگی سے کمال پائے ہلال تیرا
جہاں کا فرضِ قدیم ہے تو ادا مثالِ نماز ہوجا

دیارِ خاموشِ دل میں ایسا ستم کشِ دردِ جستجو ہو
کہ اپنے سینے میں آپ پوشیدہ صورتِ حرفِ راز ہوجا

نہ ہو قناعت شعارِ گلچیں! اسی سے قائم ہے شان تیری
وفورِ گل ہے اگر چمن میں تو اور دامن دراز ہوجا

گئے وہ ایّام اب زمانہ نہیں ہے صحرانوردیوں کا
جہاں میں مانندِ شمع سوزاں میانِ محفل گداز ہوجا

وجودِ افراد کا مجازی ہے ہستئ قوم ہے حقیقی
فدائے ملّت ہو یعنی آتش زنِ طلسمِ مجاز ہوجا

یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہیں سارے
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبارِ راہِ حجاز ہوجا زتاباں

کنارِ راوی

سکوتِ شام میں محوِ سرود ہے راوی
نہ پوچھ مجھ سے جو ہے کیفیت مرے دل کی
پیامِ سجدہ کا یہ زیر و بم ہوا مجھ کو
جہاں تمام سوادِ حرم ہوا مجھ کو

سرِ کنارۂ آبِ رواں کھڑا ہوں میں
خبر نہیں مجھے لیکن کہاں کھڑا ہوں میں

شرابِ سرخ سے رنگیں ہوا ہے دامنِ شام — لئے ہے پیرِ فلک دستِ رعشہ دار میں جام
عدم کو قافلۂ روز تیز گام چلا — شفق نہیں ہے یہ سورج کے پھول ہیں گویا
کھڑے ہیں دور وہ عظمت فزائے تنہائی — منارِ خواب گہِ شہسوارِ چغتائی
فسانۂ ستمِ انقلاب ہے یہ محل — کوئی زمانِ سلف کی کتاب ہے یہ محل
نظارہ موج کو پھر وجہِ اضطراب ہے کیا؟ — یہ کہنہ مشق تو آموزِ پیچ و تاب ہے کیا
مقام کیا ہے سرودِ خموش ہے گویا — شجر یہ انجمنِ بے خروش ہے گویا

نمازِ شام کی خاطر یہ اہلِ دل ہیں کھڑے
مری نگاہ میں انسان پا بگل ہیں کھڑے

رواں ہے سینۂ دریا پہ اک سفینۂ تیز — ہوا ہے موج سے ملاح
سبک روی میں ہے مثلِ نگاہ یہ کشتی — نکل کے حلقۂ حدِ نظر
جہازِ زندگیٔ آدمی رواں ہے یوں ہی — ابد کے بحر میں پیدا یوں ہی نہاں
شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

علی گڑھ کالج سے رخصت

(مولانا محمد علی صاحب

دم بھر کی جسے فرصت یہ چرخِ ستمگر دے

صحبت سے اگر اپنے اوروں کو کرے گا خوش — احباب کی صحبت کا کچھ لطف اٹھائے گا
اصرار سے اوروں کے گر توڑ کے تقوے کو — میخانہ کی صحبت کا اک جام چڑھائے گا
گا ہے مے گلگوں سے دو ایک سبو بھر کر — خود پیرِ مغاں بن کر اوروں کو پلائے گا
گر پچھلے زمانے کا چھڑ جائے کہیں قصہ — اوروں کی سنیگا کچھ۔ کچھ اپنی سنائے گا
صحبت میں اگر اُن کی بھولے گا کچھ اپنے غم — کچھ رنج و محن اُن کے بھی دل سے مٹائیگا

لیکن جسے طے کرنا ہو ہر صبح کو اک منزل — اُس شخص کا محفل میں کیوں دل نہ بھر آئیگا
کس طرح سے صحبت سے محفوظ ہو اسکا دل — احباب سے کا جس کو یہ چرخ چھٹائے گا
ہو کو بختی کا اذں میں آوازِ جرس جس کے — وہ اپنی کتھا اوروں کو کیا خاک سنائیگا
ساقی کی ظرافت سے مسرور ہو وہ کیونکر — پوچھتے ہی جس بےکس کا قافلہ جائے گا
مے ہوئے کہ نغمہ ہو۔ فرصت میں ہیں سب اچھے — دم بھر کا جو مہماں ہے کیا لطف اٹھائیگا

ہم جانتے ہیں اے کالج پر یاد رہے اتنا — یاد آئے گی جب تیری تو خون رلائے گا
اُس بلبلِ بےکس کو جو قیدِ قفس میں ہو — کیا اس کو گل و گلشن پھر یاد نہ آئے گا
دل رکھتے ہو اے یارو تو کہہ دو خدا لگتی — کیا تم سے الگ رہنا کچھ دل نہ دکھائیگا
سیکھی تھی محبت جو یاں آٹھ برس رہ کر — جو سر اُسے کس طرح پھر دل سے بھلائیگا
جس حال میں ہم ہوں گے ایک حشر بپا ہوگا — ایامِ گذشتہ کا کچھ دھیان جب آئے گا
کالج کے لئے لیکن نکلے گی دعا دل سے — ہر بار زباں پر یہ مطلع مگر آئے گا

کیا بادۂ گلگوں سے مسرور کیا دل کو
دا تا رکھے آباد اں ساقی تری محفل کو

پدمنی

منشی دُرگا پرشاد صاحب سرورؔ جہان آبادی

عندلیبوں کو ملی آہ و بکا کی تعلیم اور پروانوں کو دی سوزِ وفا کی تعلیم
جب ہر اک چیز کو قدرت نے عطا کی تعلیم آئی حصّے میں ترے ذوقِ فنا کی تعلیم

نرم و نازک تجھے اعضا دیئے چلنے کیلئے
دِل دیا آگ کے شعلوں پہ پگھلنے کیلئے

رنگ تصویر کے پردے میں جو چمکا تیرا خود بخود لوٹ گیا جلوۂ رعنا تیرا
ڈھال کر کالبدِ نُور میں پُتلا تیرا یدِ قُدرت نے بنایا جو سراپا تیرا

بھر دیا کوٹ کے سوزِ غمِ شوہر دِل میں
رکھ دیا چیر کے اک شعلۂ مضطر دل میں

تو وہ تھی شمع کہ پروانہ بنایا تجھ کو تو وہ لیلیٰ تھی کہ دیوانہ بنایا تجھ کو
رونقِ خلوتِ شاہانہ بنایا تجھ کو نازشِ ہمّتِ مردانہ بنایا تجھ کو

ناز آیا ترے حِصّے میں۔ ادا بھی آئی
جاں فروشی بھی۔ محبّت بھی۔ وفا بھی آئی

آئی دُنیا میں جو تو حسن میں یکتا بن کر چمنِ دہر میں پھولی گُلِ رعنا بن کر
رہی ماں باپ کی آنکھوں کا جو تارا بن کر دلِ شوہر میں رہی خالِ سویدا بن کر

حُسنِ خدمت سے شگفتہ دلِ شوہر رکھا
کہ قدم جادۂ طاعت سے نہ باہر رکھا

تیری فطرت میں مروّت بھی تھی غم خواری بھی ۔ تیری صورت میں ادا بھی تھی طرح داری بھی
جلوۂ حسن میں شامل تھی نکوکاری بھی ۔ درد آیا تیرے حصّے میں نکوکاری بھی

آگ پر بھی نہ تجھے آہ! مچلتے دیکھا
تپشِ حسن کو پہلو نہ بدلتے دیکھا

تو وہ عصمت کی تھی اک آئینہ سیما تصویر ۔ حسنِ سیرت سے تھی تیری متجلّا تصویر
لاکھ تصویروں سے تھی اک تری زیبا تصویر ۔ تجھ کو قدرت نے بنایا تھا سراپا تصویر

نور ہی نور ترے جلوۂ مستور میں تھا
انجمِ ناز کا جھرمٹ رُخِ پُر نور میں تھا

لب میں اعجاز حیا چشمِ فسوں ساز میں تھی ۔ اِک قیامت کی ادا تیرے ہر انداز میں تھی
شکل پھرتی جو تیری دیدۂ غمّاز میں تھی ۔ برقِ بیتاب تری جلوہ گہِ ناز میں تھی

یہ وہ بجلی تھی قیامت کی تڑپ تھی جس میں
شعلۂ نارِ عقوبت کی تڑپ تھی جس میں

یہ وہ بجلی تھی جو تیغِ شرر افشاں ہوکر ۔ کوند اُٹھی قلعۂ چتوڑ میں جولاں ہوکر
یہ وہ بجلی تھی جو سوزِ غمِ حرماں ہوکر ۔ خاک سے لوٹ گئی تیری پشیماں ہوکر

یہ وہ بجلی تھی تجھے جس کے اثر نے پھونکا
رفتہ رفتہ تپشِ سوزِ جگر نے پھونکا

آہ! او عشوہ و انداز و ادا کی دیوی ۔ آہ! او ہند کے ناموسِ وفا کی دیوی
آہ! او پرتوِ انوارِ صفا کی دیوی ۔ او زیارت کدۂ شرم و حیا کی دیوی

تیری تقدیس کا قائل ہے زمانہ ابتک
تیری عفّت کا زباں پر ہے فسانہ ابتک

آفریں ہے تری جاں بازی و ہمّت کے لئے ۔ آفریں ہے تری عفت۔ تری عصمت کیلئے

کیا مٹائے گا زمانہ تری شہرت کے لئے
کہ چلی آتی ہے اِک خلق زیارت کیلئے
نقش اتنک تری عظمت کا ہے بیٹھا دِل میں
تو وہ دیوی ہے ترا لگتا ہے میلا دِل میں

سوزِ بیوگی

عجب رقّت بھری اے چارہ گر! ہے داستاں میری
جگر میں چٹکیاں لیتی ہے رہ رہ کر فغاں میری

پسند آئی نہ آرائش تجھے او آسماں میری
اُتاریں بدھیاں بیدرد! توڑیں چوڑیاں میری

مبدل غم سے شادی ہوگئی او جان جاں میری
کہ چپکی بن کے خوں آخر شرابِ ارغواں میری

فلک نے چھین لیں مجھ سے شہابی چندریاں میری
پہنتی سُرخ جوڑا ایسی قسمت تھی کہاں میری

کہاں کا شوقِ زینت! جل رہی ہیں ہڈیاں میری
گرانی مجھ پہ اب برقِ ستم ہیں بجلیاں میری

ہُوا کیا اے جوانی! وہ لڑکپن کا مرے زیور
کدھر ہے طوقِ منّت کا! کہاں ہیں ہنسلیاں میری

لگائی آگ آرائش کو آخر سوزِ نالہ نے
اُڑی ہونٹوں کی مسّی بن کے آہوں کا دھواں میری

بہا جاتا ہے دل آنکھوں سے خونِ آرزو ہو کر
یہ روتا ہے۔ رہیگی بے کسی یارب کہاں میری

بنایا ہے یہ کس کے سوگ نے ماتم نشیں مجھ کو
تمنّا نالہ کش میری ہے حسرت نوحہ خواں میری

وہ نقش نامرادی ہوں سراپا درد ہوں غم ہوں
مرقع ہیں جہاں کے آہ! میں تصویرِ ماتم ہوں

وہ دُکھیا ہوں نہیں دردِ نہاں کا رازداں کوئی
وہ بیکس ہوں نہیں سُنتا ہے میری داستاں کوئی

کرے رو رو کے کب تک شکوۂ دردِ نہاں کوئی
بہائے آہ! کب تک سیلِ اشکِ خوں چکاں کوئی

بنایا ہے سراپا داغ حسرت سوز ہجراں نے — پہنائے آہ! پھولوں کی تجھکو بدگمانی کوئی
جگر سے آہ! تھم تھم کر دھواں اٹھتا ہے آہوں کا — جلاتا ہے کسی کو یوں بھی اے سوزِ نہاں کوئی
تقاضا لذتِ ذوقِ خلش کا ہے شبِ غم میں — جگر میں آہ! رکھدے چیر کر نوکِ سناں کوئی
کلیجہ قوم ہی نے کر لیا ہو اپنا جب پتھر — تو ہو پھر خاک یارب شکوہ سنجِ آسماں کوئی
زمانہ ہو رہا ہو آہ! جب تاریک آنکھوں میں — سنوارے بام پر کیا گیسوئے عنبر فشاں کوئی
سنبھال اے ضبط! اٹھکر اضطرابِ دل سے ڈرتی ہوں — کہ نازک ہے زمانہ۔ ہو نہ مجھ سے بدگماں کوئی
ہوئے کیا کیا نہ آنسو خاک میں پامال گر گر کر — نہ نکلا قوم میں ان موتیوں کا قدرداں کوئی

جلایا چپکے چپکے آتشِ خاموشِ غم تو نے
بجھائی آہ! کب دل کی لگی ابرِ کرم تو نے

گھٹائیں چھا رہی ہیں آہ! دل پر یاسِ ہجراں کی — امنگیں خوں رلاتی ہیں شبابِ فتنہ ساماں کی
خلش ہے آہ! پھر نالوں میں میرے نوکِ پیکاں کی — الٰہی خیر ہو دل کی جگر کی۔ شاہ رگِ جاں کی
نہ دے بادِ صبا! تکلیف گلگشتِ گلستاں کی — کہ صورت ہے ہر اک گل میں ہائے زخمِ دنداں کی
میں وہ تصویرِ حسرت ہوں شکستِ رنگِ ارماں کی — کہ مہندی ہے نہ ہاتھوں میں نہ سرخی لب پہ ہے پاں کی
گئے وہ دن کمندِ شوق تھے جب دوش پر گیسو — درازی آہ! اب زلفوں میں ہے شبہائے ہجراں کی
یہ ہے کس کا سموم بادِ صبا! یہ کس کے پھولوں سے — لپٹ کر رو رہی ہیں خون کلیاں میرے داماں کی
نہ رکھا پیرہن میں تار باقی دشتِ وحشت نے — الٰہی شرم تیرے ہاتھ ہے اس جسمِ عریاں کی
دماغِ عرضِ شرمِ آرزو ہے چارہ گر کس کو — بگڑتا کیوں ہے۔ منت کش نہیں ہیں تجھ سے درماں کی
پرائے جی کی وہ جانے کہ بیتا ہو پڑی جس پر — کسی کو کیا خبر ہو آہ! میرے دردِ پنہاں کی

مرے دردِ نہاں کو آہ! تو بے درد کیا جانے؟
گذرتی ہے جو مجھ دکھیا پہ وہ تیری بلا جانے

نشاط افروز شادی تو ہے منعم بزمِ عشرت میں — بسر ہوتی ہے تیری شاہد و مطرب کی صحبت میں

حمائل ہاتھ تیرے گردنِ مینا میں ہیں شب کو — کہ مستِ بیخودی ہے ذوقِ صہبائے مسرت میں
کسی گل پیرہن سے شب کو پہلو گرم ہے تیرا — بہارِ صبحِ جنت کا ہے جلوہ شامِ خلوت میں
گذرتے ہیں ترے دن لطف سے یاروں کے جلسے میں — بسر ہوتی ہیں راتیں تیری خوابِ استراحت میں
سمجھتا ہے مآلِ زندگی تو عیشِ دُنیا کو — کبھی ہے فکرِ ساماں میں کبھی ہے حرصِ دولت میں
خبر کیا! تجھ کو اے دلدادۂ ذوقِ تن آسانی — کہ کٹتے ہیں کسی دُکھیا کے دن کیونکر مصیبت میں
اثر ہو تجھ کو کیا بیدرد مجھ بیکس کے نالوں کا — نہ دلسوزی ہے فطرت میں نہ غم خواری طبیعت میں
توقع چارۂ دردِ نہاں کی کیا کرے کوئی — کہ ہمدردی نہیں جائز ہے ظالم! تیری ملت میں
کسی ظالم کا تو اے بوالہوس! ڈھانکے گا کیا پردہ — کہ ہیں تیری نگاہیں رخنہ گر دامانِ عصمت میں

کہاں کی پردہ داری۔ پاسِ ناموسِ وفا کیسا
توقع قوم ہی سے اُٹھ گئی۔ یا رب گلہ کیسا

مُرغ و صیّاد

اے نسیمِ صبح! اے گہوارہ جُنبانِ چمن — ہو اگر تیرا گُذر سُوئے جوانانِ چمن
اُن سے کہنا میری جانب سے بعد اظہارِ شوق — ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں وُہ جو یارانِ چمن
اِک گرفتارِ قفس نے ہے کہا تم کو سلام — اَور پوچھا ہے مزاجِ سرو و ریحانِ چمن
پھر یہ دُہرانا میری جانب سے نویدِ جانفزا — سیرِ گلشن ہو مبارک تم کو مُرغانِ چمن
خاک اُڑا کر پہلے چُپ ہو جائیو بادِ صبا — حال پُوچھیں کچھ مرا اگر ہم صفیرانِ چمن
پھر یہ کہنا کھینچ کر سینے سے آہِ جانگداز — ہے قفس میں قید وُہ مرغِ خوش الحانِ چمن

اب نہ سیرِ لالہ و گُل ہے نہ وہ گلگشتِ باغ — حسرتِ پرواز ہے اب اور ارمانِ چمن
اب نہ وُہ پھولوں کا تختہ ہے نہ کُنجِ خوش گوار — نونہالانِ چمن ہیں اب نہ مبدا نِ چمن
تنکے چُنتا ہے پڑا کُنجِ قفس میں اب غریب — آشیاں کیسا! کہاں کی فکرِ سامانِ چمن

توڑتا ہے خانۂ صیّاد میں دم ہائے ہائے
ہو رہا ہے بلبلِ تصویر ماتم ہائے ہائے

چھیڑتی ہے کیا قفس میں ہم کو اے موجِ نسیم — اس چمن میں ہم بھی تھے پروردۂ نازِ قدیم
تھی ہماری بھی کبھی سرسبز کشتِ آرزو — ہم پہ بھی اے ابرِ رحمت! تھا ترا لطفِ عمیم
ٹوٹتے تھے آہ دن کو سبزہ زاروں کے مزے — شب کو رہتے تھے تر و شاداب کُنجوں میں مقیم
یا چہکتے پھرتے تھے باغوں میں ہم اے ہم صفیر — یا قفس میں پیچتے ہیں آہ بے یار و ندیم
ہم کہاں کے خوشنوا تھے اور کہاں کے بذلہ سنج — ہم پہ اے صیّاد ٹوٹا جو ترا قہرِ عظیم
ہم صفیرانِ چمن کے کیا تغافل کا گلہ — جب قفس میں پھنس گئے کیسی رہ و رسمِ قدیم
ذبح اے صیّاد کر بھی چک کہ جھگڑا پاک ہو — ہم سے اب دیکھا نہیں جاتا ہے یہ حالِ سقیم
پھونک دے اے سوزِ غمہائے نہانی! پھونک دے — سن او ظالم! بھڑک اٹھا شعلۂ نارِ جحیم
ہم ہیں پابندِ قفس، کیسا چمن۔ کیسی بہار — کس کو مژدہ دینے آئی ہے نوائے بادِ نسیم

دیدِ گُل سے واسطہ کیا ہم اسیروں کیلئے
سیرِ گلشن ہو مبارک ہم صفیروں کے لئے

لالہ و گُل کی تھی قسمت میں فضا دو چار دن — ہم نے کھالی سبزہ زاروں کی ہوا دو چار دن
پھر سُنے گا ہائے کس کے زمزمے صیّاد تو — ہم قفس میں اور ہیں نغمہ سرا دو چار دن
حسرتِ پرواز بھی جاتی رہے گی اے اجل! — ہم سے اُڑلیں اور مرغانِ ہوا دو چار دن
پھر کہاں صیّاد ہم اور پھر کہاں کُنجِ قفس — آب و دانہ ہے مقدر میں ترا دو چار دن
گھٹ کے اس زنداں میں جائیگا کبھی تو دم نکل — مانگتے ہیں اے اجل! تیری دعا دو چار دن

یاد اے صیّاد! ہم کو بھی کرے گا تو کبھی
اور تڑپا لے قفس میں بے وفا دو چار دن

دیکھ کر خالی قفس کو جی بھر آئے گا ترا
پیٹ کر روئے گا سر بعد فنا دو چار دن

کر رہے ہیں جس طرح ہم نالہ ہائے دردناک
تو رہے گا یونہی مصروفِ بکا دو چار دن

یاد جب صیّاد آئیں گے ہمارے زمزمے
گھر میں تنہا تیرا جی گھبرائے گا دو چار دِن

دستِ حسرت مل کے اے صیّاد پچھتائیگا تو
ایسا لائے گا کہاں سے آہ مرغِ خوش گلو

جب بنائے گا ہمارا آہ! چھوٹا سا مزار
چپکے چپکے تو ہمارے غم میں ہوگا اشکبار

یاد رہ رہ کر جفائیں اپنی آئیں گی تجھے
اور ہماری بےکسی پر روئے گا تو زار زار

لے کے خالی گھر کو جب گلشن سے لوٹے گا قفس
پیچھے پیچھے خاک اڑاتی آئے گی بادِ بہار

سُن کے اے صیّاد! تیرے نالہ ہائے جانگداز
راستے میں لوگ پوچھیں گے کہ کیوں ہے سوگوار

تو کہے گا مر گئی وہ بلبلِ رنگیں نوا
وصلِ گل کے واسطے تھی جو قفس میں بے قرار

گُل کھلیں گے، سبزۂ نورس اُگے گا قبر پر
ہم نہ ہوں گے اور آئے گی گلستاں میں بہار

سوتے ہوں گے تیرے گہوارے میں اے کنجِ لحد
خوابِ راحت میں مخل ہوگی نہ گل بانگِ ہزار

اپنی مٹی ہے کہاں کی کیا خبر - یادِ صبا!
ہو پریشاں دیکھیئے کس کس جگہ مشتِ غبار

وہ بھی آزادی کے دن تھے ہائے کتنے جانفزا
تیرے بندھن سے تھے جب بے قیدِ ہستی رستگار

لوٹتے تھے اپنی گلشن میں بہاروں کے مزے
سبزہ زاروں کی تھیں سیریں جوئباروں کے مزے

ہم سرودِ طائرانِ قدس تھے ہم بھی صبا!
قیدِ ہستی کی کشاکش میں نہ تھے یوں مبتلا

بولتے تھے اپنی دھن میں پیاری پیاری بولیاں
ہائے وہ دن! شاخِ طوبےٰ پر تھے جب نغمہ سرا

لوٹتے تھے ہم بہاریں گلشنِ فردوس کی
تھی عجب دلکش ہمارے سبزہ زاروں کی فضا

کھل رہے تھے چار سو پھولوں کے کنجِ خوشگوار
تھیں رواں شیر و عسل کی اُن میں نہریں جابجا

اپنے پھولوں پر تو اتراتی ہے کیا اے عندلیب!
تو نے دیکھی ہی نہیں ہے شاہدِ گُل کی ادا

کرکے ہم کو تو اسیرِ حلقۂ دامِ فریب
کھینچ کر کس وادیٔ پُر خار میں لائی قضا

ہم نہ پھنستے کس طرح صیّاد تیرے جال میں
آب و دانہ تھا مقدر میں ترے گھر کا لکھا

ہم قفس میں کب تلک بے بال و پر تڑپا کریں
ٹوٹ بھی جا! اے طلسمِ قیدِ ہستی۔ ٹوٹ جا

تیرے مرغِ دست پرور ہم ہیں صیّادِ ازل!
خواہ ہم کو ذبح کر تُو۔ خواہ ہم کو کر رہا

من نہ آں مرغم کہ نالم از جفائے تیغ تو
ذبح کن صیّاد۔ قربانِ ادائے تیغ تو

جوگی

خان بہادر چوہدری خوشی محمد صاحب بی۔ اے علیگ ناظرؔ

کل صبح کے مطلعِ تاباں سے جب عالم بقعۂ نور ہوا
سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا

مستانہ ہوائے گلشن تھی جانانہ ادائے گلبن تھی
ہر وادی وادیٔ ایمن تھی ہر کوہ پہ جلوہ طور ہوا

جب بادِ صبا مضراب بنی ہر شاخِ نہال رباب بنی
شمشاد و چنار ستار بنے ہر سرو و سمن طنبور ہوا

سب طائر مل کر گانے لگے عرفان کی تانیں اڑانے لگے
اشجار بھی وجد میں آنے لگے دلکش وہ سماع طیور ہوا

سبزے نے بساط بچھائی تھی اور بزمِ سرور سجائی تھی
بَن گلشن میں اور آنگن میں فرشِ سنجاب وسمور ہُوا
تھا دلکش منظر دشت وجبل اور چال صبا کی مستانہ
اس حال میں ایک پہاڑی پر جب نکلا ناظر دیوانہ

چیلوں نے جھنڈے گاڑے تھے پربت پہ چھاؤنی چھائی تھی
تھے ڈیرے خیمے بادل کے کہرے نے قنات لگائی تھی
یہاں برف کے تودے گلتے تھے چاندی کے فوارے چلتے تھے
چشمے سیماب اُگلتے تھے نالوں نے دھوم مچائی تھی
یہاں قلۂ کوہ پہ رہتا تھا اک مست قلندر بیراگی
تھی راکھ جٹوں میں جوگی کے اور انگ بھبوت رمائی تھی
تھا راکھ کا جوگی کا بستر اور راکھ کا پیراہن تن پر
تھی ایک لنگوٹی زیبِ کمر جو گھٹنوں تک لٹکائی تھی
سب خلقِ خدا سے بیگانہ وہ مست قلندر دیوانہ
بیٹھا تھا جوگی مستانہ آنکھوں میں مستی چھائی تھی
جوگی سے آنکھیں چار ہوئیں اور جھک کر میں نے سلام کیا
تب آنکھ اُٹھا کر ناظر سے یُوں بَن باسی نے کلام کیا
ہاں بابا ناحق جوگی کو تم کس لئے آکے ستاتے ہو
ہیں پنکھ پکھیرو بن باسی تم جال میں آن پھنساتے ہو
کوئی جھگڑا دال چپاتی کا کوئی دعوے گھوڑے ہاتھی کا
کوئی شکوہ سنگی ساتھی کا تم ہم کو سنانے آئے ہو

ہم حرص و ہوا کو چھوڑ چکے اس نگری سے مُنہ موڑ چکے
ہم جو زنجیریں توڑ چکے تم لا کے وہی پہناتے ہو
تم پُوجا کرتے ہو دھن کی ہم سیوا کرتے ہیں ساجن کی
ہم جوت جگاتے ہیں من کی تم اُس کو آ کے بجھاتے ہو
سنسار سے یہاں مُکھ پھیرا ہے من میں ساجن کا ڈیرا ہے
یہاں آنکھ لڑی ہے پیتم سے تم کس سے آنکھ ملاتے ہو
اُس مست قلندر جوگی نے جب ناظر پر یہ عتاب کیا
کچھ دیر تو ہم خاموش رہے پھر جوگی سے یہ خطاب کیا
ہیں ہم پردیسی سیلانی مت ناحق طیش میں آ جوگی
ہم آئے تھے تیرے درشن کو چتون پر مَیل نہ لا جوگی
آبادی سے مُنہ پھیرا کیوں پربت میں کیا ہے ڈیرا کیوں
ہر محفل میں ہر منزل میں ہر دل میں ہے نورِ خدا جوگی
کیا مسجد میں کیا مندر میں سب جلوہ ہے وَجہُ اللہ کا
پربت میں نگر میں ساگر میں ہر اُترا ہے ہرجا جوگی
جی شہر میں خُوب بہلتا ہے وہاں حُسن پہ عشق مچلتا ہے
وہاں پریم کا ساغر چلتا ہے چل دل کی پیاس بجھا جوگی
وہاں دل کا غنچہ کھِلتا ہے ہر رنگ میں موہن ملتا ہے
چل شہر میں سنکھ بجا جوگی بازار میں دھونی رما جوگی

اِن چکنی چپڑی باتوں سے مت جوگی کو بہلا بابا
جو آگ بجھائی جتنوں سے پھر اُس پہ نہ تیل گرا بابا

ہے شہروں میں غُل شور بہت اور حرص و ہوا کا زور بہت
بستے ہیں نگر میں چور بہت سادھو کی ہے بن میں جا بابا
ہے شہر میں شورشِ نفسانی جنگل میں جلوۂ رُوحانی
ہے نگری ڈگری کثرت کی بن وحدت کا دریا بابا
ہم جنگل کے پھل کھاتے ہیں چشموں سے پیاس بجھاتے ہیں
راجا کے نہ دوارے جاتے ہیں پرجا کی نہیں پروا بابا
سر پر آکاش کا منڈل ہے دھرتی پہ سُہانی مخمل ہے
دن کو سُورج کی محفل ہے شب تاروں کی ہے سبھا بابا
جو جھوم کے یہاں گھن آتے ہیں مستی کا رنگ جماتے ہیں
چشمے طنبور بجاتے ہیں گاتی ہے ملار ہوا بابا
یہاں پنچھی مل کر گاتے ہیں پیتم کے سندیس سُناتے ہیں
یا رُوپ انوپ دکھاتے ہیں پھل پھول اور برگ گیا بابا
ہے پیٹ کا ہر دم دھیان تمہیں اور یاد نہیں بھگوان تمہیں
سِل پتھر اینٹ مکان تمہیں دیتے ہیں سُکھ سے چھڑا بابا
تن من کو دھن میں لگاتے ہو ہِردے کو دِل سے بُھلاتے ہو
ماٹی میں لعل گنواتے ہو تم بندۂ حرص و ہوا بابا
دھن دولت آنی جانی ہے یہ دُنیا رام کہانی ہے
یہ عالم عالمِ فانی ہے ۔ باقی ہے ذاتِ خدا

قومی نظم

مقامِ عبرت ہے دَورِ گردُوں۔ ذرا بصیرت کی آنکھ وا کر
فلک کے پردوں میں سا نہ کیا ہے۔ کبھی تو یہ راگنی سُنا کر

ہے کیسا یہ انقلاب جاری۔ زماں میں سائر مکاں میں ساری
نہ اُس سے خاکی بچا نہ ناری فلک پہ پہنچا زمیں سے آکر

کہیں بلندی کہیں ہے پستی۔ یہی ہے رمزِ مصافِ ہستی
اِسے اُبھارا اُسے دبا کر۔ اِسے جگایا اُسے سُلا کر

جبل میں دریا میں گلستاں میں۔ بلخ میں ماہی میں انس و جاں میں
سدا قوی اور ناتواں ہیں۔ رہا نہ ازنہ جہاں میں آکر

ہے مصر کا گاہ ہے دَورِ دوراں۔ ہے گاہے یوناں کا فرِ نمایاں
کبھی ہے ایراں کبھی ہے توراں۔ گئے یہ سب نوبتیں بجا کر

کل ایشیا کی تھی کامرانی۔ ہے آج یورپ کی لن ترانی
غرض یُوں ہی دورِ آسمانی۔ بگاڑتا ہے بنا بنا کر

خُدا کی عادت رہی سدا لَا یُغَیِّرُ اللّٰہُ مَا بِقَوْمٍ
مگر بدلتی رہی ہیں قومیں۔ عمل کی پاداش اپنے پا کر

یہ بحرِ مَوّاج کے تھپیڑے۔ ڈبوتے ہیں غافلوں کے بیڑے
ہیں پہنچے ساحل پہ اہلِ ہمت۔ طلب کے چپّو چلا چلا کر

سئے جوانوں نے دشت رنگیں لئے پلوں نے حصارِ سنگیں

لہُو کے دریا بہا بہا کر۔ سروں کی بھینٹیں چڑھا چڑھا کر
جو قوم سے لَو لگا رہے ہیں۔ وُہ نقدِ جاں تک لُٹا رہے ہیں
وُہ کاخِ ملّت بنا رہے ہیں۔ بنائیں اپنے گھروں کی ڈھا کر
ہیں جن کے سینوں میں دِل پھڑکے۔ وُہ مشکلوں سے نہیں جھجکتے
ہیں مثلِ پروانہ سر پٹکتے۔ وُہ عشق میں بال و پر جلا کر
ہیں راہرو کرتے پڑتے جاتے۔ رہِ ترقی میں بڑھتے جاتے
ہیں بامِ دولت پہ چڑھتے جاتے۔ کمندِ ہمّت لگا لگا کر
الٰہی خیر اپنے قافلے کی۔ نہیں جسے فکر مرحلے کی
یہ مستِ خواب اب بھی سو رہے ہیں۔ تھکے سب انکو جگا جگا کر
کچھ ایسی قسمت ہے ان کی پھوٹی۔ کہ درجِ عزّت کی آس ٹوٹی
ابھی تو شاخِ مراد سے یہ۔ گرے ہیں جھولے جھلا جھلا کر
یہ دولت و مُلک و کامرانی۔ تو سب بہاریں تھیں آنی جانی
مگر یہ سیلاب کی روانی۔ تو لے گئی دین و دِل بہا کر
دِلوں میں اپنے نہاں ہیں کینے۔ بھرے ہیں بُغض و حسد سے سینے
یہ رہ گئے قوم کے دفینے۔ وُہ گنجِ اُلفت لُٹا لُٹا کر
ہے رہنماؤں کا زور ہر سُو۔ ہے پیشواؤں کا شور ہر سو
بنائے کیا کیا طلسمِ کثرت۔ وُہ رنگِ وحدت مٹا مٹا کر
رہو گے اِس دارو گیرِ دوراں میں۔ ہمدمو! مستِ خواب کب تک؟
نبھے گی امواجِ جانستاں میں۔ یہ آن و بان اے حباب کب تک؟
خدا کی رحمت ہو اہلِ دِل پر۔ جو قوم کا غم ہیں کھانے والے
مجالس اس کی سجانے والے۔ سفر کی زحمت اُٹھانے والے

ہیں صدرِ بزم اپنے فخرِ ملت ۔ وُہ ملتوں کے ملانے والے
چھپا یار اور پنجاب کی ۔ کدورتوں کو مٹانے والے
سدا رہا اُن کا فیض جاری ۔ ہے شاکرِ لُطف قوم ساری
الٰہی اُن کو بنائے رکھیو ۔ ہیں اپنی بگڑی بنانے والے
وُہ افضلُ الفاضِلین دہلی ۔ وُہ اکمل الکاملین دہلی
کلامِ حق کی دِکھا کے مشعل ۔ دلوں کی ظُلمت گنوانے والے
ادیبِ قومی خطیبِ قومی ۔ حبیبِ قومی طبیبِ قومی
زبانِ معجز بیاں کا اپنی ۔ جہاں میں سکہ جمانے والے
وُہ میرے اخوند ذوالمعالی ۔ لسانِ اسلام خواجہ حالی
بُتوں کی اُلفت چھُڑانے والے ۔ وُہ قوم سے لَو لگانے والے
رہے سدا ہم پہ ظلِّ عالی ۔ الٰہی پیرانِ زندہ دِل کا
وگرنہ عالم میں پھر نہ دیکھیں گے ۔ شور نہیں یہ زمانے والے
ہے سخت قحط الرّجال ہم میں ہے باکمالوں کا کال ہم میں
نہ اہلِ جاہ و جلال ہم میں ۔ نہ مال و دولت خزانے والے
ہیں موجِ دریائے پُرخطر میں ۔ یہی تو اب ناؤ کے کھوّیا
یہ کوٹ پتلون ٹائی والے ۔ یہ آئنے والے شانے والے
سُنیں یہ فریاد انجمن کی ۔ سب اہلِ پنجاب گوشِ دل سے
وُہ اپنی قسمت کے فیصلے کا ہیں آج محضر لکھانے والے
جو بھیک پر ہو مدارِ ہستی ۔ تو کچھ نہیں اعتبارِ ہستی
ہم آج کالج کی زندگی کا ہیں تم سے بیمہ کرانے والے
مکاں کی اب داغ بیل ڈالو ۔ دِیئے میں جلد اس کے تیل ڈالو

دگرنہ اس کا چراغِ ہستی۔ ہیں کوئی دِن میں بُجھانے والے
نئی بنائیں بنانی ہوں گی۔ چھپنیں بھی گھر کی اُٹھانی ہوں گی
کہ حکمِ حاکم سے قبل بانوں کو۔ ہم ہیں مہماں بنانے والے
غضب ہے اک درس گاہِ قومی کے ہیں بنانے سے آج قاصر
تھے جن کے اسلاف روضۃ التاج و بیتِ حمراء بنانے والے
یہ سچ کہا ہے کسی نے۔ بہتر ہے موت بےصرفہ زندگی سے
ہم اپنی ذِلّت سے نامِ اسلام۔ پر ہیں دھبّہ لگانے والے
عزیزو اس رہ میں چھوڑ جانا۔ کچھ اپنی غیرت کی یادگاریں
کہ نقشِ پا پر تمہارے لاکھوں ہیں قافلے پیچھے آنے والے
نہیں جہاں میں کوئی ٹھکانا۔ بجز آستانِ شہِ دو عالم
کہ جس کے دربار میں ملائک ہیں عجز سے سر جھکانے والے
وُہ جلوۂ ذاتِ ذو الجلالی۔ وُہ مظہرِ شانِ ذوالجمالی
کہ جس کے در پر سدا سوالی۔ مُرادیں دِل کی ہیں پانے والے
وُہ اہلِ زور اور اہلِ فن کے طلسمِ حیرت مٹانے والے
وُہ چشمِ اہلِ جہاں کو نُورِ خُدا کا منظر دکھانے والے
وُہ ہفت کشور میں عدل و انصاف کی مُنادی کرانے والے
وُہ چار دانگِ جہاں میں وحدت کی پنج نوبت بجانے والے
وُہ خاکِ یثرب کو سُرمۂ چشمِ اہلِ ایمان بنانے والے
عرب کی بےآب ریگِ صحرا پہ نیلِ رحمت بہانے والے
ہمارے مولا ہمارے والی؟ ہیں آستاں پر ترے سوالی
یہ نونہالانِ باغِ قومی کو گودیوں میں کھلانے والے

سلام و صلوٰۃ تم پہ لاکھوں۔ شفیعِ روزِ جزا ہمارے
نہیں ہے بیڑے کو خوفِ طوفاں۔ جو آپ ہیں ناخدا ہمارے

آغازِ محبت

از مولانا حسرت موہانی

یاد ہیں وہ سارے عیشِ با فراغت کے مزے
دل ابھی بھولا نہیں آغازِ اُلفت کے مزے

وہ سراپا ناز تھا بیگانۂ رسمِ جفا
اور مجھے حاصل تھے لُطفِ بے نہایت کے مزے

حُسن سے اپنے وہ غافل تھا میں اپنے عشق سے
اب کہاں سے لاؤں وہ نا واقفیت کے مزے

میری جانب سے نگاہِ شوق کی گستاخیاں
یار کی جانب سے آغازِ شرارت کے مزے

یاد ہیں وہ حسن و اُلفت کی نرالی شوخیاں
التماسِ عذر و تمہیدِ شکایت کے مزے

جلوۂ ہستی فزائے دلربا کی لذتیں
بیخودی ہائے دلِ مخمورِ حیرت کے مزے

یاد ہیں وہ آرزو ہائے لقائے یار میں
کشمکش ہائے شبِ تاریکِ فرقت کے مزے

شوقِ عرضِ آرزو کے وہ نرالے ولولے
فکرِ مضموں ہائے عنوانِ کتابت کے مزے

یاد ہیں وہ انتظارِ نامۂ محبوب میں
بیقراری ہائے ناکامِ طبیعت کے مزے

صحبتیں لاکھوں مری بیماریئے غم پر نثار
جس میں اُٹھے بارہا ان کی عیادت کے مزے

وہ زمانہ بھی غرض تھا کیا زمانہ لُطف کا
دِلکو جب حاصل تھے سارے عیش و عشرت کے مزے

لیک حسرت اس تغافل کیش کی بیداد نے
بدلے سب محرومیوں سے وہ محبت کے مزے

ترانۂ محبّت

وادیٔ کوہ میں وہ برف پہ چمکا جس دم
آ در کس قصد سے اُسوقت اُٹھاتے تھے قدم
آگیا پاس مرے دوڑ کے کیونکر آخر
میری وارفتگیٔ شوق سے واقف تھا مگر
مہرِ تابندہ سے جب گرم زمیں ہوتی ہے
یادِ تکلیفِ جفا کاری سرما دِل سے
مہرِ اُلفت سے تری جب سے ہُوا دل روشن
مہر سے بڑھ کے ہے خورشیدِ محبت کا چلن

ماہِ روشن کو نکلتے ہوئے دیکھا میں نے
اپنے آہُو سے بھی یہ راز چھپایا میں نے
ہو گیا قصد مرا کیسے ہرن پر روشن
آگیا کوچۂ جاناں میں جبھی تو یہ ہرن
بے دلی جوشِ مسرت سے بدل جاتی ہے
آمدِ موسمِ گرما سے نکل جاتی ہے
نہ رہا نام و نشاں رنج و الم کا باقی
اب نکل کر سوئے مغرب یہ نہ جائے گی کبھی

حسرت موہانی

پہلا سفید بال

لالہ ونائک پرشاد صاحب طالب بنارسی

اک گال پہ ہات دیئے بیٹھی. اک مہوشِ بارعنائی تھی
آئینہ آگے رکھا تھا رُخ پر حیرانی چھائی تھی
مہتاب سے مکھڑے پر اُسکے غم کی بدلی گھِر آئی تھی
سہمی سوکھی اوسان خطا مضطر ششدر گھبرائی تھی
آئینے سے چار آنکھ ہُوئی تو چوٹی کا یہ بھید کھلا
ہے ہے! اُس مہوش کے سر میں اک پہلا بال سفید ملا

گو عمر ڈھلی تھی لیکن پھر بھی سُرخی تھی رُخساروں پر — چکنائی گالوں پر چھائی۔ یا روغن تھا انگاروں پر
دو گیسو چوٹ کیا کرتے تھے کاکل کے بیماروں پر — تھے جتنے خال سیہ تن میں سب چشمک زن تھے تاروں پر
چہرہ اُترا غیظ چڑھا اور لرزہ تن میں آیا تھا
غم چاند سے رُخ پر چھایا تھا۔ یا چاند گہن میں آیا تھا
کہتی تھی بھر کر آہ الٰہی یہ کیا ستیاناس ہُوا! — جو سنبل نافہ عنبر تھا۔ وہ سنبل آخر گھاس ہُوا!
یہ مُشک مرا کافور بنا۔ دل آج اسیرِ یاس ہُوا — لاے ہونگے کالے بالوں کے۔ اب نیا وسواس ہُوا
جو زلفِ رسا کہلاتی تھی۔ کیا اب وہ رسن کہلائیگی؟
کیا آج جوانی چل نکلی؟ کیا اب سے ضعیفی آئیگی؟
وہ گیسو جو ہمراہ ہوا کے۔ ناگن سے لہراتے تھے — وہ بال جو بچپن میں بکھرے پر اُڑ ناگن کہلاتے تھے
وہ بال بلا کے جنکے بل پر پیچ ہزاروں کھاتے تھے — اب انکی خوبی میں بل آیا جنپر سب بل بل جاتے تھے؛
اُڑ جائے انگوڑی پیری مجھکو دینے داغِ جگر آئی!
اِس میری شامِ جوانی کی کیا اتنی جلد سحر آئی!
اس لٹ میں دُنیا لٹکتی تھی۔ اوردار اسی کو کہتی تھی — مخلوق اسی کی ماری تھی اور مار اسی کو کہتی تھی
کُل مار پھرے مارے مارے۔ خونخوار اسی کو کہتی تھی — مُشکیں آشفتہ سرکش سنبل مار اسی کو کہتی تھی
جس جوبن پر مغرور تھی میں وہ کار نہ کچھ اور کام آیا
سر کا اِک بال سفید ہُوا اور مرنے کا پیغام آیا
کافر اس حلقے میں پھنس کر زنّار اسی کو کہتے تھے — نافہ عنبر ظلمات ختن۔ تاتار اسی کو کہتے تھے
اچھے اچھے اِس پر مر کر۔ بیمار اسی کو کہتے تھے — جادُوگر۔ پُرفن پیچیدہ۔ طرار۔ اِسی کو کہتے تھے
وہ کونسا ایسا دِل تھا جو اس بحر میں غرق نہ تھا؟
اس دام میں کتنے اُلجھے تھے اور اس میں سر مُو فرق نہ تھا؟
میں باغ گئی تو نرگس مجھ سے دم بھر آنکھ لڑا نہ سکی — کوئی بُلبُل میری نغمہ سنجی کے مقابل آ نہ سکی

سوسن کی زباں تعریف کی میری تاب فرا بھی لا نہ سکی دانتوں سے میرے پیش کبھی نسترن کی کسی دن چل نہ سکی
دانا بھی میرے حسنِ ادا کا شیدا اتھا دیوانہ تھا
دو گیسو دام تھے جن میں ہر رُخسار کا ہر تِل دانا تھا

کیا بال کا باندھا حُسن مرا اب چلنے کو تیار ہُوا! کیا چوٹی کے جوبن کو میرے سرتن سے انکار ہُوا!
یارب یہ کیا بدفال آیا کس دشمن کا دیدار ہُوا جو میرے سر پر چڑھ کر میری خوبی کا آزار ہُوا
ہیہات غضب! کیا مجھ کو کہیگا شوخ نگار نہ اب کوئی!
افسوس ستم! کیا مجھ کو کریگا دل سے پیار نہ اب کوئی!

کچھ سوچ کے دِلکو دھارس دیکر پھر یہ سخن لب پر لائی میں طاق ہوں اب بھی حُسن میں میرے شان میں کیا خفّنی آئی
ناحق ہے خیال خام مجھے ناحق کو طبیعت گھبرائی اک بال جو پکّا بھی تو کیا موجود ہے اب بھی رعنائی
خورشید کو دعوئے حُسن کا ہو تو چرخ سے آج اُتر آئے
مہتاب کو غرّہ ہو تو میرے آگے آئے اِدھر آئے

ناگاہ ندائے غیب آئی "ہاں اے ہوش بیزار نہ ہُو! رفتارِ زمانہ دیکھ کے چل اِس کی شناکی زنہار نہ ہو
گلزارِ جہاں میں کونسا گل ہے جو مُرجھا کر خار نہ ہو تو دِل کو اپنے ڈھارس دے بیکار الم میں خوار نہ ہو
جب زیست گھٹی اور عمر بڑھی تو اَدر بڑائی پائیگی
جو خام خرد کہلاتی تھی وہ پختہ سر کہلائے گی

جو غازہ تیری زینت تھا اب دے وہ اپنی دختر کو اپنے افشاں سے چُن دے اپنے بہو کے چہرۂ انور کو
اولاد کو اپنی پہنا دے تو اپنے سارے زیور کو اب دیکھ نہ زینتِ ابرو کو اب دیکھ تو اپنے گھر بھر کو
بیٹی بہوؤں میں بڑائی کا یہ تجھ کو آج نوید بلا
اے ہوش کیا غم ہے سر میں گر پہلا بال سفید ہُوا

شاہ اور ہم

یعنی

سرورِ قناعت

اگر شاہ ملکِ ارم کا مکیں ہے | بھرے گھر میں رنجش سے خالی نہیں ہے
ہماری طرح وہ بھی اندوہگیں ہے | اُسے فکرِ دنیا۔ ہمیں فکرِ دیں ہے

وہ اپنے الم میں ہم اپنے الم میں
رہا فرق کیا شاہ ہیں اور ہم ہیں

بظاہر سرِ شاہ پر تاجِ زر ہے | مگر باطناً روز و شب خوفِ سر ہے
وہاں قلبِ مجروح د زخمی جگر ہے | یہاں تیغ کا ڈر نہ فکرِ سپر ہے

ہم آرام میں شاہ رنج و سقم میں
یہی فرق ہے شاہ ہیں اور ہم ہیں

وہاں خوانِ نعمت مگر اشتہا کم | یہاں اشتہا پر سوالِ غذا کم
نہیں ہم کو اصلاً خیالِ سوا کم | قناعت ہمارا خزانہ۔ ہے کیا کم؟

ہم آسودہ دِل۔ شاہ حرصِ نعم میں
یہی فرق ہے شاہ ہیں اور ہم ہیں

وہاں چاپلوسی۔ تملق۔ خوشامد | خوشامد بر آمد سے بنتا سر آمد
دورنگی دلِ دوستاں کی شد آمد | وفا کی جدا مد۔ جفا کی جدا مد

نہ خوشِ مدح ہیں ہم۔ نہ مغمومِ ذم ہیں
یہی فرق ہے شاہ ہیں اور ہم ہیں

اگر شاہ کے ہاتھ میں جامِ جم ہے — یہاں اوک اپنا جو ہے کس سے کم ہے
اگر شاہ بن جائے ناز و نعم ہے — دل اپنا غنی ہے غنیمت یہ دم ہے

جو ہم میں ہے وہ شاہِ والاحشم ہیں
رہا فرق کیا شاہ ہیں اور ہم ہیں

وہ بدخواب ہیں۔ نوم شب کھو رہے ہیں — مگر پاؤں پھیلا کے ہم سو رہے ہیں
وہاں دیدۂ شاہ خوں رو رہے ہیں — یہاں اپنے آنسو گہر ہو رہے ہیں

ہم آزادِ غم سے وہ پابندِ غم ہیں
یہی فرق ہے شاہ ہیں اور ہم ہیں

کوئی شاہ بادل بلا دے تو جانیں — کوئی برق و باراں گرا دے تو جانیں
کوئی حرفِ قسمت پڑھا دے تو جانیں — مقدر کا لکھا مٹا دے تو جانیں

نہ ہم میں یہ قدرت نہ اُس ذی حشم ہیں
رہا فرق کیا شاہ ہیں اور ہم ہیں

وہاں جو فروش اور گندم نما ہیں — جو اصحابِ دولت ہیں زر آشنا ہیں
یہاں جتنے دم ساز ہیں بے ریا ہیں — نہ اہلِ غرض ہیں نہ اہلِ دغا ہیں

ہم اہلِ کرم ہیں وہ اہلِ ستم ہیں
یہی فرق ہے شاہ ہیں اور ہم ہیں

وہاں غلبۂ حرصِ کشور کشائی — یہاں ملکِ تسلیم کی بادشاہی
وہاں فرشِ سندس۔ بساطِ عنائی — یہاں بوریا مسند بے ریائی

ہم آزادۂ فکرِ دام و درم ہیں

یہی فرق ہے شاہ ہیں اور ہم ہیں

وہاں جاہ داں رشک جاہ و نعم ہے ۔۔۔ حضوری میں ہے مداح غیبت میں ذم ہے
یہاں ایک ساں حالتِ بیش و کم ہے ۔۔۔ نہ آنے کی شادی نہ جانے کا غم ہے

کھلے بند ہم ۔ شاہ قیدِ خدم ہیں
یہی فرق ہے شاہ ہیں اور ہم ہیں

وفورِ دَول میں مسرت نہیں ہے ۔۔۔ وہ مسرور ہے جو قناعت گزیں ہے
جسے فرش سنجاب سطحِ زمیں ہے ۔۔۔ اُسی کا دلِ پاک عرشِ بریں ہے

ہم اور شاہ یکساں ہوئے ہیں شیم میں
رہا فرق کیا شاہ ہیں اور ہم ہیں

یہاں نیتِ نیک تاجِ ہُدا ہے ۔۔۔ یہاں عرشِ دل سدرۃ المنتہی ہے
یہاں قلبِ قانع مسرت فزا ہے ۔۔۔ جگہ دولت عافیت سے بھرا ہے

ہم آلام داخل سمجھتے ہیں سم میں
یہی فرق ہے شاہ ہیں اور ہم ہیں

ہمیں گنجِ عرفان وادراک بس ہے ۔۔۔ نہ اللہ بس اور باقی ہوس ہے
ہوا و ہوس سے حذر ہر نفس ہے ۔۔۔ نہ ذوقِ جہاں ہے نہ شوقِ قفس ہے

ہمارے قدم ہیں تلاشِ قدم میں
یہی فرق ہے شاہ ہیں اور ہم ہیں

ثمر ہم شجر میں صدف میں گہر ہیں ۔۔۔ گہن میں اگر ہیں تو مثلِ قمر ہیں
اگر آہ و نالے میں ہیں تو اثر ہیں ۔۔۔ نہاں نیشکر میں مثالِ شکر ہیں

کسی حال میں ہم نہیں پیچ و خم میں
یہی فرق ہے شاہ ہیں اور ہم ہیں

وُہی نزع ہے اور وہی جان کنی ہے ولادت وہی ہے وُہی مُردنی ہے
جو ہم پر وُہی جانِ شہ پر بنی ہے فقط شاہ ہیں کبریا و منی ہے
ہم آہ و فغاں ہیں وہ طبل و علم ہیں
یہی فرق ہے شاہ ہیں اور ہم ہیں

مگر کوئی مغلوب ہو یا کہ غالب سیاہ بخت یا کامیابِ مطالب
جُدا ہو گیا رُوح سے جب کہ قالب برابر ہوئے دونو مطلوب و طالب
بالآخر گئے دونو یکساں عدم ہیں
رہا فرق کیا شاہ ہیں اور ہم ہیں

مامتا

مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی

بے خبر ماں! تجھ کو اُس بچے کی بھی ہے کچھ خبر؟ گود میں میری مہکتا تھا جو کل تک
گوری گوری اُس کی وُہ رنگت وُہ مکھڑا چاند سا اور وُہ صورت اسکی جس پر رات دن
کُل بلائیں لیتی تھی تو دیکھ کر اندازِ خواب آج کیوں آتا نہیں سونے پہ اسکے تجھ
اُف وہ دہشت ناک جنگل اور اندھیاری وُہ رات آہ! وُہ معصوم بچہ اور وُہ کنج
بے خبر لے دیکھ ڈر جائے نہ وُہ بچہ کہیں کیا اُسے آغوش میں لیتا ہے تیر
گیسوؤں میں جس کے کنگھی تُو نہ کرتی تھی اگر رات بھر رہنا تھا شکلِ زلف تجھ
مُو پریشاں خاک بر سر دیکھ کر اب غم نہیں مجھ پہ اس جمعیتِ خاطر کی کر
کیا ہوئی وُہ تیری اُلفت کیا ہوئی وُہ مامتا کیوں نہیں اس کے لئے دِل

سینکڑوں صدقے اُتارا کرتی تھی تو رات دن
آنکھ بھر کے دیکھنا جس کا تھا تجھ کو ناگوار

اپنے سینہ سے لگا کر تو سُلاتی تھی جسے
آج وہ ہے اور اِک کُنجِ لحد تاریک و تار

آج لپٹے ہیں اُسی میں چند کیڑے قبر کے
جس گلے میں تو نے پہنائے تھے تعویذوں کے ہار

ہڈیوں کا ایک ڈھانچا ہے اٹا سب خاک میں
ہائے وُہ پیکر جو کل تک تھا ترے زیبِ کنار

جب تری آواز سُنتا تھا مچل جاتا تھا وُہ
اب وُہ ہے اور خامُشی تو چاہے لاکھ اُسکو پکار

اِک اشارے سے کسی کے ہو گئی ہے آج بند
اُسکی وُہ آواز جو تھی روکشِ صوتِ ہزار

جس کو پہنایا تھا تو نے جامۂ گُل دوز کل
آج اُس کے تن پہ کیڑوں نے کئے نقش و نگار

زندگی میں تو ہر اک عیب و ہُنر پر تھی نظر
دیکھ لے یہ حال بھی جا کر بچشمِ اِعتبار

طائرِ دل

(غالب)

اُٹھا اک دن بگولا سا جو کچھ میں جوشِ وحشت میں
پھرا آسیمہ سر گھبرا گیا تھا دِل بیاباں میں

نظر آیا مجھے اِک طائرِ مجروح پر بستہ
ٹپکتا تھا سرِ شوریدہ دیوارِ گلستاں سے

کہا میں نے کہ او ناکام! آخر ماجرا کیا ہے؟
پڑا ہے کام تجھ کو کس ستمگر آفتِ جاں سے

ہنسا کچھ کھلکھلا کر پہلے۔ پھر مجکو جو پہچانا
تو یُوں رویا کہ جوئے خوں بہی پلکوں کے داماں سے

کہا میں صید ہوں اُسکا کہ جس کے دامِ گیسو میں
پھنسا کرتے ہیں طائر روز آکر باغِ رضواں سے

اُسی کے زلف و رُخ کا دھیان ہے شام و سحر مجکو
نہ مطلب کُفر سے ہے اور نہ ہے کچھ کام ایماں سے

بہ تپشِ غور جو دیکھا مِرا ہی طائرِ دل تھا!
کہ جل کر ہو گیا یُوں خاک اپنی آہِ سوزاں سے

مجنوں اور مجنوں کی ساس

مُسلمانوں کی علمی حالت

لِسان العصر حضرت اکبرؔ۔ الہ آبادی

خُدا حافظ مُسلمانوں کا اکبرؔ ہمیں تو اُن کی خوش حالی سے ہے یاس
سُناؤں تم کو اک فرضی لطیفہ کیا ہے جس کو میں نے زیبِ قرطاس
کہا مجنوں سے یہ لیلےٰ کی ماں نے کہ بیٹا تو کرے ایم اے اگر پاس
تو فوراً دوں بیاہ لیلےٰ کو تجھ سے بِلا دِقّت میں بن جاؤں تری ساس
کہا مجنوں نے یہ اچھی سُنائی کُجا عاشق کُجا کالج کی بکواس
بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس
یہ اچھی قدردانی آپ نے کی مجھے سمجھا ہے کوئی ہرچرن داس
یہی ٹھیری جو شرطِ وصلِ لیلےٰ تو استعفےٰ مرا با حسرت و یاس

برقِ کلیسا

تہذیب یافتہ مسلمانوں کا ایمان

رات اُس مس سے کلیسا میں ہُوا میں دوچار ہائے وہ حُسن وہ شوخی وہ نزاکت وہ بہار

زلفِ پیچاں میں وہ پیچ در پیچ کہ بلائیں بھی مرید
قدِ رعنا میں وہ چم خم کہ قیامت بھی شہید

آنکھیں وہ فتنۂ دوراں کہ گناہ گار کریں
گال وہ صبحِ درخشاں کہ ملک پیار کریں

گرمِ تقریر جسے سننے کو شعلہ لپکے
دلکش آواز کہ سن کر جسے بلبل چہکے

دلکشی چال میں ایسی کہ ستارے رک جائیں
سرکشی ناز میں ایسی کہ گورنر جھک جائیں

آتشِ حسن سے تقوے کو جلانے والی
بجلیاں لطفِ تبسم سے گرانے والی

پہلوئے حسنِ بیاں، شوخئ تقریر میں غرق
ٹرکی و مصر و فلسطین کے حالات میں برق

پس گیا لوٹ گیا۔ دل میں سکت بھی نہ رہی
سرمئے تمکین کے جس گت میں وہ گت ہی نہ رہی

ضبط کے عزم کا اس وقت اثر کچھ نہ ہوا
یا حفیظ کا کیا وِرد مگر کچھ نہ ہوا

عرض کی میں نے کہ اے گلشنِ فطرت کی بہار
دولت و عزت و ایماں ترے قدموں پہ نثار

تو اگر عہدِ وفا باندھ کے میری ہو جائے
ساری دنیا سے مرے قلب کو سیری ہو جائے

شوق کے جوش میں میں نے جو زباں یوں کھولی
ناز و انداز سے تیوری کو چڑھا کر بولی

غیر ممکن ہے مجھے انس مسلمانوں سے
بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

لن ترانی کی یہ لیتے ہیں نمازی بن کر
حملے سرحد پہ کیا کرتے ہیں غازی بن کر

کوئی بنتا ہے جو مہدی تو بگڑ جاتے ہیں
آگ میں کودتے ہیں توپ سے لڑ جاتے ہیں

گل کھلائے کوئی میداں میں تو اترا جائیں
پائیں سامانِ اقامت تو قیامت ڈھائیں

مطمئن ہو کوئی کیونکر کہ یہ ہیں نیک نہاد
ہے ابھی ان کی رگوں میں اثرِ حکمِ جہاد

دشمنِ صبر کی نظروں میں لگاوٹ پائی
کامیابی کی دلِ زار نے آہٹ پائی

عرض کی میں نے کہ اے لذتِ جاں راحتِ روح!
اب زمانے پہ نہیں ہے اثرِ آدم و نوح

شجرِ طور کا اس باغ میں پودا ہی نہیں
گیسوئے حور کا اس دور میں سودا ہی نہیں

اب کہاں ذہن میں باقی ہے براق و رفرف
ٹکٹکی بندھ گئی ہے قوم کی انجن کی طرف

ہم میں باقی نہیں اب خالدِ جانباز کا رنگ
دل پہ غالب ہے نقطِ حافظِ شیراز کا رنگ

اب نہ وُہ نعرۂ تکبیر نہ وُہ جوشِ سپاہ
سب کے سب آپ ہی پر پڑھتے ہیں سُبحان اللہ

جوہرِ تیغِ مجاہد ترے ابرو پہ نثار
نُورِ ایماں کا ترے آئینۂ رُو پہ نثار

اُڑ گئی صفوۂ خاطر سے وُہ بحثِ بد و نیک
دُو دلے ہو رہے ہیں کہتے ہیں اللہ کو ایک

موجِ کوثر کی کہاں اب ہے میرے باغ کے گرد
میں تو تہذیب میں ہوں پیرِ مغاں کا شاگرد

مجھ پہ کچھ وجہِ عتاب آپ کو اے جاں نہیں
نام ہی نام ہے ورنہ میں مسلماں نہیں

جب کہا صاف یہ میں نے کہ جو ہو صاحبِ فہم
تو نکالو دلِ نازک سے یہ شبہ اور یہ وہم

میرے اسلام کو اِک قصۂ ماضی سمجھو
ہنس کے بولی کہ تو پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو

خان بہادر

جلوۂ دربار

سر میں شوق کا سودا دیکھا
دہلی کو ہم نے بھی جا دیکھا

جو کچھ دیکھا اچھا دیکھا
کیا بتلائیں کیا کیا دیکھا

نظم ہے مجھ کو بادۂ صافی
خیر اب دیکھئے لطفِ قوافی

جمنا جی کے پاٹ کو دیکھا
اچھے سُتھرے گھاٹ کو دیکھا

سب سے اُونچے لاٹ کو دیکھا
ڈیوک اوف کناٹ کو دیکھا

پلٹن اور رسالے دیکھے
گورے دیکھے کالے دیکھے

سنگینیں اور بھالے دیکھے
بینڈ بجانے والے دیکھے

خیموں کا اِک جنگل دیکھا
اُس جنگل میں منگل دیکھا

بڑھا اور ورنگل دیکھا — عزّت خواہوں کا دنگل دیکھا
سڑکیں تھیں ہر کمپ سے جاری — پانی تھا ہر پمپ سے جاری
نور کی موجیں لمپ سے جاری — تیزی تھی ہر جیپ سے جاری
کچھ چہروں پر سردی دیکھی — کچھ چہروں پر زردی دیکھی
سردی کی نیرنگی دیکھی — محفل میں سارنگی دیکھی
بے رنگی بارنگی دیکھی — دہر کی رنگا رنگی دیکھی
اچھے اچھوں کو جھٹکا دیکھا — بھیڑ میں کھاتے جھٹکا دیکھا
منہ کو اگرچہ لٹکا دیکھا — دل دربار سے اٹکا دیکھا
ہاتھی دیکھے بھاری بھرکم — اُن کا چلنا کم کم تھم تھم
زرّیں جھولیں نور کا عالم — میلوں تک وہ چم چم چم چم
پُر تھا پہلوئے مسجد جامع — روشنیاں تھیں ہر سُو لامع
کوئی نہیں تھا کسی کا سامع — سب کے سب تھے دید کے طامع
سُرخی سڑک پہ گُھٹتی دیکھی — سانس بھی بھیڑ میں گُھٹتی دیکھی
آتشبازی چھٹتی دیکھی — لُطف کی دولت لٹتی دیکھی
چوکی اک جو لکھی دیکھی — خُوب ہی چکھتی پکھتی دیکھی
ہر سُو نعمت رکھی دیکھی — شہد اور دُودھ کی مکھی دیکھی
ایک کا حِصّہ منّ و سلوا — ایک کا حِصّہ تھوڑا سا حلوا
ایک کا حِصّہ بھیڑ اور بلوا — میرا حِصّہ دُور کا جلوا
اوج ہر برٹش راج کا دیکھا — پرتو تخت و تاج کا دیکھا
رنگِ زمانہ آج کا دیکھا — رُخ جارج مہراج کا دیکھا
پہنچے چاند کے سات سمندر — تحت ہیں اُن کے بیسیوں بندر

حکمت و دانش اُن کے اندر — اپنی جگہ ہر ایک سکندر
اوج بخت ملاقی اُن کا — چرخِ ہفت طباقی اُن کا
محفل اُن کی ساقی اُن کا — آنکھیں میری - باقی اُن کا
ہم تو اُن کے خیر طلب ہیں — ہم کیا ایسے ہی سب کے سب ہیں
اُن کے راج کے عمدہ ڈھب ہیں — سب سامانِ عیش و طرب ہیں
اِگزِبشن کی شان انوکھی — ہر شئے عمدہ ہر شئے چوکھی
اُقلیدس کی ناپی جوکھی — من بھر سونے کی لاگت سوکھی
جشنِ عظیم اس سال ہُوا ہے — شاہی فورٹ میں بال ہُوا ہے
روشن ہر اک ہال ہُوا ہے — قصّۂ ماضی حال ہُوا ہے
ہے مشہُورِ کوچۂ و برزن — ہال میں ناچیں لیڈی کرزن
طائرِ ہوش تھے سب کے پرزن — رشک سے دیکھ رہی تھی ہرزن
ہال میں چمکیں آ کے یکایک — زرّیں تھی پوشاک جھکا جھک
محو تھا اُن کا اَوجِ سما تک — چرخ پہ زہرہ اُن کی تھی گاہک
گو رقاصہ اَوجِ فلک تھی — اس میں کہاں یہ نوک پلک تھی
اِندر کی محفل کی جھلک تھی — بزمِ عشرت صبح تلک تھی
کی ہے بندش ذہن رسا نے — کوئی مانے خواہ نہ مانے

سُنتے ہیں ہم تو یہ افسانے
جس نے دیکھا ہو وہ جانے

اندھی پھول والی کا گیت

سید مہدی حسن صاحب احسن لکھنوی

گود میں مالن کے ہیں ٹوٹے ہوئے ڈالی کے پھول — تو خریدار و یہ اندھی بیچنے والی کے پھول

تم ہو جس دُنیا کے ساکن نور کی دُنیا ہے وہ — عالمِ ظلمات۔ مجھ مجبور کی دُنیا ہے وہ

ہو مبارک تم کو دُنیا کے نظارے دیکھنا — دِن کو نورِ مہر۔ شب کو چاند تارے دیکھنا

مَیں وہاں ہوں ہے اندھیرا گھُپ جہاں چھایا ہُوا — ہے تصوّر اس سیاہ خانہ میں گھبرایا ہُوا

تم کو قدرت نے عطا کی قوّتِ نظّارگی — اَور مَیں محروم قدرت بندگی بےچارگی

نظمِ دنیا کا ہے جامِ جم تمہارے واسطے — تم ہو عالم کے لئے عالم تمہارے واسطے

فلسفہ قدرت کا ان پھولوں میں دکھلاتی ہوں میں — ان میں جو جو خوبیاں ہیں تمکو سمجھاتی ہوں میں

طفلِ غنچہ بڑھ کے یہ آزادِ گُل بوٹے ہوئے — آگئے ہیں اپنی ماں کی گود سے چھوٹے ہوئے

وہم ہے نقش و نگارِ گُل غلط ہے یہ گماں — عارضِ گل پر ہیں پیاری ماں کے بوسوں کے نشاں

باعثِ عبرت ہے ان کا عالمِ افسردگی — مادرِ گیتی سے چھٹ کر پائی ہے پژمردگی

نازبردارِ چمن ہیں یہ جوانانِ چمن — حُسن کی دُنیا کے ساکن ہیں یہ یارانِ چمن

دستِ گلچیں سے حفاظت دلیں تھے ٹھانے ہوئے — خارِ گلشن ہر طرف تھے برچھیاں تانے ہوئے

جب ہوئے پُورے جواں تو ہو گئے عاشق مزاج — اب خود اُن کو صاحبانِ حُسن کی ہے احتیاج

آرزو یہ ہے کسی کی طرّۂ دستار ہوں — خواہشیں یہ ہیں حسینوں کے گلے کا ہار ہوں

باوفا خود ہیں یہ اَور ہر حال میں دلسوز ہیں — اَور حسینوں کو اتالیقِ وفا آموز ہیں

ہمدمِ راحت بھی ہیں اَور غمگسارِ غم بھی ہیں — رونقِ شادی۔ شریکِ محفلِ ماتم بھی ہیں

صرفِ بزمِ عیشِ معشوقِ ستم ایجاد بھی
اَور کبھی زیبِ مزارِ عاشقِ ناشاد بھی
لو خریدارو چلو یہ بے رُخی اچھی نہیں
رات بھر کی ہے یہ رونق صبح کو کچھ بھی نہیں
خندہ زن ہیں ایک شب کی زندگانی کیلئے
اپنے گھر لے جاؤ اُن کو میہمانی کے لئے

داغِ جگر

اے انقلابِ عالمِ فانی ہزار حیف
اے اعتبارِ فصلِ جوانی ہزار حیف
باقی رہے ہیں سینہ میں اشک دل و جگر
اے تابِ ضبطِ سوزِ نہانی ہزار حیف
یہ کیا ہُوا کہ خشک ہیں دامان و آستیں
اے ذوق و شوقِ اشک فشانی ہزار حیف
ہے آمد و شدِ نفسِ تنگِ دل خراش
اِس پر یہ سنگِ غم کی گرانی ہزار حیف
کیا ہو گئی وُہ لذّتِ تقریر کیا ہُوا
کیا ہو گئی وُہ سحر بیانی ہزار حیف
دیتا ہے کون دادِ ستم ہائے آسماں
سُنتا ہے کَون غم کی کہانی ہزار حیف
اندازِ دل فریبیٔ دُنیا ہزار تف
ارمانِ عیش و لذّتِ فانی ہزار حیف
اے آرزوئے عالمِ اسباب صد دریغ
اے حرصِ تاج و تخت کیانی ہزار حیف

اُمید وار کان صدائے درا کے ہیں
دُنیا کے رہنے والے مسافر سرا کے ہیں

شور فغاں میں جو اثرِ نفخ صُور تھا
تھا بزرا روزِ مرگ کہ یوم النشور تھا
جب یہ سُنا کہ آج زمانہ میں تم نہیں
دِل میں نہ تھا سرور نہ آنکھوں میں نور تھا
رہتے تھے میرے گھر میں جو ذرّاتِ روشنی
اے شمعِ حُسن سب یہ تمہارا ظہور تھا

ثابت ہؤا وہ شب تھی تمہاری شبِ وفات — جس رات بے قرارِ دِلِ ناصبُور تھا
ہنگامِ نزع حسرتِ دیدار رہ گئی — مجبُور تھا کہ تم سے مَیں کم بخت دُور تھا
مشتاق رہ گیا ہے غریب الوطن پدر — اِک بار اُس کو شکل دِکھانا ضرور تھا
ہو جائیگا شمار میرے دل کے داغ سے — جو عمر میں حساب سنین و شہُور تھا
اے شمع صبح تک تیری رونق کہاں رہی — اِس ہستیٔ قلیل پہ کتنا غرُور تھا

دُنیا کا لُطف تیری جدائی میں کچھ نہیں
جب تُو نہیں تو ساری خدائی میں کچھ نہیں

دم توڑ دو تم اور آنکھ سے دیکھا کرے کوئی — پتھر کا کس طرح سے کلیجہ کرے کوئی
جب تم بھی آنکھ پھیر لو ناشاد باپ سے — پھر بے نوا کس کا بھروسا کرے کوئی
ہے زندگی میں موت کا دھڑکا لگا ہؤا — کیا قدر دلفریبیٔ دُنیا کرے کوئی
نازک مزاج تم سا جو مل جائے خاک میں — پھر خاک زندگی کی تمنا کرے کوئی
آنکھیں میری ہیں کیوں میں نہ رؤوں کسی کو کیا — کیوں مجھ سے ضبطِ غم کا تقاضا کرے کوئی
کیوں مجھ کو صبر کی ہو ہدایت میں کیوں سنوں — کیوں میرے اضطراب کو روکا کرے کوئی
مجھ کو نہیں تحمّلِ احسانِ چارہ ساز — کیوں میرے دردِ دل کا مداوا کرے کوئی
تاخیر کیوں نزولِ بلا میں ہے کیا ہؤا — اب کب تک آسمان کو دیکھا کرے کوئی

ممکن نہ تھا یہ جبر کبھی اختیار میں
پر دخل کیا مشیّتِ پروردگار میں

جز مرگ اب تو دِل میں کوئی آرزو نہیں — افسوس ہم جہان میں ہیں اور تُو نہیں
میں مر ہی جاؤنگا جو لگے گی ذرا سی ٹھیس — اے چارہ گر خدا کے لئے زخم چھُو نہیں
کیا تھی خبر قضا کا فرشتہ ہے گھات میں — ہم جانتے تھے کوئی ہمارا عدو نہیں
پاؤں پہ گر کے کرتے سفارش عدو سے ہم — پر کیا کریں کہ اُس میں مروّت کی خو نہیں

کیا ڈھونڈتے ہیں اشک جو بہتے ہیں خاک میں — پر بھی کھو گئے تم کہ پری جستجو نہیں
کیسی ہوا چلی ہے گلستانِ دہر میں — پھولوں کو سونگھئے تو محبت کی بو نہیں
دیوانہ ہو گئے ہیں یہ کم بخت چارہ ساز — میرے جگر کے زخم ہیں جائے رفو نہیں
گردش نے آسماں کی ملایا ہے خاک میں — پھر کیونکر اس کے دور پہ کیجے تفو نہیں

پہلو میں لے کے میرے عبادت گذار کو
کیا آج ناز ہوگا زمینِ مزار کو

کیونکر بسر ہو زیست کہ چارہ نہیں رہا — جب تم نہیں تو کوئی ہمارا نہیں رہا
ہوگی وطن میں جا کے کبھی دید و بازدید — اتنا بھی اب تو ہم کو سہارا نہیں رہا
چمکیں فلک پہ روز ستارے تو کیا غرض — جب تو ہماری آنکھ کا تارا نہیں رہا
چھائی ہوئی ہے بزمِ جہاں پہ فسردگی — آخر یہ کون انجمن آرا نہیں رہا
سر کیا کروں کہ سر میں وہ سودا کہاں ہے اب — دل کیا کروں کہ اب وہ دل آرا نہیں رہا
غنچے فسردہ ہو گئے بادِ سموم سے — باغِ جہاں میں اب وہ نظارا نہیں رہا
دنیا اگر ہو محو تواضع تو کیا خوشی — بے تیرے لطفِ لطف و مدارا نہیں رہا
اللہ تو مجھے بھی اٹھا لے تو خوب ہے — اب مجھ میں غم اٹھانے کا یارا نہیں رہا

ہے ہے ابھی جہاں سے گذرنے کے دن نہ تھے
یہ کھیلنے کی فصل تھی مرنے کے دن نہ تھے

تاریک ہو گیا ہے زمانہ نگاہ میں — یا رب ہے کس بلا کا اثر دودِ آہ میں
اے حاملانِ میتِ معصوم دیکھنا — آنکھوں کا فرش ہم نے بچھایا ہے راہ میں
آخر ہوا عروجِ جوانی پیامِ مرگ — نقصان ہے۔ کمال جو پیدا ہو ماہ میں
اے روشنئ داغِ جگر تو نے کیا کیا — دھبّہ لگا دیا مرے روزِ سیاہ میں
کُنجِ مزار میں تمہیں کس طرح چین آئے — راحت کہاں ملی مہِ کنعاں کو چاہ میں

اہلِ عزا کا کس نے کلیجہ ہلا دیا — کیسا اثر ہے اَشْہَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ میں
احسن و فورِ گریہ نے عصیاں کو دھو دیا — کچھ بھی نہیں رہا مری فردِ گناہ میں
عہدِ وفا کو اہل مروت نہ توڑتے — رخنہ اجل نے ڈال دیا ہے نباہ میں

آلودہ گو کہ خاک ہیں جسم نفیس ہے
تُربت غریب قبرِ جناب نفیس ہے

بس اے ہجوم حسرت و غم آہ الغیاث — باقی نہیں ہے چشم میں نم آہ الغیاث
گر بیٹھنے کا قصد کروں بیٹھ جائے دل — اُٹھنے میں کانپتے ہیں قدم آہ الغیاث
بے راحلہ پہ سخت سفر اور یہ بے کسی — ہے ہے مسافرانِ عدم آہ الغیاث
اہلِ وفا میں طرز تغافل ہزار حیف — اہلِ کرم میں شیوۂ رم آہ الغیاث
بیتابی و طپش. قلق و اضطراب و درد — اک جانِ ناتواں پہ ستم آہ الغیاث
تم کو جوان ہونے سے پہلے ہی موت آئی — زندہ رہے جہان میں ہم آہ الغیاث
حوریں شریک ماتمِ مرگِ جواں ہیں آج — کہتے ہیں اہلِ خلد بہم آہ الغیاث
اے یادگارِ احسنِ خستہ جگر دریغ — اے وجہِ حسرتِ لب دم آہ الغیاث

افراطِ حزن مانع آرام و خواب ہے
احسن بھی اب مسافرِ پا در رکاب ہے

(حسن سنبھلی)

ہلالِ عید

لالہ تلوک چند صاحب محروم

دیکھو! دیکھو!! وہ میں نے دیکھ لیا — قلّۂ کوہ سے ذرا اُونچا!

چھپ گیا چھپ گیا کہیں دیکھو! پھر نظر آئے گا وہیں دیکھو!
وہ جو ہے سامنے شجر دیکھو! اِس سے اُوپر اُٹھا نظر دیکھو!

اے لو! اے لو! وہیں نظر آیا
مژدہ اے دوستو! نظر آیا

مرحبا اے ہلالِ شامِ سعید لے کے آیا ہے تو بشارتِ عید
مخبرِ صبحِ عیش و عشرتِ عید! تجھ سے وابستہ ہے سعادتِ عید
مژدۂ عید ایک شب پہلے لائے گا۔ جانتے تھے سب پہلے
پر یہ تھی انتظار کی صورت کہ نہ دیکھی قرار کی صورت!
تھا تری جستجو میں ہر یک نظر دشتِ چرخِ بریں میں محوِ سفر
کہ یکایک کرم کیا تو نے اپنا چہرہ دکھا دیا تو نے!
تو کفیلِ نشاطِ عالم ہے باعثِ انبساطِ عالم ہے
تو عجب شے ہے میکشوں کے لئے کشتیٔ مے ہے میکشوں کے لئے

دُور سے یہ ترا اشارہ ہے
اوج پر عیش کا ستارہ ہے

واہ اے شاہدِ کماں ابرو! کِس ادا سے تنا ہُوا ہے تو
خود نمائی بھی ہے۔ ادا بھی ہے! اِس پہ پھر کاہشِ ہوا بھی ہے۔
یہ ترا بانک پن۔ یہ رعنائی بزمِ بالا میں خلوت آرائی
ہے سزاوار تجھ کو ناز و غرور کھینچ بے شک تو اپنے آپ کو دُور
سارا عالم ہے تیرا شیدائی سب کو دیکھا ترا تماشائی
تھی زمانے کو جستجو تیری محفلوں میں تھی گفتگو تیری
چشمِ بد دُور کیا نزاکت ہے تجھ پہ بارِ نظر بھی آفت ہے

یُوں عیاں ہے شفق کے دامن میں | جیسے مہرو ہو کوئی گلستاں میں
یا کوئی جیسے غنچۂ نازک | زینتِ دستِ دلبرِ نازک
خونِ عاشق سے سُرخرو ہو کر | ناز کرتا ہو اپنی جُرّتش پر!
یا کوئی جیسے نقرئی کشتی | قلزمِ سُرخ پر ہو تیر رہی
اِک جہاں اُس کا ہو تماشائی | کرتی جائے وُہ بحر پیمائی
رفتہ رفتہ نظر سے غائب ہو | تکتے رہ جائیں لوگ سب اُس کو

اے لو سچ مچ وُہ صُورتِ زورق
ہو گیا گُم میانِ شام و شفق

تُربتِ جاناں

سیّد غلام بھیک صاحب نیرنگ

ہوائیں ہو گئیں خاموش۔ وقتِ شام آپہنچا | اندھیرا چھا گیا ہر سمت عالم ہے خموشی کا
نہیں پائے صبا تک کی ذرا آہٹ گلستاں میں | اسی عالم میں آنکلا ہوں میں شہرِ خموشاں میں
دلِ مہجور میں اک لالہ زارِ داغ لایا ہوں | میں اپنے گُل کی تُربت پر چڑھانے پھول آیا ہوں

اب آرمیدہ ہے اس تنگ کاشانے میں وہ مٹی | شرارِ زندگی کل جس کے ذرّوں سے چمکتی تھی
غضب ہے ایسے حسن و ناز کا صیدِ قضا ہونا | بایں اوصافِ محبُوبی تہِ تیغِ فنا ہونا!

قضا اُس گلبدن پر رحم کھا کر کاش ٹل جاتی!
خدا کے حکم سے تحریرِ قسمت کی بدل جاتی!
تو گورستاں میں یوں دُکھڑے نہ رونا میں حزیں ہو کر
نہ کہتا مرثیہ یوں آج میں اندوہگیں ہو کر

مگر رونے سے کیا حاصل؟ وہ روحِ نور تو یاں سے
گئی اُڑ کر کہیں اونچی مہ و صدیر درخشاں سے
ملائک لے گئے باچشمِ گریاں اُس کو جنت میں
جہاں نیکوں کی روحیں تا ابد رہتی ہیں راحت میں

یہ جرأت کس طرح سے ہو سکے انسانِ فانی کو
کہ دے الزام خالق کے نظامِ جاودانی کو
سرِ تسلیم رکھوں گا سدا خاکِ اطاعت پر
سدا راضی رہوں گا اپنے مالک کی مشیّت پر

مگر دل کو برابر دُھن ہے اُس گُل کے محاسن کی
رہے گی یاد اُس کے حسنِ ظاہر حسنِ باطن کی
اسی کی یاد میں اشکِ محبت میں بہاتا ہوں
تصوّر کو اُسی کے تختِ دل پر میں بٹھاتا ہوں

خار

تُو سمجھتا ہے کہ اِس باغ میں بیکار ہوں میں؟
محض بیکار ہی کیا موجبِ آزار ہوں میں؟
تُو نے دیکھا ہے مجھے دیدۂ عبرت سے کبھی؟
قدر پوچھی ہے مری اہلِ بصیرت سے کبھی؟
مُلکِ ہستی میں کوئی شے کہیں بے سُود بھی ہے؟
جلوۂ حسن کسی چیز میں محدود بھی ہے؟
کِلکِ قدرت نے لکھی ہے کوئی شے بے مطلب؟
اِس مسدّس[1] میں کوئی لفظ بھی ہے بے مطلب؟
نورِ خورشید کا ہر ذرہ میں ہے راز چھپا
موج دریا کا ہے ہر قطرے میں انداز چھپا

[1] یہ نظم بطورِ مسدّس لکھی گئی جس کے ہر بند چھ چھ مصرع ہیں جس سے دنیا کی شش جہت سے مراد ہے۔

ایک قانون کے تابع ہیں شجر ہو کہ حجر
تو گل و خار میں کرتا ہے تمیز بیں قائم
کس جگہ حُسن کے آئین کا اظہار نہیں؟
آہ کیا چشمِ مشاہد کی ہے کوتہ نظری!
دیکھئے حُسنِ تناسب کا نمونہ ہُوں میں!
ہے دل افروز میری نوکِ سناں کی سی چمک
رنگ ہر شاخ پہ پاؤگے نرالا میرا
نگہ حُسن طلب دیکھے تو رعنا ہُوں میں
رونق افروز ہے گُل باغ میں زینت کیلئے
دامنِ اہلِ تطاول میں اٹک جاتا ہُوں
نہیں آزار دہی خلق کا شیوا میرا
توڑ لینا گلِ تر کا کوئی آسانی ہے؟
گل کو وہ اپنی غرض کے لئے برباد کرے
راہ رَو سے نہیں صحرا میں کبھی مجھ کو خلش
خود ہی مجھ خاک نشیں کو وہ کچل ڈالے اگر
سینکڑوں مور و ملخ گو وہ کچل دیتا ہے
اس سے نیند سے رہرو کو جگانا مقصود
اس سے کیا بڑھ کے کروں کام میں انسانوں کا

ایک سانچے میں ڈھلے ہیں کرۂ خاک و قمر
دیکھ اُس آئین کو جس سے ہیں یہ چیزیں قائم
گُل ہی گُل باغ جہاں میں ہے کہیں خار نہیں؟
جس سے مستعد میرے حُسن کی ہے جلوہ گری
کیا دلاویز ہُوں کیا شوخ نکیلا ہُوں میں
میری تشبیہہ پہ اترائے حسینوں کی پلک
روپ ہر نخل پہ دیکھوگے انوکھا میرا
دل میں ہر رنگ میں ہر روپ میں کھبتا ہُوں میں
ہیں چمن زار میں ہُوں گل کی حفاظت کیلئے
دیدۂ حاسد گلچیں میں کھٹک جاتا ہُوں
پھر بھی گلچیں کی مدارات ہے عہدہ میرا
باغ میں یوں ہی تباہی کی ہوا آئی ہے
کیوں نہ بندہ عملِ نشترِ فصّاد کرے؟
ہاں اگر بھائے اُسے آپ ہی غفلت کی روش
تو کبھی اُس کو بتاتا ہُوں سلامت کی ڈگر
یُوں ہی چٹکی سی کبھی بندہ بھی لے لیتا ہے
قدر ہے خاک نشینوں کی بتانا مقصود
ہیں نگہبان ہوں کھیتوں کا کھیانوں کا

یُوں مری قدر کو جانے کہ نہ جانے کوئی
میرے احسان کو مانے کہ نہ مانے کوئی

انتظارِ عید

کہتے ہیں آج عید ہے، اپنی بھی عید ہوتی
ہم کو اگر میسر جاناں کی دید ہوتی

قیمت میں دیدِ رخ کی ہم نقدِ جاں لگاتے
بازارِ ناز لگتا دل کی خرید ہوتی

کچھ اپنی بات کہتے کچھ میرا حال سنتے
ناز و نیاز کی یوں گفت و شنید ہوتی

جلوے دکھاتے جاتے وہ طرزِ دلبری کے
اور دل میں یاں ہوائے نارِ مزید ہوتی

تیغِ نظر سے دل پر وہ وار کرتے چلتے
اور لب پہ یاں صدائے ہل من مزید ہوتی

ابرو سے اُن کے غمزہ تیرِ ادا لگاتا
یہ دل قتیل ہوتا وہ جاں شہید ہوتی

کچھ حوصلہ بڑھاتا اندازِ لطفِ جاناں
کچھ دغدغہ سا ہوتا۔ کچھ کچھ اُمید ہوتی

لیکن یہاں تو حرماں ہے ثمرۂ تمنا
کیوں قفلِ آرزو کی پیدا کلید ہوتی

آنکھیں ترس رہی ہوں جب اُسکی اِک جھلک کو
نیرنگ منتظر کی کیا خاک عید ہوتی

(نیرنگ)

انجامِ محبت

(حرماں نصیب گلیٹ[1] زبانِ حال سے)

مجھ سے پوچھے کوئی انجامِ محبت کے مزے
بادۂ حرماں کی لذت جامِ حسرت کے مزے

مجھ پہ احساں کر گئی وعدہ فراموشی تری
بیوفائی نے ہی دکھلائے شہادت کے مزے

کوہکن بھی داستاں کو میری سُن کر بول اٹھے
کاہے کو چکھے تھے ہیں نے یہ مصیبت کے مزے

گو سراپ آرزو تھا تیرا پیمانِ وفا
پر ملے دھوکے ہیں بھی ہم کو حقیقت کے مزے

آہ اُمیدِ حصولِ مرہمِ مقصود میں
لُوٹے ہیں کیا کیا مزے دل نے جراحت کے مزے

ذائقہ دردِ محبت کا تن آسانوں کو کیا
جانتے ہیں اہلِ ہمت ہی مصیبت کے مزے

بحرِ اُلفت میں تھا طوفانِ شدائد کا خطر
سب بھلا دیتے تھے پر اُمیدِ راحت کے مزے

بے وفا یارِ ستم پیشہ اگر نکلا تو کیا
کم نہیں راہِ وفا میں استقامت کے مزے

جامِ وصلت سے نہیں کم مجھ سے حرماں دوست کو
یہ خمارِ نشۂ صہبائے اُلفت کے مزے

بوالہوس کو ہی مبارک وعدۂ الفت ترا
ہم اُٹھائیں گے بس اب ایثار و غیرت کے مزے

جان دیں گے اب تو قعرِ بحرِ ناکامی میں ہم
پائیں گے گمنامی مرقد میں شہرت کے مزے

چھوٹ گئے اُمید کے پھندوں سے اب یہ زنگ تم
یاس نے ہم کو دیئے عیش و مسرت کے مزے

---

[1] مغرب کے لاثانی فسانہ نگار وکٹر ہیوگو کے فسانہ "ٹوائلرز آف دی سی" کو ختم کرکے راقم کے دل میں ان خیالات نے خود بخود ہجوم کیا۔ گلیٹ ایک حسینہ پر عاشق ہے۔ اس حسینہ کے چچا کا جہاز کہیں دُور سمندر میں ٹوٹ کر غرق ہوگیا ہے یہ چچا ہی اُس حسینہ کا سرپرست بلکہ بمنزلہ پدر ہے وہ اور اِسکا چچا وعدہ کرتے ہیں۔ کہ جو کوئی اس شکستہ جہاز کے انجن کو سمندر سے نکال لائے اس سے حسینہ کی شادی ہو۔ گلیٹ اِس شرط کو منظور کرکے دو ماہ کی لاتعداد مصائب جھیل کر انجن کو تن تنہا نکال لاتا ہے۔ مگر اس اثنا میں وہ حسینہ اپنا دل ایک اور کو دے بیٹھی ہے گلیٹ یہ دیکھ کر اپنے ہاتھ سے اپنے رقیب کی شادی اس حسینہ سے کرا کر خود سمندر میں ڈوب مرتا ہے۔

زمزمۂ نشاط

جناب سید اعجاز حسین صاحب بی۔اے

زندگی مزے کی ہے۔ لطفِ جاں اُٹھائے جا
حملہ ہائے فکر و غم۔ ہوں اگرچہ دمبدم
ظلمِ دُشمناں سہی۔ جورِ دوستاں سہی
داغِ رفتگاں سہی۔ سوزشِ نہاں سہی
ماجرائے حسن و عشق۔ خارِ دل اگر بنے
زندگی کہیں جسے۔ وُہ نہ سیلِ آب ہے
شب زیادہ شمع کم ہے اگر تو کیا ہے غم
مغتنم ہے مافیا۔ فرصتِ انبساط کی
ما مضٰی پہ خاک ڈال۔ کل پہ چھوڑ کل کا حال
جو ہُوا وُہ ہو چکا۔ عاقبت کی خبر کہا
میری جانِ عندلیب۔ بامِ شاخسار سے

لطفِ جاں اُٹھائے جا۔ یہ مزے اُڑائے جا
وار سب بچائے جا۔ فکر و غم ٹلائے جا
رشکِ رازداں سہی۔ بھول جا بُھلائے جا
داغ یہ چھپائے جا۔ آگ یہ بُجھائے جا
دل سے تو نکال پھینک۔ یہ خلش مٹائے جا
بہ چل اور بہائے جا۔ بہ چل اور بہائے جا
جب تلک کہ چل سکے۔ بیدھڑک جلائے جا
پی بھی اور پلائے جا۔ پی بھی اور پلائے جا
جام و شیشہ اب سنبھال۔ دور یہ چلائے جا
آج ہے بڑا مزا۔ یہ مزا اُڑائے جا
تختِ نو بہار سے۔ فرطِ انبساط سے
مستیٔ نشاط سے۔ خوب چہچہائے جا
خوب چہچہائے جا۔ فصلِ گل منائے جا
فصلِ گل منائے جا۔ راگنی سنائے جا
محوِ نغمۂ طرب۔ تو مجھے بنائے جا
راگ رنگ مل گئے۔ میں سنوں تو گائے جا

تیری زندگی ہے راگ۔ میری زندگی ہے رنگ

گائے جا بجائے جا۔ خوب چہچہائے جا
مستِ نغمۂ نشاط۔ تو مجھے بنائے جا

اے خیالِ ابتدا۔ اے خیالِ انتہا
اے خیالِ احتیاط۔ اے خیالِ انبساط
اے خیالِ معصیت۔ اے خیالِ معدلت
اے ہوائے آرزو۔ اے امید وبیم د تو

دو گھڑی تو چین لے۔ اتنا مت ستائے جا
اتنا مت ستائے جا۔ ہوش مت اڑائے جا

گل چمن دکھائے جا۔ سبزہ لہلہائے جا
ہائے وہ تو اُڑ گئی۔ لو یہ کیا سُنا گئی
بے طلب تو ہاتھ آئے۔ اور طلب سے بھاگ جائے
خدمتِ خدا وخلق۔ ہے نشاطِ زندگی

میری پیاری عندلیب۔ تو بھی چہچہائے جا
جستجوئے عیش میں۔ عمر مت گنوائے جا
اشتیاق انبساط۔ دل سے تو بھلائے جا
اسمیں اپنا جان ومال۔ شوق سے لگائے جا

اعجاز حسین بی۔ اے

حالی

صادق علی خاں صادق

کوئی نہ تھا جو بنے ملکِ شعر کا والی ‏ دکھائے جو ہر فکرِ طبیعتِ عالی
پڑی تھی شاہدِ بزمِ سخن کی جا خالی ‏ زمانہ دیر سے تھا منتظر ترا حالی

بیا کہ فرش رہت دیدہ ہائے مشتاقاں
نوائے نغمۂ تو جاں گداز غم ناکاں

اُٹھا کے بربطِ بالینِ سعدیٔ شیراز پڑے ہوئے جسے گذرے تھے سالہائے دراز
گئے تھے جس کو بجانے کا بھول سب انداز پھر اس ادا سے ہوا اس پہ تو ترانہ نواز
کہ آتے جاتے کو شیدا بنا لیا تو نے
فسوں سا خلقِ خدا پر چلا لیا تو نے

جگر نشیں ہیں ترے تیر نالۂ موزوں تری نوائیں ہیں برقِ قرارِ صبر و سکوں
ہے زخم زخمہ پہ ایک ایک والہ و مفتوں خمِ شراب ہیں ساقی نے کھول دی افیوں
کہ مستِ جامِ تو تنہا نہ مے گسار انند
خرابِ بادۂ ناب تو ہوشیار انند

ہیں حرف حرف میں تیرے چھپے ہوئے نشتر ہیں لفظ لفظ ہیں گویا بجھے ہوئے خنجر
دلِ اُسکا چھیدتے ہیں چاٹتے ہیں اُسکا جگر ہوئی پکار کہ بزمِ طرب بنی محشر
"کسے نہ ماند کہ دیگر بہ تیغِ ناز کُشی"
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کُشی

صدائے رعد سے بھی تھے نہ چونکنے والے شرابِ لذتِ خوابِ سحر کے متوالے
مگر اُٹھائے جگر دوز تو نے جب نالے تو پڑ گئے دلِ فولاد میں بھی تب چھالے
ز خوش نشیں شد و یک یک تپاں ز جا برخاست
کہ شورِ صورِ سرافیل حالیا برخاست

ترا کلام ہے تفسیرِ دردِ اہلِ جہاں ہے شرحِ رازِ حقیقت ہر ایک تیرا بیاں
شعاعِ مہرِ معانی ہے یہ ترا دیواں ضیائے مردمکِ دیدۂ سخن داناں
ہمیشہ بزم میں باقی رہیگی ضو اُس کی
رہیگی زندہ دلوں کے دلوں میں لَو اُسکی

غزل میں ہے وہ تصوف وہ سوز او گداز ہے مستِ صوفیٔ صافی دِ رِندِ محرمِ راز

دکھایا اُردو میں حافظ کا ہو بہو انداز بھرا ہے شیشۂ ہندی میں بادۂ شیراز

زلالِ چشمۂ حیواں زخامہ ات بچکید

کہ رُوح در تنِ قومِ فسردہ جاں رسید

چمن میں طوطئ ہندوستاں ہے گرمِ سخن کہاں ہے شورشِ آوازِ نالۂ بے زن

زبانِ ہند زبانِ جہاں اگر ہو جائے تری نواؤں سے تسخیر بحر و بر ہو جائے

زمینِ شعر میں تازہ چمن لگائے ہیں اور اُن میں طرفہ مضامیں کے گل کھلائے ہیں

نگاہِ صادقِ مشتاق میں سمائے ہیں ہزار طرح ہزاروں نے خار کھائے ہیں

نہ وُہ رہیں گے زمانے میں اور نہ تو حالی

رہیں گے تیرے گلستاں میں رنگ و بو حالی

بُلبلِ شیدا

خان احمد حسین خاں صاحب بی اے

اے عندلیب باغ میں گُل چیں ہزار ہو پونچھ آنسوؤں کو تیری بلا بے قرار ہو

آ صبر تیری گردنِ نازک کا ہار ہو اور موسمِ بہار بھی تجھ پر نثار ہو

ہاں فصلِ گُل میں گل سے جو تجھ کو جدا کرے

وُہ بھی مُراد اپنی نہ پائے خدا کرے

آ عندلیب نغمۂ مرچنگ فال ہو آ خال بن کے زیورِ رُخسارِ حال ہو

آ رنگ بن کے رونقِ چشمِ غزال ہو آ میرے دل میں طائرِ باغِ خیال ہو

عنوان ہیں خراب تیرے اضطراب کے
آ۔ دُوں ہیں تیرے چہرے پہ چھینٹے گلاب کے

ہیں تیرے اضطراب سے سیماب بن گیا — نالوں سے تیرے ماہیٔ بے آب بن گیا
ہر اشک رشکِ قطرۂ تیزآب بن گیا — کانٹوں کا فرش بسترِ کم خواب بن گیا

تو عندلیب روح کسی مبتلا کی ہے
آواز ہائے یہ کسی درد آشنا کی ہے

آ میرے پاس دیکھ مری جاں نثاریاں — دیکھی ہوئی ہیں پھولوں کی غفلت شعاریاں
مشہور ہیں جہاں میں مری غم گساریاں — آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں

آ دو نو ں مل کے سر سے اُٹھائیں الم کی سِل
"تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دِل"

لیکن فغاں سے ہم درِ مقصد نہ پائیں گے — کیا فائدہ جو فتنۂ محشر جگائیں گے
پھولوں کو حالِ زار پہ اپنے ہنسائیں گے — پروانے بزمِ شمع میں ہم کو اُڑائیں گے

ہو ضبط سے اثر یہ جہاں کو خبر نہ ہو
یوں مانگئے دُعا کہ زباں کو خبر نہ ہو

کیوں غم کی تیز آگ میں ہر دم جلا کریں — کیوں ہم قتیلِ خنجرِ حسرت رہا کریں
اے عندلیب کس لئے شور و بکا کریں — آ دونوں مل کے شام و سحر یہ دُعا کریں

"دِل دے تو اس مزاج کا پروردگار دے"
"جو رنج کی گھڑی بھی خوشی سے گذار دے"

آ چل وہاں چلیں کہ جہاں پاسباں نہ ہو — لیلےٰ ہو اور قیس ہو پر ساربان نہ ہو
ہاں ہوں تو تیرے پھول ہوں پر باغباں نہ ہو — واں میں ہوں وہ ہوں اور کوئی درمیاں نہ ہو

ہر روز غیر دل کو ہمارے ہیں توڑتے

کیا ہو گیا ہمیں کہ نہیں اُن کو چھوڑتے

اِک اپنے غم سے پڑ گئیں چہرے پہ چھائیاں اک تیرے غم سے اُڑتی ہیں رُخ پر ہوائیاں
کس مُنہ سے ہیں بیان کروں بیوفائیاں اِن سب کی کج ادائیاں بے اعتنائیاں

جب لاتے ہیں چنگیر میں پھولوں کو ڈال کر
لے جاتے ہیں ہمارا کلیجہ نکال کر

کس دل سے یہ سنبھالتے ہاتھوں میں تیر ہیں کس دل سے ہم کو کرتے قفس میں اسیر ہیں
ہاں سچ ہے ہم بچارے نہایت حقیر ہیں پر اپنے گھر میں خوش ہیں اگر ہم فقیر ہیں

ہم بیکسوں کو کس لئے ناحق ہیں چھیڑتے
حیرت ہے مجھ کو کیوں نہیں اپنی نبیڑتے

صیاد بن کے دامِ بلا میں اُچھالنا اور بیکسی میں محفلِ گل سے نکالنا
ہاں کھینچ کر کسے پہ ہمیں پنجر دل میں ڈالنا کیا اس کو ہی جہان میں کہتے ہیں پالنا؟

اے ظالمو بناتے ہو ناحق بہانہ کیا
تم کو کہے گی خلقِ خدا غائبانہ کیا

اے گُل تو مت مہک کہ مہکنا گناہ ہے اے غنچے مت چٹک کہ چٹکنا گناہ ہے
ہاں سبزۂ چمن یہ لہکنا گناہ ہے اے عندلیب آج چہکنا گناہ ہے

صادق ہمارے واسطے اب یہ مثل ہوئی
"اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شدی"

اللہ کی شان میرا گریبان پھاڑ کے اور مثلِ خاک دامنِ عزت سے جھاڑ کے
رونے پہ میرے ہنستے ہیں مجھ کو بگاڑ کے خوش ہوتے ہیں یہ پھولوں کا تختہ اُجاڑ کے

کیا دل میں اپنے سمجھے ہیں یہ؟ ان کو خبر ہے
تجھ سے تو تھا یہ مجھ سے بھی دیکھ ان کو بیر ہے

جب میں مروں تو مجھ کو نہ دِل سے بھلائیو ہاں گاہے گاہے قبر پر احمد کی آئیو
اس بے وفا جہان کے پیچھے نہ جائیو اور اپنا قصّہ بلبلِ شیدا سنائیو
میں گرچہ تیرے باغ کے پھولوں کا خار تھا
پر زندگی میں تیرے لئے بے قرار تھا

مبتلائے غم!

حافظ جلیل احمد صاحب جلیل جانشین امیر مینائی

یہ صبح صبح کِدھر کا نسیم ارادہ ہے بتا تو کون سا باغ آج تونے تاکا ہے
بہارِ شام اودھ کی ہے سیر مدِ نظر سمجھ گیا میں تری چال سے یہ پیدا ہے
اگر یہ سچ ہے تو سُن مجھسے دیکھ مری طرف وُہ راستہ ہے جو پورب کی سمت جاتا ہے
اگر بھٹک نہ گئی راہ تو ملے گا تجھے اودھ میں ایک چمن دل سا جو شگفتا ہے
چمن نہیں ہے وہ اک حُور زاد کی ہے گلی گلی نہیں ہے وُہ باغِ ارم کا تختا ہے
وہاں پہنچ کے ادب سے ذرا ٹھہر جانا پکارنا پھر اُسے بڑھ کے جس کا کوچا ہے
کہ او فراق نصیبوں کے بھولنے والے! تجھے خبر نہیں دنیا میں ہو رہا کیا ہے؟
تجھے خبر نہیں کیا منتظر کی حالت ہے؟ تجھے خبر نہیں مر مر کے کون جیتا ہے؟
وہ رام پور جو ہے دُور دُور تک مشہور میں کیا کہوں کہ وہاں میں نے کس کو دیکھا ہے
تملسہ مال اسے اِک جوانِ عاشق تن غریب ہے فلکِ پیر کا ستایا ہے
جگر پہ کھائے ہوئے ہے کسی کے عشق کی چوٹ جو حال دل کا ہے آنکھوں سے وُہ ٹپکتا ہے

نہ جانے کس نے کیا ہے اُسے شہیدِ ادا
نہ جانے کون سا قاتل ہے جس پہ مرتا ہے
خیالِ یار میں ڈوبا ہوا ہے آٹھ پہر
نہ اپنا ہوش نہ اُس کو کسی کی پرواہ ہے
کبھی تو گرم ہیں نالے کبھی ہیں سرد آہیں
کبھی سکوت ہے ایسا کہ شک سا ہوتا ہے
زبانِ حال سے کہتا ہے بے قرار ہُوں میں
کبھی جگر پہ کبھی دل پہ ہاتھ رکھتا ہے
جہاں اِدھر کا کوئی شخص اُدھر کو جا نکلا
نگاہِ شوق سے گھڑیوں اُسے وہ تکتا ہے
جلیل کہتے ہیں اُس کو اگرچہ ہے وہ ذلیل
خراب حال ہے پر آدمی وہ اچھا ہے
بہت ستاتی ہے جس وقت بے قراری دل
اُدھر کو ہاتھ اُٹھا کر یہ شعر پڑھتا ہے

بیا بیا کہ ترا تنگ در کنار کشم
بہ تنگ آمدہ ام چند انتظار کشم

سپوت بیٹا

(عبد الرشید چشتی)

آتا ہے ہند سے تو اے نوجوان سپاہی
مجھ کو بھی کچھ بتا جا۔ رکھے تجھے الٰہی
انیسویں کی پلٹن اک ہے وہاں بہادر
جس کا ہر اک سپاہی مشہور ہے دلاور
کچھ اُن کا حال کہنا اور مجھ کو یہ بتانا
کیا ہیں وہ سب سلامت اور خرّم و توانا
بیٹا میرا ہے اُن میں۔ میرا عزیز لڑکا
جس کی ہے سب سے بڑھ کر دنیا میں مجھ کو پروا

احساں کرے گا ماں پر اُس کی خبر بتا کر
لے رانڈ کی دعائیں اُس کی خبر سُنا کر

آتا ہوں ہند سے میں۔ موجود جنگ میں تھا | حصہ میرا بھی اُس جا تیر و خدنگ میں تھا
انیسویں جو پلٹن ہے خوب جانتا ہوں | اُس کے سپاہیوں کی جرأت کو مانتا ہوں
افسر ہوں یا سپاہی سب سے ہوں میں شناسا | ہمراہیوں سے اپنے ہر اک ہے دوست میرا

لایا پیام ہوں اک تیرے لئے بڑی ماں
رابرٹ کا تیرے ہاں خوش خوش سنو بڑی ماں

رابرٹ کو میرے کیا پہچانتے ہو بیٹا؟ | سچ سچ بتانا جو کچھ تم جانتے ہو بیٹا۔
اے نیک خو سپاہی اُس کا پیام کیا تھا | کہنا اُسی کے الفاظ اُس کا کلام کیا تھا
ہائے وہ لفظ کہنا جو اُس کے منہ سے نکلے | لختِ جگر کے میرے جو اپنے منہ سے نکلے
تجھ کو خبر نہیں وہ۔ کیسا مجھے ہے پیارا | اپنی ضعیف ماں کی ہے آنکھ کا وہ تارا

فرقت میں اُس کی ماں کا کیا حال ہو رہا ہے
یہ دل میرا غموں سے پامال ہو رہا ہے

ہیولاک کی لڑائیاں اُسنے لڑی ہیں ساری | دشمن پہ وار اُس کے سارے ہوئے ہیں کاری
دو بار لکھنؤ پر وہ چڑھ کے خوب اڑا ہے | تلوار سے لڑا ہے اور توپ سے لڑا ہے

کر شکر اُس خدا کا جس نے اُسے بچایا
ہر معرکے میں اُس پر حق کا رہا ہے سایا

صد شکر یا الٰہی۔ طاقت نہیں بیاں کی | تو نے سنی دعائیں اس کی غریب ماں کی
اے دو جہاں کے مالک اے کردگار میرے | اِس رانڈ ناتواں کی سن لی۔ نثار تیرے
گولے کی زد سے روکا تلوار سے بچایا | اپنے کرم کا نقشہ دل پر میرے جمایا

پھر ہاں مجھے بتا دے پیغام اُس کا کیا تھا
اپنی ضعیف ماں سے کہنے کو کیا کہا تھا

"اے ماں بہادری سے تیرا لڑا ہے لڑکا | اور ہر زباں پہ اُس کا پھیلا ہوا ہے چرچا

کرنل کی جاں کو اُس نے رن میں بچا لیا تھا
سرکار میں یہ قصّہ سارا لکھا گیا تھا
اس کے صِلے میں اس کو تمغہ عطا ہوا ہے
زائد براں وظیفہ اُس کو دیا گیا ہے

ہے خوش نصیب لڑکا تیرا بہت بڑی ماں
خوش قسمتی کا تارا اُس کے رہے درخشاں

اے نیک دل سپاہی تیری زباں پہ رحمت
جس خانداں سے ہے تو اُس خانداں پہ رحمت
اے پیارے مرنے والے تو کاش آج ہوتا
اس بیرے جھونپڑے میں کیا رنگ راج ہوتا
دُکھ درد جو سہے تھے سب محو ہو گئے ہیں
سالوں کے رنج و غم کو یہ لفظ دھو گئے ہیں
پر ہاں ابھی تو باقی کچھ پوچھنا ہے تم سے
حالت تھی اُس کی کیسی اور کیا کہا تھا تم سے

رابرٹ کا حال کیا تھا اور رنگ رُوپ کیا تھا
لِلّٰلہ مجھے بتا دو تم سے جو کچھ کہا تھا

سُرخی سے اُس کی رنگت تانبا سی ہو رہی ہے
ڈاڑھی نکل کے خوبی عارض کی کھو رہی ہے
ایسا بدل گیا ہے وُہ ناز نیں شمائل
پہچان اُس کی اماں تم کو بھی ہو گی مشکل
مردِ جوان کیا ہے ہم نے تمہارا بچّہ
دِل اُس کا پر وہی ہے ہرگز نہیں ہے بدلا
رکھتا ہے یاد تجھ کو۔ کرتا ہے تیری باتیں
اور جانتا نہیں ہے وُہ ایسی ویسی باتیں

لیکن جہاز اُس کا سمجھو لگا کنارے
جلدی ہی خود ملے گا وُہ آکے تم کو پیارے

سچ مچ وُہ آرہا ہے۔ سچ مچ ملے گا مجھ کو؟
کب میرا پیارا ننّھا دیدار دے گا مجھ کو
تم نے کہا ہے جلدی آیا وُہ چاہتا ہے
جھوٹا نہیں ہیں امّاں سچ مچ وُہ آچکا ہے

او میرے پیارے رابرٹ! امّاں تمہارے واری
او ماں میں تیرے قرباں حق نے سُنی ہماری

پھول اور پیام

(انگریزی سے ترجمہ)

جاؤ گلِ گلاب تو کارِ ثواب کو
میرا پیام دے میری عصمت مآب کو

کیوں مُفت کھو رہی ہے وُہ یوں وقت مغتنم
کیا جانتی نہیں وُہ کہ فرصت بہت ہے کم

اُس وقت آتشیں ہیں دو رُخسار پھول سے
منہ سے ہیں چھوٹتے دمِ گفتار پھول سے

گر وہ ہے شمعِ حسن تو پروانہ مَیں بھی ہُوں
ہے وُہ پریجمال تو دیوانہ مَیں بھی ہُوں

لازم ہے شکر نعمتِ پروردگار اُسے
واجب ہے فکرِ گردشِ لیل و نہار اُسے

کیا مال ہے یہ حُسن اگر قدرداں نہ ہو
مجنوں نہ ہو تو لیلیٰ کی بھی داستاں نہ ہو

اے گل تو ہی بتا کہ تجھے گر بجائے باغ
بہرِ نشیمن آج ملا ہوتا کوئی راغ

خوبی کو تیری دیکھنے والا بھی تھا کوئی
سو جاں سے تیرا والہ و شیدا بھی تھا کوئی

ایسا ہی وُہ میری سمن اندام نازنیں
جنگل میں کوہ دشت میں ہوتی اگر نہیں

اہلِ نظر کی جس جگہ ہوتی نہ دسترس
اور ایک ساں ہی ہوتے جہاں ناکس اور کس

واں جنسِ حسن ہوتی خریدار بن پڑی
اور دلربا وُہ ہوتی طلب گار بن پڑی

پیغام میرا دے کے اُسے اے گلِ گلاب
مُرجھا نا بے دریغ۔ وہیں کھا کے پیچ و تاب

شاید کہ تیرے مرنے سے ہشیار ہو کے وُہ
انجامِ حُسن دیکھ لے بیدار ہو کے وہ

جانے کہ کوئی گل کا سا رنگیں قبا بھی ہو
شیریں سے بڑھ کے گو کوئی شیریں ادا بھی ہو

قبضے میں اُس کے حُسن کا حِصّہ ہے چند روز
دُنیا میں حُسن و عشق کا قصّہ ہے چند روز

جو فائدہ اُٹھانا ہو اُس سے اُٹھائے جلد
دِل میں سما چکی ہے نظر میں سمائے جلد

غزلیات

شفا سے کیا غرض اے چارہ گر بیمارِ جاناں کو — مجھے یہ درد ہی اچھا ہے رہنے دیجے درماں کو

جلایا ہے وہ خرمن آپ کی برقِ تبسّم نے — کہ حسرت جس پہ گرنے کی رہی ہر برقِ تاباں کو

بلا کے مَن چلے مردانِ میدانِ جنوں دیکھے — کیا آباد جا کر کوہ کو صحرا کو زنداں کو

یہ مستی ہے ان میں بھی ترے گیسوئے سرکش کی — کوئی دیکھے ترے سودائیانِ پابجولاں کو

اُدھر غایت عنایت کی اِدھر پایانِ مجبوری — دکھاؤں کس طرح صورت نگاہِ لطفِ جاناں کو

رہیں گے دل کے دل ہی میں یہ تو نکلے ہیں نہ نکلیں گے — نہ ٹوکو میری حسرت کو نہ چھیڑو میرے ارماں کو

کوئی ایسا تو دل لیں جس کی قیمت آپ کا دل ہو — کریں گے آپ کیا اس میرے دِل کی جنسِ ارزاں کو

یہ نیرنگی ہے سب نیرنگ کی تقدیر کی ورنہ
ترے کوچے کے گلشن سے کوئی کیوں جائے گلشن کو

کٹ گئی بے مدّعا ساری کی ساری زندگی؟ — زندگی سی زندگی ہے یہ ہماری زندگی؟

کیا ارادوں سے ہے حاصل؟ طاقتِ فرصت کہاں؟ — ہائے کہلاتی ہے کیوں بے اختیاری زندگی؟

اے سرِ شوریدہ اب تیرے وہ سودا کیا ہوئے؟ — کیا سدا سے تھی یہی غفلت شعاری زندگی؟

دردِ اُلفت کا نہ ہو تو زندگی کا کیا مزا ؟ — آہ و زاری زندگی ہے بے قراری زندگی؟

آرزوئے زیست بھی یاں آرزوئے دید ہے — تو نہ پیارا ہو تو مجھ کو ہو نہ پیاری زندگی

اور مرجھائیگی تیری چھیڑ سے دل کی کلی — کر نہ دو بھر مجھ پر اے بادِ بہاری زندگی

یاں تو اے نیرنگ دونو کیلئے ساماں نہیں
موت بھی مجھ پر گراں ہے گر ہے بھاری زندگی

نویدِ یاس دیتی ہے مجھے ہر آرزو میری
نہ کر مٹی خراب اے سعیِ ہیچ انجام تو میری

چھپے ہو سات پردوں میں بھی تم تو اس سے کیا حاصل
تمہارے عشق میں رسوائیاں ہیں کو بکو میری

چھپو گے کیا مرا ذوقِ طلب بھی تم نے دیکھا ہے
ورائے لامکاں ہے انتہائے جستجو میری

یہ پیچ و تاب یہ اُلجھن یہ اندازِ پریشانی
کہانی تیرے گیسو کہہ رہے ہیں مو بمو میری

جہت کی قید کو توڑا ہے سودائے محبت نے
لگی ہیں تیرے چہرے پر نگاہیں سو بسو میری

ترا انصاف گر مجھ کو ذرا آنکھیں دکھاتا ہے
بندھا دیتا ہے ڈھارس مژدۂ لاتقنطو میری

طلب نے کھائی ہیں وہ ٹھوکریں راہِ تمنا میں
کہ آخر مجھ کو شرمانے لگی ہے آرزو میری

وہ گل ہوں سادگی میں میری سو رنگینیاں نکلیں
مشامِ روح کو بھاتی ہے بھینی بھینی بو میری

مرا ہر لفظِ سادہ اک صدف ہے دُرِّ معنی کا
سمجھ پیدا کرے تو کوئی سمجھے گفتگو میری

تصنع کا نہیں احسان میری قدر و قیمت پر
ملی فطرت سے مجھ کو شکلِ گوہر آبرو میری

سلامت مانعِ مشکل پسندی ہو نہیں سکتی
ادنیٰ ہے حضرتِ نیرنگ طرزِ گفتگو میری

زمانہ دیکھے گا جب مرے دل سے محشر اُٹھے گا گفتگو کا
مری خموشی نہیں ہے گویا مزار ہے حرفِ آرزو کا

جو موجِ دریا لگی یہ کہنے سفر سے قائم ہے شان اپنی
گہر یہ بولا صدف نشینی ہے مجھ کو سامان آرزو کا

نہ ہو طبیعت ہی جن کی قابل وہ تربیت سے نہیں سنورتے
ہوا نہ سرسبز رہ کے پانی میں عکس سروِ کنارِ جُو کا

کوئی دل ایسا نظر نہ آیا نہ جس میں خوابیدہ ہو تمنا
الٰہی تیرا جہان کیا ہے نگار خانہ ہے آرزو کا

اگر کوئی شے نہیں ہے پنہاں تو کیوں سراپا تلاش ہوں میں
نگہ کو نظارے کی تمنا ہے۔ دل کو سودا ہے جستجو کا

چمن میں گل چیں سے غنچہ کہتا تھا اتنا بے درد کیوں ہے انساں
تری نگاہوں میں ہے تبسّم شکستہ ہونا۔ مرے سبو کا

کھلا یہ مر کر کہ زندگی اپنی تھی طلسمِ ہوس سراپا
جسے سمجھتے تھے جسمِ خاکی غبار تھا کوئے آرزو کا

ریاضِ ہستی کے ذرّے ذرّے سے ہے محبت کا جلوہ پیدا
حقیقتِ گل کو تو جو دیکھے تو یہ بھی پیماں ہے رنگ و بو کا

سپاس شرطِ ادب ہے ورنہ کرم ترا ہے ستم سے بڑھ کر
ذرا سا اِک دل دیا ہے وہ بھی فریب خوردہ ہے آرزو کا

اُڑایا ذوقِ تپش پتنگے سے شمع سے شوقِ اشک باری
کہیں سے سیکھی نماز میں نے لیا کہیں سے سبق وضو کا

کمالِ وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوکِ نشتر سے تو جو چھیڑے
یقیں ہے مجھ کو گرے رگِ گل سے قطرہ انساں کے لہو کا

جو چاک میرے جگر کے دیکھے کلی نے بادِ صبا سے پوچھا
یہ آدمی ہے کہ گل ہے؟ منّت پذیر ہے سوزنِ رفو کا

گیا ہے تقلید کا زمانہ مجاز رختِ سفر اُٹھائے
ہوئی حقیقت ہی نمایاں تو کس کو یارا ہے گفتگو کا

تمام مضموں مرے پرانے۔ کلام میرا خطا سراپا
ہنر کوئی دیکھتا ہے مجھ میں تو عیب ہے میرے عیب جو کا

جو گھر سے اقبال دُور ہوں میں تو ہوں نہ محزوں عزیز میرے
مثالِ گوہر وطن کی فرقت کمال ہے میری آرزو کا

(زخیاباں)

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

گذر گیا اب وہ دورِ ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا میخانہ سارا عالم ہر اک کوئی بادہ خوار ہوگا

کبھی جو آوارۂ جنوں تھے وہ بستیوں میں پھر آبسیں گے
برہنہ پائی وہی رہے گی مگر نیا خار زار ہوگا

سُنا دیا گوشِ منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر اُستوار ہوگا

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سُنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

کیا مرا تذکرہ جو ساقی نے بادہ خواروں کی انجمن میں
تو پیرِ میخانہ سُن کے کہنے لگا کہ مُنہ پھٹ ہے خوار ہوگا

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

سفینۂ برگِ گل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہوگا

جنہوں نے میری زبانِ گویا کو محشرستانِ صدا کا جانا
مرا وہ دل چیر کر جو دیکھیں تو واں سکوتِ مزار ہوگا

چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو
یہ جانتا ہے کہ اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہوگا

جو ایک غارے نگاہ تو نے ہزار کر کے ہمیں دکھایا
یہی اگر کیفیت ہے تیری تو پھر کسے اعتبار ہوگا

کہا جو قمری سے میں نے اک دن یہاں کے آزاد پا بہ گِل ہیں
تو غنچے کہنے لگے ہمارے چمن کا یہ رازدار ہوگا

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اُس کا بندہ بنوں گا جسکو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

یہ رسمِ بزمِ فنا ہے اے دل گناہ ہے جنبشِ نظر بھی
رہے گی کیا آبرو ہماری جو تو یہاں بے قرار ہوگا

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری نفس مرا شعلہ بار ہوگا

نہیں ہے غیر از نمود کچھ بھی جو مدعا تیری زندگی کا
تو اک نفس میں جہاں سے مٹنا تجھے مثالِ شرار ہوگا

نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانا ابھی وہی کیفیت ہے اُس کی
کہیں سرِ راہ گذار بیٹھا ستم کشِ انتظار ہوگا

نگاہ پائی ازل سے جو دُور بیں میں نے
ہر ایک چیز میں دیکھا اُسے مکیں میں نے

سوالِ دید میں لذّت ہے اے کلیم ایسی
ہزار بار سُنی ہے وُہی نہیں میں نے

سُنے کوئی میری غربت کی داستاں مجھ سے
بھلایا قصّۂ پیمانِ اوّلیں میں نے

لگی نہ میری طبیعت ریاضِ جنّت میں
پیا شعور کا جب جامِ آتشیں میں نے

رہی حقیقتِ عالم کی جستجو مجھ کو
دکھایا اوجِ خیالِ فلک نشیں میں نے

مِلا مزاج تغیّر پسند کچھ ایسا
کیا قرار نہ زیرِ فلک کہیں میں نے

نکالا کعبے سے پتھر کی مورتوں کو کبھی
کبھی بتوں کو بنایا حرم نشیں میں نے

کہا کسی نے فسانہ جو عرش و کرسی کا
وہ سادہ لوح ہوں بس کر لیا یقیں میں نے

کبھی میں ذوقِ تکلّم میں طُور پر پہنچا
چھپایا نورِ ازل زیرِ آستیں میں نے

کبھی صلیب پہ اپنوں نے مجھ کو لٹکایا
کیا فلک کو سفر چھوڑ کر زمیں میں نے

کبھی میں غارِ حرا میں چھپا رہا برسوں
دیا جہاں کو کبھی جامِ آخریں میں نے

کبھی میں قتل ہوا کر بلا کے میداں میں
کہی کسی کو ستم پر بھی آفریں میں نے

سُنایا ہند میں آ کر سرودِ ربّانی
پسند کی کبھی یوناں کی سرزمیں میں نے

دیارِ ہند نے جس دم مری صدا نہ سُنی
بسایا خطّۂ جاپان و مُلکِ چیں میں نے

بنایا ذرّوں کی ترکیب سے کبھی عالم
خلافِ معنیٔ تعلیمِ اہلِ دیں میں نے

اُٹھائے تلخیٔ انکار میں مزے کیا کیا
بنا کے ایک زمانے کو نکتہ چیں میں نے

لہو سے لال کیا سینکڑوں زمینوں کو
جہاں میں چھیڑ کے پیکارِ عقل و دیں میں نے

سمجھ میں آئی حقیقت نہ جب ستاروں کی
اسی خیال میں راتیں گذار دیں میں نے

ڈرا سکیں نہ کلیسا کی مجھ کو تلواریں
سکھایا مسئلۂ گردشِ زمیں میں نے

کشش کا راز ہویدا کیا زمانے پر
لگا کے آئینۂ عقلِ دُور بیں میں نے

کیا اسیر شعاعوں کی برقِ مضطر کو
بنا دی غیرتِ جنّت یہ سرزمیں میں نے

مگر خبر نہ ملی آہ ! رازِ ہستی کی — کیا خرد سے جہاں کو تہِ نگیں مَیں نے

ہوئی جو چشمِ مظاہر پرست وا آخر

تو پایا خانۂ دل میں اُسے مکیں میں نے

عجیب طرز ہے کچھ گفتگوئے واعظ کا — خدا بچائے یہ باتیں سُنی نہ تھیں مَیں نے

وُہ چیز نام ہے جس کا جہاں میں آزادی — سُنی ضرور ہے دیکھی کہیں نہیں مَیں نے

نہ توڑ میرے دلِ دردمند کو ظالم — بڑی تلاش سے پایا ہے یہ نگیں مَیں نے

خُدا تو مِلتا ہے اِنسان ہی نہیں مِلتا — یہ چیز وُہ ہے کہ دیکھی کہیں کہیں مَیں نے

عجیب شے ہے صنم خانۂ امیرِ اقبال

میں بُت پرست ہوں رکھ دی کہیں جبیں مَیں نے

(زمانہ)

چمک تیری عیاں بجلی میں آتش میں شرارے میں — جھلک تیری ہویدا چاند میں سورج میں تارے میں

بلندی آسمانوں میں زمینوں میں تیری پستی — روانی بحر میں اُفتادگی تیرے کنارے میں

جو نکلا نالہ بن کر غنچۂ منقارِ بلبل سے — وہی نکہت چمن سے اُڑ کے جا چمکی ستارے میں

مرے پہلو میں دل ہے یا کوئی آئینہ جادو کا — تری صورت نظر آئی مجھے اپنے نظارے میں

اُتارا میں نے زنجیرِ رسومِ اہلِ ظاہر کو — مِلا وُہ لطفِ آزادی مجھے تیرے سہارے میں

شریعت کیوں گریباں گیر ہو ذوقِ تکلم کی — چُھپا جاتا ہوں اپنے دل کا مطلب استعارے میں

جو ہے بیدار انساں میں وُہ گہری نیند سوتا ہے — شجر میں پھول میں حیواں میں پتھر میں ستارے میں

مجھے پھونکا ہے سوزِ قطرۂ اشکِ محبت نے — غضب کی آگ تھی پانی کے چھوٹے سے شرارے میں

نہیں جنسِ ثوابِ آخرت کی آرزو مجھ کو — وُہ سوداگر ہوں میں نے نفع دیکھا ہے خسارے میں

نہاں تھا تو تو روشن تھا چراغِ زندگی میرا — مگر موجِ نفس پوشیدہ تھی تیرے نظارے میں

سکوں نا آشنا رہنا اسے سامانِ ہستی ہے — تڑپ کس دل کی یارب چھپ کے آ بیٹھی ہے پارے میں

صدائے لن ترانی سن کے اے اقبال میں چپ ہوں
تقاضوں کی کہاں طاقت ہے مجھ فرقت کے ماروں میں
(ریاض)

تمناؤں میں اُلجھایا گیا ہوں
کھلونے دیکے بہلایا گیا ہوں
نہیں اُٹھتے قدم کیوں جانب دیر
کسی مسجد میں بہکایا گیا ہوں
ستایا آکے پہروں آرزو نے
جو دم بھر آپ میں پایا گیا ہوں
نہ تھا میں معتقد اعجاز مے کا
بڑی مشکل سے منوایا گیا ہوں
دلِ مضطر سے پوچھ اے رونقِ بزم
میں آپ آیا نہیں لایا گیا ہوں
لحد میں کیوں نہ جاؤں منہ چھپائے
بھری محفل سے اٹھوایا گیا ہوں
کجا میں اور کجا اے شاد دُنیا
کہاں سے کس جگہ لایا گیا ہوں (شاد)

اکڑ کے دوش پہ کیونکر نہ زُلف ناز کرے
اُسی کے ہاتھ میں ہے جس کو سرفراز کرے
بیک اشارہ نہیں تھا نہ غیر محفل میں
اَن ابروؤں کی خدا زندگی دراز کرے
مرے حسابوں تو عاشق نہیں حریص ہے وہ
فراق و وصل میں کچھ بھی جو امتیاز کرے
نگاہِ ناز سے مطلب مرا کچھ اور نہیں
کسی طرح سے خدا اس کو دِل نواز کرے
کچھ اور بزم میں اپنی دعا نہیں ساقی
تری نگاہ کو اللہ پاک باز کرے
کہیں تو جام دھرا ہے کسی طرف ساغر
کدھر جھکائے سر انساں کدھر نماز کرے
بہت دنوں سے ہے خالی فقیر کا کشکول
بس اب نگاہِ کرم وہ گدا نواز کرے
شراب جام میں دی تو نے ساقیا یا زہر
کسے دماغ ہے کون اِس کا امتیاز کرے
گِلہ سر آنکھوں پہ ہے اِسکا لیکن اے قاصد
ہم ایسے ہیں تو نہیں کیوں ابین راز کرے

فقط بھروسے پہ تیرے ہے زندگی اپنی
خدا حیات تری اے اجل دراز کرے

ہم اپنے آپ نہیں جب تو ہونگے غیر کے کب
زمانہ شاد ہم ایسوں سے احتراز کرے

(شاد عظیم آبادی)

جسم کا ساتھ چھٹا آپ سے باہر ہم ہیں
اب تو اپنے لئے اک غیر سے بدتر ہم ہیں

جلوۂ یار پہ ٹھہری رہیں تا دیر آنکھیں
نہ خدا ہیں نہ امام اور نہ پیمبر ہم ہیں

کان مشتاق ہیں آنکھوں کی طرح مدت سے
دید و آواز کہ اس پردہ کے اندر ہم ہیں

تھک گئے پاؤں گئی در بدری شکرِ خدا
اب یوں ہی تا بہ قیامت ترے در پر ہم ہیں

تا قیامت رہے آئینہ سلامت یارب
ہر حسیں کو ہے یہ دعویٰ کہ سکندر ہم ہیں

دشتِ اُمید کی جانب جو بڑھاتے ہیں قدم
موت کہتی ہے یہ آہستہ کہ سر پر ہم ہیں

فکر کر رکھتی ہے سرما کے لئے گرما میں
ایک چیونٹی سے بھی تدبیر میں کم تر ہم ہیں

عقل سے راہ جو پوچھی تو پکارا یہ جنوں
وہ تو بھٹکی ہوئی خود پھرتی ہے رہبر ہم ہیں

دل یہ کہتا ہے نہیں دیکھ کتابوں پہ نہ جا
قدرتِ صانعِ مخلوق کے دفتر ہم ہیں

پھر تو ہو جائیں گے بازارِ جہاں میں مہنگے
شاد ارزاں ہیں ابھی تک کہ میسر ہم ہیں

(شاد عظیم آبادی)

نہیں چین اگرچہ بے مے شبِ ماہتاب ہرگز
نہ پلائے خود جو ساقی نہ پیوں شراب ہرگز

شبِ وصل میں ہو یارب شبِ ہجر کی درازی
کہ طلوع تا قیامت نہ ہو آفتاب ہرگز

جو خطا ہوئی ہے مجھ سے وہ ترے سبب ہوئی ہے
نہ کرے جو تو تغافل نہ ہو اضطراب ہرگز

یہ مزہ شکستگی کا مجھے عمر بھر نہ بھولے
دلِ کام جو آبھی نہ ہو کامیاب ہرگز

جو خدا نے دی ہیں آنکھیں تو کچھ اُن سے کام بھی لے
ہمہ دان بنا سکے گی نہ تجھے کتاب ہرگز

مرے دل میں اے شبِ غم تو چھری چبھو خلش کی
کہ نہیں ہے چشمِ عاشق پہ ذوقِ خواب ہرگز

یہ ضرور مجھ کو وحشت لکھوں خط پہ خط میں اُن کو
اُنہیں ضد کہ ایک کا بھی نہ لکھیں جواب ہرگز

[illegible]

راحتیں طولِ مرض کی صرف درماں ہوگئیں
زندگی جن مشکلوں سے تھی وہ آساں ہوگئیں

صورتیں اُمید کی خواب پریشاں ہوگئیں
سامنے آنکھوں کے آئیں اور پنہاں ہوگئیں

کچھ دنوں واعظ نے جن کا خود کیا تھا التزام
اب وہ تکلیفیں سراسر جزوِ ایماں ہوگئیں

اُن سے کیا لُطفِ تعلق اُن سے کیا دل بستگی
غیر کے ماتم میں جو زلفیں پریشاں ہوگئیں

عالمِ غربت میں وہ یادِ وطن کی لذتیں
رفتہ رفتہ نذرِ شوق خانہ ویراں ہوگئیں

بے مروت سی جو قریں کوچۂ وحشت میں تھیں
وہ بھی آخر صرفِ استحکامِ زنداں ہوگئیں

ناخنِ وحشت نے سینہ پر جو کیں گلکاریاں
فصلِ گل میں زینتِ چاکِ گریباں ہوگئیں

چند باتیں وہ جو ہم رندوں میں تھیں ضرب المثل
اب سُنا مرزا کہ دردِ اہل عرفاں ہوگئیں

[illegible]

جب مرے ہونٹوں سے لعلِ شکریں چھوٹے ہوئے
لفظ جو دشنام کے نکلے وہ سب لوٹے ہوئے

بزمِ دشمن سے اب آئے ہو مزے لوٹے ہوئے؟
ہوش میں آؤ کہیں جڑتے ہیں دل ٹوٹے ہوئے

تم یہاں دیکھو تو آکر ہجر میں کیا حال ہے؟
دل کے ہاتھوں آج سو سو حشر ہیں ٹوٹے ہوئے

وائے ناکامی کہ گلشن میں خزاں آنے لگی
دو ہی دن گذرے تھے ہم کو قید سے چھوٹے ہوئے

چاہنے والے تری فرقت میں جی سکتے نہیں
زندگی سے ہیں وفاداروں کے جی چھوٹے ہوئے

دلفریبی لالہ رویوں کی نہیں مٹتی کبھی
یہ ستمگر خاک ہو کر بھی تو گل بوٹے ہوئے

سچ یہ ہے گرنا کسی کی آگ میں اچھا نہیں
دل کو روتے ہیں جگر کے آبلے پھوٹے ہوئے

شمع کا آنسو نہیں تھمتا ہے اُن کی یاد میں
اُڑتے پھرتے ہیں جو پروانوں کے پَر ٹوٹے ہوئے

اپنی سوزش کا کیا ہے شمع نے اچھا علاج — رکھ لئے ہیں دل میں پروانوں کے پَر ٹوٹے ہُوئے

آغا شاعر

شُونگھ لے شاعر اگر ہے کچھ دماغِ بوئے گُل
میرے گلشن کے یہ تازے پھُول ہیں ٹوٹے ہُوئے

[illegible]

کچھ ہو مگر قصور نہ ہمّت میں چاہیئے
اِنساں کو وضعِ پاس مصیبت میں چاہیئے

اک داغِ مہر سینہ پر تربت میں چاہیئے
زیرِ کفن یہ شمع بھی ظلمت میں چاہیئے

اے دل نہ فرق معنی و صورت میں چاہیئے
مضمرِ صفائے آئینہ طینت میں چاہیئے

فکرِ کشود کار مصیبت میں چاہیئے
دامانِ صبر بخیۂ ہمّت میں چاہیئے

بیخودِ ملال میں ہو نہ راحت میں خود نما
یہ رنگ آدمی کی طبیعت میں چاہیئے

واعظ بشر کی حور سے کیا ہو گی دل لگی
تھوڑی مناسبت بھی طبیعت میں چاہیئے

ہے شرطِ عقل کوششِ کسبِ کمالِ فن
دامن پہ داغِ نقص نہ شہرت میں چاہیئے

بولے وُہ اپنے کشتۂ حسرت کو دیکھ کے
ہم شکل بھی مرقعِ عبرت میں چاہیئے

فرقت میں برقِ خرمنِ صبر و سکوں ہیں اشک
طفلی سے یوں کمال شرارت میں چاہیئے

جس جا کٹی ہے عمر وہیں کیوں نہ ہو لحد
کچھ یادگار کوچۂ اُلفت میں چاہیئے

انساں رہے عروج میں بھی بن کے خاکسار
منعم یہ سرمہ چشمِ بصیرت میں چاہیئے

اشکوں سے ہر مژہ پہ صف آرا ہیں لختِ دِل
ایسا امام ایسی جماعت میں چاہیئے

مِل جائے نانِ خشک تو نعمت سمجھ اُسے
پیوندِ حرص کا نہ قناعت میں چاہیئے

بے مہرئی زمانہ سے دل سرد ہے تو ہو
افسردگی نہ آتشِ غیرت میں چاہیئے

ریحانِ باغِ حکمت و تہذیب ہو سخن
کوئی ثمر تو نخلِ ریاضت میں چاہیئے

گردوں نشیں ہے خاک مری بن کے گردباد
یوں کوششِ عروج فلاکت میں چاہیئے

دل تنگ کیوں ہیں سب مری فریاد و آہ سے
کرتا ہوں وُہ جو کچھ شبِ فرقت میں چاہیئے

اُس تیغ کی یاد آئینہ دارِ خیال ہے — ایسا ہی رہنما مجھے حیرت میں چاہیئے
ابروئے یار، کلمہ ترا پڑھ رہی ہے تیغ — عادل سوال جرحِ شہادت میں چاہیئے
آنکھوں میں لختِ دل ہیں زمیں پر ہے فوجِ اشک — یہ فرق بادشاہ و رعیت میں چاہیئے

شیدا ازل سے شاہدِ معنی کا ہے حبیب
ایسا انیس گوشۂ عزلت میں چاہیئے

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن وہ اکثر یاد آتے ہیں — الٰہی ترکِ اُلفت پر وہ کیونکر یاد آتے ہیں
سکونِ خاطرِ ناکام کی تکلیف کیا کہیئے — جنون و وحشت و فساد و نشتر یاد آتے ہیں
نہ چھیڑ اے ہم نشیں کیفیتِ ہوا کے افسانے — شرابِ بیخودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں
رہا کرتے ہیں قیدِ ہوش میں اے وائے ناکامی — وہ دشتِ خود فراموشی کے چکر یاد آتے ہیں
خیالِ یار کا دل سے خفا ہونا قیامت ہے — کسی کے عشوہ ہائے ناز پرور یاد آتے ہیں
نہیں آتی تو یاد اُن کی مہینوں تک نہیں آتی — مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

اسی پر ناز تھا حسرت تجھے ترکِ محبت کا
تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھ کر یاد آتے ہیں

حسرت موہانی

روشِ حسن مراعات چلی جاتی ہے — ہم سے اور اُن سے وہی بات چلی جاتی ہے
کچھ رہی تھی ہوسِ مے سو تغافل سے ترے — وہ بھی اے پیرِ خرابات چلی جاتی ہے
ہم سے ظاہر میں وہ ہر چند خفا ہیں لیکن — کوششِ پرسشِ حالات چلی جاتی ہے
دن کو ہم اُن سے بگڑتے ہیں وہ شب کو ہم سے — رسمِ پابندیِ اوقات چلی جاتی ہے
ہائے رے سادگیِ شوق کہ اب تک اُن سے — خواہشِ لطفِ ملاقات چلی جاتی ہے
اُس ستمگر کو ستمگر کہتے نہیں بنتا — سعیِ تاویلِ خیالات چلی جاتی ہے

مجھے اولجھا دیا ہے دل نے گھونگر والے بالوں سے
یہ سب چالاکیاں سیکھا ہے انکھیلی کی چالوں سے

قضا بیکار کرتی ہے بہانے مرنے والوں سے
سنبھلتے ہیں کہیں بیمار فرقت کے سنبھالوں سے

بڑے بیدرد ہیں یہ بُت نہایت بے مروت ہیں
کہیں کیا شدّتِ دردِ جگر خوفی ہونے والوں سے

پلائے سبکو ساقی بزم میں ہم آنکھوں سے دیکھیں
اِدھر دیکھے کہ کیا حسرت ٹپکتی تھی پیالوں سے

مرے دلکی تڑپ پر خود جگر کے زخم خنداں ہیں
توقع خاک ہمدردی کی ہو ایسی ہنسنے والوں سے

کوئی دیکھے دلِ عاشق ہیں کر لیتے ہیں گھر کیونکر
کوئی سیکھے ذرا آنکھیں لڑانا خوش جمالوں سے

جدا گل سے ہوئی کیا ایک بلبل ہے گلستاں میں
گرے ہیں ٹوٹ کر شاخوں سے گل شاخیں نہالوں سے

بھرے ہیں کس قیامت کی ادا بننے اور سنورنے میں
بگڑتے ہیں وہ کیا شانہ اُلجھتا ہے جو بالوں سے

یہ حالت ہو گئی رُخ پر گلوں کے چھا گئی زردی
چمن کا رنگ اڑ جاتا ہے بُلبُل تیرے نالوں سے

یہ بھولا پن ستم کا ہے کہ وہ شانہ سمجھتے ہیں
دِل صد چاک کو اولجھا رہے ہیں اپنے بالوں سے

جو چونکائیں گے آہوں سے تو نالوں سے جگائیں گے
کریں گے چھیڑ پیدا ہم بھی شب کو سونے والوں سے

نہ کیونکر روئیں آنکھیں پھوٹکر رکھتی ہیں یہ چشمک
کمالؔ اپنے جگر کے آبلوں سے دِل کے چھالوں سے

سید محمد مہدی کمالؔ خلف الصدق حضرت جلالؔ

آئے تو جبر کر کے ترے جلوہ زار میں
بجلی چمک رہی ہے دلِ بے قرار میں

تہ تیری آرزو میں بڑھی وسعتِ نظر
دنیا ہے سب مری نگہِ انتظار میں

مانا کہ ضبط باعث اخفائے راز ہے
یہ بات اب نہیں ہے مرے اختیار میں

مژگاں کو شغلِ ماتمِ ناکامئ نگاہ
آنکھیں جھپک رہی ہیں ترے جلوہ زار میں

جاؤں گا میں بھی سیرِ قیامت کو رے کے ساتھ
چند آفتاب حشر دلِ داغدار میں

اے بے خبر نہ یوں کسی بے کس کی آس توڑ
دنیائے شوق ہے دلِ امیدوار میں

پوچھو نہ حال جلوۂ طاقت گدازِ حسن
سیماب بھر دیا ہے دلِ بے قرار میں

وہ محوِ زینتِ خمِ کاکل ہیں میں یہاں
تصویر دیکھتا ہوں شبِ انتظار میں

اے پڑھنے والے کیوں نہیں تھمتے ہیں ترے اشک
لکھا ہوا ہے کیا مری لوحِ مزار میں

آتا نہیں قریب بھی میت کے اب کوئی
یوں آنکھیں پھر گئی ہیں ترے انتظار میں

اللہ عشق بھی ہے کوئی ایسی معصیت
اک آگ سی لگی ہے دلِ بے قرار میں

آتی ہیں آج شام سے انگڑائیاں مجھے
کچھ تو اثر ہے جذبۂ بے اختیار میں

اب بن گئے ہیں رشتۂ یک سوئی نگاہ
تھے جو نفس مریضِ شبِ انتظار میں

کیا ڈھونڈھتے ہیں آپ ذرا ہو چکے عزیز
دل لیکے آپ آئے بھی تھے کوئے یار میں

نہ سنگِ راہِ عدو نہ غبارِ خاطر ہیں
خفا نہ ہو جو گلی میں تمہاری حاضر ہیں

بقا ہے ہم کو زمانے میں صورتِ شبِ وصل
ذرا جھپک کے کھلی آنکھ اور آخر ہیں

ترے شباب نے جن سے کیا تھا وعدۂ قتل
کفن یہ پہنے ہوئے آج در پہ حاضر ہیں

یہ ڈر ہے غیر نہ سن لیں کہ ان کو ہوگی خوشی
کسی سے کہہ نہیں سکتا شکستہ خاطر ہیں

لڑی نگہ سے نگہ اور حواس ہو گئے گم
زمانہ بھر میں ہیں جتنے حسین وہ ساحر ہیں

انہیں ہے عذرِ نزاکت یہاں شکایتِ ضعف
غرض کہ ملنے سے قسمت کے ہاتھوں قاصر ہیں

قسم نہ مانئے گا اس سے جب کیا شکوہ
دیا جواب یہ جھنجھلا کے ہم تو کافر ہیں

انہیں کے دل سے کوئی پوچھے لذتِ غمِ ہجر
انہیں کا عشق کوئی شے ہے جو کہ صابر ہیں

نکلتے ہی نہیں ارمان دل میں آئے ہوئے
تمام گھر کو یہ مہمان بارِ خاطر ہیں

کوئی چھپے گا کہاں تک اداشناسوں سے
نگاہِ شوق سے سب ان کے حال ظاہر ہیں

یہ قول ہے ترے کوچے میں مرنے والوں کا
چلے ہیں خلد کو اور خلد کے مسافر ہیں

مُبارک اُن کو ہو محفل کی رونق اے محشرؔ
اُٹھے ہی جاتے ہیں ہم خود جو بارِ خاطر ہیں

مرزا کاظم حسین لکھنوی

کیا مانگتا

کیا خدا سے سیم و زر یا لعل و گوہر مانگتا
اُس نے بے مانگے دیا سب کچھ تو کیونکر مانگتا

بادشاہی کی ہوس ہوتی تو خیر اک بات تھی
کانِ پُرزر مانگتا ہیں تیغ و افسر مانگتا

کجکلاہی کی بھری ہوتی اگر سر میں ہوا
افسرِ زرینہ زیرِ چترِ پُرزر مانگتا

قصدِ قصابی اگر ہوتا بنی آدم کے ساتھ
گُرز و گوپال و سنان و تیغ و خنجر مانگتا

مُلک گیری کو سمجھتا میں اگر کارِ بزرگ
حملۂ محمود و نادرشاہ و بابر مانگتا

تختِ شاہی پر اگر منظور کرتا میں جلوس
تختِ دارا مانگتا بختِ سکندر مانگتا

فتح و نصرت کو اگر میں جانتا خوش اختری
طالعِ اسکندر و اقبالِ قیصر مانگتا

امن و آزادی حکومت میں دکھانے کیلئے
روزگارِ لارڈ کرزن - عہدِ اکبر مانگتا

عیش و عشرت کی اگر ہوتیں بہاریں دیکھنی
جشنِ دہلی - بزمِ جمشیدی سے ساغر مانگتا

اِس کے دینے میں اگر قسام کچھ کرتا درنگ
آبِ حیوانِ جنابِ خضر رہبر مانگتا

آدمیت سے ہے اُمت آپ کی خیرالامم
حُسنِ خلقِ شافعِ دیوانِ محشر مانگتا

بابِ علمِ خاص پیغمبر جہانِ علم ہے
علمِ حیدر - سیرتِ آلِ پیمبر مانگتا

ہے ہوس ناپاک لیکن علم و حکمت کے سوا — حکمتِ دانشورانِ ہفت کشور مانگنا
اِس میں غزالی - سنائی کو اگر ہوتا کلام
نہیں کسی کی کچھ نہ سنتا مانگنا پر مانگنا

چھوڑ دیا

دوستو صادقِ محزوں نے وطن چھوڑ دیا — بلبلِ زار نے رہ رہ کے چمن چھوڑ دیا
صورتِ خار نکالے گئے اس گلشن سے — جس طرح حضرتِ آدم نے عدن چھوڑ دیا
رہ گیا ٹوٹ کے پیمانِ وفاداریٔ گل — یعنی تو نے ہمیں او عہد شکن چھوڑ دیا
لاکھ بھولا کئے پر یاد تمہاری نہ گئی — تم نے کیونکر ہمیں یارانِ وطن چھوڑ دیا
اب نہیں جنسِ محبت کا خریدار کوئی — وہ مگر اہلِ زمانہ نے چلن چھوڑ دیا
اے صبا آج سے لے تو بھی سبکدوش ہوئی — ہم نے عشقِ گل و نسرین و سمن چھوڑ دیا
صحنِ گلزار میں پھیلی ترے گیسو کی مہک — لا کے پنجاب میں آہوئے ختن چھوڑ دیا
سرِ شوریدہ سے نکلی نہ ہوائے پرواز — تو نے پر کاٹ کے جو مرغِ چمن چھوڑ دیا
دلِ بیتاب کی آرام سے اب بھی نہ کٹی — گرچہ اندیشۂ کالا و کفن چھوڑ دیا
سچ تو یہ ہے کہ جہاں میں نہیں بے عیب کوئی — تری تصویر میں مانی نے دہن چھوڑ دیا
طوطیو تم کو مبارک شکرستانِ خیال — ہم نے رنجِ غزل و فکرِ سخن چھوڑ دیا

کوئی پوچھے تو بھلا صادقِ دلگیر سے یوں
شیوۂ سحر بیانانِ کہن چھوڑ دیا

صادق

قصیدۂ شاطر

دیکھ لی ہجر میں ساقی کے مری نوحہ گری
آج گرمائیگی پہلو میرا شیشہ کی پری

دِل جلوں کی ترے ہی دم سے بندھی ہتی ہے آس
رکھے اللہ سلامت تجھے داغِ جگری

بیم و اُمید کا کھٹکا ہی نہ رکھا باقی
تجھ کو کیا کہہ کے دُعا دیجئے اے بے اثری

عالم نزع میں اِک پردہ نشیں کی ہے تلاش
ہائے ظاہر کئے دیتی ہے پریشاں نظری

آبرو تیری پہ پھر جائیگا پانی اَے ابر
جوش پر آئیگی جس دم مری آنکھوں کی تری

ہم نے مرقد میں کفن کے بھی اُڑائے پُرزے
تیرے وحشی کی ہے زوروں پہ ابھی جامہ دری

دِل جلا ہیں بھی ہُوں ہو جاؤں گا ٹھنڈا آخر
دو گھڑی اور مرا ساتھ دے شمع سحری

گرم نالے جو کروں آگ لگے جنّت کو
ٹھنڈی آہیں جو بھروں سرد ہو نارِ سقری

میری بیتابی دل ہے تری شوخی کا جواب
جوڑ غمزے کا ترے میری پریشاں نظری

لاکھ معشوق ہیں تم فرد ہو عشّاق ہیں ہیں
شہرتِ حسن سے ٹکراتی ہے شوریدہ سری

نشترِ تیز ہے خود ترچھی نظر قاتل کی
زہر میں اور بجھاتی ہے اسے عشوہ گری

تشنہ لب تیر بھی اس ترک کا ہے مژگاں بھی
دونوں مہمانوں کے کام آتا ہے خونِ جگری

فتنۂ حشر کا کیا حشر ہو دیکھیں تو سہی
کہ اڑاتا ہے تمہاری روشِ فتنہ گری

نگہِ شوخ نے گھونگٹ میں کیا دل ٹکڑے
نظرِ شوق نے بھی خوب ہی کی پردہ دری

منتیں کرکے منایا ہے کسی کو شبِ وصل
پھر ترے شور میں کیا دیر ہے مرغِ سحری

ضعف ہے ہل نہیں سکتا ہوں مدد کر مری آج
اُس کے قدموں پہ لٹا دے مجھے بیدِ جگری

حالِ ایامِ جدائی کا سنا دے جا کر — عمرِ رفتہ ہے مناسب پئے پیغامبری
بدگمانی نہیں صیاد کے دل میں مجھ سے — آڑے آئی ہے اڑے وقت میں بے بال و پری
محفلِ یار میں ٹوٹے نہ کہیں اشکوں کا تار — آج کرنا نہ کمی جوش میں خونِ جگری
دامنِ یار ہے ناصح کا گریباں نہیں — دیکھ اچھی نہیں اے دستِ جنوں جامہ دری
دیکھتے ہی اسے بھر آتی ہیں میری آنکھیں — مانعِ دید ہوئی جاتی ہے اشکوں کی تری
میرے ماتم میں بھلا غیر نہ روئے کیونکر — کہیں جاتی ہے تری عادتِ بے دادگری
مل چکے خاک میں اب قبر ہمیں دے نہ فشار — پیستا تھا کبھی ہم کو فلکِ نیلوفری
ہم کو ساقی سے غرض کچھ ہے نہ شے سے مطلب — دل رہے پاس سلامت رہے خونِ جگری
جب تک پیالے سے تم جان بھی پیاری تھی ہمیں — اب ہیں ہم اور عجب طرح کی ہے بے خبری
ہو ہی جائے گا مقدر میں جو کچھ ہونا ہے — اب نہ دیکھیں گے تجھے اے فلکِ نیلوفری
میرا مطلب اسے سمجھا دے خدایا دمِ نزع — کچھ اشاروں میں جو کہتی ہے پریشاں نظری
ایک امید پہ جیتا ہوں خدارا اے یاس — قیدِ ہستی کی کشاکش سے مجھے کر دے بری
رشک کہتا ہے خبردار نہ کرنا اف تک — محفلِ غیر میں اٹھتا ہے جو دردِ جگری
عشق میں زلفِ پریشاں کے ہوا ہوں برباد — خاک بھی میری اڑاتی ہے نسیمِ سحری
خیر کچھ غم نہیں اتنا تو کر احسان صبا — خاک پہنچا دے سوئے روضۂ خیر البشری
مدح میں شاہ کی پڑھتا ہوں وہ مطلع شاطر — سر کو دھننے لگیں سنتے ہی جسے جن و پری
رحمتِ عام کے باعث ہے تری ناموری — ترے قربان میں اے شافعِ جرمِ بشری
ناخنِ فکر نے حل کر دیے عقدے سارے — تیرے آگے تو ہے مانندِ بدیہی نظری
تیغِ ابروئے ہلالی کا ترے واہ رے کاٹ — لوگ کہتے ہیں جسے معجزۂ شق القمری
شکلِ رابع سے نتیجہ کو کرے استخراج — رائے سے تیری جو حیواں کو ہو بہرہ وری
علتِ غائیِ ایجادِ دو عالم تری ذات — معنوی اس میں فضائل ہیں بھرے اور صوری

جلوہ گر سینے میں ہے داغِ محبّت تیرا
اسی گرمی سے مرے جسم کی رگ رگ بھری
تیرا بندہ ہے جو شاطر اسے جس دم دیکھا
خوف سے کانپ اُٹھا شعلۂ نارِ سقری

کیفیتِ حج

اسلامیوں کا آج یہ دربارِ عام ہے
ہر ایک دل بھرا ہُوا وحدت کا جام ہے
سب کا لباس ایک ہے اور ایک سی ہے وضع
پوچھو وطن تو چین ہے یا ہند و شام ہے
ہر اک کے دل پہ خوفِ الٰہی ہے چھا رہا
شاہ و گدا ہے رند ہے یا نیک نام ہے
پر خوف سے فزوں ہیں اُمیدوں کے ولولے
سُلطان دو جہاں کا یہاں فیضِ عام ہے
کمزور اور قوی میں سرِ مُو نہیں تمیز
دہشت سے یاں ہر ایک بنازِ روغام ہے
دُنیا کے شہ سوار بھی تھر تھر ہیں کانپتے
رُستم ہے اپنے وقت کا یا کوئی سام ہے
بھوکا فقیر اپنی ہے عادت سے مانگتا
یہاں شاہ کے بھی ہاتھ گدائی کا جام ہے
آپس میں رنج ہیں نہ عزیزوں میں کلفتیں
کوسوں دلوں سے دُور یہاں انتقام ہے
زینت کا ہے خیال نہ سنگار کا ہے چاؤ
چادر کا ایک سب کو یہاں اہتمام ہے
یہاں ملت و عقیدہ کا کچھ تفرقہ نہیں!
یہ کُل گروہِ اُمّتِ خیر الانام ہے

اِتّفاق

پھنسے گا اگر جال میں ایک کوّا — وہ کوّا جہاں پھنس کے آواز دے گا
چلے آئیں گے سینکڑوں کوّے اُس جا — کریں گے ہم مِل کے سب شور و غوغا

یہ چاہیں گے اُس جال کو توڑ ڈالیں
مُصیبت سے قیدی کو جلدی چھڑا لیں

نہ ہو ہم میں ایکا قیامت کی جا ہے — مقامِ تاسف ہے عبرت کی جا ہے
ہیں دُور اپنوں سے غیرت کی جا ہے — کسی میں نہیں اُنس عبرت کی جا ہے

ہمیں چاہیئے سب کا غمخوار ہونا
مُصیبت زدوں کا مددگار ہونا

تعصب کو دل سے ذرا دُور کر دو — مُسلمان ہو یا کہ ہندو ہو سب کو
ہمیشہ نگاہِ تلطّف سے دیکھو — بجا ہے جو سردار کہتا ہے سُن لو

اگر اتّفاق آج ہو جائے ہم میں
کڑی منزلیں سب ہوں طے ایکدم میں

کرتار ..... دہلی